

مجموعه تقاریر

خطیب آل محمد

مولانا سید اظہر حسین زیدی

Presented By: www.jafrilibrary.com

مکمل مجموعہ تقاریر

خطیب آل محمدؐ

(مولانا سید اطہر حسن زیدی رحمۃ اللہ علیہ)

مرتبہ

خضر عباس سید مرحوم

ناشر

شاہد برادرز لاہور پاکستان

فہرست مضامین

صفحہ نمبر	عنوان
7	تذکرہ امام حسن مجتبیٰ
18	سودۃ فی القربیٰ
48	آنکھ
55	جہاد اکبر
64	معصوم کا فیصلہ
81	حجت
95	اصطفیٰ
113	اسلام لرزہ بر اندام ہو گیا
144	اسن
179	حق طاقت ہے
207	علی اصغر ایک سپاہی
217	فاطمہ کا چاند
227	شام غریباں
230	فی سبیل اللہ
251	انک لعلی خلق عظیم
257	انسانیت
275	موت و حیات
287	موت و حیات

صفحہ نمبر	عنوان
297	باب الحوائج امام موسیٰ کاظم
304	آل ابی طالب
327	انسان اور انسانیت
339	شام غریباں
358	اضافہ شکر یہ
380	حسینیت
385	حضرت قائم آل محمد علیہ السلام
389	عشق خدا
402	شجاعت اور ملوکیت
414	اللہ سے ڈرو
427	اللہ گواہ ہے
442	معرفت امام
458	شام شہیداں
462	شہادت عظمیٰ
476	اصحاب حسین
485	سیکنہ بنت الحسین
503	قلم
513	مرج البحرين
534	فرز رب الکعبہ

صفحہ نمبر	عنوان
560	فہذا علی مولاً
584	لا الہ الا اللہ
598	احسن القصص
609	حسین اور اسلام
617	سید الساجدین
619	نجات
635	ختم نبوت
660	سیدہ کا عقد
678	اضافہ شکر یہ
691	قانون عدل
720	قانون عدل
743	محسن اعظم
752	ادائے حق
780	اے انصاریا رسول اللہ
807	شجرہ طیبہ
823	تصور آل محمد
831	اسیر بغداد
836	وفات سیدہ
848	پروردہ آغوش رسالت

تقریظ

قاہل ملت جعفریہ پاکستان سرکار مفتی جعفر حسین قبلہ اعلیٰ السیاقامہ

میری ایک عرصہ سے تمنا تھی کہ خطیب آل محمد مولانا السید اظہر حسین صاحب زیدی دام بدہ کے بیانات کا مجموعہ کتابی صورت میں شائع ہو تاکہ ارباب منبر اس نلک خطابت کے بیرو درخشاں سے روشنی حاصل کر سکیں۔ مجھے یہ دیکھ کر انتہائی مسرت ہوئی کہ جناب سید خضر عباس صاحب راحت معالیتے مولانا موصوف کی چند تقریروں کو ترتیب دے کر میری اور علمی و ادبی ذوق رکھنے والوں کی دیرینہ خواہش کو پورا کیا ہے۔ مولانا کے بیانات صرف کئی خاص طبقہ ہی میں مقبول نہیں ہیں بلکہ ہر گروہ اور ہر جماعت میں انہیں یکساں مقبولیت حاصل ہے۔ پاک میں شاید ہی کوئی شہریا قصبہ ایسا ہوگا۔ جہاں مولانا کی آواز نہ گونجی ہو۔ اور اہل اسلام اور دوسرے مذاہب کے افراد ان کے طرز خطابت و سخن بیاں سے محفوظ نہ ہوئے ہوں۔ خطیب کے لیے جن اوصاف کی ضرورت ہوتی ہے۔ قدرت کی طرف سے ان اوصاف کا انہیں وافر حصہ ملا ہے۔ متوازن لہجہ بیان میں ٹھہراؤ، متوازن آواز، ادب کی شگفتگی، زبان کی پاکیزگی، ان کی خطابت کا خاص جوہر ہے۔

مجھے توقع ہے کہ ان کے بیانات کا یہ تحریری مجموعہ ان کے بیانات کی طرح مقبولیت عامہ کی سند حاصل کرے گا اور ناظرین اس سے اسی طرح لطف اندوز ہونگے جس طرح ان کے بیانات سے محفوظ ہوتے ہیں۔ میری دلی دعا ہے کہ یہ نذرانہ عقیدت بارگاہ حذر رسید الشہداء میں شرف قبولیت حاصل کرے۔
(دعا گو) مفتی جعفر حسین عفی عنہ

دلت تیری یارب تیرے مہر کو بخشا

پھر انہیں نکل رہے ہیں کانٹے طمیری زبان کے

ولادت امام حسن مجتبیٰ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

”خداوند عالم کی حمد و ثناء کے بعد حضرات محمد و آل محمد پر درود و سلام“
حضرات گرامی! آج کی محفل کا موضوع بحث ہے۔ تذکرہ حضور امام حسن مجتبیٰ
علیہ السلام اور میں آپ سے عرض کروں۔ کہ جناب حسن علیہ السلام کا تذکرہ اتنا مختصر
نہیں ہے کہ اسے تھوڑے سے لفظوں میں ادا کر دیا جاتے۔ چنانچہ یہ مسئلہ بعض وجوہ سے
اُلجھ گیا ہے اس لئے اسے سمجھانے کے بیان کرنے کے لئے کافی مہتدیں اور مقامات کی
ضرورت پڑتی ہے۔ بیگانوں سے تو کوئی شکوہ نہیں بلکہ اپنوں نے بھی اس پر اتنی توجہ نہیں
دی جو دینی چاہیے تھی۔

میرے سامعین! حضور امام حسن مجتبیٰ کی وہ شخصیت ہے جو ایک لمحہ کے لئے
بھی امام حسینؑ کے ماتحت نہیں رہی۔ امام حسینؑ تقریباً عرصہ دس سال تک امام حسنؑ کی
امامت کے ماتحت رہے ہیں۔ اگر کوئی اس وقت حسینؑ سے پوچھتا کہ تمہارا امام کون
ہے؟ تو آپ فرماتے کہ میرا امام حسنؑ ہیں۔ چنانچہ امام حسینؑ پورے دس سال زیرِ امامت
حضور امام حسنؑ مجتبیٰ رہے اور حسینؑ کا نیا نام تجویز ہی نہ ہو سکا۔ آخر یہی کہنا پڑا۔ اس کا نام
بھی حسنؑ ہی رکھ دو۔ یعنی حسنؑ کی اگر تقدیر کر دو۔ بڑا ہر حسنؑ اور چھوٹا ہر حسنؑ۔ گویا حسینؑ
کی سب سے بڑی فضیلت یہ ہے کہ وہ حسنؑ کے چھوٹے بھائی ہیں اور حسنؑ کی سب سے بڑی فضیلت
یہ ہے کہ وہ حسینؑ کے بڑے بھائی ہیں۔ مگر ہم لوگوں نے کچھ ایسی غفلت

برقی ہے کہ مجالس میں اس عظیم شخصیت کے تذکرے اتنے نہیں ہوتے جتنے ہونے چاہئیں۔

محترم سامعین!

دنیا کا یہ دستور ہے کہ عوام کسی جماعت یا فرد کا منشور نہیں پڑھتے۔ بلکہ عوام کی قوجہ کامرزدہ فرد ہوتا ہے جو (Election) میں کھڑا ہو شخصیت سامنے آتی ہے۔ لوگ اُس کے گرد اکٹھے ہو جاتے ہیں پھر یہ عالم ہوتا ہے کہ دو مختلف پارٹیاں اپنے اپنے منشور کی اہمیت بیان نہیں کرتیں۔ بلکہ اپنی اپنی شخصیت کی برتری کے لئے دلیلیں پیش کرتی ہیں۔ ————— حضرات! منشور

سے بے توجہی اور شخصیت کے گرد اکٹھا ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ انسان کے ضمیر میں یہ سایا ہوتا ہے کہ صرف کتاب کافی نہیں ہے۔ شخصیت کا بھی کافی دخل ہے۔ ————— بہرِ نفع اسلام نامی ایک نظام ہے جس کے تحت ہم زندگی بسر کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس زندگی کو مرعوب کرنے کیسے ہم آیتن بناتے ہیں۔ لفظ آیتن فارسی زبان سے ہے۔ اور لفظ دستور ترکی سے ہے۔ ————— عربی زبان میں اگر کوئی لفظ آیتن کے معانی ادا کر سکتا ہے تو وہ صرف ایک لفظ ہے دین۔ دین کے معنی میں آیتن دین کے معنی میں دستور۔ اللہ نے یہ اقرار کیا ہے ﴿إِنِّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ﴾

”اگر کوئی آیتن کوئی دستور ہے اللہ کے پاس تو وہ اسلام ہے“ ہم اس آیتن کے پابند ہیں۔ یہ اسلام نامی ایک آیتن ہے۔ اور ہر آیتن شخصیتوں کے پیچھے جلتا ہے۔ ————— اسلام نے جس پہلی شخصیت دنیا کے سامنے پیش کی۔ وہ سخی آقائے حضور رالتاب۔ اور آیتن میں یہ دفعہ آج بھی موجود ہے اس آیتن پر عمل کرنے کے لئے بطور نمونہ ہیں رسولؐ رسولؐ نے اس آیتن کو مجھانے کے لئے

ہمیں طریقہ بتایا کہ ”کتاب اللہ و سنتی“ ایک کتاب اللہ ہے، ایک سنت ہے۔
 کتاب اللہ تو مسلمان نے دیکھ لی مگر سنت کا وجود کہاں سے تلاش کریں۔
 بس سنت رسول سمجھانے کے لئے، محمد کو کہنا پڑا ”کتاب اللہ و سنتی“۔
 ”اگر کسی نے میرا طرہ طریقہ، میری سنت کا اندازہ دیکھا ہو تو میرے گھر
 والوں سے پوچھو“ چونکہ ”اہل البیت أعلم دجانی البیت“ گھر والے زیادہ جانتے
 ہیں کبھی گھر والے کی بات۔ یا گھر والے بہتر جانتے ہیں کبھی گھر والے کی بات کو۔
 اب سنت رسول سمجھنے کے لئے دو چیزیں ضروری
 ہیں، ایک رسول کے وہ مقدس و محترم واجب الاحترام قابل جاں نثار اصحاب!
 جو رسول کے پیش درگرو موجود تھے وہ جانتے ہیں کہ رسول کی سنت کیا ہے!
 (اب بحیثیت مسلمان! کسی اصحابی رسول کی شان میں گستاخی کرنا تو درکار، اگر ذہن
 میں یہ تصور بھی آجائے۔ تو یہ گناہ عظیم ہے۔ ہم تو فرماں ہیں اُن اصحاب پر جو
 صراطِ مستقیم پر چل کر رسول کے ساتھ ہوئے۔ جو رسول پر فدا ہونے کو تیار تھے۔
 غلوّس دل کے ساتھ رسول کے ساتھ پر بیعت کی تھی۔ وہ ایک نذر تھے جنہوں نے
 نذر ایمان کے ساتھ چہرہ رسول کو دیکھا۔ ہمارا ہر فرد اُن پر فرمان ہونے
 کو تیار ہے۔ سبحان اللہ! اُن سے بہتر شخصیت تو دنیا میں ہو سکتی ہی نہیں جن کو
 رسول کا پاس تھا اور پاس کے ساتھ رسول کے پاس بیٹھے تھے۔ اُن سے بہتر
 تو کوئی ہو سکتا ہی نہیں)۔ اتودہ بہتر جانتے ہیں یا اہل بیت رسول۔ بس یہیں سے
 دو کتب فکر اسلام میں پیدا ہوئے۔ ایک ہے گھر والوں کا کتب فکر ایک اُن
 عزیزوں کا کتب فکر اصحاب کہلاتے ہیں۔ مسلمانوں نے دونوں کا نام مقرب
 کر لیا۔ گھر والوں کا بھی اور اصحاب کا بھی۔ گھر والوں کو انہوں نے ”آل“ کہا ہے
 ساتھ یہ بھی کہہ دیا کہ ہر کلمہ پڑھنے والا آل ہے۔ جب نماز میں درود پڑھی تو صرف یہی

کہا اللہم علی اللہ محمد و آل محمد۔ مسلمانوں نے نماز پڑھی۔ نماز سے بڑھ کے کوئی عبادت ہے
 ہی نہیں اور نماز اس وقت تک کبھی کی ہوئی ہی نہیں جب تک اس نے آل پروردگار
 بھیجا ہو۔ اگر کوئی نماز میں آل محمد پر درود نہ بھیجے تو تمام مسلمانوں کا یہ متفقہ فیصلہ
 ہے کہ اس کی نماز نہیں ہوتی، بس یہ مسلمانوں نے فرق رکھا ہے (آل میں اور اصحاب
 میں)۔ بہر حال مسلمانوں کو آل پروردگار پر درود پڑھنا ہے۔ آل کے بغیر
 گدہ ہی نہیں ہے۔ آج کبھی عقیدے، فرقے کے مسلمانوں سے پوچھو، آل رسول کو
 مانتے ہو تو ان کے نام بتاؤ؟

اللہ نے کہا، جگڑا کیوں کرتے ہو۔ میں آج ہی رسول کو ٹالیتا ہوں۔ دیکھا ہوں
 — کون مانتا ہے۔ کون نہیں مانتا۔ چنانچہ چھ دے دیتے ایک فرقے کو اور آٹھ
 دے دیتے ایک فرقے کو۔ انہوں نے اپنے والے کہلا دیں، بخت میں، مشہد میں، کافین
 میں بے ادبیت اور انہوں نے بھی اپنے والے جنت البقیع میں بے ادبیت۔ آج دنیا دیکھ رہی
 ہے کہ ماننے والے کون ہیں — نہ ماننے والے کون ہیں)

بہر حال آل کو مانتے ہیں۔ آل کے بغیر دنیا و آخرت میں گزارا ہو سکتی ہے۔

آنحضرتؐ کی بخت چل رہی ہے کہ علیؑ بھی آل رسولؐ ہیں یا نہیں۔ چنانچہ بہت سے حضرات یہ
 درود پڑھنے لگے ہیں اللہم علی محمد و علی آل محمد۔ علیؑ کو آل میں نہیں رکھتے
 برابر کا بھائی سمجھتے ہیں۔ اور آل کو اولاد سمجھتے ہیں۔ — حالانکہ یہ غلط ہے۔ علیؑ
 اول حق۔ علیؑ کے ذریعے سے آل شروع ہو رہی ہے۔ علیؑ آل میں ہیں۔ — مگر حق کے
 آل میں ہونے کا تو کسی کو شک و شبہ ہے ہی نہیں۔ وہ یقیناً لازماً حقیقتاً آل
 رسولؐ میں بلکہ

یوں کہتے کہ ۱۵ رمضان ۱۰ سہ ماہ کو اول فرد مسلمہ آل رسولؐ میں تشریف

لائے۔ اللہ نے ان مومنین

کے غصوں کا آج جواب دیا ہے جو رسولؐ کو "اتر کہا کرتے تھے آج ٹھکڑی گود میں یہ بچہ دیکھ کر ان کے مُنہ بند ہو گئے اور آل رسولؐ کے بارے میں تمام مسلمانوں کا یہ متفقہ فیصد ہے کہ یہ آیہ تطہیر میں داخل ہیں۔ میرے سامعین! قرآن میں یہ آیت ہے کہ رسولؐ ان سے کہہ دو کہ "ایں تم جیسا بشر ہوں" "قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ" بشر کے معنی میں "انسان" جب رسولؐ نے کہا تھا "ایں تم جیسا بشر ہوں تو کیا عربوں سے کہا تھا کہ میں تم جیسا بشر ہوں، ابوہریرہؓ نے کہا تھا کہ میں تم جیسا بشر ہوں۔ پھر کس سے کہوں یا گیا کہ میں تم جیسا بشر ہوں، کیا مسلمانوں سے کہو یا یہ کہہ، اصحابؓ موجود تھے ان سے کہا تھا کہ میں تم جیسا بشر ہوں۔ ایک طرف اللہ رسولؐ سے یہ کہو، اے ہے کہ کہہ دو، میں تم جیسا بشر ہوں" اور ایک طرف رسولؐ کی طرف لایا جوتاہل! جس کے بارے میں رسولؐ پوچھ رہے ہیں "یہ ہدیہ لاتے ہو یا صدقہ؟" انہوں نے عرض کی، جناب صدقہ! اگر وہ ہدیہ کہتے تو کھالیتے اور جب انہوں نے کہا "صدقہ" تو رسولؐ نے اصحابؓ کو فرمایا "آپ فزائش فزائقی" اصحابؓ نے عرض کی "قبل آپ کے لئے لاتے ہیں" رسولؐ نے فرمایا "نہیں۔ میں تم جیسا نہیں ہوں" (ایسی سچاس مٹالیں ہیں جو میں سن سکتا ہوں کہ جہاں رسولؐ کہتے رہے کہ تم اور میں برابر ہیں، میں تم جیسا نہیں ہوں، پھر رسولؐ نے کس سے کہا تھا کہ "ایں تم جیسا ہوں"۔ کوئی بشر تو ایسے تھے۔ نامانے۔ جن سے رسولؐ کہہ رہا تھا کہ "ایں تم جیسا ہوں"۔ پیاسے سامعین! یہ ایک رندانہ ٹھکڑ ہے کہ رسولؐ چادر کے نیچے چاروں کو بچھا ہوئے تھے۔ اور جب آیہ تطہیر نازل ہوئی۔ اُن چاروں نے ٹھکڑ یہ ادا کیا۔۔۔

"ہاں رسولؐ! ہم بہت شکر گزار ہیں کہ آپ کے سدرتے میں ہمیں یہ سعادت نصیب ہوئی" تو رسولؐ نے ان چاروں کو پیسار کر کے فرمایا "کوئی بات نہیں۔ میں تم جیسا ہوں" اور اسی فقرہ "میں تم جیسا ہوں" کو آل ٹھکڑ نے اس طرح نبھایا کہ ہمارا اول بھی ٹھکڑ ہے

ہمارا آخر بھی محمد ہے۔ اسی بات کو شعر آفاق "کے معنیف علامہ عبد الخلیم نے ادا کیا ہے کہ اگر محمد مہیا کوئی بے قرہ آل محمد ہیں۔" — حسن حسین میں جمال محمد ائمہ کمال محمد جب مسلمانوں کا یہ اعتقاد ہے کہ یہ اُن جیسے ہیں اور وہ ان جیسا ہے تو آپ کو

ایک تاریخی واقعہ سناروں —

ایک دفعہ حضرت ابو بکر صدیقؓ کو کسی نمک سے خراج آیا۔ تو جابر بن عبد اللہ انصاریؓ صحابی نے اُنکے کہ "رسول اللہ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا۔" جب اس علاقے سے خراج آتے گا۔ تو میں تجھے دروں ہاتھوں سے بھر کے دو دفعہ خراج میں سے پیسے دوں گا۔"

جابرؓ نے کہا اب رسول کا بندہ پورا کرو۔

حضرت ابو بکرؓ نے کہا ہاں۔ میں وعدہ پورا کرتا ہوں مگر علیؓ کو بلاؤ۔ — اور جناب علی المرتضیٰؓ تشریف لاتے تو بادشاہ وقت نے آپؓ سے فرمایا یا علیؓ اپنے ہاتھ سے بھر کے دے دو۔ چونکہ میں نے اپنے کان سے یہ بات سنی ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا ہے کہ علیؓ کا ہاتھ رسول کا ہاتھ ہے۔" اور

میرے محرم سامعین! جو صحابیؓ منبر پر بیٹھ کر علیؓ کے ہاتھ کو رسول کا ہاتھ کہہ رہا ہو، انہی پر یہ ماننے کو تیار ہی نہیں کہ اُس نے علیؓ سے کہا ہو کہ وہ میری بیعت کرے۔ اسے بیعت کی کیا ضرورت تھی۔ علیؓ کا ہاتھ تو رسول کا ہاتھ ہے۔ اُس نے تو کہا ہی نہیں کبھی علیؓ سے کہ تم میری بیعت کرو۔ ہم نے یہ الزام خواہ مخواہ لگا دیا ہے۔

اور اگر وہ کہتا بھی تو اُس کا وہی جواب تھا جو کہ بلا میں حیدؓ نے دیا تھا۔ خاندان رسالتؐ سے بیعت کا صرف ایک ہی دفعہ مطالبہ ہوا ہے۔ نہ اس سے پہلے براعتا، نہ بعد میں ہوا۔ بہر نوع یہ شان آل رسولؐ ہے۔ اب میں آپ کو حسن محبت کی مختصر سی بات سنائیں گا۔

۔ اس کے بعد پھر اجازت چاہوں گا۔

مسلمانوں نے یہ نظام بنایا (جب طرح بھی بنایا اس بحث میں کیا پڑوں) جس میں انہوں نے آل رسول کو بقل ان کے، چوتھے درجہ بہت بڑی عظمت عطا فرمائی آج تمام مسلمانوں کے فرقوں میں وہ حکومت! جو راشدہ کہلاتی ہے۔ اس کے چوتھے منبر پر سربراہ مملکت! امیر المؤمنین علی ابن ابی طالب تشریف لاتے۔ اور علی کو چوتھے منبر پر بٹھا کر مسلمان مجبور ہیں کہ وہ آل محمد کی عزت بھی کریں، تعظیم بھی کریں۔ اگر کوئی تجویز ایسی ہو سکتی کہ ان کو چوتھے منبر سے ہٹا دیا جائے تو آپ یقین فرمائیں کہ مسلمان کا نام کسی زبان پر نہ آئے۔ یہ چوتھے درجہ پر آنے کی وجہ سے مسلمانوں کی زبان پر آل محمد کا نام۔ دیکھیں! وجود آل محمد کے چوتھے درجہ پر آنے پر بھی مسلمانوں نے مخالفت شروع کر دی تاکہ کسی طرح سے آل محمد کا نام ہی ٹاٹا دیا جائے

پہنچنا پھر ان کو ہٹانے کے لیے مسلمانوں نے پہلے تو لڑائی کی اُدھر وہ چوتھے منبر پر آ کے بیٹھا اُدھر اُس کے ساتھ لڑائی ہوئی

اس کے بعد ابھی اُس طرائی کا قلعہ

ختم ہی ہوا تھا تو میر صفین کی عظیم لڑائی شروع ہو گئی اور یہ سب۔ اسی لئے تھا کہ کسی طرح سے آل محمد کو جو یہ چوتھا مرتبہ مل گیا ہے اُس سے انہیں ہٹا دیا جائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب تم کو اس آل محمد نہ کٹ سکے تو پھر قرآن اٹھا کے لے آئے تاکہ آل محمد کو ہٹا

دیا جائے۔ اور میری بڑی جنگ بظاہر اس نوبت پہ پہنچ گئی کہ حاکمین مقرر کرنے پر جسے حاکمین میں سے جو آل محمد کی طرف سے حاکم تھا اُس کا نام تھا ابو موسیٰ اشعری۔ یہ ابو موسیٰ اشعری اُس خاندان کا فرد تھا جن کے متعلق جناب امیر نے فرمایا تھا کہ تم کبھی یہ توقع نہ کرنا کہ وہ صحیح فیصلہ سنائیں گے۔ جناب امیر نے اصرار کیا تھا میں نہیں چاہتا کہ میری طرف سے ابو موسیٰ اشعری نمائندہ بنے۔ تم اکثر شہر کو نمائندہ بناؤ، کسی اور کو بناؤ۔ ”مگر معاویہ جانتا ہی نہیں تھا۔“

آخر حاکمین کا فیصلہ کیا تھا؟ اور دوسرے عہد عاص ایک چالاک و عیار اور ادھر سے البرہمی
 اشرفی۔ حاکمین نے فیصلہ یہ کر دیا کہ ہم چوتھے منبر سے علیؑ کو معزول کرتے ہیں اور امیر شام
 (معاویہ) کو چوتھا خلیفہ مقرر کرتے ہیں۔ اس فیصلہ کے بعد اب کیا ترتیب ہو گئی حکومت
 کی۔ اول۔ دوم۔ سوم کے بعد اب چوتھا خلیفہ ہو گیا۔ "امیر شام"۔ یہی مسلمانوں کا
 منشا تھا کہ ہو جائے۔ ابھی یہ فیصلہ ہوا ہی تھا کہ انہوں نے علیؑ کو قتل کر دیا تاکہ نہ علیؑ
 رہے نہ کوئی خطرہ باقی رہے۔ اب باقی علیؑ کی شہادت کے بعد جو علیؑ کا بیٹا میدان میں
 ہے اُس کی کیا پوزیشن ہے؟ (اہمست دالی بات نہ کرنا وہ تو ہمارے عقیدے کی بات
 ہے) علیؑ کا بیٹا کیا اب ایک بادشاہ کا بیٹا ہے؟ "نہیں" علیؑ کا بیٹا اب ایک معزول شدہ
 بادشاہ کا بیٹا ہے۔ اُس کی بظاہر کوئی پوزیشن نہیں مگر یہی حقیقت ہے اور امیر شام
 فیصلے کے مطابق ایک مسئلہ حاکم ہے۔ اور حاکم ایک عام آدمی ہے۔

اب بتائیں ایک نام آدمی حکومت کے مقابلے میں ایک گروہ اکٹھا کرے تو وہ
 کیا کہلاتے گا؟ یعنی باغی اور باغی کو حکومت حکم دیتی ہے "ہتھیار ڈالو، ہمارے
 طاعت کرو ورنہ قتل ہو جائے گے" جتنا سچہ باغی جو ہے وہ اطاعت کرتا ہے یا قتل ہو جاتا
 ہے۔ مگر

یہاں کیا ہو رہا ہے۔ کہ حکومت اس شخص سے جو ایک باغی کی مدد سے پہنچ گیا ہے
 درخواست کر رہی ہے۔ کہ میں تجھ سے صلح چاہتی ہوں۔ "صلح باغی سے نہیں
 ہوتی۔ رعایا سے نہیں ہوتی، بلکہ حکومت اپنی برابر طاقت سے صلح کرتی ہے۔ اور برابر
 کے معنی یہ ہیں کہ اُس کے باپ کی وہ حیثیت تسلیم ہے تو سچی وہ برابر کی طاقت ہے۔
 گویا حسن مجتبیٰؑ کی شخصیت نے اس معاہدے میں صرف ایک لفظ "صلح" لکھا کہ اپنے باپ
 کی حیثیت مسلمانوں سے منوادی۔

بہر نوح - عزت مآب حسن نے اپنی ادا کردہ صلح سے بڑی کی شخصیت۔ آج دُنیا میں مسئلہ کراچی — گر اس صلح کا نام لوگوں نے اپنی کم طرفی کی وجہ سے "بیعت" رکھ لیا بیعت چیز اور ہے۔ صلح چیز اور ہے۔ بیعت تو اس خاندان سے دُنیا نے صرف ایک دفعہ ہی مانگی تھی۔ نہ اُس کے بعد کسی نے مانگی اور نہ اُس سے پہلے کسی نے مانگی۔ اور اُس کا اس خاندان نے وہ دن ان شکن جواب دیا کہ پھر کسی کو جرأت نہ ہوئی اس خاندان سے بیعت مانگنے کی۔ بہر نوح - حسن کی بدولت، اُن عہد کی شخصیت جو تھے ممبر پر مسلم رہ گئی۔ اور چنانچہ امام حسنؑ مجتہدِ اکابر نامہ خاکہ جنگ ختم ہو گئی۔ تواریخِ نیاموں میں آگئیں۔ لوگوں کو امن سے بیٹھ کر سوچنے کا موقع مل گیا اور اس سوچ و غور کا نتیجہ یہ نکلا کہ بہتر زبانِ انسان تیار ہو گئے جو کہ بلا میں ساتھ تھے۔ صرف حسن کی صلح کر کے کی بدولت وہ بہتر زبان ہو گئے۔ ورنہ یاد رکھو میرے سامعین! کہ بلا سے پہلے اگر بلا کے بعد راہِ حق میں یکساں ہو کر جان بیسے والے بہتر ہیں، آدم سے لے کر کر بلا تک اور کر بلا سے قیامت تک نہ کبھی پیدا جوتے نہ ہونگے مولتی کو چالیس حواری لیے تھے سب ناکام ہو گئے۔ محمد کے ساتھ لاکھوں نئے گمراہ میں بہت اکا کے دیکھ لیا۔ علیؑ کے ساتھ تیس ہزار فوج متقی صلح میں جب معاہدہ حاکمین ہوا۔ آپکو پتہ ہے کہ تین چار آدمی رہ گئے تھے۔ حسن کے ساتھ تیس ہزار آدمی تھے جن میں سے صرف اردن مکہ مارے گا تھا جب آپ صلح کر رہے تھے۔ مگر

"بہتر آدمی نہ کر بلا سے پہلے کسی کو ملے تھے نہ کر بلا سے بعد کسی کو ملے۔" امام غزالیؒ

بھی اسی انتظار میں ہے کہ چالیس مل باقی تو آجاؤں گویا سب بڑی جماعت جان نثاروں کی اللہ کے نام پر صرف حسن کی صلہ تھے پیدا کی۔ جتنے اعلیٰ حسین کہ بلا میں شہید ہوئے تھے، حبیب بن مظاہر، زبیر، عینہ و عینہ یہ سب وہ تھے جو دس سال کے عرصہ میں حسن کے دوست بنے تھے وہ حسن کے چھوٹے بھائی پہ آکے قربان ہو گئے۔ اور تیس چالیس ہزار آدمی وہ بنا دیئے جو قیدوں میں بند تھے۔ حبیب قید سے جرنے تو انہوں نے واقعہ کر بلا کا انتقام خاندن بنوا میر سے لیا۔ یہ سب حسن کی دہی ہوئی تعلیم کا نتیجہ تھا۔ یہ سب حسن جتنے کی پیدائی ہوئی صلہ امن کے کارنامے کی بدولت ہے اب اس کو چاہے کتنا بیان کرے۔ دنیا کی سیاست کے اعتبار سے دنیا کے حالات کے اعتبار سے حسن کی سوانح عمری کبھی ختم ہو سکتی ہی نہیں۔ ایسی عظیم اور ایسی عجیب اور ایسی بے مثل حقیقت حسن کے نام سے آج اس دنیا میں اسکی ولادت ہوئی، وہ تشریف لاتے۔ گویا خدا کی سب سے بڑی نعمت اُس کے بندوں کو ملی۔ خاندان رسالت میں دوسرے بہادر پیدا ہوتے، اصلی وارث پیدا ہوا۔

اللہ کا ہم شکر ادا کرتے ہیں۔ رسول کو ہم مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ علی دف طہ کی خدمت میں مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ ہم اللہ سے، رسول سے، علی سے استیرہ سے ادا کر آپ (پاویں) اپنے زمانے کے امام سے درخواست کرتے ہیں کہ جب شہنشاہوں کے گھر خوشی ہو، بیٹا پیدا ہو تو دوسرے کے انعامات رعایا میں تقسیم کئے جاتے ہیں۔

1۔ قیدیوں کو آزاد کیا جاتا ہے۔ جو نذرانہ عقیدت پیش کرتے ہیں، انہیں انعام دیتے ہیں چنانچہ ہم میں سے جو گناہوں کی قید میں قیدی تھے، ہم اللہ سے انہیں آزاد کرے اتنے بڑے فرزند کی ولادت کی خوشی میں خداوند عالم ہمیں گناہوں کی قید سے آزاد کرے دوسرا انعام ہمیں کیا ہے۔ یہ ہم نہیں مانگتے۔ اس لئے کہ ہم اگر بڑی سے بڑی شے بھی مانگیں گے تو وہ اپنی حیثیت کی بڑی ہوگی۔ یہ بات اُن پر چھوڑ دو۔ وہ اگر چھوٹی سے چھوٹی شے بھی دیں گے تو ان کی حیثیت کی ہوگی۔ اللہ جانے آلی محمد کیا عطا فرمائیں گے۔؟

اے آل محمد! ہمیں جو انعام بھی عطا فرما چاہیں اپنی شان کو دیکھ کر اور ہمارے
ظرف کو دیکھ کر وہ ہمیں آپ عطا فرمادیں۔ ہم آپ کو کچھ نہیں کہتے۔ آپ ہمیں جنت
دے دیں۔ فلاں دے دیں۔ یہ جنت تو آپ کے گھوڑے کی شبیہ ولا دتی ہے۔
جنت کیا شے ہے جنت تو آپ کی شان میں دو شعر کہہ دینے سے مل جاتی ہے۔ اتنی معمولی
چیز آپ سے کیا مانگیں۔ حضور اپنی شان کے مطابق عطا فرماتیں۔ اسنا ہم آپ سے
عرض کرتے ہیں کہ۔

نعمت اطمینان جو خدا کا بڑا عطیہ ہے ایسا ہمارے لئے ہو جاتے کہ اس
پُر آشوب انقلاب زمانے میں جب کہ بحران میں ہم پھنسے ہوئے ہیں اور عزت و ناموس
خطرے میں ہے۔ شریعوں کی شرافت خطرے میں ہے ایسی فضا پیدا کر دے جو
آپ کے نام لیوا، آپ کے فلام، عزت و اطمینان سے زندگی گزاریں۔ یہ نعمت اطمینان خدا
کی سب سے بڑی نعمت ہے جو آپ کے ہاتھ میں مل جاتے۔ یہ ہماری رہنمائی ہے
اپنی مصلحت کو خدا بہتر مانتا ہے۔ اور ہمارے وارث، ہمارے والی، ہمارے امام، ہمارے
شہنشاہ، ہمارے ربیر، ہمارے آقا، ہمارے مرشد، ہمارے صاحب العمر و الزمان کا
ظہور فرما۔ ہمارا حوصلہ صبر ختم ہوتا جا رہا ہے۔ ہماری ہمتیں پست ہو جاتی جا رہی ہیں۔ دنیا
نے ہمیں بڑی طرح تنگ کر دیا ہے۔ ہم گھبرا کے کہتے ہیں کہ ہمارا والی و وارث آجائے۔
یہی محمد و آل محمد۔ رَبَّنَا اقْبَلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ۔

مودۃ فی القربی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

خداوند عزوجل جلالت کی حمد و ثنا کے بعد حضرات محمد و آل محمد پر درود و سلام

حضرات! آپ کو معلوم ہے کہ آج جو اس وقت ہمارا جلسہ ہے، یہ سلسلہ تشریف آوری حضور امام رضا ہے۔ آج دنیا میں ہمارے آٹھویں امام علیہ السلام تشریف لارہے ہیں اور ہم ان کی ادنیٰ رعایا اپنے شہنشاہ کی آمد کی خوشی میں اس سارے خاندانِ عصمت و طہارت کو ہر بڑے مبارک یاد پیش کرنے کے لئے یہاں اکٹھے ہوئے ہیں۔ وقت کی مناسبت سے موضوع تو یہی ہے کہ یہی ذکر ہو، مگر وہ مضمون بڑا لمبا ہے اگر ساری بات نہ کہی جائے تو پھر سامعین کو کوئی لطف نہیں آئے گا۔

لہذا آج کی محفل میں یہ معلوم ہو چکا ہے کہ یہاں کچھ ایسے حضرات بھی تشریف فرما ہیں جو علمِ لغت کے ماہر اور واقف ہیں اسلئے ان حضرات کی خدمت میں ایک ایسے طالب کی حیثیت سے ذہن بھول گیا ہو وہ سبق دہرانا چاہتا ہوں۔ اس کا تعلق نہ عقیدت سے ہے نہ اس کا تعلق فقہ سے ہے اور نہ ہی اس کا تعلق حصولِ فقہ سے ہے۔ صرف اور صرف علمِ لغت کا مسئلہ ہے جو میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں۔ اس لئے بھی کہہ رہا ہوں کہ یہاں یہ حضرات ٹیپ کرنے والے بھی بیٹھیں میری تقریر محفوظ بھی ہو جائے گی اور یاد بھی رہے گی۔ اس سے پہلے بھی میں یہ بات کہہ چکا ہوں۔ یہ ایسی بات نہیں ہے جو

نئی میں کہہ رہا ہوں۔ اس حیثیت سے نئی ہے کہ یہ بات علامہ نے کبھی نہیں کہی۔ صرف جہاں آدمی نے کہی ہے اور وہ میں ہوں۔

اللہ نے کام مجید میں جبریل علیہ السلام پہنچا ہے۔ یہ فرمایا ہے —
 "قَدْ لَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْلاً اِلَّا الْمُدَّةَ فِي الْقُرْبَىٰ" یہ آیت ہے کلام مجید میں —
 اب اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہاں ہے تو چونکہ میں حافظ نہیں ہوں لہذا بتا نہیں سکتا۔ یقیناً ضرور ہے کہ ہے۔ "آیت اللہ کے لئے اتنا جانا ضروری ہے کہ وہ ہے یہ جانا ضروری نہیں کہ وہ کہاں ہے۔ چاہے وہ قرآن صامت کی آیت ہو یا قرآن ناطق کی آیت ہو۔ اس اتنا جانا ضروری ہے کہ وہ ہے — اور آیت ایسی ہے کہ اس کے لئے حافظ کی ضرورت نہیں پرانی ہر عقبت مند مومن کے حافظے میں یہ آیت محفوظ ہے اسی آیت پر ہمارے اعتقاد اصولی و فروعی کا دارومدار ہے۔ ہم اس آیت کو اپنے اعتقادات کی روح مانتے ہیں۔ اگر اسے بیچ سے نکال دو تو ہمارے تمام اعمال و افعال چاہے کتنے ہی فقیہ کے مطابق ہوں، وہ بے روح ہو جائیں گے۔ یہ آیت روح ہے ہمارے ایمان کی۔

اس آیت کے شروع میں اللہ نے لفظ "تُكَلِّمُ" فرمایا ہے — قُلْ لَّوْ اَسْئَلُكُمْ
 — کلام مجید میں چند آیتیں ایسی ہیں جو "تُكَلِّمُ" سے شروع ہوتی ہیں۔ حالانکہ ہر آیت اسی لئے نازل ہوتی تھی کہ رسول پر وہ آیت آئے اور رسول وہ عوام سے نہیں سے۔ اصحاب سے، مسلمانوں سے کہہ دیں۔ جب ہر آیت اسی لئے آتی تھی کہ وہ کہی جائے تو بعض آیتوں کے شروع میں "تُكَلِّمُ" کہنے کی ضرورت کیوں پیش آئی — کیا ان آیتوں کو رسول سنانا نہیں چاہتے تھے؟ کیا انہیں چھپا لینا چاہتے تھے۔ جو اللہ کو کہنا پڑا "تُكَلِّمُ" — یہ کہہ دے —

رسول کے لئے یہ تاکید حکم آنا "تُكَلِّمُ" کا۔ اس کے کیا معنی ہیں —

تفسیر کو چھوڑ کر مختصر لفظوں میں یہ نگلیہ یاد رکھیں کہ جن آیتوں کا انکار کفرِ محض بن جائے ان کے شروع میں اللہ "قل" کہہ دیتا ہے۔ "قل هو اللہ احد" — اور اگر کسی مثل، والی آیت میں انکار کفر نہ بننا ہو تو وہ منسوخ ہو جاتی ہے۔ بہر نوع یہ ایک اصول ہے قرآن کا — اس آیت میں بھی اللہ نے "قل" کہا ہے — اہل لغت حضرات جانتے ہیں کہ "قل" کے معنی ہیں "کہہ دے" — یہ تو ہماری زبان ہے۔ ہم اپنی ہی زبان میں اگر ذرا لفظ بدل دیں تو اس "کہہ دے" سے زیادہ لطف آ جائے گا۔ یہاں "قل" کے معنی "کہہ دے" ذکر کریں۔ بلکہ "قل" کے معنی یہ کریں کہ رسولؐ یہ کہہ رہے تھے بحکم خدا "تھا" کہہ کر اس بات کے قائل ہو جاؤ۔ یہاں "قل" کے معنی ہیں اس کے قائل ہو جاؤ۔ "مان لہ اس بات کہہ کر۔ تمہیں ماننا پڑے گی یہ بات" — "اس کے ماننے بغیر گزارا نہیں ہے" اور جس بات کو منوایا جاتا ہے۔ اس کا طریق ادا یہ ہوتا ہے کہ اُسے نفی و اثبات میں ملا کے کہا جاتا ہے۔ پہلے نفی پھر اثبات — جس طرح —

لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ — ویسے بھی کہہ سکتے تھے کہ اللہ وحدہ لا شریک ہے — مگر یہ لا اور اللہ نے اس کے منوانے کو مستحکم کر دیا۔ تو جہاں آپ دیکھیں لا اور اللہ، وہاں ماننا ہی پڑے گا۔

اسی طرح اس آیت میں اللہ نے کہا۔ "قُلْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ عَلَيْهِ أَجْرُ الْوَدُوعِ" جس طرح خدا کے کلمہ میں لا اور اللہ ہے اُسی طرح یہاں بھی لا اور اللہ ہے۔ جس طرح اُسے ماننا پڑے گا۔ اسی طرح اسے بھی ماننا پڑے گا۔ اس کا انکار اُسی طرح بُرا ہے جس طرح لا اور اللہ اللہ کا انکار ہے۔

(اب یہ نوجوان بچے سامنے بیٹھے ہوئے کہہ رہے ہیں "لا اور لا")

تو آپ نے بتا دیئے۔ تیسرا لا اور اللہ ہمیں بھی یاد ہے —

لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ — لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ عَلَيْهِ أَجْرُ الْوَدُوعِ فِي الْقُرْآنِ

اور "قیسرا لہ اور اللہ اور بھی ہے۔" وہ ہے "لَوْ فُتِحَ
 إِلَهُ عَلَى لَوْ سَيِّفَ اللَّهِ ذَوَالْفَقَارِ"۔۔۔۔۔ یہ وہ کلمہ ہے
 جو اللہ پڑھتا ہے۔ سنا ہے غیبی آواز آئی تھی "لَوْ فُتِحَ إِلَهُ عَلَى كَا
 سَيِّفَ اللَّهِ ذَوَالْفَقَارِ"۔۔۔۔۔ اس کلمہ میں اتنی طاقت
 ہے "لَوْ فُتِحَ إِلَهُ عَلَى" میں اتنی قوت ہے کہ اگر ساری دُنیا کے ہر
 اکٹھے ہو کر کسی فرد یا جماعت کو بے دین و کافر کہیں۔ اگر وہ لا
 فُتِحَ کا سہارا لے تو کامیاب ہو جاتا ہے۔ اتنی طاقت اب بھی
 ہے "لَوْ فُتِحَ" میں۔ یہ بات ماننا پڑے گی ہر ایک کو کہ "لَوْ فُتِحَ" نفع دلاتا
 ہے۔۔۔۔۔ بہر فرع یہ بھی ایک کلمہ ہے۔)

میرے محترم سامعین! یہ جو آیہ مودۃ ہے۔ جسے اللہ نے یوں شروع کیا ہے۔۔۔ "تَلِّ" قائل ہو جاؤ۔
 کس بات پر۔۔۔ "لَوْ اسْتَلْکُمْ"۔۔۔ علمِ کُفْت کے ماہرین اگر عربی ادب کی لطافت
 پر ذرا غور کریں تو اتنا پیارا انداز ہے یہ "لَوْ اسْتَلْکُمْ" اس سے زیادہ حسین اور پیارا انداز
 سمجھ میں آتا ہی نہیں۔ یہ کلمہ لائقِ فرمان نہیں ہے۔ کسی بڑے کا حکم نہیں ہے۔ کسی
 برابر والے کا کہنا نہیں ہے۔ بلکہ ایک محبوب کی فرمائش ہے۔ اتنا پیار ہے اس میں
 کہ اسے ادا نہ کرنا شرافت کے خلاف ہے۔ انسانیت کے خلاف ہے۔۔۔ اس
 اداسے بات ہو رہی ہے۔ "لَا اسْتَلْکُمْ" میں تو نہیں مانگتا۔۔۔ کتنے پیارے انداز میں بات
 کہی ہے "میں تو نہیں مانگتا۔۔۔ میں تم سے کچھ نہیں مانگتا۔۔۔ تم مجھ سے مانگو۔۔۔ تم مانگو
 جو چاہو۔۔۔ میں تو نہیں مانگتا۔۔۔ میں تم سے کچھ نہیں مانگتا۔۔۔ "لَا اسْتَلْکُمْ"۔۔۔
 مجھے پتہ ہے کہ "اَسْأَلُ" اچھی چیز نہیں ہے۔ بال جیسی عزت ہے۔ مانگ سے
 فرقہ آجائے گا۔۔۔ لہذا میں تم سے کچھ مانگتا ہی نہیں۔۔۔ میں تم سے کیا مانگوں۔

میں تمہیں عطا کرنے آیا ہوں — مانگتے نہیں آیا — ”وہ اسلمکہ“ میں تو نہیں مانگتا۔
 ابن سے نہیں مانگتا — اللہ گواہ ہے — میں تم سے کچھ نہیں مانگتا — مجھے مانگنا
 سنا؟ نہیں — میں نے کبھی مانگا ہی نہیں — تم سے میں کیا مانگوں گا —
 میں نے تو اللہ سے بھی کبھی نہیں مانگا — جس سے ساری دنیا مانگتی ہے —
 میں نے تو اس سے بھی نہیں مانگا — وہ بھی بار بار مجھے کہتا ہے ”ربی زدنی علما“
 درجہ نہیں تو علم ہی مانگ لے — میں کہتا ہوں — ”نہیں“ — میں تجھ سے بھی
 نہیں مانگتا — میں تو اللہ سے بھی نہیں مانگتا —

”قبلہ!“

اللہ سے کیوں نہیں مانگتے —؟

مجھے پتہ ہے۔ اگر میں مانگوں گا تو چاہے کتنی ہی برائی شے مانگ لوں — وہ
 بڑی میری حیثیت کی ہوگی — بعد میں کیوں مانگوں — اگر اس میں ذرا
 سی ادائے محبوبیت شامل کر لو تو — اللہ کا دل پاتا تھا کہ محمدؐ مجھ سے کچھ مانگے —
 ہر حبیب کا جی چاہتا ہے کہ محبوب کوئی فرمائش کرے — کچھ مانگے تو سہی — کچھ
 کہے تو سہی — اللہ سب کچھ دینے کو تیار تھا مگر اتنا غبور محبوب کہ کچھ نہیں
 مانگتا — ممکن ہے اللہ نے یہ خیال کیا ہو۔ (ان لفظوں پر قیاس نہ کرنا۔ اللہ
 کے واسطے کوئی لفظ ہے ہی نہیں دنیا میں۔ یہ تو ہم اپنا مطلب ادا کرنے کے لئے
 ان لفظوں کو سہارا لیتے ہیں) — ممکن ہے اللہ نے خیال کیا ہو کہ جمع میں مانگتا ہوا
 شرماتا ہے — تو ایک رات چپکے سے گھر بلا یا اور کہا۔

”اب تو صرف اور میں ہوں — اور تو کوئی نہیں۔ پردے کی باٹ
 ہے — اب مانگ لے“ — پھر اللہ نے سوچا — چلو سستی
 ہی نہٹائی سہی — میں اللہ! — یہ بندہ! — یہ غیرت

تو اب بھی ہے نا آخر — اللہ اور بندے کی بات ہے —
 تو اللہ نے اللہ بن کر بات نہیں کی وہاں پردے میں — بلکہ اس طرح
 بول رہا تھا — یہ معلوم ہوتا تھا جسے بھائی بول رہا ہو — ”اب
 مانگو — مانگ کیا مانگتا ہے؟“

مگر اس غیرت دار بندے نے وہاں بھی کچھ نہ مانگا — جس نے اللہ
 سے کچھ نہ مانگا۔ وہ ہم جیسے ذلیل بندوں سے کہہ رہا ہے — ”میں تم سے کچھ نہیں
 مانگتا —“ ”اے اللہ! میں نہیں مانگتا — میں نہیں کہہ رہا — اللہ نے کہا ہے
 ”تم“ اب جو تم سے کوئی شے مانگی جا رہی ہے وہ میں نہیں مانگتا — وہ مانگ رہا ہے
 وہ مانگتا ہے تم سے — میں نہیں مانگتا — اُس نے کہا ہے تم — میں نہیں
 مانگتا —“

”سوال: پھر فرماؤ نہ کچھ — کیا مانگتا ہے وہ — کیا چاہتا ہے وہ —“
 جتنے مربے والے تھے وہ آگئے اپنی جائیدادیں لے کر — پیسے والے پیسے لے کر
 — دولت والے دولت لے کر — رسولؐ نے فرمایا — ”نہیں — میں
 تمہارے مربے نہیں مانگتا — میں تمہارے پیسے نہیں مانگتا — میں تمہاری دولت
 نہیں مانگتا — تمہارا کوئی سناؤ نہیں مانگتا —“
 پھر قبیلہ کیا مانگتے ہو؟

”میں تم سے ”اجر“ مانگتا ہوں — میں تم سے اجرت پرانتا ہوں“
 حضرات علماؒ کے کرام!

”خدا تمہارے علم و فضل میں برکت عطا فرمائے — آپ کے علم میں خدا ایسی
 طاقت دے کہ آپ میں فتنہ استیغاب پیدا ہو جائے — کبھی کبھی غریب شہر جاہل
 کی گفتگو بھی استیغاب کے نکتہ سے غور فرمایا کریں — مر جاؤں گا تو یاد رکھو کہ کوئی دیوانہ

ایسی باتیں بھی بتایا کرتا تھا، رسولؐ ہم سے یہ کہہ رہا ہے کہ میں تم سے اجر مانگتا ہوں۔
 اجرت مانگتا ہوں۔ رسولؐ مانگتا ہے اجرت ہم سے۔ اتنا بڑا رسولؐ ہم سے اجرت
 مانگتا ہے۔ میں تم سے اجرت مانگ رہا ہوں۔ اور ترجمہ یہ کیا جاتا ہے۔
 میں تم سے اجرت مانگتا ہوں رسالت کی۔

کیوں صاحبان!

ایک بات بتاؤ کہ ایک شخص کو حکومت نے تحصیلدار بنایا اس تحصیل

کا۔ تھانے دار بنایا اس تھانے کا۔ اُس تھانیدار کو اپنی

تنخواہ مانگنے کا حق کس سے ہے؟ حکومت سے۔ اور

اگر وہ آپ کو بلا کے کہے۔ "ہڈ۔ میری تنخواہ؟" تو وہ

تھانیدار درخواست ہو جائے گا یا نہیں؟ اگر تحصیلدار اپنی تنخواہ ہم سے

مانگے۔ تو ہم کہیں گے۔ قبلہ! آپ کو ہم نے بنایا تھا تحصیلدار۔

تم تو پہلے ہی ہمارے لئے وبالِ جان ہو۔ جاؤ گھر۔ جس

نے بنایا ہے اُس سے مانگو۔ گو ہر بنا ہوا اپنے

کام کی اجرت اُس سے مانگ سکتا ہے جس نے اُسے اپنے کام پر

معمور کیا ہے۔ اگر یہ رسالت کی اجرت ہے تو جن نے

اُسے رسالت پر معمور کیا ہے اس سے اجرت مانگ سکتا ہے۔

ہم نے نہیں رسولؐ بنایا اُسے جو ہم سے اجرت مانگے۔

یہ ایک مغالطہ درودِ العالمہ ہے جسے ہمارے ذہنوں میں بٹھا دیا گیا ہے کہ رسولؐ

نے رسالت کی اجرت مانگی تھی۔ ہم نے کب رسولؐ کو رسولؐ بنایا تھا۔ اُسے ہم

سے اجرت مانگنے کا کوئی حق نہیں۔ ہم نے دعوتِ نبویؐ کر کے کہا تھا "تو رسولؐ

ہے۔" ہم نے کیٹی کر کے کہا تھا "تو رسولؐ ہے؟"۔ جن بیٹوں کو ہم بنی

بناتے ہیں — وہ ہم سے اپنی اُجرت مانگتے ہیں۔ کہ ہمیں اپنی کمائی کا رسواں حصہ بھیج دیا کرو۔ کیوں کہ تم نے ہمیں نبی بنایا ہے — اور جنہیں اللہ نبی بنائے وہ صفا کہتے ہیں "ان اجرہ علی اللہ" — "ہمیں تم سے کیا واسطہ ہے۔ جس نے ہمیں رسول بنایا ہے، وہ ہمیں اجر دے گا — اور تم کہتے ہو کہ اُس نے رسالت کی اُجرت مانگی تھی — یہ بہت بڑی جہالت ہے — رسول، ہم سے اپنی رسالت کی اُجرت مانگ سکتا ہی نہیں — اور رسالت میں اُس نے سکھایا کیا ہمیں — نماز پڑھو۔ روزہ رکھو۔ حج کرو — یہی باتیں ہیں ناجز ہمیں سکھائی رستہ نے —

کیوں علمائے کرام! کیوں فقہائے عظام!

نماز سکھانے کی اُجرت لینا جائز ہے؟ — ناجائز ہے — ہمارے لئے تو کہہ دیا — ناجائز — اور خود یہی چیزیں سکھاکے کہتا ہے کہ "مجھے اُجرت دو" — یہ کیسے ہو سکتا ہے — ان چیزوں کی کوئی اُجرت نہیں دیتا۔ رسالت کی کوئی اُجرت نہیں — مگر مانگی اُجرت ہے — پھر اُجرت کس بات کی؟ — قرآن میں لفظ "اُجر" موجود ہے — مانگی ہے اُجرت ہی — کیا آدمی کے ذہن میں یہ بات نہیں آسکتی — کہ رسالت کی اُجرت اگر نہیں ہے تو پھر رسول کس بات کی اُجرت مانگتا ہے؟ — پوری توجہ ہے نا صاحبان!

یہ وہ چیزیں ہیں جو تفسیروں میں ہیں نہ کتابوں میں ہیں اور نہ ہی علماء کی زبان پر ہیں — یہ صرف مجھ جاہل آدمی کے ذہن میں آگئی تھی بات جو میری آج آپ کی خدمت عالی میں بیان کر رہا ہوں — ہو سکتا ہے ساری غلط ہوں۔ میں یہ ضد تو نہیں کرتا کہ میری ہر بات صحیح ہے — مگر ابھی تک کسی نے غلط کیا نہیں — چنانچہ ایک دفعہ ایسا

تفسر بنا میں نے کراچی میں اسی مضمون کو دس دن میں متواتر دس مجلسوں میں بیان کیا۔
— مولوی صاحبان کہیں — ”واہ — ہماری اب تک کی ساری تفسیریں

غلط کرتا ہے۔“ میں نے کہا۔ — ”میں تفسیری بات نہیں کر رہا۔ لغت کی بات ہے۔“
تفسیر میں میرا کوئی دخل نہیں۔ تفسیر تو اس کی میں وہی مانوں گا۔
جواب فرمائی گئی۔ یہ صرف علم ادب کی حیثیت سے معافی دیاں اور صرف و نحو کی حیثیت سے علم لغت میں گفتگو ہو رہی ہے۔ چنانچہ ایک سٹھ جہانی میں کراچی میں۔
وہ مہربانی ساری گفتگو کھڑکڑا کر ”جامعہ ازہر“ سے گئے۔

ایک شخص لغت کے اعتبار سے اس آیت کے منعلق یہ کہتا ہے۔ فرمائیے
یہ صیح ہے یا غلط ہے؟ وہاں سے جواب آیا۔ لغت کے اعتبار سے صرف
یہی صیح ہے۔

پھر لوگوں کو کچھ حوصلہ دینا ہوا۔ — زیدی بھی کچھ جانتا ہے۔ ورنہ میں تو کچھ
جانتا ہی نہیں تھا۔ آپ نے میری ہزاروں تقریریں سنی ہوں گی۔ عربی میں نہیں
پڑھتا۔ — انہیں میں نہیں پڑھتا۔ حدیثیں میں نہیں پڑھتا۔
سیدھی سادھی لغت کی بات ہے۔ کہ رسولؐ نے ہم سے انکی اجرت ہے۔
بات یہ ہے حضور! رسولؐ کے فرائض میں ہے کہ وہ خدا کے احکام ہم تک پہنچائے
اور اداائے فرض میں اجرت نہیں ہونی۔ — جس طرح
میں سے آیا ہوں لاہور سے۔ تاکہ مجلس پڑھوں۔ گھر سے چلا اسی نیت سے
ہوں۔ بلایا اسی لئے گیا ہوں۔ اگر کوئی صاحب مجھے یہ کہہ دیں ”زیدی صاحب جلیل
تو آپ نے پڑھنی ہی ہے۔“ ذرا میرا خط بھی لکھ دیں۔“ تو یہ خط لکھنا میرے فرائض
میں نہیں ہے۔ فرض سے زائد کام مجھ سے لینا چاہیں تو میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ چیز میرے
فرائض میں نہیں ہے۔ — لہذا احکام الہی کا پہنچانا یہ رسولؐ کے فرائض میں ہے۔
غشش کی راہیں دکھانا یہ رسولؐ کے فرائض میں ہے۔ نہایت کے راستے بتانا یہ رسولؐ

کے فرائض میں ہے — — — ”مخفا“ کے جنت میں لے جانا یہ رسولؐ کے فرائض میں نہیں ہے — — — یہ تمہارے اوپر بوجھ ہے — — — جنت کے سارے راستے بتا دینا رسولؐ کے فرائض میں ہے اور تمہیں جنت میں لے جانا۔ یہ رسولؐ کے فرائض میں نہیں ہے۔ اب اگر تم کبھی رسولؐ کے سر جو جاؤ قبلہ !

”جنت میں لے بھی جاؤ — — — تو رسولؐ کہے گا۔ ”یہ میرے فرائض میں نہیں ہے۔“ ہم نے پھر عرض کی ”قبلہ — — — آپ شفیع ہیں — — — آپ ہماری شفاعت فرمائیں — — —“ تو رسولؐ نے فرمایا — — —

”بھائی ! میرے فرائض میں تمہاری شفاعت نہیں ہے — — — جہاں تک میرے فرائض کا تعلق ہے۔ وہ ہے۔“

یہ چار کام ہیں — — — شفاعت اس میں کہاں ہے — — — ان چار کاموں کی اجرت نہیں مانگ سکتا۔ یہ میرے فرائض میں ہے، شفاعت کا زمانہ ہم تم میرے ذمے لگا رہے ہو۔ میں نہیں کرتا شفاعت تمہاری — — — جاؤ — — — اب ہم تمام رسولؐ سے کہتے ہیں یا رسول اللہ ! ہماری شفاعت کرو۔ رسولؐ فرماتے ہیں — — — شفاعت کا کام میرے فرائض میں نہیں ہے — — — میرے صاحب سے جاؤ سارے جہنم میں یہ کیا کروں۔ میں نے تمہیں نجات کا رستہ بتا دیا ہے — — — شفاعت میرے ذمے نہیں ہے — — — آخر جب ہم نے مجھ کو کہا — — — تو رسولؐ نے کہا — — — ”دیکھو۔ میں ہوں سرکاری ملازم — — — مجھے اللہؐ نے بنایا ہے رسولؐ — — — اور یہ میرے فرائض میں ہے کہ ایک ذمہ دار انفرادی گورنمنٹ سے اجازت لئے بیزنس SIDE BUSINESS نہیں کر سکتا — — — اگر تم مجھ سے یہ (SIDE BUSINESS) شفاعت کا کروانا چاہتے ہو تو اس کی اجازت میں اللہؐ سے لوں گا۔“ کیوں اللہ ! اجازت ہے۔ میں شفاعت کروں اس کی — — —

تو اللہ نے بڑے غصہ میں جواب دیا "من فاذی یشفع عندک الا باذنہ کہن
ہوتا ہے شفاعت کرنے والا" — رسول! چپ ہو گئے — مگر عوام سر ہیں آپ
رحمت ہیں — آپ آخری نبی ہیں — ایک دفعہ پھر کہہ دو نا اللہ سے — اور رسول
نے پھر کہا — اللہ نے اس میں تحقیق کر دی — کوئی شفاعت نہیں کر سکتا — مگر
وہ رسول جس سے اللہ راضی ہو — رسول بھی راضی ہو گئے۔ چلو اللہ مجھ سے راضی
تو ہے — میں شفاعت کر سکتا ہوں —

پلیک اتم مجھ سے شفاعت چاہتے ہو — خدا نے مجھے تمہاری شفاعت کا حق
دے دیا ہے — اگرچہ یہ میرے فرائض میں نہیں ہے — یہ فرائض سے زائد کام ہے
جو تم مجھ سے لینا چاہتے ہو — اللہ نے کہا محمد! سُنتے بھی ہو۔ یہ
کام مفت نہ کرنا — یہ کام تیرے فرائض میں نہیں ہے — تو اس کی ان سے اجرت
لے — جو اجرت دے دے — اس کی شفاعت کر — اور جو اجرت نہ دے — وہ
جائے جہنم میں — رہ گیا یہ تلاوت آیات کرنا — نازیں سکھانا — روزے سکھانا —
پاس بخانا — پیہ کرنا — محبت کرنا — اپنے ساتھ رکھنا — یہ تیرے فرائض میں ہے
یہ سب آپ سے ماخذ کر — راجحت بہنم میں سکھانا — جو اس کی اجرت دے اس کو
شفاعت کر — جو نہ دے پائے جہنم میں — یہ SIDE BUSINESS ہے تیرا — اس کی
اجرت نہ — چنانچہ اس نے کید دیا — لا اسلکھ — میں تم سے نہیں لگتا
— علیہ — اس بات پر رد علیہ کی زمین لاکوئی — چچ تو ہونا چاہیے نا —
رسالت تو کبھی نہیں — اس بات پر جو تم مجھ سے مانگ رہے ہو — یہ راجح و موافق
ضمیر ہے — جو تم مجھ سے مانگ رہے ہو شفاعت — اس بات پر میں تم سے
اور کوئی اجرت نہیں چاہتا — تب شفاعت کروں گا — جب تم اجرت دو گے نا
تو جہنم میں سا جانا

شفاعت کے متعلق بھی دو لفظ کہہ دوں — شفاعت کے معانی ہم غلطی سے سمجھ بیٹھے۔ سفارش — حالانکہ سفارش اور چیز ہے۔ شفاعت اور چیز ہے۔ جس حکومت میں سفارش سے کام ہوتا ہو۔ وہ نااہل حکومت ہے۔ جس طرح ایک نالائق آدمی کی سفارش ہوئی۔ وہ افسر بن گیا۔ ایک تابل بے چارہ رہ گیا۔ یہ حکومت کوئی اچھی حکومت ہے دنیا میں؟ تو اگر اللہ کے یہاں بھی سفارش چلنے لگی۔ گویا حکومت کیا ہوئی۔ بچہ سک کی شنا ہی ہوئی

رسولؐ نے کہا۔ میں سفارش کسی کی نہیں کروں گا۔ میں تو شفاعت کروں گا۔ اب شفاعت کے کیا معانی ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ حالانکہ ایک مولوی تھا۔ مگر اتفاق سے میں ایک زمیندار کے گھر پیدا ہوا تھا۔ قصوری بہت زمینداری بھی جانتا تھا۔ شفاعت کے معانی سمجھ میں آ گئے۔ ————— مثلاً

ایک زمین تھی آپ کی۔ ساتھ بنا لگتا تھا کسی اور کی زمین کا۔ اُس نے بیج دی۔ آپ نے کہا میں تو اس پر شفعہ کرتا ہوں۔ کیوں کہ میرا بنا لگتا ہے۔ یہ بے شفاعت۔۔۔ جہاں آپ کی حد لگتی ہو۔ جہاں آپ کا بنا لگتا ہو۔ اُسے دوسرے تک نہ جانے دیں۔ اسے شفاعت کہتے ہیں۔ اب دنیا میں کوئی آدمی ایسا نہیں ہے جو ساری نیکیاں ہی نیکیاں کرے۔ ایسا بھی کوئی نہیں جو ساری بریاں ہی بدیاں کرے۔ ہزاروں بُرائیاں کیں۔ ایک آدمی کی جی۔ ہزاروں نیکیاں کیں۔ ایک آدمی بڑی بھی۔ تو جتنی برائیاں کی ہیں۔ اتنا اس میں حصہ۔ بے شیطان۔ اور جتنی اچانیاں کی ہیں۔ اتنا اس میں حصہ دار ہے رسولؐ۔ چونکہ رسولؐ کا بنا لگتا ہے شیطان کے بتے کے۔ قیامت کے دن شیطان کہے گا۔ میرا حق ہے۔ تو رسولؐ حق شفعہ کرے گا۔ اسے شفاعت کہتے ہیں۔ اسے کہتے ہیں۔ المیزان حق قیامت میں میزان قائم ہوگی۔ میزان سے معافی ہیں۔ "تو لاجائے گا کہ کس کا پڑ بھاری ہے۔"

کا اردو میں کیا ترجمہ ہے —

میرے سامعین ! آج تک اردو زبان نے وہ الفاظ بنائے ہی نہیں جو مورت فی القریٰ کا ترجمہ کر سکیں۔ جتنے بھی ترجمے ہوتے ہیں، وہ لفظ نہ ہونے کی وجہ سے مجبوراً ایم ادھر اور سے بیر پھر کر کے کہہ دیتے ہیں۔ ورنہ کوئی اردو زبان میں لفظ ہی نہیں جو مورت فی القریٰ کا ترجمہ کرے — — — — — اور جو ترجمہ کیا جاتا ہے وہ ہے میں تم سے اُبرت چاہتا ہوں قربی کی محبت کی — مورت کے معانی محبت کیا جانا ہے — لے ابل ذوق ! تمہارے — — — — — سننے کی بات ہے —

نوجوان طبقہ ! عمر سے سُنا — میرے جیسے بڑھتو! تو بھی سُنا — — — — — کیا اُبرت مانگی رسولؐ نے بقول تمہارے ترجمہ کے — "محبت" — — — — — ایسے سے کہو — محبت کوئی — مانگنے کی شے ہے — محبت کا کہیں مقابلہ ہو سکتا ہے — محبت طلب کی جا سکتی ہے —! اگر میں کہوں

"بیر محل کے سیدو! بڑھے، نوجوانو، بچو! میں تم سے بیعت نہ کرتا ہوں کہ مجھ سے محبت کرو" — — — — — سب کہیں گے — بڑھے کا دماغ خراب ہو گیا ہے — بھلا محبت بھی کہیں مانگے سے ہوتی ہے — بھلا محبت بھی کہیں طلب سے ہوتی ہے —

— اب سب کہیں گے "ہم کیوں کریں آپ سے محبت؟" — — — — — میں کہوں گا "میں بہت سونا ہوں" اس لئے مجھ سے محبت کرو — — — — — بچتے در نہیں گے۔ تم نے کبھی آئینہ میں شکل بھی دیکھی ہے۔ اپنے آپ کو سونا بنا رہے ہو — — — — — مگر دلیل کیا ہے۔ میرے پاس کو میری ماں کہتی ہے — میں بہت ہی سونا ہوں — — — — — اب تم ہنسو گے یا نہیں؟ — — — — — تم کہو گے — اماں تو ٹھیک کہتی ہیں۔ پر اماں کی ہر بات سچی ماننے کے قابل نہیں ہوتی — — — — — چاہے "اماں" ہی کیوں نہ ہو — — — — — اماں تو اپنوں کی طرف سے ہی بات کر دیتی ہے، — — — — —

بہرِ فزع محبت مانگی نہیں جاتی — محبت کی نہیں جاتی — محبت ہو جاتی ہے — اور جو شے ہو جائے۔ اُس کا مطالبہ نہیں ہوتا۔ نہ ہی اُس پر جزا و سزا ہوتی ہے — مطالبہ اُس شے کا ہوتا ہے جو کی جائے۔ اُس کا نہیں ہوتا۔ جو ہو جائے — لہذا موت کے معانی محبت نہیں ہے — محبت اور پیار ہے — موت اور چیز ہے۔ موت کی جاتی ہے — محبت ہو جاتی ہے — اور

علم و معانی و بیان — ہر زبان کا یہ فیصلہ کر چکا ہے دُعا کی کا ہو۔ ناری کا ہو — اردو کا ہر یا انگریزی کا ہو۔ ایک ہی زبان کے دو لفظ کبھی ہم معانی نہیں ہو سکتے — موت بھی عربی کا لفظ ہے۔ محبت بھی عربی کا لفظ ہے — کبھی ایسا ہو سکتا ہی نہیں کہ موت کے وہی معانی ہوں جو محبت کے ہیں — محبت کے وہی معنی ہوں جو موت کے ہیں — اگر دونوں ہم معنی ہوتے تو دوسرا لفظ بنانے کی ضرورت ہی نہ ہوتی — کوئی فرق ہے معانی میں جو دوسرا لفظ بنانا پڑا —

میرے محترم سامعین!

اب لو سمجھو۔ موت کیا ہے؟ محبت کیا ہے؟

”محبت“ تو وہی ہے جو ہو جاتی ہے — اور موت کی جاتی ہے اگر ہم ذرا فظوں

کو بڑھا کر ان کے معانی بیان کریں تو یہ کہوں گا کہ —

محبت وہ ہے جس پر ہر شے قربان ہو جائے — وہاں محبت ہوتی ہے۔ اور

جس پر محبت قربان ہو جائے۔ وہ موت ہے — لہذا محبت ہو جاتی ہے۔ موت

کی جاتی ہے — رسولؐ نے ہم سے ”محبت“ نہیں مانگی — ہم سے موت

مانگی ہے۔ ”موتة فی القبر“

اب میں مثال سے اسے سمجھانا چاہتا ہوں کہ اسے اصطلاح میں ”تاویل بالمعنی“ کہتے

ہیں دُعا کہہ چکے کہ نہیں آتا مجھے موت کا — اس لئے مثال سے سمجھاتا ہوں

سب سے اعلیٰ قسم محبت کی۔ سب سے بڑھیا

قسم محبت کی۔ سب سے بہترین قسم محبت کی۔ وہ ہے جہاں کو ہوتی ہے اپنے بچے
 سے محبت۔۔۔ توجہ فرمائی صاحبان! — اسی لئے ہندی میں، بھاشا زبان میں جو دنیا کی
 حسین ترین زبان ہے۔ اس میں ماں کی محبت کے لئے لفظ ماما رکھا ہے۔ اور کسی محبت
 کو یہ نہیں کہا گیا۔ ماں کی ماما۔ باقی کسی محبت کو یہ نہیں کہا گیا۔ ماما۔ اگر
 محبت کی سب سے اونچی قسم کوئی ہے دنیا میں تو وہ ہے ماں کی محبت۔ اور اس کی
 مثال وہی ہے جو میں ہزاروں دفعہ سنا چکا ہوں۔ اب پھر سنا دوں۔

مولانا میرے سامنے بیٹھے ہیں۔ ان سے میں نے سنی ہے یہ بات کہ جب مدرسے
 میں پڑھتے تھے (دکھ تو اس بات کا ہے کہ میں کبھی پڑھا ہی نہیں کسی مدرسے میں۔ ایسا
 آدمی۔ کائنات بنا ہوں کہ پڑھا ہی نہیں۔ بہتیرا کہا استادوں نے۔ کتاب پڑھ لو۔ میں نے کہا
 کتاب کافی ہے۔ کتاب کا وجود ہی کافی ہے۔ پڑھنے کی کیا ضرورت ہے) —
 مولانا کہتے ہیں کہ انہوں نے پڑھا تھا پرائمری کی کتابوں میں کہ ایک بچہ تھا۔ اور دو
 عورتوں میں جھوڑا ہو گیا۔ ایک کہے میرا بچہ ہے۔ دوسری کہے میرا بچہ ہے۔ دونوں
 روتی روتی بیٹھیں حاکم وقت کے پاس۔ حاکم کوئی بڑا ہی سمجھدار قابل غنا۔ اس نے کہا کہ اس
 کا فیصلہ یوں کرو۔ اس بچے کو کاٹ کے دو حصے کر کے۔ ان میں آدھا آدھا بانٹ دو۔
 جب یہ فیصلہ ہوا جو جھوٹی ماں تھی۔ وہ تو چپ رہی۔ اور جو سچی تھی اُس نے کہا
 ٹھہرو۔ اس بچے کو کچھ نہ کہنا۔ یہ اسی کو دے دو۔ میں دعوئے واپس لیتی
 ہوں۔ — — — یہاں سے پتہ چلا اصلی ماں کا — اور پھر مولانا نے جو بات
 مجھے سکھائی۔ وہ یہ ہے کہ اس کہانی سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ —

جب چیز ہو ایک۔ اور دعویدار ہوں دو۔ ایک ہو جھوٹا۔ ایک ہو سچی۔
 اگر اس شے کے گردنے کا اندیشہ ہو تو سچا گھر بیٹھ جاتا ہے۔

— گویا ماں کی محبت۔ سب سے بڑی محبت ہے۔

— اگر مودت کے معنی، محبت ہوتے تو زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکتے تھے۔

”ماں والی محبت مانگی ہوگی — مگر ماں والی محبت بھی نہیں مانگی — بلکہ مودت مانگی ہے۔“ ”مودت“ وہ ہے جس میں، محبت، قربان ہو جائے۔

اب بتاؤ ماں کی محبت یہ برداشت کر سکتی ہے کہ وہ زندہ رہے اور بیٹا مر جائے؟

جائے؟ — مجبوری اور بات ہے کہ ماں زندہ ہے اور بیٹا مر جاتا ہے۔

مگر کوئی ماں چاہتی ہے ایسا؟ کسی ماں کی خواہش ہے کہ بیٹا مر جائے۔ کوئی ماں خواہش

کرے گی کہ میرا بیٹا بیمار ہو جائے۔ کسی ماں کی تمنا ہے کہ میرا بیٹا زخمی ہو جائے

— ہے؟ نہیں — مگر جب مودت آجائے تو مائیں — رات بھر منت

مانتی ہیں۔ نکل کو پہلے میرے بیٹے کی لاش آئے — ”پہلے میرے بیٹے کی میت

آئے“ — جہاں سے تمنا کر دے — ”موت کی“ — ”یہ مودت ہے — یہاں

محبت قربان ہو جاتی ہے۔ مودت پر —

لبنڈ رسولؐ نے تم سے مودت، مانگی ہے، قربانی کی — دافوس اس بات کا ہے

کہ اردو زبان میں لفظ نہیں ملتے۔ مودت، کا ترجمہ کرنے کے لئے۔ اس لئے

لفظوں کی بیرو پھیر سے کوشش کی ہے کہ مودت کا مطلب آپ کی سمجھ میں آجائے،

بہر نوع جس پر ہر شے قربان ہو جائے۔ وہ محبت ہے۔ اور جس پر محبت

قربان ہو جائے۔ وہ مودت ہے۔ لبنڈ رسولؐ مودت کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اور

مودتِ آخرت ہے شفاعت کی — اور رسولؐ سے شفاعت چاہتے ہو۔ تو مودت

کردو — اب سوال پیدا ہوتا ہے۔

مودت کس سے کریں۔ کون ہے اس قابل جس سے مودت کریں۔ اس کے

لئے قرآن نے کہہ دیا ”فی القربیٰ“

تمام دنیا کے اہل لغت سے خطاب ہے قبلہ !
 مودت فی القربا کا ترجمہ کیا بنا۔؟ — ”مودت کرو“ کس سے ”قربا“ سے ت
 — یہ ”کون سے لفظ کے معانی سے بنا ہے — لفظ سے کس لفظ کے
 معانی سے بنا ہے —؟ عربی میں ”سے“ کے لئے لفظ ہے ”من“ —

— اور آپ نے ترجمہ کیا ہے ”سے“
 اگر ہوتا ”مودت من القربا“ — تو آپ کا ترجمہ صحیح ہوتا — ”قرین سے مودت
 کرو“ — مگر یہاں ہے ”مودت فی القربا“ — ”فی“ کے معانی ”سے“ آپ
 نے کیسے کر دیا — ”فی“ کس لغت میں ”سے“ کے معانی ہے؟ — یہیں سے
 یہ موارد بنا ہے کہ — ”اس بات میں کوئی فی ہے“ — یعنی کوئی نکتہ ہے —
 کوئی خاص بات ہے — جب ہی تو یہاں فی کہا گیا ہے — تو یہاں ”من“
 نہیں کہا — فی کہا ہے — اور ”فی“ کے معانی ہیں ”میں“ — تو یہاں ”میں“
 جی مناسب نہیں بیٹھا — اب مجھے ”فی“ کے معانی جی سمجھانے کے لئے وہی
 ”تاریخ المعنی“ کر کے ذرا لمبی سی گفتگو کرنا پڑی —

عرب زبان میں ”فی“ سمجھانے کے لئے ایک موارد ہے ”السمک فی الماء“
 یعنی مچھلی پانی میں — اگر مچھلی پانی میں نہ ہو تو وہ مچھلی نہیں رہتی — اگر ہم اُسے
 پکڑ کر گھر لے آئیں تو وہ مچھلی نہیں رہتی — مچھلی تو جب بھی مچھل ہے — مگر —
 السمک فی الماء کیا مطلب ہے —؟ یہاں ”فی“ آپ کی سمجھ میں آجائے گا —
 مچھلی پیدا کہاں ہوتی ہے —؟ پانی میں — پتی بڑھتی کہاں ہے —؟ پانی میں —
 اس کی غذا خوراک کہاں ہے —؟ پانی میں — اس کا مرکز حیات کہاں ہے —؟
 پانی میں — اس کا سونپصدی تعلق کس چیز سے ہے —؟ پانی میں — اُس کا کتبہ
 تباہ — رشتہ ناط — سب کہاں ہے؟ پانی میں — پانی سے اُسے جدا کر دو — تو وہ

تڑپے گی — ماسی بے آب۔ آپ نے سنا ہی ہوگا — اور پانی کی یاد میں تڑپ
 تڑپ کر جان دے دیتی ہے — پھر آپ نے اس کی کھال کھینچ لی — اُس کے
 ٹکڑے کر دیئے — اُس میں نمک سرچ ملا کر اُسے بھون ڈالا — اور بھون کے
 کھایا — آپ نے تو ختم کر دیا نا مچلی کو۔ کھا کے آبیٹھے مجلس میں — ٹھوڑی
 دیر ہوئی تھی — پیاس لگی — پانی پیا — پھر پیاس لگی — پھر پانی پیا — اور حبیب
 آج بہت پانی پی رہے ہو — تو کہا صاحب مچلی کھائی ہے — یہ ہے رشتہ
 پانی سے مچلی کا — اگر پیٹ میں ایک ریزہ بھی اس کا باقی رہے گا — پانی۔ پانی
 کہے گا — اس رشتے کو لفظ "فی" سے ادا کیا جاتا ہے — تم مودت کرو
 "فی" والی — یعنی دنیا ٹکڑے کر دے — بھون ڈالے۔ جلا دے۔ بچلے
 — اگر ایک ریزہ بھی باقی ہے — تو "قریبی" ہی کو پکارتے رہنا۔ دوسرے
 کا نام نہیں — یہ مطلب لفظ "فی" نے ادا کیا ہے — "میں" میں یہ صفت
 کہاں تھی جو "فی" میں صفت ہے —
 بہر نوع۔ قریبی سے مودت کرو فی۔ والی۔ جس طرح پھیل کو ہے پانی سے

محبت —

میرے سامعین! اب میں اپنی گفتگو کو آگے بڑھاتا ہوں کہ رسوائے
 ہم سے یہ کہا ہے کہ میرے قریبی، سے مودت کرو۔ اور قریبی، کے بچے ہیں۔
 ق۔ ر۔ ب۔ ی اور الف۔ "ی" والا۔ جسے موسیٰ کا الف۔ عیسیٰ کا الف
 — وہی بے مکر قریبی، کا ترجمہ کر دیا جاتا ہے "قربیت داروں" — یہ ہمارے
 ذہن کو الجھانے کی ایک چال ہے — عربی میں دغریزہ کو قریب کہتے ہیں۔
 اور اگر بہت سے دغریزہ ہوں تو انہیں "قرباء" کہتے ہیں۔ جس طرح عالم کی جمع علماء۔

حکیم کی جمع حکماء۔ طالب علم کی جمع طلباء اور قریب کی جمع قرباء۔ — مگر یہاں سے "قرنی" دقرباء نہیں بلکہ "قرنی" ہے۔ اگر "لغت" بوسیدھا اور "ر" پہ ہوتا ضمیر۔ تو "قرباء" "قرباء" — پھر ہوتے قربات دار۔ — مگر یہاں تو ہے "ر" ساکت اور "لغت" ہے "ی" والا۔ — یہ ہے "قرنی"۔

اب ان لغت والوں سے پوچھو۔ ان "بنی دانوں" سے پوچھو۔ — بتاؤ۔ "قرنی" کیا شے ہے۔ — "قرنی" کیا چیز ہے؟ — "قرنی" کے معنی "لغت" میں صرف اور صرف یہ ہیں۔ "انعل ولفعلیل مؤنث واحد" — اب یہ ترجمہ ہو گیا۔ — "قرنی" والی "مؤنث" کرو اس ایک خاتون سے جو ساری کائنات میں مجھے سب سے زیادہ قریب ہے۔ بس یہ لفظی ترجمہ ہے اس کا۔ — اس کے علاوہ اگر کوئی شخص اس کا ترجمہ پیش کر دے تو میں ساری عربی چھوڑ دوں۔ بتاؤ دنیا کے عربی دانوں سے پوچھ لو۔ سوائے اس کے کوئی اور ترجمہ ہو سکتا ہی نہیں۔ — "اس خاتون سے جو دنیا میں مجھے سب سے زیادہ قریب ہے" — "قرنی" کا مطلب ایک خاتون۔ —

اب اگر میں کہوں "بروی" مثنیٰ — تو وہاں اتفاق سے "نوتقیں" — ایک نہیں بنتی — اور اگر کہوں — — — "ان" مثنیٰ — وہ اس آیت کے غمور بعد اعلان رسالت سے پہلے فوت ہو چکی تھیں — اب ایک خاتون تلاش کرو۔ جو نزول آیت کے وقت ہو، اور ایک ہو — ایسا کچھ ایک کے بغیر کام نہیں چلے گا — چاروں طرف نہ دیکھو — "قرنی" — ہو — ایک ہو — ہم کہتے ہیں "اللہ میاں" — یہ ایک معنی بن گیا — تو ہمیں اس معنی "نوتقیں" کے بتا کر "قرنی" بھی بن جائے — اور ایک بھی رہے —

اللہ نے کہا - ”میں اسے ابھی حل کرتا ہوں۔“
”مسند!“

زرا سی تکلیف کرو۔ یہ عقدہ حل کرو۔
”کیسے؟“

”گھر میں جاؤ۔“

”کس کے گھر میں؟“

”اپنے گھر میں۔“ ازواج کے گھر مت جانا۔ ازواج کے گھر ازواج کے
گھر نہیں ہیں۔ وہ ہے ”بیوت النبی۔“

ازواج جن گھروں میں رہتی تھیں وہ نبی کے گھر تھے۔ ان کے گھر نہیں تھے۔
رواں جو یہ کہا گیا ہے ”وَقَدْ رُتِّقَ فِي بُيُوتِكُنَّ“ ————— اس کا

مطلب یہ ہے کہ جن گھروں میں تمہیں نبی نے بٹھا دیا ہے اس سے باہر مت
جاؤ۔ وہ نبی کے گھر آئی ہیں۔ یہ کہنا کہ نبی فلاں بیوی کے گھر میں رتن
ہے۔ رسول اپنے گھر میں دفن ہے۔
آخر اللہ نے رسول سے کہا

”محمد! عباد اُس بیت میں جو جس بیت میں بیٹھ جائے۔ تو بیت میں اتنی
اہمیت آجائے کہ وہ اہمیت ہوں۔ اور یہ بیت ہو۔“

بہر حال رسول اُس بیت میں آئے۔ ”قرنی“ سمجھانے کے لئے — جب ”قرنی“
سمجھانے بیٹھے — تو پہلے سے خدا اور رسول کا یہ فیصلہ تھا کہ آج ”قرنی“ کا معرہ
حل ہوگا۔ آج ”قرنی“ سمجھایا جائے گا۔ اللہ نے کہا

”رسول! ایک دم کرو — گھر کافی لمبا چڑا ہے — ایک جھوٹا سا کپڑے کا
گھر اور بناؤ — چنانچہ یہاں پادرمی ڈیرہ بنادیا — اب اس میں اکٹھے ہونے

شروع ہوئے۔ قریب۔ قریب۔
رسولؐ نے کہا۔

”حق تم آؤ، تم میرے قریب ہو۔

حسین تم آؤ، تم میرے قریب ہو،

علی تم آؤ، تم میرے قریب ہو۔

اور سیدہ تم بھی آ جاؤ۔ تم میرے قریب ہو۔“

سیدہ کے آتے ہی یہ فقرہ آتا ہے۔ ”اللَّهُمَّ اِنِّیْ حَلَوٌ لِّاَهْلِ بَیْتِیْ

اب پورے ہو گئے۔ جب یہ چاروں بیٹھ گئے آگے قریب تر۔

ان چاروں کو رسولؐ کے پاس دیکھ کر اعلیٰ حضرت نے مجلس پڑھنا شروع کر دی۔

اللہ نے اعلان کیا مجلس کا۔

”یا مَلَائِکَۃَ وَ سُلَاطِیْنُ“ خدا کی مجلس کا اعلان ہو رہا ہے۔ ”آؤ۔

لے فرشتو!۔ آؤ۔ لے آسمانی مخلوق! آج تمہیں مجلس سنائی جائے گی۔ چنانچہ

فرشتے بھی آ گئے۔ آسمانی مخلوق بھی آ گئی۔ اللہ نے بادل کے سا بان لے دیے

قوس قزح کی تقاریر لگا دیں۔ شفقت کے پردے لٹکا دیئے۔ سرین دھننی کے

گلہستے سجا دیئے۔ سنبھلہ کی بلیں پھیلا دیں۔ اعلیٰ حضرت کرسی وحدت پر تشریف

فرما ہوئے۔ ملائکہ اور سکن سُلَاطِیْنُ سامعین بن کے بیٹھ گئے۔ ہر ایک

اپنے اپنے قدم سے تشریف فرما ہے۔ اعلیٰ حضرت نے پہلے گلا صاف کیا۔

”ہم آج مجلس پڑھیں گے۔“ ہم آج تقریر کریں گے۔ نہ مولویوں والا قتال تھا۔

نہ گلے سے آواز نکل رہی تھی۔ بالکل شاعرانہ شان سے۔

سنو! لے مخلوق ہماری۔

عَزَّ وَ جَلَّ یا مَلَائِکَۃَ سُلَاطِیْنُ وَ سُلَاطِیْنُ رَفِیْہِ مَا خَلَقْتُ سَمْعَہُ

مَبْنِیَّۃً وَلَا اَرْضًا مَّدْحِیَّۃً وَلَا قَمَرًا مُّبِیْنًا وَلَا سَمًّا مُّضِیَّۃً وَلَا

فَلَمَّا بَدَدْنَا رَمْلًا فَجَعَلْنَا خَبْرًا مِنْهُمَا قُنْفُذًا بَيْنَ رِجْلَيْهِمَا فَيَكْفُؤُا عَلَيْهِمَا فَيُلْأَثِمَانِ مَوْلَاهُمَا فَرَأَىٰ تُرَابًا رَمَىٰ فِي مَحَبَّتِهِ هَؤُلَاءِ
الْخَمْسَةُ الَّذِينَ هُمُ تَحْتَ الْكِسَاءِ۔

پوری شامی میں مجلس پڑھی — مجمع بالکل موبو گیا — مست ہو گیا — اور اعلیٰ
حضرت جہوم جہوم کے پڑھ رہے تھے — جب ٹیپ کا بند پڑھا۔

”میں نے دنیا کی برائے ان کے لئے بنائی ہے جو اس چادر میں بیٹھے ہیں۔“
اس کے لئے لفظ ابلا ہے۔ ”هَؤُلَاءِ“

(یہ بھی اہل لغت سے خطاب ہے) — بس هَؤُلَاءِ کا لفظ کہنا تھا کہ فرشتے
چونکے — اور چونک کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے — کیوں فرشتو!
”تم کیوں چونک پڑے“ — تو فرشتوں نے کہا۔

”اس سے پہلے بھی تُوں چپکے ہیں — آج پھر تُوں رہے ہیں — اس
لفظ سے ہمارا پہلے بھی واسطہ پڑ چکا ہے — آج پھر ہم نے سنا ہے —
کب پڑھا تھا؟“

”جب آدم پیدا ہوئے تھے — یہی کہا تھا اللہ نے“ هَؤُلَاءِ اَنْتُمْ طَيْفِينِ

”ان کے نام تباؤ — جن کے ہم تبا نہیں کئے تھے —

اللہ نے آج پھر کہا ہے: هَؤُلَاءِ

جبریل کھڑے ہوئے اور عرض کی۔

”جان کی امان پاؤں تو کچھ عرض کروں — اگر اجازت ہو تو لوچوں — اللہ نے

کہا جا بجا تباؤ ہے — جبریل نے عرض کی۔

”میرے اللہ اس دوران تو تم نام تبا نہیں کئے تھے — آج تباؤ — یہ ہیں کون؟“

جبریل تبرا احسان ہے — تو نے نام پوچھ کے قرنی کا تعارف کر دیا

— ہیں اُن قریٰ سمجھا دیا کی ۔

اب اعلیٰ حضرت نے چادر کی طرف دیکھا — مسکرایا ۔

• ان کے نام پوچھتا ہے — بھلا تو بوجھ ۔ یہ کون ہیں ؟ —

۸

”میرے پاسنے والے ! جب چادر سے باہر آئیں جب پتہ چلتا ہے — یہ کون ہے — وہ کون ہے — اور جب پردے میں پہنچ جائیں — تو چونکہ نور واحد میں اندازہ نہیں ہوتا — اب اعلیٰ حضرت نے نام بتائے — پہلے کوثر سے ومنو کر دیا سامعین کو — پھر ایمان کی تسبیحیں پڑھوائیں ۔ الحمد للہ اور سبحان اللہ کی تسبیح پڑھوائی — جب تلب و دل سامعین کے پاک ہو گئے — تو اعلیٰ حضرت نے پہلے خود درود پڑھا — پھر سامعین و ملائکہ سے درود پڑھوایا ۔ جب درود بھی پڑھا گیا ۔ اب اعلیٰ حضرت نام لیتے ہیں ۔ سر جھکا کے ۔ پورے ادب و احترام سے اللہ نام لیتا ہے — اللہ تعالیٰ کرت کر دیا ہے ” قریٰ کا —

تعارف کا قریٰ کا — ز محمد کا برید — ز علی کا نام لیا — ز حق کا نام لیا ۔
ز حسین کا نام لیا — لیا تو کس کا نام لیا — حَمْدٌ حَاجِلَةٌ وَأَبْجُوحَا
وَبَعْلَاهَا وَمَبْنُوْهَا — چادر کے نیچے خود ناظرہ مٹھی ہیں — اُن کے ساتھ اُن کے والد بیٹھے ہیں — اور — اُن کے شرابزادہ بیٹھے ہیں — اور ان کے بیٹے بیٹھے ہیں ۔

کیوں قبلہ بلفظ بنو جع ہے یا تثنیہ ؟ — بنو جع ہے — بیٹے تو درختے — یہ جع کیوں آئی — اس سے معلوم ہوا — جع کا لفظ کم سے کم گیارہ پر بولا گیا — اس میں گیارہ بیٹے شامل ہیں — بنو ہیں — بس نام لیتے ہی دنیا سمجھ گئی ۔ یہ اب ”قریٰ“ — اب اعلیٰ حضرت کے جہ و کرم

ایک یہ کہ —

محمدؐ کہہ دو !

لَا اسئلكم عليه احيراً الى المودة في القربى :

بس یہ ہے میری قربیٰ — جس کا نام اللہ لے رہا ہے —
(اللہ نے ایمان سے کمال کر دیا۔ اگر کہہ دیتا۔ محمدؐ بیٹھے ہیں۔ اُن کے ساتھ
اُن کی بیٹی ہیں — تو اللہ جانے۔ دنیا کتنی بیٹیاں اُن کے ساتھ اور بھادیتی
— محمدؐ کے ساتھ اُن کے داماد ہیں — اللہ جانے۔ دنیا اور کتنے داماد بھادیتی
محمدؐ کے ساتھ اُن کے بیٹے ہیں — اللہ جانے۔ دنیا اور کتنے بیٹے بھادیتی)
فاطمہ کا نام لے کر یہ نس کی کہ —

محمدؐ کے عزیزوں کے ساتھ میرا کوئی واسطہ نہیں —
محمدؐ کی رشتہ داریوں سے میرا کوئی تعلق نہیں —
یہ آیا تہطیر آرہی ہے۔ صرٹ فاطمہؑ کس قرابت داروں کے لئے — اور جب
یہ آیت اُگئی — قربیٰ کا تعین ہو گیا — تو پھر —
”قَالَ عَلِيٌّ — علیؑ نے پوچھا —

”یا رسول اللہ — ہم جہاں بیٹھے ہیں۔ اس کی کیا فضیلت ہے —
رسولؐ نے اُس کی فضیلت بیان کی
جب یہ واقعہ بیان ہوا۔ خدا رحمت نازل کرے گا — فرشتے آئیں گے۔
دعائیں قبول ہوں گی۔ — علیؑ نے کہا

”یا رسول اللہ! آپ کی بدولت ہمیں بڑی سعادت حاصل ہوئی۔
چونکہ علیؑ نے رسولؐ کا شکریہ ادا کیا — رسولؐ کو پیار آ گیا — پیار سے علیؑ
کا منہ چوما — فاطمہؑ کو سینے سے لگایا — حسینؑ کو گود میں بٹھایا — اور فرمایا —
”بچو۔ بیٹو۔ عزیزو!

میرا شکریہ نہ ادا کرو۔

کیوں؟

”میری وجہ سے تمہیں فضیلت نہیں حاصل ہوئی“

پھر کیا ہے؟

”اَنَا بَشَرٌ مَثَلَكُمْ“ میں بھی تمہارے جیسا بشر ہوں۔

یہ آیت صرف اسی موقع کے لئے ہے۔ اور کسی سے رسولؐ نے کہا ہی نہیں کہ۔
”میں تم جیسا بشر ہوں۔ اَنَا بَشَرٌ مَثَلَكُمْ۔ بہر نوع ”قربی“ کا تعین ہو گیا۔ جس
سے موت و شفاعت، بنے گی۔

اب بناؤ مگر قیامت میں شفاعت چاہتے ہو۔ تو بغیر قیمت کے نہیں ملے گی۔
نمازوں سے شفاعت نہیں ملے گی۔ روزوں سے شفاعت نہیں ملے گی۔ اگر تم
نے نائی کا چادر نہ ہفتہ بچالیا۔ اس سے شفاعت نہیں ملے گی۔ یہ وردی ہے سلمان
کی۔ واڑھی ہونا یہ وردی ہے۔ بے وردی پا ہی کچھ اجائے تو سزا ہو جاتی ہے
یہ وردی ضرور چاہیے۔ مگر تم اس سے شفاعت چاہو۔ یہ نہیں ہوگا۔ اللہ
نہ تمہارے بالور سے مرعوب ہوتا ہے۔ نہ تمہاری جماعتوں سے مرعوب ہوتا
ہے۔ نہ تمہاری جمیعتوں سے مرعوب ہوتا ہے۔ نہ تمہاری کثرت سے مرعوب
ہوتا ہے۔ اللہ یہ ان چیزوں کا کوئی رعب نہیں ہے

اگر شفاعت چاہتے ہو قیامت میں۔ تو قربی“

کی موت دینا پڑے گی۔ اس کے بغیر شفاعت نہیں ہوگی۔ اب اگر اس قربی“
کی شفاعت چاہتے ہو۔ تو اللہ کے احکام کی تعمیل کرنا پڑے گی۔

نمازیں اس لئے پڑھنا ہوں کہ قربی“ کا ہو جاؤں۔

روزہ ہمیں اس لئے رکھنا پڑتا ہے کہ قربی“ کے ہو جائیں۔

ہمیں سچ اس لئے بولنا پڑتا ہے کہ "قربانی" کے ہو جائیں —

ہمیں آپس میں محبت اس لئے کرنا پڑتی ہے کہ قربانی کے ہو جائیں —

اتحاد و اتفاق اس لئے رکھنا پڑتا ہے کہ ہم قربانی کے ہو جائیں —

شفاعت جب ہوگی جب ہم قربانی سے مروت کریں گے —

صحابان! بات ختم کرتا ہوں۔ انشاء اللہ قیامت کے دن ہم جائیں گے قیامت

ہیں — ایک دوسرے کو ہم پہچانے گے — وعدہ کرو مجھ سے — اگر مجھے فرشتے ہنگامہ دے رہے ہوں جارہے ہوں جہنم کی طرف — تو تم شور مچا دینا —

”مختار“ — کہاں لے جا رہے ہو — ہم آئے پیر محل والے — پہلے ہمیں مجلس

کر لینے دو — ”بس مجلس کا لفظ آیا نہیں“ — اور فرشتوں کی مجال نہیں جو مجھے چھوڑ

نہ دیں — قیامت کے دن دیکھنا — تم منظر شفاعت کا — وہاں نہ

رسول شفاعت کریں گے — نہ انبیاء شفاعت کریں گے — وہاں شفیع روزِ حرا

ہی قربانی ہوگی — اس کی تم مروت کرو — یہ وہاں تہااری شفاعت کرے گی۔

— کیا سناتوئیں نے یہ بھی تھا علامہ سے — پڑھا بھی ہے کتابوں میں — کہ قیامت

میں زلزلہ آجائے گا — دہل جائیں گے قیامت والے — ابراہیم جیسے جلیل القدر

پنیر گھٹنوں کے بل کھڑے ہو جائیں گے — یہ ہول کی ہوگی قیامت کی — کب

— جب شور مچے گا — قیامت والوں — خردار — بشیر — ناطق — اپنا

مقررے کر آئی ہے — خدا کی کچہری میں — اللہ کی عدالت میں ستیہ آئی

ہیں — مقررے کر — اور ستیہ جھکتی ہوئی — سنبھلتی ہوئی — ڈرتی ہوئی

آئیں گی — آواز آئے گی —

”وہی“ — جھکتی کیوں ہو — تو آپ فرمائیں گی۔

مجھے عدالت کا بڑا سحت تجربہ ہے — مجھے مقدمے کا بڑا تلخ تجربہ ہے —

خداوند! — آج میں اپیل لے کر آئی ہوں۔ تو نے قیامت تاریخ رکھی تھی اپیل کے لئے آج میں اپیل کر رہی ہوں —

خداوند! — پہلا تو میرا دعوئے یہ ہے کہ بھرے مجمع میں مجھے جھوٹا کہہ دیا — اور خداوند! — دوسرا دعوئے یہ ہے کہ میرے گھر میں ایک دن میں بہتر قتل ہو گئے — خداوند! میرا جو مقدمہ قتل ہے — اُس قتل کے مقدمے کے لئے ایک عینی گواہ پیش کرنا چاہتی ہوں — ”اڈا آئے گی — وہ کون ہے؟ —“ بی بی فرمائیں گی۔ ”خداوند! — وہ میری بیٹی زینب ہے — وہ چشم دید گواہ ہے۔ میرے بہتر کے قتل کا —“ اب عدالت الہی کی طرف سے گواہ کی طرف سے جاری ہوں گے اور عدالت کا سمن لے کر حورانِ جنتِ شام جائیں گی — ”بی بی زینب! تمہیں اللہ کی عدالت نے بلایا ہے — اٹل کے مقدمے کی گواہی دو —“

”میں اُسی طرح آنا چاہتی ہوں قیامت میں جس طرح شام کے بازار میں گئی تھی۔ اس شکل سے زینب آجائے گی — اونٹ پر بیٹھی ہوئی — زین العابدینؑ مہار کچرے بوزے۔ شہیدوں کے سر ساتھ ساتھ — اور ہم سب گرد اکٹھے ہو جائیں گے۔“ بی بی! ساری عمر روتے رہے۔ آج تو آئی ہے — ہمارا پُرسا لے — بی بی کہیں گی —

”اب آج مقدمے کا فیصلہ یہی ہے کہ میں تمہاری شفاعت کروں گی۔“

بی بی! — تو موت کا ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں — اتنا ثبوت ہم دیتے ہیں کہ تیرے غم میں غم کیا تھا — تیری خوشی میں خوشی کی تھی — جس دن تمہارا غم کا دن تھا اُس دن ہمارے گھروں میں آگ نہیں جلی تھی — اُس دن ہمارے بچوں تک نے ماتہ کیا تھا — آپ دیکھ رہی تھیں —

ہماری عورتیں ننگے سر زمین پر بیٹھیں تھیں — ہم نے ماتم ماتم کر کے خون بہا دیا تھا — اور جس دن آپ کے گھر خوشی تھی — جس دن آپ کے گھر ولادت تھی اُس دن ہم نے شاندار جلسے کئے تھے — اُس دن ہم نے روشنیوں کی جھلکیاں — اُس دن ہم گٹے لگے تھے — اُس دن ہم نے ایک دوسرے سے مصافحے کئے تھے — اُس دن ہم نے ایک دوسرے کو مبارکباد دی تھی — جس کا ثبوت آج گلستانِ رضویہ — (درد آباد) میں امامِ رضا کی ولادت ہے — آج ہمارا عیدِ گادَن ہے — آج ہماری خوشی کا دن ہے —

آج ہماری جڑی سترت کا دن ہے
 ہمیں رونے کا غنہ دینے والے! کبھی ہمارا ہنسنا بھی دیکھ جایا کر — آج ہمارا خوشی کرنے کا دن ہے — آج ہمارا مبارکباد کا دن ہے —
 آج ہم ساری عمر قید میں زندگی بسر کرنے والے باپ کو اُس کے بیٹے کی مبارکباد دینے جا رہے ہیں — آج ہم نے رسولِ مَدِ اَل رسول کو مبارکباد دینی ہے امامِ رضا کی ولادت پر تہنیت کرنی ہے — اللہ کا ہم شکر ادا کرتے ہیں — رسولؐ کو ہم مبارکباد پیش کرتے ہیں اور عرض کرتے ہیں کہ
 مولانا — یہ زمانے کا دستور ہے کہ جب شہنشاہوں کے گھر کوئی ولادت ہو تو وہ اپنی رعایا پر دو قسم کے انعام فرماتے ہیں —

۱۔ قیدیوں کو رہا کیا جاتا ہے — اور
 ۲۔ رعایا میں انعام تقسیم کیا جاتا ہے —
 ہم میں سے جو کُن برس کی قید میں قید ہیں — آج کے صدقے میں اللہ انہیں آزاد کر دے — اور

دوسرا انعام ہمیں کیا ملے گا؟ — ہم نہیں مانگتے —

اس لئے کہ اگر ہم نے بڑی سے بڑی شے بھی مانگی تو وہ ہماری حیثیت کی بڑی
 ہوگی — اور تو اگر چھوٹی سے چھوٹی شے بھی مانگا کرے گا — تو وہ تیری حیثیت کی چھوٹی
 ہوگی —

یہ انعام ہم تمہاری مرضی پر چھوڑتے ہیں —
 جو مناسب سمجھو — ہمیں دے دو —
 اللہ! ہمارے دلوں میں موتِ محمدؐ و آلِ محمدؐ پیدا کرے۔
 اُن کی موت کے ساتھ زندہ رہیں۔ اور اُن کی موت کے ساتھ دم نکلے۔
 • بحقِ محمدؐ و آلِ محمدؐ •

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ
 اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّآلِ مُحَمَّدٍ

(نذ)

جب چیزیں ہوں تو
 ایک ہو کر کئے والی ایک ہو کر نہ ٹوکنے والی
 تو
 بُت پرستی کی عادت یہ کہلوادے گی
 کہ
 ”ہمیں نہ ٹوکنے والی کافی ہے۔“
 (خطیبِ آلِ محمدؐ)

آنکھ

۱ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

خداوند عالم کی حمد و ثنا کے بعد حضرات محمد و آلِ محمد پر درود و سلام۔

حضرات گرامی قدر اگر می بڑی شدید ہے۔ آپ صاحبان اس گرمی میں یہاں تشریف لائے ہیں۔ میں آپ کو دو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ پہلی مبارک تو اس بات کی کہ سید الشہداء کے دربار میں آپ لوگوں کو حاضری دینے کا شرف ملا ہے۔ دوسری مبارک اس بات کی کہ آپ جبرئیل کے پروں کی طرح ذوالفقار کی زد میں آئے ہوئے تھے اللہ نے آپ کو بچا لیا۔

میرے سامعین! مجھ سے پہلے حضرت علامہ حافظ سید ذوالفقار علی شاہ مدظلہ العالی یہاں وعظ فرما رہے تھے۔ میں بھی نیچے بیٹھا ہوا اُس رہا تھا۔ زیادہ کچھ تو مجھے یاد نہیں رہا۔ صرف اتنا یاد ہے کہ قبلہ حافظ صاحب کچھ آنکھوں کے بارے میں خطاب فرما رہے تھے۔ لہذا میں بھی چاہتا ہوں کہ آنکھوں کی بات ہی کی جائے چھوٹا کھٹ یہ ہے کہ آنکھ سے آنکھ لڑے تو بات کا لطف آئے گا۔۔۔

اللہ نے بڑی نعمت عطا فرمادی ہے۔ یہ آنکھ۔ آنکھ کے بغیر دنیا آباد ہی نہیں۔ جس کی آنکھ نہیں اُس کے لئے دنیا آباد ہی نہیں۔ دانت کئے کھانے کا سوا دگیا۔ آنکھیں گئیں دنیا کا لطف،

گیا۔ یہ آنکھ بڑی عجیب شے ہے۔ جو خدا نے بنائی ہے۔ اب میں اپنے نوجوان عزیزوں کو جو کالوں میں پڑھتے ہیں۔ آج کل کی فضا میں پرورش پاتے ہیں۔ سیاست کے میدان میں رہتے ہیں۔ جو نہیں گھنٹے

سیاسی گفتگو کرتے ہیں۔ اور خدا جانے کیا کیا باتیں کرتے ہیں۔ جو ہم جیسے بڑھوں کی سمجھ میں نہیں آتیں

اُن کی خدمت میں یہ عرض کرتا ہوں کہ انسان کا بدن ایک ملک ہے سر سے پیر تک تبتا ہی بن

ہے۔ یہ ایک ملک ہے۔ اس ملک میں جنگل بھی ہے اس ملک میں صحرا بھی ہے۔ اس ملک میں دریا بھی

ہیں۔ اس میں بڑیوں کے پہاڑ بھی ہیں۔ نزعی ہر شے اس ملک میں موجود ہے۔ پورا بدن انسان کا ایک ملک ہے۔

اب اس ملک میں بہت سی قومیں آباد ہیں۔ ایک قوم کا نام ہاتھ ہے۔ ایک قوم کا نام پاؤں ہے۔ ایک قوم کا نام ناک ہے۔ ایک قوم کا نام سر ہے۔ مختلف قومیں میں جو بدن کے ملک میں آباد ہیں۔ آپس میں ایک دوسرے کی مدد کرتی ہیں۔ تو ملک آباد رہتا ہے۔ ہاتھ یہ کی مدد کرتا ہے ہوش ہوش کی مدد کرتا ہے۔ یہ مدد کرتے ہیں تو ملک آباد رہتا ہے۔ اور اس مدد کرنے میں کبھی بھی لڑائی بھی ہو جاتی ہے۔ لڑائی ہونا بھی ملک کے لئے ضروری ہے۔ لڑائی کے بغیر بھی گزارا نہیں۔ لڑائی بھی زندگی کی علامت ہے۔ دیکھو نا۔ اگر یہ زمین سے نہ لڑیں تو راستہ کیسے طے ہو۔ راستہ جب ہی طے ہوتا ہے۔ جب پیروں کی زمین سے لڑائی ہوتی ہے۔ روٹی سے لڑائی ہو جائے تو پیٹ بھرتا ہے۔ پانی سے لڑائی ہو جائے تو پیاس بجھتی ہے۔ کھیت میں بل جی چا دو تو فصل آتی ہے۔ لب سے لب لڑے تو بات بنتی ہے۔ تالو سے زبان لڑے تو الفاظ نکلتے ہیں۔ پک سے پک لڑے تو آنکھ دکھائی ہے اور آنکھ سے آنکھ لڑے تو سوا آتا ہے۔ لڑائی بھی ضروری ہے۔

مہر نوح انسان کا بدن ایک ملک ہے۔ اس میں بہت سی قومیں آباد ہیں۔ کوئی قوم آنکھ ہے۔ کوئی قوم پیر ہے کوئی قوم سر ہے کوئی قوم ہاتھ ہے۔ کوئی قوم ناک ہے۔ اور پاؤں اس لئے اکڑتے ہیں کہ وہ تعداد میں زیادہ ہیں۔ قسمت میں جڑتے ہیں۔ تعداد تو ان کی بہت زیادہ ہے۔ سارے ملک میں۔ بدن کے سارے ملک میں سب سے زیادہ تعداد جو موجود ہے وہ پیروں کی ہے۔ مگر ان کی قسمت میں جڑتے ہیں۔ ان سے کم تعداد ہاتھوں کی ہے۔ مگر یہ اپنے کاموں سے اتنے شرمندہ ہیں کہ اگر انہوں نے صحیح صحیح کام کئے ہوں تو اپنے مالک کے سامنے بالکل صحیح حالت میں جاتے ہیں۔ دھڑکے کوئی بُرے کام کئے ہوں اس قوم نے۔ تو مالک کے سامنے شرم کے مارے بغلوں میں منہ چھپا لیتے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس قوم نے کوئی بُری حرکت کی ہے۔ ہاتھوں سے کوئی ناقابلِ عمل عمل ہوا ہے۔ جب ہی تو مالک کے سامنے شرم کے مارے بغلوں میں منہ چھپائے

ہوئے ہیں۔ نیک ہوتے تو صاف سامنے کھڑے ہوئے ہوتے۔

بندہ پرور! اس ملک میں ایک ٹکڑہ ہے۔ جو سینہ کہلاتا ہے۔ اس سینے کے اندر اس ملک کا پایہ تخت ہے۔ اس پایہ تخت میں اس ملک کا بادشاہ رہتا ہے۔ ساری رعایا آرام کرتی ہے۔ وہ دھڑکتا رہتا ہے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اُس نے اپنا دھڑکتا بند کیا ہو جس دن بادشاہ حرکت بند کر دے گا۔ ساری رعایا ختم ہو جائے گی۔ نہ الجھڑے میں آتا ہے۔ نہ دیکھنے میں آتا ہے۔ ہے تو غائب۔ مگر ہے بادشاہ۔ اُس کی بدولت تمام رعایا زندہ ہے۔ ہاتھ کام کرتا ہے دل کی بدولت۔ زبان بولتی ہے دل کی بدولت۔ آتا ہے دل۔ جاتا ہے دل۔ پسند کرتا ہے دل۔ ناپسند کرتا ہے دل۔ زندگی ہے دل۔ جب ہی تو زندگی کو اُرد زبان میں "جی" کہتے ہیں۔ (میراجی جاتا ہے، دل بادشاہ ہے اس ملک کا۔ اور اس کا وزیر ہے دماغ۔ دماغ مشورے بتاتا ہے۔ بادشاہ اُسے منظور کرتا ہے پھر ساری قومیں کام کرنا شروع کر دیتی ہیں۔ اب لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں۔ زیدی صاحب! یہ غلط کہہ دیا تم نے دل بادشاہ ہے۔ دماغ وزیر ہے۔ وزیر بیٹھا ہے اوپر بادشاہ بیٹھا ہے نیچے۔ دماغ کو نیچے بیٹھنا چاہئے تھا۔ تو اب انہیں کون سمجھائے۔ کہ یہ دل خدا کا بنایا ہوا بادشاہ ہے۔ دماغ اللہ کا بنایا ہوا وزیر ہے۔ اور اللہ کے بنائے ہوئے وزیر، بادشاہوں سے اوپر رہتے ہیں کسی کو تعین نہ آئے تو لعین میں جا کے دیکھ لو۔ بہر حال دل ہمارا بادشاہ ہے۔ دماغ ہمارا وزیر ہے۔ ہاتھ پاؤں جو ہیں یہ قومیں

ہیں۔ اور ان کے درمیان سعدہ شریف ہیں۔ یہ وزیر خزانہ ہے تمام خوراک دماغ کو باہر سے آتی ہے ان میں آتی ہے یہ پھر اُسے تقسیم کرتے ہیں۔ جتنی آپ نے روٹی کھائی نا آج۔ اُس روٹی سے بدن میں چار چیزیں بنتی ہیں۔ ایک کا نام ہے بلغم۔ ایک کا نام سُفرہ۔ ایک کا نام سودا۔ اور ایک کا نام ہے خون۔ یہ چار چیزیں بنتی ہیں تمہاری غذا سے۔

اب میں تم سے نہیں پوچھنا کسی ڈاکٹر سے پوچھ لو کسی حکیم سے پوچھ لو کہ تمہاری غذا سے کتنی چیزیں نکلیں گی۔ مگر یہاں سے بتاؤ چاروں ایک جیسے بلغم، سُفرہ، سودا، خون کے قابل۔ سو دماغ دینے کے قابل۔ دماغ آخری خون بدن میں گھسے کے قابل۔ اپنے خون کی نشان دہی اور ہے۔ بلغم لاکھ چیزیں مارے کریں یہی اکی جگہ سے ہا ہوں۔ لیکن خون خون ہے۔ بلغم بلغم ہے۔ جگر جگر ہے۔ دگر دگر ہے۔

اور یاد رکھو بزرگوار! انسان کی عادتیں، سیرت میں، مزاج میں اثر کرتا ہے خون! آپ نے وہ لطیفہ سنا ہو گا کہ ایک بے چارہ مولوی تھا۔

مسجد اذان دیا کرتا تھا۔ وہ سو کیا بیمار۔ داخل ہوا ہسپتال میں۔ اُسے ضرورت پڑی نوہ کی اتفاق سے۔ وقتی طور پر غوی تل سکا۔ اور وہ اگیا جو شادی بیاہ میں من بلائے آجاتے ہیں۔ وہ اب اُسے اگیا کہوں یا اگئی کہوں بہر نوع وہ اگیا تو ڈکڑنے اُسی کا خون دے دیا۔ مولوی صاحب اچھے ہو گئے۔ اب چونکہ اُس کا خون آیا تھا بدن میں۔ اُس کی تاثیر کیا ہوئی۔ کہ جب مولوی صاحب نے مسجد میں جا کر کبھی اذان۔ اور جب ”مسی الصلوٰۃ“ پر پہنچے تو تالیاں بجانا شروع کر دیں۔ خون کا اثر تھا۔ اگر آدو پاؤ خون کا اثر بدن میں ہوگا ایک مولوی سے تالیاں بجا سکتا ہے تو بتاؤ اُس کے خون کی کیا تاثیر ہوگی جس سے رسوا یکے! تیرا سارا خون میرا خون ہے۔

بہر نوع۔ غذا سے چار چیزیں بنتی ہیں۔ بھج، سنا، سودا اور خون۔ اور ہمارا معدہ وزیر خزانہ ہے۔ یہ غذا کو تقسیم کرتا رہتا ہے۔ خون کی جگہ خون بھیج دیا۔ بھج کی جگہ بھج بھیج دی۔ جہاں جہاں جس کا ٹھکانہ ہے اُسے بھیج دیا۔ اور

اسی ملک میں جہاں سر بھی آباد ہے۔ جہاں ہاتھ بھی آباد ہیں۔ جہاں پیر بھی آباد ہیں۔ جہاں ساری قومیں آباد ہیں۔ اسی ملک میں آنکھ بھی آباد ہے۔ یہ بھی ایک قوم ہے۔ ہاتھوں سے چھوٹی بے پروں سے چھوٹی بے تعداویں سب سے کم ہے گویا آنکھیں ملک کی اقلیت ہیں۔ گو کیا علاقہ کیا جاگہ اکثریت کی قسمت میں وہ بات نہیں ہے۔ جو اقلیت کی قسمت میں ہے یہ پیر یا خدا اکثریت میں ہیں۔ ان کی قسمت میں چیز نہیں جو اقلیت والی قوم آنکھ کی قسمت میں ہے۔ اور وہ کیا۔ نور اور رونا جو کسی ملک میں اقلیت ہوا۔ اللہ سے نور بھی دیتا ہے۔ اُسے رونا بھی دیتا ہے۔ اور جہاں نور نہ ہو وہاں رونا سہمی نہیں ہے۔ تو اقلیت کو کہے نور کا مرکز۔ اکثریت کو راستہ دکھاتی ہے۔ پاؤں چل نہیں سکتے اگر اقلیت رہبری نہ کرے۔ ہاتھ کام نہیں کرتے اگر اقلیت رہبری نہ کرتے۔ جب تک اقلیت کو قاتل اعظم نہ بناؤ تو من کام نہیں کرتیں۔ آنکھ رہبری کرتی ہے۔ پورے ملک میں کہیں بھی چوٹ لگ جائے آنکھ فوراً پہنچ جاتی ہے۔ اور جا کر اُس کی مدد کرتی ہے کہیں کوئی گستاخ ہو وہیں شفا ہو جاتی ہے اس آئینہ کی حفاظت

کا اقد نے یہ انتظام کیا ہے کہ سات پردوں کے پیچھے معشوقہ نور کو آرام سے بٹھا کر سامنے اس کی مسہری کے پردے لٹائے۔ پردوں کے بعد ملکوں کی چمن لٹکانی۔ اُس کے اوپر حبا کر لٹکائے تاکہ آنکھ دیکھنا چاہے تو ملکین چھو کے پہنچے آئینے کو صاف کر دیں۔ پھر معشوقہ چشم آنکھ سے نکلنے کا ارادہ کرے۔ بڑی دوا سے لٹکتا ہے نور آنکھ سے۔ آنکھ میں خراش نہیں آتا۔ دروازہ نہیں کھلتا بلکہ ہلکی نہیں کھلتی۔ نور سات پردوں سے سر کر رہا ہوا ہے۔ آسمان تک پہنچا۔ پھر آیا۔ نور کی رفتار ہے کہ ملکوں کی رنجیریں ہتی رہیں اور نور آسمان پر جا کے بوسہ بھی آیا۔

یہاں آنکھوں میں نور رہتا ہے۔ دلی نور کے ساتھ کالے رنگ کی تیلیاں بھی ہیں۔ نور سے کھڑکی میں کالے رنگ کی تیلیاں۔ ساری عمر کوئی نور کے گھر میں رہتے ہوئے۔ گھر یہ نامراد دھبی ہالی کی کالی میں لیکھا کیا، انہوں نے اپنی فطرت سے کہ وقت بڑے تو پتہ چلیں۔ اور ان تیلیوں کے اندر اللہ نے پانی کا حوض رکھا ہے۔ اگر باہر سے نور سا بھی کوئی دروازہ آجائے تو فوراً حوض سے پانی بہا کے صاف کر دیا جائے۔ چونکہ آنکھ تارک ہے اسلئے باہر کی چیز کو برداشت نہیں کر سکتی۔ بڑے سے نفرت کرتی ہے۔ اچھے سے رغبت کرتی ہے۔ سترہ جو تو خوشی سے دیکھنے کی کئی کئی ہفتوں نہ پھیرے گی۔ آنکھ میں یہ کمال ہے کہ ہر دوسرے سے نفرت کرتی ہے۔ اچھپوں کو پسند کرتی ہے اور یہ اقلیت کا درجہ ہے کیونکہ اس میں نور ہے۔ پھر اللہ نے ایک اور کام کیا ہے کہ آنکھیں دو بنا دیں۔ اگر ایک ہوتی دو کی بجائے تو اللہ کو کوئی نقصان تھا۔ نہ تو کوئی اعتراض تھا۔ ... مگر اللہ نے کہا: "نہیں دو بنائی ہیں چونکہ نور ہے اور نور میں نہیں جھپٹتا۔ جب تک دو نہ ہوں۔ ایک نور کبھی آج تک جھپٹا ہی نہیں جب بھی نور جیسا دو کر کے جھپٹا تاکہ اگر ایک نور جیسا بنے تو دوسرا نور اُس کی جگہ کام دے گا۔ اللہ سب کو نور دینا میں جھپٹتا ہے۔ تو اُس کا دھی بھی ساتھ ہی جھپٹتا ہے بغیر دھی کے نور کے پہلا نور ہی نہیں سکتا۔

اب اگر اللہ کر بیٹھو عزیزو۔ اگر خدا نخواستہ آنکھ چل جائے گی تو ہم ناک سے دیکھ دیکھیں گے

ہم کہتے ہیں "دیکھو ناک سے" اور تم کہتے ہو "ناک کی تو بین کرتے ہیں ہم"۔ اسی سے تو کہتے ہوں مجلس میں نہ جایا کرو۔ یہ ناک کو برا کہہ رہے ہیں۔ ناک نہیں دیکھ سکتی ہ۔۔۔ ویسے ناک چہرے کی ناک ہے۔ ناک

کی خاطر گھبرا جاتے ہیں۔ تاک کی خاطر کنبے تباہ ہو جاتے ہیں۔ تاک کی خاطر نکل و غارت ہو جاتی ہے۔ تاک بڑی عزت کی چیز ہے۔ پھر اس کا کیا علاج کیا جائے۔ تاک چاہے جتنی ہی عزت کی شے بھی کمزوری جگہ تو نہیں لے سکتی۔ بس اتنی بات کہتے ہیں کہ تاک نور کی جگہ نہیں لے سکتی۔ اسے تم کہتے ہو "برا کہتے ہیں" میرے ماسین! آنکھیں میں تو دو۔ مگر جب بھی دیکھتی ہیں ایک۔ کوئی فرق بیان کر سکتا ہے۔ یہاں تک ایک آنکھ نے دیکھا۔ یہاں تک دوسری آنکھ نے دیکھا۔ دو ہونے کے باوجود نظر ایک ہے۔ یہ نہ تو کاملانہ کہ جو دو مگر نظر ایک ہو۔ جو داہنی دیکھ رہی ہو۔ وہی بائیں دیکھ رہی ہو۔ کیا محال جو ان دونوں میں فرق آتا ہے۔ یہ بھی آنکھ کا محال ہے۔ اور یہ سے مخم نہ کرو!

یہ بھی سن لو میری قدر کا آخری فقرہ۔ "آنکھ نازک تو اتنی کہ ذرا سا زیادہ جی برداشت نہیں کر سکتی اور طاقتور اتنی کہ خدا کرے جو کہیں رہ جائے۔" اگر یہ لڑ جائے تاکہیں۔ تو سب ہی بچ دیتی ہے اور یہ نور کی صفت ہے کہ نہ زناکت دکھائے پر آئے۔ تو جو کی روٹی کھانا لگائے سے ٹوٹے۔ اور اگر دلا جائے تو خیر کے در نہ روکیں۔ پہلوانوں کے سر نہ روکیں۔ حد یہ کہ جبریل کے پر نہ روکیں۔ نہ اُس کی زناکت۔ کوئی حد ہے نہ اُس کے ٹٹ کی کوئی حد ہے۔ اور اللہ تمہیں مجھے سب کو اس نور کی نعمت سے محروم نہ کرے۔ یہ بڑی عجیب شے ہے۔ یہ بڑی نعمت کی چیز ہے۔ اور

نور کی آنکھ کی توشان بن ازلہ ہے۔ اس آنکھ کی قیمت وہ کوئی اندازہ کر سکتا ہی نہیں۔ خدا ماننے کوئی ہزار دفعہ تمہاری آنکھ سے یہ دے کے دُمال سے صاف روٹی ہے۔ اور ستیہ
مردمان کو کرتی کیا ہیں۔ آنکھ صاف کی اور مردمان اپنی سچی زینب کو دے اور فرمایا۔ "یہی زینب! میں زینب جانی کا مرہم لاتی ہوں۔" اور زینب اپنے منہ کی کے زخموں کا مرہم بنا لیتی ہے۔ اور یہی بھائی مل کر اللہ سے دعا کرتے ہیں۔ خداوند! — دیکھ لے۔ یہ قوم اپنے گھروں کو چھوڑ کر اپنی آسائش و آرام کو چھوڑ کر یہاں قائم کر رہی ہے۔ تمہاری آنکھوں کی بڑی عزت ہے۔ تمہاری آنکھوں کی بڑی قدر ہے۔

بس بھائیو۔ میرا بیان ختم ہو گیا۔ قیامت کو سب ایک لوتھم ہو جائے۔ آنکھیں بند کر دو۔
 مگر مومن اپنی آنکھیں کھلی رہنے دے گا۔ اس لئے کہ مومن کی آنکھوں سے
 شیدو مانوس ہے۔ وہ مومن کی آنکھوں کو دیکھتی رہی ہے۔ اور ایک موقعہ ایسا آئے گا جب خود بخود
 مومن کی آنکھیں بند ہو جائیں گی۔ اور وہ موقعہ جب آئے گا۔ جب قیامت میں اعلان ہوگا۔
 قیامت والو۔ یا ادب بلا حظہ بشیر!

عہد کی جیسی کو سواری آ رہی ہے۔ کوزینب کہے گی یہ اسی طرح آؤں گی جس طرح
 شام کے بازاروں میں گئی تھی۔ تاکہ قیامت والے جی دیکھ لیں۔ کوزینب کس شان سے شام کے بازاروں میں
 گئی تھی۔ انبیاء، تھوڑے کاٹتے ہوں گے۔ اولیاء نررتے ہوں گے۔ اور زین العابدین کے
 ہاتھ میں مہار ہوگی۔ علیؑ سرخو کاٹے زین العابدینؑ کے ساتھ ہوں گے۔ حسنینؑ تاقے کے دائیں بائیں ہوں گے
 اور زینب سرنگے۔ بال کٹے ہوئے۔ ہاتھ گردن کے ساتھ بندھے ہوئے۔ بالکل اسی طرز آنے کی جس طرح
 شام کے بازاروں میں آئی تھی۔ اور کہے گی۔ "نداوندا میں آگئی ہوں۔" اس وقت تم ہو گا خدا
 کی طرف سے۔ زینب کے غلام کہاں ہیں۔ تو کروڑوں کی تعداد میں لوگ اکٹھے ہو جائیں گے۔
 زینب کے تاقے کے گرد ماتر شریعہ کر دیں گے۔

قیامت میں ماتم کی آواز بلند ہو جائے گی۔ تو اللہ کہے گا۔
 "بس قیامت ہوئی۔ یہ قیامت نہیں کوئی۔ ماتم داروں کو ایک طرف کر دو۔ تماشاہوں کو ایک طرف کر دو۔"
 "اُدھر زینب اپنے چھوٹے بھائی کو حکم دے گی۔" عباسؑ بھائی! اپنے علم کا پیرہ کھول دو۔ ان ماتم کرنے والوں کو اپنے علم کے زیر سایہ میرے علم کے سامنے آؤ میں
 ایک ایک کا مزاج پوچھوں گی۔ ایک ایک سے زینب بات کرے گی۔ "برخوردار تو نے
 حسینؑ کا ماتم کیا تھا۔" سورتوں سے زینب کہے گی۔ "اُدھو ہنو۔ میرے کئے ہو۔ میرا
 حسینؑ کر بلا میں ذبح ہو گیا۔" تو جو انو۔ تم سے علیؑ اکبرؑ پوچھیں گے۔ "میرے ہم سن نو جو انو
 تم نے ماتم لیا تھا۔" ادھر آؤ۔ تیرے کوئی زخم تو نہیں۔" اور جب ہم اپنے زخم دکھا چکیں گے۔
 تو ہم عرض کریں گے۔ "شہزادہ عالم! اگر مناسب ہو تو ذرا اپنا زخم بھی دکھا دو۔" علیؑ اکبرؑ کہیں گے۔

"میرے زخموں کا سرمہ بن گیا ہے تمہارا ماتم۔"
 "وَمَا تَلَّكَ أَنَّكَ السَّمْعُ الْعَلِيمُ"
 Presented By: www.jafrilibrary.com

جہاد اکبر،

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

”خداوند عالم کی حمد و ثناء کے بعد حضراتِ محمد و آلِ محمدؐ پر درود و سلام“
حضراتِ محترم! معاف کرنا۔ آج مجھے معلوم سے دیر ہو گئی۔ اور وہ میرے بس کی بات
نہیں ہے۔ اس لئے کہ ہم دنیا میں معصوم تو آئے نہیں۔ معصوم تو وہی لوگ تھے جنہیں خداوندِ عالم
نے معصوم پیدا کیا تھا۔ کوئی بننے سے تو معصوم بنائے نہیں۔ جسے اللہ معصوم پیدا کرے وہی معصوم
ہے۔ اور اگر کوئی معصوم بننا چاہے۔ تو یہ ہماری معصومیت ہے جو ہم معصوم بنائیں گے یہ نہ
سوچیں کہ یہ آدمی ہمیں بنا رہا ہے۔

بہرِ نوع معصوم وہی ہے جسے اللہ نے معصوم پیدا کیا ہے — لفظ در معصوم، جو
ہے۔ یہ لفظ ”عصمت“ سے بنا ہے۔ عصمت کے معنی ہے پاک۔ جو بقدر زیادہ برائیوں سے
پاک ہوتا جائے گا۔ اتنا ہی زیادہ وہ معصوم ہوتا چلا جائے گا۔ اور یہ ضروری نہیں کہ ہر جگہ
جہاں ”عصمت“ کا لفظ بولا جائے۔ وہاں اس کے معنی یکساں ہوں۔ معصوم کا لفظ جہاں بھی بولا
جائے، اس میں سارے معصوم یکساں ہوں۔ یہ نہیں ہو گا۔ معصوم ہونا اور بات ہے
اور ہر معصوم یکساں ہو۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ آدم کی معصومیت اور بات ہے۔ خاتم کی معصومیت
اور بات ہے۔ چونکہ ہم چودہ معصوم کی معصومیت میں رہتے ہیں ہر وقت۔ اس لئے ہمارے
سامنے جب لفظ معصوم آئے۔ ہم ہر معصوم کو اسی میزان سے ناپتے ہیں جو ہم نے بنا ہے۔
حالانکہ ان کی معصومیت اور ہے۔ ران کی معصومیت اور ہے۔ فرق کیا ہے۔؟

باقی مسموم جو ہیں۔ وہ وہی کام کرتے ہیں جو ٹھیک ہو۔ وہ کبھی غلط کام نہیں کرتے۔ ہمیشہ وہی کام کرتے ہیں جو درست ہو۔ اور یہ چودہ جو ہیں۔ یہ پہلے ٹھیک نہیں سوچتے۔ بلکہ یہ جو بھی کر دیتے ہیں۔ وہ ٹھیک ہے۔ یہ فرق ہے ان کی معصومیت میں اور ان کی معصومیت میں۔ پہلے وہ حق کو تلاش کرتے ہیں۔ پھر حق کے پیچھے چلتے ہیں۔ اور حق انہیں تلاش کرتا ہے۔ حق ان کے پیچھے چلتا ہے۔ ان کی معصومیت کی شان اور ہے۔ ان کی معصومیت کی شان اور ہے۔

مہر نواز۔ اللہ جنہیں معصوم پیدا کر دے۔ وہ پیدا ہی معصوم ہوتا ہے۔ اور پھر اُسی وقت سے معصوم کی پرورش اس کی خوراک، اور اس کی ضروریات۔ عصمت کے لحاظ سے ہوتی ہیں۔ اس لئے ہر معصوم پر صدقہ حرام ہے۔

حالانکہ صدقہ پاک ہے۔ صدقہ کوئی نجس چیز تو ہے نہیں۔ مگر معصوم کی معصومیت کے لئے نامناسب ہے۔ اسی لئے یہ حدیثیں مشہور ہیں مسلمانوں میں۔ کہ مسلمان جب کوئی کھانے پینے کی چیز حضور کی خدمت میں لاتے تھے۔ کوئی فرد ط لاتے ہوں گے۔ اور وہ بھی عرب کا فرد ط کھجور وغیرہ (یہی غراما لیا فرد ط ہے جو عرب میں ہوتا ہے۔ میں نے عراق میں جا کر خیال کیا۔ یا اللہ۔ یہاں سنگترہ، ٹالکیوں نہیں پیدا کیا۔ بعد میں خیال آیا۔ اللہ نے ٹیک کیا ہے کہ یہاں سنگترہ ٹال وغیرہ پیدا نہیں کیا۔ کیونکہ جانوروں میں اونٹ پیدا ہوا تھا۔ اگر یہ رشتہ دہاں ہوتے تو سارا پہل اونٹ کھا جاتا۔ اللہ نے ایسا بچل پیدا کیا جہاں اونٹ نہ لگتا۔ نہ بچے کے) مہر نواز۔ عرب کا فرد ط یہ کھجور ہے۔ اور جب لوگ یہ کھجور لے کر تھے۔ وہ چرانے

تھے جناب رسالت آج کی خدمت میں۔ تو رسول ان سے پوچھتے تھے۔ ”یہ بہ تم میں۔“ دے دے نہ ہو۔ تحفہ ”یا صدقہ“ لائے ہو۔ اگر وہ کہنے حضور نے دے دیں۔

تو آپ فرماتے ”حسن بیٹا۔ اور آؤ۔ حیر بیٹا۔ ادھر آؤ۔ علی تم بھی آؤ۔ یہ تحفہ ہے۔ کھاؤ بیٹے۔“ اور اگر لائے نہ کہہ دیتا۔ حضور یہ صدقہ ہے۔“ تو حضور انہیں کو روک

دیتے۔ اور اصحاب سے فرماتے — ”بسم اللہ۔ نوش فرمائیں —“ اور وہ نوش فرماتے تھے — یہ فرق رکھا تھا اللہ نے۔ معصوم کی پرورش و تربیت کا انداز ہی اور ہے۔ اور پھر یہ بتانے کے لئے کہ ہم تم سے امتیازی نشان رکھتے ہیں۔ رسول ہمیں سبق دیتے تھے — ایک دن امام حسن مجتبیٰ ایک خرمائاٹھا کر امام حسین کی طرف لے گئے — قریب تھا کہ جس خرمائے نے اُدھم سے رسالتا آگے سے کہا ”دبلیا۔ نہ کھانا —“ تبہیں معلوم نہیں یہ بات کہ صدقہ ہم پر حرام ہے۔ — بات ختم ہوئی۔ پوچھنے والے پوچھ بیٹھے — قند! آپ نے سچے سے اس طرح کہا جیسے پیسے سے یہ بات جانتا ہو۔ حالانکہ یہ بچہ ڈیڑھ سال کا ہے۔ — تو حضور نے فرمایا — ”ہاں مجھے معلوم ہے۔ یہ ہر مسئلہ جانتا ہے۔“ اسے کس نے سکھایا۔ —

” جس نے مجھے سکھایا۔ اور یہ میرا بچہ لوح محفوظ کا مطالعہ کرتا ہے۔ (دیکھو ہم معصوم) ہیں۔ ہم یہاں آکر نہیں پڑھتے۔ ہم پڑھانے کے لئے آئے ہیں۔ ہم بتانے آئے ہیں۔ ہم سیکھنے نہیں آئے۔ ہم سکھانے آئے ہیں۔“ بات کو مختصر کرتا ہوں۔ —

میں آیا ہوں لاہور سے۔ اور مجھے پتہ ہے کہ کراچی کے مومنین کو مجھ سے بڑا پیار ہے۔ بڑی محبت ہے۔ مجھے محسوس یہ ہوتا ہے کہ مجھ سے بڑا پیار ہے کراچی والوں کو۔ — میں آگیا یہاں۔ — ”آؤ زیدی صاحب۔ آپ نے یہاں مجلس پڑھنا ہے۔ تشریف رکھئے۔“ سامنے بڑے بڑے بزرگ سامعین بیٹھے ہیں۔ جب میں آکے بیٹھ گیا منہ پہ — تو آپ نے دزدہ پڑھنا میں نے حبیب سے ایک کتاب نکالی۔ اور مطالعہ کرنا شروع کر دیا۔ اور اب آپ اس انتظار میں ہیں کہ یہ شروع کرے۔ اب آپ درد پڑھ رہے ہیں۔ — اور میں نے کہا۔ ”دھڑ دھڑ بھٹی۔ میں ذرا کتاب پڑھ لوں۔ پھر مجلس سناؤں گا۔“ تو لوگوں نے کہا۔ ”زیدی صاحب اگر یہیں آکے پڑھنا تھا تو پھر آپ نے تکلیف کیوں فرمائی۔“ — حبیب ایسے مودی کو آپ برداشت نہیں کر سکتے۔ جویہاں آکے پڑھے۔ تو ایسے رسول کو کون برداشت کرے جویہاں آکے پڑھے۔ آخر یہی کہیں گے تا۔ قبلہ۔ پڑھنا تھا۔ تو دیں سے پڑھ کر۔

آنا تھا جہاں سے آئے ہو۔

ہر کیف۔ یہ معصوم ہیں۔ یہ پڑھانے آتے ہیں۔ پڑھنے نہیں آتے۔ یہ دنیا کو سبق کھانے آتے ہیں۔ یکینے نہیں آتے۔ ان کا ہر قول، ہر فعل، ہر عمل غیر معصوموں کے لئے انسان بنانے کا ایک ذریعہ ہوتا ہے۔ اور پھر اس میں لطف یہ ہے کہ کسی کو مجبور نہیں کرتے۔ وہ خدا کی عطا کی ہوئی طاقت خارجی سے نہیں سوانتے۔ وہ اسے سمجھا دیتے ہیں اپنے قول سے۔ اپنے عمل سے کہ بن جا۔ جو بن جائے، وہ بن جائے۔ اور جو نہ بنے وہ نہ بنے۔ بہر نوع کسی سے نہیں بگاڑتے۔ ان کی سب سے بن جاتی ہے۔ چاہے کوئی بنائے یا نہ بنائے۔ رنم بنو، نہ بنو، ہم تمہیں سمجھاتے رہیں گے۔ یہ ان کا سمجھانے کا طریقہ ہے۔ خواہ عمل سے سمجھانا پڑے یا قول سے سمجھانا پڑے۔

اور ان معصومین نے جو سب سے بڑا سبق دیا۔ جو طریقہ ابتداء سے شروع ہوا ہے۔ یعنی آدم سے لے کر آج تک۔ آج یکم محرم ہے اور ۱۲۹۷ھ کا۔ انسانوں کو انسان بنانے کے لئے ابی اسماعیل بن کسی معصوم نے تجویز نہیں کیا۔ جیسا کہ ان معصوموں نے ان دس دنوں میں دیا ہے۔ جو آج سے شروع ہو رہا ہے۔ دس دن دس ہو گا۔ اس کے بعد ہم اسے بیٹھ کے دہرائیں گے۔ اس کے بعد یاد کرنے کی کوشش کریں گے۔ درنہ خدا گواہ ہے کسی مذہبی عقیدت یا تعصب کی بنا پر نہیں کہہ رہا۔ عام بات کہہ رہا ہوں کہ اگر انسانوں کی زندگی میں یہ دس دن رات باقی ہیں۔ اگر کوئی شرافت و انسانییت کا نام دنیا میں باقی ہے۔ تو صرف ان دس دن کی بدولت باقی ہے۔

دیکھو نا۔ دنیا کو سبق دے دیا جاتا ہے۔ شرافت اسے کہتے ہیں۔ انسانییت اسے کہتے ہیں۔ دنیا کے شریف ترین خاندان کا آغاز یہ ہوا تھا۔ انجام یہ ہوا تھا۔ یہ ان دس دن میں بتایا جاتا ہے۔ اور اس کو سب کو انسان بنانے کا ذریعہ ہے۔

آج ایسا وقت بھی آگیا تھا کہ دنیا کو سبق دینے والوں کو مجبور ہونا پڑا کرتا

یہ مجبوری آج کی نئی بات نہیں ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے بھی ہجرت کی۔ حضرت اسماعیلؑ نے بھی ہجرت کی۔ اُن کی ماں کا تقاضا بھی اُگیا ہے ہجرت کی یادگار۔ انہوں نے بھی ہجرت کی۔ تمام انبیاء کو مجبور ہو کر اپنے اپنے وطن سے ہجرت کرنا پڑی۔ مگر ان کی ہجرتیں ایسی تھیں۔ آج ہجرت مگر دس دن کے بعد واپس وطن آگئے۔ اور آلِ محمدؐ کو بھی ہجرت کرنا پڑ گئی۔ محمدؐ نے تو پہلے ہجرت کی تھی۔ جہاں سے سن عمری کا آغاز ہوا۔ یہ آلِ محمدؐ کی ہجرت ہے۔ وہ دشمنوں کے خوف سے رات کے وقت ڈرتے ہوئے گئے تھے۔ اور غار میں باکر پناہ لی تھی۔ یہاں وہ بات نہیں تھی۔ آلِ محمدؐ نے اس شان سے ہجرت کی کہ دن کا وقت تھا۔ تمام اہلِ مدینہ دیکھ رہے تھے۔ اور مدینہ کی رُوح اہلِ مدینہ سے یہ کہہ رہی تھی۔

”خدا حافظ۔ میں واپس نہیں آؤں گا۔ مدینہ واجبہ میں اب تمہارے شہر میں نہیں آؤں گا۔ مجھے اس شہر کی ایک ایک اینٹ سے محبت ہے۔ میں یہیں پیدا ہوا تھا۔ میری پرورش یہیں ہوئی تھی۔ اور

مدینہ والے تمہیں یاد ہو گا۔۔۔ مدینے کی دیواروں تمہیں بھی یاد ہے نا۔ کہ میرے نانے کا ندھے پہ مجھے سوار کیا تھا۔۔۔ مدینے کے بازار۔ تمہیں یاد ہے نا۔ کہ خدا کے رسولؐ نے مجھے کا ندھے پہ سوار کیا تھا۔۔۔ میں کسی کو اپنے ساتھ جانے کے لئے مجبور نہیں کرتا۔۔۔ میں کوئی ٹوٹے نہیں جا رہا ہوں۔ کوئی مالِ منیت نہیں ملے گا۔۔۔ میں مرنے جا رہا ہوں۔ میرے ساتھ جو جانا چاہے چلے۔ جو جانا چاہے۔ اعلاٰ عام ہے۔۔۔ میں کسی کو روکوں گا نہیں۔“

اور جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے قبلہ! جب آپؐ نے فرمایا جو جانا چاہے میرے ساتھ چلے۔ تو یہاں انسان جو حضورؐ کی خدمت میں آیا ہے یہ کہنے کے لئے کہ قبلہ! میں چلوں گا۔۔۔ پیدا شخص جس نے آپؐ کے کہا کہ ”مردم“ میں ساتھ چلوں گا۔

وہ تھے حضور امام زین العابدینؑ ————— اور امام نے سر سے پاؤں تک شہزادے کو دیکھا ————— اور فرمایا ”تمہارے منہ پر یہی تھا ہے۔ تمہاری ہی شان ہے جڑا بیٹا۔ برابر کا بھائی بڑا ہے۔ تو میرا قوت بازو ہے۔ تم میرے ساتھ چلو گے۔“ مگر مجھے خیال آتا ہے ————— تم میں شاہی خزن ہے۔ تمہاری ماں شہنشاہ کی بیٹی تھی۔ تمہارا مزاج شہنشاہی مزاج ہے سفر جڑا تکلیف دہ ہے۔ بیٹا! کہیں تمہارا شہنشاہی مزاج اس تکلیف کو برداشت نہ کر سکے۔“ مگر امام زین العابدینؑ نے جواب دیا ”آبا حضور! میں حضور کا بیٹا ہوں۔ میں ساتھ چلوں گا۔“

ایک بات مولانا نے اور پوچھی

”سجاد بیٹا۔ تم میرے دلدار اکبر ہو۔ اس لئے تم سے پوچھتا ہوں۔ کہ میں سفر میں جہاد کروں گا۔ یہ جہاد دو قسم کا ہوگا۔ ایک جہاد اصغر۔ ایک جہاد اکبر۔ تم کون سا جہاد کرو گے؟“ امام زین العابدینؑ نے جواب دیا

”قلید۔ میں چونکہ دلدار اکبر ہوں۔ اس لئے میرے سپرد جہاد اکبر فرمائیں۔“ مگر اپنی

زبان سے تشریح فرمائیں۔ ان دونوں جہادوں کی۔“

امام نے فرمایا۔ در سنو بیٹا۔ ایک بیاباں میں ایک وحشی فوج کے بیچ میں گھر کے تین دن بھوکا بیابا سارہ کے بیدردی سے قتل ہو جانا۔ قبر نہ ملنا۔ کفن نہ ملنا۔ یہ جہاد اصغر ہے۔ اور ایک جہاد اکبر ہے میرے لال۔ وہ یہ ہے کہ ماں، بہن، بھوپچی، بچوں کو ساتھ لے کر۔ اُن کے سر رکھے ہوئے ہوں گے۔ بال کٹھے ہوئے ہوں گے۔ اور بازاروں میں پھرائی جائیں گی۔ اور باوجود طاقت کے کچھ نہ کہنا۔ یہ جہاد اکبر ہے۔ تم کون سا جہاد کرو گے۔“؟

یہ سن کر میں نے اپنی مجلس ختم کر دی ہے۔ اور اتنی بات کہہ کے ختم کرنا ہوں کہ

خواب ابراہیمؑ نے خواب میں دیکھا کہ میں اپنے بیٹے کو توح کر رہا ہوں۔ یہ خواب

ہنسی دیکھا کہ ذبح ہو گیا ہے۔ بلکہ ذبح کر رہا ہوں۔ اور جب آنکھ کھلی تو بیٹے کو جگایا۔

”بیٹا میں نے خواب میں دیکھا ہے۔ کہ میں تمہیں ذبح کر رہا ہوں۔ بیٹے نے جواب دیا مدد با جان۔ کچھ اور تو نہیں۔“

ابراہیم نے فرمایا۔ نہیں

مدد با جان۔ آپ اپنے خالق کے حکم کی تعمیل کریں۔ آپ مجھے حابر پائیں گے۔ اس بیان کے بعد اب میں اپنے موضوع کی طرف آتا ہوں۔ کہ جب امام نے جہاد کی تشریح فرمادی کہ بیٹا۔ جہاد اصغر ہے کہ کسی بن میں بھوکا پیاسا مر جانا۔ اور جہاد اکبر یہ ہے کہ باوجود طاقت ہونے کے اپنی ماؤں، بچہ بیٹوں اور بہنوں کو لے کر بازاروں سے گزرنا اور درباروں میں سے جانا۔ اور باوجود طاقت کے کچھ نہ کہنا۔ یہ جہاد اکبر ہے۔

بولو اس جہاد اکبر کے لئے تیار ہو گیا۔ بالکل اسی طرح ہر چھ حسین شخص طرح ابراہیم نے ماتین سے رجوع کیا۔ کہ ”بیٹا تیار ہو۔“ اسی طرح حسین نے اپنے بیٹے سے رجوع کیا۔ کہ ”بیٹا تیار ہو۔“ مگر بیٹا کیا جواب دیتا ہے۔

”بابلین۔“

”آپ اللہ اللہ مجھے شکر پائی گے۔“

ابراہیم کہہ رہے تھے۔ آپ اللہ اللہ مجھے حابر پائیں گے۔ اور یہاں کہہ رہے ہیں۔ اے آپ اللہ اللہ مجھے شکر پائیں گے۔ صبر تو ناہم معصیت پر۔ اور شکر ہوتا ہے غیرت پر۔ جس چیز کو وہ معصیت سمجھتے تھے۔ وہ چیز ان کے لئے امانت بن گئی۔ اور اس بیٹے نے کہا۔ آپ مجھے شکر پائیں گے۔ آپ مجھے شکر گزار پائیں گے۔ ہر لمحہ شکر بجاؤں گا۔ میں تیار ہوں اس جہاد کے لئے۔ میں حاضر ہوں۔ اور ابی دوق!

یہ میرے اعتقاد کی بات ہے۔ کہ جب محرم کا پانچواں طلعہ ہوتا ہے پہلی رات کو۔ اور آپ لوگ مجلس کرتے ہیں تو مصومین تشریف لاتے ہیں ان مجلسوں میں۔ اور مصومین کے متعلق تو میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ دو مصوموں کے متعلق تو میرا ایمان ہے۔ کہ وہ تشریف لاتے ہیں۔ آپ کی مجلس کا وقت دیکھا۔ اور امام زین العابدینؑ نے کہا

”بھڑھی ماں۔ چلو مجلس ہو گئی“

ان مجلسوں میں امام زین العابدینؑ بھی ہوں گے۔ اور حوروں کے ساتھ جناب زینبؑ بھی تشریف فرما ہوں گی۔ اور

”آجھ آکے محمد سفر کرنے کے لئے گھر سے روانہ ہو گئے۔ اور چلتے وقت جب محل میں عصمت کبریٰ سوار ہونے لگیں۔ اور ناقہ جب لایا گیا دروازہ پر۔ امام علیہ السلام خرداٹھے اور اٹھ کے فرمایا

”بھائیو۔ ذرا ایک طرف بیٹھ جاؤ۔ میں خود زینبؑ کو سوار کرتا ہوں“

امام تشریف لائے دروازے پر۔ اور زینبؑ چادر میں برقعہ میں سرھٹکائے خاموش برآمد ہوئیں۔ ایک بازو علی اکبر کے ہاتھ میں۔ ایک بازو سید الشہداء کے ہاتھ میں۔ اور امام نے محل کا پردہ اٹھایا۔ جناب غازی نے بلند آواز سے

آواز دی

”در محلے والو۔ خبردار۔ کوئی بچہ بھی ادھر سے ادھر نہ گزرنے پائے۔ کوئی سوار یہاں سے گزرنے نہ پائے۔ کوئی آواز نہ بلند ہونے پائے۔ زینبؑ سوار ہو رہی ہیں۔“

اور جب محل کے بالکل قریب پہنچیں۔ سوار ہونے کا وقت آیا۔ تو فراتی ہیں

”رسین۔ ذرا ٹھہرو۔ اکبر بیٹا تم بھی ٹھہرو۔ تمہارا بہت بہت شکریہ۔ تم سوار کرنے آئے ہو۔ تم نے بہت تکلیف کی۔ میں خود سوار ہو جاؤں گی۔ کسی اور منزل پر

معصوم — کا فیصلہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

خداوندِ عالم کی حمد و ثناء کے بعد حضراتِ محمد و آلِ محمد پر درود و سلام
حضراتِ گرامی !

خداوندِ عالم ہی محمد و آلِ محمد آپ حضرات کی توفیقات میں اور اضافہ کرے۔ اور
آپ کی اس عبادتِ عظمیٰ کو جو آپ اس زمانے میں کرتے ہیں، خدا قبول فرمائے۔
محترم بزرگان !

انسان کو ہر وقت ہر لمحہ محمد و آلِ محمد کی نصرت کی ضرورت ہے اور نہ ہی اُن
کے بغیر زندگی میں انسان کا گزارا ہو سکتا ہے۔
میرے سامعین !

”زندگی“ کا لفظ میں بول دیتا ہوں۔ اور اس لفظِ زندگی سے زندہ دلوں
کے ذہن میں صرف یہی زندگی آتی ہوگی۔ جو اس دنیا میں ہماری زندگی گزر رہی ہے۔
حالانکہ اس زندگی کو زندگی کہنا، زندگی کے ساتھ مذاق کرنا ہے۔ یہ بھی کوئی زندگی ہوتی۔
جس میں نہ آنے میں بس یہ جانے میں بس۔ نہ یہاں آتے ہیں اختیار۔ نہ یہاں سے جانے میں اختیار۔
اتنی بے بس زندگی بھی کوئی زندگی ہے۔ ایک زبردست نئے حکم دیا۔ ”جاد“۔ ہمیں آنا
پڑ گیا۔ اور جب وہ حکم دے گا ”واپس آؤ“۔ چاہے ہم مرجائیں ہمیں جانا پڑے
گا۔ جب تک حکم ہوگا ”یہاں رہو“۔ ہمیں رہنا پڑے گا۔ اگر خود جانے کی

کرشش کی بھی — اور مر گئے — چے گئے — تو وہ بھیجے والا پکڑ لیا — کہ حرام موت تھی اگر
پہن گئے تو حکومت پکڑے گی۔ خود کشی میں چالان کر دے گی —

بہر فروع — نہ جانے میں بس ہے — نہ یہاں رہنے میں بس ہے — ایک زبردست
طاقت نے یہاں بھیج دیا — آنا پڑا — اور جب بلا لے گا — تو جانا پڑے گا —
اور سچی بات تو یہ ہے — اس وقت اگر ہم سے پوچھا جاتا کہ ”تم جانا چاہتے ہو۔
— اس وقت کا تو مجھے پتہ نہیں — اب میں شاید یہی جواب دیتا —
”نہیں“ — اور غالباً جب بھی میں راضی نہیں تھا آنے پر — بھیج دیا زبردستی جو
چلا آ رہا تھا — ثبوت یہ ہے — کہ اگر میں ہنسی خوشی آتا — تو آتے ہی ہنستا —
لیکن میں راضی نہیں تھا آنے پر — جب ہی تو میں آتے ہی رویا — اور لطف کی بات یہ
ہے کہ گھر میں خوشیاں تھیں میرے آنے پر — مگر خوشی جب ہوئی تھی — جب
میں رویا تھا — جب تک میں رویا نہیں تھا — نہ ماں خوش تھی — نہ باپ خوش تھا
— نہ بہن خوش تھی — نہ بھائی خوش تھا — کسی کو میری زندگی کا یقین نہیں تھا۔
جب تک میں رویا نہیں تھا — گویا انسان نے آتے ہی زندہ رہنے کا
ثبوت دیا رونے سے — زندہ وہ رہے گا جو روئے گا۔ — روزِ زندگی کی
علامت ہے —

بہر فروع — بچہ پیدا ہوتے ہی دننا ہے — اور پھر بھی نہیں کہ بعد میں دننا نہیں —
بلکہ جب کوئی ضرورت پیش آئے — وہ اُسے حل کرنے سے — بھوک لگی۔
جب رونے لگا — سردی لگی جب رونے لگا — گرمی لگی جب رونے لگا — نیمند
آئی جب رونے لگا — گویا زبان ہی دننا تھی — گفتگو ہی دننا تھی — ساری
زندگی ہی دننا تھی — جب سوائے رونے کے کچھ کام نہ تھا۔ تو ساری کائنات کہتی تھی —
”یہ معصوم ہے“ — پوری کائنات کا فیصلہ تھا کہ معصوم ہے — اور جب روزِ نامک ہوتا چلا گیا۔

مصومیت بھی کم ہوتی چلی گئی۔

پیارے سامعین !

آپ کو یاد نہیں — مجھے یاد ہے اپنا ردنا — بڑے خوش تھے گھر والے
کہ بچہ اب جیسے لگا لگا ثبوت — کہ دور رہے — رونے سے سب خوش تھے۔
میری مرحوم والدہ بھی بڑی خوش تھیں کہ بچہ دور رہے — وہ سارا دن مجھے گود میں لیے
پھرتی — میں روتا رہتا — وہ گھر کا کام کرتی — میں روزنا رہتا — اور جب رات
کو دوسری تو مجھے ساتھ سُلائی — ماں جو تھی — میں اس وقت بھی رونے
لگا — تو ماں نے مجھے سمجھایا

”بیٹا — اب نہ رُو —“

”اب کیوں نہ رُوں —؟“

کہ ایک چارپائی تھی — میری ماں میرے ساتھ لٹی تھیں — اب میں اس کا ساتھی
تھا — ساتھی ہو کر رُونا اُسے پسند نہ آیا — اور مجھے تھپکایا، بہلایا —
”اللہ! اللہ!“

یہ میرے کانوں میں اب تک گونج رہا ہے — کہ جب ماں نے روزنا روکنے کے
لئے مجھے کہا ”اللہ — اللہ!“ — یعنی اللہ کو یاد کرو — اللہ ساتھ ہے —
اور میں نے ماں سے کہہ دیا

”اماں — اُس وقت کارنا تو اتنا پسند — اور اس وقت کارنا اتنا پسند —“
تو ماں نے کہا

”دبیر خرد دار ! ہر چیز کا وقت ہوتا ہے — ہر چیز کا مَمل ہوتا ہے —
با مَمل رُو — تو ٹھیک ہے — اور بے مَمل رُو — تو غلط ہے — اچھے بچے
ایسا نہیں کیا کرتے —“

بہرِ رُخ — میں رویا کرتا تھا — پھر زندگی اور برحق ہو گئی — اور دنیا ماکم ہوتا گیا — بچپن آیا — بچپن رخصت ہوا تو شباب آیا — آنکھ جھپکی، شباب رخصت ہوا — تو یہ بڑھاپا آگیا — ہم نے کہا — چلو یہی قیمت ہے — تو یہ حضرت بھی چلے گئے — اور اس کے بعد وہ آخری منزل ہے — جسے موت کہتے ہیں — موت آگئی — موت آئی تو زندگی ہماری جو یہ گزر رہی تھی — ختم ہو گئی — مگر یہ علم نہیں کہ موت کب آئے گی — یہ کسی کو معلوم نہیں کہ موت کب آئے گی — لیکن موت نے آنا ضرور ہے — یہ پتہ ہے آئے گی — مگر یہ پتہ نہیں کہ آئے گی — اور موت انسان کو روزیہ سبق دیتی ہے — کہ جس کا آنا ضروری ہو، اس کے آنے کا وقت معین نہیں ہوتا — چاہے وہ امامِ ہرِ امت — آئے گا ضرور — وقت معین نہیں ہوتا — آنا ضرور ہے — ضرور آئے گا —

بچپن ہم نے دیکھا — شباب ہم نے دیکھا — بڑھاپا ہم نے دیکھا — اور موت بھی آئی — ضرور آنا تھا — مگر کسی دانش ور نے یہ نہ کہا کہ بچپن برحق ہے — کسی نے یہ نہ کہا کہ شباب برحق ہے — کسی نے یہ نہ کہا کہ بڑھاپا برحق ہے — جس نے کہا — یہی کہا — ”موت برحق ہے“ — جس کا آنا ضروری ہو — بس وہی برحق ہے — چاہے امامِ ہرِ امت — حضور!

یہ ہماری زندگی ہے — موت کی پہلی آئی اور یہ زندگی ختم ہو گئی — اس زندگی کے لئے کیا کچھ کرتا ہے آدمی — خدا کی پناہ — انسان کو اس زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے کیا کچھ کرنا پڑتا ہے — خوشامدی، خدشیں، اطاعتیں، عینیں، مجنبتیں اور جو کچھ بھی ہے وہ اس زندگی کے لئے کر رہا ہے — جس نے ایک دن ختم ہو جاتا ہے — اس کے بعد جو زندگی شروع ہوگی — اُس میں اور اس زندگی میں یہ فرق ہے

کہ اُس زندگی نے ختم نہیں ہونا ————— اس زندگی میں موت ضروری ہے ————— اس
 زندگی میں جینا ضروری ہے ————— یہاں جی نہیں سکتے ————— وہاں مر نہیں سکتے ————— یہاں
 مجبور ہیں مرنے پر ————— وہاں مجبور ہیں جینے پر

اب اس چھوٹی سی زندگی کو بچانے کے لئے کتنی احتیاط ہے انسان کو ————— نذر
 ہو گیا ————— بیمار ہو گیا ————— طبیعت خراب ہو گئی ————— کیا کرنا ہے ————— زندگی پرچ جائے۔
 کسی ڈاکٹر کو بلاؤ ————— حکیم کو بلاؤ ————— ڈاکٹر آگئے ————— اب ڈاکٹر کے ہم محتاج ہیں —————
 اس نے تبصہ دیکھی ————— حالات دیکھے ————— قیاس سے اندازہ کیا ————— اور کڑی سے کڑی
 دوا دے دی ————— مگر اس زندگی کو بچانے کے لئے ہم نے پی ٹی - (INFLECTION) انجکشن
 کیا ————— وہ تکلیف برداشت کر لی ————— اس زندگی کے لئے د (OPERATION)
 آپریشن کر دایا ————— ماتھے پاؤں کٹوا دیئے ————— ہر نوع اس زندگی کے لئے سب کچھ
 کرنا پڑتا ہے ————— اور

محترم ماسین!

بیماری میں مرین کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ کوئی قابل ڈاکٹر مل جائے —————
 جس سے بیماری جاتی رہے ————— زندگی محفوظ ہو جائے ————— اب ہم مشورہ کر کے ایک بڑے اچھے
 ڈاکٹر کے پاس پہنچے ————— تاکہ علاج کر دائیں ————— اور لوگوں نے کہا
 وہ بہترین ڈاکٹر ہے ————— اس سے بہتر ڈاکٹر تو شہر میں ہے ہی نہیں ————— مگر ایک
 ذرا سانسفق ہے ————— اور وہ یہ ہے کہ یہ جان کے نہیں ————— اپنے اختیار سے نہیں —————
 بلکہ کبھی کبھی بھلے سے ————— سہواً نسنے میں کوئی ایسی دوا لکھ دیتا ہے جو ضرر ہوتی ہے۔
 آپ ایمان سے تباہیں۔ ایسے ڈاکٹر کے نسنے پر اعتماد کریں گے —————؟ جو غلطی سے کبھی کبھار
 کوئی غلط دوا لکھ دیتا ہو —————؟ ————— نہیں ————— اس کے ہر نسنے پر تنگ ہوگا —————
 کہیں ایسا نہ ہو کہ اس میں بھی کوئی غلط دوا لکھ دی ہو ————— جب

اس ذرا سی زندگی کے لئے کسی ایسے ڈاکٹر پر بھی اعتماد نہیں۔ جو کبھی کبھی بھولتا ہو۔ تو اس ہمیشہ کی زندگی کے لئے کسی ایسے کا دامن کیسے پکڑ لیں جو بھولتا ہو۔ جس سے غلطی ہو سکتی ہو۔ اب تلاش کرنا پڑتی ہے اس زندگی کے لئے ان ڈاکٹروں کی، ان طبیبوں کی، ان پچانے والوں کی جن کے متعلق یہ یقین ہو جائے۔ کہ نہ سہواً، نہ عمدہ، نہ اراداً۔ ان سے کبھی غلطی ہو سکتی ہی نہیں۔ اور ذرا سا شک ہو جائے کہ ان سے غلطی ہو سکتی ہے۔ اُسے نہ اس زندگی میں پسند کریں۔ نہ اُس زندگی میں پسند کریں گے۔ جس طرح ایک مقدمہ ہو جاتا ہے عدالت میں اور کسی وکیل پر اگر یہ شبہ ہو جائے۔ کہ قابلِ توجہ ہے، لائقِ توجہ ہے۔ تاؤن بھی بہترین جانتا ہے۔ ساری باتیں ٹھیک ہیں۔ مگر کبھی کبھی غلطی سے غلط بحث کر دیتا ہے۔ ایسے وکیل کو کون وکیل کرے جو کبھی بھی غلطی کر سکتا ہو۔ اور جب اس عدالت میں ہم ایسے وکیل کو وکیل کرنا پسند نہیں کرتے۔ تو عاقبت کی عدالت کے لئے کون ایسے وکیل بنائے ان سے سہواً غلطی ہو سکتی ہو۔

اگر اس بار رُدم میں ہم اُس وکیل کو تلاش کریں گے جس سے کبھی غلطی نہ ہو۔ تو بارہ رُدم میں وہ کیوں نہ تلاش کریں جس سے غلطی ہو سکتی ہی نہیں۔ جو کبھی غلطی نہ کر سکتا ہو۔ ایسے کو تلاش کرو۔

یاد رکھو میرے سامعین!

ساری دنیا میں صرف محمد و آلِ محمد ہی وہ ہیں جن سے نہ کبھی غلطی ہوئی۔ نہ ہو سکتی ہے۔ ان سے نہ کبھی بھول ہوئی نہ کبھی سہواً ہوا۔ اور جب وہ ہیں موجود نہ بھولنے والے نہ تو ہر ایک کے ہاتھ میں اُن ہی کا دامن ہو۔ اور

دہرے بھولنے والو!

ہم بھولنے والوں کا تم سہارا ہو۔ ہم بھٹکنے والوں کا تم سہارا ہو۔ ہم، تمہیں محمد و آلِ محمد کو کیوں نہ یاد کریں۔ چوں کہ وہ اس دنیا کے بھی ماہر ہیں۔

اور اس دنیا کے بھی عالم ہیں — وہ ہونے لگے تباہی لگے۔ جو طریقہ بتائیں گے — وہ بہترین ہو گا۔

گویا محسود و آل محسود خود غلطی سے متبر ہیں — اور صاحبان !

اسی کو مذہب کی اصطلاح میں ”معموم“ کہتے ہیں — معموم کے معنی یہی ہیں کہ جس سے

سہواً، غملاً، علم میں، عمل میں، جاننے میں، کرنے میں، قدم اٹھانے میں، چلنے میں، پھرنے میں، بیٹھنے میں،

اٹھنے میں، سونے میں، جاگنے میں، بیماری میں، آزاری میں، کسی عالم میں بھی غلطی کا احتمال ہو سکتا ہی نہیں

_____ بس یہی معموم ہے — اور جس سے ذرا سی غلطی ہو سکتی ہو — کہ

صاحب ! یہ معموم تو ہے — تندرستی میں تو معموم رہتا ہے مگر جب بیمار ہو جائے تو دماغ

میں ذرا سانسکیان کا مرض (-----) معلوم ہوا وہ معموم ہی نہیں — ہم

اُسے معموم ہی نہیں مانتے _____ اور معموم کے تو معنی یہی ہیں کہ _____

_____ کیا مجال جو کہیں غلطی ہو — کیا مجال جو کہیں نقص آجائے _____

_____ ہر نرسہ۔ وہ ایک طویل زندگی ہے جس نے کبھی ختم ہی نہیں ہونا _____

_____ یہاں تزیہ بھی ہے — اگر ایک ڈاکٹر کی غلط دوا پیلی۔ آج اُس سے تکلیف بڑھ گئی۔

شام کو دوسرا ڈاکٹر بلایا — اُس نے دوا دی۔ کل ٹھیک ہو گئے — چلو ایک دن کی تکلیف تھی۔

برداشت کر لی _____ اور دہاں اگر غلط دوا مل گئی — اور دہاں اگر ایک دن کی

تکلیف ہو گئی — تو دہاں کا ایک دن ہے پچاس ہزار سال کا _____ دہاں ایک دن کی تکلیف

بڑی مصیبت ہو گی _____ اس لئے پورے غور سے ان طبیعوں کو تلاش کرنا پڑے گا جن سے

_____ احتمال ہی غلطی کا نہ ہو — جن سے شبہ ہی غلطی کا نہ ہو _____

بات یہ ہے حضور !

_____ کہ معموم، معموم میں فرق ہے۔ ہر معموم یکساں نہیں ہوتا — ایک معموم تو

وہ ہے — جو دہی کرتا ہے جو ٹھیک ہو — کبھی غلطی کرتا ہی نہیں — وہ کرنے سے پہلے

دیکھ لیتا ہے۔ یہ بات ٹھیک ہے — وہ عمل سے پہلے دیکھ لیتا ہے کہ میں جو کر رہا ہوں۔ وہ

ٹھیک ہے ————— مگر میں جن چودہ معصومین کا ذکر کر رہا ہوں ————— ان کے معصوم ہونے میں اور باقی انبیاء کے معصوم ہونے میں میرے نزدیک فرق یہ ہے کہ ————— باقی وہی کرتے تھے جو ٹھیک ہوتا تھا۔ اور یہ ٹھیک نہیں تلاش کرتے ————— بلکہ یہ چوڑہ جو کر دیتے ہیں ————— وہ ٹھیک ہوتا ہے ————— اُن معصوموں کو پہلے تلاش کرنا پڑتا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ نہیں ————— درست ہے کہ نہیں ————— وہ حق کو تلاش کرتے تھے ————— اور حق ان چودہ معصومین کو تلاش کرتا ہے ————— وہ حق کے پیچھے چلتے تھے ————— حق ان کے پیچھے چلتا ہے ————— جدھر ان چوڑہ نے رُخ کر دیا ————— حق ہو گیا ————— جو بات انہوں نے کہہ دی، حق ہو گئی ————— جو ان کے منہ سے نکل گیا، حق ہو گیا ————— ان کی معصومیت اور ہے ————— اُن کی معصومیت اور ہے —————

یہ چوڑہ معصوم۔ وہ معصوم ہیں۔ یہ حق تلاش نہیں کرتے۔ حق انہیں تلاش کرتا ہے ————— کہیں ہنس دیئے تو مینا حق ہو گیا ————— کہیں بیٹھ گئے تو مینا حق ہو گیا ————— کہیں کھڑے ہو گئے تو کھڑا ہرنا حق ہو گیا ————— جس طرح ناز پڑھ لی۔ وہی ناز حق ہو گئی ————— جس طرح روزہ رکھ لیا۔ وہی روزہ حق ہو گیا ————— کہیں جاگئے رہے تو جاگنا حق ہو گیا ————— اور کہیں چادر تان کے سر گئے تو سنا حق ہو گیا —————

اب اس مغل میں علاء بھی ہیں، دانشور بھی ہیں، رکلا بھی ہیں۔ میں بے پڑھا کھسا آدمی آپ کے پیچ میں آ کے پھس گیا ہوں ————— اللہ جانے۔ آپ کیا کہیں گے۔ کیا نہیں کہیں گے ————— یہ آئی ہوئی بات ہے ————— وہ کتابچوں آپ سے ————— کہ جس انسان کی زندگی، ساری رات سُنت نازیں پڑھیں میں گزری ہوں ————— نمازِ شب پڑھا ہوں ————— وہ اگر ساری رات سوتا رہے اور میں جا کے اُسے نمازِ شب کے لئے جکا دوں ————— ”اُٹھو۔ نمازِ شب کا وقت ہے۔“ ————— اور وہ کہے ————— آج میں نہیں اُٹھتا۔ آج مجھے حکم ہے سونے کا ————— ”تو جاؤ جس رات اُسے

سونے کا حکم تھا۔ اُس رات اگر اٹھ کے نماز پڑھنے لگتا۔ یہ مناسب تھا یا نامناسب
 ؟ ”نامناسب“ — معلوم ہوا کہ کہیں ان کی نماز بہتر ہوگئی — اور
 کہیں ان کی نیند بہتر ہوگئی — گویا آج کی رات اس عابد کے لئے دیند نماز سے بہتر ہے۔
 تو یہ وہ معصوم ہیں جن کا ہر عمل صحیح ہوتا ہے — یہ چاہتے ہی وہ ہیں جو اللہ جانتا ہے
 — اور جن کی نیت ہی وہ ہو جو اللہ چاہے — اُن کے عمل میں کہیں غلطی ہو سکتی ہی نہیں — جن
 کی مشیت و خواہش ہی وہ ہے جو اللہ جانتا ہے —
 میں آپ سے پھر جلد متعزضہ کتنا چلوں کہ
 یاد رکھو میرے سامعین !

محسود آل محسود کی ان اداؤں پہ دنیا مرقی ہے۔ کہ آپ نے ساری زندگی
 وہی کیا جو خدا نے چاہا — اپنا چاہا — کیا ہی نہیں — بس جو خدا نے چاہا، وہ آپ نے چاہا —
 خدا نے چاہا۔ ”نافقہ کرو“ — ”بہت اچھا“ —
 خدا نے چاہا۔ ”کھانا کھا کر“ — ”بہت اچھا“ —
 خدا نے چاہا۔ ”سو“ — ”بہت اچھا“ —
 خدا نے چاہا۔ ”جاگو“ — ”بہت اچھا“ —
 جب ساری زندگی آپ وہی کرتے رہے۔ جو خدا نے چاہا — تو خدا کے مدد کا تقاضا
 یہ ہے کہ —

اگر تم زندگی بھر وہی کرتے رہے جو خدا نے چاہا — تو قیامت کے دن اگر اللہ
 مدد کرے گا — تو مدد کا تقاضا یہ ہے کہ —
 یہاں تم نے وہی کیا جو اللہ نے چاہا —
 اللہ وہی کرے گا — جو تم چاہو گے — یہاں تم وہی کرتے رہے جو اللہ نے چاہا —
 وہیں — اللہ وہی کرے گا — جو محسود آل محسود چاہیں گے — مدد کا

تعاظی ہے۔۔۔۔۔ اس لئے محمد وآل محمد میں کوئی جھول یا غلطی برکتی
 ہی نہیں۔۔۔۔۔ شیت اللہ کی۔۔۔ ارادہ اللہ کا۔۔۔ اور علی ان کا۔۔۔ اسی
 لئے اللہ ان کے انھوں کو اپنا امّت کہتا ہے۔۔۔ ان کے کام کو اپنا کام کہتا ہے۔۔۔ ان
 کی آنکھ کو اپنی آنکھ کہتا ہے۔۔۔ کیونکہ ان کی آنکھ دیکھتی ہی رہی ہے۔ جو اللہ دیکھے۔۔۔ چاہتا ہے
 اللہ۔۔۔ عمل یہ کرتے ہیں۔۔۔ یہ صرف محمد وآل محمد تھے۔ جن کے عمل کو اللہ اپنا
 عمل کہتا ہے۔۔۔ جن کا ارادہ وہ تھا جو خدا کا ارادہ تھا۔ جن کی شیت وہ تھی جو خدا کی شیت
 تھی۔۔۔ وہ چاہتے رہے تھے۔ جو خدا چاہتا تھا۔ وہ کرتے رہے تھے جو ارادہ الہی تھا۔ اس
 کے بغیر وہ عمل کوئی کرتے ہی نہیں تھے۔۔۔ خواہ دنیا نے انہیں قید بھی کیا۔ انہیں گھروں
 میں محووظ بھی رکھا۔۔۔ انہیں سب کچھ کیا۔ مگر کوئی یہ نہ کہہ سکا۔ کہ اُن میں غلاں غلطی تھی۔
 ۔۔۔۔۔ وہ دشمنوں کے مجمع میں کھڑے ہو کے کہتے تھے۔۔۔ ہم جو حق خدا
 ہیں۔۔۔ ہم اللہ کی شیت ہیں۔۔۔ ہم اللہ کا ارادہ ہیں۔۔۔ اور
 دشمنان آل محمد، آل رسول کی زبان ٹوٹنے کے لئے تید تو انہیں کر دیتے تھے۔۔۔ مگر
 اُن کی یہ طاقت نہیں تھی۔ کہ وہ یہ کہہ دیں۔ کہ یہ غلط کہتے تھے۔۔۔ وہ
 جو کرتے تھے۔ بالکل صحیح کرتے تھے۔ کیا مجال جو ان کے کسی عمل میں خرابی آجائے۔
 اپنی اپنی عقل کے مطابق لوگ مشورے ضرور دیتے تھے۔ اور وہ آل رسول ان کا شکریہ ادا
 کرتے تھے۔۔۔ مگر کرتے رہے تھے جو اللہ چاہتا تھا۔

سابعین!

ب۔ تباؤ۔ انہی آل محمد کی فردا علی حضور سید الشہداء حضرت امام حسین علیہ السلام
 کو بہت سے آدمیوں نے اپنی عقل کے مطابق مشورے دیئے تھے۔۔۔۔۔؟
 ”حسین بیعت کرو۔۔۔ درحسین کہیں دُر چلے جاؤ۔“ مگر حسین ہر ایک کا شکریہ
 ادا کر رہے ہیں۔۔۔۔۔ لیکن حسین کو نہ وہ چاہتا ہے جو اللہ چاہتا تھا۔۔۔ اور

بلکہ فرمایا ————— ”میں علی کا بیٹا ہوں، اور سعیت نہیں کروں گا۔“ ————— مگر یہ فرمایا
ان لوگوں کے سامنے جو علی کو دیکھے ہوئے تھے۔ جو علی کے ساتھ رہے ہوئے تھے۔
جن کے سامنے علی کی ساری زندگی تھی۔ اُن کے سامنے اپنے کو علی کا بیٹا کہہ کے انکار
کرنے کے معنی یہ ہیں کہ —————

”وہ اُس نے یہ کام کبھی کیا تھا نہ میں کروں گا۔“ ————— ”میں یہ کام نہیں کروں گا۔“
اب ”نہیں“ کہہ کے حسینؑ گھرا گئے۔ دنیا حیران ہو گئی۔ کہ اتنی بڑی سلطنت کے
سامنے حسینؑ ————— ”نہیں“ کہہ رہے ہیں۔ اللہ جانے ارادہ کیا ہے ————— کیا
کریں گے —————؟

حسینؑ گھر آئے تو بہن بی

”حسینؑ! کیا بات ہوئی تھی؟“ ————— تو مولانا فرمایا

”بہن! کیا بتاؤں۔ مجھ سے یزید کی بیعت مانگی گئی تھی۔“

”تم نے کیا جواب دیا حسینؑ! زینبؑ نے پوچھا

”بہن! میں تم مشورہ پاتا ہوں۔“

”حسینؑ! تم امام وقت ہو۔ معصوم ہو۔ تمہیں مشورے کی کیا ضرورت ہے۔“

”بہن! بات یہ ہے کہ تم عمر میں تو مجھ سے چھٹی ہو۔ مگر تم ہی گورہ

ہو اس بات کی کہ اماں کے بعد ہم نے تمہاری عزت اماں کی طرح کی ہے۔

باوجود بڑا بھائی ہونے کے ہر معاملہ میں تم سے مشورہ لیا ہے۔ اور

آج بیعت یزید کا سوال ہے زینبؑ! بولو۔ کیا جواب دوں۔“؟

تو بی بی نے فرمایا

”حسینؑ! میرا امتحان لے رہے ہو۔ سنو حسینؑ! جو خون تمہاری رگوں میں ہے۔

وہی میری رگوں میں ہے۔ جو دردِ ہمت نے پیا ہے۔ وہی میں نے پیایا ہے۔

جو تمہارا نام ہے۔ وہی میرا نام ہے۔ ————— جو تمہارا باپ ہے۔ ————— وہی میرا باپ ہے۔ —————

جو تمہاری ماں ہے وہی میرا ماں ہے —————

بس فرق اتنا ہے حسین!

تیرے سر پہ آیا کلام ہے ————— مگر

دیکھ حسین!

میرے سر پہ اماں کی چادر ہے ————— میرا استخوان نہ تو حسین!

تو اٹم نے فساد یا

در زینب!

میں استخوان نہیں ے رہا۔ ————— شورشہ چاہتا ہوں۔ —————

”حسین!

اگر تو نے مجھے یہ عزت بخشی ہے شورشہ کی تو پھر میں میرا جواب!

”کیا جواب ہے زینب تمہارا“؟

اگر مجھے پوچھتے ہو حسین!

”تو کہ دو در نہیں۔“

اب زینب نے کہا۔ ————— ”نہیں۔“ ————— تو حسین نے اپنا سر فوراً سجدے میں

رکھ دیا۔ ————— اور کہنے لگے

”مغلقہ! —————

تیرا شکریہ۔ ————— میری بہن کی ”نہیں“ بھی میرے ساتھ شامل ہو گئی۔ —————

اب دنیا کی کوئی طاقت ہماری ”نہیں“ کو دماں سے نہیں بدل سکتی۔ ————— ”مگر

زینب ایک بات سنا۔ ————— میں بھی نہیں، کہہ کے آیا ہوں۔ ————— تم بھی نہیں کہہ رہی

ہو۔ ————— ہم بہن، بھائیوں کو اس ”نہیں“ کی تمیت دینا پڑے گی۔ ————— مگر

”زینب!“

میری قیمت اور ہے تمہاری قیمت اور ہے ————— ”اب بی بی بولی
 ”حسین! — مجھے کوئی پرواہ نہیں — نکل نہ کر — میں اپنی مدد نہیں — پتہ قائم رہوں گی —“
 ”زینب!“

دو میدان سر کر کے پڑیں گے — ایک کربلا کا میدان — ایک شام کا میدان —
 تو زینب نے پوری شان سے کہا
 ”میں بھی ناتج اعظم کی بیٹی ہوں ————— ایک میدان حسین! تو اپنے حق میں رکھ —————
 ایک میدان میرے سپرد کر —————
 حسین!“

کربلا تیرے سپرد ————— شام میرے سپرد ————— کربلا
 تو فتح دنیا ————— شام میں فتح کروں گی ————— اگر دنیا کے سب سے
 بڑے نام کو گالی نہ بنوا دوں تو زینب نہ کہنا ————— اور —————
 ”سُحسین!“

شام تو میں تنہا فتح کروں گی ————— گھر —————
 کربلا میں تیرے ساتھ شہید ہوں گی
 یوں کام کریں گے حسین! کہ بچا کر ————— کہیں خاتون ہوں ————— میں گھر میں بیٹھوں گی —
 تو مرد ہے تو ابرو نہ ————— ہر کے سارے کام تیرے سپرد —————
 گھر کے اندر کے سارے کام یہ ————— سپرد ————— گھر میں عزتیں ہیں — عورتوں کی سرداری میں
 کروں گی ————— سروں ہاں رد تو کرنا ————— اور —————
 ”سُحسین!“

شہیدوں کا سردار تو بننا

اُسیر کی سردار میں بزدلی اور
 کسی شہید کو گھر میں کپڑے پہنانا میرے ذمے
 میدان سے لاش لانا تیرے ذمے اور
 دیکھنا حسین !

تو بھی بھائی قربان کرے گا میں بھی بھائی قربان کروں گی — تیرا بھائی قربان ہوگا
 عباسؑ بیٹا — میرے دو بھائی قربان ہوں گے — ایک حسینؑ بیٹا — ایک عباسؑ
 بیٹا — تیرا ایک بھتیجا قربان ہوگا — تاسمؑ بیٹا — میرے دو بھتیجے قربان ہوں گے
 ایک اکبرؑ بیٹا — ایک تاسمؑ بیٹا
 دیکھنا بیٹوں کا معاملہ حسین !

دو بیٹے تو قربان کرے گا — ایک اکبرؑ — ایک اسماعیلؑ — دو ہیں
 بھی قربان کروں گی — مگر میرے بچوں کا تیرے بچوں سے کوئی مقابلہ نہیں حسین ! —
 تیرے بچے شہزادے ہیں — میرے بچے ان کے غلام ہیں — مگر ایک وعدہ کرتی
 ہوں حسین !

دو بیٹے قربان کرنے کے بعد نور بی بی پہنچتی ہیں یسویٰ قیامت تک باقی رہے گی — اور
 میری بیٹی نور بی بی قربان کر دوں گی — میری نسو ختم ہو جائے گی — اب تیرا ہی کوئی
 بیٹا مجھے آں کہ دے تو مجھ دے — دوسرا میرا کوئی بیٹا نہیں رہے گا جو مجھے آں کہ دے
 رہے گا — اور
 میں حسین !

کر بلا تیرا علاقہ ہے — تمام میرا علاقہ — کر بلا فتح کرنے کے
 بعد تو قیامت تک اپنے مفتوحہ علاقے میں رہنا — اور میں قیامت تک اپنے مفتوحہ
 علاقے میں رہوں گی — کر بلا میں تیرے نائرا ہیں گے حسین ! میری روح خوش ہوئی تیرے

ناروں کو دیکھ کے ————— مگر خدا کو اُپا بھی پیدا کر دے گا جو میرا روضہ
بنوا دے گا۔ میرے اُن بھی کوئی آجایا کرے گا۔ ————— اور
آخری فیصلہ یہ ہے حسین!

جتنے بچے ہیں بارے ساتھ ————— اُن میں جتنے بڑے ہیں ————— وہ تیرے سپرد
————— اور جتنی بڑکیاں ہیں وہ میرے سپرد۔

سنو گے یہ فقرہ صائبان! فیصلہ بہن بھائی کا

در بڑے حسین تیرے سپرد ————— بڑکیاں میرے سپرد

علیٰ اصغر بڑا کا ہے ————— وہ تیرے سپرد

کیئٹہ بڑکی ہے ————— وہ میرے سپرد

حسین! اصغر تیرے حقے ہیں ————— کیئٹہ میرے حقے ہیں ————— اور حسین!

اگر اصغر کا گلا زخمی ہوگا تو تیری گود میں ————— وہ تیرے حقے کا ہے ————— اور

کیئٹہ کے کان زخمی ہوں گے تو وہ میری گود میں ————— وہ میرا حق ہے —————

دونوں بہن بھائی مل کے اس میدان کو سر کریں گے ————— اور
حسین!

میں تجھے اکیلا بنیں چھوڑوں گی ————— ہر مقام پر ہر شکل میں تیرے

ساتھ رہوں گی حسین! —————

دنیا کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا ————— کہ کیا کرتا ہے ————— کہ بلا جا کر پتہ چلا کہ کیا ہو گیا

ہے ————— اور میری گفتگو ختم ہو گئی ————— بیباکین ختم ہو

گیا ————— مگر

یاد رکھو سامعین!

آج دنیا میں جتنی مجلسیں ہو رہی ہیں ————— یہ سب زینب کا سونہ ہے

در نہ ایک غیر آباد کن میں ٹٹ جانے اور مرجانے والے کانٹے کو کوئی جان بھی نہ سکتا۔۔۔۔۔
 زینب! اوٹھ کے منیر پہ بیٹھ کر۔ نگلے سر۔ بازاروں میں جا کر مجلس نہ پڑھتی۔۔۔۔۔
 ”روگو۔ میرا حسین مارا گیا۔۔۔۔۔“

یہ زینب کی مجلسیں ہیں جو ساری دنیا میں ہو رہی ہیں۔۔۔۔۔ یہ زینب
 کے مدتے میں ہو رہا ہے جو کچھ ہو رہا ہے۔۔۔۔۔ اور اللہ کا کوئی نام نہ لیتا (اللہ تو
 ہے اور ہو گا) اللہ کا کوئی نام نہ لیتا۔ اگر محمد نہ ہوتے۔۔۔۔۔ اور محمد کا کوئی کلمہ نہ
 پڑھتا۔ اگر حسین نہ ہوتے۔۔۔۔۔ اور حسین کا کوئی نام نہ لیتا۔ اگر زینب نہ
 ہوتی۔۔۔۔۔ آج زینب کی بدولت سارے نام لے جا رہے ہیں۔۔۔۔۔ اور
 میرے سامعین!

براہِ پاؤں کو بیٹھی ہے اور ہر بھائی کو بہن سے محبت ہوتی ہے۔ میں تو سمجھتا یہ
 ہوں کہ جب ہم مصیبت میں پکارتے ہیں ”یا علی! یا علی! تو علیؑ زینب سے کہتے ہیں۔۔۔۔۔
 ”بیٹی زینب!“

فلان نے مجھے مدد کے لئے پکارا ہے۔ تیری اجازت ہو تو
 جاؤں۔۔۔۔۔“ یہ زینب کا کا نام ہے۔

اللہ میں مردت محمدؐ و آل محمدؐ عطا فرمائے۔ بحق محمدؐ و آل محمدؐ
 ”ربنا تقبل منا انک انت السميع العليم“

~ ~ ~

”لاریب“ کتاب کا۔۔۔۔۔

”مفسر“ وہی ہو گا۔۔۔۔۔ جو۔۔۔۔۔

”ولاعیب“ ہو گا۔۔۔۔۔

(خطیب آں محمدؐ)

محبت

رض
(حلیب ابن منطاهر)

دغدغہ مند عالم کی حمد و ثناء کے بعد حضرات محمد و آل محمد پر درود و سلام
حضرات گرامی!

دنیا میں سب سے بڑی کشش کی شے کوئی ہے۔ جو انسان کا دل کھینچتی ہے۔ جو انسان
کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ تو وہ ہے ہی "محبت"۔ اگر محبت ختم ہو جائے تو یہ دنیا ہی
ختم ہو جائے۔ دنیا کا تم ہی محبت کے بل بوتے پر ہے۔

مری صاحبان! قرآن پڑھ پڑھ کے ہمیں بتاتے ہیں کہ دنیا سے کادوں جو ہوگا۔ اس دن
بھائی سے بھائی، چچا ہوگا۔ بیٹا باپ سے چچا ہوگا۔ اور باپ بیٹے سے اور عزیز ازیز سے
نفرت کرے گا اور ایک دوسرے سے بھاگیں گے۔ "اس سے میں یہ سمجھا ہوں۔
کہ اس دن "محبت" نہیں رہے گی۔ لہذا اس محبت نہ ہونے کے معنی قیامت ہے۔ جس
دن محبت نہیں ہوگی۔ کیا بتاؤں۔ کیا ہوگا۔؟ بس قیامت ہوگی۔

اور "محبت" کا الیک ایسا عظیم رشتہ ہے۔ جو انسانوں تک ہی محدود نہیں۔ دنیا کی
ہر شے میں اس کی حیثیت کے مطابق "محبت" ہے۔ پتھر میں بھی محبت ہے۔ نباتات
میں بھی محبت ہے۔ حیوانوں میں بھی محبت ہے۔ اور انسانوں میں بھی محبت ہے۔
آپ نہ کہیں۔ کہ پتھر کوئی نا سمجھ شے ہے۔ پتھر بھی سمجھا رہا ہے۔

بھی محبت ہے — پتھر میں بھی جان ہے۔ زندگی ہے۔ حیات ہے — اگر پتھر میں جان نہ ہوتی — تو پتھر پتھر کو مار کر اُسے کُشت نہ کتے — لفظ ”کُشتہ“، اس بات کی دلیل ہے — کہ زندہ تھا — اب کُشتہ ہوا — ”بہر نوع پتھر میں بھی زندگی ہے۔ پتھر میں بھی محبت ہے۔“

جب کوئی پتھر معدن کے اندر کچھ اور بنا چاہتا ہے — فیروزہ، عقیق، امیر یا کوئی اور شے — تو اُس پاس کے ذرے اُسے چپے رہتے ہیں — اور وہ امیر ابقا رہتا ہے — اور جن ”ذروں“ میں اس ”امیر“ کے ساتھ ”امیر“ بننے کی ”ملا جبت“ ہے — وہ ہر حالت میں اس کے ساتھ ”والبتہ“ رہتے ہیں — اور جن ذروں میں امیر بننے کی ملا جبت نہیں ہوتی — وہ چپے تو رہتے ہیں اُس کے ساتھ — مگر ذرا سی حرکت ہوئی تو — دو گئے

اسی طرح درختوں کی حالت ہے جناب! درختوں کو بھی محبت ہے — نفرت بھی ہے — آپ دیکھتے ہیں — کیسے ہرے بھرے سرسبز دشاواب درخت ہیں — ان کے پتے، شاخیں، پھول، پھل کتنے اچھے ہیں — ان میں زندگی ہے — حیات ہے — مگر ان کو زندگی بخشی ہیں ان کی وہ شاخیں جو زمین کے اندر غائب ہیں — اگر درخت کا تعلق ان شاخوں سے منقطع ہو جائے — جو زمین کے اندر شاخیں ہیں — تو درخت ختم ہو جائے۔ گویا باہر کا حصہ زندہ ہے اس کی بدولت جو زمین میں غائب ہے — اگر اس غائب سے سلسلہ منقطع ہو جائے — تو یہ درخت بھی مردہ ہو جائے

اب جو شاخیں زمین میں ہیں۔ وہ بڑی نرم و نازک ہیں۔

”تلاشِ غذا میں جلتی ہیں زمین میں ——— حیت تک نرم زمین ملتی رہتی

ہے ——— وہ جلتی رہتی ہیں ——— اگر کوئی پتھر ملنے آگیا۔

نوریں سے مزہ مٹ گیا ——— ہذا ان میں بھی نفرت و محبت کا مادہ

موجود ہے ——— جو شے پسند ہے ”رسمان اللہ!“ اور

جو نا پسند ہے ——— ”دھجھوڑ بھی ——— دفعہ کرو ——— جانے دو۔“

بہر نفع درختوں میں بھی محبت و نفرت کا مادہ موجود ہے۔۔

اور حیوان کی نفرت و محبت تو ظاہر ہی ہے ——— اگر آپ اس کے سامنے اچھا سا

چارہ رکھ دیں ——— تو کیسے چار کے کھائے گا ——— اور اگر کڑی لیکر مارنے کو بائیں ———

وہ بھاگ جائے گا۔“ ——— بچتا بھی ہے ——— محبت بھی کرتا ہے

پھر لطف یہ ہے۔ کہ حیوان میں جبرائیت کے باوجود ——— انسان سے خصوصیت ہے۔

کہ لوگ اس کے ہمدرد بڑے ہو جاتے ہیں۔ حیوان سے لوگ کو ہمدردی بڑی ہو جاتی ہے ——— حالانکہ

اتنی ہمدردی انسان سے نہیں ہوتی ——— جتنی حیوان سے ہوتی ہے ———

سامعین!

اگر میں کسی غذا، کسی کی شے، اس کی مرضی کے بغیر کھائوں ——— تو عمر بھر بے ایمان

کہلاؤں ——— مگر آپ کا گھوڑا، آپ کی بکری، آپ کا جانور، میرے جانور کی گھاس کھا گیا

——— سارا چارہ کھا گیا بغیر اجازت کے ——— اب میں اُسے مارنے لگا ——— تو

دیکھتے دالے اس کے حمایتی بن گئے ———

”رزیدی صاحب!“

جانے بھی دو ——— حیوان ہے ”بیچارہ“ ——— دوسرا

چارہ کھا گیا ——— پھر بھی بیچارہ ساری گھاس کھا گیا ——— پھر بھی

بیچارہ ——— پورا باغ کا باغ کھا گیا ——— پھر بھی بیچارہ۔

بہرِ نزع۔ لوگ ایسے حیوان کے حاشی بن جاتے ہیں ————— لہذا حیوان میں بھی
”نفرت و محبت“ کا مادہ ہوتا ہے۔ —————

اور انسان کی زندگی کا تو دار مدار ہی ”محبت“ پر ہے۔ اسے محبت بھی ہے
اور نفرت بھی ہے۔ ————— یہ چاہتا بھی ہے۔ بچتا بھی ہے۔ ”محبت“ نہ کرنا بھی
خلافِ فطرت ہے۔ ————— محبت کرنا بھی فطرت ہے۔ —————
سامعین!

”محبت“ خود ”نفرت“ کی خاتی ہے۔ جب کسی سے آپ
کو ”محبت“ ہو جائے گی۔ ————— تو خود بخود اُس کے مخالف سے
”نفرت“ ہو جائے گی۔ ————— لہذا محبت خود خاتیِ نفرت ہے۔
————— مُر شرط یہ ہے۔ کہ ہر ”محبت“ —————
مصدیت یہ بن گئی ہے۔ کہ آج کل کے زمانے میں۔ جس میں ہم ہیں۔ ————— اس میں
محبت ہے ہی نہیں۔ ————— بلکہ ”محبت نامی“ ————— ایک شے ہے۔ جس طرح گھی کی جگہ
گھی نامی چیز بکتی ہے۔ ————— دودھ کی جگہ دودھ نامی شے بکتی ہے۔ ————— اسی
طرح محبت نہیں۔ محبت جیسی ایک شے ہے۔ جس کا نام لوگوں نے محبت رکھ لیا ہے۔
میں بیٹھا ہوا تھا اپنے کمرے میں۔ ————— اُدھر سے ایک صاحب ملے
آئے۔ ————— دُور سے میں نے انہیں دیکھا کہ وہ آ رہے ہیں۔
میں نے کہا۔

”لا حول و لا قُدْر“ ————— یہ بلا۔ اب کہاں سے آگئی ہے۔
خواہ مخواہ کو میرا سر کھائے گا۔ ————— اسے چائے پلا نا پڑے گی۔
اور میں نے بہت سی برائیاں کیں۔

اور جب وہ حضرت آگئے کمرے میں بالکل قریب۔ ————— نہیں

فراگھڑا ہو گیا

”بسم اللہ تشریف لائیے۔ آنکھیں ترس گئیں آپ کے

دیکھنے کو۔۔۔ بڑی خوشی ہوئی ہے۔۔۔“

اس ”نفاق“ کے معنی لوگوں نے ”محبت“ رکھ لیا۔۔۔ حالانکہ یہ بیوقوف۔۔۔

مگر اس کے معنی ہیں ”محبت“۔۔۔ مدح و ثناء! بڑا اخلاق ہے۔۔۔“ یہ ”نفاق“ ہے۔۔۔ جس کو لوگ ”محبت“ کہتے ہیں۔

بعض اذنان دھوکا بھی لگ جاتا ہے آدمی کو۔۔۔ محبت نہیں ہوتی۔۔۔ مگر سمجھ بیٹتا

ہے کہ محبت ہے۔۔۔ حالانکہ محبت نہیں ہوتی۔۔۔ نیلیں گزر جاتی ہیں آدمی کی۔

مگر وہ دھوکا ختم ہی نہیں ہوتا۔۔۔ جس طرح ہمارے شناسروں کی نیلیں گزر

گئیں۔۔۔ اور وہ آج تک اسی دھوکا میں مبتلا ہیں۔ کہ ”پردانے کو شمع سے

محبت ہے۔۔۔“ یہ زرا دھوکا ہے۔ اور کچھ بھی نہیں۔ دیوان کے دیوان بھر دیئے

انہوں نے۔۔۔ ہزاروں۔۔۔ کٹوں شرکھ دیئے انہوں نے اس معنی پر۔ کہ وہ جو

پردانے ہوتا ہے نا۔۔۔ جانور، چمکا سا۔۔۔ دے شمع سے محبت ہے۔۔۔ ”وہ

شمع پہ عاشق ہے۔۔۔“

اب ان سے کوئی پوچھے

”پردانے نے نہیں کہا تھا۔۔۔ مدح و ثناء محبت ہے شمع سے۔۔۔“

اس نے تم سے شور مچا تھا۔۔۔ مدح و ثناء شمع سے محبت ہے۔۔۔“

تم کیسے سمجھ محبت ہے۔۔۔؟

مکہ ہم نے شمع کے قریب بیٹھا دیکھ کے یہ سمجھ لیا ہے۔ کہ

”پردانے کو شمع سے محبت ہے۔۔۔“

قرین سمن کرتا ہوں

”شاعرو! ”

قرب سے ہرنا اور بات ہے — محبت ہرنا اور

بات ہے —

کوئی شمع نے انہیں چٹھی لکھی تھی کہ — آجاؤ —

کوئی شمع نے آدمی بھیجا تھا — کہ — آجاؤ —

شمع یہاں روشن ہوئی — وہ خود آگئے — شمع کا یہ اخلاق تھا — کہ

اُس نے جڑ کا نہیں — بہرِ فضا وہ آگئے — اور اُس کے اس کے گرد اکٹھے ہو گئے

— اب اُس کے گرد اکٹھے ہونے سے آپ سمجھے محبت ہے — اور آپ کو دھوکا

لگنے کا سبب یہ ہوا — کہ شمع یہاں روشن تھی — پر دانے بھی یہیں موجود تھے —

اب شمع ہم اُٹھا کر یہاں سے کہیں اور لے گئے — تو وہ بھی ساتھ ہی ”ہجرت“ کر کے

چلے گئے — اس سے ہمیں یہ دھوکا ہوا — کہ انہیں بڑی محبت ہے —

حالانکہ ایمان سے پروانہ جتنا ہے شمع سے — اور جتنے کے بعد فضا

کرتا ہے — کہ شمع وہیں روشن ہے — اور اس کی ”دمیت“

کوئی ”ردائیں“ پڑی ہے — کوئی ”دبائیں“ پڑی ہے ۔

اب ان شاعروں کو کون سمجھائے — اور اگر میں سمجھاؤں بھی تو میری بات ان کی

سمجھ میں کہاں آئے گی — سینکڑوں برس کی دمان میں بیٹھی ہوئی بات — میرے کہنے

سے تھوڑا نکل سکتی ہے ۔

بجائی شاعرو! عزیزدا!

تمہارا غلط خیال ہے —

کہ پردانے کو شمع سے محبت ہے —

بالکل محبت نہیں ہے — اُسے بڑی سخت عداوت ہے شمع

سے ————— پر دانہ تو عاشق ہے اندھیرے کا۔ اُسے تو محبت
 ہے اندھیرے سے ————— اور
 شمع چونکہ اس کے محبوب کو، اندھیرے کو فنا کرتی ہے ————— یہ نامراد
 اُس سے رٹنے آجاتا ہے ————— اندھیرے کی حالت میں شمع سے
 رٹنے آجاتا ہے —————

تمہیں کیا خبر کہ اس کی نیت کیا ہے —————؟
 تمہیں کیا خبر کہ اس کے دل میں کیا ہے —————؟
 اگر تمہیں اس کی نیت کا، دل کا پتہ چل جائے ————— تو پھر پتہ چلے
 کہ حقیقت کیا ہے —————

اب یہ سارے اکٹھے ہو کے کہتے ہیں
 دزدیدی صاحب!

آپ بحیثیت مولوی، ہم پر موعظ ڈال رہے ہیں۔۔۔
 کہ ”میری بات مان لو۔“ ————— یہ بھی کوئی قرآن و حدیث ہے۔
 جو ہم مان لیں ————— یہ تو شاعری کی بات ہے۔ اس معاملے
 میں مولوی کو کیا دخل ————— مولوی اور شاعر تو ایک دوسرے
 کی ضد ہوتے ہیں ————— یہ تو ہمارا مسئلہ ہے۔ ہم بہتر
 جانتے ہیں۔۔۔“

بھائیو!

تم بہتر جانتے ہو گے ————— مگر تمہارے پاس کوئی دلیل نہیں کہ
 درخش سے پردانے کو محبت ہے۔۔۔“
 اندھیرے پاس دلیل ہے کہ ”پردانے کو شمع سے نفرت ہے۔۔۔“

دیل میری سنو — اس کی آمد بد قسم کر دو — تو میں تائل ہر طاق
لگا

شع مدش ہے — پرماذ تار ہے — قربان ہے —
موجود ہے — اور جب بچہ لگا — پھر
گھر چلا گیا

اگر محبت ہوتی — تو میت چھڑ کر چلا نہ جاتا —
عمر بھر تشر بان رہتا — اور میت چھڑ کے چلے جاتا —
یہ کوئی محبت کی باتیں ہیں

مگر اب آپ لوگ کہتے جریں — کہ مد محبت ہے، — اتنے
کہنے داور کی بات کو کون ٹال سکتا ہے — ہزاروں آدمی مل کے
جو کہہ رہے ہیں — اب اس بات کو کون روک سکتا ہے — اور
یہ شاعر صاحبان! مجھے گھوڑے ہیں کہ

دو دیل سے تو ہم تائل ہو گئے — مگر باہر نکل — پھر
پوچھتے ہیں —

اس بات کا میرے پاس کوئی علاج نہیں ہے — محض اپنی تعداد
زیادہ ہونے پر اکڑتے ہیں — اور مجھے تنہا سمجھ کر ڈرا
لیتے ہیں —

بہر نوع — شمع سے پروانے کو بالکل محبت نہیں ہے —

سامعین!

محبت چیز ہی اور ہے — محبت شے ہی اور ہے — محبت کا انداز ہی
اور ہے — ”محبت“ ایک ایسی شے ہے جو بیان نہیں کر سکتی — یہ ذوق کی شے

ہے — محبت بیان نہیں ہو سکتی۔ — اور —

”محبت“ وہی جانتا ہے۔ جس سے اس کا واسطہ پڑا ہو — کہ اس میں کیا لطف ہے۔؟
 — محبت میں جو دیوانگی ہے — اس پر شاہیں قربان ہو جاتے ہیں — محبت میں جو
 دیوانے کو لطف آتا ہے — وہ شاہی میں لطف نہیں آتا —

میرے محترم سامعین!

اگر دنیا میں اصلی، واقعی اور حقیقی ”محبت“ کی مثال ہے — تو وہ ایک اور
 صورت ایک محبت ہے۔ اور وہ ہے ”ماں کی محبت“ — ”ماں“ جو بیٹے سے ”محبت“ کرتی
 ہے — وہ ہے ”واقعی“ اور ”حقیقی“ محبت — بس اس سے بہتر محبت کئی دُنیا
 میں ہے ہی نہیں —

بچو! آپ کو یاد ہوگا — کہ جب تم دوسری تیسری کلاس میں
 پڑھتے تھے — اس وقت ایک کہانی پڑھی تھی — ”ماں کی محبت“
 سے متعلق —

ایک بچہ تھا — اس پہ دو دھڑتوں کا جھگڑا ہو گیا — ایک
 کہے — ”میرا بچہ ہے“ — ”ایک کہے“ ”میرا بچہ ہے“ —
 دو دھڑتیں ایک بچے کی ماں ہرنے کی مدد ہو گئیں —
 حاکم کے سامنے جب فیصلے کے لئے آئیں — اور حاکم خاکوٹی بڑا ہی
 قابل انسان — اس نے فیصلہ یہ کیا — کہ

”بچے کے دو ٹکڑے کر کے آدھا آدھا بانٹ دو —“
 اب جو جھگڑی ماں تھی — وہ تو راضی ہو گئی — اور جو بچی ماں تھی
 اُس نے کہا

”دنا — یہ بچہ میرا نہیں ہے — اسی کو دے دیں —“

اس بچے کو کچھ نہ کہیں ———

حضور والا!

یہ ہے رسال کی محبت کی ایک مثال۔ اس سے پتہ چلتا ہے ——— کہ
جب چیز ہو ایک ——— اور اس کے دویدار ہوں دو ——— ایک ہو جھوٹا ——— ایک
ہو سچا ——— اور اگر اس چیز کے بگڑنے کا اندیشہ ہو جائے ——— تو سچا گھر
بیٹھ جاتا ہے

میرے محترم بزرگو!

مصیبت کے ذلت انسان کے کام نہ پیدا آتا ہے ——— نہ کوئی اور شے آتی ہے
اگر مصیبت میں کوئی شے یاد آتی ہے تو وہ صرف ”محبت“ ہے ——— محبت ہی کام
آتی ہے ——— اگر بڑے بڑے بزرگانِ دین اور انبیاء کرام نے بھی کوئی مطالبہ کیا ہے ———
تو وہ ”محبت“ ہے ——— وہ بھی یہی چاہتے تھے کہ ”محبت“ ہو۔
دیکھو نا!

سینکڑوں کی تعداد میں آدمی کر بلا میں حسین کے ساتھ آ رہے تھے ——— اور ہر منزل
پر حسین! اُن سے کہہ رہے تھے ———
”بھائیو!“

میں رٹنے نہیں جاتا ہوں ——— کوئی ملک فتح کرنے نہیں جاتا
ہوں ——— کوئی مالِ عنیت ہمیں ملے گا ——— میں
مرنے جاتا ہوں ——— میں تباہ و برباد ہو جاؤں گا ——— میرا
گھر ٹپ گیا ہے گا ——— میرے بچے ذبح ہو جائیں گے ———
میں قبر نہیں ملے گی ——— ہمیں کفن نہیں ملے گا ——— جو میرے ساتھ ہیں
گے ——— ان پر بھی یہی گزرے گی ——— تم واپس چلے جاؤ ———

چنانچہ — بڑے اچھے اچھے ٹرنے والے جوان، واپس چلے گئے — اور جاتے جاتے
 جھوٹ کے صرت بہتر رہ گئے — اب چونکہ امام نہیں چاہتے تھے۔ اُن کی ضرورت
 نہیں تھی — اس لئے انہیں رخصت کر دیا — اس لئے کہ انہیں محبت نہیں
 تھی — ساقہ تو ہر لیئے تھے — مگر محبت نہیں تھی — اس لئے اُن ساتھ
 آئیوں کو رخصت کر دیا — اور جس سے محبت تھی — اُسے گھر بیٹھے کو خط بھیج
 رہا تھا۔

در نہ بتائیے —

اگر ضرورت تھی — تو انہیں کیوں جانے دیا — اور اگر ضرورت
 نہیں تھی — تو اُس بڑے آدمی کو کیوں بلایا؟ — مگر
 حسین! خدا کو رہے ہیں — اور خط کی طرف دوسطری لکھیں —
 ایسا معلوم ہوتا ہے — کہ اُس وقت بہت ہی پریشانی کا عالم ہو گا — اس
 لئے مطویل خط نہیں لکھتے — بڑی پریشانی کے عالم میں مختصر سا خط لکھا — اور
 خط کی عبارت کیا تھی

درجائی حبیب!

یا اخی حبیب!

حبیب کا دل تو درجائی کا لفظ پڑھ کے ایب دم الٹ پیٹ ہو گیا —

در حسین! — اور مجھے جانی کے —

درجائی حبیب!

میں تمہارے علاقے میں آ گیا ہوں — بڑی سخت مصیبت میں چسں گیا

ہوں — اگر مناسب سمجھو — تو میری مدد کو آؤ —

اور آخری فقرہ جس نے حبیب کے کھمبے کے ٹکڑے کر دیئے — وہ یہ تھا۔

”عجبیب!“

”میں تمہیں کبھی تکلیف نہ دیتا — مگر مجبوری یہ بن گئی ہے کہ

میرے ساتھ زینبؓ بھی ہے —“

”بہرِ فزع۔ مولانا نے خط لکھا — ”عجبیب! آگئے — پھر حسینؓ کی

چھوٹی سی فوج کی مدد بن گیا — جیبؓ مدد تھا حسینؓ کی چھوٹی سی فوج کا —

اور میں اپنے بیان کو یہاں آ کر ختم کرتا ہوں — کہ بی بی زینبؓ کو عجبیبؓ سے اتنی

محبت تھی — اپنے بھائی کے درست سے — بی بی کو اتنا اعتماد تھا عجبیبؓ پر — کہ

جب شام عاشور خیمے جلنے لگے — اور زینبؓ پریشان ہوئی ہے — تو

بی بی نے پریشان ہو کے حسینؓ کو نہیں پکارا — عباسؓ کو نہیں پکارا —

ایک دم گھبرا کے فرماتی ہیں

”بھائی عجبیب!“

”اؤ نا — دیکھو!“

”مجھ پہ کیا گزری —“

”اور بزرگانِ من!“

جب تانہ آں عسکد کو نے میں داخل ہوا — آگے آگے ہمارے پچھلے ہوئے امام

زین العابدینؓ چلتے چلتے ٹھہر گئے — وہ ٹھہرے تو ناقہ ٹھہرا — اور

جب ناقہ ٹھہرا — تو اُس پر سوار بی بی نے یہ سمجھا — کہ شاید جتنیے کو کوئی تکلیف ہو گئی

ہے — گھبرا کے پوچھتی ہیں

”بیٹا۔ زین العابدینؓ! — کیا بات ہے —؟“

”امامؓ فرما لے ہیں

”اماں — کچھ نہیں —“

اب بی بی پوچھتی ہیں

”دبیٹا! یہ بچہ کون ہے تمہارے ساتھ —؟“

تو امام نے فرمایا

”اماں — یہ چاچیبیٹ کا بیٹا ہے — ہم حبیب کے بچے سے

گزر رہے ہیں —“

وہیں سے بی بی نے آواز دی

”حبیب کے بچے!“

میرے جیسے! برخودار!

اماں کہاں ہے —؟“

”ہیں اُسے حبیب کا پُرسا دوں گی —“

سانے ایک مکان کے چھتے سے آواز آئی

”دبی بی! بچہ تیرے استقبال کے لئے بیٹھی ہوں —“

حضور دالا!

یہ سب محبت کے کرشمے ہیں — آج کربلائے معلیٰ جا کے دیکھو —

گنج شہیدان ایک طرف ہے — اور حبیب کی مریخی ایک طرف ہے —

”روندہ حبیبؑ.. حرم کے برآمدے میں ہے — بالکل یوں معلوم ہوتا ہے کہ

حسینیؑ رکاز کا پرائیویٹ سیکرٹری ہے — اس سے اجازت تو — تو اندر

جاؤ — اور حبیبؑ کا خاندان ”بنی اسد“ سے تھے — اور یہ ”بنی اسد“

وہ ہیں — جنہوں نے سید الشہداء کو دفن کیا تھا — اب بھی ہر سال تیسری محرم کو آتے

ہیں اُسی طرح — جس طرح حبیب آئے تھے دفن کرنے — اور حبیب

وہ صن میں آکر مٹی ڈال کے مولاؑ کی معنوی قبر بناتے ہیں — تو ان کا شیخ آتا ہے

حرم میں حبیبؐ کی مرضی پر۔ اور وہ حبیبؐ کی مرضی کی پٹری کے کتبہ ہے

حبیبؐ! تم میرے شکر گزار ہیں۔۔۔۔۔

حبیبؐ! قیامت تک تو نے ہماری آبرورکھی۔۔۔۔۔

حبیبؐ! تیری وجہ سے میرے خاندان کی عزت بن گئی۔۔۔۔۔

خداوندِ عالم اپنے فضل و کرم سے میرے، آپ کے دل میں مدعویتِ آلِ محمدؐ پیدا کرے۔۔۔۔۔

اے آلِ محمدؐ!۔۔۔۔۔ ہم تمہیں گواہ کرتے ہیں۔۔۔۔۔

اگر محبت کے استحقاق میں ہم پر سے نہیں اتارتے تو اتنا دعویٰ ضرور ہے۔ کہ تمہارے دشمنوں

سے ہمارا کوئی واسطہ نہیں ہے۔۔۔۔۔ اب تمہاری مرضی ہے۔۔۔۔۔ بدھ صحر چاہو بے جاؤ۔۔۔۔۔

ہم گنہگار ہیں۔۔۔۔۔ بہت زیادہ گنہگار ہیں۔۔۔۔۔ مگر شریعت اور اچھے غلاموں کو ڈانٹنا کتنا۔۔۔۔۔ تو

ہم اتنا کلام ہے۔۔۔۔۔ تمہاری شان تو یہی ہے۔ کہ ہم جیسے گنہگاروں اور ذبیہوں کو

اپنا کھدو۔۔۔۔۔ اللہ میں مدعویتِ محمدؐ و آلِ محمدؐ عطا فرمائے۔۔۔۔۔ بحق محمدؐ و آلِ محمدؐ۔

وَرَبَّنَا أَتَقْبَلُ مِنَّا اٰتَكَ اَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ۔ اللّٰهُمَّ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ وَآلِ مُحَمَّدٍ

۔۔۔۔۔

شمع۔۔۔۔۔ جلتی ہے۔۔۔۔۔ پیننگا موجود ہے

۔۔۔۔۔ جب۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔ مجھ گئی۔۔۔۔۔ تو گھر چلا گیا

۔۔۔۔۔ اگر۔۔۔۔۔

محبت ہوتی۔۔۔۔۔ تو میت چھوڑ کر چلا نہ جاتا

(خلیب آلِ محمدؐ)

اصطفیٰ

ELECTION AND SELECTION

(آمدِ حرم)

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

”خداوند جل جلالہ دعوتِ امت کی حمد و ثناء کے بعد حضراتِ محمد و آلِ محمد پر درود و سلام“

حضراتِ محترم!

خداوند عالم اپنی حکمت و مصلحت کے تحت اپنے کام کے لئے جس بندے کو موزوں سمجھتا ہے اُسے چُن لیتا ہے۔ اللہ نے اپنے اس چُننے کی فہرست کو یوں بیان کیا ہے۔

”إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ آدَمَ وَنُوحًا وَآلَ إِبْرَاهِيمَ رِزًا عَالَمِينَ“

اللہ نے آدم کو چُننا۔ پھر نوح کو چُننا۔ جس وقت آدم چُنے لگے۔ اُس وقت آدم کے علاوہ جو مخلوق تھی۔ وہ چُنے ہوؤں سے باہر تھی۔ جب نوح کو چُن لیا۔

اُس وقت نوح کے علاوہ جو مخلوق تھی۔ وہ چُنے ہوؤں سے باہر تھی۔ پھر یہ چناؤ کا سلسلہ وسیع ہوا۔ پھر فرد ”نہیں چُنے لگے بلکہ ابراہیم کی پوری آل“ کو چُن لیا۔

اس کے بعد آلِ ابراہیم میں سے آلِ عمران کو چُن لیا۔ اس طرح

اللہ اپنے کام کے لئے بندوں میں سے بندے ”چُن لیتا ہے“ اور یہ کہی ہو سکتا ہی نہیں کہ خدا کا چناؤ غلط ہو جائے۔ وہ جس کام کے لئے جس بندے کو چُنتا ہے۔ وہ یقیناً اُس کام کے لئے موزوں اور صحیح ہوتا ہے۔ کیا محال جو اُس میں کوئی غلطی ہو جائے۔

اللہ نے آدم کو خلافت کے لئے چنا۔

کہا تھا فرشتوں نے — یہ خون ریزی کرے گا — یہ فساد کرے گا —
 آپ حضرات بزرگ بیٹھے ہیں — آپ بتائیں ایمان سے — فرشتوں کی یہ کبھی ہوئی
 بات اولاد آدم نے سوئی صدی صحیح ثابت کر دکھائی یا نہیں۔ خون ریزی و فساد والی بات فرشتوں
 کی کبھی ثابت ہوئی یا نہیں — اس زمین کو فتنہ و فساد سے اولاد آدم نے بھر دیا۔ یا
 نہیں؟

بے چارے کوئی غلط تو نہیں کہہ رہے تھے۔ ٹھیک کہہ رہے
 تھے — مگر بڑے کی بات تھی۔ انہیں یہ نہیں کہا اللہ
 نے کہ ”تم غلط کہتے ہو“ وہ فساد نہیں کرے گا — خون ریزی
 نہیں کرے گا — بلکہ انہیں اسی طرح جھڑک دیا۔ جس طرح
 چھوٹوں کو بڑے جھڑکتے ہیں۔ ”إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ“
 خبردار! کچھ نہیں کہنا تم نے — ہم بہتر جانتے ہیں —
 وہ بے چارے پُپ ہو گئے — مگر ان کا خیال جو تھا۔ وہ
 بالکل صحیح ثابت ہوا۔

اب فرشتے جو یہ کہہ رہے تھے — ان سے پوچھو —
 ”فرشتو! تمہیں کیا خبر۔ یہ خون ریزی کرے گا۔“
 تمہیں کیا خبر — ”فساد“ کرے گا — کیا تم
 — ”عالم خیب“ ہو —
 فرشتے جواب دیتے ہیں۔

”جناب — غیب کا علم تو ہمارے فرشتوں کو بھی نہیں۔“
 پھر تم نے کیسے سمجھ لیا۔“

فرشتے بولے ”حضور! یہ تو سامنے کی بات تھی۔۔۔۔۔ اس میں غیب کی کیا بات تھی۔۔۔۔۔ ہمیں پتہ تھا کہ۔۔۔۔۔“

آدم کس طرح بن رہا ہے۔۔۔۔۔ اس کو بتادیکھتے ہی ہم سمجھ گئے تھے کہ اس کا ”بنا“ جو ہے۔ یہ ہمیشہ ”بنا“ نہیں رہے گا۔ ضرور بگڑے گی بات۔۔۔۔۔

سامعین! اللہ نے حکم دیا جبرئیل کو۔ زمین سے مٹی لاؤ۔۔۔۔۔ جبرئیل نے حکم خدا سے مٹی اٹھانے۔۔۔۔۔ زمین سے مٹی اٹھائی۔۔۔۔۔ زمین پوچھ بیٹھی۔۔۔۔۔

”قبلہ! کیا ارادہ ہے۔۔۔۔۔ مٹی کہاں لے جا رہے ہو۔۔۔۔۔؟“

جبرئیل نے جواب دیا۔

”اس سے اللہ کچھ بنانا چاہتا ہے۔۔۔۔۔“

زمین نے کہا۔

”جانے بھی دو۔۔۔۔۔ کیوں خاکساروں کو بناتے ہو خواہ مخواہ کیلئے۔“

کچھ ایسا زمین گر گڑ گڑائی۔ چلائی۔ فریاد کی۔۔۔۔۔ جبرئیل کو ترس آگیا۔ چھوڑ دیا۔

چنانچہ اللہ نے میکائیل کو بھیجا۔

”تم مٹی لاؤ۔“

میکائیل نے آکے مٹی اٹھائی۔۔۔۔۔ زمین نے پھر پوچھا۔

”قبلہ! کہاں لے جا رہے ہو۔۔۔۔۔؟“ میکائیل نے کہا۔

”اس سے اللہ کچھ بنائے گا۔۔۔۔۔“

مٹی نے پھر فریاد کی۔ ”چھوڑ دو۔۔۔۔۔ جانے دو۔۔۔۔۔ میرا خاک بنے گا۔۔۔۔۔“

چنانچہ میکائیل کو بھی ترس آگیا۔۔۔۔۔ پھر وہ آئے تیسرے فرشتے اسرافیل۔

انہوں نے کہیں سے مٹی اٹھائی۔ زمین پھر روئی پہنچی۔ چلائی۔۔۔۔۔ پھر وہ چھوڑ گئے۔

آخر اللہ نے ملک الموت کو حکم دیا۔

میں ہے ————— ”مٹی“ اسی میں ہے ————— ”ہوا“ اسی میں ہے۔
 ایسے چار کو ملا کر بنایا گیا ہے ————— نہ ان چاروں کی نسل ایک
 ————— نہ مذہب ایک ————— نہ مزاج ایک ————— نہ طبیعت ایک
 ————— کسی کا کوئی مزاج ————— کسی کا کوئی مزاج ————— کسی کا
 کوئی خاندان ————— کسی کا کوئی خاندان ————— ایسے چار کب تک مل
 کے رہیں گے۔ ضرور فساد ہوگا۔ ضرور جھگڑا ہوگا ————— وہ
 فرشتے تو آدم کی اجڑائے ترکیبی ہی دیکھ کر سمجھ گئے تھے ————— کہ
 ایسے چاروں کو ملا کر کبھی اکٹھا نہیں کیا جاسکتا۔ ————— ان میں ضرور
 ٹھنڈ پڑے گی۔ —————

اب ہم سب ان چار کے بنے ہوئے ہیں ————— میں تو ان چار کے بنے ہوئے آپ
 حضرات ————— مگر ایمان سے ایک جی ہم سے یہ نہیں کہتا ————— کہ ————— ”میں تو ”ہوائی“ بندہ
 ہوں۔ حالانکہ ”ہوا“ بھی موجود ہے۔ “ میں تو ”آبی“ بندہ ہوں۔ حالانکہ ”پانی“ بھی
 موجود ہے۔ اور ”ناری“ تو کون کہے گا۔ —————

دیے جب پوچھو ————— ”بھئی خاکی بندہ ہوں۔ —————“ ”باقی یاد ہی نہیں رہے۔
 ان کا نام بھی کبھی یاد کرو ————— ہوائی بھی کبھی بن جایا کرو ————— آبی بھی کبھی بن جایا کرو۔
 ————— نا۔ ی بھی کبھی بن جایا کرو۔ ————— دیے لڑنے مرنے کو تیار۔ ————— کہ چاروں میں
 دیے جب پوچھو۔ خاکی بندہ ہوں۔ بات کیا ہے حضور! —————

————— مسٹھی بھر دانے فقے ہمارے پاس ————— ہم نے وہ پانی میں پھینکے۔
 ————— تو گل گئے۔ ————— ہوا میں پھینکے۔ ————— تو اڑ گئے۔ ————— آگ میں پھینکے
 تو جل گئے۔ ————— اور خاک میں ڈالے تو ایک کے سو ہو کے واپس آ گئے۔

ہم نے چاروں کو آ زمانہ کے دیکھ لیا۔ ————— جو ہماری امانت واپس کرے اسی کا نام لینا۔

باقی سے ہمارا کیا واسطہ — ہم تو خالی بندے ہیں۔

بہر نوح اللہ نے آدم کو چن لیا۔ اس کے بعد نوح کو چن لیا۔ پھر آل نوح کو چن لیا۔ پھر آل ہرآن کو چن لیا۔ جس کو جس کام کے لئے چنا۔ بہترین چنا۔

چنے کے لئے عربی میں لفظ آتا ہے "اصطفیٰ"۔ "اصطفیٰ" اللہ نے چن لیا۔

ایک عربی ہی کا لفظ ہے "انتخاب"۔ اس کے معنی بھی یہی ہیں۔ مگر "انتخاب" میں اور "اصطفیٰ" میں فرق یہ ہے کہ "اصطفیٰ" کے معنی ہیں "چن لینا"۔ اور "انتخاب" کے معنی ہیں "چھانٹ لینا"۔ "چھانٹ لو"۔ یہ انتخاب ہے "چن لو"۔ "اصطفیٰ" ہے۔ تو جس بندے کا "اصطفیٰ" ہوتا ہے وہ "چنا" ہوا ہوتا ہے۔ اس کے معنی ہیں چن لینا۔ اور جس کا "انتخاب" ہوتا ہے۔ وہ "چھٹا" ہوا ہوتا ہے۔ اس کے معنی ہیں "چھانٹ لینا"۔ اگر بہت سے میں سے ایک چنے۔ "یہ اصطفیٰ ہے"۔ اور انگریزی پڑھے لکھے حضرات بتاتے ہیں کہ بہت سے چنیں۔ تو یہ سلیکشن () ہے۔ اور ایک چنے۔ تو یہ سلیکشن () ہے۔ "اصطفیٰ" کے معنی ہیں (سلیکشن) اور "انتخاب" کے معنی ہیں (ایلیکشن)۔ تو اللہ ایلیکشن نہیں کرتا۔ وہ سلیکشن کرتا ہے۔ وہ چن لیتا ہے۔ جس کو چن لیا۔ وہ اس کے لئے موزوں ثابت ہوا۔ کیا محال ہو وہ غلط ہو جائے۔

بہر نوح اللہ نے تمام کائنات کی نبوت و رسالت کے حضور مصطفیٰ کو چن لیا۔ اور ایسا چنا کہ نام کا جو بنا دیا۔ "مصطفیٰ"۔ "یہ ہمارا چنا ہوا بندہ ہے"۔ یہ کائنات کی رسالت کے لئے ہے۔ "یہ عالمین پر حکومت کرنے کے لئے ہے"۔ اسے چن لیا۔ اس سے بعد اس چنے ہوئے کی پھیلائی ہوئی، لائی ہوئی ہدایت کو کون منہمال مکتا ہے؟۔ اس کے لئے اللہ نے بندے چن لئے۔

اب آپ بچوں چراں " کریں یا حجب کریں — آپ کی "چونا چونی" کو اللہ

اپنے مقابلے میں نہیں سمجھتا — اُس نے چُن لیا جسے چُن لیا

اب آپ خود چھانٹتے ہیں آپ کی مرضی — — — — — محمدؐ کے بعد

اب یہ اُس کی ہدایت کو قائم رکھ سکتے ہیں — محمدؐ کو کچھ نامیں تو یہ

"چینا ہوا" کہے "بالکل ٹھیک ہے: — — — — — بالکل درست ہے — — —

بہر نوح یہ بندے بھی اللہ نے چُن لئے — — — — —

میرے عہد میں سامعین! دیکھنا — — — — — خدا نواز اللہ اگر کراچی پو میں آتی تھی یہ کہہ کے کرتا

کر لے کہ "یہ بندہ جراثیم پیشہ ہے" اور سارے کراچی والے اکٹھے ہو کر یہ کہیں — — — — —

"صاحب غلط ہے — — — — — یہ تو بڑا نیک آدمی ہے — — — — —"

تو پولیس پوچھے گی "جناب — — — — — آپ کب سے واقف ہیں — — — — —"

اور آپ جواب دیں — — — — —

"جب سے کراچی آیا ہے — — — — — ہم اس کے ساتھ ہیں — — — — — ایک منٹ کو ساتھ نہیں چھوڑ

ہم نے — — — — — کراچی شمشین سے جو ساتھ ہوئے ہیں — — — — — کتنے ٹک ساتھ ہیں — — — — —"

پولیس جواب میں کہے گی

"حضور — — — — — اس نے جرم کئے ہیں لاہور میں — — — — — اب آپ چُپ ہیں — — — — —"

لہذا ایسے آدمی جو بیان آنے کے بعد ساتھ ہوئے ہوں — — — — — وہ کیا گواہی دیں گے — — — — —

گواہی تو اصل وہ دیکھا جو وہیں سے ساتھ ہوا ہو۔ جہاں سے ہم آئے ہیں۔

اب ایسا گواہ تلاش کرو۔ جو کہ یہ حضور یہ غلط ہے۔ جہاں جہاں یہ تھا۔ وہیں وہیں میں

تھا — — — — — جہاں یہ تھا۔ وہاں میں تھا۔ میں گواہی دیتا ہوں اس کی — — — — — میں شہادت دیتا

ہوں اس کی — — — — — اسی باتوں کے لئے اللہ نے چُن لیا — — — — — تو اللہ چُن لیتا ہے

اور اُس کا چناؤ کبھی غلط ہو سکتا ہی نہیں — — — — — بہر نوح اللہ نے رسولؐ کے بعد "وہ انسان

پچھنے لگے کہ —————

”تم اس کام کے لئے ہو۔ جو کچھ محمدؐ فرما گئے ہیں۔ اس پر خود عمل کر کے دنیا کے دماغوں میں بٹھا دو کہ حق یہ ہے۔“

اور دیکھو! ”تم وار و خنجر بنا کر نہیں بھیجے گئے۔ کہ زبردستی ہر ایک کو اپنی بات منواؤ۔“
تم انہیں بتا دو کہ ”حق یہ ہے۔“ ————— پھر عجائبات ————— اور ان کا کام جانے ————— انہیں
بھگاڑ کر دے دو۔ ————— انہیں لڑنے دو۔ ————— آپ ہی دیکھو کہ کسی محوِ رہا پر آجائیں گے۔
تم کیوں خواہ مخواہ کے لئے کسی کے خلاف موافق بنو۔ ————— تم بڑے قیمتی ہو۔ ————— تم کوئی مفتی
نھوڑا ہی ہو۔ جو فتوے دیتے پھرو۔ ————— پہلے آپ منٹ لیں۔ ————— پھر خود بخود ٹھیک ہو جائیں گے۔
انہیں اپنی اپنی بات کہنے دو۔ جو کچھ کہہ رہے ہیں۔
اور آلِ محمدؐ خود آکے عمل سے سمجھاتے رہے۔

”دیکھو جی! یوں کرنا ہے۔ اس طرح کرنا ہے۔ ————— نماز اس طرح پڑھنی ہے۔ روزہ
اس طرح رکھنا ہے۔ ————— اور ہم لوگ جو شاگرد تھے اُن کے ہم بھی بیٹھے بیٹھے رہے۔
انہوں نے نماز سکھائی۔ ہم سیکھتے رہے۔ ————— زبان سے تو دہی کہتے رہے جو وہ کہلاوا رہے تھے۔
دیے کہتے رہے۔“ نہیں۔

دیکھو! روزہ رکھنا ہے۔ ————— روزہ رکھ لیا۔ ————— پھر ہم نے کیا کیا۔ ————— دو تین
منٹ رات سے پہلے۔ ————— کھول لیا۔ —————

اللہ نے کہا! محمدؐ! تمہارا کام تھا صرف بتانا اور سمجھانا۔ مگر یہ شرطی طالب علم ہیں۔ انہوں
نے وقت سے پہلے روزہ کھول دیا ہے۔ ————— انہیں ہمارے پاس بلاؤ۔ اور بچے پکھڑا کر دو۔
تین منٹ پہلے کھولنے کے جراتے میں رات کو دو گھنٹے کھڑا رہنا پڑا۔ ————— اگر دو تین منٹ
اور صبر کر لیتے تو رات آرام سے سوتے۔ —————

یہ نوعِ محمدؐ و آلِ محمدؐ ہمیں سکھاتے رہے۔ اور ہم اُن کے سکھائے ہوئے کے مطابق عمل کرتے رہے۔

اور انہوں نے جس کو جس کام کے لئے چنا۔ وہ اُس کے لئے موزوں نرئ انسان ثابت ہوا۔ جس بندے کو جس کام کے لئے چن لیا۔ وہ ايسا موزوں ثابت ہوا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ یہ پیدا ہی اسی کام کے لئے ہوا ہے۔ اس کی پیدائش کا مقصد ہی یہی ہے۔

بزرگانِ مہی آرام اور راحت کے وقت اطمینان سے بیٹھ کر کسی کو کسی کام کے لئے چن لینا اور بات ہے۔ اور انتہائی پریشانی کے عالم میں جبکہ حالت ایسی ہو کہ اپنی اولاد کے انتہائی خوبصورت چہرے سامنے ہوں۔ اور یقین ہو جائے کہ کل یہ چہرے سامنے نہیں ہوں گے پھر گھر کی طرف نظر جائے کہ میری پردہ دار عورتیں جن کی آواز گھر سے باہر آنا مجھے گوارا نہیں۔ ان کا یہ سارا پردہ صرف کل تک ہے۔ کل شام کو یہ پردہ نہیں رہے گا۔ اس پریشانی و اضطراب کے عالم میں کسی کو چنتا۔ اور وہ چناؤ غلط نہ ہو۔ یہ اللہ کے چنے ہوؤں کا کام ہے۔ یہ ہمارے بس کی بات نہیں ہے۔ اگر خدا کے کسی اور بندے پر یہ عالم ہوتا۔ پہاڑ ہوتا تو پانی ہو کر بہ جاتا۔ مگر یہ اللہ کے چنے ہوؤں کی بات ہے۔ ان تمام باتوں کے باوجود کیا محال کہ پریشانی پر پل آجائے۔ کسی بات میں فرق آجائے۔ پوری شان و استقلال کے ساتھ موجود ہیں۔ کوئی پرواہ نہیں کسی بات کی۔ ذرا جھجکنا نہیں۔ گھبرانا نہیں۔ پریشان ہونا نہیں۔ اس عالم میں چناؤ ہو رہا ہے۔ اپنے تو چنے ہی تھے۔ اب حسین نے کہا۔

”آؤ۔ ایک نظر دشمن کی فوج پر بھی ڈال دیکھیں۔ شاید اس ٹیڈی دل میں کوئی ایسا ہو جو ہمارے قابل ہو۔ شاید ان کسکروں و ڈھیریں کوئی ایسا ہیرا ہو۔ جسے ہم چن لیں۔“ حسین نے اس مجمعِ عام پر ایک نظر ڈالی۔ اور نظر سے چن لیا۔

”ہے ایک ہمارے قابل ہیرا۔“ جسے راستے میں ہم نے اب دی۔ جیسے ہم نے آبدار بنایا تھا۔“

اربابِ ذوق! فقرہ میں کتنا ہوں سمجھ تم لینا۔“

— جن کی تلواروں نے آلِ عمر سے انصاف نہ کیا — اُن کے قلم کیا انصاف کریں گے۔
جو چاہیں مکھ دیں — لفظ کے بدلنے سے مطلب بدل جاتا ہے — جس طرح ہمارے
سامنے یہ مکھ دیا کہ —

”حسینؑ نے (معاذ اللہ) ایک رات کی اُس فوج سے مہلت مانگی تھی —

حضرات! مہلت تو وہ مانگتا ہے جسے کوئی انتظام کرنا ہو — جس نے کہیں پہلے جانا
ہو — جس نے کہیں سے ٹک منگوانی ہو — جس نے کہیں سے رسد منگوانی ہو — مگر
حسینؑ مہلت مانگ کر کیا کرتے — جو مرنا ہی ٹھہرا تو کل کیا — اور آج کیا —
”جینؑ نے تو مہلت نہیں مانگی تھی — یہ غلط لفظ ”مانگی“ کا مکھ دیا تو میں نے — بلکہ
حسینؑ نے اُس فوج کو ایک رات کی مہلت اور دی — تاکہ وہ سوچ سمجھ لیں۔ وہ کیا کر
رہے ہیں —

حسینؑ نے مہلت اپنے لئے نہیں مانگی تھی بلکہ انہیں سوچنے سمجھنے کی ایک رات کی اور
مہلت دی تھی۔

”دیکھ لو۔ غور کرو — کیا کر رہے ہو۔ سوچ لو کیا کر رہے ہو —
کل تو تمہیں، مجھے، دونوں کو اللہ کے سامنے پیش ہونا ہے —
دیکھو — میرے انا کے سامنے جانا ہے تمہیں — میں نہیں ایک رات
کی اور مہلت دیتا ہوں — اور اس مہلت میں میں چُن لوں گا اُسے جو
میرے قابل ہوگا۔“

لہٰذا مولائے ایک رات کی مہلت دی تھی — حسینؑ نے رات رات میں چُن لیا —
اور چُنا بھی اُسے جو واقعہ کر بلا کا بظاہر سب سے بڑا ذمہ دار تھا۔

کیوں صاحبانِ بصیرت! واقعہ کر بلا کا سب سے بڑا ذمہ دار وہی شخص نہیں ہے جو راستے
میں فائدہ اہل بیتؑ کو گھیر کر لے آیا — جو ایک ہزار سواروں کے ساتھ جا کے ایک بے عزت فائدہ

برفوع - رات کو نگاہ انتخاب پر گئی حُر اپنے خیمہ میں کل رات کی تیاریاں کر رہا ہے۔
آخر ایک فوج کا سردار ہے۔ اُسی تیاری کے دوران کان میں ایک آواز آگئی۔۔۔۔۔ کوئی
بی بی کہہ رہی تھی۔

”حُر! میں نے یہ کیا بگاڑا ہے۔۔۔۔۔“

حُر گھبرا گیا۔۔۔۔۔ ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

”یہ کس کی آواز ہے؟۔۔۔۔۔ کس نے کہا ہے؟۔۔۔۔۔ کون ہے؟۔۔۔۔۔“ یہ حُر کے

ضمیر کی آواز تھی۔۔۔۔۔ اُس نے کہا۔

”میں سمجھ گیا۔ اس ساری بات کا میں ذمہ دار ہوں۔ صبح ہوئی۔۔۔۔۔ حُر کا رنگ ہی بدلا

ہوا تھا۔۔۔۔۔ انداز ہی اور تھا۔ اپنے ہزار ”رسالہ“ کو لے ہوئے امیر لشکر کے پاس آئے۔ اور کہا

عمر ابن سعد!۔ کیا لازماً لوٹنا ہے حسینؑ سے۔۔۔۔۔“

کیا صلح کی کوئی تدبیر نہیں ہو سکتی۔۔۔۔۔“

کیا یہ جنگ ٹل نہیں سکتی۔۔۔۔۔“

عمر سعد کہتا ہے۔

”حُر! اب ایسا نہیں ہو سکتا۔۔۔۔۔ حُر کو نہ حسینؑ کو تو لایا ہے

لہذا ”ہر اول“ بھی تو ہیں۔۔۔۔۔ تیری طرف سے پہلا حملہ ہونا چاہئے۔“

حُر نے کہا۔۔۔۔۔ ”عمر! تمہارے بات سن۔۔۔۔۔ مجھے یہ احتمال نہیں تھا کہ نوبت یہاں تک

پہنچ جائے گی۔۔۔۔۔ حسینؑ کو یہاں تک لانے کا میں ذمہ دار ہوں۔۔۔۔۔

مجھے خود اپنی ذمہ داری کا احساس ہے۔۔۔۔۔ لہذا میں حسینؑ کو

یہاں تک لانے کی معافی مانگنے جا رہا ہوں۔۔۔۔۔ حسینؑ مجھے

معاف کر دے گا۔۔۔۔۔“

عمر سعد کہتا ہے ”بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے۔۔۔۔۔ آنا بڑا سنگین جرم اور معاف

ہو جائے۔

خُ کہتا ہے۔

”عمر! میں جن کے پاس جا رہا ہوں۔ اُن کے رحم و کرم سے میں نَفْت

ہوں۔ — مجھے یقین ہے کہ وہ مجھے صاف فرما دیں گے۔

یہ کہہ کے خُ روانہ ہو گیا۔

ادھر سے خُ چلا۔ — ادھر سے امامؑ نے اپنے ساتھیوں کو فرمایا۔

”دیکھتے ہو۔ — ادھر سے کوئی آ رہا ہے۔“

امامؑ کے ساتھیوں نے عرض کی۔

”اے مولا! ہم دیکھ رہے ہیں۔ — کوئی تیزی سے گھوڑا دوڑا رہے

آ رہا ہے۔“ اب امامؑ کے ساتھیوں نے تلواروں کے قبضوں

پر ہاتھ رکھ دیا۔ — نیرکمان والوں نے کمانوں میں تیر چُن لے۔

سب امامؑ کے گرد اکٹھے ہو گئے۔ — سجے، دشمن کی فوج سے

کوئی سپاہی آ رہا ہے۔ — حبیبؑ وزیرِ فرزندِ جوفقیب

تھے امامؑ کی چھوٹی سی فوج کے۔ — انہوں نے آواز دی۔

”سپاہیو! ہوشیار۔ — اولادِ رسولؐ میں سے کسی کے کوئی زخم

نہ آنے پائے۔“ گویا تمام سپاہی تیار ہو کر کھڑے ہو گئے

— امامؑ نے حکم دیا۔

”دیکھو بھئی! میرے حکم کے بغیر کسی کا تیر نہ چل جائے۔ — کسی کا

دار نہ چل جائے۔ — اے آنے دو۔ جو آ رہا ہے۔“

اب سب کی نظریں اُسی گھوڑے پر لگی ہوئی ہیں۔ — جب وہ، اور قریب آیا۔

تمام حبیبی فوج نے دیکھا۔ — کہ وہ، اپنے گھوڑے سے اُترا۔ گھوڑے کی باگ

ڈال دی اپنے گانڈھے پر — اور ایک رومال اپنی جیب سے نکال کر اس سے اپنے دونوں ہاتھ باندھ لئے — اور وہیں سے پکارا۔

”رحمۃ للعالمین کے بیٹے!“

کیا دنیا کا سب سے بڑا گنہگار، تیرے دربار میں آسکتا ہے؟
خو کا یہ کہنا تھا — کہ امامؑ سفر آیا۔

”عباسؑ بھائی! تم میری فوج کو یہاں روکے رکھو — میں خود اسے لینے جاتا ہوں —“

امامؑ، حر کے قریب آگئے — اور حر نے کوئی تہیہ نہیں اٹھائی۔ کوئی واسطے نہیں دیئے — کوئی لمبی چڑی گفتگو نہیں کی — صرف اتنا کیا — کہ آتے ہی امامؑ کے گھوڑے کی رکاب پکڑ لی — اور رکاب پر سر رکھ کر کہتا ہے۔
”اَخْطَاْتُ يَا اَبْنَ رَسُولِ اللّٰهِ“

اے رسولؐ کے بیٹے! مجھ سے قصور ہو گیا ہے۔“

بس اتنا فقرہ کہا ہے — ”مجھ سے قصور ہو گیا ہے —“ اور امامؑ نے کھجاکر اس کی پیشانی ہاتھ میں رکھی — سر اٹھا کے سینے سے لگایا اور فرماتے ہیں۔
”بھائی! تم نے معاف کر دیا۔“

سامعین! امامؑ کا بھائی کہنا تھا — کہ جتنے سوار تھے فوج حسینیؑ کے، سب گھوڑوں سے نیچے اتر آئے — اور کہنے لگے۔

”ہم سے بے ادبی ہو گئی — امامؑ کا بھائی پیدل کھڑا ہے۔“

بہر نوع، حرؑ کو مرلا نے بھائی کبر کے معاف کر دیا — اور اُسی حرؑ سے سب سے پہلے جیٹ بٹگیر ہوئے۔ ”خو! مبارک ہو۔“

غرض ایک ایک سپاہی آکے حرؑ سے بٹگیر ہوا — اور شش الشہداء و حضورؐ

قمر بنی ہاشم، سپہ سالار افواج تاہرہ حنینہ، جناب عباس غازی نے سر پر علم کا پھر رہے مکمل
 دیا۔ — شہزادہ علی اکبر اور شہزادہ امیر تائب نے بروہہ کے چچا۔ کہہ کے سلام کیا۔
 — جنگل میں عید ہو گئی — اور حبيب " مبارک و سلام کی آوازیں بیت الشرف میں پہنچی
 — تو جناب زینب نے سن لیں — خیمہ کے دروازے تک آئیں —
 اشارے سے عمن و محمد کو بلایا — شہزادے آئے اور عرض کی
 " اماں! کیا بات ہے۔؟ "

شہزادہ علی عالم نے پوچھا۔

" بیٹو! آج کیا خوشی ہو رہی ہے۔ کیا عید ہو رہی ہے؟
 تو شہزادوں نے عرض کی۔

" اماں! — جس آدمی نے راستہ روکا تھا نا — وہ آیا ہے —
 اب وہ ہماری طرف آ گیا ہے — مولانا نے اُسے بھائی کہہ
 کے معاف کر دیا ہے —
 بی بی نے فرمایا۔

" اچھا یہ بات ہے — تم دونوں جاؤ — ایک طرف کی دایں طرف
 کھڑا ہو جائے ایک بائیں طرف کھڑا ہو جائے —
 اور دیکھنا! " ناموں کہہ کے بات کرنا — اور یہ کہنا کہ —
 " اماں۔ دعائیں دے رہی ہیں۔ "

سامعین!

شہزادے آئے۔ " خیر کو " ناموں کہہ کے بات کی — اماں کی دعائیں دیں —
 اور خیر یمن کو حیران ہو گیا۔ رنگ دروہ کی طرح سفید ہو گیا — تمام بدن کی ہڈیاں
 ٹکڑ ٹکڑ ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا ابھی دم نکل جائے گا — مولانا نے پوچھا —

”خُڑا! کیا بات ہے —؟“

خُڑے نے عرض کی۔

”خاتمہ کے بیٹے! کیا عرض کروں — حضورؐ نے تو معاف کر دیا — حضورؐ سے یہی توقع تھی — مگر جب میں نے راستے میں گستاخی کی تھی — تو مجھے پتہ ہے کہ عملوں سے مددنے کی آواز آئی تھی — میں جب مطمئن ہو سکے مروں گا۔ جنبِ نیت کی زبان سے معافی کا لفظ نہ سُن لوں — لہذا حضورؐ میرے سفارشی بن جائیں —“
مولانا نے فرمایا۔

”خُڑا! گھبراؤ نہیں — میں تمہیں چمکا ہوں —“

مولانا خُڑے کو لے کر دوا زے تک تشریف لائے — پردہ اٹھا — امام اندر خُڑے باہر — بیچ میں پردہ —
امام نے فرمایا۔

”زینب! بہن!“

خُڑے ہماری طرف آگیا ہے — زینب جواب میں فرماتی ہیں
”حسین! مبارک ہو — ایک ساتھی مل گیا —“

ادھر سے خُڑے نے دوا زے سے آواز دی

”مشکل کش کی بیٹی!“

اپنی اماں کی چادر کے صوفے میں مجھ گنہگار کو معاف کر دو۔ میں نے
بڑا انصاف کیا ہے —“

بس صاحبان!

جو کہنے کی بات تھی وہ یہ ہے کہ اگر زینب جواب میں فرمادیں۔

”ہم نے معاف کر دیا —“ — یہ بھی بڑا اخلاق ہے — جبریلؑ

حییٰ نے بھی معاف کر دیا تھا۔ زینب بھی معاف کر دے گی۔ مگر جو جواب دیا ہے علی کی بیٹی نے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ خاندان "بس اللہ کا چنا ہوا خاندان ہے۔ اور کسی کی طاقت نہیں یہ جواب دینے کی۔" حُرم نے گڑا گڑا کے معافی مانگی۔

شکل کٹا کی بیٹی! مجھے معاف کر دو۔ میں شکل میں پھنس گیا ہوں۔

زینب جواب میں کیا فرماتی ہیں۔

"بھائی حُرم! مجھے شرمندہ نہ کرو۔"

"گنہگار معافی مانگ رہا ہے۔ اور کریم شرمندہ ہو رہا ہے۔"

"بھائی حُرم! مجھے شرمندہ نہ کرو۔ تو ایسے وقت میں آیا ہے میرے دواڑ پر۔ کہ تیری کوئی خاطر نہیں کر سکتی۔ تجھے بٹھا نہیں سکتی۔ کچھ کھلا پلا نہیں سکتی۔"

حُرم! ایک تجھ سے وعدہ کرتی ہوں کہ قیامت کے دن میرے باپ کی حکومت ہوگی۔ آج کے بدلے وہاں تیری دعوت کروں گی۔ اس دن کی دعوت میرے ذمے ادا رہی۔

امس حُرم!

دنیا میں اتنا وعدہ تجھ سے کرتی ہوں۔ کہ اگر اس فوج بے جہانے مہلت دے دی تو میرا وعدہ ہے کہ حییٰ سے پہلے تیری لاش پہ آؤں گی۔ اور یہ سفید بال کھول کے تجھے "بھائی" کہہ کے روں گی۔ یہ میرا تجھ سے وعدہ رہا۔"

بی بی نے اس طرح معاف کر دیا۔ حُرم، مولہ کا چنا ہوا بندہ تھا۔

سامعین! آج کر بلا کے زاروں نے دیکھا ہوگا کہ حُرم کا روضہ اندس گنج شہیدیاں میں باقی شہیدوں کے ساتھ ہوتا۔ تو کون سمجھتا۔

"ایک معاف کئے ہوئے گنہگار کے ساتھ کیا کرم ہوا۔"

علیہ روضہ بنا ہوا ہے۔ دنیا کا زائر سلوک کو جاتا ہے۔ صبح سے شام تک۔

ہر رہی ہیں — میں نے خود کی ضرورت پکڑ کے کہا تھا۔

ہشبیہ! تو زندہ ہے — تو مجھے بول کے جواب دے۔ ایک

شاہنشاہ کی فوج کی انفری میں زیادہ لطف آیا یا ایک غریب الغریاء، بھوکے
پیاز سے کی مہانی میں زیادہ لطف آیا۔

بہر نزع۔ یہ حسین کا چٹا ہوا بندو تھا۔ کیا مجال جو حُیّٰں کے چٹائی میں کوئی غلطی ہو جائے

محمد و آل محمد جب کسی کو کسی کام کے لئے چن لیتے ہیں تو وہ یقیناً اس مقصد کے لئے موزوں ثابت
ہوتا ہے۔

خداوندِ عالم۔ اپنے حبیب کے صدمے میں ہم سب کو یہ توفیق دے کہ قیامت کے
دن حُیّٰں فرما دیں

”ان بندوں کو میں نے چن لیا ہے۔“

اللہ ہمیں مورتِ محمد و آل محمد عطا فرمائے۔

رَبَّنَا اقْبَلْ مَنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ

اللَّهُمَّ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ وَآلِ مُحَمَّدٍ

اصطفیٰ

کھوٹا روپیہ اسے کہتے ہیں — جو

پبلک کا بنایا ہوا ہو

کھرا روپیہ اسے کہتے ہیں — جو

سرکار کا بنایا ہوا ہو (خلیب آلِ محمد)

اسلام — روزه براندام ہو گیا؟

(مصائب شہزادہ امیر قاسم)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

رد خداوند عالم عز اسنہ وجل جلالہ کی حمد و ثناء کے بعد حضرات محسّد و آل محمّد پر درود و سلام

حضرات گرامی تدر!

ہمارا اس دنیا میں آنے کا مقصد ہی مرث یہی ہے کہ ہم حضرات محمّد و آل محسّد سے اپنا تعلق قائم رکھیں — اور تعلق ہی ایسا قائم رکھیں کہ ہم اپنے ہر قول و عمل کو ان کے آئنا تابع بنادیں۔ کہ ہماری کوئی بات یا کوئی عمل ان کی مرضی کے بغیر نہ ہو۔ اور ہمارے کسی عمل و قول سے ان کی (مذا و خواست) ناز و مکی کا پہلو نہ نکلا ہو — ہمیں ایسا عمل کرنا پڑا ہے جس سے آل محمّد خوش رہیں — ہماری خرابی بابت خود کوئی شے نہیں ہے — ہمیں تو ہر لمحہ ہر وقت ان کی خوشنودی چاہیے۔

ناز ہے۔ روزہ ہے۔ یہ نیک اعمال جو ہم کرتے ہیں — بے شک ان کی تبت میں یہی ہے کہ ہم ”قربۃ الی اللہ“ کر رہے ہیں — اس کے ذریعہ سے ہم خدا کے قریب بننا چاہتے ہیں — مگر ”قربۃ الی اللہ“ نہیں ہے — اللہ کے قریب بننا نہیں ہے — جب تک ہم محمّد و آل محسّد کو قریب نہ کر لیں — تبنا زیادہ ہم محمّد و آل محسّد کو قریب رکھیں گے۔ اتنا ہی زیادہ ہمیں اللہ سے قریب حاصل ہوگا — اور جتنا محسّد و آل محمّد سے دوری ہوگی۔ اتنا ہی اللہ ہم سے دور ہوگا۔ ورنہ اللہ بذات خود قریب یا بعید ہونے والی شے نہیں ہے — اللہ تو قریب ہے۔ بس قریب ہے

تقریب ہے — یہ نہیں کہ کبھی قریب ہو گیا۔ اور کبھی بعید ہو گیا — اللہ تو وہیں ہے جہاں ہے — بس آلِ محمد کی خوشنودی ہی خدا کی قربت ہے۔ اور ان ہی کو خوش رکھنا خداوند عالم کے قریب ہونے کی دلیل ہے

محترم سامعین!

آپ نے نماز پڑھی — بے شک قربۃ الی اللہ پڑھی۔ خداوند عالم کے ”قرب“ کے لئے پڑھی — اور اس تقدس کے ساتھ کہ بدن پاک ہو۔ لباس پاک ہو۔ اور وہ پانی پاک ہو جس سے آپ نے وضو کرنا ہے — اتنی طہارت کے ساتھ آپ مصطفیٰ پر آئے کھڑے ہو گئے — اور حسبِ فرمانِ رسولؐ کہ ”غزوات میں کی معراج ہے“ — آپ کو وہ معراج ہو گئی — اب نازی کی براہِ راست گفتگو ہو رہی ہے

اللہ کی حمد بھی کی۔ ثناء بھی کی۔ خدا کی تعریف بھی کی — اُسے رب العالمین، بھی کہا — رحمن و رحیم بھی کہا — مالکِ یوم الدین بھی کہا — اس سے صراطِ مستقیم پر قائم رہنے کی التجا بھی کی۔ مرغوب و خیال سے بچنے کی بھی دعا کی — پھر کوئی اور سورۃ بھی پڑھی — اور سرُجھکا کے اس کی عظمت کا اعتراف بھی کیا — پھر سجدے میں سر رکھ کے اس کے اعلیٰ ہونے کا اعتراف بھی کیا — اور بیٹھ کر اپنے گناہوں کی معافی مانگی — غرض سب کچھ کیا آپ نے نماز میں — پھر اس کے بعد واحد اللہ شریک، ہونے کی شہادت بھی دی — محمدؐ کے بعد و رسولؐ ہونے کی گواہی بھی دی — اور سب کچھ کہنے کے باوجود نماز میں ہے۔

اب تم اپنی نماز سے کہتے ہو ”قبول ہو جا“ —

تو نماز جواب میں کہتی ہے ”میں نے قبول خاک ہونا ہے“

پھر ہم پوچھتے ہیں ”دیکھو — کیا بات ہے؟“

تو نماز کہتی ہے

پاسپورٹ کے بغیر میں کیسے جاؤں گی۔۔۔۔۔“

نمازی بجاؤ!

اب اتنی لمبی پڑھی ہوئی ناز! مٹھری ہوئی ہے بغیر پاسپورٹ کے —

اب نماز کتنی ہے

”میرا یا سپورٹ کیا ہے؟“

تو ہم نے عرض کی

”آپ خودی بتائیں۔“

اب نماز پوری !

”میرا پاسپورٹ یہ ہے کہ — جب تک نمازیں

دَمِ درود نہ آئے۔ میں کیسے جاؤں اُس ملکِ قبول میں۔۔۔

لہذا اتنی لمبی حیرتی نماز! ٹھہری ہوئی ہے کہ جب تک محمد و آل محمد

یہ درود نہ بھیجا جائے میں کیسے جاؤں

بہارِ نوح۔ محسنِ دآلِ محمد پہ درودِ پڑھو تو نازِ بربانی کی۔۔۔ اب اگر میں درود

یہ پڑھو "اللہم صلی علی محمد"۔۔۔۔۔ نماز ہوئی؟

— — — — — نہیں “

معہوم ہوا کہ درود میں محض ”محسّد“ کا نام لینے سے نماز نہیں ہوتی۔۔۔۔۔ اس

نے کہ محمد فانا، تو ہم بھیجے بھی لے چکے ہیں۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ جب تک دو

جواب تک نہیں یہ۔۔۔ اُس وقت تک نماز نہیں برقی۔۔۔ ہم اللہ کا نام بھی

اے چپیر۔ محسوس کا نام بھی لے چکے ہیں۔۔۔ یہ صرف لفظ ”آل محمد“ ہے جس کی بدولت نواز

جھوٹنی۔۔۔۔۔ اور اگر میں نے ازراہ عقیدت یہ کہہ دیا۔

بھس یہاں سے فرق کا پتہ چل جاتا ہے ”آلِ محمدؐ“ میں اور دُستارِ محمدؐ میں ۔۔
کرا آلِ کلام نہ لو — تو غازی نہیں ہوتی — اور صحابہؓ کا نام لے لو — تو غازی نہیں ہوتی ۔۔
بہر نفع : یہ حکم خدا ہے جو ہمیں آلِ محمدؐ کی طرف لے جاتا ہے کہ ان سے واسطہ رکھو تو غنازا
غناز ہو جائے گی ۔۔ بر عمل بہر عبادتِ محمد و آلِ محمد کے ساتھ وابستہ رہے تو سب کچھ
ہے ۔۔ اس لئے یہ سب چیزیں تعلق رکھتی ہیں ”دینِ اسلام“ ۔۔
اور ”دینِ اسلام“ وہ شے ہے جس سے حضرت محمدؐ و آلِ محمدؐ نے دنیا کو روشناس کرایا
ہے ۔۔ انہوں نے پہنچایا دنیا کو کہ اسے کہتے ہیں ”دینِ اسلام“ ۔۔ یہ شے ہے ”اسلم“ ۔۔
اس کے معنی ہیں ”اسلام“ ۔۔ یہ سمجھا جاے میں محمد و آلِ محمدؐ نے

سامعین !

آج تو ہماری حالت ہی اور ہے۔ آج تو آزادی کا دور ہے۔ ہر شخص دنیا میں آزاد ہے۔ اور اس آزادی کے دور میں ہر شخص یہ کہتا ہے کہ۔۔۔ دوس میری بات نہ کرے آخر ہے۔

”میں کتابوں“ میں یہ کتابوں ” آج ہے مدیں “ کا زمانہ
اور اگر آج کی نئی پردے پوچھو

”بھئی۔ اسلام کیا ہے۔ دین کیا ہے؟“

”بس۔ وہی جو ہم کہہ رہے ہیں“

آج تو دنیا میں ہر شخص آزاد ہے وہی کرتا ہے جو اپنے ماول سے متاثر ہو کر دنیا ہے
اور ہماری سمجھ تو اتنی ہے کہ میرا ایک عزیز نے والا جو تقریباً تین سو سو برس

تھا۔۔۔۔۔ اور میری بچی ضد گردہی تھی

مہ آما ! آج پندرہ شعبان ہے ۔

میں نے کہا

”پھر کیسے“

تو وہ بکھی بولی —

”بابا۔ آج تو شبِ برات ہے،“

میں نے کہا

”میں بڑا۔ آج شب برات ہے۔“

بیجی بولی

”آج تو بارے المم کی پیدائش کا دن ہے“

میں نے کہا

مناں بٹیا۔۔۔ ٹھیک ہے۔۔۔ مگر تم کیا چاہتی ہو؟

تو تجھی نے کہا

”بابا! آتش بازی چاہیں گے۔“

میں بولا

”ناٹیا۔۔۔ موری صاحبان کا فتویٰ ہے کہ آتش بازی نہیں چلانی چاہیے۔۔۔ اتنا

پیسہ بھی حلوے میں لگاؤ۔

مگر وہ بچہ مند کر رہا تھا۔ بھلا معصوم کی ضد کو کون روکے۔ آخر اسی تین یونیورسٹیوں

کے پڑے مکھے نوجوان کو میں نے تین روپے دیدیے اور کہا

مدیر خود را

تم تین یونیورسٹیوں کے پڑھے لکھے ہو۔ ذرا تین روپے بے جا کے انار تو لے آؤ۔
 بچی ضد کر رہی ہے کہ شب برات ہے۔ اور دیکھنا انار ذرا اچھے ہوں۔
 وہ برغزدار روانہ ہو گئے۔ اور تھوڑی دیر کے بعد واپس آئے۔
 اور رومال میں بندھے ہوئے انار میرے سپرد کر دیئے

ورزیری صاحب!

بہترین قندھاری لایا ہوں۔

اسامین! اب آپ بتائیں۔ لایا انار ہی مگر صبح لایا۔؟
 ”ہنیں“ غلط لایا۔ تین یونیورسٹیوں کا ایم اے پاس۔ تین روپے
 کے انار لایا۔۔۔ پر اچان سے بناؤ۔۔۔ صبح لایا؟
 غلط لایا۔ آخر صبر کے کاغذ بن گیا۔

”اچھا بیٹی“

ایم اے ہونا اور بات ہے۔ بات کا سمجھنا اور بات ہے۔

اب جو بچی کو میں نے بلایا

”بے بیٹی۔۔۔ انار آگئے۔“

جناب! انار دیکھتے ہی اس کے چہرے پر تو بھجڑیاں چھوٹ گئیں۔ اور وہ بچی
 پورے غصے میں بولی ”یہ انار کون لایا ہے“

بہر فرما۔ معصوم کی فرمائش اور متقی۔۔۔ لانے والے کی سمجھ اور متقی۔۔۔ خیر صبر کر لیا۔
 میں نے کسی اور کو بھیج کر انار منگوایے۔۔۔ آج اس دن کے بعد وہ بھی برغزدار
 پھر ملنے آگئے۔ اس دن بچی کا طبیعت کچھ خراب تھی۔۔۔ ڈاکٹر نے انار بتایا تھا
 ۔۔۔ اور آدمی کوئی تھا نہیں اس وقت میرے پاس۔۔۔ آخر میں نے ان کو ہی پیسے دے
 دیئے اور کہا

”یٹیا! ذرا تکلیف کرو۔ آدھ سیر انار لے آؤ۔“

مگر اس دن کے ڈرے برے اب جو انار لائے تو بہترین آتش باز کے انار لائے

سامعین! لایا انار ہی ہے۔ دونوں مزہ انار لایا۔ _____

ایمان سے بنا ڈھیچ لایا؟ _____ ”نہیں۔“ غلط لایا۔ _____

اپنی زبان۔ آسان سا لفظ۔ روزمرہ استعمال ہونے والا لفظ۔ اور

وہ بھی پڑھا کھٹا آدمی۔ غلط بھی نہیں لایا۔ _____ کوئی یہ بھی نہیں

کہہ سکتا کہ غلط لایا۔ _____ انار ہی لایا مگر غلط لایا۔ _____

ایسے غلط کو میچ کہہ دینا۔ _____ چاہے وہ ایک جویا ہو۔ _____ چاہے دو لایا ہو یا چھ لایا ہو۔

کچھ بھی ہو۔ _____ میچ کہہ دینا ایسے عمل کر۔ یہ بھی غلط ہی بات ہوئی۔ _____ کیوں؟

معی کو نہ سمجھا۔ _____ موقع کو نہ سمجھا۔ _____ وقت کو نہ دیکھا۔ _____ حالات کو نہ دیکھا۔ یہ نہ پتہ چلا

تاریخ کیا ہے۔ _____ یہ نہ پتہ چلا آج موقع دعویٰ کیا ہے۔ _____ اور ایک موقع دعویٰ نہ سمجھنے سے

ایک پڑھا کھٹا آدمی! میچ چیز لا کر بھی غلط ہو گیا۔ _____ اور _____

اتنا غلط کار انسان! اگر قرآن ماتحت میں لے کر یہ کہے کہ

”میں سمجھ گیا۔“ _____ ارے تو تو انار نہیں سمجھا۔ _____ مصلحتیہ کیا معلوم! _____

نتیجہ کیا پتہ کہ یہ بات کب کہی تھی۔ _____ کہاں کہی تھی۔ _____ کس سے کہی تھی۔ _____ کس نے کہی تھی

کس وقت کہی تھی۔ _____ یہ صرف تیری قیاس آرائی ہے

نور دیکھئے صاحب! میں سمجھ گیا۔ _____

”بھئی کیا سمجھا؟“

”قرآن مجید میں لکھا ہے کہ رسولؐ تم جیسا بشر ہے۔“ انا بشر مثلكم۔

مصلحتی۔ _____ طبعیک ہے۔ _____ لکھا ہے کہ ”میں تم جیسا بشر ہوں۔“ مگر یہ آیت اللہ نے

کب نازل کی تھی۔ _____ کہاں نازل کی تھی۔ _____ اللہ نے کب یہ فقرہ رسولؐ سے کہلوا یا تھا۔ _____

تباؤ تو بھی اہان سے — جب ابو جہل سلسنے بیٹھے تھے۔ جب کہا تھا رسولؐ نے نہ میں تم جیسا ہوں۔ — جگ بدر میں جو رسولؐ سے ٹڑ رہے تھے۔ اُن کا فروں سے رسولؐ نے کہا تھا۔ میں تم جیسا ہوں۔ — جگ اُحد میں جو ٹڑ رہے تھے۔ رسولؐ اُن سے کہہ رہے تھے۔ میں تم جیسا ہوں۔

”نہیں جناب! یہ اُن سے نہیں کہا تھا کہ میں تم جیسا ہوں۔“

”پھر کس سے کہا تھا۔ — فرق تو نکلا ہی آخر۔“

پھر عام بات تو نہ رہی۔ — سارے مسلمانوں سے وہ کہہ نہیں سکتے۔ — چند مسلمان ایسے تھے جو عمر بھر کا قریبے اور آخروں میں مسلمان ہو گئے۔ — پھر کس سے کہا رسولؐ نے کہ میں نہ تم جیسا ہوں۔ — کوئی خاص موقع ہو گا نا کہنے کا۔ —

اے حضور والا!

بات مختصر کرنا ہوں۔ — حلقہ محمدؐ و ہزننا جا رہا تھا۔ — اور محمدؐ دہرتے ہرتے جب ایک چادر میں سمٹ کے آگے چار آدمی رسولؐ کے ساتھ۔ — اور جب رسولؐ کو چادر چاند لگے ہوئے تھے۔ —

تو اس وقت اللہ بھی خوش تھا۔ — رسولؐ بھی خوش تھا۔ — چادر میں سب بیٹھے تھے۔ — اپنا ماحول تھا۔ — اپنا گھر تھا۔ — اپنی جگہ تھی۔ — اپنا کنبہ تھا۔ — اپنا داماد تھا۔ — اپنی بیٹی تھی۔ — اپنے بیٹے تھے۔ — سب اپنے ہی اپنے تھے۔

اور ”اپنے“ کا لفظ! اتنا پیارا ہوتا ہے کہ خدا جانے — لفظ ”اپنا“

اور لفظ ”پیارا“، خود بخود آ جاتا ہے۔ — جس طرح اپنا گھر۔ —

اپنا کنبہ۔ — اپنا خاندان۔ — اپنا ماحول۔ — اپنا داماد۔ —

اپنی بیٹی۔ — اپنے بیٹے۔ — چادر میں سب بیٹھے تھے۔

اور اتفاق سے امیر المومنینؑ نے یہ پوچھ لیا۔

مدیا رسول اللہ!

ہم جو اس وقت اکٹھے بیٹھے ہیں چادر میں۔ اللہ کے نزدیک اس کی
نفیست کیا ہے؟

رسولؐ نے فرمایا

”وہ سب اللہ۔۔۔ اس کو اگر کوئی بیان ہی کرے گا۔ تو اس کی تمام حاجتیں پوری
ہو جائیں گی۔“

میں نے کہا

”مصور کے صدقے میں ہیں بڑی سادہ و نعیم ہوئی ہے۔“
رسولؐ مسکرا دیئے اور پیار سے چٹائی کی پیشانی چوم لی۔ اور فرمایا
”تم میرا شکریہ ادا کرو۔“ میں بھی تم جیسا ہوں۔“ اور اس وقت
اللہ نے آیتِ تعبیر بھی نازل کر دی۔

بہر نوا۔۔۔ قرآن سمجھنے سے پہلے۔۔۔ مرقع دیکھئے۔۔۔ محل دیکھئے کہ یہ بات
رسولؐ نے کب کہی تھی۔ کہاں کہی تھی۔ کس سے کہی تھی۔ کس وقت کہی تھی۔
تب جا کر تمہیں کہیں قرآن کی سمجھ آئے گی۔
اور یاد رکھو بزرگو!

قرآن اللہ کی کتاب ہے۔ اور آئی مجسّمہ اس کتاب کے محافظ ہیں (حاکم نہیں) وہ اس
کتاب کے محافظ ہیں۔ اور کتاب ان کی محافظ ہے۔ اور مصنف نے اس نزاکت کے ساتھ
اس کتاب کو لکھا ہے۔ کہ عربی زبان۔“ منتخب کی ہے اس کتاب کے لئے۔ اور عربی گرامر
کی اتنی احتیاط ہے اس اللہ کی کتاب میں کہ جہاں زہر ہے۔ ہی رہے گا۔ جہاں دزیر،
ہی رہے گا۔

کب اللہ کے دزیر، کو کوئی دزیر، کر دے۔ اور دزیر کو کوئی دزیر، کر دے۔

تو سارا ایمان زیر و زبر ہو جائے گا۔۔۔۔۔ یہ کتاب اسلام کا نظریہ ہے۔ یہ کتاب اسلام کا قول ہے۔۔۔۔۔ مگر آل محمد عمل کر کے بتاتے ہیں اس پر۔ کہ اس میں یہ لکھا ہوا ہے۔۔۔۔۔ اے یوں کرنا ہے۔۔۔۔۔ اے اس طرح کرنا ہے۔۔۔۔۔ دیکھو نا!

تعلیم کا قاعدہ یہی ہے (لفظ ”قاعدہ“ یا در کھنا) کہ معصوم بچہ گیا مدرسے میں پڑھنے۔۔۔۔۔ اور سامنے آگئی ایک کتاب۔۔۔۔۔ جس کا نام ہے ”قاعدہ“ (جو کتاب معصوم کو پڑھائی جائے) اسے ”قاعدہ“ ہی کہتے ہیں) اور اس قاعدہ میں معصوم کو پڑھایا گیا ہے۔۔۔۔۔

”الف“۔۔۔۔۔ ”ب“

نرا ”الف“۔۔۔۔۔ ”ب“ ہی نہیں۔۔۔۔۔ بلکہ بچے کو دو بن نشین کرانے کے لئے ”الف“ کے سامنے ”الف“ سے ”آم“ ”بکری“ اور ”شیر“ سے شیر ”نرا پڑھایا ہی نہیں جاتا۔۔۔۔۔ بلکہ سامنے ”آم“۔۔۔۔۔ ”بکری“ اور ”شیر“ کی تصویر بھی لگائی ہوتی ہے۔۔۔۔۔ تاکہ بچہ صرف ”شیر“ سے شیر ہی نہ رٹ لے۔۔۔۔۔ بلکہ وہ شیر کی تصویر بھی دیکھ لے۔۔۔۔۔ بہر فرح۔۔۔۔۔ یہ ہے بچوں کو سکھانے کا ”قاعدہ“۔۔۔۔۔ محض کتاب ہی نہ رٹاؤ۔۔۔۔۔ جو پڑھ رہے ہو۔ اس کی تصویر بھی دکھا دو۔۔۔۔۔ لہذا خدا تبارک ہے ”دیوں کہتے رہو“۔۔۔۔۔ اور آل محمد اس کی تصویر پر ہیں۔۔۔۔۔ اس کی تعبیر ہیں۔۔۔۔۔ بغیر ان کے تعلق کے تہدی پڑھائی ادھر رہ جائے گی۔۔۔۔۔ گویا بغیر تعلق آل محمد نہ کتاب پوری ہو سکتی ہے اور نہ کافی ہو سکتی ہے۔۔۔۔۔ کتاب ہے ”لا دیبے فیہ“ اور اس کی تصویر دی بن سکتا ہے۔ جو خود کا عیب فیہ ”جس میں کوئی عیب ہی نہ ہو۔

سامعین!

ایک بات بتاؤ۔۔۔۔۔ جو سورۃ پیر کا نوٹ ہوتا ہے اس کے کاغذ کی بازار میں کیا قیمت ہے؟ بعد پر ٹنگ دھپائی و بیروہ کے تقریباً

چار آنے قیمت ہوگی۔ اصل قیمت ہے اس کاغذ کی چار آنے۔ اور
بازار میں اسی کاغذ کی قیمت ہے ایک ترارویسہ۔
اب بتاؤ۔۔۔ کیوں؟

معلوم ہوا۔۔۔ کہ اس سورت پر پی کے ٹٹ پر یہ ضمانت لکھی ہے
یا بتائی گئی ہے کہ یہ کاغذ جو تمہیں دیا جا رہا ہے۔۔۔ یہ نرا کاغذ نہیں
ہے بلکہ سورت پر پی کا سزاگرفٹ کے خزانے میں محفوظ ہے۔۔۔
اور یہ اس محفوظ شدہ ہونے کی رسید ہے۔۔۔ اور اگر وہ خزانے میں

سورت پر پی کا سزا نہ ہے تو یہ کاغذ صرف چار آنے کا ہے۔۔۔
اگر سورت پر پی کا سزا محفوظ ہے تو ٹٹ کے پاس تو اس کاغذ کی قیمت
سورت پر پی ہے گویا بازار میں کاغذ کی قیمت جب ہی برقی ہے جب

اس کا ہم قیمت کہیں محفوظ ہو۔۔۔ اسی طرح اللہ کی کتاب کی قیمت جب ہے
جب اس کی قیمت کی کوئی شے کہیں محفوظ ہو۔۔۔ کہیں غائب ہو۔۔۔ اور اگر وہ نہیں ہے
تو پھر کاغذ۔

اب اگر کوئی یہ کہے کہ صاحب!

محفوظ کی کیا ضرورت ہے۔۔۔ ہماری کتاب ہے۔۔۔ ہم جب چاہیں بازار سے
خرید کر لاسکتے ہیں۔۔۔ تو ان کی خدمت میں عرض کرتا ہوں کہ حضور والا! ہماری کتاب
برتا اور بات ہے۔۔۔ اور صاحب کتاب ہرنا اور بات ہے

سامعین! یوپی میں ایک چٹت نو لکٹور، ایک بہت بڑا دولت مند شخص گذرا ہے۔
وہ کتابیں چھاپتا تھا۔۔۔ لاکھوں قرآن مجید چھاپ دیئے اس نے۔۔۔ یہاں تک کہ ہماری
تمام مسجدوں میں ہندوستان کی، ایران کی اور کابل کی مسجدوں میں کثرت کے چھپے ہوئے قرآن
موجود تھے۔۔۔ اتفاق سے دانی کابل

تشریف لائے ہندوستان میں — آج سے تقریباً پچاس سال پہلے کی بات ہے۔ وجہ
 لکھنؤ آئے۔ اور شاہی مہمان ٹھہرے — اور لکھنؤ کے معززین انہیں ملنے گئے —
 تو بڑت زلکشور بھی گیا — وہ بھی ایک معتذر دولت مند آدمی تھا — اس
 نے جا کر سلام کیا

دلی کابلی نے پوچھا

”تم کون ہو؟“

زلکشور نے جواب دیا

”میں زلکشور ہوں“

”اچھا۔ آپ کیسے آئے —“

”حضور اسلام کو یہاں آیا ہوں — میں نے لکھنؤ قرآن چھاپے ہیں —“

تو دلی کابلی جیسا ہو کر پوچھا ہے

”تم ہو زلکشور —“

میں تو یہ سمجھا تھا کہ زلکشور کسی ملک کا نام ہے —“

اب شاہ بہت خوش ہوا — اور لکھنؤ کو اپنے ساتھ بٹھایا — اور غوطی دیر

کے بعد شاہ کا ناشتہ آیا — وہ لکھنؤ میں کا ناشتہ — جس میں جھنجھوٹے گوشت

کے سوا اور کچھ ہوتا ہی نہیں — اور زلکشور بے چارہ برہمن !

دال روٹی کھانے والا۔

اب شاہ نے کہا

”او زلکشور ! ہمارے ساتھ ناشتہ کرو —“

اب شاہی حکم ہے۔ وہ بے چارہ بڑا حیران — آخر اس نے نررتے ہوئے کہا

در حضور ! میں تو ہندو ہوں۔“

اب دانی کمال نے حیران ہو کر بوجھا

”کیا کہتا ہے تم نے — ہندو — تم مسلمان نہیں ہو —“

”حضور! نہیں ہوں“

”پھر تم نے قرآن کیوں چھاپا؟“

حضور والا! قرآن چھاپنا اور بات ہے — مسلمان ہونا اور بات ہے — قرآن چھاپنے

والا ضروری نہیں کہ مسلمان ہو — اور کہیں قرآن جمع کر کے چھاپ دینے سے x x x اور

بات ہے — یہ کون سا کمال ہے — یہ کام تو نوکثر بھی کر سکتا تھا۔

پھر نزع قرآن چھاپ لینا اور بات ہے — صرف اور صرف محمد وآلہ محمد ہی

الئے ہیں جو اپنے عمل سے سمجھاتے ہیں — اپنے قول سے سمجھاتے ہیں — اور

کہیں کہیں ایسا ہوتا ہے کہ یہ کر دیتے ہیں قرآن پھر بتاتا ہے ”یہ کر دیا۔“

”یہ ٹھیک ہے۔“ تو قرآن کے ساتھ آلہ محمد کا ایسا ساتھ ہے کہ یہ کبھی چھوٹ

سکتا ہی نہیں۔

میرے محترم سامعین!

یاد رکھو — میرے اس فقرے کو کہ کتاب ہے ”کلا دیب ذیہ“ اور

اسے سمجھا ہی سکتا ہے جو ہو ”کلا عیب ذیہ“ — اس بے عیب کو بے عیب

انسان ہی سمجھا سکتا ہے — اس معصوم کتاب کو معصوم ہی سمجھا سکتا ہے — اور

اسلام میں بذاتِ خود کوئی نقص نہیں — ہماری کچھ بر نقص ہے — اور ہماری نا سمجھی سے

جو ہمارا گھڑا ہوا اسلام ہے، اس میں نقص آجاتا ہے — پھر آکے آلہ محمد اس کا علاج کرتے

ہیں — اور اگر وہ نہ آئیں، تو پھر ہمارا گھڑا ہوا اسلام دنیا میں رائج ہو جائے۔

سامعین! ایک بات آپ سے عرض کروں کہ لڑکانہ نوح کے بعد حضرت نوح کے نہیں

بیٹے زندہ رہے — ان کے بڑے فرزند کا نام تھا ”سام“ — اس سے چھوٹے کا

نام تھا۔ ”سام“۔ اور اس سے چھوٹے کا نام تھا ”یافت“ ان تینوں بیٹوں کی نسل آگے چلی ہے۔ کچھ ساری نسل ہے۔ کچھ باقی نسل ہے اور کچھ یا فنی نسل ہے۔

دنیا میں سب سے پہلے جب نظام حکومت رائج ہوا تو وہ ”سام“ جو بڑے بیٹے تھے۔ ان کی اولاد نے سب سے پہلے حکومت قائم کر لی تھی۔ اور آہم اور یافت کی اولاد کو رعایا کر لیا۔

اب یہ ”سام“ کی اولاد دنیا کے مختلف خطوں میں اس لئے حکومت کرتی رہی۔ کہ ہم ”سام“ کی اولاد ہیں۔ ہم بڑے بیٹے کی اولاد ہیں۔ اور یہ ہمارے چھوٹے بھائی ”یافت“ کی اولاد ہیں۔ وہ ہماری رعایا ہے۔

سیکڑوں سال پہلے ہوتا تھا کہ ”سام“ کی اولاد حکومت کرتی رہی محض اس لئے کہ ہم ”سام“ کی اولاد ہیں۔ اور دوسرے بھائیوں کی اولاد رعایا محض اس لئے کہ دوسروں کی اولاد ہیں۔

تو بڑوں کا نظریہ تھا حکومت کرنا۔ اور چھوٹوں کو رعایا رکھنا۔ اور یہ دماغ میں بس گیا، آدمی کے کہ بڑا ہوتا ہی اس لئے ہے کہ وہ حکومت کرے اور چھوٹا ہوتا ہی اس لئے ہے کہ محکوم رہے۔ تو سام نے اور اس کی نسل نے ہزاروں برس حکومت کر کے ان کے دماغ میں بٹھا دی یہ بات۔

کہ چھوٹوں کو رعایا بننا چاہیے اور بڑوں کو حاکم ہونا چاہیے۔

آج تک ہزار آدمی کے دماغ میں یہ موجود ہے کہ جو حکومت محض اس لئے حکومت کرے۔ ہم بڑے ہیں۔

اس لئے حکومت کریں کہ ہمارے پاس دولت ہے، لہذا حکومت ہے۔ ایسی حکومتیں

جو بے قابلیت کے محض بڑے بن پر حکومت کریں۔ ایسی حکومتیں

آج دنیا میں ”سامراج“ کہلاتی ہیں۔

بس یہ بات تھی حضور والا!

کہ انسان کی نا سمجھی نے ”اسلام“ کے انتظام کی ذمہ داری شام کے ایک نا اہل شہزادے

کے سپرد کر دی۔ وہ شام کے تخت پر بیٹھ گیا۔ اور دُشمن نے اس تخت نشین

کے سپرد اسلام کا نظام کر دیا۔ اس نے اعلان کر دیا کہ۔ ”میں جانتا ہوں۔ اسلام

کا نظام کیا ہے؟

بسیار یزیدین کا یہ اعلان کرنا تھا کہ ”اسلام کا امیر میں ہوں۔“ — اسلام کا نظام میرے پاس ہے۔ — ”اسلام پر تو جناب عجیب و غریب کیفیت طاری ہو گئی — اسلام تو لڑنے برا ذمہ ہوتا — اس کی تو شکل ہی وہ ذرا ہی — اس کا تو طریقہ ہی وہ ذرا — ایسی بیماری لگی، اسلام“ یزید لعین نامی بیماری — کہ اسلام تو مرنے کے قریب ہو گیا — اور جب بالکل مرنے کے قریب ہو گیا — تو اسلام ایک ایک سے کہتے ہیں —

”اسلام کے کھر گویا“

اسلام کے دعویدارو! مجھے ”یزیدین“ نامی بیماری لگ گئی ہے — کوئی ہے جو مجھے بچا لے — مجھے جھوٹی حدیثوں کا زہر پلا دیا گیا ہے — مجھے جھوٹے فتوؤں کا زہر پلا دیا گیا ہے — مجھے آمریت نے تباہ کر کے رکھ دیا ہے — مجھے زبردستی کی حکومت نے برباد کر دیا ہے —

اور — اور حسب مراجع یزیدین تھا — اس نے تختِ حکومت پر بیٹھ کر جو غلطی ڈالی ہے اپنے نقشہ پر — دیکھا کہ اتنی دُشمن ہمارے زیرِ نگیں ہے — اتنے لوگ ہمیں سلام کرنے والے ہیں — اتنے بڑے بڑے مقتدین اور قدردارانِ مذہب! ہمارے چوکاٹوں کے پائے پکڑے ہوئے ہیں — بڑے بڑے محافظانِ دین اپنا ریش مبارک سے ہمارے آستانوں کی حادوب کٹھا کر رہے ہیں — ہر شخص بجا سرکار! بجا سرکار کہہ رہا ہے —

پس وہ ”دین کا مالک بن کے بیٹھ گیا — اور اس کے دین کے مالک بننے سے ”دین اسلام“ بیمار ہو گیا — اور بیمار بھی اتنے کو مرنے کے قریب ہو گیا — اور آوازیں دے رہا ہے — ”مجھے بچاؤ۔“

مگر کسی کو کیا غرض پڑی ہے جو بیمار کو بچاتے — کسی کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ بیمار

تیار داری کرے — یہ تو وہی بچا تیں گے ناجر اپنے گھر والے ہوں —
 احسنہ اسلام کی آواز فضا میں گونجنے ہوئی اس کے کان میں پہنچ گئی۔ جن کے گھسہ کسے
 تھی —:

”ہمیں کس نے پکارا ہے؟“

”ہمیں کس نے آواز دی ہے؟“

”یہ کون کہہ رہا ہے ہم نے کون سی رہیں؟“

”ہیں! ذرا بچا تو تو — ہمیں مدد کے لئے کون پکار رہا ہے؟“

احسنہ بہہ جاتی نے پہچان لیا —

”ارے یہ تو اسلام ہے، کیوں اسلام کیا بات ہے؟“

اسلام نے عرض کی —

— ”حضور! میں بیمار ہو گیا ہوں — میں تو مر رہا ہوں — میں تو

مرنے کو تیار ہوں —“

”حسین!“

مجھے آکے بچاؤ

مہارامیر ارشد ہے حسین!

جس گھر میں تم پیدا ہوئے

— اسی گھر میں میں پیدا ہوا — جس گھر میں تم پلے! حسین! اسی گھر میں میں

پلا ہوں — بس فرق اتنا ہے

حسین!

میں محمد کے سینے میں پل رہا تھا — تو محمد کے سینے

میں پل رہا تھا

محمدؐ کی زبان سے الفاظ نکلتے تھے تو سیدی غذا بنتے تھے اور محمدؐ کی زبان سے دودھ
 نکلتا تھا تو تیری غذا بنتا تھا۔
 — اور حسینؑ !

— بچپی میں ہم سب تو کھیتے تھے

حسینؑ !

— یاد نہیں ! اکٹھے کھیلا کرتے تھے۔

دیکھنا !

— رسولؐ من ز پر محمدؐ رہے تھے — یہ اسلام تھا یا نہیں — اُدھر
 سے حسینؑ آگئے — دونوں بچپی کے ساتھی — حسینؑ کو دیکھتے ہی اسلام نے
 سب سے میں آواز دی —

”اے حسینؑ کھیلے۔“

حسینؑ آکے کمر پر بیٹھ گئے اور رسولؐ سجدے میں — اسلام بھی ہے اور
 حسینؑ بھی ہے۔

”یہ بچپی کا کھیل تم مجھے یاد ہے نا حسینؑ!“ — اور حبيبؑ تک تیرا دل نہیں بھر گیا
 تھا — میں نے سب نہیں اٹھایا تھا۔
 اور حسینؑ !

تو کمر پر بیٹھا تھا اور پیچھے نمازیوں کی صفیں تھیں۔ انہیں یہ شک ہو رہا تھا کہ
 رسولؐ پر ”وحی“ آ رہی ہے — آخری بڑی دیر بعد رسولؐ نے سجدے سے سر
 اٹھایا —

روایتیں تو کہتی ہیں کہ بہترۃ دفعہ سبحان ربی الاعلیٰ کہا حسینؑ گتے رہے۔ جب
 بہترۃ پورے ہو گئے تو اُتر آئے — !

پہنچے گھر۔ ماں کو سلام کیا۔

”اماں! سلام“

”حسین کہاں گئے تھے؟“

”اماں! مسجد میں گئے تھے۔“

اب ماں نے پوچھا:

”حسین! ناما کیا کر رہے تھے۔؟“

حسین نے جواب دیا۔

”اماں! ناما من زبڑھ رہے تھے۔“

”پھر تم نے کیا کیا؟“

”اماں! میں مسجد سے میں ناما کی کمر پر بیٹھ گیا تھا۔ اور بڑی

دیر بیٹھا رہا۔ ناما! صبحان ربی الا علی“ کہتے رہے۔

جب میں اتر آیا۔ تب ناما نے سر اٹھایا۔

تو سیدہ نے فرمایا

”بیٹا حسین! ناما نے کو تکلیف ہوئی ہوگی۔“

اب جوابی نے یہ فرمایا تو حسین پورے جوش میں فرماتے ہیں۔

”اماں!“ اسٹی میری بات۔

اگر میرے کمر پر بیٹھنے سے مسجد میں ناما نے محسوس کیا۔

تو اتنا! میں تیرے دودھ کی قسم کھا کے کہتا۔ کہ اس مسجد سے کا

بدلہ نہ اُتار دوں تو حسین نام نہ رکھنا۔

اس مسجد سے کا بدلہ۔ میں اُتار دوں گا اس مسجد سے کا بدلہ۔ اور

بدلہ اس طرح اُتاروں گا۔ اماں! ناما نے سر اٹھایا تھا مسجد سے

چاہے دیر میں اٹھایا تھا _____ مگر
 اناں ! میں ایسا سجدہ کروں گا اس کے بدلے میں کہ سر تو خود کھوں
 گا سجدے میں _____ مگر خود نہیں اٹھاؤں گا _____ " قابل
 اٹھا کے لے جائیں گے ۔ میں نہیں اٹھاؤں گا _____ "
 آج اسلام کہہ رہا ہے حسین سے _____ !
 " آ حسین مجھے بچا _____ "

حسین نے اسلام کی نبض دیکھی ۔ اس کا پسینہ دیکھا _____ چاروں طرف سے اُسے جانچ
 کے دیکھا _____ اور حسین کی بعیرت نے اسلام کا ایک سرے کر لیا _____ اس کی
 بیماری کو اچھی طرح سمجھ لیا _____ اس کا دل دیکھا _____ دماغ دیکھا اور دفن کیا _____
 " مریض کی حالت خراب ہے _____ اسے تو خون دیا جائے گا ۔ "
 ڈاکٹر صاحبان کہتے ہیں _____ کہ خون دینا مریض کا آخری نندہ ہے
 یہ آج کل کے ڈاکٹروں کی ایسا دہنیں _____ یہ حسین نے ایجاد کی تھی
 " اسلام تو مریض ہے _____ اسے خون دیا جائے گا _____ مگر ہر خون نہیں دے خون
 _____ جو مریض کے خون سے مطابقت کرے _____ "

سامعین !

اسلام کا خون بھی دیکھو _____ اور جو خون دینے آئے ہیں اُن کا خون بھی دیکھو
 _____ اگر اسلام کے خون کے ساتھ مطابقت کرتا ہو تو لب جاتے گا _____ اور
 مطابقت نہ کرتا ہو تو انہیں شکریہ کے ساتھ واپس کر دیا جائے گا _____ وہ خون
 لیا جائے گا جو اسلام کے خون کے ساتھ مطابقت کرتا ہو _____ ورنہ ہر خون ہر مریض کو نہیں
 دیا جاتا _____ غلط خون سے مریض کو تکلیف پہنچاتی ہے _____ اب اسلام کو وہی خون
 دیا جائے گا جو اسلام کے خون سے مطابقت کرتا ہو ۔

اسلام دینِ معصوم ہے۔ اے درخون دیا جلتے گا جو دینِ معصوم کا خون ہو گا۔
 اور یہی تو تلاش تھی حسین کی۔ اور کیا ہے۔۔۔۔۔ ساتھ تو بہت تھے حسینؑ
 کے۔ مگر ہر منزل پر کہہ رہا تھا۔
 ”چلے جاؤ۔“

جوساقتہ تھے انہیں کہہ رہا تھا ”چلے جاؤ۔“ اور جو گھر بیٹھے تھے انہیں خط لکھ کے
 بکرا رہے۔ ”آجاؤ۔“ یہاں تک کہ رات کو چراغِ گل کر کے کہتا تھا۔۔۔۔۔
 ”چلے جاؤ۔“ میں نے اسلام کو خون پینا نا ہے۔ اور خون وہی دیا ہے۔
 جو اسلام کے خون سے مطابقت رکھتا ہے۔ تاکہ اسلام زندہ رہے۔ وہ کبھی مرنے
 نہ پائے۔“

تو ہر وہ شخص! جو خون دینے آیا تھا اسلام کے نام پر۔ اُسے یہ خیال پلایا ہو گیا کہ
 ”اللہ جانے میرا خون اسلام کے خون سے مطابقت رکھتا ہے یا نہیں“
 اسی خیال کے ماتحت جو ان یہ سوچنے لگے
 ”واللہ جانے۔ کل ہماری باری آتے گی یا نہیں۔“
 بوڑھے اور جوان تو سمجھا رہے تھے۔۔۔۔۔ چھوٹے بچے بھی یہ سوچنے لگے۔
 ”اللہ جانے۔ کل ہمارا خون اسلام کے لئے حسین لیں گے یا نہیں۔“
 اور حضورِ والا!

آج آپ کو ایک بچے کی بات سنانا ہوں۔ اُسے نکرہ ہو گئی کہ میرا خون بھی
 کل کام آتے گا یا نہیں۔؟

اور بچہ! تم نے غور سے سنا ہے۔۔۔۔۔ تمہارے ہم سن شہید کی بات ہے۔۔۔۔۔
 کہ اُسے نکرہ ہو گیا کہ اللہ جانے میرا خون اسلام کے قابل ہے بھی یا نہیں۔

شبِ عاشور۔۔۔۔۔ رات کے دو بجے کا وقت۔۔۔۔۔ اور حسینؑ بیٹھے ہیں

پیلے _____ اللہ جانے

میرے دودھ میں تاثیر ہے بھی یا نہیں _____ اللہ جانے

تیری قربانی قبول ہوگی یا نہیں —

اور قیلہ !

اماں نے کچھ ایسی باتیں کیں کہ میرے دل میں یہ اشتیاق پیدا ہو گیا کہ جا کے سوڑ

سے پوچھ آؤں

”میرا خون بھی اسلام کی رگوں میں جائے گا — کل کے مرنے والوں میں

میرا نام بھی ہے —“

اب جو بچے نے یہ پوچھا — بارہ سال کا بچہ — اور یہ پوچھ رہا ہے کہ

”کل کے مرنے والوں میں میرا نام ہے یا نہیں —“

حیث نے تو آکھیں چڑم لیں — پیشانی چڑم لے — سینے سے لگایا — اور

بچہ ہے کہ بار بار پوچھتا ہے کہ

”چچا جان !

تباؤ نا — کل کے مرنے والوں میں میرا نام ہے یا نہیں —“

اب مولّا ”ماں“ نہیں کہتے — پیار کرتے ہیں بار بار —

پھر بچہ پوچھتا ہے

”چچا جان !

تباؤ نا — کل مرنے والوں میں میرا نام ہے ؟“

اب جو بچے نے ضد کی — تو مولّا نے فرمایا

”بیٹا تاسم !

تم تو بڑے بڑے — تیرے چھوٹے بھائی اصغر کا نام بھی ہے —“

”دیکھو بیٹا؟“

”اماں!“

میں نے کئی بار مولا سے پوچھا ہے کہ کل کے مرنے والوں میں میرا نام ہے یا نہیں؟

”تو اُمّ نے جواب کوئی نہیں دیا۔“

ہوتا ہے کہ شاید کل کے مرنے والوں میں میرا نام نہیں ہے۔ اس لئے میں

یہاں نہیں رہنا چاہتا۔ میں اپنے دادا کے پاس جانا چاہتا ہوں۔“

اب جو ماں نے یہ بات سنی۔ تو اس کا دل بھی بھر آیا۔ بچے کا ہاتھ پکڑا۔

اور سیدھی زینب کے پاس آگئی۔ آگے سلام کیا اور کہا۔

”بی بی!“

تو کُلّہ عالم ہے۔ تیری ماں بھی کُلّہ عالم ہے۔ ہم تیری ادنیٰ کنیز ہیں۔

ترے نعلین اٹھانا ہمارا فخر ہے۔ اور

بی بی!

میں تو تیری ادنیٰ کنیز ہوں۔

یہ بچہ آخر تمہارا ہی بچہ ہے۔ مجھ بیوہ نے اسے بارہ سال پہلا ہے۔

اور بی بی! آپ کو علم ہے کہ میں ہر سال اس کی سالگرہ مناتی تھی۔ اور

ایک بیوہ کا سہارا اس کا بچہ ہوتا ہے۔ اور ہر سال میں آپ سے کہا کرتی تھی

کہ زیادہ دیر نہ لگانا۔ جب بارہ سال پورے ہو جائیں۔ تو اس کی شادی کر دینا۔

مجھے بڑی تمنا ہے اس کی شادی کی۔ اور

آپ نے وعدہ کیا تھا کہ ہو جائے گی۔

بی بی!

اب بارہ سال پورے ہو گئے۔ اور آج میں قاسم کی شادی کرنا

چاہتی ہوں ————— مگر شادی کیسی ہو —————!

آج میں اس کی شادی سے شادی کرنا چاہتی ہوں

بی بی!

تم میرے ساتھ حسین کے پاس چلو — اور میرے سامنے کہو اڑکے —
”رکھی یہ بھی شہید ہوگا“ تاکہ مجھے بھی اطمینان ہو — اور اس بچے کو بھی

اطمینان ہو —

اے حضور!

”تائسم کی ماں کے یہ نفرتوں کے زینبؓ کو گھبرا گئی — بھانجہ کو ساتھ لیا۔

امام کی خدمت میں پہنچی — اور زینبؓ کہنے لگی

”بھابھی جان! آپ خود بات کر لیں —

اور اتنی شرمیلی خاتون تھی تائسم کی ماں حسنؓ کی بیوہ — کہ آج پہلی دفعہ حسینؓ سے

بات کر رہی تھی۔

حسینؓ!

امامؓ زانا!

امامؓ نے پوچھا

”کون! —

تو تائسم کی ماں بولی

”وہ مولیٰ!

تیسری بیوہ بھانجہ ہوں —

مجھے سے بھیک مانگنے آئی ہوں —

حسینؓ! اگر آج حسنؓ زندہ ہوتے — تو میں نہ آتی — میں تو گم ہوتی ہوں۔ اس سے

مجھے خود آنا پڑ گیا۔۔۔۔۔ میں آج سولی بن کے حسین! تیرے دروازے پہ آئی ہوں۔۔۔
 اپنی ماں کی چادر کے صدقے میں میری بیوہ جھولی میں خیرات ڈال دو حسین!
 اب مولائے فرمایا
 ”بھابھی جان! فرمائیے کیا حکم ہے۔؟“
 ”حسین!“

میں تمہاری ادنیٰ کینز ہوں۔۔۔۔۔ اپنے بھتیجے کا دل نہ توڑ حسین!
 اسے بتا دے کہ کل شہیدوں میں اس کا نام بھی ہے۔۔۔۔۔
 ”اماں نے بچے کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔۔۔۔۔ پیار کیا۔۔۔۔۔ کھجے لگایا اور فرمایا۔۔۔۔۔
 ”تو تاسم کی ماں!“

”ملن رہو۔۔۔۔۔ کل تیری قربانی سب سے زیادہ قبول ہوگی۔۔۔۔۔“
 اور ماں بیٹا دونوں اہلین سے خیمے میں آگئے۔۔۔۔۔ اور ماں نے آتے ہی دُر کھت
 نماز شکر یہ کی پڑھی
 ”یا اللہ۔۔۔۔۔ تیرا شکر ہے۔۔۔۔۔ میری نیک کائی نیک راہ میں کام آئے گی۔۔۔۔۔“
 اور میرے سامعین!

یوم عاشور میدانِ شہادت گرم ہو گیا۔۔۔۔۔ اور تاسم کی ماں اسی طرح مٹھلے
 پہ بیٹھی ہیں۔۔۔۔۔ اور جب دوپہر کا وقت ہوا۔۔۔۔۔ تو تاسم خیمے میں آئے اور عرض کیا
 ”اماں۔۔۔۔۔ سلام۔۔۔۔۔“
 ماں جواب میں کہتی ہے

”رُجیا! ابھی زندہ ہو۔۔۔۔۔؟ میں تمہاری سببت دیکھنا چاہتی ہوں میرے نسل!
 میں تمہارا لاشہ دیکھنا چاہتی ہوں میرے فرزند!“

”اماں! میں جا رہا ہوں۔۔۔۔۔“ میں تو تیرے سلام کے لئے آیا تھا۔۔۔۔۔“

تاسم نے ماں کو بڑھ کے بڑے ادب سے سلام کیا — اور ماں نے پیار کر کے نصحت
کیا — اور حسیت تاسم جانے لگے تو تاسم کی ماں نے آواز دی
”تاسم بیٹا! ذرا ٹھہرنا —“
تاسم واپس آئے — اور بی بی زینب کے پاس سے گئیں
”بی بی!“

میرا بچہ جا رہا ہے — میری کلائی کام آرہی ہے — میرا بچہ پر دان
چڑھ رہا ہے — بی بی! اپنے ہاتھ سے اسے دد دیا
نادو —“

زینب نے عامر بنایا اور کہا
”دو ذرا باہر سے حسین کو بلاؤ —“
حسین بیت اشرف میں تشریف لائے — تو تاسم کی ماں نے عرض کی
”دعائیں!“

میں نے اس کے باپ حسن کا عامر بڑی حفاظت سے رکھا ہے — وہ
آج میرے بچے کے سر پہ باندھ دو حسین!“

اور حسین نے عامر باندھ دیا — اور تاسم خیمے سے باہر آئے —
اور حسین نے گود میں لے کے گھوڑے پر سوار کیا — تاسم چلے گئے —
اور حسین ایک ریت کے ٹیپے پہ کھڑے ہو گئے — اور
زینب دروازے میں کھڑی ہو گئیں — تاسم کی ماں مٹھے پہ بیٹھ گئی — اور
تاسم کی نظر قوجوں پر — حسین کی نظر تاسم پر — زینب کی نظر حسین
پر — تاسم کی ماں کی نظر زینب کے چہرے پر — یہاں سے
وہاں تک نظر کا تار بن گیا — اور دس منٹ گزرے ہوں گے

جو تائسم گھوڑے سے گرے ——— حسین طیلے سے گرے ——— زینب

دروازے میں گری ——— اور تائسم کی ماں سجدے میں گری

”یا اللہ!“

تیرا شکر ہے ——— تو نے میری قربانی قبول فرمائی ——— مجھ بیوہ کی

قربانی منظور فرمائی ———“

اور خیمے میں ماتم شروع ہو گیا ——— سیدانہوں نے سر کے بال کھول دیے

میرے سامعین!

تائسم اناکم سن بچہ تھا ——— کہ جب اور شہید گھوڑے سے گرے

تو انہوں نے مولا کو پکارا ——— مگر تائسم اناکم سن بچہ تھا کہ جب یہ گھوڑے سے

گرے ——— تو حسین کو نہیں پکارا ——— پکارا تو کس کو پکارا

”و اماں! میں گر گیا ———“

اور فوج میں نقارے بجنے لگے۔ فوج میں طبل بجنے لگے ——— تو یہ طبل بجا! اس بات

کی علامت تھی کہ بچہ شہید ہو گیا ہے ——— اُدھر طبل بجے ——— ادھر سیدانہوں نے

سر کے بال کھول کئے کہنا شروع کر دیا

”ہائے تائسم!“ ”ہائے شہزادے!“

تو تائسم کی ماں کہتی ہے

”بی بیو! مدہنیں ——— یہ جو طبل بج رہے ہیں ——— یہ میرے بیٹے کی موت

کے نہیں ہیں ———“

یہاں خدائے سخن میرا ایس کا ایک شعر ہے ——— کہ جب طبل جنگ بجے

لگے دشمن کی فوج کی طرف سے ——— تو

تائسم کی ماں کہتی کیا ہیں

”بی بیو! رو نہیں ہے

باجے والوں کی صدا زیرِ تنات آتی ہے

کیسا لاش! میرے بچے کی لرات آتی ہے

”دیکھتی نہیں ————— یہ باجے کی آواز آرہی ہے ————— میرا بچہ دو لبابن گیا ہے —————

یہ میرے بیٹے کی لارات آرہی ہے“

اور تواسم کی ماں نے اتنا فرمایا مرلا سے

”حسین!

میں تیری بیوہ مجاہدج ہوں ————— میرا کوئی زور نہیں ہے ————— آج

حسنؑ زندہ ہوتے۔ تو میرا زور بھی تھا —————

حسین!

اگر ہو سکے تو تواسم کی لاش لے آؤ ————— میں ایک دفعہ لاش کو گود میں

لیکر رونا چاہتی ہوں —————“

اور امامؑ میدان میں تشریف لے گئے لاش لانے کے لئے

میرے سامعین!

جب امامؑ پہنچے میدان میں ————— تو اتنے میں داہنی طرف کے

گھوڑے بائیں طرف دوڑ گئے ————— اور بائیں طرف کے گھوڑے داہنی طرف دوڑ

گئے ————— اور زندگی میں اس نازک ترین شہزادے کا جسم پامال ہو گیا ————— ان

گھوڑوں کے سوں سے۔ کہ امامؑ زمانؑ زیارتِ ناحیہ میں فرماتے ہیں۔

میرا سلام ہر اس شہید پر جس کی داہنی طرف کی پسلیاں ٹوٹ کے بائیں طرف آگئی

تھیں ————— اور بائیں طرف کی پسلیاں ٹوٹ کے داہنی طرف آگئی تھیں۔ —————

اور جب حسینؑ پہنچے ————— تو لاش کا یہ عالم تھا ————— کہ امامؑ فرماتے ہیں

زناسم بیا!

مجھے معاف کر دو۔۔۔۔۔ میں ذرا دیر سے پہنچا ہوں۔۔۔۔۔

بیا!

تیری ماں سے وعدہ کر آیا ہوں تیری لاش لانے کا۔۔۔۔۔ اب لاش

اٹھانے کے قابل نہیں رہی۔۔۔۔۔

بیا!

میں کیا اٹھاؤں۔۔۔۔۔

یہ کہہ کر مولانے اپنی عبا بھجائی۔۔۔ اور لاش کے کٹے کٹے اٹھا اٹھا کے عبا میں

رکھے۔۔۔ اور عبا کے چاروں کونے پکڑے۔۔۔ اور گٹھڑی کی طرح لے کر گھر میں

آگئے۔۔۔ اور فرمایا

”دزینب!“

۔۔۔ بہان آؤ۔۔۔ میں تواسم کی لاش لایا ہوں۔۔۔ مگر اس کی ماں کو نہ دکھانا۔۔۔

کہیں ایسا نہ ہو۔ وہ مر جائے۔۔۔

ماں نے سن لیا۔۔۔ اور باہر آئیں اپنے خیمہ سے

”حسین!“

میں کیوں مرجاؤں گی۔۔۔ دکھاؤ مجھے۔۔۔ کیا بات ہے؟

اب جو حسین تے تواسم کی لاش کے کٹے کٹے ٹکڑوں کی گٹھڑی ساتھ رکھی۔۔۔ تو بی بی نے پہلے تو

دور رکھتے نماز پڑھی۔۔۔۔۔ پھر فرمایا

”دزینب! کھنڈم! رقیۃ! بی بیو! آؤ۔۔۔ مجھے مبارک باد دو۔۔۔ میری

قربانی سب سے زیادہ قبول ہوئی ہے۔۔۔۔۔

دیکھو! میرا ہدیہ سب سے زیادہ قبول ہوا ہے۔۔۔

امام نے لاش سے جا کے گنچ شہیدان میں رکھ دی — اور یہ میرے بیان کا آخری
نفر ہے قبلہ !

کہ تاسم کی لاش کو اکبر کی لاش پر رکھ کر حسینؑ دونوں لاشوں کے بیچ میں بیٹھے
ہیں — ایک ہاتھ اکبر کی لاش پر — ایک ہاتھ تاسم کی لاش پر رکھ کر حسینؑ نے
آسمان کی طرف منہ اٹھائے بلند آواز سے کہا
”وَاعِزُّ بِنَا“

”دیا اللہ ! میں غریب ہو گیا“ —

”نہ میرا اکبر نہ میرا تاسم رہا“ —

”وَاِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَا اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ“

~ ~ ~

نمانے کے قدموں نے — عرش کو

عرشِ معلیٰ بنا دیا

اُحد میں

نواہے کے سجدوں نے — فرش کو

کر بلائے عرشِ معلیٰ بنا دیا

(خطیبِ آلِ محمد)

اسن

(شہادت حضورِ قمر بنی ہاشم)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

”خداوند عالم عز اسماء وجل جلالت کی حمد و ثناء کے بعد حضراتِ محمد و آلِ محمد پر درود و سلام“

حضراتِ گرامی !

اللہ کی سب سے پہلی نعمت تزیہ ہے۔ کہ اُس نے میں انسان پیدا کیا ہے — اور
اس کے بعد اُس کا دوسرا کرم ہم پر یہ ہے۔ کہ انسان بنانے کے بعد اُس نے اپنے فضل و کرم سے
میں مسلمان بنایا — اگر غیر مسلم کے گھر کہیں پیدا ہو جاتے — تو شاید وہی برتے — یہ
اور بات ہے کہ کوئی کوئی ایسا ہنزا ہے دنیا میں، جو اپنی تحقیق و تلاش سے ٹوٹ پھوٹ کے
ادھر آجائے — ورنہ عموماً انسان وہی ہنزا ہے جہاں پیدا ہو — جس طرح
کوئی مسلمان کے گھر پیدا ہو جائے — وہ مسلمان ہے — جو ہندو کے گھر پیدا ہو جائے —
وہ ہندو ہے — جو عیسائی کے گھر پیدا ہو جائے — وہ عیسائی ہے — اور
اکلا فقرہ میں کہہ دوں !

جو کسی ”بندے“ کے گھر پیدا ہو جائے — وہ ”بندہ“ ہی ہے — اور
جو ”اللہ“ کے گھر پیدا ہو جائے — وہ اللہ × × × × × × × × × ×

خدا کا یہ فضل ہے کہ اُس نے ہمیں انسان پیدا کیا ہے — اور دوسرا احسان یہ ہے کہ اُس نے ہمیں مسلمان پیدا کیا ہے — اور تیسرا احسان اللہ کا یہ بھی ہے کہ ہم مسلمان ہونے کے ساتھ ساتھ صاحبِ ایمان بھی ہیں اور مومن بھی ہیں — یہ اللہ کی طرف سے بہت بڑی عزت ہے — کہ کسی کو دولتِ ایمان مل جائے — دُعاؤں پر جائے — میرے محترم سامعین!

”مومن“ کا لفظ بنا ہے ”ایمان“ سے — ”مومن“ اُسے کہتے ہیں جس میں ایمان ہو — اور ”ایمان“ کا لفظ بنا ہے ”امن“ سے — جہاں ”امن“ ہے — وہاں ”ایمان“ ہے — اور جہاں ”ایمان“ ہے — وہاں ”مومن“ ہے — جہاں ”ایمان“ ہے — وہاں ”ایمان“ نہیں ہے مومن کبھی ”بدامن“ نہیں ہوتا — چونکہ ایمان کے معنی ہیں ”امن قائم رکھنا ہے“ —

خود جیٹو — دوسروں کو جیسے دو — بدامنی نہ ہونے پائے — اسے ”مومن“ کہتے ہیں اور جو اپنے قول و فعل سے، زبان سے بدامنی کرے — تو سمجھیے اُس کے ایمان میں کمی ہے — ایمان کے تو معنی یہ ہیں کہ ”امن کو ہر حالت میں قائم رکھا جائے“ — یہاں تک کہ باوجود طاقت اور قوت کے کوئی شخص محض ”امن“ قائم رکھنے کے لئے اپنے حقوق کو چھوڑ کے بیٹھ جائے — تو ایسا مومن ”مکمل ایمان“ کہلاتا ہے سامعین!

باوجود اتنی طاقت ہونے کے محض ”امن“ قائم رکھنے کے لئے اپنے حقوق کو چھوڑ دیا — یہ نہیں کہ بوجہ کسی کمزوری کے بیٹھ گیا ہو۔ یہ اور بات ہے کہ کمزوری کی وجہ سے بیٹھ جائے مگر طاقت ہوتے ہوئے — قوت ہونے ہوئے — ہزیمت جیتتے ہوئے — پھر بیٹھ جانا — یہ ”مکمل ایمان“ ہی

کر سکتا ہے _____ اور _____

رسولؐ جب کسی ایسے انسان کا تعارف کروا دے کہ وہ یہ کلی ایمان ہے

_____ ” _____ تو ہم فوراً سمجھ جائیں گے کہ وہ ایمان والا، مومن

ہے؟ _____ بس جو اس سے وابستہ ہے _____ وہ ایمان

والا ہے _____ اور جو اس سے وابستہ نہیں ہے _____ وہ ایمان

مومن بھائیو! والا نہیں ہے۔“

آپ نے یہ حدیث کئی ہرگ _____ میں آپ کو سنا تاہوں۔ قرآن مجید میں آیت

ہے

”رُكْبَةُ طَيْبَةٍ كِى شَال شَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ حَسْبُهَا“

اب میں رسولؐ کی حدیث سنا تاہوں

ایک دن حضور رسالتؐ آگے منبر پر تشریف فرما تھے _____ اصحابؓ

کا مجمع سامنے بیٹھا ہوا تھا _____ اور اس آیت کا ذکر

ہو رہا تھا

رُكْبَةُ طَيْبَةٍ كِى شَال شَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ حَسْبُهَا

شجرہ طیبہ جس کی جڑ زمین میں ہے جس کی

شاخ آسمان میں پہنچی ہوئی ہے۔

تو حضورؐ نے اس کی تفسیر فرماتے ہوئے فرمایا

”مسلمانو!

وہ شجرہ طیبہ جس کی جڑ زمین میں ہے _____ جس کی شاخ آسمان میں ہے _____ وہ

شجرہ طیبہ! میں اور میری اہل ہے _____ اور میں اُس شجرہ طیبہ کی ”جڑ“ ہوں _____ اور

بیرا جانی علی! اُس شجرہ طیبہ کی ”شاخ“ ہے _____ اور آپ حضرات کے متعلق فرمایا ہے _____

”جو ہمارے چاہنے والے ہیں — جرم سے محبت کر نیوالے ہیں — جنہیں ہم سے پیار ہے — وہ اس ”شجرہ طیبہ“ کے ”پتے“ ہیں۔“

ماشاء اللہ — چشم بد دور — آپ اُس ”شجرہ طیبہ“ کے پتے ہیں — مگر شرط یہ ہے کہ محبت ہو — پیار ہو — پھر آپ اُس شجرہ کے پتے ہیں —

(پتے بازی نہ ہو) — اگر واقعاً آپ کو محسوس دال محسوس سے محبت ہے تو آپ اُس ”شجرہ طیبہ“ کے پتے ہیں —

”پتے کی صفت یہ ہے عزیزو!

برجائے والا — ”پتے“ کو دیکھ کر بنا دے — کہ یہ نخل درخت کا ”پتا“ ہے — درخت بر سر جو دیا نہ ہو — صرف ”پتے“ کی شکل و صورت ہی دیکھ کر بتا دیا جائے — کہ نخل درخت کا ”پتا“ ہے —

اگر ہم واقعاً ”معصوم“ درخت کے ”پتے“ ہیں — تو ہمیں ایسا نہ چاہیے — کہ ہمارے اعمال و افعال و اقوال کو دیکھتے ہی دینا بتا دے کہ — ”کسی معصوم درخت کے پتے ہیں۔“

چونکہ ”پتے“ سے پنہاں جاتا ہے — کہ یہ کس درخت کا ”پتا“ ہے

اگر کسی ”درخت کے پتے“ مر جائے ہوئے ہوں — تو پتوں کو مر جانا ہوا دیکھ کر دنیا سمجھ لیتی ہے — کہ آج درخت کے پاس ”پانی“ نہیں ہے — اس کی جڑ میں کوئی ”عدم“ ہے — جب ہی تو پتے مر جائے ہوئے ہیں — اور اگر ”پتے“ تروتازہ ہوں — تو پتہ چلتا ہے کہ ”شجرہ“ کی جڑ تروتازہ ہے — شاخیں تروتازہ ہیں — چونکہ پتوں کو دیکھ کر درخت کی حقیقت معلوم ہوتی ہے

بہر نفع — خدا کے فضل و کرم سے آپ لوگ اُس ”شجرہ طیبہ“ کے ”پتے“ ہیں — علیٰ تباخ

ہیں اور رسول اُس کی جڑ ہیں —

سامعین!

بناؤ۔ کوئی ایسا دخت دیکھا ہے آپ نے — جس کے پتے ”شاخ کی بجائے جڑ“

پر اُگتے ہوں؟ — — — — — ”نہیں“

میشہ ”پتیا“ جڑ سے تعلق رکھتا ہے۔ مگر کہاں — — — — —؟

وہ شاخ کے دامن کو مضبوط کپڑے بیٹھا ہے — — — — — پتے کی صلاحیت یہی ہے —

پتے کی شان یہی ہے کہ — — — — — وہ جڑ کے فیض سے زندہ ہے — — — — — مگر کب؟ —

جب وہ شاخ کے دامن کو کپڑے بیٹھا رہا — — — — — ”دامن“ بتا رہا ہے ”پتے“ کے ہاتھ میں

”شاخ“ کا — — — — — اور فیض پہنچتا ہے اس کی ”شاخ“ کی معرفت اُسے ”جڑ“ کا — — — — — اور

اگر کوئی گستاخ ”پتیا“ — — — — — یہ مذکر بیٹھے کر

”جب جڑ موجود ہے — — — — — تو شاخ سے کیا واسطہ — — — — —“ اور وہ شاخ سے

بُدا ہو کے جڑ کے قدم میں اس کے بیٹھ جائے ”وہ پتیا“ — — — — — تو دو پار دن تو خیریت

سے گزریں گے — — — — — پھر ”حلیہ“، بگڑ جائے گا — — — — — شکل خراب ہو جائے گی —

رنگیں پھول جائیں گی — — — — — رنگت زرد ہو جائے گی — — — — — موت طاری ہو جائے گی

زندگی جواب دے جائے گی — — — — — شکل بے شکل ہو جائے گی — — — — — سستی کہ

ایک تڑولا آئے گا — — — — — اور آگ میں پھینک دے گا

غصن شاخ کا دامن چھوڑنے سے — — — — — ایسا ہوا ہے ”جڑ“

کے تدموں سے — — — — — مگر شاخ کا دامن چھوڑ دیا — — — — — اس نے جڑ کا

کوئی فیض اُسے نہیں پہنچتا — — — — — ایک

ہوا کا جھونکا آیا — — — — — ادھر اڑا کے لے گیا — — — — — پھر

جھونکا آیا — — — — — ادھر اڑا کے لے گیا — — — — — اور

ہوا کے ہر جھونکے سے اُڑنے والے ”پتے“ — — — — — وہی ہوتے ہیں۔

جوشاخ کا دامن چھوڑ دیں — — — — —

اور اگر کب شاخ کا دامن مضبوط کپڑے بیٹھ رہتے — — — — — تو

ہوا کے جھونکوں سے جھوٹے بھی رہتے — اور اپنا سرگز

بھی نہ چھوٹتا —

بہرِ فزع — خداوندِ عالم نے ہم پر یہ اپنا نفل فرمایا ہے —

کہ ہمیں اُس در شجرہ طیبہ، کا ”پتہ“ بنایا ہے — اور ہم

دنیا کو ”پتہ“ دیتے ہیں — کہ ہم کس شجرہ طیبہ کے ”پتے“ ہیں —

ہماری حالت سے اندازہ ہوتا ہے — جس دن ہمارے گھر میں

غم ہو — دنیا سمجھ لے گی کہ — ”ان کے شجر میں غم ہے“ —

اور جس دن ہمارے گھر میں خوشی ہو — دنیا سمجھ لیتی ہے — ”ان کے شجر میں خوشی ہے“ —

میرے محترم سامعین!

خدا نے ایسے مُرشد ہیں عطا فرمائے ہیں — ایسے محبوب ہیں عطا فرمائے

ہیں — ایسے پیارے ہیں اور ہمیں عطا فرمائے ہیں — کہ انہیں برحالت میں ہم سے

نہ پادہ ہم سے پیار ہے — وہ سرے پیر تک ہمارے لئے رحمت ہی رحمت ہیں —

اُن کا وجود — رحمت — اُن کا ہنسا رحمت — اُن کا اُٹھنا رحمت — اُن کا

بیٹنا رحمت — اُن کا جگنا رحمت — اُن کا سونا رحمت — اُن کا بونا رحمت —

اُن کا سکنا رحمت — سرے پیر تک رحمت ہی رحمت — اور ہم تو اس بات پر

نناناں ہیں — کہ ہمارا مُرشد — ہمارا رہبر — ہمارا پیشوا — ہمارا پیر — ہمارا سائیں!

جس کے ساتھ ہمارا تعلق ہے — وہ خدا کے فضل و کرم سے دنیا میں — ہے۔

ہمارا اُمُّم ”ہے“ — ہمارا وارث ”ہے“ — اور جب ہمارا اُمُّم ”ہے“ —

تو اسی لئے ہم ”امامیہ“ کہلاتے ہیں — اور وہ امامیہ نہیں کہلا سکتا — جس کا امام

تھا — امامیہ وہی ہیں — جن کا ”امام“ ”ہے“ — لہذا ہم امامیہ ہیں

ہمارا وارث ”ہے“ — ہمارا ”امام“ ”ہے“ — ہمارا اُن سے تعلق

ہے — ہمارے ہر وقت وابستگی ہے — یہ اور بات ہے کہ وہ
”غائب“ ہے — مگر مد ہے “

یاد رکھو — اہل ایمان !

”ایمان“ کا لفظ ”امن“ سے بنا ہے — اور ”امن“ قائم رہتا ہے اس یقین
سے — کہ کوئی دھارت ہمارا ہے “ جو ”غائب“ ہے — چونکہ یقین ”امن“ کو قائم
رکھتا ہے —

سامعین !

میں تیری روزمرہ کی مثالیں — مگر ان ہی مثالوں سے
بات سمجھ میں آتی ہے — جس طرح یہ بچے جو
بیٹھے ہیں منبر کے قریب آکے — بہت سے انہیں کہتے
ہیں کہ ”اٹھ جاؤ“ —

میں کہتا ہوں — ”نہیں — ایسا نہ کرو —“

کیونکہ بچوں کو منبر کے پاس بیٹھنا چاہیے — اور جہاں تک
میری زبان کا تعلق ہے — وہ میں جان بوجھ کر نہایت سلیس
زبان میں گفتگو کرتا ہوں — تاکہ ان بچوں کو بھی یاد ہو جائے
کیوں بچو !

یاد ہر جاتی ہے — ؟

”ہاں —“ — بچے کہہ رہے ہیں ”ہاں —“ چونکہ معصوم کبھی
غلط بات نہیں کہتا — وہ صحیح کہتا ہے — اور اگر معصوم کی
کسی بات میں غلطی نظر آئے — تو یہ معصوم کی غلطی نہیں ہوگی —
بلکہ یہ ہماری سمجھ کی غلطی ہوگی — ورنہ معصوم جو کہتا ہے —

وہ بالکل ٹھیک "کہتا ہے ———
 بہ نروع ——— نچے اپنے گھروں میں شرارت بھی کرتے ہیں ———
 بچوں کو شرارت کرنی چاہیئے — کیونکہ بچپن کے معنی ہی یہی ہیں —
 کہ اس میں شوخی بھی ہو — شرارت بھی ہو — ایسا تو نہیں ہو
 سکتا — کہ بچہ بڑوں کی طرح خاموش بیٹھا رہے — اور —
 جو بچہ بچپن میں شرارت نہ کرتا ہو — وہ تو بچپن کی توہین کرتا ہے
 — بچپن کی عزت ہی یہی ہے — کہ اس میں تھوڑی سی شرارت —
 بھی ہونی چاہیئے — درخبات "بُری چیز ہے — کہ بچہ
 لگیوں میں گالیاں بکنا پھرتا ہو — اتنا پیٹا ہو — چوری کرتا ہو —
 مدرسے نہ جاتا ہو — یہ خباثت ہے — مگر جہاں تک شوخی
 اور شرارت کا تعلق ہے — وہ نچے میں ہونی چاہیئے —
 بچپن کا زیور ہے — بچے کا سر ہے — بچے کا جوہر ہے —
 چنانچہ ہر گھر میں چند شرارتی نچے موجود ہوتے ہیں — اور —
 مدرسے میں تو عمل بھر کی شرارت اکٹھی ہوتی ہوگی —
 سامعین !

ایک دن میں گیا مدرسے میں — کہ باکے دیکھوں کہ محلے بھر کی
 شرارت کیا رہی ہے — اور —
 دیکھنا کیا ہوں قبلہ ! کہ کلاس میں بیٹھے ہوئے ہیں — ایسے
 جیگی بلی بنے ہوئے — کہ جیسے شرارت کرنا جانتے ہی نہیں —
 وہ جو گھروالی شرارت تھی — وہ بالکل بے ہی تہی ان میں — ایسے
 آرام سے بیٹھے ہیں — کہ کیا محال ہو کوئی شرارت کر جائے —

اب میں نے شیشے میں جو جھانک کے دیکھا — تو ماسٹر صاحب بھی نہیں تھے — پھر بھی بڑے آرام سے بیٹھے ہیں — میں نے آواز دی

بچو!

تمہارا ماسٹر بھی موجود نہیں ہے — تم شرارت کیوں نہیں کرتے — تمہاری تو عادت ہے شرارت کرنا — ”دامن“ سے کیوں بیٹھے ہو — — — — — ؟“

تو بچوں نے کہا

”موسوی صاحب! شرارت نہیں کرنا — ماسٹر صاحب تو نہیں ہیں — مگر ڈریس بے کہ کہیں — ”آئے جائیں“ — حضور! تمام شریعتیں بیٹھے اس ڈر کی وجہ سے — کہ کہیں ماسٹر صاحب آئے جائیں — اور — یہ ڈر دامن ”کو نام رکھتا ہے۔ اسی“ اس سے ”ایمان“ بنتا ہے

سامعین!

تھوڑی دیر بعد اب چپراسی نے آکے کہہ دیا بچوں سے

”بچو!“

آج ماسٹر صاحب نہیں آئیں گے —

بس — یہ سنا تھا کہ در نہیں آئیں گے — اب جو آنے والے کا

ڈرنہ دیا — تو پھر وہ شرارتیں ہوتی ہیں کہ خدا کی پناہ! — کتابیں بھٹ گئیں۔

دو دات قلم ٹوٹ گئے — ایک دوسرے کے گریبان بھٹ گئے — دوسرے

کی گرد آسمان پہنچ گئی — اور —

سامعین!

اب کلاس میں جا کر دیکھو — ایک بچہ نہیں پوری جماعت کی جماعت —
پورے اہل جماعت شریر ہو گئے — ایک نہ آنے والے کی وجہ سے — ڈر نہیں
تھا آنے والے کا — اس لئے کہ اُس نے آنا نہیں تھا —

اور نیچے ابھی شرارت میں مشغول ہی تھے کہ کسی نے کہہ دیا —

دماغ صاحب آگئے ہیں —

تو پھر خباب! عام نیچے اپنی اپنی جگہ پہ بیٹھ گئے — ایسے

الطینان سے — کہ میں آپ کو کیا بتاؤں

دکٹا میں بھی کھل گئیں — دوا تلم بھی رکھائی — اگر

آنے والے کا ڈر ہے — تو کتاب کی بھی خیریت ہے —

کتاب بھی جیب ہی محفوظ ہے — دوا تلم بھی ہوش ہے

— صرف ڈر کی وجہ سے

میرے سامعین!

یہ شہ کا بہت بڑا احسان ہے — کہ ہماری آن محسوست دلائل کی ہے —

ہمارا اُن سے تعلق ہے — ہمارا ایمان ہے کہ ہمارا وارث ہے — وہ ہمیں دیکھ رہا

ہے — اور اُس کے ڈر سے ہم میں دامن، بھی ہے — اور ایمان بھی ہے —

اس لئے کہ ہمارا وارث موجود ہے — لا وارث کی زندگی بھی کوئی زندگی ہوتی ہے

— ہمارا وارث موجود ہے — سر در کائنات سے یکدہ اٹم غائب تک ہمارے

وارث موجود ہیں — اور —

حضور والا!

حضور سر در کائنات کو کتابیار تھا اپنے ساتھیوں سے — اپنے چاہنے والوں

سے ————— انا ان چاہنے والوں کو نہیں تھا ————— جتنا حضور سرور کائنات کو اپنے ساتھیوں سے
 پیار تھا ————— چاہے عرب ہو ————— چاہے عجم ہو ————— چاہے کلاہ ہو ————— چاہے گور ہو ————— رسول
 کو پیار تھا ————— اور یہ پیار ہی کی بات تھی نا ————— کہ فیصیح اللہی عربوں کے ہوتے ہوئے اذان
 کا کام حضرت بلالؓ کے سپرد تھا ————— جو وہ اللہ اکبرؐ نہیں کہہ سکتے تھے جو جیشی ہونے کے
 ————— اور مدنیؓ کو دسؓ کہہ کے بولتے تھے ————— مگر بلالؓ اذان کتے تھے مسجد
 کے گھگھستہ پر۔

ایک دن لوگوں نے مشورہ کر لیا ————— کہ مدعوں کے ہوتے ہوئے یہ جیشی اذان کیوں
 دیتا ہے ————— یہ بدلا جائے ————— ” ————— جمع کا وقت تھا ————— عربوں نے حسان ابن ثابتؓ
 اصحابی رسولؐ کے چپوٹے بھائی سے جو بہت خوش امیر تھے ————— انہیں کھڑا کر دیا گلدستہ مسجد
 پر اذان کہنے کے لئے ————— اب جو انہوں نے اذان کہی ————— تو عرب جھوم گئے —————

مد لطف آگیا اذان کا ————— ”

اب بلال چپ کھڑے ہیں ————— اذان ہو گئی ————— اور مسلمان اب اس انتظار
 میں ہیں ————— کہ حضورؐ تشریف لائیں ————— تو غار پڑھیں ————— جب دیر ہو گئی ————— تو در دولت
 پہ حاضر ہوئے ————— اور عرض کی

”یارسول اللہ!

تشریف لائیے ————— مسجد میں نماز پڑھانے کے لئے۔“

تو رسولؐ پوچھتے ہیں

”آج اذان نہیں ہوئی —————؟“

مسلمانوں نے عرض کی

”نہید! آج تو وہ اذان ہوئی ہے کہ لطف آگیا —————“

رسولؐ نے فرمایا

”ہم نے نہیں سنی۔۔۔۔۔۔ ہمیں تو آواز نہیں آئی۔۔۔۔۔۔ کس نے اذان
کہی تھی۔۔۔۔۔۔“

مسلمانوں نے کہا۔۔۔۔۔۔ کہ قبلہ طاق شخص نے۔۔۔۔۔۔
تو رسولؐ فرماتے ہیں
دیکھو؟

میرے بلالؓ کو کیا ہوا تھا۔۔۔۔۔۔“

”حضورؐ!

ہم نے آج چایا تھا کہ ”سرب“ کی زبان سے اذان ہو۔۔۔۔۔۔“
حضورؐ نے فرمایا

”تمہیں“ کالے کے سامنے کسی کا چراغ نہیں جلے گا۔۔۔۔۔۔ میرے بلالؓ سے اذان
کہلو!۔۔۔۔۔۔“

چنانچہ بلالؓ نے اذان کہی۔۔۔۔۔۔ حضورؐ برآمد ہوئے۔۔۔۔۔۔ اور اس واقعہ سے
دنیا کو سبق دے دیا۔۔۔۔۔۔ کہ میں کسی جگہ اگر کسی جنتی کو بھی مقرر کر دوں۔۔۔۔۔۔
تمہیں حق نہیں کہ اُسے ٹہاکے کسی اور کو دیاں لے آؤ۔۔۔۔۔۔“

بہرِ نزاع۔۔۔۔۔۔ رسولؐ یہی چاہتے تھے۔ کہ ہر ایک سے محبت ہو۔۔۔۔۔۔ آپس
میں محبت کرو۔۔۔۔۔۔ ایک دوسرے کے بھائی بن کے رہو۔۔۔۔۔۔ جو اپنے لئے چاہو۔۔۔۔۔۔
وہی اپنے بھائی کے لئے چاہو۔۔۔۔۔۔“

رسولؐ نے اس بات کو سب سے بڑا نفع قرار دیا کہ ایک مومن بھی دوسرے مومن کے پس پشت
اس کی برائی کرے۔۔۔۔۔۔ غیبت کرے۔۔۔۔۔۔ اور

اگر کسی میں کوئی گناہ ہے۔۔۔۔۔۔ وہ اُس کے پس پشت بیان کر دے۔۔۔۔۔۔ تو یہ ”غیبت“
یہ۔۔۔۔۔۔ اور اگر گناہ تمہیں ہے۔۔۔۔۔۔ دیے جھوٹ کہہ رہے ہو۔۔۔۔۔۔ تو یہ ”ہتھان“ ہے

_____ اللہ اس گناہ کو معاف نہیں کرتا _____ لہذا آپ سب بھائی بن کے رہیں _____
 آپس میں محبت کریں _____ اور ایسی محبت پیدا کرنے کے لئے جیب رسولؐ جوتہ دیا
 کر دینے تشریف لائے _____ اور مدینے کی مسجد بن گئی _____ تو ایک دن
 رسولؐ نے اپنی مسجد میں یہ انتظام فرمایا _____ کہ تمام مسلمانوں کو اکٹھا کر لیا _____ تمام
 صحابیوں کو حکم دیا

”سب جمع ہر جاؤ _____“

اور جب وہ جمع ہو گئے _____ تو آپؐ نے فرمایا

”آج میں چاہتا ہوں کہ تمہارے دل ایک دوسرے سے ملا دیں _____ لہذا آج
 میں تمہارے درمیان میں ”مراعات“ قائم کروں گا _____ ایک دوسرے کو بھائی بنا لیا جائے
 چنانچہ آپؐ نے منبر پر بیٹھ کے حکم دیا
 ”ظلال صاحب اُٹھیں“
 ایک صاحب اُٹھے

پھر فرمایا _____ ”ظلال صاحب اُٹھیں“

وہ بھی اُٹھ کھڑے ہوئے

تو پھر آپؐ نے فرمایا _____ ”وہ آپؐ دونوں کو میں نے بھائی بنا دیا ہے“

اور وہ ایک دوسرے کو بھائی کہہ کر گئے ملتے تھے _____ اسی طرح تمام مسلمانوں کو

_____ دو دو کو ایک دوسرے کا بھائی بنا دیا _____ کسی انصاری کے ساتھ کسی مہاجر

کو _____ کسی مہاجر کے ساتھ کسی انصاری کو _____ کہیں دو مہاجروں کو _____ کہیں دو

انصاریوں کو _____ غرض سب کو ایک دوسرے کا بھائی بنا دیا _____

اس بھائی بنانے میں کافی دیر لگ گئی _____ ہر بھائی اپنے بھائی کے گلے میں ہتھ ڈالے دے

اُسے مبارکباد دے رہا تھا _____ اُسے بل رہا تھا _____ وہ کہہ رہا تھا ہاتھ خنہ _____

وہ کہہ رہا تھا راتِ آخری۔۔۔۔۔ غرض رسولؐ کی مسجد میں عید ہو رہی تھی (جب ہم عید کو گلے ملے ہیں نا۔۔۔ یہ اُس دن کے گلے ملنے کی یادگار ہے)

تو اُسی وقت جب مسلمان بھائی بن کر خوش ہو رہے تھے۔۔۔۔۔ تو دیکھا دینار کے ایک شخص پچپے کو تے میں اُداس کھڑا ہے۔۔۔۔۔ اور سب مل رہے تھے گلے سے مگر وہ تنہا اُداس کھڑا ہے۔۔۔۔۔ اور رسولؐ اپنے منبر پر تشریف فرما ہیں۔ انہوں نے دیکھا کہ وہ بہت اُداس کھڑا ہے۔۔۔۔۔ تو فرمایا

”ادھر آؤ“

جب وہ پہنچا رسولؐ کے سامنے۔۔۔۔۔ تو حضورؐ نے پوچھا

”تم کیوں اُداس ہو۔۔۔۔۔ خاموش کیوں کھڑے ہو۔۔۔۔۔؟“

”حضورؐ!“

آپؐ نے سب کو ایک دوسرے کا بھائی بنایا ہے۔۔۔۔۔ اور یہ بھائی بن کر کتنے خوش ہو رہے ہیں۔۔۔۔۔ مگر آپؐ نے مجھے کس کا بھائی نہیں بنایا۔۔۔۔۔ میں کس کے گلے مل کے کہوں کہ۔۔۔۔۔ ”تو میرا بھائی ہے۔۔۔۔۔“

رسولؐ کا یہ سنا تھا کہ آپؐ منبر کے نیچے کے نیچے پہ تشریف لاتے اور فرمایا۔۔۔۔۔

”علیؑ! ادھر آؤ۔۔۔۔۔ ان میں سے کوئی اس قابل نہیں کہ تم اس کے بھائی بنو۔۔۔۔۔“

”تو میرا دنیا اور آخرت میں بھائی ہے۔“

”علیؑ!“

میں نے ہم سب کو بھائی بنایا ہے، جس طرح سب سے مزاج ملتا تھا وہ اُس کا بھائی ہے۔۔۔۔۔ اور تیرا مزاج کسی سے ملتا ہے۔ دوائے میرے۔۔۔۔۔ تو میرا بھائی ہے یا علیؑ! ”ابنتِ آخری“

آخرت میں —————

سامعین!

ڈاکٹر صاحبان کا متفقہ فیصلہ ہے کہ جو خون مر لیں کو دیا جاتا ہے۔ تو اس خون کی تاثیر اس مر لیں کے مزاج میں آجاتی ہے

مثلاً کسی بڑے غصیاری آدمی کا خون دے دیا گیا مجھے — پنج تو میں گیا — مگر زندگی بھر غم نہ آتا رہے گا — اور کسی حلیم آدمی کا خون آگیا۔ تو علم آجائے گا — جیسا خون کسی کو دے دو — اس کی تاثیر وہی دہتی ہے —
تو اب بتائیے —

اس کے خون کا کیا کینا۔ جسے رسولؐ لگے سے لگا کے یہ فرمائیں۔
درعی! تو میرا بھائی ہے اس دنیا اور آخرت میں "کیونکہ —

تیرا اسارا خون میرا خون ہے —————

اور لطف آیا ہو گا حضور والا!

جب رسولؐ نے اپنے کو گود میں لیکر خدا کے گھر سے چلے ہیں —
اور اپنے گھر کے گہوارے میں ٹا دیا — خاندان بنی ہاشم پوچھا ہے —
"محمد!"

مبارک ہو — خداوند عالم نے بڑا اچھا بھائی عطا کیا ہے — ابی طالب کا
بیٹا ہے — خدا کے گھر پیدا ہے —

"بھئی! خیر مبارک ہو — آپ لوگوں کو بھی مبارک ہو —"
چنانچہ سب خاندان بنی ہاشم رسولؐ کو مبارک دے رہا ہے — اور رسولؐ مسکرا کر

”خیر مبارک۔ کہہ رہے ہیں۔۔۔۔۔ اتنے میں (حضرت) ابو جہل تشریف لائے (ابو جہل) کی مشہور شخصیت تھی۔ ان کا ذریعہ معاش یہ تھا کہ جب کسی بڑے گھر کا بچہ پیدا ہوتا۔۔۔۔۔ تو وہ جاتے اور جا کے دُعا دیتے۔۔۔۔۔ اور کسی بُت کے پیر کی نیچے کی مٹی بطور سُرْمہ انہیں بچے کی آنکھ میں لگا دیتے۔۔۔۔۔ اور ۵ سے لیکر پانچ روپیہ تک انعام دیکر گھر واپس آ جاتے (چنانچہ ابو جہل بڑے خوش۔ کہ بہت بڑے گھر میں بٹیا پیدا ہوا ہے۔۔۔۔۔ انعام ہی بہت بڑا ملے گا۔۔۔۔۔ ایک چاندی کی سلائی بنوائی۔۔۔۔۔ چاندی کی سُرْمہ دانی بنوائی۔۔۔۔۔ اور سُرْمہ باریک پیس کے سے گئے۔۔۔۔۔ اور رسولؐ کو جا کے سلام کیا

”مُحَمَّدُ اِسْلَامُ۔۔۔۔۔“

حضورؐ نے پوچھا
”ابو جہل! کیسے آئے۔۔۔۔۔“
”حضورؐ!“

بچے کی مبارک باد دینے آیا ہوں۔۔۔۔۔ اور اپنا حق لینے آیا ہوں۔“
اب رسولؐ ہنسی روکے بیٹھے ہیں۔۔۔۔۔ جی چاہتا ہے ہنسنے کو مگر منہ ہی روک کے بیٹھے ہیں اور فرماتے ہیں

”بچہ لیا ہوا ہے گھوڑے میں۔۔۔۔۔ بچہ جانے اور آپ جا رہے ہیں۔۔۔۔۔“
ابو جہل بچے کے قریب آیا۔۔۔۔۔ پھر بے سے کپڑا بٹایا
”ماشاء اللہ۔۔۔۔۔ بڑا خوبصورت ہے۔۔۔۔۔“

اب رسولؐ ہنسی روکے بیٹھے ہیں۔۔۔۔۔ ابو جہل بچے کے اور قریب آیا۔۔۔۔۔
سلائی میں سُرْمہ لگایا۔۔۔۔۔ پھر ذرا اور قریب ہوئے۔۔۔۔۔ یا میں ہاتھ سے بچے کی آنکھ کھولی
۔۔۔۔۔ دایں ہاتھ سے ارادہ کیا سُرْمہ لگانے کا۔۔۔۔۔ سلائی آنکھ کے قریب
پہنچی ہی تھی۔۔۔۔۔ کہ بچے نے انگڑائی لی۔۔۔۔۔ اور ایک زور سے جھٹکا مارا۔۔۔۔۔

تو ابو جہل ماعب کا منہ پھر گیا — جہل ادھر رہ گیا — ابو ادھر رہ گیا —
 بے چارہ شرم کے مارے اٹھ کے چلا گیا اور جانتے وقت صرف یہی کہا —
 ”یہ خاندان یاد دو کر ہے —“

بہر زور — خاندان کے لوگ بڑے خوش اور کہتے ہیں

محمد!

”خدا نے بڑا بہادر بچہ عطا کیا ہے — ذرا زیارت تو کرو اور اس بچے کی
 — پس — اس کی شکل تو دیکھیں کیا شکل ہے —“

ان کا بھانڈا کہ ہمیں اس بچے کی شکل دکھاؤ — اور رسول کو یہ ڈر کہ بچے اُسی شکل کے
 برستے ہیں جس گھر پیدا ہوتے ہیں (جس طرح باپ، بھائی، ماموں اور چچا وغیرہ کی شکل) —

اب یہ بچہ جو اس گھر میں پیدا ہوا تھا — اُس کے مالک کی کوئی شکل ہی نہیں تھی —
 رسول حیران ہیں کہ اس کی کیا شکل تیار — ادھر لوگ سمجھ کہ بچہ بد صورت ہو گا۔

جب ہی تو محمدؐ کچھ نہیں بتاتے — ادھر رسول کو یہ شکل آن پڑی تھی کہ کس کی شکل

تباؤں — — — — — آخر

گھر کے مالک نے دجی کی

محمدؐ!

ذرا سی بات سے گھبرا گئے — لوگ شکل پوچھتے ہیں اور تم اس کی شکل بتاتے
 ہوئے گھبراتے ہو —“

کہہ دو ان سے کہ

ہم — — — — — ”محمدؐ“ ہے

انکہ — — — — — ”عین اللہ“ ہے

نہیں — — — — — ”سن محمدؐ“

اور ماثہ — ”ید اللہ“ ہے — — —

اور کس کی شکل ہے — ساری اللہ کی شکل ہے — — —

اب حضورؐ نے اُن سے کہہ دیا کہ چہرہ دودھ اللہ ہے — — — ”آئینہ“ میں اللہ ہے — — —

زبان ”لسان اللہ“ ہے — — — اور ماثہ ”ید اللہ“ ہے — — — پھر خیال یہ آیا کہ دعائیں

بند مانگ کے اپنی مدد کے لئے میں نے اسے اللہ سے مانگا تھا — — — مگر اللہ نے ایک ایک کر کے

پھر واپس لے لیا — — — میرے پاس کیا بچا — — —

تو جو اللہ نے ابھی نہیں کہا تھا — — — وہ جلدی جلدی رسولؐ نے کہہ دیا

”یا علیؑ !“

”دعائے دمی، لَحْمُكَ لِحْمِي“ تیرا خون، میرا خون ہے — — —

”تیرا گوشت، میرا گوشت ہے — — —“

سامعین !

گوشت، خون رسولؐ نے دے دیا — — — اور

ماثہ، آئینہ اللہ نے دے دیا — — — اور

ہم دیکھتے کیا ہیں — — — کہ مٹی گوارے میں بیٹے برتے ہیں رہے ہیں

”یا علیؑ !“

”تم کیوں ہنستے ہو — — — ؟“

علیؑ فرماتے ہیں

”آج لطف آگیا — — —“

”قبلہ ! کیا لطف آگیا — — — ؟“

”آج ہم بٹ گئے — — — آج ہم تقسیم ہو گئے — — — آدمے اللہ کے حصے میں آ گئے — — —“

آدمے رسولؐ کے حصے میں آ گئے — — — اب ہمارے پاس تو کچھ رہا نہ — — — جو ہم

سے محبت کرے گا — آدمی اللہ سے کرے گا — آدمی رسولؐ سے کرے گا — اور
جو ہم سے مدد کرتے گا — آدمی اللہ سے کرے گا — آدمی رسولؐ سے کرے گا —
سامعین!

آج پھر رسولؐ نے مل کر لکھ لکھایا —

”علیٰ!

تم میرے بھائی ہو دنیا میں اور آخرت میں — میرا رشتہ تم سے قائم رہے
گا — تم یہاں بھی میرے بھائی ہو وہاں بھی میرے بھائی ہو —
اور اللہ کا یہ فرمان ہے کہ حجت میں کچھ بھائی ہوں گے — وہ
میں سے تختوں پہ بیٹھے ہوں گے — اور
ہم بھی دیکھیں گے — ایک تخت پہ ایک بھائی ہو گا ایک تخت پہ ایک بھائی ہو گا
بیچ میں ہم کھڑے ہوں گے — ادھر دیکھا — دود پڑھ لیا —
ادھر دیکھا سلام کر لیا —

بہر نوح — بھائی کا بڑا عجیب رشتہ ہوتا ہے — بازو کی قوت بھائی ہوتا ہے
دل کا سہارا بھائی ہوتا ہے — دنیا کی زینت بھائی ہوتا ہے — آئینہ کی رونق بھائی ہوتا
ہے — اور بھائی کے مرنے سے کمر ٹوٹتی ہے — یہ عجیب رشتہ ہے بھائی کا
— رسولؐ کہتے ہیں

”یا علیٰ!

تو میرا بھائی ہے — تو دنیا میں بھی میرا بھائی ہے — تو آخرت میں بھی میرا بھائی
ہے — اور ایسا عجیب بھائی کہ دنیا نے ایسا بھائی دیکھا ہی
نہیں —

اولاد تیری ہوگی — نس میری کھلائے گی — بیٹے تیرے

اللہ نے ان صاحبزادوں کا ایسا رشتہ بنایا۔ کہ حسن و حسینؑ جیسے عجیب و غریب بیٹے
عطا کئے علیؑ کو۔ حسنؑ ابن علیؑ ہیں۔ حسینؑ ابن علیؑ ہیں۔ حنینؑ بیٹے علیؑ کے ہیں۔
مگر قیامت تک دنیا سلام کیا کرتی رہے گی۔

اتنا قریبی رشتہ ہے۔۔۔ حسن و حسینؑ جیسے بیٹے اللہ نے دیئے۔۔۔ یہ دونوں بھائی آپس میں مثال بنے ہیں۔۔۔ ایسے بھائی آج تک نہ پیدا ہوئے اور نہ ہی پیدا ہوں گے۔۔۔ سنی کا سینہ فخر سے تن جانا ہے۔ جب کوئی لکھتا تھا

جب کوئی کہتا تھا

”در حنین کی اماں۔۔۔۔۔“

دنیا میں پیدا ہوئے ہی نہیں جیسے یہ بھائی تھے

بڑا عطا فرمایا۔۔۔۔۔ وہ تھے جناب حنفیہ۔۔۔۔۔ امیر المومنین کے تیسرے بیٹے تھے۔۔۔۔۔

وایسے جناب حنفیہ علی کی شجاعت کے مالک تھے۔ — علی کی بہادری کے مالک تھے۔ —

کی خصوصیات حسینؑ کے ساتھ بغیر _____ مگر خاندان بنی ہاشم کی عظمت محمدؐ خانہ

کے ساتھ تھیں

سامعین !

جب مرکز رحل ہوا ہے — اُس ننگ میں علی کی فوج کا علم ان ہی محمد حنفیہ
کے ہاتھ میں تھا — یہی علم دار تھے — اور
وہ جو علی کی وصیتیں ہیں جنگ کے موقع پر (جو بیچ البلاغ میں محفوظ ہیں — اور دوسری کتابوں میں
بھی) وہ ان ہی محمد حنفیہ کو وصیتیں ملی تھیں — کہ
”لو محمد!“

یہ علم سنیا لو — اور میدان جنگ میں جاؤ —

”دیکھو!“

سب سے پھلی صف پہ تمہاری نظر رہے — پہنچاؤ علی کا یں
مگر تمہارے قدم اپنی جگہ سے نہ ہٹے پائیں — اپنے ہاتھوں کو مضبوط
جالینا — اپنا سر خدا کے سپرد کر دینا — اور جگہ کرنا —
جاؤ بیٹا!

شکلاش — خدا تمہارا محافظ ہوگا —

یہ فرمائے علی نے محمد حنفیہ کو میدان جنگ میں بھیجا — اُس نے واقعا
شہادت کے جوہر دکھائے — اور جب جوہر شہادت دکھا کے واپس آئے — تو
علیؑ نے شہد کا شربت پلایا — سائے میں بٹھایا — عبا کے دامن سے ہوا کی —
جب تازہ دم ہو گئے — تو دوبارہ بھیج دیا — پھر خب تازہ دم ہو گئے —
تیسری دفعہ پھر بھیج دیا — جب تیسری دفعہ بھیج رہے تھے نا — تازہ دم
کر کے تو

محمد حنفیہؑ کے منہ سے نکل گیا

”بابا جان!“

جو میرے بڑے بھائی ہیں حسنؑ حسینؑ — اس دفعہ انہیں بھیج دیں —

علیؑ کا یہ سنا تھا کہ فرمایا

”محمدؐ غنیؑ!

میں سمجھ گیا ————— تو بٹانے سے ہچکچا رہا ہے ————— اس لئے کہ تیری ماں کے

دودھ کا اثر یہی ہے —————“

اب جو مولانا نے یہ فقرہ کہا کہ مذہبی ماں کے دودھ کا اثر ہے —————“

تو بچے کو غیرت آگئی ————— دد زہہ ”جو بکٹری ہوئی خقی ہاتھ سے آتے

توڑ دیا اور اب کے جو حملہ کیا تو بد جنگ، حمل، کا فیصلہ ہی کر دیا —————

بہر نوع۔ الیسا بہادر بیٹا خدا نے علیؑ کو عطا فرمایا ————— اُدھر حسنؑ و حسینؑ جیسے

بیٹے ————— رادھہ محمدؐ غنیؑ جیسا بہادر بیٹا علیؑ کے پاس موجود ————— جس کی بہادری کی

دھاک بیٹھی ہوئی تھی دنیا میں ————— ان بیٹوں کے ہوتے ہوئے —————

ایک دن امیر المومنینؑ نے اپنے بڑے بھائی مسعودؑ عقیلؑ کو بلایا ————— عقیلؑ

آئے ————— علیؑ تعلیم کو آٹھے ————— اور عقیلؑ کہتے ہیں

”یا علیؑ! اتم امام زمانہ ہو ————— تم میری تعلیم نہ کرو —————“

مولانا نے فرمایا

”عقیلؑ بھائی!

میں نے بعثت امام نہیں بلایا ————— بلکہ ————— بھائی کثیت سے آپ کو بلایا

ہے ————— آپ بڑے بھائی ہیں ————— اور بڑا بھائی باپ کے برابر ہوتا ہے —————

میں آج آپ سے خاص بات کہنا چاہتا ہوں —————“

عقیلؑ نے پرچھا

”یا علیؑ! اگر کسی بات —————؟“

مولانا نے فرمایا

”عقیل مہائی!“

میں یہ کہا چاہتا ہوں۔ آپ عرب کے تمام خاندانوں سے واقف ہیں۔
 کسی ایسے خاندان میں میرا عقد کرادیں۔ جو عرب بھر میں بہادری میں مانا ہوا
 خاندان ہو۔ میں ایک بہادر خاندان کی بہادر لڑکی سے عقد کرنا چاہتا ہوں۔ تاکہ
 اُس لڑکی کے بطن سے جو بیٹا پیدا ہو۔ وہ میری شجاعت کا وارث ہو۔“

عقیل نے کہا

”ٹھیک ہے۔ میں رات بھر غور کروں گا۔ کل صبح بتاؤں گا۔“
 اگلے دن صبح عقیل تشریف لائے۔ اور کہنے لگے

”بیٹا علی!“

میں نے وہ خاندان ڈھونڈ لیا ہے۔ جہاں تمہاری شادی کرانا ہے۔“
 مولانا نے پرچھا

”کون سا خاندان۔“

تو جابر عقیل نے فرمایا

”بنی کلاب“

عرب کا مانا ہوا بہادر

خاندان ہے۔ لوگ اُس خاندان کے آدمیوں کے نام اپنی عمارتوں پر کندہ کر لیتے
 ہیں۔ علی اُس خاندان میں تمہارا عقد ہو گا۔“

خاندان ”بنی کلاب“ خیموں میں رہتا تھا۔ اتفاق سے (بنی کلاب)
 مدینے سے دس بارہ میل کے فاصلے پر خیمے ڈالے ہوئے تھے۔

آپ نے کہا

”علی! وہ آئے ہوئے ہیں۔ میں ابھی وہاں تمہاری خواستگاری کے لئے

جاتا ہوں۔“

چنانچہ عقیل خود جل کے قبیلہ بنی کلاب کے پاس پہنچے۔ اور قبیلہ کے سردار سے
 ملے۔ جس کا نام تھا دھرم۔ قبیلہ کے سردار نے پوچھا

”آپ کون ہیں۔؟“

جناب عقیل نے جواب دیا

”میں عقیل ہوں۔“

”کون عقیل۔؟“

”ابی طالب کا بڑا بیٹا۔“

اب جو سردار نے یہ سنا کہ ابی طالب کا بڑا بیٹا میرے سامنے کھڑا ہے۔
 تو اس نے عقیل کے پیروں پر اپنا سر رکھ دیا۔ اور کہنے لگا

”اے معذرتہ البلد کا بیٹا!

سید العرب کا بیٹا!

امیر القوم کا بیٹا!

ابی طالب کا بڑا فرزند! تو یہاں کہاں ٹھہر گیا۔“

ہم خادموں کے گھر جو موجود ہیں۔“

چنانچہ تمام قبیلہ استقبال کر کے عقیل کو اپنے قبیلے میں لے گیا۔ ایک بہترین نیسے

میں ٹھہرایا۔ تین دن تک جب فرائض مہانی ختم ہو گئے۔ تو سردار قبیلہ
 عرض کرتا ہے

”اے امیر العرب کے بیٹے!

آپ نے کیوں زحمت فرمائی۔ آپ حکم فرمائیں

ہمارے لئے کیا حکم ہے۔“

جناب عقیل نے کہتے ہیں

خاندان میں :۔

روح حضور !

میری بھی موجود ہے۔۔۔۔۔ جب حکم دیں۔۔۔۔۔“

جناب عقیل نے کہا

دوسروں کو!

مجھے یہی توقع تھی — تم یہی جواب دو گے — جاؤ — ذرا ٹھیک سے در بات کرو —

”قبلہ — رطکی سے کیا پرچینا ہے — میں جو رطکی کا باپ کہہ رہا ہوں۔“

تو خوابِ عقلِ مضیٰ کہا

درمهر دار!

یہ اسلامی قانون ہے۔ ————— رٹکی سے پوچھا جائے۔ ————— پھر شتہ

طے ہر یانے گا۔
بہر نوا۔ در غرام۔ سردار بنی کلاب۔ گھر آیا۔ آگے بڑی سے کہا۔

دستی بھی ہو۔۔۔۔۔ تست یاد رہو گئی۔۔۔۔۔ نصیب جاگ گیا۔۔۔۔۔

”بڑی کارشتہ آیا ہے۔“

چونکہ خرام کی ایک ہی اکلوتی رٹ کی تھی جس کا نام ناطہ تھا۔ بیوی نے سمجھا۔ کہ

کسی بادشاہ کا رشتہ آیا ہوگا۔۔۔۔۔ آخر بیوی نے پوچھا

درباؤ توہی۔ کس کا رشتہ آیا ہے۔ _____

خرام نے جواب دیا۔

”پہلے شکر یہ کی دو رکعت نماز پڑھ لو — پھر تباؤں گا۔“

خام بولا!

تو خاتون نے جواب دیا

”دراڑکی سے پوچھنا ہے۔“

”وہ کہتے ہیں کہ اُس سے پوچھو۔“

”میرے رشتے کا اختیار، باپ کو ہے۔۔۔۔۔ گجرات میں نے
ایک خراب دیکھا ہے۔۔۔۔۔ وہ میرن امن و جا کے بنا دیا۔

مددِ نخبہ مبارک ہر — تو میرے بیٹے کی مائیں سے —

بہر نفع - سہیلیوں نے آکے کہہ دیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور

چند دن بعد۔ خانہ لادینی لاشم برات لے کر گیا۔ _____ علیؑ کا عقد
ہوا۔ _____ مناظرہ کلا یہ۔ _____ حرم عبدی "ہم المین" کہلائیں۔ _____ بضعت
ہو کر علیؑ کے گھر آئیں۔ _____
دروازے پر عمل بٹھائی گئی۔ _____ تمام بنی لاشم نیکی تواریں بیٹے ہرے جتنے کا
پہرہ دے رہے تھے۔
لوگو!

نبردوار۔ _____ کوئی ساری پر سوار ہر کے نہ گزرے۔ _____ کوئی مکان کی چھت
پر نہ چڑھے پائے۔ _____ علیؑ کا منہ لوسس "آیا ہے۔ _____ علیؑ کا
حرم آیا ہے۔ _____"

پناہیہ بیٹی محل سے اُتریں۔ _____ دروازے پر آئیں۔ _____ جو کھٹ کو چوما۔ _____
شکر کا سجدہ کیا۔ _____ دروازے کے اندر قدم رکھا۔ _____ اور وہیں
زمین پر بیٹھ گئی۔ _____
خاب زینبؑ نے آکے کہا
اماں! اندر آو۔ _____
بی بی کہنے لگی

مناظرہ کی بیٹیو!

مجھے اماں نہ کہو۔ _____ میں تمہاری خدمت کے۔ _____
اُٹی ہوں۔ _____ میں تمہاری خادمہ ہوں۔ _____
حنین آئے
اماں! چلو اندر۔ _____
بی بی نے کہا

”مشہزادو! میں تمہاری خدمت کے لئے آئی ہوں۔ تمہارے باورچی خانے میں
 کام کرنے کے لئے۔ تمہارے نعلین صاف کرنے کے لئے۔ یہ گھر سیدہ
 کا گھر ہے۔ تم سیدہ کی اولاد ہو۔ میں تمہاری کینیز کے رہوں گی۔“
 بہر نوحہ۔ بی بی نے عقیدت کی انتہا کر دی۔ اور حنین نے محبت کی
 انتہا کر دی۔

محترم سامعین!

پورا ایک سال گزرا اس شادی کو۔ تو خداوند عالم نے
 وہ بیٹا عطا فرمایا۔ جس کی علی کو ننا تھی۔

علی مسجد میں بیٹھے تھے۔ اطلاع دی گئی

”دریاء علی! مبارک ہو۔ خدا نے بیٹا عطا فرمایا ہے۔“

علی گھر میں آئے۔ ماں کی گود میں بچہ کو دیکھا۔

دیکھتے ہیں

”ماشاء اللہ۔ وہی ہے جس کی مجھے ننا تھی۔“

علی، اُم البنین سے کہتے ہیں

”اُم البنین!“

”مبارک ہو۔ تو اس بیٹے کی ماں بن۔“

اُم البنین فرماتی ہیں

”دریاء علی! اس نے آنکھ نہیں کھولی۔“

علی جواب میں فرماتے ہیں

”ماں۔ مجھے پتہ ہے۔ یہ آنکھ نہیں کھولے گا۔ آخر

میرا بیٹا ہے تا۔“

پھر مولا فرماتے ہیں

”حسینؑ کو بلاؤ۔“

حسینؑ آگئے۔

”حسینؑ!

ذرا بھائی کو گود میں لینا۔“

اب جو حسینؑ نے ہاتھ پھیلے۔ تو بچے نے آنکھ بعد میں کھولی۔ ہاتھ
دونوں پہلے پھیل دیئے۔ غالباً ہاتھ پھیلانے کا مطلب یہ تھا

”حسینؑ!

آنکھ تو کھلتی ہی رہے گی۔ پہلے میرے دونوں ہاتھوں کا نذرانہ

قبول فرما۔

آتا!

”میں دونوں ہاتھ ابھی سے تیری نذر کرتا ہوں۔“

چنانچہ حسینؑ نے گود میں لے لیا۔ بھائی کا منہ چومنا۔ بچے نے

آنکھیں کھولیں۔ اور سب سے پہلے حسینؑ کا چہرہ دیکھا۔ پھر

علیؑ نے گود میں لے کر ایک کان میں اذان کہی۔ ایک کان میں آمانت کہی۔ اور

فرمایا

”مجھے رسولؐ نے وصیت کی تھی کہ اس بچے کا نام ”عباسؑ“ رکھنا۔“

چنانچہ ”عباسؑ“ نام رکھا گیا۔

اب خباب زینبؑ فرماتی ہیں

”اے میری گود میں دو۔“

بہن نے گود میں لے لیا۔ اور کان پر منہ رکھ کے کچھ بات کہی۔ تو

امیر المومنین پر چلتے ہیں

”دزینب! کیا بات کہی ہے۔۔۔۔۔“

”دربابا جان! امان کی ایک وصیت تھی۔ وہ سنلا ہے۔۔۔۔۔“
مولانا نے پوچھا

”دزینب! کونسی وصیت۔۔۔۔۔؟“

بی بی نے فرمایا

”امان نے وقتِ رحلتِ فساد یا تھا۔۔۔۔۔ کہ ایک بچہ پیدا ہوگا۔۔۔۔۔ عباس اُس
کا نام ہوگا۔۔۔۔۔ جب وہ پیدا ہو۔۔۔۔۔ تو گود میں لے کے۔۔۔۔۔ اس کے کان
میں یہ کہہ دیا

”امان سلام کہتی تھی۔۔۔۔۔“

میرے مقترم سامعین!

امتِ محقر کرتا ہوں۔۔۔۔۔

حسینؑ کربلا گئے۔۔۔۔۔ تو حسینؑ تانے کا انچارج عباسؑ!

حسینؑ فوج کا سپہ سالار عباسؑ!

حسینؑ اگر کہیں خط لکھتے۔۔۔۔۔ تو کاتب عباسؑ!

کوئی مشورہ کرتے۔۔۔۔۔ تو مذیر عباسؑ!

حسینؑ کے خیموں کا محافظ عباسؑ!

حسینؑ کے بچوں کو بہلانے والا عباسؑ!

غرض کوئی کام ایسا نہیں تھا۔۔۔۔۔ جو اس ایک انسان کے سپرد نہیں تھا۔۔۔۔۔ دنیا

کا ہر کام اس انسان کے سپرد تھا۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔

بے حساسین! میں اپنے بیان کو محقر کرتا ہوں۔۔۔۔۔ کہ کربلا میں نہیں محرم الحرام کی رات

کوزینیب نے عباسؑ کو اپنے خیمے میں بلایا ————— آپ تشریف لے گئے —————

عباسؑ نے عرض کی

”بی بی! — کیا حکم ہے —؟“

”عباسؑ بھائی!“

کلی کیا ہوگا —؟“

عباسؑ فسر ماتے ہیں

”آپ فکر نہ کریں — آپ ملکہ عالم ہیں — آپ گھبراہٹیں نہیں — جب

شک میں زندہ ہوں — کسی کی طاقت نہیں جو تیری چادر کا نام بھی لے لے —“

اب زینیبؑ کو اطمینان ہو گیا — حوصلہ ہو گیا — اور تمام خیموں میں جتنی عورتیں

تھیں۔ سب کو بلایا

”بی بی! میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ تمہاری چلدا کی میں غامض ہوں —“

اے حضور والا! صبح ہو گئی — صبح کے بعد دوپہر ہو گئی — جب تمام سپاہی

شہید ہو گئے — تو

قبر بنی ہاشمؑ سامنے آئے — اور آکے حینؑ سے عرض کرتے ہیں

”مولا!“

میں مرنا چاہتا ہوں — مجھے مرنے کی اجازت دو مولا!“

اور حسینؑ نے دیکھ کے فسر دیا

”عباسؑ! تم تو میرے علمدار ہو —“

”مولا! علمدار ضرور ہوں — مگر وہ فرج ہے کہاں جس کا میں علمدار ہوں —

تو مجھے اجازت دے مولا!“

کوثرؑ یہ میرے سپاہی میرا انتظار کر رہے ہیں۔“

اور مولاؑ نے اجازت کے ساتھ ساتھ یہ فسر دیا —

”جھائی! نیسے میں جاؤ ——— بچی کی شک بھی لے جاؤ ——— اور اسے
در پانی سے بھر لو۔“

چنانچہ عباس خیسے میں آئے ——— بچی کو بلایا
در شہزادی!

مجھے اپنی شک دو ———

بچی نے اپنے ہاتھ سے چاکے کا ندھے پہ شک رکھ دی ——— اور سکنڈ
نے تمام خیموں میں بچوں کو خوشخبری سنائی

”بچو! مبارک ہو ——— میرا چاچا تباہی کے جا رہا ہے۔“

بہر نوع ——— عباس نے بہنوئی کو سلام کیا ——— زینب کو سلام کیا ——— اور اپنے
نیسے میں گئے ——— زوجہ سے کہا

”در خدا حافظ ——— میں جا رہا ہوں ——— ان بچوں کا خیال رکھنا۔“
سامعین! اس موقع پر میرا تیس مرحوم کا ایک شعر سنا دوں ——— کہ حبیب بچوں کی بات
کہی ——— تو زوجہ کہتی ہیں

”وہ آپ بچوں کا نکر نہ کریں۔“

سہ کچھ غم نہ کریں آپ یہ پروان پڑھیں گے
میں تبر کو جھاڑوں کی یہ قرآن پڑھیں گے

بہر نرس ——— زوجہ عباسیہ کہہ رہی تھیں ——— عباس میدان میں چلے گئے۔

تمام سیماں نیسے کے معن میں کھڑی ہیں ——— اور اپنے ہاتھوں میں خالی کرزے لٹے پھٹے دروانے
سے باہر نچے کھڑے ہیں ——— سب کی نگرانی علم پر ہیں
علم کی میدان میں ——— نہر پر نیچا

سامعین!

یہاں میں ایک شعر اور سنا دوں ——— کہ حبیب عباس نے پانی

سے شک کو بھرا۔ اور دشمن کی فرج کی طرف

پانی اُچھالنے کا مطلب یہ تھا کہ — سے خواہش پہ ٹوٹ کے گزرا نہیں آتا

پیاسہ ہوں مگر ساحلِ دریا پہ کھڑا ہوں

خواہش کا تنہا خاتر یہ تھا کہ عباسؑ جب پانی بھر رہے ہیں شک

سامعین !

میں — تو ٹہی لیتے — مگر انہوں نے پیا بہنیں —

بلکہ ہاتھوں سے پانی اُچھال کر دشمن کو دکھا رہے ہیں — کہ

— پیاسہ ہوں مگر ساحلِ دریا پہ کھڑا ہوں

المنحصر عباسؑ جب واپس لوٹے — اور بچوں نے علم کو واپس آتے دیکھا —

تو سیکھنے نے خوش ہو کے کہا در بچو ! وہ میرا سقا آ رہا ہے —

سب کی نظریں علم پر لگی ہوئی ہیں — اور تھوڑی سی دیر میں دیکھا کیا

— کہ علم کبھی داہنی طرف جھکتا ہے — کبھی بائیں طرف جھکتا ہے — اب جو علم

کو ڈلگاتے دیکھا — تو غلابِ زینبؑ نے آواز دی

در حسین ! — یہ کیا ہو گیا ہے — ؟

اور حسینؑ فرماتے ہیں ”وزینبؑ !

دیکھ تو میں بھی رہا ہوں — مگر میری کمر ٹوٹ گئی — مجھ سے

چلا نہیں جاتا — میری کمر ٹوٹ گئی —

مومنین ! تھوڑی دیر میں علم سزگوں ہوا — اور حسینؑ لاشے پر پڑنے —

گود میں سرایا

”عباسؑ بھائی ! ہر آگئے —

مدبولاً ! آپ نے بڑا کرم فرمایا — میں نے تو آواز نہیں دی تھی —

حضورؐ نے بڑی تکلیف فرمائی — اب اگر حضورؐ مناسب سمجھیں — تو

بر نیوالے امامؑ ازین العابدینؑ تک میرے ”دینِ نامِ پیچادیں —

مرلا نے فرمایا ”عباسؑ بھائی ! کہو — کیا بات ہے ؟“

”مولاً! ایک تو یہ ہے کہ جب میری قبر بنائیں — تو قبر پر میرا نام نہ لکھیں — بلکہ
نام کی بجائے یہ لکھیں — ”میرا سون کا ستارہ چو پیسا مارا گیا“ —
اور جب وطن واپس جائیں — تو میری اماں کو میرا سلام کہیں —
بس اتنا کہنا میری اماں سے کہ

”دہن نے تیرے دودھ کی عزت رکھ لی ہے —“

اس کے بعد عباس خاموش ہو گئے — رُوح پرواز ہو گئی — اماں
نے علم اٹھایا — علم میں شک باندھی — علم لیکر خیمے میں آئے —
سیدانہ نے علم کی تعلیم کی — اور حسین نے علم زینب کے سپرد کر دیا —
”رزینب!“

یہ علم آگیا — اب اس کا بیخبر آثار دو — اس کا پکا کھول
دو — اب مجھے کسی علم کی ضرورت نہیں رہی — مجھے جی بھر کے دیکھ لوں!
میں جا رہا ہوں —“

اور زینب علم لے کر خیمے کے صحن میں کھڑی ہو گئیں — بلند آواز
میں فرمایا

بی بیو!

آؤ — میری بات سنو — رات میں نے تم سے وعدہ
کیا تھا — کہ میں تمہارے پردے کی غامن ہوں — اب میں
اپنے الفاظ واپس لیتی ہوں — میں نے جس بھروسے پہ کہا تھا — وہ
ختم ہو گیا — میرا بھائی عباس مارا گیا —“

(انا لله وانا اليه راجعون)

Presented By: www.jafrilibrary.com

مگر دکھ اس بات کا ہے کہ انسان اللہ کی بات تو مانتا نہیں۔ اور اپنی بات حرف آخر سمجھتا ہے۔ اور اسی چیز نے انسان سے مُبت پرستی کروائی تھی۔۔۔۔۔ پھر انسان کی عقل ذرا تیز ہوئی۔ اور مٹی پتھر کے مُبت توڑے آدمی نے۔ مگر ایک ایسا مُبت مسلط رہا ہے انسان کے سر پر کہ نہ وہ پہلے ٹوٹا نہ اب ٹوٹا۔ اور نہ ہی اللہ جانے ٹوٹے گا۔ ایک مُبت ایسا مسلط ہو گیا انسان کے سر پر۔

کہ دنیا میں اگر حق کوئی شے ہے تو وہ طاقت ہے۔ جہاں طاقت ہو۔ بس وہ حق ہے۔ جس کے پاس طاقت ہو وہ حق ہے چاہے کسی طرح ہی وہ طاقت آئی ہو۔ کسی طرح ہی وہ طاقت حاصل ہوئی ہو۔ اگر طاقت ہے۔ قوت اگر کسی میں ہے تو اُس کی بات بھی حق ہے اُس کا قول بھی حق ہے۔ اس کا فعل بھی برحق ہے۔ وہ سب کچھ حق ہے۔ وہ اعلیٰ حضرت بھی ہے۔ وہ غلّ سبجانی بھی ہے۔ اگر طاقت ہے۔۔۔۔۔ یہاں تک طاقت سے مرعوب ہے دُنیا کہ طاقت کے سامنے کوئی کچھ نہیں ٹوٹتا۔

ایک دفعہ یہ مناظرہ ہو گیا کہ رسولؐ ٹوڑنے یا خاک تھے؟ (یہ جھگڑے پہلے دہستے ہیں نامولوی صاحبان میں۔ یہ بے کاری کے مشغلے ہیں مولویوں کے۔ کہ چلو اور کچھ نہیں تو یہ مناظرہ ہی کر لیں، تو اس میں نواب بہادر پور کو صدر بنایا۔ تو جو ٹوڑ سونے کے متکرم تھے انہوں نے خط لکھا نواب بہادر پور کو۔

”حضرت پُر نور، اعلیٰ حضرت۔ نواب بہادر پور!

آپ فیصلہ فرمائیں کہ رسولؐ ٹوڑتے یا خاک۔۔۔۔۔ تا ب اُن سے کوئی پوچھے کہ بہادر پور کا نواب تو پُر نور۔۔۔۔۔ اور رسولؐ بے نور۔۔۔۔۔“ اور یہ اس لئے کہ طاقت حق ہے دُنیا میں۔

جو طاقت نے کہہ دیا۔ بالکل ٹھیک ہے۔ جو طاقت کے منہ سے نکل گیا۔

بالکل درست ہے۔۔۔۔۔ اسی لئے انبیاء کی بات لوگ نہیں مانتے
تھے۔ کہ لوگوں کے ذہن میں یہ بیٹھا ہوا تھا۔ کہ انبیاء کے پاس طاقت نہیں
ہے۔ ان کی بات کون مانے۔ یہ امیر نہیں۔ ان کے پاس دولت نہیں۔
ان کے پاس فوج نہیں۔ ان کے پاس لشکر نہیں۔۔۔۔۔ یہ کمزور سے آدمی
ہے۔۔۔۔۔ ان کمزوروں کی بات جھلا فاقثوروں کے مقابلے میں کون
مانے۔۔۔۔۔ اس لئے انبیاء کی بات نہیں مانتے تھے۔۔۔۔۔ مگر
انہوں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ میں دنیا سے یہ منوال کے چھوڑ دوں گا۔ کہ طاقت حق نہیں ہے۔
بلکہ حق طاقت ہے۔۔۔۔۔

دنیا والو! بڑھ چکے ہو کہ طاقت حق ہے۔۔۔۔۔ طاقت حق نہیں ہے۔۔۔۔۔ بلکہ
حق طاقت ہے۔۔۔۔۔
یہ منوانے کے لئے وہ ہمیشہ طاقت کے مقابلے میں کمزور کو لانا تھا۔۔۔۔۔ اور جب طاقت کو
شکست ہوتی ہے تو کہتا ہے کہ ہم نہ کہتے تھے کہ حق طاقت ہے۔۔۔۔۔ فرد کے مقابلے
میں ابراہیم کو لے آیا۔ اور جب فرد کو ہار گئے تھے۔۔۔۔۔ اور طاقت کو ہو گئی شکست۔ تو
انہوں نے کہا۔ دیکھو طاقت کو شکست ہو گئی حق سے۔۔۔۔۔
دنیا نے کہا۔ بالکل نہیں۔ کون کہتا ہے کہ حق طاقت ہے۔۔۔۔۔ حق ہی طاقت ہے۔۔۔۔۔
کیسے۔۔۔۔۔

فرد کے پاس پتھر بلائے کی طاقت نہیں تھی۔ ابراہیم کے پاس پتھر بنانے کی طاقت تھی۔ ان
کی طاقت نے شکست دی۔ حق نے کوئی شکست نہیں دی۔۔۔۔۔ یہ وہی منہ۔۔۔۔۔ اور
سری کو فرعون کے مقابلے میں لے آئے۔ فرعون کے پاس طاقت۔۔۔۔۔ سری کو کمزور۔
۔۔۔۔۔ جب فرعون ڈوب گیا۔ غرق ہو گیا۔

زید اللیف ہے اُس کے ڈوبنے کا۔ جب یہ ڈوب رہا تھا تاہم ادا۔ تو موسیٰ کو ٹہری آواز سی

دی تھیں۔ ”موسیٰ مجھے بچالیں۔ میں ایمان لے آؤں گا، مگر موسیٰ نے پلٹ کر بھی نہ دیکھا۔ جب ڈوب گیا۔ غرق ہو گیا۔ تو حضرت موسیٰ رپورٹ دینے گئے کوہ طور پر۔ اور اتفاق ایسا بنا تھا۔ کہ جب جناب موسیٰ دربار فرعون میں گئے تھے۔ تو فرعون کے ایک تنخواہ دار مسخرے نے جناب موسیٰ کا بھیس بدل کر موسیٰ کی نقلیں اتاری تھیں۔ موسیٰ کو بڑا غصہ آیا تھا اُس مسخرے پر۔ اب جو موسیٰ نے پلٹ کے دیکھا۔ کہ فرعون اور اُس کی ساری فوج تو ڈوب گئی۔ گروہ مسخرہ زندہ کھڑا ہے۔ وہ نہیں ڈوبا۔ وہ ویسے ہی موسیٰ جیسا بھیس بدلے کھڑا ہے۔ موسیٰ گئے کوہ طور پر۔ رپورٹ دی۔ کہ فرعون غرق ہو گیا۔

تو اللہ نے کہا ”موسیٰ وہ ڈوبتے ہوئے تمہیں پکار رہا تھا۔ تم نے اُسے جواب نہ دیا۔ اگر وہ مجھے پکار لیتا۔ تو پھر اُسے نہای دے دیتا۔“

تو موسیٰ نے جواب میں کہا ”خداوند! ذرا میری بات بھی سُن لے۔“ جو خدا بن کے تیری نقلیں اُتارنا تھا۔ اُسے تو غرق کر دیا۔ اور جس نے میری نقلیں اُتاری تھیں۔ اُسے نہ ڈوبا۔ وہ اُسی طرح کھڑا ہنس رہا تھا۔“

اللہ نے جواب دیا موسیٰ! تجھے اداۓ محبت کا پتہ نہیں۔ اُسے اس لئے نہیں ڈبویا کہ اُس وقت وہ تیری شبیہ بنا ہوا تھا۔ اور محبوب کی شبیہ کو غرق کرنا محبت کے خلاف ہے۔“ بہرِ نوع فرعون ڈوب ہو گیا۔

اب لوگوں نے کہا۔ موسیٰ کے پاس دریا پار کرنے کی طاقت تھی۔ فرعون کے پاس نہیں تھی۔ موسیٰ کی طاقت نے شکست دی ہے۔ حق نے شکست نہیں دی۔ پھر وہی طاقت ہی حق نکلی۔ دنیا کے ذہن میں یہی بیٹھ گیا تھا۔ کہ طاقت حق ہے۔

بیانِ تک کہ ہمارے آخری رسول آگئے۔ اور اللہ نے کہا۔ محمد! سنتے بھی ہو۔ طاقت تو تم میں اتنی ہے کہ تمہاری برابر کسی میں طاقت نہیں ہے۔

تم چاہو تو انگلی کے اشارے سے چاند کو توڑ دو۔ سورج کو پٹ سکتے ہو۔ دن کو رات اور رات کو دن بنا سکتے ہو۔ تمام کائنات کی پلک بھپکنے میں سیر کر سکتے ہو۔ کسبکرا اور پتھروں سے کلمہ پڑھوا سکتے ہو۔ مگر

ان کے سامنے طاقت کا مظاہرہ نہ کرنا۔ اگر طاقت کے ذریعہ سے انہیں منوایا۔ تو وہی طاقت ہی رہے گی۔ وہ ہی طاقت نہیں مائیں گے۔ لہذا ان کے سامنے تم ”طاقت“ بن کے رہو۔

اور انہوں نے کیا کیا کہ ہمارے رسول کے سامنے یہ پیش کر دیا۔ قبلہ! آپ ہمارے بتوں کو بُرا بھلا نہ کریں۔ ہم آپ کو بادشاہ بنا دیتے ہیں۔ آپ ہمارے بادشاہ ہوں گے۔ ہم آپ کی رعایا ہوں گے۔ اس لئے ہمارے بتوں کو بُرا کہنا چھوڑ دیں۔

رسولؐ نے کہا ”نہ“ میں بادشاہ نہیں بنتا۔ میں جو کبھی رہا ہوں۔ یہی کہتا رہوں گا۔ دمنیر پہ بیٹھ کے غلط بات کہنا بہت بُری بات ہے اگر میں اُس زمانے میں موجود ہوتا تو الگ لے جا کے رسولؐ کو مشورہ دیتا۔ ”قبلہ ایسے مواقع روز روز نہیں ملتے۔ بہترین موقع ہے۔ یہ خود تمہیں بادشاہ بنا رہے ہیں۔ بادشاہ بننے کے بعد بادشاہی طاقت سے جو چاہتا منو دینا کیوں خواہ مخواہ کو تکلیف اٹھاتے ہو۔“ مگر رسولؐ نے کہا۔ کہو اس بند کرد۔ طاقت سے منوانا میرا مقصد نہیں ہے۔ بادشاہ ہونا اور بات ہے۔ دین منوانا اور بات ہے۔ دین سے بادشاہت کا کیا واسطہ۔

بادشاہت اور چیز ہے۔ دین منوانا اور چیز ہے۔

جب دین کا سوالیہ پیدا ہوتا ہے۔ تو ہم بادشاہت کو ٹھکرا دیتے ہیں۔ دیکھو! آج میں ٹھکرا رہا ہوں۔ کبھی میرا بیٹا حسن ٹھکرا دے گا۔ ہم

بادشاہت کو کیا جانتے ہیں —————

دین طاقت سے نہیں، نا طاقتی سے ہے ————— اور نا طاقتی، بھی اتنی کو گھر سے
 گئے بھی تو رات کو چھپ کر ————— چند عربوں نے گھر گھیر لیا۔ اور رات کو گھر سے چھپ
 کر گئے۔ اور تین دن تک غار میں چھپے رہے ————— اتنی نا طاقتی کا اظہار —————
 دینے جا کے بس گئے۔ اور وہاں حملوں پہ چلے ہوئے گئے۔ مقابلوں پہ مقابلے ہوئے گئے۔
 گرد ہی نا طاقتی، دُبی بوریہ ہے ————— وہی نا قہ کشی ہے ————— بیٹی کے سر پہ باندھیں
 بیویاں فاقے کر۔ بی بی ————— نا طاقتی ہی نا طاقتی ————— مگر یہ متوانا چاہتے
 ہیں کہ طاقت ہی نہیں ہے۔ بلکہ حق طاقت ہے۔ ————— وقت گذرنا رہا۔
 نا طاقتی کا اظہار ہونا رہا۔ ————— اُمد ہو، بدر ہو، غنم ہو، خیر ہو، جہان نک فوجی
 نقطہ نظر ہے۔ ان کے پاس نا نا قتی ہوتی تھی ————— دشمن کے پاس طاقت ہوتی تھی۔
 مگر رسول نا طاقتی سے متوانا چاہتے تھے حق کو۔

دبھر بھی لوگوں کو یہ خیال رہتا تھا کہ طاقت ہی ہے۔ کیونکہ رسول کے پاس ایک خیر شکن کی طاقت
 ہے۔ اس لئے انہوں نے خیر فتح کر لیا۔ ان کے پاس ایک ذوالفقار کی طاقت ہے۔ ————— اس لئے
 انہوں نے فتح کر لیا۔ ————— یہ لوگوں کے دلوں میں مبیٹ گیا تھا کہ طاقت ہی ہے۔ ————— یہ
 بات اُس وقت بھی تھی اور آج بھی ہے کہ طاقت ہی ہے۔

آٹھ نوسا دینے میں رہ کر رسول مکے گئے۔ اور صلح حدیبیہ کے آنا پڑا۔
 اس صلح کی تفصیلات اگر آپ دیکھیں۔ تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یوں دب
 کے صلح کی ہے کہ خود ساقیوں کو صلح میں ہی نہیں رسالت میں بھی شک ہو
 گیا تھا۔ ————— اور وہ شک لٹہ جانے گیا بھی یا عمر بھر باقی رہا۔ —————
 بہر حال اتنی نا طاقتی کا اظہار کیا ہے اس صلح میں —————

میرے محترم سامعین! رسول دینے میں ہیں۔ تب وہی نا طاقتی کا اظہار ————— ودان مبارک

شہید ہو گئے۔ تب بھی وہی طاقتی کا اظہار ——— حمزہ جیسا چا شہید ہو گیا۔ وہی طاقتی۔ آپ کو گھر سے نکال دیا۔ ——— چلے گئے۔ کسی نے آپ پر کوڑا کرکٹ پھینک دیا۔ خاموش ہیں۔ کسی نے رستے میں کانٹے بچھا دیئے۔ ——— چُپ ہیں۔ یعنی اتنی طاقتی کا اظہار کہ طاقت کے ذریعے نہیں منوانا۔ بلکہ یہ منوانا ہے کہ حق طاقت ہے۔ طاقتی کا پورا مظاہرہ کرنا ہے۔ ——— جب نو دس سال گزر گئے۔ اسی عالم میں ——— تو ایک دن وہ وقت آیا کہ یہی طاقت انسان جو کتے سے ہجرت کر کے چلا گیا تھا۔ رات کو ٹھپ کر۔ ——— وہ دن کے اُجالے میں پوری دنیا دی طاقت کے ساتھ پھر اسی شہر مکہ میں واپس آیا۔ اور مکہ فتح کیا۔ فاتحہ مکہ بنا۔ ——— اور مکہ سے نکال دینے والوں کے دم نکل گئے۔ کہ اب کیا بنے گا۔ ——— اور جو خون کے پیاسے تھے۔ اُن کے خون خشک ہو گئے۔ کہ اب کیا بنے گا۔ ——— جس کو رات کو گھر سے نکالا تھا۔ وہ دن میں پوری طاقت سے آیا۔ ——— سینکڑوں قبائلی ساتھ تھے۔ علم لہرا رہے تھے۔ سوار ساتھ تھے پیادے ساتھ تھے۔ ——— اور پوری شان و شوکت سے عبداللہ کے بیٹے کے مکہ فتح کیا۔ ——— اور حضرت ابوسفیانؓ ان کی ساری سوانح عمری تو مجھے یاد نہیں۔ یہ وہ بزرگ تھے جو ہر جنگ میں مسلمانوں کے خلاف فوج کے سپہ سالار ہوتے تھے۔ بڑے خاندانی بزرگ تھے۔ ان کے خاندانی تعارف کے لئے صرف یہ کہہ دینا ہی کافی ہے کہ حضرت ابوسفیانؓ وہ تھے جو بڑیہ کے بھی دادا تھے۔

جب رسولؐ فتح مکہ کر رہے تھے۔ اپنی فوج کے ساتھ۔ تو یہ ابوسفیانؓ ایک پہاڑی کی چوٹی پہ کھڑے تھے۔ ——— اور رسولؐ کی آمد دیکھ کر کہے ساختہ کہنے لگے۔

”عبداللہ کے بیٹے میں بڑی طاقت آگئی ہے۔“ اور عباسؓ، رسولؐ کے چچا پاس ہی کھڑے تھے۔ انہوں نے کہا کہ کعبت! یہ طاقت نہیں ہے۔ یہ حق ہے۔ اب بھی تو ”طاقت“ طاقت“ چلا رہا ہے۔“ اُن کے ذہن میں ہی یہی بیٹھا ہوا تھا۔ کہ طاقت حق ہے۔ اور کوئی نئے

ہے ہی نہیں دنیا میں — بس اگر حق کوئی شے ہے۔ تو وقت طاقت ہے۔“
 بہر حال مکہ فتح ہو گیا۔ اور وہی جہنوں نے گھر سے نکالا تھا۔ وہ قیدی بن کے رسولؐ کے سامنے اکھڑے ہوئے۔ ہاتھ اُن کے بندھے ہوئے ہیں۔ رسولؐ کے سامنے کھڑے ہیں۔
 اب دنیا کے دنیا کے تمام قوانین کے مطابق۔ اگر رسولؐ حکم دے دیں۔ ”ان سب کو قتل کر دو۔ انہوں نے ہمارے عزیز قتل کئے ہیں۔ انہوں نے ہمیں ستایا ہے“ یہ ٹھیک ہے فاتح کو حق ہے اس بات کا۔ وہ کر سکتا تھا۔ مگر رسولؐ نے کہا ”دنیا کے طاقت ور فاتحوں والا کام میں نے نہیں کرنا“ بڑے اطمینان سے جب وہ ہاتھ بندھے ہوئے کھڑے تھے رسولؐ کے سامنے تو رسولؐ نے فرمایا

”میں تمہارے لئے فیصلہ کر دوں۔“

اب اُن کے لبوں پہ جان آئی ہوئی تھی۔ وہ بچنے تھے غم کے ایک انشارے سے تم قتل ہو جائیں گے۔ تم ختم ہو جائیں گے۔
 اور بہت سے اصحاب رسولؐ اپنے قبضوں پہ ہاتھ رکھے ہوئے تھے۔
 کہ حضورؐ ذرا حکم دیں اور ہم انہیں قتل کریں۔“

میرے محترم سامعین! ایک دم رسولؐ کے لبوں پہ ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔ اور آپؐ نے حکم دیا۔ ”جاؤ! میں تم سب کو آزاد کرتا ہوں“ لیجئے۔ اُن کے ہاتھ کھل گئے۔ سب کے سب آزاد ہو گئے۔ اب جو وہ آزاد ہوئے۔ تو بڑے شرمندہ۔ اب اُن کے کلمہ پڑھنے لگے۔

”یا رسول اللہ! مان گئے۔ ہم مسلمان ہوتے ہیں۔ لا الہ الا اللہ۔ محمد رسول اللہ“
 ہم مسلمان ہو گئے۔

سامعین! اب جو وہ مانیں گے۔ تو رسولؐ کو حق سمجھ کے نہیں مانیں گے۔ بلکہ رسولؐ کی طاقت سے مرعوب ہو کر مانیں گے۔ وہی طاقت کو حق سمجھا ہے انہوں نے۔ کہ رسولؐ میں آج طاقت ہے۔ لہذا آج کا میرا پرت

”قبیلہ میں مسلمان ہو گیا۔“

کیوں —————؟

”حالت جو تیرے پاس ہے تو فاسخ ہو کے جو آیا ہے۔۔۔۔۔۔“ حالت سے کلمہ

پڑھا ہے۔۔۔۔۔ مگر بات دہی رہی کہ طاقت حق ہے۔

بہرِ نوح رسولِ نوحؑ کہنے کے بعد خانہ کعبہ کے سامنے پہنچے۔ کعبہ کو دیکھا

اور فرمایا کہ کعبہ ہم آگئے۔۔۔ تو مجھے انتظار میں نکلتا۔۔۔ ہم

اے

کعبہ نے عرض کیا "قبلہ کیا عرض کروں۔۔۔ آپ تو آگئے۔ مگر

میری جان ان سے تو چھڑوا میں جو مجھے لکیرے بیٹھے ہیں۔

خدا جانے کب سے میٹھے میں اور وہ یکن ایسے نبت بن کے میٹھے تھے۔

کر بیٹھنے کا نام ہی نہیں لیتے تھے۔۔۔۔۔ اور یقین طرح سے

میں نے تھے کبے میں مبت — (۱) کچھ تو کھڑے تھے۔ (۲) کچھ دیواروں

سے اڑے تھے۔ (س) اور کھجور کڑے تھے۔

تو کھڑے تھے وہ تو یوں ہی کھڑے کھڑے اُٹے تھے۔ اُن کا تو کوئی بھروسہ

ی نہیں تھا۔ اور جو دیواروں سے اڑے تھے۔ اُن کا سہارا

تھا۔ وہاں جھوٹے نوشتہ موعامیں۔۔۔ اور سو گز سے

ہوئے تھے۔ وہ بڑے مغرور تھے۔ کہ تم یہاں کھڑے ہوئے ہیں۔ اُن کے

یوں بننے والے بھی بڑے مغرور بن گئے۔ کہ ہمارے توں کا کوئی کہاں لگا کر سکتا

۷۔ ہمارے عت حرم میں گڑھے ہوئے ہیں۔ خار کدہ میں گڑھے ہوئے

”یہ ثابت ہو اُنچے کڑے ہوتے ہیں۔ ذرا انہیں توڑ دو۔“
 ”حضور! یہ اُوچے ہیں بہت۔ میرا تو ہاتھ دیاں تک نہیں پہنچے گا۔۔۔۔۔“
 تو رسولؐ نے فرمایا: ”دیکھو نا۔ ہم جو کہتے ہیں متبعین کہ توڑ دو ان تلوں جو۔ دوسروں
 سے میں کہہ نہیں سکتا۔ چوک کہ وہ برسوں ان تلوں کے ساتھ اچھے تعلقات رکھ چکے ہیں۔
 اب اگر وہ توڑیں بھی تو انہیں شرم آئے گی ان تلوں سے۔۔۔۔۔ میں چاہتا ہوں۔ تم توڑو
 چوک کہ تمہارا ان سے کوئی واسطہ نا ہی نہیں۔۔۔۔۔ اور توڑنے کا طریقہ یہ ہوگا

کہ تم میرے کانڈھے پہ کھڑے ہو کے توڑ دو۔

مگر قبیلہ — میں! کانڈھے پہ —

”ہاں ہاں۔ میں جو کہتا ہوں — تم میرے کانڈھے پہ قدم رکھو — اور توڑ دو“

اور عجیب منظر بن گیا — کہ آخر درجہ کی رسالت جھکنے لگی۔ اور اول درجہ کی امامت ابھرنے

لگی۔ رسول پر قدم پہنچے۔ رسول کا ایک ہاتھ کعبے کی دیوار پر —

اور قدم بُت شکن کے دوش رسول پر — اور بُت شکن کا نقشہ یہ۔ کہ ایک ہاتھ دیوار

پر رکھا ہوا ہے۔ اور ایک ہاتھ میں بُت کی گردن ہے۔ اور رسول

پوچھتے ہیں۔

”یا علی! کہاں ہو۔“

”قبلہ کیا بتاؤں۔ کہاں ہوں۔“ آج عرش سے جو چیز کہئے۔ جھک کے

اٹھائوں۔ اتنا بلند ہو چکا ہوں۔“

”شباباش۔ بہت اچھا۔ توڑ دو انہیں۔“

علی نے جھٹکا دیا۔ بُت ٹوٹے۔ گرے۔ جس طرح کچی شیشیاں ٹوٹ جائیں۔ اس

طرح رسول کے قدموں میں وہ بُت ٹوٹ رہے تھے۔ جب تمام بُت ٹوٹ

چکے۔ تو رسول نے فرمایا۔

”یا علی! اتر آؤ۔“ مگر علی اب اترتے نہیں۔

علی اتر دنا۔

”قبیلہ۔ اتنا بلند ہونے کے بعد نیچے اترنے کو جی نہیں چاہتا۔“

”علی اتر آؤ نا۔ دیکھتے نہیں۔ دیکھنے والوں کے پیروے اتر گئے ہیں“

اب علی اترتے نہیں۔ کتابوں میں لکھا ہے کہ۔

بریل اگئے فوراً۔ اور آ کے اُستاد کو سلام کیا۔ اور اپنی گود میں

لے کے آرام سے اُتارا ————— اور جبرئیلؑ نے جو علیؑ کو گود میں لے کے اُتارا —
 اس سے جبرئیلؑ کی نشان اور بڑھ گئی۔ جب جبرئیلؑ کا وقار بڑھ گیا۔ جبرئیلؑ کی حیثیت بڑھ
 گئی ————— اور یہ ملک ساری عسمر سے عادی ہے۔ اس بات
 کا قرآن صامت خدا سے لے کے نبیؐ کے گھر اُتار دے —————
 جبرئیلؑ قرآن صامت اُتارتے اُتارتے اتنا مشتاق ہو گیا تھا کہ آج
 قرآن ناطق نبیؐ سے لیا اور خدا کے گھر پہنچ دیا —————

بہر نوح مکہ فتح ہو گیا۔ رسولؐ کا پرچم سارے مکہ پر لہرانے لگا۔ خانہ کعبہ پر لہرانے
 لگا۔ اذانیں ہونے لگیں۔ اب تمام مسلمان سامنے آ بیٹھے۔ حضرت ابی سفیانؓ بھی تشریف
 فرما ہیں۔ اور اُن کی زوجہ محترمہ جناب ہندہ بھی بیٹھی ہیں۔ ————— اور بھی سب مسلمان
 بیٹھے ہیں۔ مکہ پڑھ رہے ہیں۔ سب مسلمان ہو رہے ہیں۔ ————— اور
 رسولؐ فرماتے ہیں۔

”آؤ۔ بیٹھو۔ تم ہمارے بھائی ہو۔ تم مسلمان ہو گئے۔ نیت کا حال اللہ جانتا ہے۔
 بہر نوح۔ تم سب میرے اصحاب ہو۔ ————— اور
 رسولؐ کے کرد و پیش سب بیٹھے ہیں۔ ————— خدا کے فضل سے اسلام کا بول بالا ہے۔
 سارا جزیرہ عرب مسلمان ہو چکا ہے۔ چاروں طرف اسلام ہی اسلام ہے۔ اور حضرت
 ابی سفیانؓ بھی ساتھ بیٹھے ہوئے ہیں۔ اور اُن کے خاندان والے بھی سب بیٹھے ہوئے ہیں
 نیت اور دلوں کا حال اللہ جانتا ہے۔ —————

بہر نوح سب کے سب مسلمان ہیں۔

توجہ ہے نا حضور! یہاں تک کہ اتنی قرابت ہوئی رسولؐ سے حضرت ابی سفیانؓ کی کہ
 ان کی ایک صاحبزادی جناب ام حبیبہؓ کا رسولؐ سے عقد ہوا۔ وہ حرم رسولؐ میں آئیں۔ وہ
 اُم المؤمنین ہیں۔ ہم مومنوں کی وہ ماں ہے۔ ————— ہمارے لئے واجب الاحترام ہیں۔

عزت و احترام سے ان کا نام لینا ہمارا فرض ہے۔۔۔۔۔ حضرت ابی سفیان کی دختر نیک اختر ہیں۔ اور امیر شام معاویہ کی بہن ہیں۔۔۔۔۔ ام حبیبہؓ ان کا نام ہے۔۔۔۔۔ اور حضرت ابوسفیان کی دوسری بیٹی کی شادی قبیلہ بنی ثقیف کے سردار سے ہوئی۔۔۔۔۔ اور یہ قبیلہ بنی ثقیف، جو نفا ناعرب میں، حسن بیان، شیر زبان اور شیریں بیان کے اعتبار سے اس کے مقابلے میں پورے عرب میں کوئی اور قبیلہ نہیں تھا۔

عرب کے چار قبیلے، چار خصوصیات میں مشہور تھے۔

۱۔ عزت و عظمت میں بنی ہاشم۔۔۔۔۔ اور

۲۔ سیاسی تدبیروں میں بنی امیہ۔۔۔۔۔

۳۔ بہادری میں بنی کلاب۔۔۔۔۔ اور

۴۔ حسن میں بنی ثقیف۔۔۔۔۔ اور جو بنی ثقیف، کے قبیلہ

کا سردار تھا۔ اُس کا نام تھا "ابو مرہ" جس کے ساتھ ابی سفیان کی دوسری

صاحبزادی کی شادی ہوئی تھی۔۔۔۔۔ گویا ابو مرہ اور رسالتناہ

آپس میں ہم زلف تھے۔۔۔۔۔ یہ رشتہ ہو گیا۔۔۔۔۔

ابی سفیان کی ایک صاحبزادی ابو مرہ کے گھر میں بیاہی گئی۔۔۔۔۔ اور

ایک جناب رسالتناہ کے گھر میں تشریف لائی۔۔۔۔۔ جن کا نام تھا

ام حبیبہ۔۔۔۔۔ اور اگر آپ اسلامی کتابیں پڑھیں۔ تو ان کے فضائل

بڑے کثرت ہوئے ہیں۔ اور تمام فضائل کا سرنامہ جو فضیلت ہے جناب

ام حبیبہ کی۔ وہ یہ ہے کہ ایک دن ان کے والد بزرگوار حضرت ابی سفیان

انہیں ملنے کے لئے آئے۔۔۔۔۔ اور جب آئے اُس حجرے میں جس

میں جناب ام حبیبہ رہتی تھیں۔۔۔۔۔ تو آپ اپنے والد کو دیکھ کر بہت

خوش ہوئیں۔۔۔۔۔

”ابا۔ آؤ۔ بسر شد۔ تشریف رکھو۔۔۔۔۔“

ابی سفیان تشریف لائے۔۔۔۔۔ اور جب بیٹھے گئے۔ تو ام حبیبہ نے فرمایا۔
ذرا ٹھہرو۔۔۔۔۔“

وہ درمی جو بھیجی ہوئی تھی۔ وہ آپ نے یہ کر لی۔ اور زمین پر اشارہ کیا۔۔۔۔۔
”تشریف رکھئے۔۔۔۔۔“

ابی سفیان نے کہا۔ ”بیٹی۔ میں زمین پر۔۔۔۔۔ میں اگر اس درمی
پر بیٹھ جاؤں۔ تو کیا صریح ہے۔۔۔۔۔“
تو جناب ام حبیبہ نے فرمایا۔

”آپ اس درمی پر نہیں بیٹھ سکتے۔ کیونکہ اس پر رسول بیٹھا کرتے ہیں۔۔۔۔۔“
واہ! ام المؤمنین۔ ام المؤمنین ہو تو ایسی ہو۔ جو رسول کی جگہ پر
اپنے باپ کو بھی نہ بیٹھنے دے۔۔۔۔۔ یہ ہے جناب ام حبیبہ
کے فضائل کا تعارف۔۔۔۔۔“

حضرت ابی سنان بڑے خوش تھے دونوں بیٹیاں بڑے گھر میں بیاہی گئیں۔
ہر باپ خوش ہوتا ہے۔ اگر بیٹی کو اچھا رشتہ مل جائے۔ ابو سفیان بھی بہت خوش
تھے۔ ایک بیٹی محمد کے گھر میں۔ ایک بیٹی ابو امرا کے گھر میں۔ ایک
محمد داماد۔ ایک سردار بنی ثقیف داماد۔ خدا نے ابو مرا ثقیفی کے گھر ابی سفیان
کی صاحبزادی سے صرف ایک بیٹی عطا فرمائی۔ کوئی اور اولاد نہیں ہوئی۔ صرف ایک
دختر پیدا ہوئی۔ اور اس دختر کا نام تھا جناب سیلی۔۔۔۔۔
سیلی عرب میں شہزادیوں کو کہتے ہیں۔ سیلی نام تھا اس ابو مرا کی بیٹی کا۔۔۔۔۔ اور
سیلی جناب ام حبیبہ کی بھانجی ہوئی۔ اور جناب رسالت مآب خالو ہوئے سیلی کے۔
سیلی دواں پیدا ہوئی۔ اور جب سیلی جوان ہوئی۔ اور شادی کے قابل ہوئی تو ان کے

باپ کو رشتے کی تلاش ہوئی ————— آخر نگاہ انتخاب خاندان بنی ہاشم پر پڑی۔ — اُس نے خاندان بنی ہاشم میں سردار جو انسانِ بہت جناب سید الشہداء امام حسین علیہ السلام کو منتخب کیا۔

چنانچہ جناب بیٹی سے جناب سید الشہداء کا عقد ہوا۔ اور ابو مراد تقیہ کی بیٹی بیٹی حرم سید الشہداء میں آگئیں۔ سید الشہداء کی پہلی جو حرم محترم تھیں۔ وہ تھیں جناب شہزادہ اُن کا انتقال ہو چکا تھا۔ — اور اُن کے بطنِ طیب سے حضور امام زین العابدین علیہ السلام پیدا ہوئے۔ — اور بیٹی کے بطنِ طیب سے خداوند عالم نے پیٹے نو ایک لڑکی عطا فرمائی۔ اور اُس کے بعد اللہ نے ایک فرزند عطا فرمایا۔ — جن کا نام تھا شہزادہ علی اکبر۔

میرے سامعین! جناب امام زین العابدین جب پیدا ہوئے تھے۔ تو اُس وقت امیر المومنین موجود تھے۔ واداک کی موجودگی میں امام زین العابدین پیدا ہوئے تھے۔ — ان کی والدہ شہزادہ شہزادہ ایران کی بیٹی تھیں۔ — اور جب امام زین العابدین پیدا ہوئے۔ تو امام حسین علیہ السلام نے انہیں ایک سفید کپڑے میں لپیٹا اور مسجد میں لگے۔ — حرابہ میں شاکر دور رکعت نماز پڑھی۔ — اور نماز پڑھ کے کہا۔

”خداوند! خدا تو نے یہ نعمت مجھے عطا فرمائی ہے۔ میں تیری ہی نذر کرتا ہوں۔“

اور بابہ کے بچے کو وہیں مسجد میں لیٹا چھوڑ کے گھر واپس آ گئے۔

حییہؑ تو مسجد میں لٹ کے آ گئے امام زین العابدین کو۔ — اب

امیر المومنین علیہ السلام مسجد میں گئے۔ دور رکعت نماز پڑھی اور ہاتھ

اٹھا کے دعا کی۔

”خداوند! حسینؑ یہ نعمت تیرے سپرد کر گیا۔ میں تجھ سے مانگنے آیا ہوں۔“
 اور علیؑ کو دینے کے امام زین العابدینؑ کو گھر میں آگئے۔
 اور آگے آواز دی۔

”زینبؑ بیٹا! میں اسے الگ کے لایا ہوں خدا سے۔ اور
 تمہارے سپرد کرتا ہوں۔ اُسے تم نے خصوصیت کے ساتھ پرورش
 کرنا ہے۔ اور زینبؑ! اس کے بدن میں شہنشاہی خون ہے۔ خیال رکھنا
 باقی بچوں کی طرح اسے نہ پالنا۔ اس کے گہوارے میں نرم گدا
 بچھایا جائے۔ چونکہ اس میں شہنشاہی خون ہے۔“

اس طرح زینبؑ نے پالنا شروع کیا۔ اور حبیب پیدل چلنے لگے تو امیر المؤمنینؑ
 انگلی پکڑ کے چلتے کہ کہیں ٹھوکر نہ لگ جائے۔ کہیں گر نہ جائے۔ جب ذرا اور
 بڑے ہوئے۔ تو امام حسنؑ مجتبیٰؑ اور امام حسینؑ نے یہ انتہام کیا امام زین العابدینؑ
 کے لئے۔ چونکہ اس کے مزاج میں شہنشاہی خون ہے۔ لہذا حکم یہ تھا کہ اس کے
 سامنے کوئی اونچی آواز سے نہ بولے۔ شاہی مزاج ہے۔ برداشت نہیں کرے گا
 اور گھر میں حور توں کو یہ حکم تھا۔ کہ حبیب زین العابدینؑ گھر بیٹھے ہوں۔ تو گھر کے اندر
 بھی کسی کے سر سے چادر نہ اترے۔ شاہی غیرت ہے برداشت نہیں کرے گی۔
 گویا امام زین العابدینؑ کی اس شان سے پرورش ہو رہی تھی۔ اس کے
 بعد حبیب لیلیٰ کے بطن سے دوسرا فرزند بشکل رسول اللہؐ نے عطا فرمایا۔ تو امیر المؤمنینؑ
 موجود نہیں تھے۔ آخر امام حسینؑ علیہ السلام نے اس بچے کو گود میں اٹھایا۔
 اور لے جا کے اُسی طرح مسجد میں ٹٹا دیا۔ دو رکعت نماز پڑھی۔ اور
 اللہ سے دعا کی۔

”خداوند! یہ نعمت تو نے مجھے عطا فرمائی ہے۔ میں یہ تیری

ہی نذر کرتا ہوں۔ تو ہی مالک ہے اس کا۔۔۔۔۔

حسین بچے کو لٹا کے چلے آئے۔۔۔۔۔ اب علی تو قتلے نہیں۔۔۔۔۔ آخر
زینب نے برقع پہنا۔ اور مسجد میں تشریف لائیں۔

"خداوند! حسین تو یہ نعمت تیرے سپرد کر گئے۔۔۔۔۔ میں
مانگنے آئی ہوں،" اور اس بیٹے کو جو لیلیٰ کے بطن سے پیدا ہوا
تھا۔ جن کا نام آج علی اکبر مشہور ہے اسے زینب نے آئیں۔۔۔۔۔
زینب نے علی اکبر کو پالنا شروع کیا۔ علی اکبر سوتے زینب کے پاس۔ گود میں کھیلتے
تو زینب کے پاس۔۔۔۔۔ بھول گئے کہاں کون ہے۔ ہر وقت زینب کے ساتھ
رہتے۔ چوبیس گھنٹے بی بی زینب کے ساتھ رہتے۔۔۔۔۔ یہاں تک کہ سارے
مدینے میں علی اکبر، علی ابن زینب مشہور ہو گئے۔ اور اگر گھر میں محلے کی عورتیں آئیں۔
تو زینب اُسے چادر کے دامن میں چھپا لیتی۔۔۔۔۔ کہیں بچے کو نظر نہ لگ جائے۔ اس
شان سے پرورش ہو رہی تھی علی اکبر کی۔۔۔۔۔ زینب کبھی گود میں لے کے حسین
کے سامنے آتیں۔ تو حسین مسکرا کے کہتے۔

"زینب! ماشاء اللہ۔ تمہارا بیٹا تو بڑا حسین ہے بڑا سمجھدار
ہے۔ ہماری تمنا ہے۔ ہمارا دل چاہتا ہے۔ بھائی خواہش
ہے کہ تمہارا بیٹا ہم سے کوئی شے مانگے۔۔۔۔۔" اور
زینب جواب میں کہتیں۔

"میرا بیٹا غیرت دار ہے۔ میرے ہوتے کیوں مانگے کسی سے؟"
یہ بھائی بہن کی باتیں ہوتیں۔ علی اکبر کو کسی شے کی ضرورت ہوتی۔ تو
زینب سے مانگتے۔ کوئی شے چاہتے۔ تو زینب سے مانگتے۔ باس
زینب تیار کرتی۔ کھانا زینب تیار کرتی۔ اس شان سے علی اکبر پلے پے

اور —————

زینب نے یہ تیاریاں بھی شروع کر دیں۔ کہ چوٹ تک یہ میرا بیٹا ہے
اس کی شادی اس شان سے کروں گی۔ کہ دنیا یاد رکھے گی۔ کہ بنی ہاشم
کے شہزادے کی شادی کس شان سے ہوئی تھی ————— بس
اٹھارہ سال پورے ہو جائیں۔ انشاء اللہ اُنیسویں سال شادی
کروں گی ————— اور

سترہ سال پورے ہوئے۔ اٹھارہ سال شروع ہوا جو سفر شروع ہو گیا —————
زینب بھی سفر میں۔ علی اکبر بھی سفر میں۔ اور سفر بھر یہ عالم رہا۔ کہ زینب کی محفل کے
ایک طرف حسین کا گھوڑا ————— ایک طرف علی اکبر کا گھوڑا۔ ————— زینب کے محل
پہ کبھی علی اکبر کا ہاتھ ————— کبھی حسین کا ہاتھ ————— پھر بھی زینب بار بار
کہتی۔ "علی اکبر بیٹا۔ سر پہ کوئی کپڑا ڈال لو ————— دھوپ نہ لگ جائے بیٹا۔ سامنے
میں میٹھنا۔ گرمی شدید ہے ————— بیٹا۔ کھانا میرے سامنے بیٹھ کے کھانا۔ میں خود
دیکھوں گی۔" ————— علی اکبر اس ناز و نیاز ہی سے پتے پتے ہونے لگتا تھا کہ
امام نے کربلا کی زمین خریدی۔ تو زینب نے دبی زبان میں امام سے فرمایا۔

"حسین! یہ زمین اگر میرے بیٹے کے نام ہو جائے۔۔۔"
تو امام نے فرمایا۔ "اسے بھی حصہ ملے گا۔" اس لڑکے، پیارے زینب
علی اکبر کی پرورش کر رہی تھیں۔ اُدھراں سیلی بھی خوش تھیں۔
کہ اللہ نے مجھے علی اکبر جیسا فرزند عطا فرمایا ہے۔

بزرگانِ سن!

میں اپنے بیان کو یہاں اگر ختم کرتا ہوں۔ کہ ساتویں محرم الحرام کو کربلا میں پانی
بند ہو گیا۔ ————— مگر زینب کے منہ سے ایک دفعہ نہ نکلا کہ میرے غوٹ و دمٹ

پیا سے ہیں۔۔۔۔۔ جب گھبرا کے کہا۔ یہی کہا "میر اکبر پیا سا ہے۔"
 حسین دیکھتے نہیں۔ میرے اکبر کا چہرہ اتر گیا ہے۔ میرے اکبر کے ہونٹ خشک

ہیں۔۔۔۔۔

آخر تو تاریخ بھی گزر گئی۔۔۔۔۔ دسویں کی شب آگئی۔۔۔۔۔ اور
 جب دسویں کی شب آئی۔ تو امام اپنے مصلے سے اُٹھے۔ بیت الشرف میں تشریف
 لائے۔ تاکہ دیکھیں کہ مستورات کیا کر رہی ہیں۔۔۔۔۔ سب سے پہلا خیمہ جناب
 زینب کا آیا۔۔۔۔۔ امام نے دیکھا کہ چراغ روشن ہے۔ عویٰ و محمد سانسے بیٹھے ہیں
 اور زینب اُنہیں سمجھا رہی ہے کل کے لئے۔۔۔۔۔ اُس سے دوسرا بی خیمہ تھا
 جناب بیٹی کا۔۔۔۔۔ امام جب وہاں پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ۔۔۔۔۔

سیٹی بیٹھی ہیں۔ اور علی اکبر کا سر زانو پر رکھا ہوا ہے۔ ایک
 ہاتھ میں شمع روشن کی ہوئی ہے۔ ایک ہاتھ سے اکبر کے بالوں میں
 کنگھی کر رہی ہیں۔ شمع سے اکبر کا چہرہ دیکھ رہی ہیں۔۔۔۔۔ اور

کہہ رہی ہیں

"علی اکبر بیٹا! تیری ماں کا معاملہ بڑا نازک ہے۔ تجھے پتہ
 ہے میرا رشتہ ہے اُن ظالموں سے ہے۔ اگر کل
 تو کسی وجہ سے بھی پیچھے رو گیا۔۔۔۔۔ تو دنیا یہ کہہ دے
 ماں نے رد کر لیا ہو گا۔۔۔۔۔ میری عزت کا سوال
 ہے بیٹا! کہیں لوگ یہ نہ کہیں کہ حسین کا بیٹا ہونا۔ تو
 کبھی نہ رکتا۔۔۔۔۔ یہ اُس کی اماں کے دودھ کی تاثیر
 ہے۔۔۔۔۔ میرے دودھ کو بدنام نہ کرنا میرے

لال۔۔۔۔۔

"اماں - میری دادی فاطمہ مرتبہ میں زیادہ ہیں یا آپ۔۔۔۔۔؟ آپ دونوں میں کس کا مرتبہ زیادہ ہے۔۔۔۔۔ دادی فاطمہ کا یا آپ کا۔۔۔۔۔؟"

جناب زینب کہتی ہیں۔

"بیٹا یہ کیا پوچھ بیٹھے تم۔۔۔۔۔ تم جیسا سمجھ دار نوجوان یہ کیا سوال کر رہا ہے۔ کجا فاطمہ۔۔۔۔۔ کجا میں۔۔۔۔۔ میں تو فاطمہ کی کنیز ہوں۔۔۔۔۔"

میں زینب کے منہ سے نکلتا تھا کہ میں کنیز ہوں،۔۔۔۔۔ کہ علی اکبر اُمّہ کے بیٹہ گئے۔۔۔۔۔ اور بیٹہ کے کہتے ہیں۔۔۔۔۔

"اگر واقعی فاطمہ کا مرتبہ آپ سے زیادہ ہے۔ آپ اُن کی کنیز ہیں جیسا کہ آپ کہتی ہیں۔۔۔۔۔ تو آج کام تو کر۔۔۔۔۔"

بیٹا کیا۔۔۔۔۔؟ کہ۔۔۔۔۔

"آج فاطمہ کے بیٹے پہ اپنے بیٹے کو قربان تو کر دو۔۔۔۔۔" اور اُدھر سے امام نے آواز دی۔

"زینب! میں نہ کہتا تھا کہ آج میں سنوں گا کیا بات ہوتی ہے۔"

اب زینب نے اکبر کو سر سے پیر تک دیکھا۔۔۔۔۔ اور فرمایا۔

"ہاں بیٹا خدا حافظ۔ جاؤ۔"

دونوں بہن بھائیوں نے مل کے لباس پہنایا۔۔۔۔۔ سر پر عمامہ باندھا۔ عمامے کا ایک حصہ گردن کے ساتھ "نخت الحنک" کی طرح باندھ دیا۔ علی اکبر کو تیار کیا اور فرمایا۔

"جاؤ بیٹا۔ خدا حافظ۔"

اب جو روانہ ہونے لگے اکبر۔ تو ایک بہن نے آکر عبا کا دامن پکڑ لیا۔

"اکبر عبا! جارہے ہو۔ مجھ سے مل کے جاؤ۔۔۔۔۔" اسی طرح

دوسری بہن بھی۔۔۔۔۔ اُس سے رخصت ہو کے جانے لگے۔۔۔۔۔

تو سب سے چھوٹی بہن سکینہ آکھڑی ہوئی۔ اور کہنے لگی۔
 ”اکبر بھائی! آپ دیاں جا رہے ہیں۔ جہاں سے کوئی واپس نہیں آیا۔ آپ کے بھ
 میرے اتنا کا کیا بنے گا۔ میرے اتنا پہ کیا گزرے گی۔“ اکبر نے گود میں لے کے بچی کو پیار
 کیا۔ اُس سے رخصت ہو کے جانے لگے۔ خود فوج
 یزید اس بات کی ناقص ہے کہ حسین کے خیمے کا پردہ اٹھتا تھا اور گرتا تھا۔ اٹھتا تھا اور
 گرتا تھا، سویرا تھا کہ سب سے رخصت ہو کر علی اکبر باہر آتا چاہتے تھے۔ کوئی ٹھیکو بھی
 ماں بہنیں پھر آکے اکبر کا دامن پکڑ لیتی۔ اکبر پھر ٹھہر جاتے۔ اور
 میرے محترم سامعین!

جب کافی دیر ہو گئی۔ تو امام نے فرمایا۔

”بی بیو! مسافر کا واسطہ نہ روکو۔ بس اب صبر کرو۔ اکبر کو جانے دو۔“

اور سب خواتین خاموش ہو گئیں۔ اب جو اکبر روانہ ہوئے۔ تو
 ایسا منظر نہ گیا۔ کہ حسین جیسا صابر بھی وہ منظر نہ دیکھ سکا۔ اور آنکھوں پر رُوماں رکھ کے
 گھر سے باہر آگئے۔

منظر کیا بن گیا کہ سب مستورات سے رخصت ہو کر جب اکبر روانہ ہوئے۔ تو ایک آواز

آئی کان میں

”اکبر! اہم سے بھی مل کے جاؤ نا۔“ ترین العابدین لیتر بباری سے اٹھ کر کھجی برائی کر
 کو اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر کہہ رہے تھے۔ دونوں بانیوں نے ایک دوسرے کے
 گلے میں ہاتھ ڈال دیئے۔ اللہ جانتے۔ کیا راز و نیاز کی بھائیوں میں باتیں ہوتی ہوں گی۔
 اللہ جانتے۔ کیا گفتگو ہوتی ہوگی۔ بہر فوج بھائی سے رخصت ہو کر اکبر باہر
 آئے۔ اور امام زین العابدین اپنے لیتر بباری پہ جا کے بیٹھ گئے۔ اور حکم دیا۔
 ”پردہ اٹھا دو۔“ میں اپنے بھائی کا جہاد خود دیکھنا چاہتا ہوں۔“ اکبر باہر آئے۔

ابو جبریلؑ نے خود رکاب پکڑ کے علی اکبرؑ کو سوار کیا — علی اکبرؑ سوار ہو گئے۔ تو امامؑ نے فرمایا۔

”جاؤ بیٹا! خدا حافظ“

اب جو اکبرؑ میدان کی طرف جانے لگے۔ تو امامؑ گھوڑے کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ اکبرؑ نے گھوڑہ اردکا۔ اور عرض کی۔

”قہر! آپ تکلیف فرما رہے ہیں۔ اگر آپ حکم دیں۔ تو میں واپس ہو جاؤں“

آپ کیوں رحمت فرما رہے ہیں —

”علی اکبرؑ بیٹا۔ بات یہ ہے۔ تمہیں ہمارے دل کا احساس نہیں۔ اس لئے کہ تمہارے کوئی جوان بیٹا نہیں۔ — جاؤ میرے لال۔ میں یہیں بیٹھا ہوں —“

یہ کہہ کے حسینؑ دہلی زمین پر بیٹھ گئے۔ اور ہاتھ اٹھا کے دعا کی۔

”خداوند! گواہ رہنا۔ اُس بیٹے کو بھیج رہا ہوں۔ جو صورت و سیرت میں نیزے

عصیب سے مشابہ ہے۔ جب میں رسولؐ کی زیارت کا مشائق ہوتا تھا۔ اسے دیکھ لیا کرتا تھا —“

حسینؑ بیٹھ گئے — اکبرؑ میدان میں چلے گئے۔ — بھاد شروع ہو گیا

شیر نہ ان کے پوتے کا جہاد، حیدر کرار کے پوتے کا جہاد۔ مگر

سامعین! دوران جہاد ثوبت یہ پہنچی کہ گھوڑے کے گلے میں اکبرؑ نے دونوں ہاتھ

ڈال دئے۔ — اور گھوڑا سوار کو لے کے نوچوں میں گھوم رہا ہے۔

آخر گرنے لگے۔ اور جب گرنے لگے تو آواز دی۔ ”یا ابتا ادھر کہ“ ”بابا میں

گھوڑے سے گر رہا ہوں“

حسینؑ نے آواز سنی — بیٹھے ہیں غاموش — بیسی آئیں دروازے پر۔

”حسین! میں سیدانی نہیں ہوں۔ میرے اندر ناشی خون نہیں ہے۔۔۔۔۔ میں
غیر خان کی ہوں۔۔۔۔۔ اس جوان کی ماں ہوں۔ میری ایک التجا ہے۔ جسے آج پہلی دفعہ
کہہ رہی ہوں۔ کہ اگر ہر سکے تو اکبر کی لاش لے آئیں۔۔۔۔۔ ایک دفعہ زندگی میں مجھے
میرے بیٹے سے ملا دو۔۔۔۔۔“

حسین اٹھنے۔۔۔۔۔ میدان میں آئے۔۔۔۔۔ جب اکبر کی میت ہ قدم کے فاصلے
پر رہ گئی۔۔۔۔۔ آگے آواز دی ”اُدعونی یا بُنّی“
”اکبر بیٹا۔ ہمیں لپکا رو۔

اکبر بیٹا۔۔۔۔۔ ہمیں آواز دو۔۔۔۔۔ بیٹا ہمیں آنکھوں سے نظر نہیں آ رہا۔ ہمیں
راستہ نظر نہیں آتا۔۔۔۔۔ تم آواز دو۔ ہم تمہاری آواز کے سہارے آئیں گے۔۔۔۔۔
بیٹے نے وہاں سے آواز دی۔۔۔۔۔“

”۔۔۔۔۔“ ”جی یہاں ہوں۔۔۔۔۔“ اور آواز کے سہارے
حسین لاش کے سر ہانے پہنچے۔۔۔۔۔ اور منظر کیا دیکھا؟ بیٹا ایک پاؤں پھیلا تا
۔۔۔۔۔ ایک باؤں سمیتا ہے۔۔۔۔۔ حسین دیکھتے رہے اس منظر کو۔۔۔۔۔ پھر
بیٹے کو گود میں لیا۔ اور فرمایا۔

”علی اکبر بیٹا۔ ہم آگئے۔ ہم آگئے میرے بھائی۔ اور علی اکبر بڑے آنکھیں کھول دیں۔
مام کو دیکھا۔ اور فرمایا۔۔۔۔۔“

”باباجان! آپ نے بڑی تکلیف فرمائی۔۔۔۔۔ میرا آخری دُفت ہے
باباجان۔۔۔۔۔“

”ہاں بیٹا ہم آگئے۔۔۔۔۔ کچھ چاہئے۔۔۔۔۔ کچھ فرمائش؟۔۔۔۔۔ کوئی وصیت؟“
اکبر وہ بیٹا ہے کہ جس کے باپ کو نمٹا تھی کہ اکبر مجھ سے کچھ مانگے۔ اور کبھی نہ مانگا۔ آج بھی
حسین کہتے ہیں۔ ”بیٹا کچھ مانگو نا۔۔۔۔۔“ اور اکبر کہتے ہیں۔

ہاں بیٹا مانگو کیا مانگتے ہو۔۔۔۔۔ تو علی اکبر نے مانگا کیا۔۔۔۔۔؟

”بٹیا۔ یہ تو ممکن نہیں۔ فکر نہ کر۔ ابھی تیرے بڑے بھائی سیراب کریں گے۔
تمہاری دادی تمہیں سیراب کریں گی۔“

کچھ کچھ اور مانگو۔“

”ہاں بیٹا۔ یہ بات ہم یوری کر س گے۔ گھبراؤ نہیں۔“

جوان کی میت - بوڑھا باپ - ہاتھ تھرتھرائے - لاشہ شادیا ————— پھر
دم لے کے دوبارہ اٹھایا۔ ————— اب کے سینے تک اٹھایا۔ ————— پھر ہاتھ
رزمے ————— پھر شادیا ————— اور لٹا کے فرمایا۔

علی اکبرؑ نے ایک ہاتھ ڈال دیا باپ کے گلے میں۔۔۔۔۔ تو حسینؑ نے کہا۔۔۔

”بیٹا۔ دونوں ہاتھ ڈال دو۔“ اب پوچھیں گے کہ اتنا کبڑے جواب دیا۔

”بابا جان! میں دوسرا ہاتھ سینے سے بٹانا نہیں چاہتا۔ میں آپ کو اپنا سینہ دکھانا

”ہیں چاہتا۔۔۔۔۔“

”بیٹا۔ کوئی بات نہیں۔۔۔۔۔ ہم دیکھیں گے کیا بات ہے۔۔۔۔۔“

اب جو حکم دیا امام نے۔ تو اکبرؑ نے ہاتھ ہٹایا۔ اور حسینؑ نے دیکھا۔

”بس یہ بات تھی بیٹا۔۔۔۔۔“ دیکھا کیونکہ برہمن کا پھل ٹوٹ کے وہیں رو گیا

ہے۔ ایک انچ بھر باہر نکلا ہوا ہے۔ اکبرؑ کا دل برہمن کے ساتھ چھڑ چکا ہے

مگر حسینؑ طاقت کو دیکھو۔۔۔۔۔ اکبرؑ کی میت لٹائی۔ خود دوزانو بیٹھے۔ ایک

ہاتھ بیٹے کے سینے پر رکھا۔ ایک ہاتھ سے برہمن کی پٹری۔۔۔۔۔ اور برہمن کی پٹری کے منہ آسمان

کی طرف کر کے بلند آواز میں آواز دی۔

”نانا رسول اللہ! داد ابراہیمؑ کو ساتھ لے کے کربلا میں آؤ۔ میرے

دونوں بزرگوں۔ آگے دیکھو۔۔۔۔۔ میں گھبرا نہیں رہا۔ میری آنکھوں پر

پٹیاں نہیں ہیں۔ میرا ہاتھ لرز نہیں رہا۔ میرا بدن کانپ نہیں رہا

میں نے اپنے اسماعیلؑ کے ہاتھ نہیں باندھے تھے۔۔۔۔۔“

اور یہ کہہ کے حسینؑ نے برہمن کو بلایا۔ برہمن ہلی۔ تو اس میں اکبرؑ کا پھسا ہوا دل ہلا۔

دل کا لہنا تھا کہ پورا بدن لرز گیا۔ اکبرؑ کا بدن لرزا۔ تو کربلا کی زمین میں زلزلہ آگیا۔ کربلا کی

زمین میں زلزلہ آیا۔ تو حسینؑ کے نیچے لرز گئے۔۔۔۔۔ اور تہیوں کا لرزنا تھا کہ نیچے کے

دروازے کا پردہ گرا۔۔۔۔۔ اور آواز آئی۔۔۔۔۔

”حسینؑ ٹھہر۔ مجھے بھی آنے دے۔ حسینؑ! اکیلا یہ لاش نہ اٹھا۔

زینبؑ بھی آ رہی ہے۔ بہن بھائی مل کے یہ کام کریں گے۔۔۔۔۔“

حسینؑ نے وہیں سے آواز دی۔

”زینبؑ! میں اکبرؑ کو قربان کرتا ہوں تیرے پردے پر۔ زینبؑ! تو

باہر نہ آنا۔ میں خود اسے لے کر آ رہوں۔“

”اماں بیٹی! اب تو خوش ہے نا — اب تو مطمئن ہے نا“

سینل کے منہ سے یہی نکلتا رہا۔ "سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلَى" خداوند

تیرا شکر ہے۔ — میری نیک کماٹی نیک راہ میں کام آئی۔

اور حسینؑ نے لاشے کو لے جانے کی گنج شہیدان میں رکھا۔ اور جب اصغرؑ کی قبر بنائی
ہے حسینؑ نے وہ ایک کی محبت کے بالکل قریب بنائی تھی۔ اور اکبرؑ کا ہاتھ پکڑ کے اصغرؑ
کی قبر پر رکھ دیا۔ اور اٹھ کے فرمایا۔

”اکبر بیٹا! جھوٹے بھائی سے ہوشیار رہنا۔ میں اصغرؒ تمہارے

سیر کرتا ہوں میرے لال! چھوٹے بھائی سے خبردار رہنا — اور

یہ کہہ کر حسین کھڑے ہو گئے اور اتنا کہا ”یا بُحییٰ علیک الدنیا بعد الخوار“ اسے بیٹا! تیرے بعد یہ دنیا خاک ہے۔ اور اُس دن کے بعد آج کے دن تک حسین کے ٹوٹے ہوئے دل کا نام کرتے ہیں ہم۔۔۔ نوجوانو! تم نئے اکبر کا نام کرنا ہے۔

سفیدریش پوڑھو! تم نے حسین کی کمر جانی ہے اور

پردہ میں بیٹھنے والی عورتوں نے یسٹروژن کو ریسا دیتا ہے۔

— اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُونَ —

ناتار رسول اللہ! دادا ابراہیم کو لے کر آؤ۔

اور دیکھو! ● میں نے آنکھوں پہ پٹی نہیں باندھی ہوئی۔

میرا ہاتھ نہیں کانپ رہا۔

● میرا اسماعیلؑ نہیں تڑپ رہا۔ (حسین ابن علیؑ)

وخطیب آل محمد

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

Presented By: www.jafrilibrary.com

بوڑھے بھی بھرتی ہیں۔ اس میں تیس سال کا جوان بھی ہے۔ اٹھارہ سال کے نوجوان بھی ہیں۔ نو دس برس کے بچے بھی ہیں۔ اور حد یہ ہے اس فوج کی کہ اس میں چھ بیٹے کا سپاہی بھی ہے۔ بتائیے۔ اسی فوج کہیں دنیا میں دیکھی ہے آج تک کسی نے ایسا رسالہ، ریڈیو، دیکھی ہے آج تک جس میں یہ صورت ہو، پھر یہ فوجوں کے لئے رسد کے انتظام ہوتے ہیں۔ اچھے سے اچھا کھانا سپاہیوں کو دیا جاتا ہے۔ اچھے سے اچھا سامان انہیں فراہم کیا جاتا ہے۔ اور اگر کسی فوج کو یہ اندیشہ ہو کہ ہماری رسد بند ہو جائے گی۔ تو وہ فوجیں میدان چھوڑ دیتی ہیں۔ مگر ہماری عجیب فوج ہے کہ تین دن سے رسد بند ہے۔ مگر بیٹھے ہیں۔ کیا مجال ہو کسی کی پیشانی پر بل آیا ہو۔ کیا مجال ہو کسی کی پیشانی پر شکن آیا ہو کسی کو ذرا گھبراہٹ ہوئی ہو۔

اور آج کی رات کربلا میں بیٹھے والوں نے دنیا کے سارے اصول بدل دیئے۔ دنیا کی ساری قدریں بدل دیں۔ دنیا کے سارے ضابطے بدل دیئے۔ دنیا کے سارے طریقے بدل دیئے جب سے دنیا جی ہے اور آج تک کوئی انسان ایسا پیدا نہیں ہوا جو موت سے ڈرتا ہو۔ ہر شخص موت سے ڈرا۔ یہاں تک کہ انبیاء ڈرے۔ اولیاء ڈرے۔ بڑے بڑے خدا رسیدہ ڈرے۔ بڑے بڑے جرنیل و کرنل موت سے ڈرے۔ اور جب موت حسینؑ کے لشکر میں آئی۔ تو وہ یہ سمجھ کے آئی تھی کہ جس طرح ساری دنیا مجھ سے ڈرتی ہے۔ یہ بہتر بھی ڈر جائیں گے۔ مگر موت نے آکر دیکھا کہ وہ بوڑھوں کے پاس گئی تو انہوں نے اُسے خطاب بنا لیا۔ جوانوں کے پاس گئی تو انہوں نے درست بنا لیا۔ بچوں کے پاس گئی تو انہوں سے کھیلنا شروع کر دیا۔ اتنی شرمندہ ہوئی ہے موت حسینؑ اور حسینؑ کی فوج سے کہ موت نے عہد کر لیا کہ جہاں حسینؑ ہوگا اور اُس کا نام ہوگا۔ وہاں نہیں جانا۔ ورنہ کبھی کامر جاتا حسینؑ کا نام۔ اب موت نے عہد کر لیا کہ جہاں حسینؑ اور حسینؑ کا نام ہوگا وہاں نہیں جانا۔

بہر فوج آج رات حسینؑ نے سب سے پہلے مردوں کا امتحان لیا۔ تم جو میرے ساتھ آئے ہو۔ تمہارے دل میں یہ خیال تو نہیں کہ فاتح خیر کا بیٹا آیا ہو ہے۔ میدان فتح ہوگا۔ مال غنیمت ملے گا۔

ایسا نہیں ہے۔ میں یہاں مرنے آیا ہوں۔ جو مرنا چاہتا ہو۔ وہ میرے ساتھ رہے اور دیکھو۔ مرنے کے بعد کفن نہیں ملے گا۔ مرنے کے بعد قبر نہیں ملے گی۔ مرنے کے بعد تمہاری عورتیں اور بچے تیار ہو جائیں گے۔ تمہارے گھر حلا دیئے جائیں گے۔ تمہارے خاندان نباہ ہو جائیں گے۔ ان تمام تباہیوں اور بربادیوں کو اگر منظور کرتے ہو۔ میرے ساتھ ٹھہرو، درختہ جاسکتے ہو، مگر دنیا نے دیکھا کہ اتنی تباہی کے ہوتے ہوئے اُن جوانوں نے جواب کیا دیا۔

”حسین! اب تو ہم آ بیٹھے ہیں۔ اب تو یہ قدم یہاں سے نہیں ہٹ سکتے۔“

دیکھا کچھ رہی تھی۔ کہ کہہ رہے ہیں شاید کر کے نہ دکھائیں۔ مگر اگلے دن جو صبح ہوئی۔ تو انہوں نے ایک ایک بات سچ کر کے دکھائی۔ ایک ایک بات انہوں نے سچی کر کے دکھائی۔ جو ایک دوسرے کو روک رہے تھے۔ ”تو ٹھہر بیٹھے میں جاؤں گا۔“

یہ تو دونوں کی شان تھی۔

حسین نے چاہا کہ چلیں جا کر دیکھیں۔ گھر میں مستورات کیا کر رہی ہیں۔ حیدر بیت الشرف میں آئے۔ آپ نے وہاں عجیب ماجرا دیکھا۔ کہ تمام چاروں طرف خیمے ہیں۔ اُن میں چراغ جلے ہوئے ہیں۔ خیمے آباد ہیں۔ عورتیں بیٹھی ہیں۔ مائیں بیٹوں کے پاس ہیں۔ بہنیں بھائیوں کے پاس ہیں۔ شوہر بیویوں کے پاس ہیں۔ عزیز عزیزوں کے پاس بیٹھے ہیں۔ گھر آباد ہیں۔ اور حسین کی نظر جو آباد گھروں پر پڑی تو سر جھٹکے کہا۔ ”خداوند! یہ سادات کا گھر ہے جو آج آباد ہے۔ آج اس میں چراغ روشن ہیں۔ آج یہ گھر لٹا ہوا ہے اور اس گھر کی آبادی کی آج آخری رات ہے۔ آج حسین کا گھر آباد ہے۔ اور کل یہ گھر اس طرح آباد نہیں ہو گا۔ کل غریبوں کی رات آئے گی حسین نے وہ آباد گھر دیکھے سب سے پہلے بہن کے خیمے میں دیکھا۔ یہاں کیا ہو رہا ہے۔“

موتوں نے دیکھا۔ زینب بیٹھی ہیں۔ سامنے عوں و عمر کو بٹھایا ہوا ہے۔ لباس پہنا دیا ہے۔ تلواریں سامنے رکھی ہوئی ہیں۔ اور زینب انہیں خیر و خندق کے واقعات سن رہی ہیں۔ اور کہہ رہی ہیں۔

”تمہارے نانا صید کر کر آویں لڑتے تھے۔ تمہارے دادا جعفر طیار کی بہادری کی یہ شان تھی۔ میرے پیارے چچا تم نے میرا دودھ پیا ہے کُل میدان جنگ سے تمہاری آواز نہ آئے کہ ہم علیؑ کے نواسے ہیں۔ ہم جعفر طیار کے پوتے ہیں۔ زینب دودھ سب بخشے گی سب یہ فوجیں چلاؤ گئیں کہ یہ علیؑ کے نواسے ہیں۔ یہ جعفر طیار کے پوتے ہیں۔ اور بچوں نے ایک انگڑائی لے کر اس کے قدموں کی قسم کھا کے کہا۔

”اماں کل اجازت دلا دے۔ اگر ان فوجوں کو کوٹے تک نہ بھگا دیں تو دودھ نہ بننا۔“ امامؑ نے یہ غم دیکھا۔ یہوصلے دیکھے۔ دل بھرا یا حسینؑ کا۔ آنسو پونچھے۔ آگے بڑھے۔ اگلے خیمے میں گیا۔ دیکھا کہ جنابِ سبلی خیمے میں بیٹھی ہیں۔ بیٹے کا سر زانو پر رکھا ہے۔ ایک ہاتھ میں شمع روشن ہے۔ ایک ہاتھ سے بیٹے کے بالوں میں کنگھی کر رہی ہیں۔ شمع سے علیؑ کا چہرہ دیکھ ہی میں اور فرماتی ہیں۔

”میرے نعل! آج دل بھر کے مجھے اپنی زیارت کر لینے دے۔ کل یہ چاند سا چہرہ خاک اور خون میں بھر جائے گا۔“

امامؑ منظر دیکھ کے آگے بڑھے اور دیکھا کہ سبتاب امامؑ کی بیوہ نے قاسمؑ کو سامنے بٹھا رکھا ہے۔ اور کہہ رہی ہیں ”قاسم بیٹا! آج تیرا باپ حسنؑ موجود نہیں ہے۔ تو مجھے بیوہ کا نعل ہے میں غیر خاندان کی ہوں۔ سیدانی نہیں ہوں۔ میرے دودھ کی عزت رکھنا بیٹا! ایسا نہ ہو کل میرا دودھ بدنام ہو جائے۔“

امامؑ نے یہ منظر بھی دیکھا اور اس کے بعد امامؑ نے کیا دیکھا کہ دروازے پر بڑھیا دائی ف کھڑی ہے۔

”آماں فقیہہ سلام“

قصہ تو رہنے لگی۔

”آماں فقیہہ! روتی کیوں ہو“

”حسین خیمے میں جس جس کا بیٹا ہے۔ وہ اپنے بیٹے کو تیار کر رہا ہے۔ اگر آج میرا بھی کوئی بیٹا ہوتا تو میں بھی تیار کرتی۔“

یہ سننا تھا کہ حسینؑ تو بے چین ہو گئے۔ فرماتے کیا ہیں۔

”اماں فضہ یہ تو نے کیا کہہ دیا۔ کل سب میدان میں زینب عوٰن و محمدؑ کو بھیجے، لیکن علی اکبرؑ کو بھیجے۔ قاسمؑ کی ماں قاسمؑ کو بھیجے۔ علی اصغرؑ کی والدہ علی اصغرؑ کو بھیجے تو تو مجھے اپنا بیٹا کہہ کے بھیج دینا حسینؑ کی قربانی تیری طرف سے ہوگی۔

اماں نے یہ سن کر بھی دیکھا پھر تھوڑی دیر کے بعد اماں کو ایک کونے سے رونے کی آواز آئی حسینؑ نے کہا۔

”یہ کون رو رہا ہے۔“

جا کے دیکھتے کیا ہیں کہ چھپنے والے کے گہوارے پر سر رکھے ہوئے اُس کی ماں ”رباب“ رو رہی ہے۔ اماں قریب جا کے کھڑے ہوئے۔

”رباب! کیا بات ہے؟ کیا بچہ ختم ہو گیا۔“

”نہیں مولا! ابھی زندہ ہے۔“

”پھر رو کیوں رہی ہو رباب!“

”تمہید! اپنی قسمت کو رو رہی ہوں۔“ حضورؐ دیکھ رہے ہیں کہ زینب عوٰن و محمدؑ کو تیار کر رہی ہیں۔ علی اکبرؑ کو تیار کر رہی ہیں۔ قاسمؑ کی ماں قاسمؑ کو تیار کر رہی ہیں۔ کل سب یہ قربانیاں پیش کریں گی۔ اور آپؐ کی ماں فاطمہؑ کے دربار میں سرخرو ہو کے جائیں گی۔ میں بد نصیب ہوں۔ میرا بچہ اتنا چھوٹا ہے کہ میں اسے میدان میں نہیں بھیج سکتی۔ یہ سب قربانیاں والی سرخرو ہوں گی، میں شرمندہ ہوں۔

دوسری بات مجھے یہ رولا رہی ہے کہ آپؐ ہی نے فرمایا تھا۔ کہ آپؐ کی شہادت کے بعد ہمارے ہاتھ بندھ جائیں گے۔ تو بچے کو سنبھالے گا کون۔ میں گھبرا رہی ہوں۔ یونہی تو تڑپ کے

مرہی جانے لگا۔ کاشش! یہ دو سال کا ہونا۔ تو اسے گھٹنوں چلا کر میدان میں لے جاتی۔ میں بڑی عبور ہوں۔“

امام نے رباب کی جو یہ گفتگو سنی۔ تو فرمایا ”رباب! خدا کی رحمت سے ایسے نہ ہو۔ میں حسینؑ تجھ سے وعدہ کرتا ہوں کہ کل تیرے اصغرؑ کو اکبرؑ سے نہ بڑھا دوں تو حسینؑ نہ کہنا۔ ذرا کل ہونے دے۔ دیکھنا تو سہی کل بتا کیا ہے۔ اسے ایسا سیراب کروں گا کہ قیامت تک اس کی پیاس کی یاد نہ کروڑوں سبیلیں لگ جائیں گی۔ یہ فرات کی شے ہے اتنی سبیلیں لگ جائیں گی کہ اگر ساری سبیلوں کے پانی اکٹھے ہو جائیں۔ تو ہزار فرات بن جائیں گے اس کی یاد میں۔“

پھر توجہ یوم عاشور حسینؑ رباب کے پاس آئے اور فرماتے لگے۔

”رباب! میں اصغرؑ کو لے جاؤں۔“

رباب خوش ہو گئیں۔ ”موٹا! بے شک لے جائیں۔ میں تو اسی انتظار میں تھی۔“

رباب نے بچہ حسینؑ کی گود میں دے دیا۔ امامؑ لے کے چلے۔ ابھی دس قدم چلے ہوں گے کہ رباب سامنے آگئی۔

”موٹا! ذرا اس بچے کو میری گود میں دے دو۔“

”کیوں! رباب دل نہیں چاہتا بھیجے کو۔“

رباب گھبرا گئی۔

”نہیں قبلہ! تھوڑی دیر کے لئے چاہتی ہوں۔“ رباب نے بچے کو گود میں لیا لے کے

اپنے خیمے میں گئی۔ اور امامؑ انتظار میں صحن میں کھڑے ہیں۔ بہن بھی ساتھ کھڑی ہیں۔ رباب

پانچ منٹ کے بعد خیمے سے باہر آئی۔ تو بچے کی شکل کیا تھی کہ نیا کرنا پہنا دیا تھا۔ بال درست

کر دیئے تھے۔ آنکھوں میں سرمہ لگا دیا تھا۔ کمرے کی آئینیں الٹ دی تھیں۔ اور بچے کی کمر

ایک رُومال سے باندھ دی تھی۔ رباب اس شان سے لائی اصغرؑ کو۔

”کیوں رہا اب! کچھ کہتا ہے۔“

”اصغر مثیلا! تم میدان میں جا رہے ہو۔ تم باپ کی گود میں ہو۔ مجھے پتہ ہے کہ تم دس منٹ بعد اپنی دادی کی گود میں پہنچ جاؤ گے۔ تمہاری بی بی خداؤں جنت ہیں۔ تم اُن کی گود میں جاؤ گے۔ جا کے آماں کا سلام کہنا۔ اور اگر دادی کے پاس کچھ مانگنا ہو تو دھلا کے نہیں

بھیا۔ تو ان کی شکایت نہ کرنا بیٹے! کہہ دینا۔ ان کو باقی رہے۔ یہ ہوا۔ اور دوسری بات یہ سن میرے لعل! تمہارے دادا ساقی کوثر ہیں۔ تم باقی کوثر کے پوتے ہو تمہارے دادا تمہیں گود میں لے کے کوثر یہ جاؤ گے۔ اور ماں کی یہ بات یاد رکھنا کہ

کوثر پہ پہنچ کر بھی حسینؑ سے پہلے پانی نہ پینا۔ اور ایک تیسری وصیت اور ہے اصغرؑ بیٹا! وہ بھی یاد رکھنا کہ مجھے پتہ ہے میدان جنگ میں تمہارے تیز گئے کار، تم تیرے شہید ہو گے۔ میں بہیں دروازے پہ کھڑی دیکھ رہی ہوں گی۔ جب تیز گئے تمہارے آکر تو رونا مات

تہار می چھہ جھینے کی جان ہے۔ شاید رونا آجائے۔ اصغر بیٹا، ارونا مت۔ دشمن کی فوجیں
سلسلے کھڑی ہیں۔ اگر تم تیر کھا کے روڈ کے تو دشمن یہ کہہ کے نہیں گے کہ حسین کا بیٹا تو کبھی
نہ روتا۔ یہ رباب کے دودھ کی خرابی ہے۔ تیرے رونے سے تیری ماں کا دودھ بدنام ہوگا۔

میرے لعل! میں توجہ جانوں جب تیرے تیر لگے، اعتراف ہنس دینا۔ جاؤ خدا حافظ،
اور حسن کے مسد ان میں لگئے۔

حصین نے اصغرؑ کو ہاتھوں پہ اٹھایا۔

”مسلمانو! اس بچے کو ایک گھونٹ پانی دے دو“

”اصغرؑ بیٹا! میرے کہنے پہ یہ پانی نہیں دیتے۔ تم خود ان سے پانی مانگ لو۔ اور بچے نے ہونٹوں پہ زبان پھرنا شروع کی۔ اُدھر بچے کی زبان ہونٹوں پہ آئی اُدھر پوری فوج منہ پھیر کے رونے لگی۔

اب جو عمر سعید نے فوج کا یہ نقشہ دیکھا تو اُس نے حُرملہ کو بلایا۔

”حُرملہ! تو بڑا تیر انداز ہے۔ سارا معاملہ اُلٹ پلٹ ہو جائے گا۔ جلدی سے حصین کے کلام کو قطع کر دے۔ اس بچے کو ختم کر دے۔“

حُرملہ نے بچے کی طرف دیکھا۔ اپنے بازوؤں کی طاقت کو دیکھا عرب کا مانا ہوا تیر انداز، لوہے کا تیر جس کا وزن بچے کے وزن سے زیادہ تھا؛ کمان میں تیر جو بڑا، ایک گھٹنا زمین پہ رکھا۔ کمان کو پوری طرح کھینچا تیر چلانے کا ارادہ کیا۔ اُدھر اصغرؑ کی طرف اشارہ کر کے تیر چلانے کا ارادہ کیا۔ دھڑا دھڑا تھرائے۔ اور تیر کمان ہاتھ سے گر گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر تیر لگایا۔ پھر کھینچا۔ چاہا تیر پھینکے۔ ہاتھ تھرائے تیر کمان گر گیا ہاتھ سے۔ جب دو دفعہ یہی ہوا تو سنسان ابن انس نامی ایک شخص پاس کھڑا تھا وہ کہتا ہے۔

”حُرملہ! تو تو بڑا بہادر تیر انداز تھا۔ کیا اس بچے سے ڈر گیا۔ تیر کیوں

نہیں چلتا۔“

تو حُرملہ جواب میں کہتا ہے۔

”بچے سے نہیں ڈر گیا۔ جب میں تیر چھوڑتا ہوں تو حصین کے خیمے کا پردہ

ٹپنے لگتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ اس بچے کی ماں کھڑی ہے دروازے پر۔ میز ادلی دہل جاتا ہے۔ میرے ہاتھ سے تیر کمان چھٹ جاتا ہے۔“

اب کے جو تیسری مرتبہ اُس نے تیر جوڑا تو سنان نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیا اور
کے — اُس نے تیر چلا دیا۔

ادھر سے تیر چلا۔ ادھر سے باب نے ذرا پردہ ہٹا کے دیکھا۔
باب کو چونکہ اُس کے باپ نے بچپن میں مشق کرائی تھی تیر چلا لے کی۔ وہ خوب
واقف تھی تیر کے انداز سے — تیر کو آتا دیکھ کر باب نے کہا۔
”علی اصغر بیٹا! بشیار“

اصغر بیٹا! خبردار۔

تیر کا رخ یہ ہے کہ اگر تم آرام سے لیٹے رہو گے باپ کی گود میں تو تیر تمہارے اوپر
سے ہو کر حسین کو لگے گا۔ دیکھنا حسین کو تیر نہ لگنے دینا میرے لعل“

پس ماں کا یہ کہنا تھا کہ —

بچہ بالیٹا تھا، یا اٹھ کے بیٹھ گیا۔ اُس کا اٹھنا تھا کہ تیر گلے میں لگا۔ ادھر گئے
میں تیر لگا۔ ادھر نچے نے خیمے کی طرف ہنس کے دیکھا — مطلب یہ تھا

”اماں! دیکھ لے، میں ہنس رہا ہوں، اماں! میں تیری بات کو پورا کر رہا ہوں“

اور پھر حسین کی طرف نچے نے دیکھا — حسین کی طرف دیکھنے کا مطلب یہ تھا
”بابا بس! یا کوئی اور حکم ہے میرے لئے“

اماں نے اصغر کو کلیجے سے لگا لیا۔

چاہا گلے سے تیر کھینچے۔ پھر تڑپ گیا۔ پھر تیر کھینچنا چاہا پھر تڑپ گیا۔ حسین
نے زمین پر ٹا دیا اصغر کو۔ اور نچے سے کہتے ہیں۔

”تم شیر خدا کے پوتے ہو۔ عباس جیسے جری کے بھتیجے ہو۔ اکبر جیسے بہادر کے
بھائی ہو۔ حسین جیسے صابر کے بیٹے ہو۔

بیٹا! میں تیر کھینچنا چاہتا ہوں۔ میں تو جب ہاتھوں تم سے نہیں۔ — یہ تو

ہوا امام نے تو بچہ بالکل خاموش ہو گیا۔ مگر ادھر گلے سے تیر نکلا اُدھر دم نکل گیا۔ اور امام نے لاشہ کلیجے سے نکال لیا۔ اب گھر میں کیسے لے جائیں۔ رُباب کو کیا جا کے دکھائیں۔

سامعین کرام! ستموار سے قبر کھودی۔ بچے کو دفن کیا۔ حسین اپنے دامن کو جھاڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور سکینہؓ کو بچی کھڑی تھی دروازے پر آکے کہتی ہے۔
 ”اتان! علی اصغر ختم ہو گئے۔“
 ماں کہتی ہے ”تم کیسے سمجھی“

کہ ”بابا جب گئے تھے تو ہاتھ سینے سے لگائے ہوئے تھے۔ اور آئے ہیں۔ تو ہاتھ کھلے ہیں۔“

اور بزرگو! یہ میرے آخری فقرے ہیں کہ۔ مولائے علیؑ اصغر کی قبر اس طرح بنائی تھی۔ کہ ایک طرف علی اکبرؑ کی لاش، ایک طرف علی قاسمؑ کی لاش اور بیچ میں اصغر کی قبر۔ اور جب گیارہ محرم کو اسیران آئی محمدؐ روانہ ہوئے ہیں۔ کہ بلا سے قید ہو کر اور مستورات اپنے وارثوں کی لاشوں سے گذری ہیں۔ تو رُباب دہاں آکے اُتری۔ رُباب نے اصغر کی قبر دیکھی۔ اور کچھ نہ کہا سوائے اس کے کہ

ایک ہاتھ اکبرؑ کا اصغر کی قبر پر رکھ دیا۔ ایک ہاتھ قاسمؑ کا اصغر کی قبر پر رکھ دیا۔ اور اتنا کہا۔ ”دیکھو! تم دونوں بڑے بھائی ہو۔ چھوٹے بھائی سے ہوشیار رہنا۔ ڈراؤنا جنگل ہے کہیں ڈرنہ جائے۔“

اصغر بیٹا! گھبرا نہ جانا۔ باپ کی لاش بھی قریب ہے۔ بھائی بھی قریب ہیں۔“

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

زمانے کی گردشیں اس بات کی شاہد ہیں کہ انسان بڑا نقصان اٹھا تا ہے۔ ذرا سی غلطی انسان کو اتنے بڑے نقصان میں پہنچا دیتی ہے کہ پھر اس نقصان کا کوئی دوا نہ کر سکتا ہی نہیں۔ مگر نقصان سے وہ لوگ بچ جائیں گے اللہ کے فرمان کے مطابق جو وہ انا الذین امنوا۔ درجن لوگوں میں ایمان ہو گا۔ جو صاحب ایمان ہیں۔ وہ نقصان نہیں اٹھائیں گے۔ وہ ہمیشہ نفع میں رہتے ہیں۔ اس ظاہری دنیاوی نفع و نقصان کو تو صاحب ایمان نقصان ہی نہیں سمجھتے، آئندہ زندگی کے نفع پر ان کی نظر ہوتی ہے، اور وہ دنیا کے نقصان سے محفوظ رہتے ہیں جو صاحب ایمان ہیں۔ یہ اللہ کا فرمان ہے۔ اسی فرمان کے ساتھ قرآن مجید کی یہ آیت بھی شامل کریں۔

”لوگو! دل میں یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ وہ کبہ دیں زبان سے وہ مومن ہیں، بس وہ مومن ہو گئے۔“ ایسا نہیں ہو سکتا۔ صرف مومن کہتے سے وہ مومن نہیں بن سکتے۔ بلکہ ان کے ایمان کا امتحان لیا جائے گا۔ امتحان میں ان کو دیکھا جائے گا کہ وہ مومن ہیں کہ نہیں۔ ————— تو آج کی شب اہل ایمان کے امتحان کی شب ہے۔ آج اہل ایمان کا امتحان ہو رہا ہے۔ آج ان کے امتحان کی رات ہے۔ کل تو وہ آجائیں گے میدان میں۔ امتحان ان کا آج کی رات ہے کہ آج وہ اپنے لئے کیا فیصلہ کرتے ہیں وہ اپنے لئے کیا سوچتے ہیں۔ آج کی رات ان کے امتحان کی رات ہے۔

بزرگان میں یقیناً تاریخ عالم کا یہ پہلا واقعہ ہے کہ کسی سردار نے، کسی بادشاہ نے عین لڑائی کے وقت، عین میدانِ جنگ میں جب کہ لڑائی سر پر ہو۔ میدانِ جنگ میں اپنے پیامیوں سے یہ کہا ہو کہ "مدم چاکتے ہو"۔ یہ بے شل مثال صرف کر بلا کے ہی بے شل واقعوں میں ملے گی کہ آج جب یقیناً ہر گیارہویں جنگ لازماً ہوگی۔ اور جنگ کا حال معلوم ہے کہ ہینٹر بھوکے پیاسے یقیناً قتل ہو جائیں گے۔ قتل ہونے کے بعد وہ دیرانی و بربادی جو ان کے قتل کے بعد ہے وہ سب نظر ہی بخٹی اور جو اصحاب قتل ہوئے ان کی عورتیں بھی بھی ہیں، ان کے بچے بھی ہیں۔

انہیں محسوس ہو رہا ہے کہ ہمارے قتل کے بعد ہماری عورتوں کے ہاتھ بندھ جائیں گے۔ ہمارے یتیم بچوں کے گلے بندھ جائیں گے۔ انہیں یہ بھی معلوم ہے جس قوم سے ہمارا واسطہ ہے وہ ہماری لاشوں کو دفن نہیں کریں گے۔ یہ تمام چیزیں آج ان کے سامنے ہیں۔ ان تمام حالات کے ساتھ آج ان کا سردار ان سے ایک انوکھی بات کہہ رہا ہے۔ یہ ان کے ایمان کا امتحان ہو رہا ہے۔ شام کا وقت ہے بہن نے بھائی سے پوچھ لیا۔ ”جیٹا! گھوڑوں کے ٹاپوں کی برابر آوازیں آرہی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے، سینگڑوں سوار چلے آرہے ہیں۔ کیا یہ ہماری طرف آرہے ہیں؟“ جیٹا نے کہا ”نہیں بہن! یہ دشمن کی فوج ہے“ زینب نے آسمان کو دیکھا، زمین کو دیکھا۔

”یا اللہ! اس بھری دنیا میں کوئی ہے جو مجھ کے نواسے کی مدد کو آئے؟“

امام زینب کو تسلی دیتے ہیں ”بہن نکرہ کر۔ میرے ساتھی بھی ہیں۔“ رات ہوئی۔ غنا کی ناز سے نارغ ہوئے۔ آپ نے اپنے چھوٹے بھائی قمر بنی ہاشم جناب عباسؓ کو بلایا۔

”عباس! تم میری چھوٹی سی فوج کے سپہ سالار ہو۔ تم مجھے گن کے بتاؤ کہ اس وقت کتنے سپاہی میری فوج میں موجود ہیں؟“

قمر بنی ہاشم نے گن کے بتایا۔ ”ایک۔ دو۔ تین۔“

”محضور! میں نے گن لئے۔ اکہتر سپاہی ہیں۔“

آپ نے فرمایا ”بھائی، ایک دفعہ پھر گن۔ دوبارہ گنا۔“

”قبلا! میں نے گن لیا۔ اکہتر ہیں مگر میرے۔“

آپ نے فرمایا ”بھائی، ایک دفعہ پھر گن۔“

اب قمر بنی ہاشم سمجھ گئے۔ ضرور گنتی میں کوئی غلطی ہے جب کہ امامؓ بار بار فرما رہے ہیں۔ اب کے بڑی احتیاط سے گنا۔ جب گنتے گنتے ستر کے قریب پہنچے تو جیسے کاپرہ اٹھا اٹھا اٹھا آواز فضا پر آمد ہوئی اور سفید رمال میں لپیٹ ہوئی ایک چھوٹی سی شے لاکر سامنے رکھی۔ اور کہا ”عباس! یہ تو گنتی میں رہ گیا تھا۔ اب تیری فوج مکمل ہو گئی۔“

عباسؑ نے بچے کو اٹھا کے کھینچے سے لگایا۔ چھ مہینے کا ہے تو کیا ہے، بے توجہ دیکر کرار کا پوتا — اصرعؑ یہی بنے گا اور بچے نے آنکھیں کھول کے چچا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال لیں۔ بول تو سکتا نہیں، آنکھوں سے کہہ رہا تھا

در چچا جان! کل وہ جہاد کروں گا کہ دنیا یاد رکھنے کی قیامت تک کہ علیؑ کا پوتا کس طرح جہاد کرتا ہے۔“

بہر نوح بچے کو اندر بھیج دیا۔ ماں نے اسے گہوارے میں لٹا دیا۔ باقی بچے عثمانؑ کی نماز سے فارغ ہو کر خیموں میں گئے۔ ماں نے اپنے بچوں کو کل کے لئے لباس پہنائے — اور زینبؑ نے عونؑ و محمدؑ کو سامنے بٹھا کے کہا

”بیٹو! تمہیں معلوم ہے کہ تم جعفرؑ طیار کے پوتے ہو، جہدؑ کرار کے نواسے ہو اور دیکھو نا، کل میدان جنگ میں تم نے پہلی دفعہ جانا ہے۔ تمہارے بچپن سے، نا تجربہ کاری سے میں ڈر رہی ہوں۔ میں جیب جانوں کہ تم اپنی زبان سے نہ کہو کہ ہم علیؑ کے نواسے ہیں، جعفرؑ طیار کے پوتے ہیں۔ میں دروازے پہ کھڑی ہوں گی۔ میں جب خوش ہوں گی جب فوجیں چلا اٹھیں، یہ سب کے نواسے ہیں۔ یہ جعفرؑ طیار کے پوتے ہیں۔ زینبؑ یہ کہہ رہی تھیں — اور قاسمؑ کی ماں قاسمؑ سے کہہ رہی تھی، ”ٹھیک! آج تیرا باپ حسنؑ زندہ نہیں ہے۔ اگر وہ جوتا تو مجھے کچھ نہ کہنا پڑتا۔ میں تیری بیوہ ماں ہوں۔ میرا کوئی زور نہیں۔ میرا کوئی سہارا نہیں۔ میں بیوہ ماں تجھ سے کہتی ہوں —“ کل میرا نام روشن کرنا بیٹے! دنیا یہ نہ کہہ دے کہ ماں کے دودھ کی خرابی تھی۔ اپنی ماں کے دودھ کی عزت رکھنا میرے سب! — بیٹی علیؑ اگر سے بات کر رہی ہے — ایک ایک قانون اپنے اپنے عزیز سے گفتگو کر رہی ہے۔

امامؑ نے دیکھا یہ منظر۔ آکے منہ پہ بیٹھے — حکم دیا — ”بھائی عباسؑ! میرے تمام بیویوں کو میرے گرد اکٹھا کرو۔ میں ان سے کچھ گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔“

حکم کی دیر مٹی کہ امامؑ کے گرد بہتر سپاہی آکے بیٹھ گئے — ان میں ۱۲۰ برس کا بوڑھا بھی

۱۰۰۹ سال کے بچے بھی حسینؑ کی جنگی کونسل میں آکر امام کے گرد بیٹھ گئے۔ اور ابو تراب کے بیٹے نے زمین کے اوپر مسند لگا دی۔ اور امام نے فرمایا

”میرے دوستو! میرے عزیزو! میری جان سے زیادہ پیارے رفیقو! میرے بیٹو! بھتیجیو! مجھائیو!“

پھر امام نے نام لے لے کے فرمایا

”وہ مجھائی حبیبؑ! مجھائی زہیرؑ! اور جو بزرگ تھے جیسے حضرت مسلمؓ، عمارؓ وغیرہ۔ انہیں امام نے چپا کہہ کے خطاب فرمایا۔ میرے باپ اور نانا کے صحابو! دیکھ لو زمانے کا حال کیا ہے۔ یہ فوج جو مجھے گھیرے ہوئے ہے اسے صرف میری ذات سے واسطہ ہے تم سے کوئی عداوت نہیں۔ اس وقت رات کا وقت ہے۔ میں تمہیں خوشی سے کہہ رہا ہوں کہ تم میں سے جو جانا چاہے جاسکتا ہے۔“

یہ حکم نہیں دیا کہ ضرور چلے جاؤ۔ انہیں ان کی مرضی پہ چھوڑ دیا۔ دم میں سے جو جانا چاہے وہ جاسکتا ہے۔ یہ ہوراثہ تھا ان کے ایمان کا امتحان۔ جب تین چار دفعہ مولائے یہ فرمایا ”جو جانا چاہے جاسکتا ہے“ اور وہ سب خاموش بیٹھے رہے۔ کچھ نہیں بولے۔ تو مولائے فرمایا ”شاید یہ بات ہے کہ تمہیں جانتے ہوئے یہ خیال ہے کہ وہ ثواب جو تمہیں یہاں شہید ہونے میں ملے گا اس ثواب سے محروم رہ جاؤ گے۔“

”یہ حسینؑ! تم سے وعدہ کرتا ہوں اگر اس وقت تم چلے جاؤ تو جو شہادت کا ثواب ہے وہ تمہیں ضرور دلاؤں گا۔“

انہیں حسینؑ پر یقین تھا۔ اب وہ ثواب کا لالچ بھی ختم ہو گیا۔ اب مولائے فرمایا ”تمہیں غیرت محسوس ہوتی ہے، کہ لوگ تمہیں طعنہ دیں گے کہ اپنے سردار کو چھوڑ کر آگئے۔ اس غیرت کا علاج یہ ہے کہ میرے ساتھ تمہارے بھائی کی بیٹیاں آئی ہوئی ہیں۔ انہیں ساتھ لے جاؤ۔ انہیں نانا کی قبر پہ بٹھا دینا۔ پھر جہاں جس کا جی چاہے چلے جانا۔ اگر کوئی طعنہ دے تو

کہہ دینا کہ تربیب کا پردہ بچانے چلے آئے تھے۔ بی کی بیبیوں کو نرنے سے نکال کے لے آئے تھے۔
لوگ خاموش ہو جائیں گے۔

وہ لوگ پھر بھی خاموش رہے۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا
”میں تمہارے سامنے بیٹھا ہوں۔ آنکھ میں شرم ہے اس شرم کی وجہ سے تم نہیں جانتے۔
اکبر ٹپٹیا! ذرا چراغ گلی کر دو“

چراغ گلی ہو گیا۔ پھر امام نے فرمایا
”دادا اب اندھیرا ہے، میں تمہیں نہیں دیکھ سکتا۔ تم جاکتے ہو جس نے جانا ہو۔ میری طرف
سے اجازت ہے۔“

اب اندھیرے میں آوازیں تو آرہی ہیں۔ پتہ نہیں چل رہا کہ کیا ہو رہا ہے۔ جب پندرہ
بیس منٹ کے بعد آپ نے حکم دیا کہ ”چراغ دوبارہ روشن کیا جائے۔“

اب جو چراغ دوبارہ روشن ہوا تو امام نے دیکھا کہ اتنے میں یہ فرق آگیا تھا کہ جتنے
جوان تھے انہوں نے گونٹیاں لگا کے تلواروں کے نیام توڑ دیئے تھے۔ جو بڑھے تھے انہوں
نے گونٹیاں اُتار کے کمر سے باندھ لیں تھیں کہ کمر سیدھی ہو جائے۔ جو چھوٹے بچے تھے وہ ایڑیاں
اُٹھا کے کھڑے ہو گئے کہ جوان نظر آنے لگیں۔ یہ فرق ہو گیا تھا۔
جس نے جوان کی یہ ادا دیکھی تو بے ساختہ منہ سے نکل گیا۔

”میرے جیسے عزیز، میرے جیسے رفیق تو آدم سے آج تک کسی کو نہیں ملے۔ تمہارا
نہیں ارادہ جانے کا۔“

اب جو مولانا نے فرمایا تو ان کا بیٹا صبر بھی لبریز ہو گیا تھا۔ سب سے پہلے مسلم موسیٰ
آئے۔ بڑھے آدمی تھے۔ علی کے ساتھ رہ چکے تھے۔ رسول کو دیکھ چکے تھے۔ کھڑے ہوئے
”تلوار ٹیک کر۔ بدن میں تھوڑا سا لرزا بھی تھا۔ کہنے لگے۔

”حسین! میں نے تیرے نانا کو دیکھا ہے۔ میں تیرے بابا کے ساتھ رہا ہوں۔ تیرے

دوسری مرتبہ اور بلند آواز سے کہا دریا بنا رسول اللہ! پھر خاموش ہو گئے۔ پھر تیسری مرتبہ کہا درمیر سے سردار! پھر خاموش ہو گئے۔ اور خاموش ہو کے ایک دم مڑ گئے نجف کی طرف اور بجائے حسین سے کچھ کہتے — کہتے گئے۔

دریائے مدد! یا علی! حسین جانے کو کہہ رہے ہیں کیا جواب دوں —؟

امام کو پیار آگیا۔ اٹھ کے ایک ایک کے گلے ملے۔ ایک ایک کی پشیمانی چومی۔

درمیں تم سے بڑا غوش ہوں۔ میں تمہارا بڑا احسان مند ہوں۔ میں تمہارا بڑا شکر گزار ہوں۔ جاؤ۔ اپنے اپنے خیمے میں بیٹھ کر کل کے مرنے کی تیاری کرو۔ مگر ایک کام کرنا۔ اپنے خیمے اکھاڑو۔

جہاں جہاں نصب ہیں۔ اور سیدائینوں کے خیموں کے چاروں طرف لگا دو۔ تاکہ اگر رات کی تاریکی میں اس بے حیا فوج نے اچانک حملہ کر دیا تو سادات کی حفاظت ہو سکے۔

نے ایک دم اپنے خیمے سادات کے چاروں طرف لگا دیے۔ طابروں سے ٹپٹپ

باندھ لیں۔ اور اس کے بعد امام بیت الشرف میں تشریف لائے۔

حسین جو گھر میں آئے۔ بہن کھڑی تھی۔ زینب پوچھتی ہیں ”حسین! میں ساری تقریر تمناات کے پیچھے کھڑی سن رہی تھی۔ میں نے تیرے دوستوں کی ساری باتیں سنی ہیں۔ میں نے بالکل کھول کے ان کے لئے دعا کی ہے۔

”حسین! یہ نالام میں سے کوئی اب چھوڑ کے چلا تو نہیں جائے گا۔ اب ان پر بے نما

پورا اعتماد“

اب زینب نے جو پوچھا کہ ”اعتماد ہے“ ”کوئی جائے گا تو نہیں“

یہ سوال جو بی بی نے کیا تو پردے کے بالکل پیچھے پہرہ دار کے طور پر حضرت سریر ہمدانی

کھڑے تھے انہوں نے سن لیا کہ زینب نے یہ پوچھا ہے — رات کا وقت — انہوں نے ایک دم گھبرا کے کہا۔

وہ حبیب! زبیرؓ! ”جلدی آؤ“ ”نورا دوڑو“ اب جہاں انہوں نے آواز دے

گھبرا کے تو سب کے سب دوڑتے ہوئے آگے۔ زبیر نے پوچھا ”زبیرؓ خیریت تو ہے۔“
 ”خیریت بالکل نہیں۔“ ابھی زبیرؓ کو ہماری وفات کا یقین نہیں آیا۔ خیمے میں بعد میں جانا۔
 پہلے زبیرؓ کو یقین دلا کے جاؤ۔

سب تلواریں نیام سے نکل آئیں اور خیمے کے محن میں آئے
 ”بی بی! اپنے ہاتھ سے سرکاٹ دے اب یہ واپس نہیں جائیں گے۔ اور اتنا اعتماد تھا
 زبیرؓ کو اصحابؓ کی وفات کا کہ عاشور کی شام کو جب خیمے جلنے لگے تو زبیرؓ نے حسینؓ کو نہیں پکارا۔
 عباسؓ کو نہیں پکارا۔ وہاں بھی کھڑے ہو کر زبیرؓ نے آواز دی تھی
 ”عجائی حبیب! آؤ نا۔ دیکھو ہم پہ کیا گزر رہی ہے۔“
 بہر نوع تمام اصحابؓ حسینؓ جا کے اپنے اپنے خیموں میں بیٹھ گئے۔ انہوں نے وہاں
 قرآن پڑھنا شروع کر دیا۔ کوئی قرآن پڑھنے لگا۔ کوئی مناجات پڑھنے لگا۔ کوئی دعائیں پڑھنے لگا۔
 کل کے مرنے کی تیاری ہوئے گی۔

امام زین العابدینؓ بیماری کے بستر پر لیٹے ہوئے تھے۔ غشی کا عالم تھا۔ ایک دم غش سے
 آفاقہ ہوا، آنکھ کھلی۔ جو خاتون بیمار دار تھی اس سے پوچھا
 ”یہ آواز یہ کسی آرہی ہیں؟“

اس بی بی نے کہا

”اصحابؓ کے خیمے میدانوں کے خیموں کے چاروں طرف لگ گئے ہیں۔ وہ عبادت کر رہے ہیں۔
 ان کی عبادت کی آوازیں آرہی ہیں۔“

”اچھا یہ بات ہے۔ میرے بابا! کہاں ہیں؟“

خاتون بولی ”وہ باہر جائے نماز پہ بیٹھے ہیں۔“

امام زین العابدینؓ نے فرمایا

”مذہر میرے بابا کو میرا سلام کہو۔ اور کہو کہ بیمار ٹیا کچھ کہنا چاہتا ہے۔“

”اُمّ تشریف لائے۔ امام زین العابدینؑ تعظیم کو اُٹھے۔ حسینؑ نے بٹھا دیا۔ نبض دیکھی۔
 ”بیٹا! بچا کا کیا حال ہے۔ طبیعت کیسی ہے۔ جلدی جلدی اچھے ہو جاؤ بیٹا! بڑا کام کر رہے ہے۔
 بیٹا! جلدی تندرست ہو جاؤ تمہارے دتے بڑا کام ہے۔“
 امام زین العابدینؑ فرماتے ہیں۔

”بابا جان! میں نے اس لئے آپ کو تکلیف دی ہے۔ یہ جو ہمارے اصحابؑ ہیں۔ یہ جو
 حضورؐ کے دوست ہیں۔ یہ ہمارے محسن ہیں۔ میں ان کا احسان مند ہوں۔ ا۔ بابا! ان کی آخری
 خدمت میں کروں گا۔ میرے دتے ہے اور بابا! میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں ان میں سے ایک
 ایک کی قبر پر کھڑے ہو کر میں کہوں گا کہ ”میرے ماں باپ تجھ پہ قربان ہوں۔ اتنی عزت ہے
 ان کی میرے دل میں۔“ مگر اس عزت کے باوجود یہ ہیں تو غیر۔ ان کی آوازیں
 ہمارے زمانے خیمے میں آ رہی ہیں۔ ہو سکتا ہے ہماری عورتوں کی آوازیں وہاں جا رہی ہوں۔
 کیا ان کے خیمے ذرا ناگوار نہیں ہو سکتے۔ تاکہ ہماری عورتوں کی آوازیں نہ جائیں وہاں تک۔“
 امام زین العابدینؑ کا یہ کہنا تھا کہ حسینؑ یا بیٹے تھے یا کھڑے ہو گئے۔ پھر بیٹھ گئے۔
 پھر کھڑے ہوئے۔ پھر بیٹھے۔ اور کہنے لگے
 ”بیٹا زین العابدینؑ! آج کی رات تو بونہی رہنے دو۔ کل کی رات جو آئے گی تم جانو اور
 پردہ جانے۔“

”انا لله وانا الیہ راجعون“

جس اُمت میں آدمؑ، نوحؑ اور ابراہیمؑ جیسے پیغمبر

مومنین ہوں۔

اُن مومنین کا۔ امیر المومنینؑ۔ کون ہو گا؟

فاطمہؑ کا چاند

مگر بلا میں قیامت خیز منظر، آسمان سے آگ برسی ہوئی زمین کے زلزلے پتے پتے ہوئے، تمام صحرائے کر بلا بے گناہوں کی لاشوں سے بھرا ہوا، جو محض دین الہی کی حفاظت کیلئے اپنی جان اور اپنی زندگیاں قربان کر کے، ریت پر گرم کر لیٹے ہوئے، آفتاب نصف النہار پر ٹھہرا ہوا، فاطمہؑ چاند، چہرے پر کربلا کی گرد، دلی میں عزیزوں کے درد، سینے سے بے شیر کلاشر لگائے ہوئے، سر جھکائے ہوئے خیمے کے دروازے پر کھڑا ہے اور دردناک آواز میں کہہ رہا ہے

”زینب! کافرم! قیہ! امان نشہ! انم سب پر میرا آخری سلام“

خواتین دروازے کے قریب آئیں، امام کے گرد حلقہ کر لیا، سیکڑے نے مہاکادامن پکڑ لیا، زینب سامنے بیٹھ گئیں، ایسا ایک طرف خاموش کھڑی ہو گئیں۔ رُباب دم بخود ہیں، خیمے پر اُسی چٹائی ہوئی ہے، علم فوج سرنگوں ہو چکا ہے، عباسؑ کے یتیم بچے حسینؑ کی مہاکادامن پکڑے ہوئے بوجھ رہے ہیں۔ ”ہمارے بابا گھر کب آئیں گے۔“ اصحابؑ کے یتیم بچے، ان کی بیوہ عورتیں، حسینؑ کے چاروں طرف بیٹھی کھڑی ہیں

”مولا! ساری قربانیاں منظور ہیں۔“ اور حسینؑ کہہ رہے ہیں ”وزینب! بہن! اگر قیامت تک میں زندہ رہوں، ایک روز جدائی ضروری ہے، آج تمہارا بھائی حسینؑ تم سے جدا ہو کے رخصت ہو رہا ہے، زینب! مجھے گلے مل کے رخصت کرو۔ دعا کرو، خدا مجھے اتنی طاقت دے کہ میں اس قربانی کو، اس مقصد کو جس مقصد کے لئے مجھے میری ماں نے چکی میں کر پالا تھا، میرے نانے نے مجھے کاندھے پر سوار کیا تھا، میرے باپ نے سینے پر سٹلایا تھا، آج اس مقصد کے پورا کرنے کیلئے خدا تعالیٰ

زینب! دعا کرو۔ قاتل کے خنجر کے نیچے میں گھرا نہ جاؤں، بلکہ
 سے صلق پر تیغ رہے، سینے پہ جلا دوہے،
 لب پہ ہونا تم تیرا، دل میں تیری یاد رہے
 اللہ کی طرف تعلق رہے، خدا سے میرا واسطہ رہے،

خدا حافظ ہیں! میں جا رہا ہوں، سکینے نے دامن پکڑ لیا۔

”بابا! آپ اس طرف جا رہے ہیں جہاں صبح سے جو گیارہ واپس نہیں آیا۔ آج رات کو
 اگر آپ واپس نہ آئے، تو

بابا جان! سکینہ کس کے پاس سوئے گی؟

”بیٹا! تم آج رات اپنی اماں کے پاس سونا۔“

”بابا! اماں کے پاس تو چھوٹے بھائی علی اصغر سوتے ہیں۔ میں کیسے سوؤں گی۔“

”نہیں میرے لعل۔ آج سے اصغر میرے پاس سویا کرے گا۔ تم اماں کے پاس سویا کرنا۔
 اور دیکھنا بیٹا! ضد نہ کرنا۔ بیمار بھائی کے ہاتھ بندھے ہوں گے۔ پھوپھیاں مجبور ہوں گی۔ زمین پر
 آرام سے سو جایا کرنا۔“

خدا حافظ ہیں! اب میں جا رہا ہوں۔ اللہ تمہارا نگہبان ہو گا۔ خدا تمہارا محافظ ہو گا۔

دیکھنا ہیں! غصے میں نہ آنا۔ ہر مصیبت کو آرام سے برداشت کرنا۔ اُمت کے حق میں

ہر وقت دعا کرنا۔ خداوند عالم ہماری اس قربانی سے دین کی خدمت لے رہا ہے۔ اسلام زندہ رہے،
 اللہ کا نام زندہ رہے، ہمارے نانا کا دین زندہ رہے۔

زینب! تیری چادر کے زیر سایہ اگر دین کی زندگی ہے تو چادر قربان کر دینے میں
 دریغ نہ کرنا۔

ہیں خدا حافظ! فی امان اللہ! اب میں جا رہا ہوں، اب اللہ! اللہ زینب! قیامت میں ملوں گا،

ویسے نیزے پہ سوار ہو کے ہر وقت زینب! تیرے ساتھ رہوں گا۔

ۛ شہیر برآمد ہوئے یوں خیمے کے در سے
جس طرح نکلتا ہے جنازہ کسی گھر سے ،

آج حسینؑ نے دنیا سے اپنے تعلق کو منقطع کر دیا ہے۔ سو فیصدی اپنے اللہ کی طرف متوجہ ہے
آج حسینؑ اور خدا کے درمیان کوئی شے حائل نہیں بھائی کو اپنے اس بندے پر ناز ہے، اللہ
اپنی صنعت کے اس شاہکار کو دیکھ کر غریہ فرشتوں سے کہتا ہے اِنِّیْ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ۔
میں جانتا ہوں، انسان کے وہ جوہر جو تم نہیں جانتے۔ تم نے دیکھا۔ میرے اس بندے نے میرے
مشق کو کس کمال تک پہنچا دیا۔ میری عبودیت کو کس معراج کو پہنچا دیا۔ آج وہ سجدے کے بل میری
خدمت میں آ رہا ہے۔ میں نے اپنی ندائی کا نظام اُس کے سپرد کر دیا۔ میں نے بقائے دوام کا تاج اس
کے سر پر رکھ دیا۔ آج میں خود اس کے ماں، باپ اور نانا کو اس عظیم فرزند کی عظیم قسم سربانی پر
مبارک باد دوں گا۔“

آج حسینؑ بھی اللہ سے خطاب کر کے فرما رہے۔ خداوند اے
وہ کیجیے پہ دھڑے ہاتھ پڑے ہیں اکبرؑ میں وہ عباسؑ دلدار، وہ حسنؑ کا دلبر
میں نے ایک ایک کو قرباں کیا لیکن کُن کر
تُو نے دولت جو مٹی مجھ خاک نشیں کو سونپی
وہ امانت تیری بندے نے زمیں کو سونپی،

یا اللہ! پہلے کہتا تھا ج ”نہ عرباں سرفراز دیکھوں“ (پر جو تو خوش ہوتو)
”زینبؑ کو کھلے سر دیکھوں“

خداوند! آج میں بالکل تیرے سامنے حاضر ہوں۔ تیری خوشی کے سامنے میرا سر جھکا ہے۔
ۛ اگر تجھ کو نہ ہر نسل امامت منظور
ذبح عابد کو کروں ہاتھ سے میں یہ حضور
اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

شامِ غریباں

بسم الله الرحمن الرحيم ط

حضرات گرامی! آج بجائے اس وقت درود و سلام پڑھنے کے سارا مجمع بیک زبان ایک دُعا کہے: «اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ راجِعُوْنَ»

اصل حادثہ گریلا اب شروع ہوا ہے۔ آج کے عصر تک کے کارنامے کی ذمہ داری حسین کے پاس تھی اور عصر کے بعد یہ ذمہ داری حسین سے زینب کی طرف منتقل ہو گئی ہے۔ آپ حضرات نے محرم کا چاند دیکھ کر آج کے عصر تک جتنی مجلسیں کی ہیں، جتنا ماتم کیا ہے وہ شہیدوں کا ماتم تھا اور عصر کے بعد سے اب اسیروں کا ماتم ہے۔

بزرگو، سزیدو اور نوجوانو! اصلہ ماتم اب شروع ہوا ہے۔

حنورا امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کا فرمان ہے کہ

وہ عصر کے بعد ہمارے خاندان پر جو گزر گئی، نہ کوئی بیان کرنے والا اسے بیان کر سکتا ہے نہ کسی سوچنے والے کے ذہن میں آ سکتا ہے اُسے وہی جانتے تھے جن پہ گزر گئی۔

دنیا کا شریف ترین خاندان، دنیا کا معزز ترین خاندان، آج اس عالم میں پہنچ گیا کہ رات ان کی شام شہیدیاں تھی اور آج ان کی رات شامِ غریباں ہے۔ اور جن کا خدا نے، قرآن نے اہل بیت نام رکھا ہے وہ آج دنیا میں بے بیت ہیں۔ ان کا آج کبیر گھر نہیں۔ وہ آج بے گھر ہیں۔ کوئی سوچ نہیں سکتا کہ ان پہ کیا گزری۔ اور جب آخری رخصت کے بعد حسین میدان میں تشریف لائے۔ چلے وقت جب بالکل اپنے گھوڑے کے قریب آئے اور سوار

ہونے لگے تو ان کی بچی نے آکے دامن کھڑا کیا۔ سیکٹہ دامن کھڑے کھڑی ہو گئی۔

”باباجان! جارہے ہو، بابا! آپ جارہے ہیں“

”مٹاں بیٹا! میں جارہا ہوں“

”باباجان! اگرچہ میں بچی ہوں مگر اتنا میں سمجھ رہی ہوں کہ صبح سے جو گیا ہے، وہ واپس نہیں

آیا۔ مجھے یقین ہے آپ بھی واپس نہیں آئیں گے، پیارے باباجان! مجھے یہ بتا دیں کہ رات قریب

آ رہی ہے، آپ جارہے ہیں، جنگل ہے یا بان ہے۔ اگر رات کو میں ڈر گئی تو کس کے پاس

سوؤں گی۔ اب میں کس کے سینے پہ سوؤں گی؟ تو امّ نے بچی کو فرمایا کید۔ ”بیٹا! آج رات

اگر تم ڈر جاؤ تو اپنی اماں کے پاس سوتا۔ اپنی ماں کی گود میں سو جانا، تو بچی جواب میں کہتی ہے۔

”باباجان! اماں کی گود میں تو بھائی علی اصغر سو یا کرتے ہیں، میں کیسے سوؤں گی؟“

امّ نے جواب میں فرمایا

”سیکٹہ بیٹا! آج رات سے اصغر میرے ساتھ سوئے گا، اور امّ رخصت ہو کے

میدان میں آگئے اور دنیا نے یہ عجیب منظر دیکھا کہ ہزاروں کے مقابلے میں ایک تنگستہ دل انسان

ہے۔ اس بے حیا فوج نے یہ طعنہ زنی کی۔

”حسین! نہ اپنے کو تکلیف دو نہ میں تکلیف دو۔ آؤ گھوڑے سے اتر آؤ تاکہ

یہ جنگ جلدی ختم ہو جائے“

ان کے یہ طعنے کی آواز خیمے میں زینب نے سنی۔ زینب نے دروازے پہ آکے کہا

”حسین! مجھے پتہ ہے، تم نے تشبیہ ہونا ہے، مگر یہ قوم یہ نہ سمجھے کہ مجبور ہو گیا، ذرا بچہ منٹ

کے لئے میری اماں کے دودھ کی طاقت بھی دکھا دے“

اور حسین نے تلوار کھینچی۔ جہاد شروع کیا۔ فوج کا پہلا حصہ بھاگ کر خلیہ تک پہنچا تھا اور حسین

فوج کو کھٹاکر گھوڑے کو تیزی سے دوڑا کہ ایک بند بٹیلے پر آئے اور دمان بلند آواز سے کہتے

”انا عبد الرسول اللہ لوگو! میں رسول کا بیٹا ہوں۔“ اور فوراً جواب میں خیمے سے بہرہ لیتی

”مرحبا يا عبدالموسول الله“ ”منا باش حسين!“

— اور جنگ ختم ہوئی — اور حسین فوجوں کے پیچ میں گھر گئے تو زینب یہاں سے آواز دیتی ہے ”یا علی مدد!“

حسین کے پاؤں رکابوں سے نکل چکے تھے۔ اور مسلمانوں کی تاریخ کا متفقہ فیصلہ ہے کہ حسین کو گھوڑے سے زمین تک آنے میں نہ توفیق ملے۔ اب ذیقینے کا ترجمہ آپ چاہے سیکڑ کر لیں چاہے منٹ کر لیں۔ اتنی دیر کیوں لگ گئی کہ جسے میں مولا کو — اس کا بیان یہ بتایا گیا ہے کہ فوجیں قریب آگئیں۔ حسین کی لہلیوں میں برچیاں لگا دیں۔ حسین دائیں طرف گرتے تو برچھیوں والے بائیں طرف کر دیتے اور بائیں طرف گرتے تو برچھیوں والے دائیں طرف کر دیتے۔ تو منٹ اسی کشمکش میں گزرے۔ اس وقت کا واقعہ بھی آپ نے نابوکا کہ جب اس عالم میں گھوڑے سے گر رہے تھے اور گرتے وقت جو بے ساختہ منہ سے نکلا۔ وہ یہ تھا ”یا عباس!“ میں گر گیا۔ ”عباس بھائی آؤ دیکھو نا میں گر رہا ہوں“

اور پھر زمین پر آئے۔ کس طرح؟

زیارت تہیہ میں امام زمانؑ فرماتے ہیں

”میرا سلام ہر اس شہید پر جو زمین پر تھا نہ زمین پر تھا۔ پھر کہاں تھے — بدن

نیروں پر مٹا ہو گیا اور جب بہن نے دیکھا کہ حسین گھوڑے پر نہیں ہے۔ خالی گھوڑا آچکا ہے تو

اب زینب حسین بن گئی۔ اور کہنے لگیں ”سیدانیا! نکر نہ کرو۔ اب میں تمہاری محافظ ہوں“ اب

میں تمہاری دستہ دار ہوں، دیکھو! ایسا کرو کوئی بچہ کہیں گم نہ ہو جائے۔ بچے کے گرتے سے گرتا

بانہ دو۔ سیدانیا! تم اپنے برقعے سے برقعہ بانہ دو۔ میں تمہاری محافظ ہوں —

تنبہ ہوئے بچے۔ سہی ہوئی متواتر زینب کھڑی ہیں سامنے — اور اگلا فقرہ میرے

منہ سے نکلتا نہیں صاحبان! لوگ مجھے بھی سید کہتے ہیں۔ یہ تو اللہ بہتر جانتا ہے، حقیقت کیا

ہے — اس لئے جتنے اس محفل میں سادات ہوں میں اُن سے معافی مانگتے ہوئے

اور جو مومنین ہیں، ان سے معذرت کرتے ہوئے یہ عرض کرتا ہوں کہ پھر دنیا نے یہ دیکھا کہ
 زینبؓ دروازے پہ کھڑی تھیں اور بے جیا فوج شور مچاتی ہوئی کہ اب خاندان رسالت
 کے گھروں کو لوٹ لو، چلی آرہی ہے۔ گھر کا محاصرہ ہو گیا۔ اور خیموں میں آگ لگنے لگی۔
 جب ایک خیمہ جل جانا پیدا نیاں دوسرے خیمے میں آجائیں۔ وہ جل جاتا۔ تیسرے خیمے میں آجائیں۔
 اب میں آپ کو یہ واقعہ بھی سنا دوں کہ رات میں نے آپ کو یہ بات کہی تھی۔ ”امام
 زین العابدینؓ نے فرمایا تھا کہ اصحاب کے خیمے ذرا فاصلے پہ ہو جائیں تاکہ ان تک ہماری مستورات
 کی آواز نہ جائے۔“ آج وہی زین العابدینؓ اپنے بستر بیماری پر لیٹے ہوئے ہیں۔
 زینبؓ پہنچی۔ بیٹے کا سر گرد میں لیا۔ گھبراہٹ کا عالم۔ پریشانی کا وقت۔ اور کہتی
 ہیں ”بیٹا! ذرا اٹھو۔ بیٹا! ذرا آنکھ کھولو۔ تین چار دفعہ بیٹا کہہ کے پکارا۔ آنکھ نہ کھولی۔
 آخر زینبؓ گھبرا کر کہتی ہیں

”امام زمانہ! ذرا اٹھ کے بیٹھو۔“
 اب جو امام کہہ کے پکارا تو اٹھ کے بیٹھ گئے۔

”اماں! کیا ہوا“

”بیٹا! ہوا یہ کہ تو اب امام ہے۔ اور میں تیری امامت میں تجھ سے پہلا مسدہ پوچھنے آئی
 ہوں۔ یوں تو تو میرا بیٹا ہے مگر بحیثیت امام کے میرا بادشاہ ہے۔ مجھے پہلا مسدہ یہ بتا کہ خیمے
 سامنے جل گئے۔ اب بتا کہ ہم ان جیتے ہوئے خیموں کے ساتھ جل کر مر جائیں یا نا محرموں میں باہر نکلیں
 ۔۔۔۔۔ اور امام نے پہلا مسدہ یہ بتایا۔ ”عَلَيْكُمْ بِالْعِزِّ“

”اماں! عورتوں، بچوں کو نہ کراس جگہ میں نکل جاؤ۔ اب پردہ ساکت ہو گیا ہے۔“

اب حرم حسینؑ جنگل میں ہیں۔ چادریں اتر گئی ہیں۔ نیچے ماؤں سے چپے ہوئے ہیں۔ سب سے
 ہوئے ہیں۔ کربلا کے ریت کے ادنیٰ اونچے ٹیلوں پر جا کے بیدار نیاں بیٹھ گئی ہیں بچوں کو
 لے کر۔۔۔۔۔ رات ہو گئی ہے۔ ایک طرف بے سر کے لاشے ہیں۔ ایک طرف

میں چور فرج ہے۔۔۔ ایک طرف بے کس تیدانیاں ہیں۔۔۔ بچوں نے رات تک شور مچایا "ہمیں پانی چاہیے"۔۔۔ مگر آج کوئی بچہ کچھ نہیں کہہ رہا۔۔۔ سب اٹھ کی گود میں خاموش بیٹھے ہیں۔۔۔ یا تو دن کے واقعہ سے سہم گئے ہیں یا یہ سوچتے ہیں "اب کس سے مانگیں"۔۔۔ اب پانی لانے والا کون ہے"۔۔۔ خواتین خاموش بیٹھی ہیں۔۔۔ اما زمان ان کے بیچ میں بیٹھے ہیں اور زینب فرماتی ہیں

"بی بیو! فکر نہ کرو آج رات میں تمہارا پہرہ بنگی۔ میں تمہاری حفاظت کروں گی۔"

اس کے بعد روایات بڑی مختلف ہیں۔۔۔ میں کوئی بیان کروں اور کوئی نہ کروں۔ ایک یہ بھی روایت ہے کہ زینب پہرہ دے رہی ہیں۔ بیچ میں ساری خواتین بیٹھی ہیں۔ اس پہرے کے عالم میں زینب نے دیکھا کہ سامنے سے ایک سوار چلا آ رہا ہے۔ اور زینب نے یہیں سے آواز دی

"آنے والے ٹھہرو۔ آج میرا پہرہ ہے۔ خبردار! آگے نہ آنا"۔ مگر وہ سوار بڑھتا چلا آیا۔۔۔ زینب آگے بڑھیں۔ "میں تجھے کبھی ہوں آگے نہ آؤ۔ اور یہ کہہ کے اس کے گھوڑے کی باگ پکڑ لی۔۔۔ بس۔ باگ کا پکڑنا تھا کہ سوار نے نقاب الٹ دی۔ اور زینب نے پہچان لیا۔ اور سوار نے کہا "بیٹیا زینب! میں آیا ہوں"۔ اور زینب نے رکاب پکڑ لی "بابا! اب آئے ہو۔"

"بابا! اب پہنچے ہو"

اور یہ بھی ایک روایت ہے کہ آج کی رات کے پہلے حصے میں پانی کی مشک آگئی۔۔۔ اب میں اس تحقیق میں کہاں پڑوں کہ پانی کی مشک آنے کی روایتیں کتنی ہیں۔ مختلف روایتوں کے باوجود نتیجہ یہ ہے کہ پانی کی مشک آگئی۔ کچھ کھانا آگیا۔ وہ زور بڑھ کر آئیں یا کوئی اور نے کہ آیا۔ بہرے پانی آگیا۔۔۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ کرپلا کے سب واقعات ہیں ان سیدائینوں کے لئے سب سے سخت ترین وقت یہی تھا کہ نہیں کہ جب ان کے

سانے پانی کی مشک رکھی گئی ————— اُن کے دلوں سے پوچھو۔ ان پہ کیا گذری تھی۔
 ایک نفر پانی کی مشک پر تھی اور ایک ایک بی بی آواز دے رہی تھی ”علی اکبر! تم نے مرتے دم
 ایک گھونٹ پانی مانگا تھا۔ کوئی کہہ رہی تھی ”عباس! واپس آ جاؤ۔ پانی کی مشک آگئی“ کوئی
 کہہ رہی تھی ”استغفر اللہ! پانی آگیا۔ اب کیسے پیو گے۔“ سب سے سنت وقت برداشت
 کے لئے یہی تھا کہ پانی کی مشک ان کے سامنے رکھی تھی —————
 امام زین العابدین آئے۔ مشک کا دبا ہوا کھولا۔ پانی یا۔ — پچھو بھی اماں! پانی
 پیئیں۔ اور زینب کہتی ہیں ”بٹیا! زین العابدین! میں! یہ پانی!!“

میں بیٹوں!!

پہلے کلاس میں پانی لے کر سب بی بیوں نے حسینؑ کی ماتھر پڑھی ”حسین! پانی پیو میری نذر
 پیش کر رہے ہیں۔“ وہ زینب کو پیش ہوا۔ زینب نے سیکڑ کو اٹھایا۔ ”بٹیا سیکڑ!
 یہ پانی پیو! سیکڑ نے بھی انکار کر دیا۔ زینب نے بھی انکار کر دیا۔ امام
 زین العابدینؑ نے امجاڑ کی طاقت سے چھو بھی کو یہ منظر دکھایا کہ زینب نے دیکھا کہ ”کوثر
 کنارہ ہے۔ رسالت مآبؐ بیٹھے ہیں۔ حیدر کرار بیٹھے ہیں۔ اور حسن مجتبیٰؑ
 بیٹھے ہیں۔“ اور کربلا کے سارے شہید سامنے کھڑے۔ ہیں۔
 حسینؑ بھی کھڑے ہیں اور علیؑ مرتضیٰؑ ماتھیں کوثر کا جام لے کر حسینؑ کو پیش کرتے ہیں اور
 حسینؑ جواب میں کہتے ہیں

”بابا۔ ابھی نہیں۔ ابھی میری زینب پیاسی ہے۔ بابا۔ ابھی نہیں۔
 ابھی میرے بچے پیاسے ہیں۔“

زینبؑ نے یہ منظر دیکھا۔ زینبؑ نے پانی لے کر کہا

”سیکڑ بٹیا! پہلے تم پیو۔“

سیکڑ نے کہا

”اے! - پہلے آپ“

”نہیں بیٹا! پہلے بچوں کو پلاتے ہیں“

بس بھائیو! بچوں کا نام سننا تھا کہ شہزادی پانی کا وہ طرف لے کر گئے شہیدان کی طرف
دوڑی اور بلند آواز سے کہا

”دراصر بھائی! تم میرے چھوٹے بھائی ہو، پہلے تم پانی پیو۔ یکے بعد دیگرے پیے گی“

”انا للہ وانا الیہ راجعون“

~ ~ ~

حسینؑ اور خدا کے درمیان آج کوئی شے حائل نہیں۔

خالق کو اپنے اس بندے پہ ناز ہے۔ اللہ اپنی صنعت

کے اس شاہکار کو دیکھ کر فخر یہ فرشتوں سے کہتا ہے

”إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ“

دین بچا ہے اللہ کا کلمہ پڑھا گیا تو۔ محمدؐ کا۔ اور بہو بیٹیاں قید

ہو گئیں تو غریب اپنی طالب کی — (خطیب آل محمدؐ)

فی سبیل اللہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

خداوند عالم عزہ اسمہ وجل جلالہ کی حمد و ثناء کے بعد حضرات محمد و آل محمد پر درود و سلام
محترم سامعین!

اللہ کا یہ فرمان ہے "جو لوگ فی سبیل اللہ قتل ہو جائیں۔ اُن کو مردہ مت کہو"
اب یہ مردہ مت کہو ایک اشتباہ باقی ہے کہ صرف کہنے کی ممانعت ہے۔ کہ
مردہ انہیں کہو نہیں۔ اگر ہم دل میں سمجھ لیں تو کوئی حرج نہیں۔ زبان سے صرف
کہنے کی ممانعت ہے۔ کہ انہیں مردہ کہو نہیں۔ ویسے دل میں ہم انہیں مردہ سمجھ لیں تو کوئی
حرج نہیں۔ اس اشتباہ کے رفع کرنے کے لئے دوبارہ حکم ہوتا ہے "لَا تَقُولُوا لِمَنْ
يَقْتُلُ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ اَمْواتًا بَلْ اَحْيَاءٌ دَلِكُمْ لَا تَشْعُرُونَ" دل میں یہ خیال بھی نہ کرنا جو سبیل اللہ میں
قتل ہو جائیں۔ کہ وہ مردہ ہیں۔ وہ زندہ ہیں۔ اور اللہ کی طرف سے انہیں رزق ملتا ہے۔
اور اُن کی حیات ہے اور وہ یقیناً زندہ ہیں۔ مگر تمہیں اُن کی زندگی کا شعور
نہیں۔ وہ زندہ ہیں اور ہمیں اُن کی زندگی کا شعور نہیں۔ یہ اللہ نے صاف کہہ دیا کہ
تمہارے شعور سے باہر ہے اُن کی زندگی۔

ویسے تو ہمارا ایمان ہے کہ ہم میں سے جو بھی مرتا ہے وہ زندہ ہے۔
کا فر بھی زندہ ہے۔ رہنے کے بعد جانا کہاں ہے۔ ایک جگہ سے دوسری
جگہ منتقل ہو گئے۔ یہی انتقال ہے مومن بھی زندہ ہے۔ منافق بھی
زندہ ہے۔ وہ اپنی جگہ زندہ ہے۔ وہ اپنی جگہ زندہ ہے۔

ختم ہو گیا۔ ایک یہ زندگی ہے ————— اور ایک یہ زندگی ہے کہ

ع قادیوں ہلاک شد کہ پہل خانہ گنج داشت

قادیوں باوجود اتنی دولت ہونے کے مر گیا۔ ————— اور

ع نوشیرواں زمر د کہ نام نلو گداشت

اور نوشیرواں آج تک زندہ ہے اس لئے کہ وہ نیک نام چھوڑ گیا۔ تو ایک زندگی یہ بھی ہے

نام نیک کی زندگی ————— جس کا نام زندہ ہے بس وہ زندہ ہے۔ —————

اگر زندگی کے لئے یہی شرط ہوتی کہ ہم اپنے سامنے چلتا پھرتا دیکھیں تو زندہ مائیں

تو خدا کو کون زندہ مانتا۔ اُس کے جی ہونے کا کون اقرار کرتا۔ —————

اُس کا نام ہی ہمیں زندہ ہیں تو وہ زندہ ہے۔ ورنہ ہم نے کہاں دیکھا ہے اُسے چلتا پھرتا۔

بہر نوحہ جو اللہ کی حیات ہے۔ وہ بھی ہمارے شعور سے باہر ہے۔ اور جو اللہ

دالوں کی حیات ہے وہ بھی ہمارے شعور سے باہر ہے۔

اب اگر دونوں کی حیات یکساں ہو جائے۔ تو معاذ اللہ۔ وہ شریک باری تعالیٰ

ہو جائیں۔ ————— اس شرک سے بچانے کے لئے اللہ نے کب دیا۔ انہیں

رزق ملتا ہے۔ ————— بس یہ فرق ہے اُن میں اور اللہ میں۔ کہ وہ

رزق کے محتاج ہیں۔ اور اللہ رزق کا محتاج نہیں۔ ————— ورنہ

اُن کی بھی حیات ہے۔ وہ زندہ ہیں۔ اور زندہ رہیں گے۔

مرتے وہ ہیں جو انہیں مارتا چاہیں۔

آج یہاں اس وقت ایک فقرہ کہہ کے اربابِ ذوق کے لئے اس مضمون کو آگے بڑھاتا

ہوں۔ کہ یہ زندگی جو ہے۔ اُن کی ہے جو سبیل اللہ میں مرجائیں۔ ————— اگر کوئی شخص یہ

سمجھے کہ یہ آیت حسینؑ پر بھی صادق آتی ہے تو اس میں ذرا سی مجھے جھپکا ہٹ ہے۔ اور وہ

اس لئے کہ ————— حسینؑ اُن میں نہیں ہیں جو سبیل اللہ میں مرجائیں جس میں خود سبیل اللہ سے

اور اس کے ثبوت کے لئے بہت سی چیزیں ہیں میرے پاس۔ جو ساری میں اس وقت بیان نہیں کر سکتا۔ اس وقت آپ کو صرف ایک حدیث سنانا ہوں۔ اور حدیث وہی صحیح ہے جو قرآن سے مطابقت کرتی ہو۔ قرآن یہ کہتا ہے کہ

”وہ ہیں، شہید وہ ہیں جو سبیل اللہ میں مرجائیں۔“ اور حدیث یہ کہتی ہے ”من مات علی حب الیٰ محمد مات شہیداً“ جو آل محمد کی محبت میں مرجائے۔ وہ شہید ہے۔ معلوم ہوا۔ جب تک آل محمد اور سبیل ایک نہ ہوں۔ جب تک اس حدیث اور آیت کا تقابلی نہیں ہوتا۔۔۔ حسینؑ اُن میں شامل نہیں۔۔۔ حسینؑ تو خود سبیل اللہ ہے حسینؑ کے ساتھ جو مرجائیں۔ وہ زندہ ہیں۔ وہ زندہ رہیں گے۔ حسینؑ تو ہے ہی زندہ۔ وہ زندہ تھا۔ زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔

میرے سامعین!

کیا بتاؤں۔۔۔ دنیا کی طبیعتوں کو بدلنا تھا۔ زمانے کے مزاج میں ایک انقلابِ اعظم لانا تھا۔ ایک اسلام والے نظام کو دنیا میں عملاً پیش کرنا تھا۔ جن کے لئے اللہ نے حسینؑ کو چنے لیا۔ اور وہ اس کے لئے سامنے آگیا۔ حسینؑ! تجھے تو میں پنتا ہوں اس انقلاب کے لئے۔ اب اپنے مددگار تو چنے لے۔ جن کو تو ساتھ لے جانا چاہیے۔“

اور اللہ کے پناہ میں معاذ اللہ کوئی فرق آہی نہیں سکتا۔ اُس نے ایسا چنا حسینؑ کو۔ کہ اس سے بہتر کوئی تھا ہی نہیں۔۔۔ مگر حسینؑ نے بھی ایسے چنے ہیں کہ کیا محال جس کو جس کام کے لئے چن لیا۔ اُس نے وہی کچھ نہ کر دکھایا ہو جو اللہ چاہتا تھا۔ اُس نے وہی کچھ نہ کر دکھایا ہو جو مشیت الہی تھا۔

اب اگر کوئی یہ کہے کہ حسینؑ تجربے کی بنا پر چن رہا تھا وہ آدمی کسی کی ساٹھ سالہ زندگی کا تجربہ تھا۔ کسی کی پچاس سالہ زندگی کا تجربہ تھا۔ کسی کی تیس سالہ زندگی کا تجربہ تھا۔

”نہیں“ تجربے کی بنا پر نہیں چن رہا تھا حسینؑ۔ بلکہ اُس علم سے چن رہا تھا۔ جو اللہ نے اُسے دیا تھا۔ ————— ورنہ چھ ماہ والے کا کیا تجربہ تھا۔ ————— اُسے کس تجربے سے معلوم تھا۔ کہ تیرکھا کے ہنسے گا۔ ————— یہ حسینؑ کا علم حضورؐ کی اور علم الہی تھا۔ جس سے وہ چن رہا تھا ہر ایک کو۔ ————— تو حسینؑ نے اپنے ساتھ شہید ہونے کے لئے بہتر چن لئے۔ ————— اور اپنے بعد۔ اپنی اس شہادت میں انقلابِ اعظم پیدا کرنے کے لئے اپنی بہن زینبؑ کو چن لیا۔ —————

زینبؑ! میں اپنا کام کر بلا میں ختم کر دوں گا۔ یہ ایک حصہ ختم ہو گا میرے کام کا۔ دوسرا حصہ جو شرعاً ہو گا۔ وہ تمہارے سپر ہے۔ اصل انقلاب تم نے لانا ہے زینبؑ۔ ————— میرے محترم سامعین! آج گیارہ محرم کو زینبؑ کے پاس انقلاب کا چارج ہے۔ اور آج زینبؑ حسینؑی فوج کی کمانڈر انچیف بنی ہوئی ہے کر بلا میں۔ اور قیدی کا لفظ تو کہتے ہوئے میری زبان ڈرتی ہے۔ ————— ہر نوع زغوا اعدا میں گھرے ہوئے بے ایس محبوب قیدی کر بلا سے روانہ ہو گئے۔ ————— اور اُن ظالموں کی سسائی سمجھیں۔ بے حیائی سمجھیں۔ لڑاؤ بے بس و محبوب۔ قیدیوں کو اُدھر لائے ہیں۔ جہاں ان کے وارثوں کی لاشیں پڑی ہیں۔ اور یہ تاریخ کا فقرہ ہے کسی مقتول کی بات نہیں ہے۔ ————— کہ جس وقت اُونٹوں پہ سوار قیدی سامنے اُن لاشوں کے پیچھے ہیں تو امام زین العابدینؑ کی نظر اپنے والد بزرگوارؑ سے جد مبارک پر پڑی۔ اور باپ کے جسم کو جو بیٹے نے دیکھا ہے تو فقرہ یہی ہے تاریخ کا کہ زین العابدینؑ کے چہرے کا رنگ دودھ کی طرح سفید ہو گیا۔ ————— اب وارثِ نامدار ان رسالت جناب زینبؑ نے یہ دیکھا کہ زین العابدینؑ کے چہرے کا رنگ دودھ کی طرح سفید ہو گیا ہے۔ تو وہ سمجھ گئیں کہ یہی عالم اس پر ایک منٹ اور طاری رہا۔ تو ہو سکتا ہے کہ زندگی ختم ہو جائے۔ برداشت نہ کر سکے دس صدے کو۔ ————— تو فوری طور پر حسینؑ کی لاش سے زین العابدینؑ کی توجہ ہٹانے کے لئے زینبؑ نے فوری عمل کیا کیا۔ —————

کسی سوار سے پوچھیں۔ جو گھوڑے سے گرتا ہو۔ کسی اور ایسے آدمی سے پوچھیں جو کسی اونچی جگہ سے گرا ہو۔ گرنے والے کی فطرت یہ ہے کہ جب وہ گرنے لگتا ہے۔ تو اپنے آپ کو سنبھالنے کے لئے پہلے ہاتھوں کو زمین پر رکھتا ہے۔ اب زمین سے سنبھال کر آیا اونٹ سے اپنے آپ کو۔ تو ہاتھوں سے کس طرح سہارا لیا۔ ہاتھوں سے پتہ آپ کو کس طرح سنبھالا۔۔۔؟۔۔۔ ہاتھوں کے متعلق تو آپ جانتے ہی ہیں۔

آج سے ایک مدت پہلے میرا اپنا یہ خیال تھا کہ شاید باقہ ماندہ تھے، لی
روایتیں جو ہیں، لیکن یہ روئے کے لئے ہم نے بنائی ہوں۔
مگر جب میں نے امام زمان کی زیارت ناحیہ پڑھی تو اس میں باقہ بندھنے
کا ذکر تھا۔ میں نے کہا ٹھیک ہے، ضرور یہ تھے، میں نے کئے۔ پھر
یہ تشویش ہوئی کہ کس طرح بندھے تھے، بازو بندھے تھے، گلہ نیاں بندھی
تھیں۔ کس طرح بندھے تھے، تو اس کے متعلق جی امام زمان ہی نے
فرمایا کہ۔

"میرا سلام ہو میری دادی زینب پر جس کے دونوں ہاتھ انیس کی گردن کے ساتھ بندھے ہوئے تھے۔۔۔۔۔ اب اس عالم میں زینب نے اپنے آپ کو کھرٹے گونٹ سے گرایا۔۔۔۔۔ تو امام زین العابدین یا تو اپنے باپ کے لاشے کو دیکھ رہے تھے۔ یا ایک دم مڑ گئے پھوپھی کی طرف پھوپھی! یہ کیا ہوا۔۔۔۔۔ تو زینب بلا وقفہ اُٹھ کے کھرٹی ہو گئیں اور کہتی کیا ہیں۔۔۔۔۔

”بیشیا زین العابدین! میں کیا الجھڑی ہوں۔ تمہارے پیارے ملاقات

کیا ہو گیا۔ لاوارثوں کے وارث! کیا تم مرنا چاہتے ہو۔۔۔۔۔۔ پھر
 ہمارا وارث کون ہو گا۔۔۔۔۔۔

تو امام جواب میں کہتے ہیں:-

”اماں! کیوں نہ مر جائے وہ جوان بیٹا جو اپنے باپ کی محبت کو اس
 عالم میں چھوڑ جائے۔“

اماں زینب نے تقریر فرمائی:-

”بیٹا! دل شکستہ نہ ہو۔ کھیرا نہیں۔ تیرے باپ کی قبر بنے گی۔ یہاں
 حسین کا روضہ بنے گا۔ یہاں حسین کا شہر آباد ہو گا۔ روئے زمین کے
 انسان تیرے باپ کی زیارت کو آئیں گے۔ یہاں حسین کا دربار ملے گا
 ۔۔۔۔۔۔ زینب نے یہ تقریر فرمائی۔۔۔۔۔۔ اور

اُس کے بعد تمام اہل بیت بیٹھ گئے۔ تیری اُتر آئے۔ ایک ایک خاتون اپنے رشتہ پر
 اپنے بیٹے پر۔ اپنے عزیز پر جا کر اُلٹا دیا۔ رونا رو رہی تھی۔ رخصت ہو رہی تھی۔
 اور زینب حسین کے پاس آکھڑی ہوئیں۔ بیٹی علی اکبر کی لاش پر آکھڑی ہوئیں۔ فاطمہ کی
 ماں فاطمہ کی لاش کے کندھوں کے پاس آئیں۔ ہر خاتون جس سے جس کا رگڑا تھا۔
 رو رہی تھی۔

تو زینب یہ کہہ رہی ہوں کی دیر میرے اپنے تصور کی بات ہے،

حسین! میں لاشے پر رونے نہیں آئی۔۔۔۔۔۔ میں یہ کہنے آئی ہوں۔

نشا باش حسین! تُو نے یہی اماں کے دودھ کی عزت رکھی۔

تُو نے میرے اماں کی لاج رکھ لی حسین!

تُو نے میرے باپ کی آبرو رکھ لی حسین!

تُو نے اپنے بڑے جان کی عزت رکھ لی حسین!

شہنشاہ حسین!

تو اپنا کام کر چکا۔ اب میری باری ہے۔
 تو کربلا فتح کر چکا تجھے کربلا کی فتح مبارک ہو حسین!۔
 حسین! اب یہی شام فتح کرنے جا رہی ہوں۔
 حسین! جب تو کربلا میں جہاد کر رہا تھا۔ میں خیمے میں بیٹھی اپنے سر کے بال
 کھول کر تیری فوج کے لئے دعا کرتی رہی۔
 اب میں جا رہی ہوں فوج لے کے شام فتح کرنے۔
 اب بتا حسین! میں کیا کروں۔ اگر ہو سکے حسین! تو میری فوج
 کا معائنہ تو کر کے دیکھ۔ اس فوج کو لے کے جا رہی ہوں۔
 اتنی بڑی سلطنت کو مٹانے کے لئے اس فوج کو لے کر جا رہی ہوں

اور

افواجِ قاہرہ زینبیہ کا معائنہ کرنے کے لئے حسین نیزے پر سوار ہو گئے اور زینب
 نے اپنی فوج کو دو صفوں میں کھڑا کر دیا۔ ایک صف میں بیوہ عورتیں۔
 ایک صف میں یتیم بچے۔
 حسین! دیکھ یہ فوج ہے جس سے دنیا کی بڑی سلطنت کو فتح کرنے جا رہی ہوں۔
 عورتیں۔ اور اثرائتائیں منیم بچے۔ قیدی ہوئے کھڑے ہیں۔
 حسین! ذرا ان کی درد ہی دیکھ لے۔
 وردی کیا ہے۔ سر ہلے ہوئے ہیں۔ ہاتھ بندھے ہیں۔
 حسین! اس فوج کے ساتھ جا رہی ہوں یتیمی حکومت کو فتح کرنے۔

میرے خرم سامعین! ببِ قافانہ اہلِ رسول کربلا سے روانہ ہوا تو اُس وقت ان کے
 قیدیوں کی تعداد اتنی۔ پونسٹھ عورتیں اور اثرائتائیں منیم بچے۔ تعداد کو

ایک بار پھر جس لو۔ چونسٹھ عورتیں اور اٹتالیس یتیم بچے جب کر بلا سے چلے تھے۔
 قبلہ! آپ بزرگ ہیں۔ آپ ہی سے فریاد کر سکتا ہوں۔ یا پھر اللہ سے
 فریاد ہے کہ ہمارے قیدیوں کی تعداد بھی چونسٹھ عورتیں۔ اور
 اٹتالیس یتیم بچے جب کر بلا سے روانہ ہوئے۔۔۔ اور جب شام
 میں یتیم کے سامنے پہنچے تو کھلی بارہ تھے۔

اب میں کس سے پوچھوں۔ باقی کہاں گئے۔ اب ہی کہاں تلاش کروں۔ کہ ہمارے باقی
 کہاں گئے۔۔۔۔۔

بہر فوج ان قیدیوں کو لے کے زینب روانہ ہوئی۔۔۔۔۔ اور گھنٹے لے
 دروازے پر پہنچ گئی۔۔۔۔۔ کوٹنے کا دروازہ زینب کا پہچانا ہوا دروازہ تھا۔ اسی
 دروازے سے اُس دن "بی داخل ہوئی تھی۔ جب باپ یہاں بادشاہ تھا۔ اُس وقت
 زینب شہزادی کی حیثیت سے آئی تھی۔۔۔۔۔ وہی دروازہ پھر سامنے آگیا
 اور زینب نے پہچان لیا۔

"اُون! یہ وہ دروازہ ہے۔" اور آٹا کھدایا۔۔۔۔۔

"اس دروازہ سے ہم نہیں جائیں گے۔۔۔۔۔"

اُدھر فوج کا اصرار کہ زینب! تمہیں چلنا پڑے گا۔ اور اُدھر زینب کا فرمان کہ ہم نہیں
 جائیں گے۔۔۔۔۔ تو شرم آگھ! ابو اسامی نے۔ زینب! تمہیں چلنا پڑے گا،
 زینب! تم جھولی ہو۔۔۔۔۔ اتن تم کوٹنے کی شہزادی نہیں ہو۔ بلکہ ہماری یتیم ہی
 ہو۔۔۔۔۔ تمہیں چلنا پڑے گا! اب جو ہوئے کی رد و فوج۔۔۔۔۔ تو زینب
 کی گود میں جو بچی بیٹھی تھی تین سال کی۔۔۔۔۔ وہ کہتی ہے۔

"اماں!" تو زینب پر اب دیا

کیوں بیٹا!

”ہاں جڑا تھے۔“

”اُن کا کوئی ناقہ تھا“

.. ”ہاں بیٹا

”اُس اُونٹنی کو قوم نے قتل کر دیا تھا۔ تو پھر اُس اُونٹنی کے بچے نے پہاڑ پر چڑھ کے فریاد کی تھی۔ اور اُس قوم پر عذاب آ لیا تھا۔“

”ہاں بیٹا۔ ٹھیک ہے۔۔۔ مگر تم کیا عیاستی ہو۔۔۔“

”اماں! کیا میں اُس ناقہ صالح کے بچے سے کم ہوں۔۔۔ تو مجھے اجازت

دے۔ میں خدا سے فریاد کرتی ہوں۔ یہ قوم سہیں تباہ کر رہی ہے۔

بہن بچی کا یہ کہنا تھا کہ وہ نیزہ جس پر امام کا سر سوار تھا ایک دم ٹھک گیا۔
اور سر بہن کے سامنے آ گیا۔

”زینب! میری خاطر آؤنا۔ اسی دروازے سے۔۔۔۔۔“

کوئی بات نہیں ہے۔۔۔ اللہ یہ مشکل بھی آسان کر دے گا۔

آؤ۔ اسی دروازے سے سلی چوڑی ب:۔۔۔

زینبؓ نے سر جھکا دیا۔

”حسین! اگر تیری بی مرضی ہے تو مجھے کیا اعتراض“ اور

معزز سامعین! قافلہ اسیرانِ کربلا جب بالکل دروازے کے قریب پہنچا — تو

ایک دم کان میں ایک مانوس آواز آئی۔ جیسے اپنوں میں سے کسی کی آواز ہوتی ہو۔

”اسلام علیک یا نبی رسول اللہ“

نیز گہرائی۔ ”دشمنوں کے اس مجمع میں اس پیارے کس نے میرے بھائی کو سلام کیا

————— پیپرے سے بال ٹہائے ————— اودھرد کیگیا ————— اودھرد کیگیا —————

کون سلام کر رہا ہے ————— تو دوبارہ آواز آئی —————

”اسلام علیک یا بنت رسول اللہ“ اے رسول کی بیٹی! میرا سلام ہو —————

زینب نے اب جو نظر اٹھا کے دیکھا ————— دیکھتی کیا ہیں —————

دروازے پر بے سر کی لاش لٹکی ہوئی ہے۔ اور اُس شہید کی لاش سے سلام کی آواز

آ رہی ہے —————

زینب نے فوراً پہچان لیا

”کون! بھائی مسلم“

”ہاں زینب! تمہارا سفیر! دروازے پر تمہارے استقبال کو حاضر ہے“

اور سامعین! کوٹنے کی گلیوں اور یازاروں سے گزرتا ہوا۔ ان بے بس و محبوبہ قیدیوں

کا قافلہ ————— دربار ابن زیاد میں پہنچ گیا ————— جب دربار ابن زیاد میں

یہ قافلہ پہنچا۔ تو ابن زیاد نے کافی دیر کے بعد کہا۔ کہ جو قیدی ہم نے قید کر لئے تھے تاکہ وہ

حسین کی مدد کو نہ پہنچ سکیں۔ اُن میں ایک مختار نامی قیدی ہے ————— اُسے یہاں

دربار میں حاضر کرو ————— چنانچہ مختار دربار میں آگیا۔ پیروں میں بیڑیاں پڑی

ہوئی ہیں۔ زنجیروں میں جکڑا ہوا۔ اور ابن زیاد بڑے غرور و تکبر سے بولا —————

”مختار! ہم نے تمہیں اس لئے قید کیا تھا کہ تم کہیں حسین کی حمایت کو نہ چھو جاؤ۔

حسین آگئے ہیں کوٹنے میں ————— اب کیا ارادہ ہے —————

مختار نے کہا ”معدائے اگر اس قید سے رہا کر دیا۔ تو میں جاؤں گا۔ حسین کی مدد کو“

ابن زیاد نے کہا۔ ادھر آؤ۔ دیکھو یہ حسین ہیں —————

اب جو مختار نے حسین کا سر دیکھا تو اُسی قید کے عالم میں ساتھ کھڑے ہوئے سپاہی کی تلوار کے

قبضہ پر ہاتھ ڈال دیا ————— بس مختار نے قبضہ میں ہاتھ ڈالا ————— ادھر سے

امام زین العابدین نے ہاتھ سے اشارہ کیا —————

”مختار۔ اڑائی نہ کرنا۔ میرے ساتھ پھوپھیاں اور بنیں آئی ہوتی ہیں

میرے ساتھ پردہ دار عاتقین آئی ہوتی ہیں۔۔۔۔۔ اور۔۔۔

ابن زیاد نے مختار کو دوبارہ قید خانے میں بھیج دیا۔۔۔ اور حجب کافی دیر ہو گئی۔

قیدیوں کو کھڑے کھڑے ابن زیاد کے دربار میں۔۔۔ اور دنیائے یہ انقلاب اعظم دیکھا

کہ تخت پر ابن زیاد اور سامنے زمین پر قیدی امام زین العابدین۔۔۔ اب ابن زیاد

نے کافی دیر کے بعد بڑے تکبر و غرور کے ساتھ سر اٹھایا۔۔۔ اور سر اٹھا کے کہتا ہے

شمر سے۔۔۔

”یہ قیدی میں؟“

”ہاں۔ یہ ہیں“

ان قیدیوں میں یہ بچی کون ہے۔۔۔۔۔؟“

تو شمر کہتا ہے بڑھ کے

”یہی تو ہے حسین کی وہ بچی۔ جس سے حسین بہت پیار کرتے تھے۔ سکینہ بنت الحسین

یہی ہے۔۔۔۔۔

”اچھا یہ بچی ہے اسے میرے سامنے لاؤ۔“

شمر نے قیدیوں سے بڑھ کے بچی کو سامنے کر دیا۔ اب ابن زیاد پوچھتا ہے

”بچی! تیرا نام کیا ہے۔۔۔؟“

وہ جواب نہیں دیتی۔ آخر اُس نے بیمار بھائی کی طرف دیکھا۔ کیا حکم ہے۔ تو بھائی نے

اشارہ کیا۔ بات کر دیشا۔۔۔

اب بچی نے بات کی۔

”میرا نام تو فاطمہ ہے۔۔۔ مجھے پیار میں سکینہ کہتے ہیں۔۔۔“

مگر بات اس طرح کی کہ زبان میں ملکیت آگئی۔۔۔۔۔

اب ابن زیاد کو چھتا ہے۔

”بچی۔ تمہاری زبان میں کسکت کیوں ہے۔“

”میرا گلا اتنا مضبوط بندھا ہوا ہے کہ میں بول نہیں سکتی۔“

ابن زیاد کہتا ہے کہ اس بچی کا گلا کھول دو۔ اور گلا کھول دیا گیا۔

منٹ تک گلے کو سہلایا گیا۔ جب ذرا ٹھیک ہوا۔ اب وہ پوچھتا ہے۔

”ہاں۔ بچی۔ تیسرا کیا نام ہے؟“

”مجھے مکینہ بنت الحسین کہتے ہیں۔“

”تم نے یہ دونوں نام اپنے منہ پر کیوں رکھے ہوئے ہیں؟“

”میری بھینسیوں، ماؤں کے بال ہیں۔ اُن سے انہوں نے چہرہ چھپایا ہے۔ میرے بال

چھوٹے تھے۔ میں نے انھوں سے چھپایا ہے۔ ہم خاندان رسالت کی بچیاں ہیں۔ ہمارے

گھر سے دنیا نے پردہ سکھا ہے۔“

اب اُس ظالم نے پوچھا۔

”بچی تیرے ہونٹ کیوں خشک ہیں؟“

”کافی عرصے سے میں نے سیر ہو کے پانی نہیں پیا۔“

”کیوں نہیں پیا۔“

”کر بلا میں پانی ملا نہیں۔ اور میرا سقا پانی لینے گیا تھا۔ وہ واپس آیا نہیں۔“

”کہاں گیا تمہارا سقا۔“

”وہ تو مجھ سے فرات کہہ کے گیا تھا۔“ اُن کی کہنتی میں کہ وہ کوثر پہ چلا گیا۔

اس کے بعد ابن زیاد پوچھتا ہے۔

”بچی! اگر تیرے باپ حسین زندہ ہوتے۔ تو یہ بنا وہ تیری کیا خال کرتے۔“

تو بچی نے پورے بچپن کے لمحے میں کہا۔

”صبح کے وقت میرے باپ مجھے گود میں بٹھا کر اپنے ہاتھ سے تازہ خرے کھدایا کرتے تھے۔“

اب ابن زیادؓ کے حکم کی یہ آخری منزل ہے۔ وہ انت کہتا کیا ہے۔

”بچی۔ میں نے تیرے لئے تازہ خرے منگاے ہیں۔ تو کھائے گی؟“

بچی نے پھر بھائی کو دیکھا۔ بھائی نے پھر اشارہ کیا۔

بچی نے کہا۔

”ہاں۔“ اور سکینہ آگے بڑھی۔ تو ابن زیادؓ نے کہا۔

”بچے۔ اس شبت میں تازہ خرے ہیں۔“

اب بچی نے جو بیٹھ کے اٹھایا رومال۔ تو رومال اٹھاتے ہی گر پڑی۔

”بابا! تم یہاں جو۔ میں تمہیں تین دن سے تلاش کر رہی ہوں۔ یہ کہہ کے گر گئی تھشت

پہ۔ اور ادھر بچی گری۔ اور ادھر ابن زیادؓ کی سنگ دلی اور بڑھی۔

اور وہ کہتا ہے۔

”بچی! یوں نہیں۔ تم خاندانی رسالت نے دنیا میں یہ مشہور کر رکھا ہے

کہ ہم خاندان میں۔ ہم صاحب اعجاز ہیں۔ ہم معجزہ

دکھاتے ہیں۔ میں تو جب جانوں۔ جب حسینؑ کا سر خود اٹھ کے تیرے

پاس آجائے۔ اب جو ابن زیادؓ نے عن کی بات سنی تو بچی جوش میں آ کے چند

قدم پیچھے ہٹ گئی۔ اور پیچھے ہٹ کے اُس نے پھنسا ہوا کرتا چیلادیا۔

”ابا جان! خاندان کی عزت کا سوال ہے۔ تیری سکینہ کی محبت کا سوال ہے۔ میری گود میں۔

اور حسینؑ کا سر میری گود میں لپکا تا جو گود میں اگلیا اور کو نہ شہر میں زلزلہ اگلیا۔ امام زین العابدینؑ نے بڑھ کے کہیں سر لیا۔

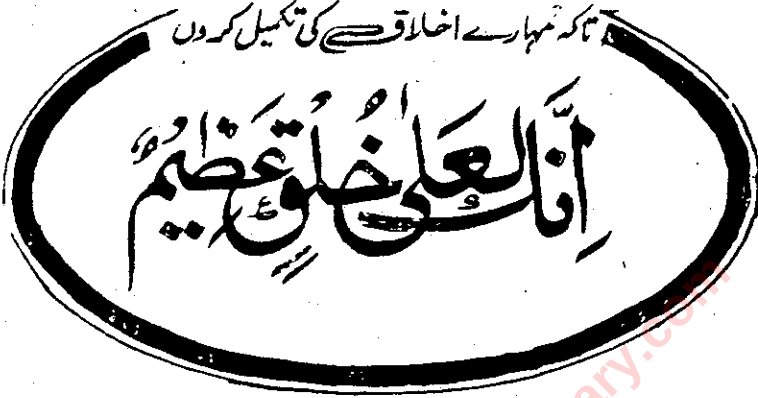
”سکینہ بس۔ یہ قیامت آجائے گی۔ ابھی تو کروڑہا انسان پیدا ہوں گے جو تیری قید کو رومال کے

سکینہ۔ ایسی کروڑہا تیری ہم سن چکیاں ہوں گی جو رات دن تیری غی کی ماتم کریں گی۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرمایا کرتے تھے مجھے معلم بنا کر بھیجا گیا ہے

تاکہ تمہارے اخلاق کی تکمیل کروں



پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات اور اسوۂ حسنہ نے پوری نوع
انسان کو راہ ہدایت رکھائی اور انسانیت کو اس کے شرف سے بہرہ ور کیا۔ ہادی اسلام حضرت
محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قبل انسان کی گردن پر کئی جھوٹے خداؤں کی غلامی
کا طوق بڑھا تھا۔ اور چار سوطلم و ناانسانی اور عصیان کے ازہیرے پھیلے ہوئے تھے
یہ ہے وہ حادثہ کہ یکایک غیرت حق کو حرکت ہوئی اور اوی اعظم حضرت محمد صلی اللہ
علیہ وآلہ وسلم انسانیت اور تمام عالمین کے لئے رحمت بن کر تشریف لائے و ماسا
ارسلناک۔ الا رحمة اللعالمین حضورؐ نے اپنی پاکیزہ اور رفیع تعلیمات کے
ذریعے زندگی کا نیا فنون پیش اندکی واحدیت اور انسان کی برابری کی تعلیم دی قبائلی
نسبی اور خاندانی بڑائی کے انسانیت کو نظر سے خارج و بنیاد سے اکھاڑ کر غفلت اور
بڑائی کو زیادہ اچھے اعمال اور اچھے اخلاق پر رکھی اور ظلم و ناانصافی کی ہر شکل کو ممنوع
قرار دیا۔ آپ کے اثر انگیز ارشادات اور حیات افروز واعظ کا مقبوضہ بن سکا۔ کہ
صدیوں کے دشمن بھائی بھائی بن گئے اور ضربوں کمزور و نامہ اور زیر دستوں کے سر پر دستخط
ہوئی تو مار ڈوٹ گئی۔ رضی اور غلام روتوں کو عظمت اور مسرت کے نئے افق نظر آئے

ظالم و جابر حکمرانوں کا تسلط ختم ہونے پر انسانی ذات اور شخصیت کو نشوونما کے نئے مواقع اور اسباب میسر آئے۔ جہات کی جگہ علم و عرفان نے لے لی اور افلاس و محکومی کے بدلے غنا اور آزادی کی روشنی پھیلنے لگی۔

ہدئی اعظم کی تعلیم نے پوری انسانیت کا رخ بدل دیا اور گمراہ ارضی پر حریت و مساوات کا نیا سورج طلوع ہوا۔ کالے گورے اور عربی و عجمی کی تفریق ختم ہو کر اقوام و ملل اخوت اور وحدت کے روح پرور رشتے میں منسلک ہو گئیں۔ سرور کونین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے حسن اخلاق کے وہ جوہر دکھائے کہ تمام اہل عرب عش عش کر اٹھے اور آپ کو صادق اور امین کہنے پر مجبور ہو گئے جن میں اپنے پرانے اور دوست دشمن سب ہی شامل تھے۔ اس ضمن میں ایک مشہور واقعہ درج کرتا ہوں۔

جب نبی اکرم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسلام کی تبلیغ شروع کی تو بکتے کے لوگ آپ کے خلاف ہو گئے۔ آپ جب بازاروں اور گلیوں سے گزرتے تو آپ پر پتھر مارتے اور کوڑا کرکٹ پھینک دیتے۔ ایک بوڑھی عورت کا یہ معمول تھا کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے گھر کے نیچے سے گزرتے تو وہ آپ پر کوڑا کرکٹ پھینک دیتی۔ آپ نگاہ اٹھا کر دیکھتے اور مسکراتے ہوئے سر اور پیڑے جھاڑ لیتے۔ ایک دفعہ آپ اس بوڑھی عورت کے گھر کے نیچے سے گزرتے رہے تبھی کہ اس دن کوڑا کرکٹ آپ پر نہ پھینکا گیا۔ آپ حیران رہ گئے اور سوچنے لگے کہ ضرور کوئی وجہ ہے کہ آج اُس بوڑھی عورت نے کوڑا نہیں پھینکا۔ آپ نے اُس کے گھر کا رخ کیا اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے آواز آئی کون ہے؟ آپ نے جواب دیا میں ہوں محمد۔ اُس نے اندر آنے کی اجازت دے دی۔ بڑھیا کئی روز سے بیمار پڑی تھی۔ آپ نے پوچھا اے عورت کیا بات ہے۔ اُس نے ڈرتے ہوئے کہا کہ میں کئی روز سے بیمار ہوں۔ میرا کوئی سہارا نہیں۔ میں نے کئی روز سے کچھ نہیں کھایا پیا۔ آپ نے

اس عورت کو تسلی دی اور کہا کہ تو گھر نہ کر میں تیری خدمت کروں گا۔ آپ نے اسے دوا لے کر دی۔ کھانا کھلایا۔ پانی پلایا اور اجازت دے کر چلے گئے۔ اس طرح کئی روز اس کی تیمارداری کرتے رہے۔ یہاں تک کہ وہ عورت بالکل خندہ رست ہو گئی اور معافی مانگنے لگی کہ وہ مجھے معاف کر دیں۔ حضور نے اسے معاف کر دیا اور وہ عورت آپ کے اخلاق دیکھ کر سماں ہو گئی۔

حضرت زکریا علیہ السلام کی بیوی اقدسہ بہہ حقمہ ہے جس کا آپ کی زندگی تمام انبیاء نے رام اور مصطفیٰ عام۔ یہ محمد زکریا کی بیوی ہے۔ کچھ یہ مضمون اخلاق پر کاربہ تھا۔ **بِمَا تَحْسَبُوهُنَّ مَا لَا تَعْلَمُونَ** (غور)۔ جو نہیں کرتے وہ کہتے ہیں۔ حضور خدا ہی تعالیٰ کا آپ پر نور بھیجے۔ اخلاق و عمل کا جو کتاب دوسروں کو سکھانے کے لیے خود اس آئینہ پر بن جانے لگے۔

انہوں نے پوچھا۔ تم قرآن نہیں پڑھتے؟۔ آنحضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انہوں نے۔ آپ کو اخلاق بہترین قرآن تھا۔ محبوبہ صحائف آسمانی اپنے راعیوں کے بہترین اقوال کا مجموعہ ہیں لیکن کیا ان کا ایک حرف بھی اپنے مبتغی کے عمل کا مدعی ہے؟۔ قرآن مجید انہوں کی الفین اور اہل غناد کی بیڑ میں اپنے راعی کی نسبت گویا ہے۔ **وَأَذَلَّتْ عَلَى خَلْقٍ عَظِيمٍ** (اے محمد تمام اخلاق کے بڑے درجے پر تار تار کی گئی ہے کہ ائمہ اربعین حضرت خدیجہ الکبریٰ جو نبوت سے پہلے اور نبوت کے بعد پچاس برس تک آپ کے حرم پاک میں زوجیت سے مشرف ہو کر ہدم و دوسا ز رہیں۔ آقا نبوت میں آپ کو ان الفاظ سے تسلی دینی ہے۔ "ہرگز نہیں خدا کی قسم۔ خدا آپ کو غلین نہ کرے گا۔ آپ رحم کرتے ہیں۔ مقروض کا بار اٹھانے میں۔ غریبوں کی اعانت کرتے ہیں۔ مہمانوں کی ضیانت کرتے ہیں۔ حق کی حمایت کرتے ہیں۔ مصیبتوں میں لوگوں کے کام آتے ہیں۔

اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ حضور اکرم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اخلاق عالیہ کے متعلق فرماتی ہیں کہ سرور کونین کی عادت کسی کو بُرا بھلا کہنے کی نہ تھی۔ بُرائی کے بدلے بُرائی نہ کرتے بلکہ درگزر فرماتے تھے۔ آپ نے کسی سے ذاتی معاملے میں کبھی انتقام نہیں لیا۔ آپ نے نام لے کر کبھی کسی مسلمان پر لعنت نہیں کی۔ آپ نے کبھی کسی غلام کو بڑی کر کسی عورت کو۔ کسی خادم کو۔ کسی جاندار کو اپنے ہاتھ سے نہیں مارا۔ آپ نے کبھی کسی درخواست رد نہیں فرمائی۔ چہ جائیکہ وہ ناجائز نہ ہو۔ آپ جب گھر تشریف لاتے تو نہایت خنداں ہنستے مسکراتے ہوئے۔ دوستوں میں پاؤں پھیل کر نہ بیٹھتے۔ باتیں ٹھہر ٹھہر کر اس طرح فرماتے کہ کوئی یاد رکھنا چاہے تو رکھ لے۔ رات کی تنہا یوں اور خصوصی اوقات میں اپنے دشمنوں کی اصلاح کے لئے دعا میں فرماتے۔ آپ نے کبھی کسی کے لئے بدعا نہ کی۔ آپ حسنِ اخلاق کے مجسم بکیر تھے۔ آپ نے زندگی کے ہر شعبہ میں اخلاق کے وہ مایہ ناز نمونہ چھوڑے ہیں جو رہتی دنیا تک سنسں راہ رہیں گے۔ آپ نے ہمسائوں سے ہمیشہ محبت اور شفقت سے پیش آنے کی تلقین فرمائی۔ آپ نے فرمایا کہ ہمسائے کے بہت حقوق ہوتے ہیں یہاں تک کہ ہمسایہ رشتے دار سے بھی زیادہ عزیز ہے۔

ہمارے سرکار اور پیادہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجسمِ عمل تھے۔ اپنا کام خود اپنے دست مبارک سے کیا کرتے تھے۔ سرکارِ دو عالم اپنے پچھے پرانے کپڑے خود سی لیتے۔ کبریا کا دودھ خود دودھ لیتے۔ اپنے جوئے خود گانٹھ لیتے۔ جھاڑو خود دے لیتے۔ غرض گھر کا ہر کام خود کر لیتے تھے۔ حضور اکرمؐ نے ہمیشہ مساواتِ بھائی چارے اور سادگی کا درس دیا۔ آپ نے بے جا صرف اور فضول خرچی سے منع کیا اور فرمایا میانہ روی اختیار کرو۔ حضور اکرم محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیشہ عفو و درگزر کی تلقین فرماتے اور کہا کرتے کہ مسلمانوں کے لئے بہتر ہے کہ دشمن کو معاف کر دے اگر کسی سے

غلطی سرزد ہو گئی ہو تو اسے درگزر کر دے۔ غصے کی حالت میں اپنے نفس پر قابو رکھے۔ جس نے اپنے غصے پر قابو رکھا اس نے اپنے آپ کو ہلاکت سے بچا لیا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فتح مکہ کے موقع پر تمام دشمنوں کو معاف کر دیا تھا اور یہاں تک کہ اپنے چچا حضرت حمزہؓ کو قتل کروانے والی عورت منہ کو بھی معاف کر دیا۔

تجارت میں آپؐ نے علی طور پر حصہ لیا اور اس کے ساتھ ساتھ آپؐ نے تجارت کے فضائل اور اصول بیان فرمائے۔ مسلمانوں کو تجارت کی ترغیب دلاتے ہوئے فرمایا کہ سچا امانتدار تاجر قیامت میں انبیاء اور سچے لوگوں کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔ آپؐ نے تجارت کے غلط طریقوں سے منع فرمایا۔ چنانچہ آپؐ کا ارشاد ہے کہ ذخیرہ اندوزی کرنے والا۔ لعنتی ہے۔ دوسرے مقام پر فرمایا جس نے ذخیرہ اندوزی کی وہ گناہ گار ہے۔ طلاوت کی مذمت کرتے ہوئے کہا جس نے دھوکا دیا وہ میری امت میں سے نہیں۔

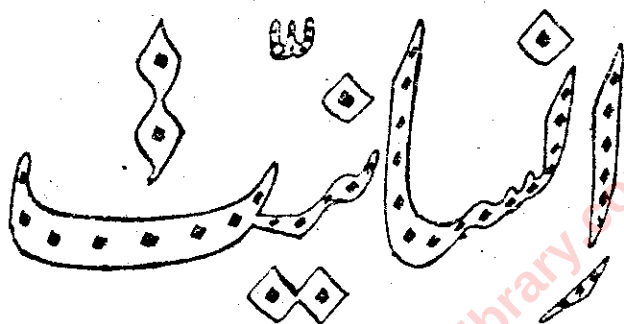
قربان جانیے اس محسن انسانیت اور رحمت اللعالمین کے جنہوں نے علی طور پر مزدوری فرما کر مزدوروں کے حوصلے بلند کر دیئے اور معاشرے میں ان کو باعزت مقام دلایا۔ مسجد نبویؐ کی تعمیر میں حصہ لے کر آپؐ نے پتھر۔ مٹی اور گارا اٹھانے والوں کی رہنمائی کی صحابہؓ کہتے ہیں کہ ہم سے زیادہ پتھر حضور اکرمؐ نے اٹھائے تاکہ آنے والا مزدور آپؐ کا اسوہ حسنہ دیکھ کر احساس فرض کا حامل بنے۔ آپؐ نے فرمایا کہ مزدور کی مزدوری اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کرو۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا علم کو طلب کرو خواہ تمہیں اس کے لئے چین ہی کیوں نہ جانا پڑے۔ ایک دوسرے مقام پر فرمایا۔ گہوارے سے لے کر قبر تک علم حاصل کرو۔ ایک اور مقام پر تمام مسلمانوں پر علم دین کا طالب کرنا فرض قرار دیا۔ آپؐ نے فرمایا میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ تاکہ تمہارے اخلاق کو مکمل کر دوں۔

آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہمیشہ بچوں سے پیار تھا وہ بچوں سے محبت

اور شفقت سے پیش آنے کی تلقین فرماتے۔ آپ کو بچوں سے اتنا پیار تھا کہ آپ جب کبھی بچوں کے قریب سے گزرتے تو کمال شفقت سے ان کو سلام کرنے میں پہل کرتے۔ آپ کا ارشاد ہے کہ والدین اپنے بچوں کو جو سب سے قیمتی اور اعلیٰ تحفہ دے سکتے ہیں وہ بچوں کی اچھی تربیت اور اچھی عادتیں پیدا کرنے کا تحفہ ہے۔ آپ نے فرمایا وہ ہم میں سے نہیں جو چھوٹوں پر شفقت اور بڑوں کا ادب نہیں کرتا۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیشہ لوگوں کو خدا کی راہ میں خیرات کرنے کی تلقین کرتے تھے۔ حضرت ام سلمیٰ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک دفعہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گھر میں رنجیدہ تشریف لائے میں نے رنجیدگی کا سبب پوچھا۔ آپ نے فرمایا ام سلمیٰ! کل جو سات دینار آئے تھے، شام ہو گئی تھی وہ میرے بستر پر پڑے رہ گئے تھے۔ خیرات کرنے میں دیر ہو گئی۔

دنیا سے رحلت کے وقت جب آپ بیمار تھے تو آپ کو خیال آیا کہ چند اشرفیاں گھر میں موجود ہیں۔ آپ نے انہیں خیرات حکم دیا۔ فرمایا جلدی کرو۔ ایسا نہ ہو کہ میں اس سے رخصت ہو کر جب اپنے رب سے ملوں تو اس وقت میرے گھر میں اشرفیاں موجود ہوں۔





یہ شہادت ہے اُس انسان کی کہ اب حشر تک
آسمانوں سے اتر آئے گی انسان انسان

الحمد لله

یہ میری خوش قسمتی سمجھیں یا یہ کہ میری زندگی کا رخ اس طرف مڑ گیا — خدا جانے
کیا قصہ ہوا کہ تقریباً ساری ہی زندگی اس طرح سٹیج پر کچھ نہ کچھ ہونے لگ کر گئی اور چھوٹے
بڑے ہر قسم کے مجموعوں میں کچھ نہ کچھ بات ضرور کی — زیادہ تر میری گفتگو کا موضوع
یہی تذکرہ محمد و آل محمد رہا — اور اسی مناسبت سے شاید ان طلباء نے بھی مجھے
حکم دیا کہ زبان اگر کچھ عرض کروں — بہت ہی ڈرا — یہاں میں اتنا ڈر رہا تھا
آتا ہوا کہ مجھے دو تین طالب علم پکڑ کے لٹے ہیں — ایک بے پڑھا لکھا آدمی مدرسے
میں آتے ہوئے ڈرتا ہے — مجھے بڑا ڈر لگا کر یہاں آ کے میں کیا کہوں —
طلبہ کا مجمع ہے — اہل علم کا جھرمٹ ہے — بال کی کھال لگانے والوں کا مجمع ہے —
سہرات کو سچنے سمجھنے والوں کا اجتماع ہے — ستاروں کو قید کرنے والوں کا مجمع ہے
حکمت کی نہریں جاری کرنے والوں کا مجمع ہے — سائنس کے دیباہ مندانوں کا مجمع ہے
— چاند پر کندی پھینکنے والوں کا اجتماع ہے — ذروں کا جگر پھاڑ کے قیامت ڈھانے
والوں کا مجمع ہے — دنیا جبر کے سائنس اور عقل و فلسفے کو دل میں سمونے
والوں کا مجمع ہے —
— اور کہنے والا ازکار رفتہ بوڑھا آدمی — بھلا میرا آپ کا کیا ربط کیا جوڑ ہے میں
جس زمانے کی آپ سے بات کر دنگا وہ زمانہ آپ سے کبھی کا پرانا ہو گیا — نئی بات
مجھے آتی نہیں — اگر پرانے یونیورسٹی کیس میں کوئی بلا تو چلا جانا — نیو کیس میں پرانا
آدمی — تو بھائی ٹیرے ذہن میں تو کوئی بات تم سے کہنے کے لئے ہے نہیں —
نہ کوئی موضوع ہے ایسا جو تمہارے سامنے بیان کیا جائے نہ کوئی گفتگو — بڑے ہی
شوق سے بے خودی کے عالم میں وہ سن رہا تھا جو باتیں ہو رہی تھیں — بڑی اچھی

شاعری، بہترین شرکی گفتگو — میرا دل لگا ہوا تھا کہ ستارہ ہوں — اچانک حکم ہوا کہ تو بھی کھڑا ہو کے کچھ بول — اب یہ طلبہ خود بہتر جانتے ہیں کہ اپنی محفل میں کتنا ہی چمکنے والا ہو طالب علم، جب سبق سنانے کا موقع آتا ہے تو بات اور ہو جاتی ہے — اب میں اتنے استادوں کے سامنے سبق سنانے کھڑا ہوا ہوں — کہیں بھول جاؤں، کہیں غلطی ہو جائے — کہیں اور کوئی بات ہو جائے تو میں کیا کہوں؟ کیا بات کروں؟ بہر کیف ایک مذہبی ماحول میں گفتگو کرنے والا آدمی اپنی بات مذہبی طور سے ہی شروع کرتا ہے — پتہ نہیں آپ کو میرا مذہبی طرز پسند بھی آئے گا یا نہیں؟ — میں دہی مذہبی باتیں جو میں کیا کرتا ہوں —

مسلمان بچو! — مسلمان بچوں میں نے اس لئے کہا ہے کہ اس مجمعے کے سامنے مجھے یہ ثابت کرنے کی ضرورت ہی نہیں کہ اسلام کوئی بڑا اچھا مذہب ہے — اس لئے کہ یہاں سبھی مسلمان ہیں — تمہیں اسلام کی خوبی بتانے کی کیا ضرورت ہے — ہونا! مسلمان؟ آپ تو سب ہیں ہی مسلمان، خدا کے فضل سے — اور یہ اللہ کا احسان ہے کہ اللہ نے آپ کو پیدا ہی مسلمان کیا — یہ اللہ کا فضل ہے نا — اگر اللہ کسی مسلمان کی بجائے کسی عیسائی یا یہودی کے گھر میں پیدا کر دیتا — ہو سکتا ہے ہم دہی ہوتے — اس لئے مسلمان ہیں کہ مسلمان کے گھر میں پیدا ہوئے — کیوں بھی یہی ہے نا؟ ایسا تو ایک آدھ آدمی کہیں کوئی جوتہ ہے — جو پیدا کہیں ہو — عیسائی وغیرہ کے گھر اور اپنی تحقیقی سے مسلمان ہو — یہ بہت کم مثالیں ہوتی ہیں — عام طور پر مسلمان کے گھر میں پیدا ہو گئے لہذا مسلمان ہیں — اور ایک اور مشکل بنتی ہے — تمہیں تو اندازہ نہیں اس بات کا کہ میں پیدا ہوا مسلمان کے گھر میں — لہذا ہوں میں مسلمان — اگر خدا نخواستہ خدا نخواستہ، تو بہ، تو بہ — ایسا ہونے کبھی — اگر میں ہو جاؤں عیسائی — اور پکا کٹر عیسائی ہوں — بڑا ہی

مزد عیسائی ہوں۔ مگر ساری زندگی عیسائیوں کو مجھ پر خبیہ رہے گا کہ ممکن ہے جاسوس ہو۔ ہو سکتا ہے مسلمانوں کو جاسوس ہو۔ ہو سکتا ہے مسلمانوں نے جاسوس کر کے بھیجا ہو۔ انہیں مجھ پر یقین ہی نہیں آئے گا۔ جب بیٹھا کریں گے آپس میں چار عیسائی کہیں گے۔ ہونہ ہو، ”وہ جوتی ہو ہی ہے“۔ یہی کہا کریں گے۔ قسمیں کھاؤں۔ لاکھ انکار کروں۔ کچھ بھی کہوں۔ مگر وہ کہیں گے۔ ”اُدھوں ہے وہی“۔ تو کیوں شبہ رہے گا مجھ پر مسلمان ہونے کا ساری زندگی، اب جو دمیرے تردید کرنے کے۔ چونکہ میں پیدا ہو گیا ہوں مسلمان کے گھر میں۔ سمجھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جو شخص جس کے گھر میں پیدا ہوا۔ یہ کچھ قدرتی سہا بات ہے۔ وہ لاکھ کہے کہ میں وہ نہیں ہوں مگر جس گھر میں پیدا ہو جائے۔ اس پر شبہ و ہتہا ہے ساری زندگی۔ ہونہ ہو وہی ہے۔ جس گھر میں جو پیدا ہو گا۔ تو یہ بات ہے بھائی۔ ہمیں خدا نے مسلمان گھر میں پیدا کر دیا۔ ہم اللہ کے فضل سے مسلمان ہیں اور ہم مسلمان کا یہ فخر ایمان ہے کہ اللہ نے جب اس کائنات کو پیدا کرنے کا ارادہ کیا اور یہ میں پڑھے لکھے حضرات کے سامنے بھر کھدوں کہ یہ جو الفاظ ہم استعمال کریں گے گفتگو میں۔ خدا سے متعلق، رسول سے متعلق تو یہ الفاظ ہیں جو ہماری عقل کی رسائی میں بڑے اچھے الفاظ ہیں۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ صیغہ معنوں میں ان کی شان کے مطابق بھی ہیں جن کا ہم ذکر کر رہے ہیں۔ اللہ کے لئے الفاظ ہمارے پاس ہیں۔ جن سے ہم اللہ کا ذکر کر سکیں۔ بس اللہ کے لئے ایک ہی لفظ ہمارے پاس ہے۔ کیا؟ کہ بس اللہ۔ اللہ کیا ہے؟ اللہ۔ بمعنی اللہ کیا ہے؟ اللہ۔ آگے؟ کہ اللہ ہی اللہ خیر صلا۔ بس اللہ۔ اللہ کیا ہے؟ اللہ۔ اور کوئی لفظ اعمیٰ تک ہے ہی نہیں ہمارے پاس اللہ کے لئے سوائے اللہ کے۔

اور بڑے سے بڑے علمائے اہل علم۔۔۔۔۔ بڑے بڑے علمائے کرام بھی جب اللہ کی بات کرتے ہیں تو عطرے ہو کے۔۔۔۔۔ تو وہ بھی کہتے ہیں کہ صلی اللہ علیہ وسلم۔۔۔۔۔ ارے بھئی اللہ تو ہے، کیا کریں اللہ کو۔۔۔۔۔ تو کہتے ہیں۔۔۔۔۔ سناؤ! اللہ سے ڈرو۔۔۔۔۔ سنا ہے یا نہیں تم نے؟ اللہ سے ڈرو۔۔۔۔۔ سنا ہے تا؟ سناؤ! ڈرو اللہ سے۔۔۔۔۔ عالم کو و غلط قبلہ و کعبہ کا فرمان، مومن کا ارشاد۔۔۔۔۔ طنبہ بیٹھے ہیں سامنے۔۔۔۔۔ بھئی اللہ سے ڈرو۔۔۔۔۔ اور ڈرو اللہ سے۔۔۔۔۔ اللہ سے ڈرو۔۔۔۔۔ ایک دفعہ سنا دو دفعہ چار دفعہ دس دفعہ۔۔۔۔۔ آخر بابا ہار دلوں صاحب نے اللہ سے جو ڈرایا تو خدا شاہد ہے۔۔۔۔۔ کائنات کے رشتوں کا تو مجھے پتہ ہے۔۔۔۔۔ یہ تو اتنے ڈر کیے ہیں اللہ سے کہ جہاں اللہ کا ذکر ہوا ڈر کے مارے نہیں جاتے۔۔۔۔۔ مولوی صاحب جو کہتے ہیں، اللہ سے ڈرو۔۔۔۔۔ رشتہ چلے جا رہے ہیں، سنا ہے سجدہ آجائے۔۔۔۔۔ چکر اٹکے گزرتے ہیں۔۔۔۔۔ سہوٹا بھی چکر اٹکے کیوں گزرے۔۔۔۔۔ کہ بھئی سب سے بڑا ہے۔۔۔۔۔ پھر؟ کہ اللہ سے ڈرو۔۔۔۔۔ مولوی صاحب نے کہا تھا۔۔۔۔۔ ہم اللہ سے ڈرتے ہیں۔۔۔۔۔ تو اللہ سے ڈرا ڈرا کے، ڈرا ڈرا کے۔۔۔۔۔ ایمان سے ہم لگوا کا بڑا حال ہوا جواب۔۔۔۔۔ اور کوئی ہم میں سے جرأت کر کے مولوی صاحب نہیں کہتا۔۔۔۔۔ مولوی صاحب، اللہ سے ڈرو۔۔۔۔۔ کیوں اللہ کے بندوں کو اللہ سے ڈرا رہے ہو، خواہ مخواہ کے لئے۔۔۔۔۔ بھلا اللہ سے ڈرنا بھی کوئی انسانیت ہے؟۔۔۔۔۔ اللہ کے بندوں کو اللہ سے ڈرنا بھی کوئی بات ہے۔۔۔۔۔ بس ڈرا رہے ہیں۔۔۔۔۔ کیوں بھائیو! ڈر تو اردو زبان کا لفظ ہے۔۔۔۔۔ ڈر کے معنی میں پچنا۔۔۔۔۔ کس سے پچنا؟ اُس سے پچنا، جس سے اندیشہ ہو ستانے کا۔۔۔۔۔ جس سے اندیشہ ہو دکھ پہنچانے کا۔۔۔۔۔ جس سے اندیشہ ہو اذیت پہنچانے کا۔۔۔۔۔ اب بتاؤ اللہ کوئی سانپ ہے؟، بچھو ہے؟ کیا ہے؟ جو اس سے ڈریں۔۔۔۔۔ ہیں ستانا

ہے؟ ہمیں نقصان پہنچاتا ہے؟ ہم پر ظلم کرتا ہے؟ ہمیں اذیت دیتا ہے؟
 پھر ڈرو کیوں اللہ سے — بولو بھی — کہتے ہیں ڈرو — کیوں ڈرو —
 کیا وجہ ہے ڈرنے کی؟ کیا اللہ ہم پر مہربان نہیں — اللہ ہمیں پیار نہیں کرتا —
 اللہ ہم سے محبت نہیں کرتا — اللہ کو ہم سے پیار نہیں — ہم سے زیادہ ہم سے
 پیار نہیں ہے اللہ کو — اللہ جیسا پیارا، اللہ جیسا محبوب، اللہ جیسا اچھا —
 اللہ جیسا حسین — اللہ جیسا معشوق — اس سے ڈرا ڈرا کے مار دیا لوگوں کو
 — کہ اس سے ڈرو — اللہ سے — یاد رکھو میرے محترم بھائیو، بچو، عزیزو
 — اگر کوئی مولوی صاحب کہیں تو بے شک میرا نام لے دینا — گناہ میرے ذمے
 — اللہ سے مت ڈرو — سمجھے — اللہ ڈرنے کی چیز نہیں ہے — اللہ ڈراؤنی
 شے نہیں ہے — اللہ ظالم نہیں ہے — اللہ ستا تا نہیں ہے — دیکھو
 بچو، اللہ محبوب ہے، اللہ معشوق ہے، اللہ پیارا ہے — اللہ حسین ہے —
 سمجھے جب وہ حسین ہے، وہ محبوب ہے — وہ پیارا ہے — اس لئے اس میں
 ادائیں بھی بڑی ہیں۔ اور اس کی ادائوں میں ایک بڑی ادائیہ بھی ہے کہ وہ ذرا روٹھ جاتا
 ہے — تو ڈرو اس بات سے کہ اللہ کہیں تم سے روٹھ نہ جائے — کہیں ناراض
 نہ ہو جائے — یہ تو سکہ بات ہے کہ جتنا بڑا حسین ہوگا، اتنا ہی بڑا نازک
 مزاج ہوگا — جتنا بڑا حسین ہے اللہ، اتنا ہی بڑا نازک مزاج ہے — ذرا
 سی بات پر روٹھ جاتا ہے — ہر وقت ڈرتے رہو کہ کہیں روٹھ نہ جائے —
 اگر روٹھ گیا تو پھر ”یار منادوں اوکھا“ — پھر اُسے منانا بڑا مشکل ہوگا —
 تو اللہ سے اس بات سے ڈرو کہ کہیں وہ تم سے روٹھ نہ جائے اور دیکھو میری بات
 سنو عزیزو! — اللہ کو یاد رکھو — سمجھے — اللہ کو یاد رکھو —
 مولوی صاحبان ہمارے سامنے ترجمہ کرتے ہیں۔ اذکر اللہ ۵ — اللہ کو یاد کرو —

تو میں کہتا ہوں۔ مولوی صاحبان جانے بھی دو۔ یہ ترجمہ عربی کا نہیں ہے۔ اللہ کو یاد کرو۔ یاد کرو میں کوئی سواد ہی نہیں۔ یاد کرو میں کوئی لطافت ہی نہیں۔ سن رہے ہونا بھی میری بات؟ پکٹی بات؟ جب سننے سے تمہارا دل بھر جائے کہہ دینا میں اُسی وقت بیٹھ جاؤ گا۔ جب تک سنتے رہو گے میں تمہیں سناتا رہوں گا۔ تم بھی کیا یاد کرو گے کسی نے سنائی تمہیں۔ جب تک سنتے رہو گے میں سناتا رہوں گا تو دیکھو بھائی یہ ترجمہ غلط ہے۔ اللہ کو یاد کرو۔ یاد کرو کو اگر زندگی میں ایک دفعہ یاد کرو تو یاد کرو پورا ہو گیا۔ عید کے دن کہہ دیا۔ یا اللہ۔ یاد کرو پورا ہو گیا۔ باقی سال یاد نہ کرو بے شک۔ یہ کون سی بات ہے۔ چاہے کسی وقت بھی یاد نہ کرو۔ کوئی بات ہی نہیں۔ اللہ کو ایک دفعہ بھی کہہ دیا۔ یا اللہ۔ یاد کرو پورا ہو گیا۔ باقی سال یاد نہ کرو۔ بے شک یہ کون سی بات ہے۔ چاہے کسی وقت بھی یاد نہ کرو کوئی بات ہی نہیں۔ اللہ کو ایک دفعہ بھی کہہ دیا اللہ۔ یاد کرو پورا ہو گیا۔ اللہ ہم سے یاد کرو کا مطالبہ نہیں کرتا۔ اللہ کہتا ہے۔ فَأَذْكُرْنِي ۝ کیا معنی؟ اللہ کو یاد رکھو۔ اب تم خود تباؤ پڑھے لکھے پنجہ۔ یاد کرو اور یاد رکھو میں کوئی فرق ہے کہ ہیں۔ بولو بھی اللہ کو یاد کرو اور بات ہے۔ اللہ کو یاد رکھو۔ اب سوچو کوئی فرق ہے یا نہیں اس میں ہے یا فرق؟ اور پھر آیت کا اگمہ تیور دیکھو۔ آیت کا اگر لہجہ دیکھو پھر ترجمہ کرو تو یہ ترجمہ بنے گا اس کا اللہ کو یاد رکھو، دے یاد رکھو پھر یہ ترجمہ بنتا ہے اور ترجمہ ہی نہیں بنتا کوئی۔ تو اللہ ہمیں یاد ہے۔ ہم اسے یاد رکھتے ہیں اور اللہ کا ہی ذکر کرتے ہیں محفل میں، مجلس میں مسلمانوں کی۔ تو میرے بھائیو!۔ اللہ نے ارادہ کیا کہ کائنات کو پیدا کرے تو اس نے کائنات کو پیدا کرنے میں ہم مسلمانوں کے اعتقاد کے مطابق۔ اس کے دلائل کے لئے اس وقت وقت نہیں

چونکہ سب مسلمان مانتے ہیں اول مخلوق جو پیدا کی — وہ تھا نورِ حضورِ سرورِ کائناتؐ
 کیوں مسلمانو! ہمارا یہ ایمان ہے یا نہیں؟ ہم مانتے ہیں یا نہیں — اول مخلوق — پہلی
 شے جو اللہ نے بنائی — سب سے پہلے جو بنایا — وہ تھا حضورِ رسالت مآبؐ کا
 نور — سمجھے نا حضورؐ؟ اور جب نورِ حضورؐ کائنات بنا دیا نا — تو اس کیلئے
 گوارا نہ کیا کہ میں بھی اکیلا اور بنا ہوا بھی رہے اکیلا — لہذا اسے کے چاروں طرف
 چار چاند لگا دیئے — تاکہ یہ چار، پانچ ہو جائیں — میں اکیلا رہوں۔
 اب جب یہ چار پانچ ہو گئے تو اور ترقی کی — انہیں بارہ چودہ بنا دیا۔ جب بارہ
 چودہ بن گئے تو اللہ نے ایک یونیورسٹی کھول دی کہ یہاں بیٹھ کے کیا کرو گے۔
 یونیورسٹی کھل جائے — تم تعلیم دیا کرو — تم پڑھایا کرو — اور ایک لاکھ
 چوبیس ہزار طالب علم اس یونیورسٹی میں داخل کر دیئے — اور محمدؐ ہو گئے اس کے
 وائس چانسلر — اور بارہ چودہ ہو گئے پروفیسر اور ایک لاکھ چوبیس ہزار پڑھنے
 بیٹھ گئے — جو طالب علم پاس ہوتا رہا، ڈگری ملتی رہی عہدہ لے کے آتا رہا —
 کسی کو زمین پہ پانی بہانا سکھا دیا اور آگیا — کسی کو آگ کو گلزار بنانا سکھا دیا اور آ
 گیا — کسی کو وائس پربت کرنے کا طریقہ سکھا کر کلیم بنانا سکھا دیا اور آگیا — کسی کو
 موت سے ٹھکر لے کے ہمیشہ جینا سکھا دیا اور آگیا — غرض اپنا اپنا پڑھ کے سارے
 شاگرد آتے رہے — تو جو ہے نا صاحبان — جب ایک لاکھ چوبیس ہزار ہو کے
 آگئے اور سب اپنا اپنا کام کر گئے تو اللہ نے اساتذہ کرام کی طرف دیکھا — جو چودہ
 پڑھانے والے تھے اور جوان کے راس و رئیس تھے — حضور محمد مصطفیٰؐ — ان کی
 طرف دیکھا — اور دیکھ کے یہ کہا ہوگا — ہوگا لفظ یاد رکھنا — یہ ہوگا
 لفظ میں آپ کے ڈر کے مارے کہہ رہا ہوں — کہیں بوچھنے لگو کہ یہ کس کتاب
 میں لکھا ہے — کتاب میں نہیں، یہ میرے دل کی کتاب میں لکھا ہے — یہ کہا ہوگا۔

— محمد سنتے بھی ہو — شاگرد تو اپنا اپنا کام کر کے چلے گئے۔ اب
 اگر مناسب سمجھیں تو آپ خود چلے جائیں ذرا — کیوں کیا خیال ہے؟ جاؤ گے؟ جانا
 ہے؟ کیوں محمد جاؤ گے؟ جانا ہے؟ ہیں؟ کیا بات ہے؟ جاؤ گے؟ دیکھو محمد
 سنو، اگر باقی بیویوں کی طرح تم بھی مرنے تو حکماً بھجیتا — جاؤ — محبوب جو ہوتے
 — اس لئے پوچھتا ہوں — جانا ہے؟ جاؤ گے؟ کیا خیال ہے؟ جانا ہے؟
 اچھا جا رہے ہو — بسم اللہ تشریف لے جاؤ — بہت اچھا تمہاری مرضی
 ہم تو تمہاری مرضی دیکھتے ہیں — چلے جاؤ — میں؟ مگر کیا؟ تم تو اداس ہو گئے
 — محمد اداس نہ ہو — اگر وہاں کبھی دل گھبرا جائے تو مل جایا کرنا — جاؤ؟
 پوچھا جا کے اب کریں کیا — کہ اب جا کے — اب تک جو سوال کھ پڑے تھے وہ
 پرانی یونیورسٹی میں پڑھے تھے — تم سب سے جا کے — ایک جنگل میں بالکل ریگستان
 میں نیوکیمپس قائم کر دینا — بالکل نئی یونیورسٹی قائم کر دینا — اب کے ایک بالکل نئی
 یونیورسٹی قائم ہو جائے نیوکیمپس بن جائے — دنیا بھی کیا یاد کرے گی کہ پڑھنے کا طرز بدل
 گیا — انداز بدل گیا — بالکل نیوکیمپس قائم کر دو وہاں جا کے — سمجھے
 — بہت اچھا — تم اس یونیورسٹی کے ہو گے اپنا راج اور آگے طلبہ تمہارے
 آئیں گے — انہیں پڑھایا کرنا — بالکل نیوکیمپس قائم کر دینا وہاں جا کے —
 بہت اچھا — اب چلے وہاں سے — جا رہے ہو؟ کہ ہاں — اور یہ
 نعل میں کیا ہے؟ کہ یہ میری کتاب ہے — اسے پڑھ پڑھ کے دنیا کو پڑھاؤں گا
 یونیورسٹی میں — اچھا تم ایک کام کرو — کتاب یہیں چھوڑ جاؤ — تم خود
 جاؤ — کہ اگر کتاب یہاں رہ گئی تو وہاں پڑھاؤں گا کیا — کہ واد محمد —
 لو اتنی بات بھی تم مجھ سے پوچھتے ہو — دیکھو جب بڑے آدمیوں کے بچے گھر سے
 کالج آتے ہیں تو ان کی نعل میں بستے نہیں ہوتے — ان کے نوکر پیچھے بستہ لے کر آتے

ہیں۔۔۔۔۔ آپ تشریف لے چلیں۔ آپ کی یہ کتاب آپ کا نوکر جبرائیل لے کر حاضر ہو گا۔۔۔۔۔ آپ تشریف لے چلیں کتاب دہ لے کر آئے گا۔۔۔۔۔ جا میں آپ اور دیکھو ایک بات سنو۔۔۔۔۔ جہاں میں تمہیں بھیج رہا ہوں نا، وہاں جس جاسوس نے بنا کے۔۔۔۔۔ وہاں جا کے بالکل نہ چڑھنا۔۔۔۔۔ وہاں پر صوفیوں کے تو میری بی بی بائی بات بگڑے جاتے تھی۔۔۔۔۔ کہوں، بچو۔۔۔۔۔ تم مجھے ایک بات بتاؤ۔۔۔۔۔ تم جو مجھے لائبریری سے لائے ہو کار میں تھا کہ بڑی عزت مند سے اور مجھ سے کہا۔۔۔۔۔ زید صاحب ایک تقریر کر دو۔۔۔۔۔ اب زید صاحب کھڑے ہوئے یہاں تقریر کرنے۔۔۔۔۔ جیب میں سے نکال سکے لکھنے سے بڑھنا شروع کر دیا۔۔۔۔۔ اپنے کہ لبسم اللہ۔۔۔۔۔ کتاب کھول کر دیکھتے ہو۔۔۔۔۔ ہاتھ سے ٹھہرنے کا اشارہ۔۔۔۔۔ زید صاحب نے ہاتھ سے لکھنا شروع کر دیا۔۔۔۔۔ ہاتھ سے ٹھہرنے کا اشارہ۔۔۔۔۔ اے صاحب پڑھو نا کچھ۔۔۔۔۔ تیسری تقریر میں طرح طرح کی کتاب پر ابو ہانوفہ سے ٹھہرنے کا اشارہ۔۔۔۔۔ دیکھو زید صاحب پڑھنا شروع کر دیں۔۔۔۔۔ سارے لڑکے اٹھ کر چلے گئے۔۔۔۔۔ جھکی کیوں پیسے گئے۔۔۔۔۔ کہ اس پاگل مولوی کو کون مانے جو یہاں آئے بیٹے۔۔۔۔۔ اب وقت بڑا جلدی ملدی تھو رہا ہے اور اشارہ کا وقت قریب آ جا رہا ہے۔۔۔۔۔ اسی لئے یہ بات غصہ کرتا ہوں۔۔۔۔۔ بہر حال یہاں آ کے مکتب کھول لیا۔۔۔۔۔ دیکھو یوں کر دو۔۔۔۔۔ پیسے زیادہ غائب ہو کر نہ کرنا۔۔۔۔۔ خورکی سی کوسس رکھنا۔۔۔۔۔ اپنے گھر والوں کو چھپے بیچ کر دو۔۔۔۔۔ پیسے ان سے تعلیم شروع کر دو۔۔۔۔۔ جیب دیکھو وہاں سے پھر اور تمام سے بات کرنا۔۔۔۔۔ اندر چلے جاؤ۔۔۔۔۔ اگلا تقریریں۔۔۔۔۔ پہلے بالکل اپنے انزب آگئے کہ وہ قریب دار۔۔۔۔۔ پھر اندرون سے بات کرنا۔۔۔۔۔ جیب اپنا ہونا نہ کہیں میں اپنی کلاس میں طالب علموں کو کھلی۔۔۔۔۔ جو رسول کے اپنے گھر والے تھے۔۔۔۔۔ وہ آگے بیٹھ گئے جناب بیٹھنے کے لئے۔۔۔۔۔ اسی پر میں دستان کھینا

نہیں — طالب علمی میں سن و سال نہیں دیکھا جاتا — پڑھنے کے شوق میں بچہ بھی پڑھ سکتا ہے — بوڑھا بھی پڑھ سکتا ہے — یہ اور بات ہے کہ بچے کا ذہن تیز ہوتا ہے — اب مجھے اتنا اچھا یاد نہیں ہو سکتا جتنا تمہیں یاد ہو سکتا ہے —

تو جناب اس میں رسول مہکاسارا خاندان اکٹھا ہو کے بیٹھ گیا — چالیس آدمی بیٹھ گئے — بھئی یہیں بیویوں بلایا ہے — کہ میں نے ایک نئی تعلیم گاہ قائم کی ہے — میں اس میں درس دینا چاہتا ہوں — اگر میرا علم تم نے پڑھ لیا اور سمجھ گئے آسے تو ساری دنیا کی حکومت تمہارے قدموں میں ہوگی اور عاقبت کی نجات تمہارے پاس ہوگی — میں ایسی چیز تمہیں بتانے کے لئے آیا ہوں — کہ اچھا بتاؤ — تو میرے محترم سامعین — اللہ تمہیں سلامت رکھے — محمد مصطفیٰ جیہ معلم اعظم اور اس کی پہلی کلاس — پہلی کلاس میں اتنے بڑے معلم کی تقریر — پہلی گفتگو — تمام طلبہ گوشِ بوش کھولے بیٹھے تھے سننے کے لئے کہ دیکھیں کیا کہتا ہے — مگر معلم اتنا عالمگیر معلم تھا کہ وہ صرف اس جامعیت کا معلم نہیں تھا بلکہ عالمین کا معلم تھا — عالم کی ہر شے کا معلم تھا — اُدھر اس نے تقریر کرنے کے لئے گلا صاف کیا — ...

ہم کچھ کہنا چاہتے ہیں — اُدھر اس نے کہا ہم کچھ کہنا چاہتے ہیں — اُدھر کائنات کی ہر شے سراپا گوش بن گئی سننے کے لئے — سمجھے نا حضور؟ درختوں کا بھی پتہ کان ہو گیا سننے کے لئے — ہر ذرہ دوش ہوا پہ سوار ہو گیا سننے کے لئے — فلک نے ستاروں کی بینک لگالی سننے کے لئے — چلتا ہوا سورج ٹھہر گیا سننے کے لئے — چاند کے سینے پہ داغ پڑ گیا سننے کے لئے — سوا لاکھ انبیاء آسمانِ اول پہ اتر آئے سننے کے لئے — اللہ نے کہا — ما شاء اللہ — قدرت نے کہا — سبحان اللہ — فطرت نے کہا — بسم اللہ — اور محمدؐ نے تقریر شروع کی زلفِ الہام کو شانہ ہونے لگا — شہسپہ جبریلؑ کو جنبش ہونے لگی — اور تقریر میں

فرمایا کہ میں تمہارے لئے خیرِ دنیا اور آخرت لے کے آیا ہوں۔ بولو ایسا کون
 شاگرد ہے جو میرے علم کو اچھی طرح سمجھ کر اس معاملے میں میرا ساتھ دے اور میرے
 بعد میری درسگاہ کا پرئسپل بنے۔ بولو کون ہے؟ بس ادھر اعلان ہوا
 خیرِ دنیا اور آخرت کا پیغام لایا ہوں۔ چالیس کے چالیس سامعین
 خاموش بیٹھے رہے۔ مگر۔۔۔ دنیا کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ عالم کی
 چلتی ہوئی نبضیں ٹرک گئیں۔ جب رسول کی آواز پر لپک کپنے کے لئے کونے
 سے ایک دس سال کا بچہ اٹھا۔ سمجھے نا حضور؟ پوری بچین کی ادا۔ پیروں پر
 مٹی پڑی ہوئی۔ کُرتے کے ٹن کھلے ہوئے۔ جیبوں میں خرے بھرے ہوئے
 پوری بچین کی ادا سے کونے سے ایک بچہ اٹھا۔ قبضہ ذرا اب کے فرماؤ کیا کہا
 ہے؟۔۔۔ اب کے فرماؤ اس نے کہا تھا کہ کام تو بچے ہی کریں گے آپ کا۔ قربانی
 دیں گے۔ مرثیوں گے۔ مگر پہلے ہیں سمجھا دیں کہ چاہتے کیا ہیں؟ بے سمجھے بوجھے
 ساتھ ہر لینا عقلمندوں کا کام نہیں۔ پہلے ہم سمجھ لیں کہ کیا کہہ رہے ہو۔ ہاں
 سمجھ ہی بھی تو آجائے آپ چاہتے کیا ہیں۔ ہاں حضور ذرا اب کے فرمائیں آپ چاہتے
 کیا ہیں؟ کہ بیٹا، بچے، برنخوار۔۔۔ میں یہ کہہ رہا ہوں کہ کون ہے جو اس معاملے میں
 میرا ساتھ دے گا۔ بس یہ کہنا تھا کہ کون ساتھ دے گا۔ بچے نے ایڑیاں اٹھا
 کے کہا۔۔۔ انا ناصر حرکت یا رسول اللہ۔۔۔ اے اللہ کے رسول میں تیرا ناصر
 ہوں۔ میں تیری مدد کروں گا۔ ”بیٹا۔۔۔ یہ بچوں کا کھیل نہیں“ قبضہ میں جان
 یہ کھیل کے کہہ رہا ہوں۔۔۔ خبیثا یہ بڑا مشکل کام ہے۔ کہ۔۔۔ ”والیجاہ۔۔۔ میں
 مشکل کشا جو ہوا۔۔۔ مشکل کام سمجھ کے کہہ رہا ہوں کہ میں تیرا ساتھ دوں گا۔
 یا محمد نہیں۔۔۔ اگر یا محمد کہہ کے وعدہ کرتا تو زندگی بھر وعدہ تھا۔
 یا رسول اللہ میں تیری نصرت کروں گا۔“ گویا جب تک تیری رسالت ہے، میری

نصرت ہے۔ جہاں جہاں تیری رسالت ہے، وہاں وہاں میری نصرت ہوگی
 میں نیرے ساتھ کیا ہوا وعدہ پورا کروں گا۔ گویا آج سے دُنیا متعارف ہوئی علی
 ہے۔ وہ چالیس آدمیوں کا مجمع جو رسول کی تقریر سن رہا تھا اس بچے کی طرف دیکھ رہا
 رسولؐ نے مسکرا کر کہا ”میں بھی یہی چاہتا تھا۔ کہ مجھ سے نظر اٹھ کر اس پر آئے
 اُسکے۔“ دیکھو یہ بچہ کہتا ہے۔۔۔ آج طلبہ بچے۔۔۔ طلبہ علم بچے۔ اس
 بچے کی تقلید میں جس نے معلم اعظم کے فرمان پر وعدہ کیا تھا۔ میں تیرا ساتھ دوں گا۔
 آزاد اس کا ذکر کرنے کے لئے نئے کمپیس میں بچے بٹھے ہیں۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ
 اس دس سالہ بچے نے جو وعدہ کیا تھا کہ تیری تعلیم پر میں عمل کروں گا۔ آج اس نے کس کس
 طرح عمل کیا ہے۔ کہیں عمل میں نسیں تو نہیں ہوا۔ کہیں عمل میں بچہ کیا تو نہیں۔ کہیں عمل
 میں گھبراہٹ تو نہیں۔ کہیں عمل میں پریشان تو نہیں ہو۔ اس کو کس وقت نصرت اتنا
 کہ ساری چیزیں بیان کی جائیں۔ اور وقت ہو بھی اتنا تو وقت ختم ہو جائے امام وقت
 کا ذکر ختم نہیں ہوگا۔ یہ وقت اس قابل ہی نہیں کہ اس کو تنہا کے اپنے اندر سمجھے۔
 ہاں یہ اور بات ہے کہ کبھی وجد میں آکر اس کا ذکر سننے کے لئے گیا ہوا سورج پلٹ کے
 آجائے۔ یہ بات اور ہے۔ درنہ یہ وقت ختم ہو جائے گا۔ ذکر ختم نہیں ہوگا۔
 وعدہ کر لیا اس نے کہ میں آپ کی تعلیم پر عمل کروں گا۔ اور قیامت تک مسلمان بچوں کو سبق
 دے گیا کہ مسلمان بچو!۔ اپنے معلم کی بات کو اچھی طرح سمجھو۔ اپنے بزرگ کی
 بات کو اچھی طرح سمجھو۔ جو وہ تم سے کام لینا چاہتا ہے اسے اچھی طرح سے سمجھ
 لو۔ اس کے ہر پہلو پر غور کرو۔ اس کو اچھے طریقے سے اپنے دہن میں بٹھا
 لو۔ اور جب تمہاری سمجھ میں آجائے تو آنکھیں بند کر کے نہیں۔ سوچ کے
 سمجھ کے غور کر کے۔ پھر اس سے وعدہ کرو تو عمل میں رکاوٹ نہ ہونے پائے
 عمل میں بچہ کیا ہٹ نہ ہونے پائے۔ عمل میں بچہ رکنا نہیں۔ پھر عمل اس

طرح کرو آنکھیں بند کر کے کہ دنیا حیران رہ جائے۔۔۔۔۔ کہ اس طرح عمل کیا جاتا ہے۔۔۔۔۔
لوہو ایک بات اور پھر بات ختم۔۔۔۔۔ وقت گزر جائے گا اور میں بیٹھ جاؤں گا۔۔۔۔۔
وعدہ کیا ناعمل کا؟ تو اس طرح آنکھیں بند کر کے عمل کیا۔۔۔۔۔ جب سمجھ گیا تھا تعلیم
کیا ہے۔۔۔۔۔ جب سمجھ گیا تھا کہ اس کا مقصد کیا ہے۔ جب سمجھ گیا تھا کہ وہ اس سے
منوانا کیا چاہتا ہے۔۔۔۔۔ یہ سوچ سمجھ کر وعدہ کیا تھا تو عمل اس طرح کیا بجائیو۔۔۔۔۔
بچو سن رہے ہو بات کو؟ سن رہے ہو؟ کئی بات ہے؟ شاہنشاہ سن رہے
ہیں بڑے غور سے بچے۔۔۔۔۔ یہ بھی اتفاق کی بات ہے کہ ایک سفید دارھی والے کی
بات کو فوجوان سن رہے ہیں۔۔۔۔۔ نہیں تو دُزین مرتبہ میرے ساتھ ایسا اتفاق ہوا ہے
جب میں تم جیسے لڑکوں میں چلا گیا تقریر کرنے۔۔۔۔۔ تو ان بچوں نے کہا ”بابا ہم وی جا۔۔۔۔۔
کیسے بندے نوں گل کون دے۔۔۔۔۔ یہ تو اتفاق ایسا ہے کہ تم میری بات سن رہے ہو۔۔۔۔۔
آج تم نے مجھے بندہ سمجھ لیا ہے۔۔۔۔۔ سوچ سمجھ کے جب وعدہ کیا کہ میں تیری نصرت کروں گا۔۔۔۔۔
اس کے ہر مع لہو اور ماعلیہ پر نظر ڈال کے وعدہ کیا کہ میں تیری نصرت کروں گا۔۔۔۔۔
یونہی اندھی تقلید نہیں۔۔۔۔۔ آنکھیں بند کر کے نہیں۔۔۔۔۔ یونہی ساتھ دوڑ پڑے والی بات
نہیں۔۔۔۔۔ سوچ سمجھ کے وعدہ کیا تھا میں تیری نصرت کروں گا۔۔۔۔۔ اس سمجھ کے
وعدے کا اثر یہ تھا کہ اس وعدے کے تیرہ سال بعد جبکہ رسولؐ کا سن ۵۳ ہے تیرہ سال
کا۔۔۔۔۔ کیا سن ہے رسولؐ کا بھئی؟ تیرہ سال کا۔۔۔۔۔ کیوں بھئی تیرہ سال کا سن
پختہ عمر ہے یا نہیں؟ ہیں؟ تجربے کی عمر ہے یا نہیں؟ دنیا کا سب کچھ، جہانِ دیدگی پوری
ہے یا نہیں؟ تیرہ سال کا رسولؐ شام کے وقت اپنے گھر کے اندر کھڑے ہو کر یہ کہہ
رہا ہے ایک ایس سال کے فوئیز فوجوان سے۔۔۔۔۔ جتنے اس محفل میں اٹھارہ ایس سال
کے فوجوان ہیں وہ میری بات غور سے سنیں۔۔۔۔۔ ایک اٹھارہ ایس سال کے فوجوان
سے، تیرہ سال کا رسولؐ کہہ رہا ہے یہ، کھڑا ہو کے۔۔۔۔۔ بیٹا، برخوردار آج میرے

گھر میں خطرہ ہے۔ بڑا سخت خطرہ ہے۔ تو بتاؤ بچو جب گھر کا بزرگ خطرہ
 بتائے تو بچے کے دل پر کیا گذرے گی۔ ہیں؟۔۔۔ وہ بھی ڈرا ہو گا یا نہیں؟
 وہ بھی گھبرایا ہو گا یا نہیں۔ خطرہ ہے قبلہ۔۔۔ اور جب اتنا تجربہ کار بزرگ
 کہہ رہا ہے خطرہ ہے تو بچہ بھی گھبرایا ہو گا۔ اس اُنیس سالہ بچے نے گھر کے پوچھا
 ۔۔۔ قبلہ خطرہ ہے؟۔۔۔ کہ اُن بیٹا خطرہ ہے۔ واقعی خطرہ ہے؟۔۔۔ کہ بہت
 ہی خطرہ ہے۔ خطرہ ہے؟۔۔۔ کہ یقیناً خطرہ ہے۔ پھر قبلہ کیا پروگرام
 ہو گا۔۔۔ میں گھر چھوڑ کے جا رہا ہوں۔ کیوں؟۔۔۔ خطرہ ہے۔ اچھا
 قبلہ، میں کیا کروں؟ کہ تم یہیں رہو۔ کیوں؟۔۔۔ خطرہ ہے۔ سمجھے آپ
 اب بتاؤ بچو۔۔۔ اگر وہ لڑکا یہ کہہ دے کہ میں تو نہیں رہتا۔ تو کسی اخلاقی ضابطہ
 میں اس کا یہ انکار کرنا بڑی بات ہے؟ وہ کہہ سکتا ہے یا نہیں کہ جب خطرہ ہے
 تو میں بھی نہیں رہتا۔ مگر دنیا حیران ہو گئی یہ سن کے جب اس بچے نے کہا کہ
 خطرہ ہے؟ کہ اُن بہت خطرہ ہے۔ پھر۔۔۔ کہ میں جا رہا ہوں۔۔۔
 اور میں! کہ تم یہیں رہو۔ کہ اچھا میں یہیں ہوں۔ آپ جائیں۔۔۔
 خطرہ۔ خطرہ ہے۔ تو ہوا کرے۔ میں یہیں ہوں۔ حیرت میں آگئی ساری
 دنیا کہ یہ بچہ کیا کہہ رہا ہے؟ تو اسے اس وقت یہ بتایا گیا کہ اس نے سوچ سمجھ کر وعدہ
 کیا تھا۔ نفرت کا۔۔۔ اس لئے یہ کہہ رہا ہے۔ کہ میں یہیں رہوں گا۔۔۔
 رسول جانے لگے تو اس بچے سے کہتے ہیں کہ بیٹا گھر میں خطرہ ہے۔ خطرہ بڑا
 ہے۔۔۔ بہت ہی خطرہ ہے۔ لہذا چو کس نہ رہنا۔ کیوں؟ خطرہ ہے
 ہوشیار نہ رہنا۔ کیوں؟۔۔۔ خطرہ ہے۔ خبردار نہ رہنا۔ کیوں؟
 خطرہ ہے۔ بے خبر سو جانا۔ کیوں؟ خطرہ ہے۔ ہے نا عجیب بات
 بالکل بے خبر سو جانا۔ اس لئے کہ خطرہ ہے۔ سمجھے حضور۔۔۔

اس نے کہا لیجئے قہد میں سو گیا۔ اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ کہ ٹھہر دو تمہارے
 بستر پر خطرہ نہیں۔ میرے بستر پر لیٹو کہ خطرہ یہاں ہے۔ اب
 خطرے کا مرکز سٹ کے بستر پر گیا تھا۔ یہاں لیٹو۔ وہاں لیٹ گیا۔
 یہاں سو جاؤں؟ کہ نہیں ایسے نہیں۔ اگر میرے بستر پر تم، تم ہو کے سوئے
 تو خطرہ نہیں۔ میرے بستر پر تم، ہم بن کے سوؤ۔ ہیں؟ لیٹو۔ لٹایا
 اپنی چادر اوڑھادی۔ اپنے عاتق سرانے رکھ دیا۔ اپنے نعلین قریب
 قریب رکھ دیئے۔ اپنی تلوار پاس رکھ دی۔ تاکہ دیکھنے والے، سونے والے
 کو جانے والا سمجھیں۔ ہیں۔ سو جاؤ۔ سو گئے؟ سو گئے۔ صبح تک
 کروٹ نہیں لی بستر کی سلوٹ گواہ ہے۔ اسی طرح آرام سے سوتا رہا۔ ساری
 رات سوتا رہا۔ یہ ہے سوخ سمجھ کر کسی اسکیم کو۔ پھر اس پر نصرت کا
 وعدہ کرنے کا نتیجہ۔ بے سوچے سمجھے، بغیر سوچے ہوئے وعدہ کر لینے سے
 یہ استقامت پیدا نہیں ہوتی۔ خوب سمجھ لو کہ ہم نے کیا کام کرنا ہے
 پھر وعدہ کرو تو اتنا پکا وعدہ کرو۔ سو گیا آرام کے ساتھ۔ سو گیا یا نہیں؟
 اور اللہ نے کیا کیا۔ رات کو سوتا دیکھ کر اللہ نے۔ لوجی یہ آخری فقرے
 سوتا دیکھ کر اللہ نے۔ کیوں بچو اللہ بھی کبھی سوتا ہے۔ ہیں؟ نہیں
 سوتا !!! اے لو۔ اللہ تو کبھی سوتا ہی نہیں۔ کبھی نہ سونے والے نے آج
 کا سونا جو دیکھا۔ تو اس نے کہا محمد یہ بڑا کھرا سوتا ہے۔ بڑا بہترین سوتا
 ہے۔ میں نے اسے پرکھ کے دیکھا ہے۔ بہت ہی بہترین سوتا ہے۔ اس
 میں کوئی غیل و غش نہیں۔ یہ سونا میں خرید لوں؟ یہ سونا میں خرید لوں۔
 محمد۔ تم درمیانی بن کے یہ سونا مجھے خریدو دادو۔ محمد تمہیں کہیں اور۔
 سونے والا تھا کہیں اور۔ وہیں سے آواز دی۔ سونے والے۔

کہ جناب عالی! — دہی سوتے میں کہا — سونے والے — ماں کیا ہے؟
 — سونا بیچتے ہو؟ — ”جی ہاں“ — ”کیا لوگے؟“ — ”قبلہ کیا دو گے؟“ —
 خریدنا کون ہے؟ کہ کبھی نہ سونے والا اللہ خرید رہے — اچھا! — اللہ خرید
 ہے؟ — — پھر بیچتے ہو؟ کہ بیچتا ہوں — کیا قیمت لوگے؟ کہ قبلہ ہات سنو۔
 جب اللہ جیسا خریدار ہو تو قیمت پہ جھگڑا کرنا خلاف تہذیب ہے — اللہ سے کہو
 کہ سونا میرا حاضر ہے، قیمت میں جو اس کی مرضی ہے وہ دیدے — جو مرضی
 ہے دیدے — بس مرضی قیمت ہے — سونا حاضر ہے — اللہ نے کہا
 — منظور — سودا ہو گیا — کہ قبلہ یہ مرضی ملے گی کب؟ کہ قیامت میں
 — قیامت کا ادھار؟ — بیعانہ مل جائے تاکہ سودا پٹکا ہو جائے — اللہ نے
 بیعانے میں جنت دے دی — جنت تیری قیمت نہیں — یہ بیعانہ ہے —
 جنت پہ قبضہ کر لیا — سمجھے نا حضور — ہوئی جو شادی تو وہی جنت — جو اس
 دن بیعانے میں ملی تھی — منہ دکھائی میں بیوی کو دے دی — خریدی تھی شوہر نے
 — خاتونِ جنت کہلاتی ہے بیوی — بیوی نے بچوں کے نام کر دی — رسول
 نے رحبطی کر دی — انتقال کی — الحسن والحسین سید
 شہابِ اہل الجنة — باپ نے خریدی — ماں ملکہ نبی — حسنین
 مالک بنے — بقول شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے اللہ نے جنت کے صدر دروازے
 پر یہ نام لکھ کر لگا دیئے — محمد، علی، فاطمہ، حسن، حسین
 انشاء اللہ — نیو کمپس کے نوجوانو! — تم چلنا جنت میں — چلو گے یا
 نہیں؟ ہیں؟ جاؤ گے نا؟ — (آوازیں انشاء اللہ) — انشاء اللہ کی کیا بات
 ہے — جائیں گے — وہاں ضرور جانا ہے — وہاں جاؤ گے — مجھے بھی
 آواز دے لینا — سواد آ جائے گا — جب دروازے پر یہ نام لکھے دیکھیں

گئے نہ۔۔۔ اگر کسی فرشتے نے روکا بھی تو کہہ دینا "فرشتے ہٹ جا ہمارا وقت ضائع نہ کر۔۔۔ یہ نام نہیں دیکھتا۔۔۔ اندر تو محفل ہو رہی ہوگی۔۔۔ زیدی تقریر کر رہا ہوگا۔۔۔ چلو چلیں اللہ"۔۔۔ انشاء اللہ یہ نام دیکھ کے ہم فوراً پہنچ جائیں گے۔۔۔

تمہاری محفلوں کو اللہ قبول کرے۔۔۔ تمہارے اندر تقویت دین عطا فرمائے۔۔۔ دینی محفلیں منعقد کرنے کا تم میں شوق اور شعور پیدا کرے۔۔۔ جب کوئی دینی محفل منعقد کیا کرو اگر میری صحت ٹھیک ہو تو مجھے ضرور بلایا کرو۔۔۔ آج تو بیماری کے عالم میں، میں نے چند منٹ آپ سے باتیں کر لی ہیں۔۔۔ مجھے بلایا کرو ضرور۔۔۔ خدا تمہیں خوش رکھے۔۔۔ اللہ تمہیں سلامت رکھے۔۔۔ خوب سونچ کے سمجھ کے۔۔۔ غور کر کے۔۔۔ ذہن میں بٹھا کے۔۔۔ ہر پہلو اور نشیب و فراز کو دیکھ کر جو عزم کر لو پھر اس پر بنیان مرصوص کی طرح جم جاؤ سمجھے؟ بے سوچے سمجھے قدم اٹھانا۔۔۔ حیدری جوانوں کی شان نہیں ہے۔۔۔ اللہ تمہیں سلامت رکھے۔۔۔ خدا تمہیں خوش رکھے۔۔۔ خدا حافظ۔۔۔ فی امان اللہ۔۔۔

(۲۳ رمضان المبارک ۱۴۲۶ھ۔ ایس۔ ٹی۔ سی نیو کمپس، پنجاب یونیورسٹی، لاہور کے

طلبا سے خطاب)

تہذیب موروثیہ عنوان

فضل
مصائب
موت حیات
ہم سوسے ہائے

کبھی گزرا ہوں بعد کے بازاروں
لاشیں روم کے ابھرنے لگیں دیواروں

سید جعفر علی

مترجم سامعین! جب سے دنیا بنی ہے اور جب تک۔۔۔ دنیا رہے گی، اس آسمان کے نیچے۔۔۔ اس زمین کے اوپر، حسین جیسا کوئی شہنشاہ ہوا نہ ہوگا۔۔۔ یہ سب بڑا شہنشاہ ہے جس کا سینے کا نام ہے۔۔۔ سب سے بڑا بادشاہ ہے جس کا حسین نام ہے۔۔۔ اگر آپ یہ کہیں کہ ہمارے باقی آثار بھی بادشاہ تھے۔۔۔ باقی رسول بھی بادشاہ تھے، تو انہیں بادشاہت یا حکومت اللہ نے ازراہِ کرم عطا فرمائی تھی اور حسین نے شہنشاہی قیمت دے کر لی تھی۔۔۔ اُس نے کسی کا احسان نہیں رکھا۔۔۔ اُس نے ہر شے کی قیمت ادا کر لی ہے۔۔۔ دنیا کا سب سے بڑا شہنشاہ ہے حسین۔۔۔ سب سے بڑا بے مثل بندہ ہے حسین سب سے بڑا بے نظیر بندہ ہے حسین۔۔۔ مجھے بناؤ سامعین کرام۔۔۔ تم مجھے بتاتے رہو میں بولتا رہوں۔۔۔ یہ بتاؤ کہ حسین کا نام تمام رسولوں میں بے مثل ہے کہ نہیں؟ بولو جی؟ بے مثل ہے۔۔۔ تمام رسولوں میں حسین کا نام بے مثل ہے۔۔۔ اور تمام دیوبوں میں حسین کا باپ، بولو جی؟ بے مثل ہے۔۔۔ اور تمام دنیا کی عورتوں میں حسین کی ماں بے مثل ہے۔۔۔ اور ساری دنیا کے بھائیوں میں حسین کا بھائی حسن؟ بولو جی؟ بے مثل ہے۔۔۔ اور ذرا سٹخ کے بتانا۔۔۔ ساری دنیا کی بہنوں میں حسین کی بہن بولو جی۔۔۔ بے مثل ہے۔۔۔ دنیا بھر کے بیٹوں میں حسین کے بیٹے؟ بے مثل۔۔۔ دنیا بھر کے شیرخواروں میں حسین کا شیرخوار؟ دنیا بھر کی بیٹیوں میں حسین کی بیٹی؟۔۔۔ دنیا بھر کی فوجوں میں حسین کی فوج؟۔۔۔ دنیا بھر کے دوستوں میں حسین کے دوست؟۔۔۔ دنیا بھر کے دشمنوں میں حسین کے دشمن؟ بولو جی؟ بے مثل ہے یا نہیں؟ حسین کی ساری زندگی بے مثل ہے، حسین کی موت بے مثل ہے، حسین کی نماز بے مثل

ہے۔ حسین کی یادگار بے مثل ہے۔ حسین کا یہ دربار بے مثل ہے؛ جہاں آئی
 بے مثالیاں اکٹھی ہو جائیں اس بندے کے لئے بے تکلف کہہ دو۔ حسین کیسے
 مکشلمہ شیئی تو وہ انسان ہے کہ تیری مثل کہیں ہے ہی نہیں؛ نہ اللہ کی کہیں مثل
 ہے، نہ حسین کی کہیں مثل ہے۔ اس کی اللہ ہونے میں مثل نہیں، اس کی بندہ ہونے
 میں مثل نہیں۔ ایسے بے مثل شہنشاہ کے دربار میں تم آ کے بیٹھے ہو۔ تم بڑے
 خوش نصیب ہو کہ اتنے بڑے شہنشاہ اعظم کے دربار میں آئے۔ اللہ تمہیں سلامت
 رکھے، خدا تمہیں خوش رکھے۔ اللہ تمہارے آئے کو قبول فرمائے۔ اب
 میں تمہیں بتاؤں اور عرض کر دوں، حسین کی شہنشاہی کی۔ حسین کے دربار
 میں آنے کی۔ حسین کی خدمت میں پہنچنے کی۔ دیکھو بھائیو۔ دیکھو عزیزو
 ۔ کہو میں حسین سے محبت ہے۔ ہے؟ میں؟ ہے؟ نا؟ حسین سے محبت
 ضرور ہے۔ آپ کو حسین سے محبت ہے۔ یقیناً ہے۔ آپ نے کیوں کی ہے
 یہ محبت حسین سے۔ بولو بھئی۔ یہ حسین سے محبت آپ نے کیوں کی ہے اس کا
 جواب دو مجھے۔ ہم نے کی نہیں محبت۔ محبت کی نہیں جاتی۔ محبت ہو
 جاتی ہے۔ ہمیں حسین سے محبت ہو گئی ہے۔ ہم نے کی نہیں ہے۔ اس نے
 کہ حسین بندہ ہی ایسا ہے کہ اس سے محبت ہو جائے۔ اس سے ہمیں محبت ہو گئی ہے
 ۔ ہے نا حسین سے محبت۔ کیوں بھی ہے حسین سے محبت؟ آج اس
 کی محبت کا یہ اثر ہے کہ لاہور شہر میں ایک مرد مرگ حسین کے نام پر رگ ہوئی ہے۔
 رگ ہوئی ہے یا نہیں؟ پولیس کھڑی ہے۔ ادھر بھی، ادھر بھی۔ میں آیا تو
 میں نے دیکھا ادھر بھی پولیس کھڑی تھی، ادھر بھی پولیس کھڑی تھی۔ میں نے پوچھا
 پولیس کے جوانو؟ کیوں کھڑے ہو؟ یہاں کیوں ٹھہرے ہوئے ہو؟ کہ جیسی آج حسین کا دربار
 لگا ہوا ہے۔ ہم اس انتظام کے لئے کھڑے ہیں کہ کوئی خرابی پیدا کرنے والا نہ آجائے

کوئی گڑبڑ کرنے والا نہ آجائے۔ بس پولیس نے مجھے یہ بیان کیا اور وہیں مجلس ہوگئی کہ۔۔۔ واہ اے حسین۔۔۔ واہ۔۔۔ آج پولیس اس لئے کھڑی ہے کہ تیرے دربار میں بد نظمی نہ ہو اور ایک دن پولیس اس لئے کھڑی تھی دربار میں کہ بازار دالو آؤ آج حسین کی بہن آرہی ہے۔۔۔ بازار دالو۔۔۔ آؤ۔۔۔ دیکھو حسین کا کنبہ آ رہا ہے۔ اُس دن بھی پولیس بازار میں تھی۔۔۔ آج بھی پولیس بازار میں ہے۔۔۔ اُس دن بھی مجمع تھا، آج بھی مجمع ہے۔۔۔ اس مجمع کا انداز اور تھا اس مجمع کا انداز اور ہے۔۔۔ محترم بھائیو۔۔۔ کربلا کے میدان میں جہاں حسین جیسا عظیم بادشاہ آیا تھا۔۔۔ وہاں اس کے ساتھ اس کی بہن بھی آئی تھی۔ حسین کی بہن بھی تھی کربلا میں۔۔۔ اور میں یہ کہا کرتا ہوں کہ کربلا کا اصل ہیرو زینب تھی۔ اس کے گرد گھوم رہا تھا تمام کڑار کربلا کا۔۔۔ دونوں بہن بھائی کربلا میں آ کے بیٹھ گئے۔۔۔ روز رات کو بہن بھائی آپس میں باتیں کیا کرتے۔۔۔ جب پچھلی رات ہوتی تو زینب بلاتی، آؤ حسین باتیں کریں۔۔۔ اللہ جانے پھر موقع ملے گا یا نہیں بھائی بہن کو بات کرنے کا۔۔۔ بات کیا ہوتی؟۔۔۔ زینب کہتی حسین! تو نے جب سے اس جنگل میں آ کے خیمے لگائے ہیں مجھے روزانہ رات کو خیمے کے پیچھے سے کسی خاتون کے رونے کی آوازیں آتی ہیں۔۔۔ اللہ جانے کون روتا ہے۔۔۔ امام فرماتے ہیں بہن! پہچاننے کی کوشش کرنا۔۔۔ یہ میری اماں روتی ہے۔۔۔ پہلے دونوں بہن بھائی اماں کے رونے کی باتیں کرتے۔۔۔ پھر آپس میں بیٹھ کے گفتگو کرتے۔۔۔ زینب پوچھتی حسین ارادہ کیا ہے؟ کربلا میں آنے کا مقصد کیا ہے؟۔۔۔ چاہتے کیا ہو؟ تو حسین کہتے۔۔۔ زینب میں۔۔۔ اللہ کے نام کو دنیا میں زندہ رکھنے کے لئے۔۔۔ اللہ کی اذان کو قائم رکھنے کے لئے۔۔۔ اللہ کی عظمت کو برقرار رکھنے کے لئے میں اپنی جان دینا چاہتا ہوں۔۔۔ میں سر جانا چاہتا ہوں۔۔۔ ذرا غور سے فقرہ سنا دو سنتو۔۔۔ حسین کیا کہا تم نے؟ تم مرنا چاہتے ہو؟

کہ ہاں میں مرنا چاہتا ہوں۔ ذرا غور سے فقرہ سننا دوستو۔۔۔ حسین کیا کہتا ہے؟
 تم مرنا چاہتے ہو؟ کہ ہاں میں مرنا چاہتا ہوں۔ میں آیا ہی اسی لئے ہوں کہ بلا میں۔
 کہ مر جاؤں گا مگر اللہ کا نام نہیں مٹنے دوں گا۔ تو زینب نے سکرا کے کہا
 اے حسین سن۔ تو عبی علی کا بیٹا، میں عبی علی کی بیٹی۔ جو خون تیری رگوں میں دہی
 میری رگوں میں۔ جو جوش تجھ میں دہی مجھ میں۔ جو تیرا مانا دہی میرا مانا۔ جو تیرا پاپ
 دہی میرا پاپ۔ جو تیری ماں دہی میری ماں، بس فرق اتنا ہے کہ تیرے سر پر اپنا کاغذ نہ
 ہے۔ یہ دیکھ میرے سر پہ اماں کی چادر ہے۔ میں بھی وہی ہوں حسین جو تو
 ہے۔ تو تو ارادہ کر چکا نامرنے کا؟۔۔۔ ہاں بہن! میں نے ارادہ کر لیا۔
 مگر میری بات سن لے۔ بے شک حسین تو مر جا۔ اپنے ارادے کو پورا کر لے
 میرا بھی زینب نام ہے۔ حسین میں تجھے قیامت تک نہیں مرنے دوں گی۔ اگر
 گلی گلی کو پے کو پے، بازار بازار، میرے دربار نہ گوا دیئے تو زینب نہ کہنا۔ میں دنیا
 بھر میں تیرے دربار گوا دوں گی۔ ساری دنیا سے حسین حسین کرا دوں گی۔ یہ
 زینب نے تہیہ کیا۔ چنانچہ آج یہ زینب کا اقبال ہے کہ اتنا بڑا دربار یہاں لگا ہوا
 ہے۔ یہ زینب نے کام کیا تھا۔

میرے محرم بزرگو! دوسروں کے عہز تک حسین کا کارنامہ تھا۔ اس وقت
 حسین اپنا کام کر رہے تھے۔ عہز تک حسین نے کیا جو کچھ کیا۔ پھر عہز تک حسین اپنا
 کام کر کے اپنے مفتوح علاقے میں آرام سے سو گئے۔ حسین تو سو گئے۔ اب چارچ
 زینب سے سنبھال لیا۔ لاشے پر رونے نہیں آتی تھی۔ آئندہ زندگی کا چارچ
 لینے آتی تھی کہ حسین اب میں چارچ سے رہی ہوں۔ چنانچہ زینب نے چارچ لیا۔
 حسین میں اپنی فوج لے کر شام جا رہی ہوں۔ اگر دنیا کے سب سے بڑے ہنرمند
 دنیا کے سب سے بڑے شہنشاہ کے نام کو گالی نہ بنوادیں تو زینب نہ کہنا۔

لے حسین میں جا رہی ہوں شام — لو بھائیو! چند فقرے سن لو — خدا تمہیں سلامت رکھے — زینب گیارہ تاریخ کو تیار ہو گئی شام جانے کے لئے — اور زینب نے اپنی فوج کو لائن میں کھڑا کر دیا — حسین اگر مناسب سمجھے تو ذرا میری فوج کا معائنہ کر لے، جو فوج لے کے جا رہی ہوں اتنی بڑی سلطنت فتح کرنے — اور حسین، انواعِ قاہرہ زینبہ کا کا معائنہ کرنے کے لئے نیزے پر سوار ہوئے — زینب کی فوج دیکھی — ایک لائن میں بیوہ عورتیں — ایک صف میں یتیم بچے — چونسٹھ عورتیں، اڑتالیس بچے — یاد رکھنا فوجوانو — گیارہ محرم کو کربلا میں کتنے تھے؟ چونسٹھ عورتیں، اڑتالیس بچے — ایک لائن میں عورتیں کھڑی تھیں — ایک لائن میں بچے کھڑے تھے — حسین نے زینب کی فوج کو دیکھا — ماشاء اللہ زینب بڑی عجیب فوج ہے — کہ حسین ذرا میری فوج کی وردی بھی دیکھو — اب جو فوج کی وردی دیکھی تو حسین نے نیزے پر آنکھیں بند کر لیں — وہ دیکھ نہ سکے — وردی کیا تھی؟ گردن سے ہاتھ بندھے ہوئے، سر نکھلے ہوئے — یہ زینب کی فوج کی وردی تھی — اس فوج کو لے کے جا رہی ہوں یزید کو فتح کرنے حسین — زینب گیارہ کو روانہ ہو گئی — فوج میں سپاہی کتنے تھے؟ چونسٹھ عورتیں، اڑتالیس بچے یتیم جنہیں لے کے چلی ہے کربلا سے زینب — چلدی کربلا سے — روانہ ہو گئی — ایک فقرہ کہہ کے آگے بڑھوں — چونسٹھ عورتیں، اڑتالیس بچے لے کے چلی کربلا سے — میرے بھائیو، میرے عزیزو — میرے بزرگو، میرے دوستو، جب پہنچی ہے شام میں یزید کے سامنے — تو بچے عورتیں سب مل کے کل بارہ تھے — یہ بتاؤ کہاں تلاش کریں؟ باقی کہاں گئے؟ ہماری چونسٹھ عورتیں کہاں گئیں؟ ہمارے بچے کہاں رہ گئے؟ یہاں سے وہاں تک اس راستے میں قبریں بنی ہوئی ہیں — اگر کوئی جائے اس راستے سے جس سے اہل بیت گئے تھے — کہیں پتھروں کی قبریں، کہیں خواتین

کی قبریں۔۔۔ اس طرح پہنچی۔۔۔ کوٹے کی منزل طے کی، شام کے ملک میں پہنچی۔۔۔ شام کے شہر دمشق میں داخل ہوئی۔۔۔ جہاں جہاں بیٹھے ہوئے تھے۔۔۔ دمشق بڑا شہر ہے۔۔۔ پوری طرح آراستہ کیا گیا اس شہر کو۔۔۔ کہ آج زینبؓ نے گزرنا ہے۔۔۔ شہر سمایا گیا۔۔۔ بازار آراستہ کئے گئے۔۔۔ حکومت کا حکم ہے کہ کوئی آدمی آج گھر میں نہ بیٹھے۔۔۔ عورتیں جھنڈوں پر، بازاروں میں، دکانوں کے تھڑوں پر۔۔۔ بچے بڑے۔۔۔ بازار میں سے آلیا محمد کا قافلہ گزرا۔۔۔ آگے آگے نیروں پر سر پہنچے پیچھے قیدی۔۔۔ کبھی اس بازار میں۔۔۔ کبھی اس بازار میں۔۔۔ تقریباً ایک ہفتہ دمشق شہر کے مختلف بازاروں میں ان کو بھرا یا گیا۔۔۔ اس ایک ہفتے تک یزید اپنا دربار بناتا اور سبوتا رہتا۔۔۔ پٹال بنایا گیا۔۔۔ قناتیں لگائیں گئیں۔۔۔ ساہاں لگائے گئے۔۔۔ تمام دنیا کے سفیر اور امراء بلائے گئے اپنی حکومت کے امراء بلائے گئے۔۔۔ سات سو کرسیاں بچھائی گئیں۔۔۔ نیچے فرش پہ آدمی بٹھائے گئے۔۔۔ جب دربار پوری طرح آراستہ ہو گیا تب حکم ہوا کہ قیدیوں کو لے کر آؤ۔۔۔ اب قیدی دربار میں آئے۔۔۔ سن رہے ہونا بھی، قیدی دربار میں آئے۔۔۔ اور اس مجلس میں جتنے سید بیٹھے ہیں، ان سے پوری معافی کے بعد۔۔۔ میں اب یہ کہنا چاہتا ہوں کہ دربار میں زینبؓ کی طلب ہو گئی۔۔۔ زینبؓ کو دربار میں بلا یا گیا۔۔۔ پٹال بنا ہوا تھا۔۔۔ عظیم الشان پٹال تھا۔۔۔ سات سو کرسیاں لگی ہوئی تھیں، سیکنڈوں آدمی فرش پر بیٹھے تھے اور اس کے صدر گیٹ سے لے کے دو دو فرلانگ تک دو طرفہ قناتیں تھیں۔۔۔ ان قناتوں کے ساتھ اندر کی طرف نشی ٹولاریں لئے سپاہی کھڑے تھے تاکہ بچے اور عورتیں جب ان سپاہیوں کے نیچے سے گزریں تو اتنے ڈر جائیں کہ جب یزید کے سامنے آئیں تو فوراً سجدہ کر دیں۔۔۔ بے سہارا عورتیں، سہمے ہوئے بچے۔۔۔ جب پہنچے امام زین العابدینؑ ان قناتوں کے

کے قریب قافلہ کو لے کے اور یہاں سے وہاں تک سپاہی کھڑے ہوئے دیتے۔
 تو آپ نے فرمایا۔ بھوپتی ماں کیا ارادہ ہے؟ زینب نے کہا۔
 میری زندگی میں آگے چلتی ہوں۔ تم میرے ساتھ آ جاؤ۔ زینب آگے
 اپنی کمر باندھی۔ جس سپاہی کے قریب سے گذرتیں وہ تھر تھرا پڑتا، تلوار اس
 کے اٹھ سے گر جاتی۔ یہ سارا نامہ لڑ گیا۔ جب بالکل پڑاں کے دروازے
 پہنچے اور اندر کی جھلک دیکھو کہ سات سو کرسی پر بیٹھے ہوئے ہیں لوگ۔ کچھ نیچے
 بیٹھ ہیں۔ یہ جھانک دیکھ کے کہتے ہیں۔ "بیٹا! اب تو انہی جانے کی میری عمر
 نہیں ہے۔ مجھ سے اب نہیں جایا جاتا اندر۔ میں اب نہیں جاؤں گی۔"
 ام نے فرمایا۔ "ان جواب کی مرضی؟ زینب رکھی ہی تھیں دروازہ پر۔
 کہ ایک شخص غلطی سے جھانک کا سر کے گھڑا۔ سر جو زینب کے قریب
 سے گھڑا۔ زینب کو دیکھا۔ سر کے لب بٹ۔ زینب میری خاطر آؤ
 کوئی بات نہیں۔ میں جو ساتھ ہوں۔ دربار میں چلی گئی۔ ایک
 طرف سر رکھ دیا گیا۔ ایک طرف قیدی کھڑے ہو گئے۔ بچے ہیں۔ بڑے ہیں
 سب کھڑے ہیں۔ دو تین گھنٹے گزر گئے قیدیوں کو کھڑے کھڑے۔ نہ
 ان سے کوئی بات کرتا ہے۔ مسئلہ تو میری بات کرنا ہے۔ سننا۔ جب دو تین
 گھنٹے کے بعد اپنے شغل سے فارغ ہوا تو زینب پر چلتا ہے۔ "یہ ہیں قیدی؟"
 کہ ان۔ "ان قیدیوں میں غلطی کی بیٹی کون سی ہے؟" ان قیدیوں میں
 فائر کی بیٹی کونسی ہے؟ اس کے جواب میں کوئی اور نہ ہوا۔ اس ایک
 دم فائر کی بیٹی آگے بڑھی۔ اور پورے جوش سے کہتی ہے۔
 "اوہ ہارے آزاد کردہ غلاموں کے ذیل بچے خبردار! اس شخص زبان سے میری ماں
 کا نام لیتا۔" اتنا بڑا سخت جواب سن کر۔ زینب گھبرا گیا۔ ٹھنڈا بیت

رنجست ہو گئی۔ چہرے پہ پسینہ آ گیا۔ حواس گم ہو گئے۔ پریشان ہو گیا۔ اور پریشان ہو کے کہتا ہے۔ ”زینب! تم نے بڑے جوش میں بات کہی۔“

”لعین! میں کیا کہوں، میرا تو سارا جوش و طاقت کر بلا میں رہ گئی۔ مگر یاد رکھ۔“

”تیرے دربار میں اگر مجھے حسین کی موت بھی بھول گئی۔ یہاں وہ مصیبت مجھ پہ گزری ہے۔“

”یہ شریفوں کے سنسنے کی بات ہے۔“ یزید کہتا ہے۔ ”یہاں کیا مصیبت گزری؟“

”کہ اس سے بڑھ کر بھی اور کوئی مصیبت ہو گی کہ میں زینب۔ اور مجھ سے بات کروں۔“

”بتا اس سے بڑھ کر کیا مصیبت ہو گی کہ میں حیرے ساتھ بات کر رہی ہوں؟“ اب۔

”تو وہ بالکل ہی گھبرا گیا۔ یہ دو چار فقرے بی بی نے کہے۔ دربار تھا دربار تک لگا ہوا۔ دربار کے اُدھر۔“ کوٹنے میں۔ رسول کا ابو دردہ صحابی،

”نا بیٹا۔ وہ بھی بیٹھا تھا ایک گھر سی پر۔ اُس نے اپنے ساتھ والے سے پوچھا

”صحابی میں تو نا بیٹا ہو گیا۔ مجھے سمجھ نہیں آئی۔ یہ قصہ کیا ہے۔ یہ علی

کہاں سے آگئے؟ یہ بالکل علی کی آواز ہے۔ میں نے پہچان لیا یہ علی بول رہے ہیں۔ اُس کے ساتھی نے کہا۔ بابا یہ علی نہیں۔ کہ پھر علی کا کوئی بیٹا ہو گا؟ حسین ہے؟ عباس ہے؟ کون بول رہا ہے؟ اس ساتھ والے نے دیا

”بابا چپکارہ۔ علی کا بیٹا نہیں، علی کی بیٹی ہے۔“ اب تو بڑھے صحابی نے بے چین ہو کے کہا۔

”کون سی بیٹی، کہ علی کی بیٹی بیٹی، زینب۔“ میں!!!۔ زینب

”دربار میں کیسے آگئی؟“ وہ دربار میں کیوں آگئی؟“ تو ساتھی نے کہا۔ ”بابا زری

آئی ہی نہیں، شنگے سر بھی ہے اور ہاتھ بھی بندھے ہوئے ہیں۔ بس یہ سنا تھا کہ رسول

کا صحابی بے چین ہو کے اپنی کرسی سے اٹھا اور وہیں سے اُس نے آواز دی۔“

”زینب ڈرنا مت، میں آ رہا ہوں۔ زینب گھبرانا نہیں، میں آ رہا ہوں۔ میں تیرے

نانا کا صحابی ہوں زینب۔ میں آ رہا ہوں زینب۔ گھبرانا نہیں۔“ یہ لہجہ کے

Presented By: www.jafrilibrary.com

آنے والو خدا تمہیں اجر عظیم دے — خدا تمہیں اسکا بڑا ثواب دے —
 تم رونے کے لئے آگئے — دیکھو بیٹا، سننے بولنے کے لئے، تماشے کے لئے،
 سارا سارا دن گزار دینا اور بات ہے اور رونے کے لئے گھر سے آکے بیٹھنا اور
 بات ہے — یہ تمہاری محبت کی دلیل ہے — تم سے محمد خوش ہیں —
 محمد کا اللہ خوش ہے — اگر کوئی عمل نیک ہے تمہارے نامہ اعمال میں تو بس یہی رونا
 ہے — یہی مجلس ہے — اللہ اے قبول کرے — خدا اے منظور کرے —
 خدا ان گھروں کو آباد رکھے جہاں فاطمہ کے اہل گھر کا ذکر ہوتا ہے — سیدو،
 خدا شاہد ہے، ہمارا گھر ایسا اجڑا کہ دنیا میں کسی کا گھر ایسے نہ اُجڑا — ہم ایسے برباد
 ہوئے اس دنیا میں کہ اس طرح کوئی برباد نہ ہوا — ہم ایسے دیران ہوئے، کوئی
 ایسا ویران نہ ہوا — ہماری قبروں سے قبریں نہ ملیں — گھر سے گھر نہ ملے — کوئی
 کمر ملا ہے، کوئی کاغذیں ہے، کوئی نجف میں ہے — جب دہاں سمائی نہ ہوئی تو کوئی —
 بی بی لاہور میں ہے — ہم اُجڑ گئے — برباد ہو گئے — ایسا کوئی گھر تباہ نہ ہوا
 جیسا ہمارا گھر تباہ ہوا — ایسا کوئی گھر برباد نہ ہوا جیسا ہمارا گھر برباد ہوا —
 فاطمہ کے گھر کی بربادی پہ رونے والو اللہ تمہارے گھروں کو آباد رکھے — اللہ تمہارے
 بچوں کو بڑی ترقی دے — اللہ تمہارے بچوں کو سلامت رکھے — تمہیں سب کو
 خوش رکھے — بحق محمد و آل محمد — میں آپ حضرات کا ایک دفعہ پھر شکریہ
 ادا کر دوں آپ تشریف لائے — آپ کے آنے کا میں بڑا شکر گزار ہوں — پولیس
 کے جوانو تمہارے انتظام کا بھی شکریہ، فوج کے جوانو، تمام لاریوں میں بیٹھ کے آنے
 ہو — تمہارا بھی بہت شکریہ — بچو — بڑو — جس طرح بھی تم آئے ہو تمہارا
 شکریہ — دیکھو بیٹا — سفید دارطھی کے بوڑھے، کمر جھکی ہوئی — لکڑی
 ٹپکتے چلے آ رہے ہیں — بابا کہاں جا رہے ہو؟ کہ فاطمہ کے بیٹوں کو رونے

— عورتیں برتنو پہنے ہوئے، بچے اٹھائے ہوئے چلی آرہی ہیں — بی بی کہاں جا
رہی ہیں — بی بی کہاں جا رہی ہے؟ کہ بی بی کے بچوں کو رونے جا رہی ہوں —
اس سے بڑھ کے کوئی عبادت نہیں دینا میں — اللہ تمہاری اس عبادت کو قبول کرے
اللہ تمہاری اس سعی کو شکوہ کرے — اللہ تمہاری اس مجلس کو قبول کرے —
بحق محمد و آل محمد — آمین —

— — — — — ° ° — — — — —

موت و حیات

عنوان

موت و حیات

فَضَائِل

امام موسیٰ کاظمؑ

مصاب

کبھی گزرا ہوں بغداد کے بازاروں سے
لاشیں روہ کے ابھرنے لگیں دیواروں سے

سید جعفر طاهرؑ

حضرات! کافی دیر سے آپ مجلس عزا میں تشریف فرما ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اتنی دیر تک بیٹھنے سے اب آپ حضرات کافی تھک چکے ہوں گے۔ اور میں کوئی مجلس پڑھنے اس وقت حاضر نہیں ہوا آپ کی خدمت میں۔ بلکہ اختتام مجلس پر ننگریہ کے الفاظ ادا کرنے حاضر ہوا ہوں۔ میری آواز پہنچ رہی نا جناب؟ (بھئی یہ آواز نہیں جا رہی بٹیا) اچھا اب جا رہی ہے آواز۔ دیکھو میرے معزز سامعین! میں جو بھی بات کر رہا ہوں میرے اور آپ کے درمیان یہ ذات شریف وسیلہ ہے۔ یہ چاہیں تو میری آواز پہنچائیں چاہیں تو نہ پہنچائیں۔ اگر وسیلہ ٹھیک ہو تو کام ٹھیک ہوتا ہے۔ وسیلہ غلط ہو تو کام غلط ہو جاتا ہے۔ اس وسیلے (لاؤڈ سپیکر) کا اس لئے اعتبار نہیں کہ یہ کرایے کا وسیلہ ہے۔ بہر نوع خدا کرے یہ کام دیتا رہے۔ خدا کرے یہ آپ تک میری آواز پہنچاتا رہے۔ ہاں تو میں اس عرض سے آغاز کرتا ہوں کہ ہر انسان تین چیزوں سے مل کر انسان بنتا ہے۔ ایک جزو کا نام ہے۔ روح، ایک جزو کا نام ہے۔ نفس۔ نفس ناطقہ۔ روح و نفس و جسم ان تینوں چیزوں کے مجموعے سے انسان، انسان بنتا ہے۔ میری بات پہ غور فرمایا آپ نے۔ آپ اور ہم سب ان میں چیزوں سے مل کر بنتے ہیں۔ ایک جسم ہے۔ ایک روح ہے۔ ایک نفس ناطقہ ہے۔ پوری توجہ ہے نا صاحبان۔ جسم جو ہے۔ یہ جو آپ دیکھ رہے ہیں۔ اس کے سنا ہے چار جزو ہیں۔ سنا ہے۔ میں نے اس لئے کہا کہ اصلی بات ڈاکٹر صاحبان اور کئی حضرات جانتے ہیں۔ ہم ملا لوگ تو سنی سنائی بات کرتے ہیں۔ سنا ہے کہ جسم

کے چار جزو ہیں چار عناصر ہیں کیا کیا ہیں وہ چار عناصر بھی؟
 جن سے جسم بنتا ہے وہ اربعہ عناصر کیا ہیں؟ آگ، پانی، مٹی، ہوا
 لوحی میں بوڑھا ہو گیا چار کے نام ہی یاد نہیں اللہ جانے کیا کیا ہیں
 ان چار سے انسان کا جسم بنا ہے۔ ایک آگ ایک کیا؟ پانی
 ایک کیا؟ مٹی ایک کیا؟ ہوا یہ چار جب آپ کے بادا
 آدم بنے تھے وہ بھی انہی چار سے بنے تھے تو فرشتوں نے دیکھ کے کہا تھا
 کہ یا اللہ یہ پتلا جو ان چار سے بنا ہے ضرور فساد کرے گا کیوں فساد
 کرے گا؟ کہ یہ ایسے چار اکٹھے ہوئے ہیں جن کا خاندان مختلف، قبیلہ مختلف
 نسل الگ، قوم الگ، ایک دوسرے سے کوئی تعلق ہی نہیں بے جوڑا،
 چار کب تک اکٹھے رہیں گے بہر فروع ہم ان چار سے مل کر بنے ہیں
 اب آپ نے کہا ہے کہ آپ کے جزو چار ہیں مجھے تو یاد نہیں ایک
 آگ ایک پانی، ایک مٹی، ایک ہوا مگر جس سے میں پرچھتا ہوں کہ
 بھی تم کون ہو کہ جی میں تو خاکی بندہ ہوں کوئی یہ نہیں کہتا کہ میں ہوائی بندہ ہوں
 حالانکہ آپ کہتے ہیں کہ ہوا بھی ہے ہمارے اندر کوئی نہیں کہتا میں تو
 جناب آبی بندہ ہوں کسی نے اپنے آپ کو ناری نہیں کہا آج تک ٹٹنے
 کو تو چار اور نام لینے کو ایک بہر فروع ان سے ہمارا جسم بن گیا دوسرا
 جزو ہے ہمارا نفس اس کے بھی اجزاء ہیں وہ بڑی لمبی تشریح ہے،
 وہ سناؤں تو وقت بڑا لگے گا اس کے بھی اجزاء ہیں وہ بڑی لمبی
 تشریح ہے اسی طرح رُوح ہے۔ میرے عزم بھائیو جسم کو بھی غذا کی ضرورت
 ہے، نفس کو بھی غذا کی ضرورت ہے رُوح کو بھی غذا کی ضرورت ہے
 یہ تینوں چیزیں زندہ رہیں تو جسم زندہ رہتا ہے اگر کوئی انسان رُوح

کو تو بہت غذا دے دے اور جسم کو تباہ کر دے۔ اُس نے وَن تھر ڈانسٹ تباہ کر دی۔ اور اگر کوئی جسم کو پالتا ہے تو یہ بھی غلط۔ ہر چیز کو پالنا چاہیے۔ اب یہ بتائیے کہ یہ جو موت آتی ہے۔ جو انسان مرتا ہے۔ وہ کیسا شے ہے؟ کیوں بھی کیا چیز ہے وہ؟ موت کیا ہے؟ بولنا بھی، موت کیا ہے؟ آپ اس لئے نہیں بتا رہے کہ جو تباہ رہے ہیں انہوں نے ابھی موت کو دیکھا نہیں۔ جنہوں نے دیکھا یا وہ آکے بتاتے نہیں۔ اس لئے پتہ ہی نہیں چلتا کہ موت کیا ہے۔ ہے ایسی ضروری چیز موت۔ ایسی ضروری چیز۔ کہ جو اللہ کو نہیں مانتے۔ وہ موت کو مانتے ہیں۔ اتنی ضروری ہے۔ اور انسان کے ساتھ تو ایسی چٹھی ہوئی ہے موت۔ انسان ہی نہیں، ہر شے کے ساتھ۔ معاف کرنا بھائیو۔ ابھی ہمارے جناب جس صاحب تقریر کر رہے تھے۔ اللہ جانے وہ مجلس میں بھی یا چلے گئے۔ اگر وہ ہوتے تو میں اُن سے پوچھتا کہ ہم نے کیا گناہ کر لیا۔ ہم نے کیا جرم کر لیا۔ اس دنیا میں آنا کوئی ایسا گناہ ہو گیا ہم سے کہ چاہے یہاں ایک سانس لو چاہے لاکھ سال کی عمر پاؤ۔ سزا نے موت ضروری ہے۔ حرام ہے کہ اور کوئی سزا ہوتی ہو۔ جیل وغیرہ کی۔ سیدھی سزا موت ہوتی ہے۔ آئے ہو تو مرنا پڑے گا۔ سمجھے۔ جانا پڑے گا۔ چاہے مر جاؤ، مرنا پڑے گا۔ لازمی مرنا پڑے گا۔ خوشی سے نہیں جاؤ گے۔ چار بندے اٹھا کے لے جائیں گے۔ بہر حال مرنا پڑے گا۔ یہ مرقی کیا شے ہے۔ جسم جو ہے انسان کا۔ یہ تو ہے ہی مرنا۔ یہ کبھی زندہ ہوتا ہی نہیں۔ یہ جسم جسے کہتے ہیں۔ اور روح جس چیز کا نام ہے۔ وہ ہمیشہ جب پیدا ہو چکی، وہ زندہ ہے اور زندہ ہی رہے گی۔ روح نے مرنا نہیں، جسم نے جینا نہیں۔ پھر مرقی کیا شے ہے

اس کی تشریح ہمارے خالق نے کی۔ کہ نہ جسم کو موت ہے نہ روح کو موت ہے۔
 — روح ہمیشہ زندہ رہے گی۔ جسم میں زندگی ہے ہی نہیں۔ لہذا موت
 کا سوال ہی نہیں۔ مرنے کیا شے ہے۔ اس نے بتایا۔ کہ سنا، مرنے کیا
 شے ہے؟ کل نفس ذائقۃ الموت وہ تیسرا جزو جو نفس ہے وہ موت کو
 چمکتا ہے۔ — مرنا وہ بھی نہیں۔ کیا دلیل ہوگی نہیں مرنا؟ مرنے والے چمکا
 نہیں کرتے۔ موت کو چمکتا ہے وہ۔ نفس موت کو چمکتا ہے۔ — مرنا
 وہ بھی نہیں۔ — زندہ رہتا ہے۔ — پھر زندہ کس طرح رہتی ہیں یہ چیزیں
 ان کے زندہ رہنے کے بڑے طریقے ہیں قبہ۔ جسم الگ ہو گیا۔ نفس الگ
 ہو گیا۔ — روح الگ ہو گئی۔ جسم مٹی میں مل گیا۔ نفس ناطق عالم برزخ میں
 چلا گیا اور روح جو تھی وہ کہاں گئی۔ — وہ ”یاد“ بنی۔ — فقرہ مزایا رکھنا۔
 مرنے والے کا جسم مٹی میں گیا۔ نفس عام برزخ میں گیا۔ جسم مٹی میں چلا جاتا
 ہے۔ اور روح یاد بن کے چاہنے والوں کے دل میں سما جاتی ہے۔ اسے یاد رکھتے
 ہیں اور وہ یاد رہتا ہے۔ توجہ ہے نا صاحبان۔ — یہ روح کی شان ہے۔ —
 اور میں اس گفتگو کو مختصر کروں۔ — موت و حیات کی گفتگو تو بڑی لمبی، طویل ہے
 — کہ حضرات محمد و آل محمد جن کے ہم غلام ہیں اور جن کے اوپر ہمارا ایمان
 ہے۔ — جن کی تعلیم کو ہم اپنا ایمان سمجھتے ہیں۔ — انہوں نے موت و حیات
 کے اقدار و فلسفے ہی بدل دیئے سارے۔ — بہر نوع، حضرات محمد و آل محمد
 نے اس کی شان ہی عجیب بیان کی ہے۔ — وہ دو جملے میں حضرات محمد و آل محمد
 کی شان میں کہہ دوں۔ — تو حضرات محمد و آل محمد اپنا تعارف کیا کرتے ہیں کہ
 کہ محمد فرماتے ہیں۔ — کہ میں محمد اور آل محمد ہم سب ایک نور سے

ہیں — کیوں بھئی یہ سنا ہے کہ نہیں؟ ٹھیک ہے نا؛ کہا ہے نا انہوں نے؛
تو برابر ہو گئے نا؛ جب ایک نور سے ہیں تو ہو گئے مناسب برابر؟ انہوں نے
کہا نا؛ ہیں تو ایک ہی نور سے — مگر اتنا اچھا فقرہ کہا — یہ خطاب کیا ہے
آل محمد کے فرد اعلیٰ، علیٰ کو — یا علیٰ تو اور میں ایک نور سے ہیں —
تو علیٰ کا سینہ تن گیا ہو گا نایہ سن کے کہ میں جب ایک نور سے ہوں تو برابر ہو
گیا — سمجھے نا جناب — اگلا فقرہ فرمایا — انا شمس و انت لک القمر
نور تو ایک ہی ہے میں شمس ہوں تو قمر ہے — میری بدولت تو روشن ہے
فرق ہو گیا یا نہیں ہو گیا؟ اب شمس و قمر میں کیا فرق ہے قبلہ؟ رسول شمس
ہیں، علیٰ قمر ہیں — شمس و قمر میں فرق یہ ہے — کیوں بھئی کبھی آپ نے
یہ جھگڑا سنا ہے کہ کل شمس نکلا تھا یا نہیں؛ کیوں بھئی کبھی جھگڑا سنا ہے —
کیوں بھئی کل سورج ہوا تھا یا نہیں — سنا ہے؛ نہیں نا؛ سورج میں سب
متفق رہتے ہیں — چاند کی باری آئی تو اختلاف ہو گیا — ہوتا ہے یا نہیں؛
اختلاف — بناؤ آج چاند ہوا یا نہیں؛ اختلاف ہوتا ہے یا نہیں — اللہ
جانے چاند ہوا یا نہیں؛ — پھر اختلاف ہوتا کب تک ہے؛ پہلی کو جھگڑا ہوا پتہ نہیں
آج پہلی ہے یا دوسری؛ دوسری کو جھگڑا ہوا — تیسری کو جھگڑا ہوا — تیسری تک
جھگڑ کے سب خاموش ہو گئے — کہ بھئی خاموش رہو — چاند کا فیصلہ چودھویں پہ
ہو گا — جب چودھواں آئے گا اب پتہ چلے گا کہ تاریخ کیا ہے؛ چودھویں تک
چاند میں جھگڑا ہوتا ہے — ہے یا نہیں ایسا ہی؛ — جہاں چاند ہے وہیں
کہیں سورج بھی ہے — مگر کبھی آج تک آپ نے سنا کہ بھئی آج سفر نہ کرنا
— میان آج شمس در عقب ہے — سنا ہے کبھی؛ آج سورج عقب میں
ہے — سنا ہے کبھی آپ نے؛ اور قمر در عقب؛ سنتے ہو یا نہیں؛ عقب

کیا ہے؟ — کچھ ستارے ہیں منحوس — سنا ہے — جب تک سورج
 رہتا ہے — یہ منحوس نامراد اللہ جانے کہاں چھپے رہتے ہیں — جہاں قسم
 کا زمانہ آیا عقب بھی آگیا — کیا ہوا جی، قمر درعقب ہے — یہ ہوتا ہے
 قمر درعقب ہوتا ہے — یہ کتنے دن رہتا ہے قمر درعقب؟ — کتنے دن؟
 صرف تین دن — قمر درعقب صرف تین دن رہتا ہے — جہاں تین دن گزرے
 — اے لو — قمر درعقب ختم ہو گیا — یہی قمر درعقب ہے — چاند پہ —
 سمجھ میں آ رہا ہے نا صاحبان — اب تمہیں پتے کی ایک اور بات بتا دوں —
 اُسے بڑے غور سے سنا — اور اس کے بعد میں اپنا بیان ختم کر دوں گا — سورج
 میں ایک صفت اور ہے — وہ طلوع بھی ہوتا ہے اور غروب بھی ہوتا ہے —
 یہ صفت ہے یا نہیں شمس کی — غروب بھی ہوتا ہے، طلوع بھی ہوتا ہے — کیوں بھٹی
 سورج نکلتا بھی ہے صبح کو اور شام کو غروب بھی ہوتا ہے — ہے یا یہ صفت شمس کی
 — فرق یہ ہے کہ جب شمس طلوع کرتا ہے تو بند دروازے کھل جاتے ہیں —
 یہی ہوتا ہے نا، بند دروازے کھل جاتی ہیں — کاروبار جاری ہو جاتا ہے —
 لوگ اپنا کام شروع کر دیتے ہیں — تمام دنیا میں روشنی ہو جاتی ہے — شمس
 کے چمکنے کا زمانہ ہے — اور جب شمس غروب ہوتا ہے — کھلے دروازے بند
 ہو جاتے ہیں — کاروبار بند ہو جاتے ہیں — جب تک شمس کا وجود ہے اس
 وقت تک سچوں کا دور ہوتا ہے — جہاں شمس غروب ہو گیا اب چور کی باری
 آ جاتی ہے — یہی شمس کی بات کر رہا ہوں — کوئی اور خیال اپنے دل میں
 نہ لانا — یہ ہے شمس کی حالت — تو میرے معزز سامعین — شمس کے
 طلوع سے دنیا کو فائدہ — شمس کے طلوع سے دنیا آباد — شمس کے آباد
 ہونے سے دنیا میں آبادی — جہاں شمس غروب ہوا ایسا اندھیرا آ جاتا ہے کہ میں کیا

بتاؤں۔۔۔ پورا اندھیر ہوتا ہے۔۔۔ آپ کہیں گے ستارے جو ہیں۔۔۔ ہزاروں ستارے اسی شمس کی روشنی کی بدولت چمکتے ہیں۔۔۔ مگر اس کو پہچان کرین کرے کہ ان میں مغس کتنے اور نیک کتنے۔۔۔ اصلی حیات کا مرکز شمس ہے۔۔۔ اصلی زندگی کا مرکز شمس ہے۔۔۔ اصلی توانائی کا مرکز شمس ہے۔۔۔ یہ طلوع رہے تو اس کی شان اور ہوتی ہے عذاب ہو جائے تو دنیا میں اندھیر آ جاتا ہے بڑا فراق ہوتا ہے قبلہ۔۔۔ کبھی کبھی اس کو گرہن بھی لگ جاتا ہے۔۔۔ آپ نے بھی دیکھا ہوگا سورج کا گرہن لگتے ہوئے۔۔۔ ہوتا ہے، مگر گرہن لگ جاتا ہے یہ بھی ہوتا ہے۔۔۔ چنانچہ جب بھی ہمارے کسی امام کی شہادت ہوئی ہے۔۔۔ اس دن سورج کو ضرور گھٹا تھا۔۔۔ ضرور لگا تھا۔۔۔ جب بھی شہادت ہوئی ہے۔۔۔ آج حضور امام موسیٰ کاظمؑ کی شہادت کی تاریخ ہے۔۔۔ امام موسیٰ کاظمؑ کی شہادت کی تاریخ ہے آج صاحبان۔۔۔ آج آپ کے امام کی شہادت کی تاریخ ہے۔۔۔ اور آج آپ شمس کا چہلم بھی کر رہے ہیں۔۔۔ گویا امام کی شہادت بھی ہے اور شمس کا گرہن بھی۔۔۔ ضرور گرہن ہوتا ہے شمس کو امام کی شہادت کے دن۔

میرے محترم بزرگو، بھائیو، عزیزو۔۔۔ میں اپنی گفتگو ختم کرتا ہوں یہ کہہ کے آپ حضرات میں سے سینکڑوں دن ایسے ہونگے۔۔۔ ان سامعین میں۔۔۔ جنہوں نے چند دن پہلے شمس کا جنازہ دیکھا ہوگا۔۔۔ دیکھا تو مانا نہیں؟۔۔۔ کیوں بچو دیکھا تھا؟ کتنے آدمی تھے؟ کوئی کتا غورٹا ہی تھا؟ آپ نے ہزاروں آدمی تھے۔۔۔ اتنا بڑا جنازہ تھا یا نہیں؟ جنازہ دیکھا تو مانا؟ اور اس جنازہ کے مقابلے میں آپ یہ جنازہ بھی دیکھ لیں ذرا کہ آپ کا امام قیامت کے دن آپ سے شہید ہو گیا۔۔۔ گھر میں نہیں۔۔۔ ہال بچوں میں نہیں۔۔۔ قید خانے میں۔۔۔ جب

امامؑ کی شہادت ہو گئی — چار مزدور جنازہ اٹھا کے دجلہ کے پل پہ رکھ آئے
 صرف چار مزدور — آج کے دن ایسا جنازہ بھی اٹھا تھا — سمجھے حضور
 والا — مگر اس کا نتیجہ کیا ہوا کہ آج ہم چار مزدوروں والے جنازے کا واسطہ
 دے کر اپنی اموات کے لئے دعا کرتے ہیں — کہ خداوند اسس عزیزب جنازے
 کے صدقہ میں ہمارے دائوں پہ رحم فرما — ان کے درجات کو عالی کر —
 ان کو امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی خدمت میں پہنچا — ان کو بارہ امامؑ کی خدمت میں
 پہنچا — یہ امامؑ کی خدمت کرتے رہے ساری عمر — اور یہ ان کی خدمت میں
 پہنچیں گے جن کی خدمت کرتے رہے — اور مظفر علی شمس میں چالیس سال سے
 تیرا واقف تھا — میں نے تجھے خدمت آل محمدؑ کرتے دیکھا آل محمدؑ اپنے خادموں
 کو کہیں مایوس نہیں کرتے — ایک سیکنڈ کا خدمت کرنے والا اگر حضرت خُ
 بن سکتا ہے — تو چالیس سال کے خادم — تو خدا جانے کیا بنا دیں اسے —
 یہ تو بہتر جانتے ہیں — خدا ان کے جوار میں جگہ دے — ان کی خدمت
 میں پہنچائے — آؤ سب مل کے دعا کریں — دعا کا وقت ہے —
 یہ شہادتِ امامؑ کا دن ہے — سب مل کے پکارو — یا اللہ! ہم تیرے دربار میں
 تیرے اولیاء کے دربار میں اتنا اٹھائے بیٹھے ہیں — ہم بھکاری حاضر ہیں —
 ہمیں یہ بھیک عطا فرما کہ ہمارے سب کے گناہوں کو معاف کر دے — ہماری اموات
 یہ رحم فرما — ہمارے جانے والوں کے درجات کو عالی کر — ہم جو باقی ہیں —
 ہمیں توفیق عطا فرما — ہم میں آپس میں اتنا دو اتفاق عطا کر — ہم
 سب ایک دوسرے کے جانشین ہو کے رہیں — اللہ دین آل محمدؑ کو حمایت فرمائے
 اور کلمہ دین آل محمدؑ کی حفاظت فرمائے حتیٰ خدا داک حمد —

ان دعائیہ فقرہوں اور آپ کے شکر کے بعد میں آپ حضرات سے رخصت ہوا

ہوں۔۔۔ اب ایک نعرہ لگاؤ پھر فاتحہ پڑھنا۔۔۔ نعرہ تکبر۔۔۔ نعرہ رسالت
 نعرہ حیدری۔۔۔ کلمہ ولایت۔۔۔ کلمہ ولایت۔۔۔ شاہانہ۔۔۔ نعرہ
 تکبر۔۔۔ نعرہ رسالت۔۔۔ نعرہ حیدری۔۔۔ کلمہ ولایت۔۔۔ اے
 پکا یاد رکھنا۔۔۔ ولایت کا کلمہ ہے۔۔۔ جو دہی کے عادی ہیں وہ ولایت سے
 مانوس نہیں ہوتے۔۔۔ دہی وہ ہوتی ہے جو خود بنالیں۔۔۔ خود بنانے والوں
 کو کیا پتہ کہ ولایت میں کیا لطف ہے ؟ آپ کلمہ ولایت کو بالکل یاد رکھیں سمجھے
 خدا تمہیں خوش رکھے۔۔۔ یہ کلمے اس طرح قائم و دائم رہیں۔۔۔

بحق محمد وآل محمد

(۲۱ جولائی ۱۹۶۹ء بمطابق ریسرچ ہائی نسبت روڈ۔ لاہور)
 بر موقیع چیلڈ خاں مظفر علی صاحب شمس مرحوم)

باب الحوائج

امام موسیٰ کاظمؑ

بڑوں کی طرف سے چھوٹوں کو عطیات ملتے ہیں۔ ان کے کئی نام ہیں۔ بڑوں میں اللہ بھی ہے۔ ہے اللہ بھی تو بڑا۔ ہے نا؟۔ اس کی طرف سے بھی عطیات ملتے ہیں۔ ان کے کئی نام ہیں۔ جو اللہ کی طرف سے عطیے ملتے ہیں وہ بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے عام بات بتاؤں آپ کو۔ کہ آپ صبح سے شام تک ایک مزدور نے مزدوری کی اُسے جو مزدوری ملتی ہے عطیہ عوض کہلاتی ہے۔ اس کا نام ہے عطیہ عوض۔ یہ بدلہ ہے اس کی محنت کا۔ خوب سمجھ رہے ہیں نا آپ میری بات کو۔ اگر اس کی مزدوری جو ملے ہوئی ہے۔ اپنے جو ملے کی ہے ایک دو آنہ زیادہ دے دیا جائے۔ یہ کہلاتا ہے فضل۔ سمجھے آپ۔ یہ اس پر فضل ہے۔ یہ جو زیادہ دے دیا ہے یہ کہلاتا ہے فضل۔ اور اگر مزدوری نہیں کی ویسے ہی کوئی کام آپ کا کر دیا۔ باقاعدہ مزدور نہیں تھا ویسے ہی کوئی کام کر دیا آپ کا۔ تو اگر آپ نے کچھ دیا تو وہ نہ مزدوری ہے نہ وہ فضل ہے۔ اسے کہتے ہیں انعام۔ توجہ ہے نا صاحبان۔ وہ کہلاتا ہے انعام۔ اور اگر کسی نے اُس پر ترس کھا کے کچھ دے دیا۔ فاقہ کش تھا بیچارہ۔ ٹھٹھک رہا تھا۔ کپڑا نہیں تھا۔ تو ایسے دینے کو کہتے ہیں کرم۔ ایسا دینے والا کہلاتا ہے کریم۔ توجہ ہے نا صاحبان!

بقول پنجابیوں کہ ”رج کے پیا“ خوب پیا۔ جب پیٹ بھر گیا۔ چھوٹے چھوٹے
 ننھے ننھے ہونٹوں میں زبان مضبوطی سے پکڑ لی۔ بھٹی چھوڑ دی۔ اسی طرح گھر تک
 پہنچے۔ رسولؐ کی گود میں علیؑ ہیں۔ گھر والے سب اکٹھے۔ ابی طالب بھی
 ہیں۔ بچے نے آنکھوں آنکھوں میں سب بزرگوں کو گواہ بنایا۔ کہ محمدؐ پیدا ہونے
 ہی مجھے ”زبان“ دے چکے ہیں۔ اب اس ذکر سے بھی ہماری عبارت ہو گئی۔
 اب تمام لوگ پوچھنے لگے محمدؐ کس شکل کا ہے۔ محمدؐ خاموش۔ آخر گھر کے
 مالک نے ”دمی“ کے ذریعہ بتلایا۔ محمدؐ کہہ دو۔ ہاتھ۔ ”یہ اللہ ہے۔“ آکھ
 ”عین اللہ ہے۔“ زبان۔ لسان اللہ ہے۔ جسم۔ جسد اللہ ہے۔ یہ عجیب
 بات ہے۔ علیؑ کا ہاتھ۔ اللہ کا ہاتھ۔ علیؑ کا چہرہ۔ اللہ کا چہرہ۔ علیؑ کا جسم
 اللہ کا جسم۔ علیؑ کی زبان۔ اللہ کی زبان۔ تو اب دوق کے لئے ایک فقرہ
 کہتا ہوں۔ کہ الگ الگ اجزا کرو تو اللہ۔ اور اتنے اللہ اکٹھے ہو جائیں تو علیؑ
 عجیب بندہ آگیا۔ جسے آج تک علیؑ والے اللہ کہتے ہیں اور اللہ والے علیؑ
 کہتے ہیں۔ سمجھ میں آیا۔ کہ کیوں سمجھ رہے ہیں کہ ایسے کا ذکر عبادت ہے کہ نہیں۔
 تو میں عرض کر رہا تھا۔ علیؑ نے محمدؐ کی زبان سے دورھ پیا۔ جو علیؑ سے بچ رہا تھا۔
 وہ بچوں نے ”باپ کا مال“ سمجھ کے پیا۔ کس کی زبان سے باپ کا مال سمجھ کے بچوں
 نے پیا۔ بچوں کی بات اور تھی علیؑ کی بات اور تھی۔ علیؑ ایک دفعہ دوش رسولؐ پر
 سوار ہوئے اور تم نے کہا سبحان اللہ۔ اور بچوں نے اس کو کھیل کا میدان بنا دیا۔
 جب دیکھو کاندھے پر سوار۔ رسولؐ مسجد میں جا رہے ہیں۔ یہ کاندھے پر سوار۔
 مگر وہ پتے پتے تھے ہی اس قابل۔ کہ بچے راکب نہیں اور رسولؐ مرکب بنے۔ اب وہ
 کہیں۔ مہار چاہیے۔ رسولؐ نے زلفیں پکڑا دیں۔ بیابانہ لگا ہے۔ اب بچوں
 کے ہاتھ میں رسولؐ کی زلفیں نہیں تھیں بلکہ باگ تھی اور باگ کے معنی یہ ہیں۔

موڑ دیں مڑ جائے۔ بدھر پھر دیں پھر جائے۔ رسالت کی بانگ ان بچوں کے
 ہاتھ میں تھی اور میں کہتا یہ چاہتا ہوں۔ کہ اتنی بڑی رسالتوں کی بانگیں سنبھالنا زمان
 کے لئے بچوں کا کھیل تھا۔ یہ بچوں کی شان تھی اس انداز سے پرورش پائی تھی
 بچوں نے۔ جس طرح پہلے تھے یہ بچے۔ تین چار سال کے ہوئے تو رسولؐ
 گود میں لے کے بیٹھ گئے۔ بچو۔ عزیزو۔ میں تمہیں بڑے پیار سے
 پالا ہے۔ بڑی محبت سے پالا ہے۔ جی ہاں قبیلہ۔ آپ نے بڑا پیار
 کیا ہے۔ اگر میرے دین پہ کبھی دقت آگیا تو کیا کرو گے۔ اب بچوں کے
 تیور دیکھنے کے قابل تھے۔ رسول بھی رو پڑے دیکھ کر۔ بچوں نے کھڑے
 ہو کر انگڑائی لی۔ تو قبا کے بند ٹوٹ گئے۔ نانا پرواہ نہ کر۔ گھر لٹا دیں
 گئے۔ بچے لٹا دیں گے۔ تیرے دین پر حرف نہیں آنے دیں گے۔ اور اگر
 ہمارا یقین نہ آئے۔ تو تم خود جنت سے آکر دیکھ لینا۔ مومنین! آج محرم
 کی آٹھ تاریخ ہے اور رسول جنت سے کربلا آئے ہوئے ہیں۔ اور وہ دیکھ
 رہے ہیں کہ بچوں نے کیا کرنا ہے۔ آج انہوں نے دیکھا ہے کہ بچوں نے کیا کیا
 ہے۔ وہ فرما ادا کر رہے ہیں۔ رسول دیکھ رہے ہیں۔ مگر حسین چاہے
 کچھ بھی کریں۔ آخر رسولؐ کے نواسے ہیں۔ آخر علیؑ کے بیٹے ہیں۔ آخر فاطمہؑ کے
 بیٹے ہیں۔ حسین کی بات تو حسین کے ساتھ رہی۔ اگر زینبؓ کا کوئی کمال ہے۔ تو
 زینبؓ کی بات قبیلہ زینب کے ساتھ ہے۔ کہاں فاطمہ کی بیٹی۔ کہاں علیؑ
 کی بیٹی۔ اس کی شان بھی یہی تھی۔ جو اُس نے کیا۔ میں نے کہا ہوں حسین ایسا
 عظیم پارسا ہے جو اُس سے چھو گیا۔ اُسے حسین بنا دیا۔ حسین نے بہتر حسین
 بنا دیئے۔ خاندان کی نہ پوچھو۔ حسین اور زینبؓ کی نہ پوچھو۔ غیروں کو دیکھو
 اُن کے جذبہ کیانت ہے۔ انہیں دیکھ دیکھ کے رسولؐ قرآن ہو رہے تھے۔ انہیں

دیکھ کے رسولؐ فدا ہو رہے تھے۔ میرے بھائیو! میرے عزیزو! حسین کے ساتھ غیر بھی تھے نا؟ ایک صحابی شہید ہو گیا۔ "جناہ"۔ اس کا نام تھا۔ حسین لاشے پہ گئے اٹھا کے گینچ شہیداں میں رکھا۔ خیمے کی طرف جو دیکھا تو خیمے کا پردہ اٹھا ایک فردس ساں کا بچہ دوڑتا ہوا نکلا۔ حسین نے آواز دی۔ آلِ محمد۔ اس بچے کو رکھو۔ یہ میدان میں کہاں آ رہا ہے۔ اتنے میں دو بچہ میلان کے قریب آ گیا۔ کمرے تلوار بندھی ہوئی۔ بچہ چھڑتا تھا۔ تلوار تھی بڑی وہ گھسٹتی ہوئی آ رہی تھی۔ حسین نے بڑھ کے بچے کو گود میں اٹھالیا۔ کہاں جا رہے ہو۔ قہر مرنے جا رہا ہوں۔ میں دشمنوں سے لڑوں گا۔ میرے بیٹے تم کس کے بیٹے ہو؟ میں اسی جناہ کا جو ابھی مرا ہے۔ تمہارا باپ مرا ہے۔ تو یتیم ہوا ہے۔ اپنی ماں کے پاس جا کر بیٹھ۔ تو بچہ کہنا ہے۔ یہ کمراتاں نے باندھی ہے۔ یہ تلوار مری اماں نے خود باندھی ہے۔ میری اماں نے کہا ہے۔ بیٹا جا کر مہجاء۔ یہ سن کر قرآن ہو گئے حسین۔ یہ غیروں کے عزائم تھے۔ قہر میں نے تمہیں ہر مجلس میں حسین کے دوستوں کی ادائیں سنائی ہیں۔ یہ غیروں کی ادائیں تھیں اگر مناسب سمجھو تو بات کہہ دوں۔ اپنوں کی۔ آلِ محمد اُڑ گئے۔ سب کچھ لٹ گیا۔ خیر۔ میرے فرجاءو۔ آج آلِ محمد یہ سہارا ہیں۔ جو لوگ حسین کے خاندان کے نہ تھے۔ مگر حسین کے پاس کہ حسین بن گئے۔ خدا گرا ہے کمال کر دکھایا ہے۔ کہو اکبر کی ماں، سنیانی تو نہیں تھی مگر ایمان سے کمال کر دیا۔ حد کر دی۔ اکبر کی لاش آئی ہوئی ہے۔ اور حسین کہتے ہیں۔ اس کی ماں کو لہوؤ۔ اپنے بچے کی لاش پر آئے تو پہے جواب یہ لا۔ کہ قہر ناز پڑھ رہی ہے۔ اماں نے پوچھا۔ سہیل کیا ناز پڑھ رہی ہے۔ کہا۔ مودا شکرانے کی ناز پڑھ رہی تھی۔ میری کماؤ نیک راہ میں لٹ گئی۔ اہل

اپنے بیٹے کی لاش کو آکر دیکھ۔ پانچ منٹ گزر گئے۔ خیمے سے سیلی نہیں آئی۔
 اب جو گئے نا، دیکھنے۔ دیکھا کہ سیلی خیمے میں گھوم رہی ہے۔ زینب
 نے آواز دی۔ اکبر کی ماں۔ باپ آؤ۔ کہا حسین کی بہن مجھے خیمے کا دروازہ نظر
 نہیں آ رہا۔ مجھے در نظر نہیں آتا۔ ہاتھ پکڑ کے لائے۔ قاسم کی ماں تو سیدانی
 نہیں تھی۔ یہ غیروں کا کمال تھا۔ دو چار فقرے سن لو۔ میرے جوان بیٹو۔!
 میں تمہیں رونا نہیں دیکھ سکتا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم ہر وقت خوش رہو۔ مگر مٹا
 کرنا۔ میری کہانی ہی ایسی ہے۔ اس لئے میں تمہیں جان کے نہیں ملتا۔ رہا ہے۔
 بھی اسی فکر میں ہے۔ غیر خاندان کی ہے نا۔ یمن کے رئیس کی بیٹی ہے سیدانی
 نہیں ہے۔ غیر خاندان کی ہے۔ ساری شہادتوں کے بعد حسین خیمے میں آئے
 ۔ بہن زینب میری ساری قربانیاں قبول ہو گئیں۔ کسی کے بدلے دینہ نہیں آیا۔
 اب میں چاہتا ہوں کہ کوئی نذرانہ پیش کروں۔ اللہ کے سامنے۔ کوئی نذرانہ پیش
 کرنے کے لئے کوئی شے ہے۔ زینب نے کہا۔ کہ میرے پاس تو دو ہیرے
 خیمے ختم ہو گئے۔ سیلی نے کہا۔ میرا تو اٹھارہ سال کا شب چراغ تھا۔ گل ہو گیا
 ۔ فردہ نے کہا کہ میرا واحد سہارا قاسم تھا۔ وہ بھی تقسیم ہو گیا۔ ہم سب
 خالی ہاتھ ہیں۔ ایک کونے میں سے رباب کی آواز آئی۔ حسین! ذرا سی نیلم
 کی گئی میرے پاس ہے۔ ایک نیلم کا ٹکینہ ہے میرے پاس اگر تیرے کام آئے
 تو اسے لے لے۔ کہا رباب اسے لے جاؤں۔ کہا لے جاؤ۔ جہاں جہاں صاحبنا
 ہو میری بات سنو۔ حسین چلے آئے۔ آگے آگے حسین پیچھے پیچھے رباب۔
 جب خیمے کے دروازے پہ پہنچے۔ رباب نے کہا۔ مولیٰ ذرا ٹھہرنا۔ ذرا یہ بچہ
 مجھے گود میں دینا۔ رباب نے دو منٹ گود میں لیا۔ اور اصرار کی بہن سکیتر کو
 ساتھ لیا۔ دوڑوں کو لے کر خیمے میں آگئی وہاں۔ جہاں زینب تھیں۔ حسین زینب

کو دیکھ کر کہا۔ حسن حسین۔ حسن زینب۔ تم فاطمہ کے بیٹے بیٹی ہو۔ میں
غیر خاندان کی ہوں۔ تمہارے گھرانے میں آئی تو فاطمہ کی بہو کہلائی۔ تم نے
مجھے بڑی عزت بخشی۔ تمہارے گھرانے سے مجھے یہ دوا ملے۔ ایک سکیٹہ
ایک اصغر۔ میں تمہاری دیر میں لاوارث ہوں گی۔ نہ سیکے ہوں کے دسرال
میں تمہاری امانت سنبھال نہیں سکتی۔ لہذا یہ تمہارے سپرد۔ یہ کہہ کر سکیٹہ کو
بٹھا دیا زینب کی گود میں۔ اصغر کو دے دیا حسین کی گود میں۔ زینب تو جانے
اور سکیٹہ جانے۔ حسین تو جانے اور اصغر جانے۔ دوزن کو سپرد کر دیا۔ حسین
اصغر کو لے گئے سکیٹہ کو زینب نے گئی۔ سکیٹہ یہ وہاں کیا گذری۔ اُس پر کیا
گزر گئی۔ اگر بہت ہے تو سن لو دو چار لفظ۔ کیوں بھئی نوجوانو!۔
تم میں ہے ہمت اس قدر کو سننے کی۔ میں تو بوڑھا ہو چکا ہوں میں تو پڑھ لیتا ہوں
جوانوں کے خون میں گرمی ہوتی ہے۔ حیدر آباد (سندھ) میں میں نے سکیٹہ
کی شہادت پر صحنی بھی کئی نوجوانوں نے چاقو مار لئے تھے۔ بچو! بھائیو!۔
سکیٹہ۔ زینب کے ساتھ اور تیر و محرم ہے۔ اور ابن زیاد کے دربار میں کھڑی
ہے۔ ابن زیاد نے پوچھا۔ کہ یہ بچی کون ہے۔ بتایا گیا کہ یہ حسین کی بیٹی ہے۔
حسین سے اسے بڑا پیار ہے۔ کہنے لگا بچی آگے آؤ۔ میں تم سے بات کرنا چاہتا
ہوں۔ بچی نے بھائی کو دیکھا۔ بھوپھی کو دیکھا۔ ناخرم سے بات کی اجازت
ہے۔ بھوپھی نے بھائی نے اجازت دی۔ بچی نے بات کی۔ سنو گے بھائی
بات اس طرح کی کہ لب ہل رہے تھے آواز نہیں آرہی تھی۔ بڑی دیر تک لب
ہلتے رہے آواز نہیں آئی۔ ابن زیاد کہتا ہے کہ مجھے آواز نہیں آتی۔ تو اَمَّا زَيْن الْعَابِدِ
نے فرمایا۔ کہ بچی تو بول رہی ہے مگر اس کا کھلا اتنا مضبوط بندھا ہوا ہے کہ اس کی
آواز نہیں نکل رہی۔ اس کا کھلا کھلوا یا گیا۔ پانچ منٹ تک بچی گلے کو سہلاتی

رہی۔ جب حواس ٹھیک ہوئے تو ابن زیاد نے پوچھا۔ کہ تیرا نام کیا۔
 کہا فاطمہ نام ہے مگر باپ مجھے پیار سے سکینہ کہتے تھے۔ بچی اگر اس وقت
 حسین زندہ ہوتے تو مجھے کیا کھلاتے۔ بچی نے کہا کہ بابا مجھے تازہ خرے کھلایا
 کرتے تھے۔ سونگے نامیرے بھائیو! اجازت ہے کہ دو لفظ۔ اجازت
 ہے۔ اجازت ہو تو بتا دوں۔ وہ بے حیا خلیفہ کہتا ہے۔ بچی نے
 تازہ خرے منگائے ہیں کھائے گی۔ اس پر بچی نے بھائی کو، پھوپھی کو دیکھا
 ۔ اشارہ کیا۔ کہہ دو۔ ہاں۔ کہا لے آؤ۔ بچی کے آگے طشت
 لایا گیا۔ رومال اٹھایا گیا۔ کوزہ میں زلزلہ آگیا۔ بچی ہائے بابا کہہ کے
 گر پڑی۔ ابھی بات ختم نہیں۔ سکینہ تمہارا یہ دعویٰ ہے کہ تمہارا خاندان معجز
 ہے۔ میں تو تب جانوں کہ حسین کا سر خود تیری گود میں آئے۔ یہ سنا تھا کہ خوش
 آگیا۔ جلال آگیا۔ حیدر کی پوتی کو۔ سر کو چھوڑ کر چند قدم پیچھے ہٹ گئی۔ اور
 پٹھا ہوا کرتہ پھیلا دیا۔ بابا جان۔ میری محبت کا واسطہ۔ پھوپھی زینب
 کی قیر کا واسطہ۔ بابا میری عزت کا سوال ہے۔ مجھے دربار میں شرمندہ نہ کرنا۔
 حسین کا سر اڑ کر سکینہ کی گود میں آگیا۔ کوزہ کے بام در لرز گئے۔ زلزلہ
 آگیا۔ آج کی مجلس کو میں اپنی طرف سے آپ کی طرف سے بانیانِ مجلس کی طرف
 سے حضرت سکینہ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ شہزادی ہماری حامی کو قبول فرما
 شہزادی ہم کو بلا میں ہوتے تو مجھے قید نہ ہوتے دیتے۔ در بدر نہ ہونے دیتے۔
 اپنے باپ اور دادا سے ہماری سفارش کرنا کہ خدا ان گھروں کو آباد رکھے۔ جن میں
 سادات کے اُجرے گھروں کا ماتم ہوتا ہے۔ خدا تم سب کو سلامت رکھے۔ بحق
 مُحَمَّدٌ وَآلِ مُحَمَّدٍ۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ
 اللَّهُمَّ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ وَآلِ مُحَمَّدٍ

آل ابی طالب

عنوان

آل ابی طالب
شہزادہ علی اکبرؑ

فضائل
مصائب

ہر آخری سلام کو اکبرؑ بھیجے ہوئے
نقشہ کفچیا ہوا ہے رکوع رسولؐ کا

نکستی و رکاوٹ

خداوند عالم کی حمد و ثنا اور حضرات محمد وآل محمد علیہم السلام پر درود و سلام کے بعد میں اس طرح گزارش کرتا ہوں کہ اللہ اپنے علم و فضل کے مطابق اپنا جو کام لینا چاہتا ہے، کسی انسان سے۔ اس کام کے مطابق آدمی وہ خود چن لیتا ہے اس سے میں نے یہ کام لینا ہے۔ اس سے یہ کام لینا ہے۔ انسان، خدا خود انسانوں میں سے چن لیتا ہے اپنے کام کے لئے۔ سمجھ رہے ہیں نا صاحبان۔ اللہ کے یہاں الیکشن نہیں، اللہ کے ہاں سلیکشن ہے۔ اب میں انگریزی لفظوں کے معنی تو جانتا نہیں سنئے ہوتے ہیں نہ کہہ دیتے ہیں۔ ہم لوگ کرتے ہیں الیکشن اور اللہ کرتا ہے سلیکشن۔ ہم بہت سے مل کے چنتے ہیں ایک کو اور اللہ چنتا ہے بہت سوں میں سے ایک کو۔ سلیکشن کا ترجمہ چننا اور الیکشن کا ترجمہ ہے چھٹا ٹھنا۔ جو بندہ سلیکشن سے آئے وہ چنا ہوا ہوتا ہے۔ جو الیکشن سے آئے وہ چھٹا ہوا ہوتا ہے۔ بہر نوع اللہ چن لیتا ہے اپنے کام کے لئے اس آدمی کو جسے موزوں سمجھتا ہے توجہ ہے نا صاحبان۔ اور اس بڑی مختصر سی تمہید کے بعد میں اپنی مجلس شروع کرتا ہوں تاکہ تھوڑے وقت میں ختم ہو۔

میرے محترم سامعین! اللہ نے اپنا کام لیتے کے لئے جس خاندان کو چن لیا وہ خاندان بنی ہاشم کہلاتا ہے اس خاندان کو اللہ نے چن لیا تھا۔ اس لئے کہ اس خاندان سے وہ اپنا کام لینا چاہتا تھا۔ اس لئے یہ خاندان، اللہ نے چن لیا۔ اور اس بنی ہاشم کے خاندان میں سے بھی ہر فرد سے کام نہیں لیا بلکہ اس خاندان کا جو فرد جس کام کے لئے موزوں ہوا وہ کام اللہ اس فرد سے لیتا رہا۔ عبدالمطلب سے کعبے کی حفاظت کا کام لیا جب ابراہہ آیا تھا ہاتھی لے کر۔ اور عبدالمطلب کے بعد ان کے جانشین حضرت ابوطالب سے جن کا نام نامی ہے عمران کیت ہے ابوطالب۔

جن کے خطابات ہیں بیضۃ البلاء، شیخ البطی، سید القوم۔ یہ ان کے خطابات ہیں۔ سب سے پہلے عرب میں لفظ سید، جناب ابوطالب کے لئے استعمال ہوا اور آج تک ان کی نسل کے ساتھ یہ لفظ مشہور ہو گیا۔ جناب ابوطالب سے بھی کام لیا۔ اللہ نے۔ اور یہ کام ابی طالب کے سپرد ہوا کہ میرے رسولؐ کو جو میری اس تمام مخلوق میں ہیں سب سے زیادہ معزز اور قیمتی ہے، اے ابوطالب اس کو ہم تیرے سپرد کرتے ہیں۔ تم اسے پالو اور پرورش کرو۔ توجہ فرمائی نا صاحبان۔ اللہ نے اپنی سب سے قیمتی شے سپرد کردی ابوطالب۔ یہ فقرہ آپ نے سُن لیا۔ اسکی ذرا سی تشریح کہ دون آپ سے۔ میرے ہاتھ میں یہ ملل کار و مال ہے۔ پتر نہیں آٹھ آنے کا ہے، چھ آنے کا ہے۔ ایسا ہی کچھ ہو گا چھ چار آنے کا۔ میں چاہتا ہوں یہ رومال کسی کے سپرد کروں۔ اب اتنا مجمع ہے میرے سامنے۔ سب ماشاء اللہ مومن ہیں۔ میں نے یونہی ہاتھ بڑھا کے ایک آدمی کو دے دیا رومال۔ اب مجلس کے بعد پوچھتا پھرتا ہوں۔ بعض میز رومال کس کے پاس تھا، کہاں ہے؟ کون سے گیا وہ رومال میرا؟ لوگ کہیں گے نزدیک صاحب، تم نے خود غلطی کی۔ کسی جانے پہچانے کو دینا تھا۔ کسی ایماندار کے سپرد کرنا تھا۔ کسی شریف آدمی کے سپرد کرنا تھا۔ جب ایک کپڑے کا رومال سپرد کرتے ہوئے جان پہچان دیکھنی پڑتی ہے۔ شرافت دیکھنا پڑتی ہے، ایماندار دیکھنا پڑتی ہے تو اللہ نے محمدؐ جیسی قیمتی شے سپرد کرتے وقت یہ نہیں دیکھا ہو گا کہ یہ بندہ شریف ہے یا نہیں؟ ایماندار ہے یا نہیں؟ اور اللہ جسے اتنا ایماندار سمجھے کہ محمدؐ جیسی شے سپرد کر دے، ایسے ایماندار کو بے ایمان کہنا، بے ایمانی ہے کہ نہیں جہنم نفع یہ تو کام اللہ نے ابی طالب کو دیا، اور ابی طالب نے اپنی گود میں نبوت کو بھی پالا، امامت کو بھی پالا۔ گویا زیر دامن ابی طالب پل کر نبوت آخری نبوت بن گئی، اور امامت پہلی امامت بن گئی۔ ابی طالب کی پرورش کے بعد۔ تو یہ کام اللہ ابی طالب سے ہے رہا

اور آج تک خدا کا کام نسل ابی طالب کے پُر دہے اور اللہ کی بکری بنانے کے لئے آج جس ابی طالب کا کنبہ دنیا میں زندہ ہے اور قائم ہے۔ یہ کام اللہ نے ابی طالب کے سپرد کیا۔ میری بات پہ توجہ ہے نا صاحبان۔ بڑی مختصر مختصر بات۔ ادھر ابی طالب تھے قابل کہ آتے ہی سامنے شیطان آگیا۔ ابراہیم کے آتے ہی سامنے فرود آگیا۔ موسیٰ کے سامنے فرعون آگیا۔ اس خاندان بنی ہاشم کے مقابلے پر خاندان بنی۔ وہی آگیا جو آپ کہہ رہے ہیں۔ یہ خاندان آگیا۔ اس خاندان بنی بھی بہت بڑے بڑے آدمی پیدا ہوئے۔ بڑے بزرگ آدمی پیدا ہوئے۔ ایک صاحب فرماتے تھے کہ جتنے بڑے آدمی پیدا ہوئے سب اس خاندان میں ہوئے۔ وہی خاندان جس کا نام آپ سے رہے ہیں بنی ہاشم میں کوئی بڑا آدمی پیدا نہیں ہوا۔ میں نے کہا بالکل۔ بنی ہاشم میں تو جو پیدا ہوا بچہ پیدا ہوا۔ امیہ کے خاندان میں جو پیدا ہوا بڑا پیدا ہوا۔ یہ خاندان بنی ہاشم کے مقابلے کا خاندان ہو گیا۔ وہ دن تھے تو یہ رات تھے۔ اس خاندان میں بھی بڑے آدمی تھے۔ اُس خاندان میں بھی بڑے بڑے آدمی تھے۔ اس خاندان کے بڑے آدمیوں میں سے ایک بڑے آدمی کا نام لیتا ہوں وہ تھے حضرت ابی سفیان۔ نام سُنا ہے نا آپ نے۔ حضرت میں نے اس لئے لکھا کہ بڑے حضرت تھے۔ اگر آپ چاہیں تو ان کے فضائل بھی بیان کر دوں۔ حضرت ابوسفیان کے۔ سنیں گے آپ؟ فضائل پڑھوں؟ لو صاحبان اس ایک جملے پر فضائل ختم کرنا ہوں یہ یزید کے سہمی دادا تھے۔ یہ ان کے فضائل ہیں۔ یزید کے دادا جان۔ حضرت ابوسفیان۔ یہ اس خاندان میں پیدا ہوئے۔ جتنی جنگیں رسالت مآب سے ہوئیں ان سب جنگوں میں کفر کی فوج کے سپہ سالار بھی حضرت سفیان ہوا کرتے تھے۔ توجہ ہے نا صاحبان۔ مکہ کی فتح کے بعد اسلام کا اعلان کر دیا اور یہ بدلنے لگے۔ یہ میرے محترم سامعین بڑے غور سے سننا شروع کرنا اب میں

مطاب کی بات سنتا ہوں آپ کو تاکہ اپنے وقت میں مجلس بھی ختم ہو جائے اور بات بھی ختم ہو جائے۔ اس حضرت سنیان کے تین چار بیٹے تھے۔ جن میں سے ایک شہرہ آفاق بیٹا۔ وہ ہے امیر شام۔ یزید کے والد بزرگوار۔ یہ ان کا شہرہ آفاق بیٹا ہے۔ ابوسفیان کا۔ سمجھے حضور۔ نام یاد نہیں، مگر کا کوئی۔ نامور بیٹے تھے۔ اور جناب کئی بیٹیاں بھی تھیں ان کی۔ اس وقت اس مجلس میں مجھے آپ کی مندرکشت پوری کرنے کے لئے، مجلس سنانے کے لئے ان کی دو بیٹیوں کا ذکر کرتا ہوں۔ حضرت ابوسفیان کی دو بیٹیوں کا تذکرہ آپ کو سنا ہے۔ یہ آپسئیں۔ اور عورت سے سئیں۔ ان کے دو بیٹیاں تھیں۔ ایک کا نام تھا اُمّ حبیبہ، ایک کا نام تھا جادہ۔ یاد رکھیگا آپ کو۔ ایک اُمّ حبیبہ، ایک جادہ۔ یہ جو حضرت ابوسفیان کی بیٹی تھیں اُمّ حبیبہ، ان کی شادی ہوئی تھی حضور سرور کائنات سے۔ ابوسفیان کی بیٹی اور ہم مومنوں کی ماں، جناب اُمّ حبیبہ۔ اُمّ حبیبہ ہماری ماں تھیں۔ ان کے باپ سے بہار کیا رشتہ ہوا؟ سنو گے؟ کس نے مجھ سے پوچھا، اُمّ حبیبہ تو ہماری ماں ہیں، ان کے باپ سے کیا رشتہ ہے۔ میں نے کہا۔ نا۔ نا۔ بہر نوع یہ اُمّ حبیبہ حرم رسول ہیں اُمّ المؤمنین ہیں۔ واجب الاحترام ہیں۔ رسول کی بیوی ہونے کی حیثیت سے اور ہم مومنوں کی ماں ہیں اور ہمارے دلوں میں ان کی بڑی عزت ہے ماں ہونے کی حیثیت سے۔ سمجھے نا آپ؟ ان کے فضائل کتابوں میں بھرے پڑے ہیں بحیثیت اُمّ المؤمنین مگر سب سے بڑی فضیلت ان کے جو مسلمانوں نے کتابوں میں لکھی ہے وہ یہ ہے کہ جناب اُمّ حبیبہ ایک دن رسول کے گھر بیٹھی تھیں، ان کے باپ ابوسفیان ان سے ملنے آئے۔ مسلمان تھے نا۔ مسلمان ہونے کے بعد یہ شادی ہوئی تھی۔ جب انہوں نے حجرے میں قدم رکھا۔ آگے کہا بیٹی خیریت تو ہے؟ جب باپ آتا ہے ملنے۔ تو بیٹی نے درج جو کچھ دانتی وہ سمیٹ دی۔ زمین پر اشارہ کیا ابا جیجی! شریف رکھو۔ کہا دیکھو اُمّ حبیبہ تم نے یہی

توہین کی ہے۔ جانتی ہو ہم کون ہیں؟ ہم عرب کے بے تاج بادشاہ ہیں۔ ہم ملائکہ ہیں۔
 لیکر آئے تھے مقابلے کے لئے۔۔۔ دنیا ہوا کلمہ پڑھو ہے۔ ہمیں دیکھ کر شیطان تک جھکتا
 ہے۔ تم نے ہمیں کی تجھلے ہے۔ یہ درمی کیوں سمیٹ دی۔ ہمیں بیٹھے نہیں دیا۔ اتم حبیبہ
 نے بڑے ادب سے کہا کہ جناب بات یہ ہے کہ یہ درمی وہ ہے جس پر رسول بیٹھے ہیں۔
 اس پر آپ اس طرح نہیں بیٹھ سکتے۔ یہ راقعہ کلہ کر سلمان موزخ یہ لکھتے ہیں کہ یہ ہے
 اس کے کامل الامین ہونے کی دلیل۔ یہ ہے اُس کے اتم المؤمنین ہونے کی دلیل۔ میں بھی بیٹھ
 یہی کہتا ہوں کہ واہ اتم حبیبہ، اتم المؤمنین ہو تو ایسی ہو کہ رسول کی جگہ پر باس کو نہ بیٹھے
 دے۔ یہ ہے شان اتم المؤمنین۔ سمجھ رہے ہو نا ما جان۔ اور میرے مختصر سامعین
 اللہ آپ کو سلامت رکھے وہ خوش رکھے۔ میں ایک بات آپ سے بیچ میں بیٹھا کہنا چاہتا ہوں۔
 چونکہ جہنم میں رہا ہے اور بات بھی کر رہی ہے۔ آپ پر چھیں گے کہ کس کتاب میں
 کہیں نہیں۔ یہ خود کہاں ہے؟ کہیں نہیں۔ یہ میں اسبہ دل کی بات کہہ رہا ہوں پہلے ہی
 بتائے دیتا ہوں۔ اگر اس پر کوئی اعتراض ہے تو وہ گھر بیٹھ۔ یہ میرے مذہب کی کتاب
 کی بات نہیں ہے کہ قیامت کے دن ایمان کا شہادہ، اور شہادہ، جس کے لئے کتابوں میں یہ بھی
 لکھا ہوا ہے کہ جہنم میں رہنے کا اجر کا ہونا ہے۔ اللہ اسے کیسے پکھڑا فرمائے گا۔ جو
 آگ کو اس سے دور رکھے گا۔ یہ اُسے رحمت کا حصہ ہے۔ یہ تو کتابوں کی بات ہے، اور
 میں اپنی بات کہتا ہوں۔ یہ لکھا ہے کہ اسے کیسے؟ جب فرشتے سے جا رہے ہونگے اسے
 جہنم میں، یہ میری ذاتی بات ہے اور یہ جاتے جاتے کہ دیگاہ جہنم میں تو میں جلاؤنگا،
 پر جانے سے پہلے میں ذرا اپنے نواسے سے ملنا چاہتا ہوں۔ اس کو لے تھے زین العابدین
 زین العابدین سے اس کا اما سامتا ہو جائے گا اور یہ زین العابدین تے کہے گا۔ تم میرے
 نواسے ہو۔ فرشتے خود شرمنا جائیں گے۔ اسکو جہنم میں لے جاتے ہو گے۔ اللہ جس کو بھلا
 چاہتا ہے اس کے گھر نواسہ پیدا کر دیتا ہے۔ اس میں کے گھر نواسہ نہ ہو اس کا کوئی بچہ نہ ہوا۔

کوئی اسے بچا نہیں سکتا۔ یہ جناب ام حبیبہ کی بات آریکے ذہن میں آگئی۔ اب اسے بی بی پلٹ کے دوسری بہن کا قہقہہ سنائی۔ جس طرح عرب بنی ہاشم شرافت میں مشہور تھے، اور ان کا مقابلہ خاندان سیاست میں مشہور تھا۔ یہ لفظ میں نے احتیاط کہا ہے، سیاست ہیں۔ اسی طرح عرب ہیں، ایک خاندان تھا جو حسن میں مشہور تھا۔ اس کا نام تھا خاندان بنی ثقیف۔ یاد رہے گا آپ کو خاندان بنی ثقیف حسن میں مشہور تھے۔ اور خاندان بنی کلاب یہ شجاعت میں مشہور تھا۔ یہ عرب کے مشہور خاندان تھے۔ اگر بہادر کا نام نو قوس بنی کلاب سمجھے جاتے تھے۔ اگر حنین کہو تو بنی ثقیف سمجھے جاتے تھے۔ اگر شریف کہو تو بنی ہاشم کہنے جاتے تھے۔ اگر عمار کہو تو..... پھر وہ..... یہ تھے مشہور عرب کے خاندان۔ تو بنی ثقیف کے خاندان کا رئیس ادھر شیخ تھا اس کا ابو عمر نام تھا۔ ابو عمر ثقیفی۔ حضرت ابوسفیان کی دوسری بیٹی، ام حبیبہ کی سگی بہن۔ ابو عمر ثقیفی سے بیاہی ہوئی تھی تو ابو عمر ثقیفی، خاندان ثقیف کا سردار اور رمانتھا اب اس میں کیا ہوئے تھے۔ بولو۔ ہنس دے آپس میں ہم زلفت سہتے۔ ایک بہن ابو عمر ثقیفی کے گھر میں تھیں اور ایک بہن جناب رمانتھا کے گھر میں۔ آپ گھبرا تو نہیں گئے میری اس بات سے۔ سنئے ہونا غور سے۔ رمانتھا آپ کے گھر تو کوئی اولاد نہیں ہوئی جناب ام حبیبہ سے۔ ابو عمر ثقیفی کے گھر جو ابو حنیان کی صاحبزادہ تھی ان کے ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ سمجھے نا۔ ایک لڑکی پیدا ہوئی ابو عمر ثقیفی کے گھر۔ ابوسفیان کی بیٹی، امیر شام کی بہن، ان کے ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام تھا لیلی۔ اب یاد رکھیں گے نا۔ لیلی ابو عمر ثقیفی کی بیٹی، ابوسفیان کی نو مسلم بیٹی۔ امیر شام کی بیٹی۔ یہ یزید کی کیا جو بیٹی؟ بولو نا؟ بولو جھٹی۔ امیر شام کی چھانچھی تھی یہ یزید کی چھوٹی زاد بہن تھیں۔ حقیقی چھوٹی زاد بہن، جناب لیلی۔ یہ وہی جناب لیلی۔ اب یہ بات بھی آپ کی سمجھ میں آگئی نا۔ ابو عمر ثقیفی کی جو لڑکی تھی ان کا ابوسفیان سے کیا رشتہ تھا جھٹی؟ نو مسلم کا۔ امیر شام کی کیا تھیں وہ؟ چھانچھی۔ یزید کی کیا تھیں؟

کچھ بھی زاد بہن۔ کس خاندان سے تھیں۔ بنو ثقیف ہے۔ بنو ثقیف کی صفت کس بات کی تھی۔؟ حسن و جمال کی۔ تو لیلیٰ اپنے زمانے میں رئیس بنی ثقیف کی بیٹی ہونے کی حیثیت سے ان تمام خبریں کی مالک تھیں جو اس خاندان کی تھیں۔ سمجھ میں آرہے نامہ جان کے۔ جب یہ جوان ہوئیں لیلیٰ تو ان کے باپ کو شادی کی فکر ہوئی۔ اس نے چاہا کہ میں اپنی لڑکی کی شادی کروں۔ جہاں جہاں بیٹھے ہیں بڑے غور سے سننا بات کو۔ وہ اپنے گھوڑے یا ناتے پہ سوار ہوا حضور اور مدینے آیا۔ وہاں مدینے کی مسجد میں حضور سید الشہداء امام حسین سے اس کی ملاقات ہوئی اس ابو مرہ ثقیفی کی۔ امام حسین علیہ السلام سے وہ ملا۔ آپ کے خدمت میں امام حسین کی وہ بیٹی گیا اور بیٹھ کے عرض کیا اس نے کہ قبلہ میں ایک دفتر آپ کے ناما کے پاس بھی آیا تھا۔ میں نے آپ کے ناما سے ایک حدیث سنی تھی وہ مجھے پوری طرح یاد نہیں ہے۔ میں آپ کو جو سناتا ہوں۔ اگر کہیں بھی بھول جاؤں تو۔۔۔ قبلہ آپ اس کی تصحیح کر دیں۔ آپ نے کہا ہاں سناؤ کیا ہے؟ اس نے کہا آپ کے ناما نے یہ فرمایا تھا کہ اگر تمہیں کو مشکل پیش آئے تو ایسے شخص کے پاس جانا مشکل کو حل کرنے کے لئے جو تمہارے علاقے میں تمہاری دسترس میں سب سے زیادہ عالم ہو۔ اس نے کہا یہ ٹھیک ہے۔ وہ حدیث جو آپ نے فرمائی تھی؟۔ انہوں نے کہا ٹھیک ہے تجھے صحیح یاد ہے۔ یہی کہا تھا میرے ناما نے۔ اس نے کہا کہ قبلہ آگے بھی ہے۔ کہ ہاں کیا؟ کہ آگے فرمایا تھا آپ کے ناما نے کہ اگر عالم تمہیں نہ مل سکے تو ایسے شخص کے پاس جانا جو حسبِ اہلِ نسب میں سب سے زیادہ شریفین ہو۔ اس نے کہا ٹھیک ہے؟ آپ نے فرمایا بالکل ٹھیک ہے۔ تو نے ٹھیک کہا۔ اس نے کہا حضور آگے یہ کہا تھا کہ اگر حسبِ نسب والا نہ ملے تو ایسے بندے کے پاس جانا جو سب سے زیادہ حسین ہو تیری نظروں میں۔ آپ نے فرمایا ہاں ٹھیک ہے۔ بالکل ٹھیک۔ کہا حضور مجھے ایک کام ہے۔ میں ایسے آدمی کے پاس بیٹھا ہوں جو علم میں بھی سب سے زیادہ ہے، حسبِ نسب میں بھی سب سے بہتر ہے، حسن میں بھی سب سے

بہتر ہے۔ یہ تینوں صفیق ہیں۔ میری مشکل آپ حل کریں گے۔ سُن لیا آپ نے۔ آپ نے اس کی یہ بات سُن کے اب اس سے یہ سوال کیا کہ ہم تم سے کچھ پوچھنا چاہتے ہیں۔ اُس نے کہا قبلہ فرمائیے کیا پوچھنا ہے؟ کہ یہ بتلاؤ کہ دُنیا میں سب سے بڑا آدمی کونسا ہے؟ میری بات کو آپ حضرات سمجھ رہے ہیں۔ اُس نے کہا حضور، سب سے بڑا آدمی دُنیا میں وہ ہے جس کے پاس علم معہ علم کے۔ علم نہیں۔ علم معہ علم کے۔ اس کے ساتھ بے صبری ہو تو یہ علم کی توہین ہے۔ علم ہو معہ علم کے۔ آپ نے فرمایا بے شک تم نے ٹھیک کہا۔ اچھا۔ اور اگر یہ نہ ہو کسی کے پاس پھر؟ کہ قبلہ اس سے دوسرے نمبر پر آدمی وہ ہے جس کے پاس دولت ہو معہ سخاوت کے۔ آپ نے فرمایا۔ اچھا بالکل ٹھیک کہا۔ اگر یہ بھی نہ ہو تو پھر۔ کہ حضور تیسرے نمبر پر آدمی وہ ہے جس کے پاس فقیری ہو معہ قناعت کے۔ آپ نے فرمایا شامش بالکل ٹھیک کہا تم نے۔ بالکل درست ہے۔ اور اگر یہ بھی نہ ہو کہ حضور اسل آدمی کو مر جانا چاہیے۔ اسے زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔ آپ نے ٹھیک کہا۔ تو نے بالکل صحیح جواب دیئے۔ اب بتاؤ تم کیا چاہتے ہو تم سے؟ کیا مانگتے آئے ہو۔ اس نے کہا مانگوں؟ کہ ہاں۔ میری بات قبول فرمائیں گے۔ کہ بالکل۔ کہ حضور مجھے خدا نے ایک لوہی دی ہے۔ میں خاندانِ ثقیف کا رئیس ہوں۔ میرے اور کوئی اولاد نہیں۔ میں حضور کی خدمت میں اس سے آیا ہوں۔ میری تمنا یہ ہے کہ جیسی میری لڑکی ہے، داماد میرا وہ ہو کہ میں دنیا کے سامنے فخر سے کہہ سکوں کہ آؤ دیکھو یہ ہے میرا داماد۔ آپ نے فرمایا تم کیسے چاہتے ہو؟ کہ حضور اگر میری لڑکی کو قبول فرمائیں۔ آپ نے فرمایا منظور ہے۔ چنانچہ لیلیٰ کا عقد حضور سید الشہداء سے ہوا۔ تو جو فرمائیے انا جان د بات یہ میری غور فرمائیے ہیں حاضر۔ سید الشہداء کی پہلی بیوی جو ثقیف والہ ام المومنین بی بی زہراؑ کی شہزادی تھیں۔ پھر عقد ہوا آپ کا لیلیٰ سے۔ یہ قبیلہ بنی ثقیف کے سردار کی بیٹی تھیں۔ پھر عقد ہوا آپ کا رباب سے جو تھیں کے ایک رئیس امراء بن تیس کی بیٹی

تھیں۔ بہرِ نوح حضور۔ اس وقت میرا مطلب یہ سننا تھا۔ یہ بات یاد رہے گی نا آپ کو۔
یاد رکھو گے نا اس کہانی کو۔ انا اللہ یاد رہے گی۔ لکلی کا عقد ہو گیا حضور سید الشہداء کے
ساتھ۔ اللہ آپ کو سلامت رکھے۔ خدا آپ کو خوش رکھے۔ اب میری کہانی غور سے
سننے رہنا۔ تاکہ وقت میں بات بھی ختم ہو سکے۔ اور آپ بھی سن لیں۔ میرے محرم
سامعین اور وہ محترم حضرات جو دھوپ میں بیٹھے ہیں مجھے کا بڑا احساس ہے۔
مگر میں دھوپ میں بیٹھنے والوں سے یہ بات کہتا ہوں۔ تم مقدس دیر بیٹھو گے۔ پھر اے
بعد اٹھ کے کھڑے جاؤ گے۔ اور حسین کی شہزادی فاطمہ کبرا پورے چھ سال دھوپ میں
بیٹھی۔ چھ سال تک دھوپ میں بیٹھی رہی۔ پورے چھ سال۔ بہرِ نوح۔ یہ غم حسین
دھوپ اور یوں کوٹھنا دیتا ہے۔ ساری چیزیں ختم کر دیتا ہے۔ تو میرے محرم سامعین!
غور سید الشہداء کو خدا نے جب پہلا بیٹا امام زین العابدین عطا فرمایا پھر فرزند تھا شہداء
امام زین العابدین۔ تو آپ نے اپنے بیٹے کا نام علی رکھا۔ اور بچے کو قطعہ رومال میں لپیٹ کر
مسجد میں لے آئے۔ وہاں مسجد میں لٹا کر دو رکعت نماز پڑھی اور پھر دعا کی امام
نے۔ خداوندائے نعمت تو نے مجھے دی تھی۔ میں تیرے ہی سپرد کرتا ہوں۔ یہ کہہ کے
مسجد میں لٹا چھوڑ کر بچے کو، کھڑا گئے۔ جب زین العابدین علیہ السلام پیدا ہوئے،
امیر المومنین اس وقت دنیا میں موجود تھے۔ انہیں یہ معلوم ہوا۔ مسجد میں گئے دو رکعت
نماز پڑھی۔ خداوندائے حسین تو تیرے سپرد کر گیا۔ میں مانگنے آیا ہوں۔ امام زین العابدین
کو جناب ائیر لے آئے ساتھ اور کہا کہ میں نے اسے خدا سے مانگ لیا ہے۔ میں پاؤں نکال۔
یہ میرا بیٹا بن کے رہے گا۔ میں پرورش کروں گا اس کی۔ یہ تو امام زین العابدین کی بات
ہوئی۔ اب تفصیل میں جائیں تو بڑی دیر ہو جائے گی۔ اس کے بعد آپ کے گھر بیٹیاں ہوئیں
اس کے بعد حسبِ درجہ چلتا پیدا ہوا جسے آپ علی اکبر کہتے ہیں تو یہ بطن جناب سیدہ لیلیٰ سے
پیدا ہوا۔ جناب علی اکبر جو لیلیٰ کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔ یہ بناؤ علی اکبر کی زیہ

سے کیا رشتہ تھا۔ بولو۔ ایلی تھی نا پھر بھی زاد بہن۔ علی اکبرؑ کی ہوئے۔ یاد رکھنا اس بات کو۔ علی اکبرؑ کی ہوئے یزید کے۔ ہیں؟ بھانجے؟ سمجھ رہے ہو نا صاحبان۔ اور دوسرا بچہ ایلی کے بطن سے لڑکی پیدا ہوئی۔ جس کا نام ہے فاطمہ صغراؑ۔ ہیں۔ فاطمہ صغراؑ کیا ہوئیں یزید کی؟۔ بولو نا عیسیٰ؟ بھانجی۔ یاد رکھو گے اس بات کو۔ اس بات کو تم نے یاد رکھا تو ساتھ ساتھ یہ بھی یاد رکھنا۔ جب حسینؑ جانے لگے کہ با تو آپ نے حکم دیا فاطمہ صغراؑ ہمارے ساتھ نہیں جا سکتی۔ اسے ہم ساتھ نہیں لے جائیں گے۔ پوچھا بیٹیوں نے کیوں؟ کہ یہ یزید کی بھانجی ہوتی ہیں۔ اگر بقیہ ہو کے دربار یزید میں گئی اور یزید نے بھانجی کے رشتے کی وجہ سے اسے قیدیوں سے جدا کر دیا۔ محل میں بھیج دیا۔ نیک نیتی سے بھانجی سمجھ کے۔ بھیج دیا محل میں۔ قیامت تک ہمارے دشمن ہمارے شیعوں کو یہ طعنہ دیا کریں گے۔ اس لئے اس لڑکی کو بے جا مصلحت کے خلاف ہے۔ اسے ہم نہیں لے جائیں گے اب سمجھے آپ فاطمہ صغراؑ کو کیوں چھوڑا تھا۔ ورنہ بیماری حسینؑ کے لئے کیا شے ہے۔ اب آپ ذہن میں آگئی بات۔ جب شہزادہ علی اکبرؑ پیدا ہوئے۔ دوسرے فرزند تو حسب عادت حسینؑ نے اس بیٹے کو بھی لے جا کر مسجد میں لٹا دیا۔ وہی دور کعت نماز پڑھی۔ وہی دعا کی خداوند اتو نے یہ نعمت مجھے دی تھی۔ میں تیرے سپرد کرتا ہوں۔ اس وقت امیر المؤمنینؑ تو رستے نہیں۔ حسینؑ تو مسجد میں لٹا کے چلے آئے۔ اور برقعہ پہن کر زینبؑ گئیں۔ مسجد میں۔ اور جا کے مسجد میں دو رکعت نماز پڑھی اور بچے کو اٹھا لیا۔ خداوند اسے میں مانگتی ہوں علی اکبرؑ زینبؑ لے آئیں مانگ کے۔ اچھا تم جانو اور تمہارا بچہ جانے۔ جناب علی اکبرؑ، زینبؑ کی گود میں پلے۔ زینبؑ کی گود میں پرورش پائی، زینبؑ کے پاس ہے۔ یہاں تک کہ جس طرح امام زین العابدینؑ، علی ابن حسینؑ کہلاتے ہیں۔ علی اکبرؑ، علی ابن زینبؑ مشہور ہو گئے۔ زینبؑ کا بیٹا علی اکبرؑ۔ زینبؑ کے بیٹے مشہور ہو گئے۔ اٹھتا زینبؑ کے ساتھ کھاتا پیتا زینبؑ کے ساتھ۔ گود میں زینبؑ کی۔ اگر کوئی شے مانگتی تو زینبؑ سے۔ کوئی

مند کرنی تو جناب زینب سے ۔ بالکل سو فیصد اس شہزادہ کا تعلق جناب زینب سے تھا ۔ میری بات سن رہے ہیں صاحبان ۔ اللہ تمہیں سلامت رکھے ۔ اہم حسین اکثر زینب سے کہا کرتے تھے بہن میرا دل چاہتا ہے کہ تمہارا بیٹا مجھ سے بھی کوئی شے مانگے ۔ زینب جناب میں کہیں ۔ میرا بیٹا غیرت دار ہے ۔ وہ کیوں مانگے ۔ میں موجود ہوں ۔ کبھی علی اکبر نے حسین سے کوئی سوال نہ کیا ۔ حسین کے دل میں یہ تمنا تھی کہ یہ مجھ سے کچھ مانگے ۔ مجھ سے کوئی سوال کرے ۔ مگر سب مانگتے زینب سے ۔ جو سوال کرتا زینب سے ۔ جو عرض کرتا زینب سے ۔ ان کا نام ہی قبلہ دنیا میں علی ابن زینب مشہور تھا ۔ کون ہیں علی اکبر ۔ زینب کے بیٹے ہیں ۔ حسین کے بیٹے نہیں کہلاتے تھے ۔ علی ابن زینب کہلاتے تھے ، باہر جانے لگتے تھے نا گھر سے تو زینب بازو پکڑ کے دعائیں کرتی تھی ، میرے بچے کو کسی کی نظر نہ لگ جائے ۔ مشہور عربی کا محاورہ ہے ۔ علی اکبر سے زینب کہا کرتی تھی کہ بیٹا اس طرح نہ چلا کہ ، یہ بالکل علی کی چال ہے ، ادھر ادھر چلا کر ۔ اس طرح باتیں تھیں ۔ ستر سو سال تھا کہ مدینے سے روانہ ہو گئے ۔ چلے ۔ سنو گے ۔ اور آپ سنیں گے توجیران ہوں گے ۔ حیران کیا اس خاندان کی ساری باتیں ایسی ہیں ۔ جب آل محمد ، خواتین ، مدینے میں سوار ہونے اپنی سواریوں پر تو اس وقت عصر کا وقت تھا ۔ ۲۸ رجب ثنی ۔ سنو گے مسلمانو ۔ ایک ایک ناقہ آتا تھا دروازے پر ۔ اور آواز آتی تھی ” مادرِ قاسم کی سواری حاضر ہے ” ۔ اور مادرِ قاسم آتی تھیں ۔ قاسم سلم کر کے انہیں سوار کراتے تھے ۔ پھر آواز آتی تھی فدا خاتون ۔ فدا خاتون ، اور اس خاتون کے متعلقین سوار کراتے ۔ سب سے آخر میں کاہے پردل والی محل دروازے پر آئی ، ناقہ بٹھایا گیا ۔ اس وقت سید الشہداء مسجد میں بیٹھے تھے ۔ اصحاب رسولؐ سے گفتگو فرما رہے تھے ۔ آپ نے پاس بیٹھے والوں سے فرمایا ۔ بھائیو فدا مجھے اجازت دو میں خود کھڑے ہو کر زینب کو سوار کراؤں گا ۔ امام خود تشہید لائے اور قمر بنی ہاشم نے آواز دی ۔ ملے والو ، اب زینب سوار ہو رہی ہے ۔ اور دیکھو کوئی شخص

سواری پر چڑھ کر زمین سے نہ گدڑ نے پائے۔ کوئی آدمی چھت پر نہ چڑھے پائے۔ محفل میں شور نہ ہو۔ خبردار جو کسی نے کوئی ایسی بات کی۔ اس طرح ایک ایک خاتون سوار ہر ہر تھی ام خود آئے بہن کو سوار کرانے۔ جب آپ آئے ہیں سوار کرانے بہن کو ایک بازو زینت کا حسین نے ایک بازو علی اکبر نے ملتا ہے۔ اس طرح دروازے تک آئیں۔ اور جب دروازے پر پہنچی ہیں اس طرح تو یہ پہلا موقع ہے کہ زینت نے اپنی زندگی میں علی اکبر سے کہا کہ بیٹا میرا بازو چھوڑ دو۔ علی اکبر نے چھوڑ دیا۔ پھر حسین سے کہا آپ بھی چھوڑ دو۔ انہوں نے بھی چھوڑ دیا۔ بہن کیا بات ہے؟ کہ بس میری منشا یہی ہے مجھے سوار کرانے کے لئے زین العابدین کو بھیج دو۔ اور حضور نام زین العابدین آگئے۔ کہا بیٹا تم مجھے خود سوار کرو۔ میرا تمہارا ساتھ ہے۔ سوار ہو گئے روانگی ہو گئی۔ اور سید الشہداء نے حکم دیا کہ میرے باپ کے گھوڑوں میں سے جو سب سے شریف ترین گھوڑا مودہ زین العابدین کی سواری کے لئے مخصوص کیا جائے۔ خاص طور پر زین بنایا گیا تھا۔ امام زین العابدین کے لئے۔ نہایت نرم و نازک تھا۔ تاکہ سوار ہو کر کوئی تکلیف نہ ہو۔ گھوڑے کو خاص طور پر سکھایا گیا تھا کہ وہ اشارے کے مطابق چلے۔ لوگوں نے عرض کیا قبلہ۔ آپ اور بیٹوں کی پردہا نہیں کرتے زین العابدین کی بڑی پردہا کرتے ہیں۔ امام نے جواب میں فرمایا کہ مجھے کیا بات یہ ہے کہ اس کے ال ایران کی شہزادی تھیں۔ اس کے بدن میں شاہی خون ہے۔ اس کا مزاج شہنشاہی ہے۔ یہ کوئی تکلیف برداشت نہیں کر سکتا۔ اس کا شاہی مزاج ہے۔ شاہی مزاج تکلیف برداشت نہیں کر سکتا۔ اس لئے میں نے یہ انتظام کیا ہے کہ شاہی مزاج کو کوئی تکلیف نہ ہو۔ وہ بات آگئی زبان پر۔ وہ بھی کہتا چلا۔ جب زبان پر بات آئی ہے تو تمہیں سنا دوں۔ گھر میں یہ حکم تھا۔ اب سننا بڑے غور سے۔ گھر میں یہ حکم تھا۔ مستورات سے سید الشہداء امام حسین کا کہہ دیکھو بیٹو۔ دیکھو میری بہنو۔ گھر کے اندر جب زین العابدین بیٹھے ہوں تو گھر کے اندر۔

بیٹے کا شہی مزاج سہیہ یہ برداشت نہ کر سکے گا۔ اس کا شاہی مزاج اس چیز کو برداشت نہیں کر سکتا۔ اور اس شخص میں میری جتنے نوجوان بلیکھے ہیں۔ ہمارے خون میں اب وہ ولولہ نہیں رہا۔ ہمارے خون میں اب وہ حرارت نہیں رہی ہے۔ نوجوانوں سے معافی مانگ کر۔ ان کے خون میں گرمی ہوتی ہے نوجوانوں کے۔ ان سے میں معافی چاہ کر یہ بات سننا چاہتا ہوں۔ نوجوانو! ذرا غور سے سننا میری بات کو۔ تمہارے خون میں گرمی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ میں بھی نوجوان تھا۔ آج سے اکیس سال پہلے کی بات ہے اور میں کن گیا تھا۔ دہاں میں نے یہ واقعہ پڑھا جو ابھی تمہیں سناتا ہوں تو نوجوانوں نے چاقو مار لئے تھے۔ پھر میں نے پڑھا چھوڑ دیا اس واقعہ کو۔ اب میں اسے نرم کر کے پڑھا ہوں۔ نوجوانوں سے ڈر کے۔ امام زین العابدینؑ کا واقعہ تمہیں سناتا ہوں۔ امام زین العابدینؑ روانہ ہوئے مدینے سے تو بالکل ۱۲ سال کے مندرست جوان شہزادہ۔ امام نے چہرے پر نقاب ڈھادی۔ اور کسی کے نہیں۔ لوگوں نے کہا قبلہ ان کے چہرے پر نقاب کیوں ڈھادی۔ فرمایا یہ شہزادہ ہے۔ اس کے ہاتھ میں شہی خون ہے اور شاہی خون بازاروں میں بے نقاب نہیں چل سکتا۔ میں کس طرح تمہیں وہ منظر سنائیں۔ باپ کے ساتھ ساتھ گھوڑے پر زین العابدین سوار۔ کربلا پہنچے۔ حسینؑ سے دو سوے نمبر کا انسان امام زین العابدینؑ۔ چوتھا امام۔ وہی اعزاز تھا جو حسینؑ کے دوسرے نمبر کا ہونا چاہیے۔ توجہ سے نا صا جان۔ میرے محترم سامعین، نوین تاریخ آئی محترم کی۔ نو کی شام کو امام زین العابدینؑ کو بخار ہوا۔ یہ غشی کب تک رہی؟ دسویں کی شام تک۔ اللہ نے یہ انتظام کیا تھا۔ اس واسطے یہ غشی مسلط کر دی تھی کہ امام کی ہل من ناصیر کی آوازاں کے کانوں تک نہ پہنچے۔ ورنہ جہاد فیض ہو جاتا اور اہمیت کا سلسلہ ختم ہو جاتا۔ جب بخار ہوا۔ آپ اپنے بستر پر لیٹے ہوئے تھے بخار انتہا کا تھا۔ غشی کا عالم اور ایک سندھی خاتون جو آپ کی ماں کے ساتھ گئیں تھیں،

شہر بانو کے۔ وہ آپ کی دایہ تھیں۔ تیار دار تھیں۔ اسے امام زین العابدین کی آماں کہتے تھے۔ وہ پاس بیٹھی تھیں۔ جب رات کے نو دس بجے تو آپ نے سنا۔ سید الشہداء نے اپنے خیمے میں اپنے ساتھیوں کو بلا کے ایک کانفرنس کی اور اس میں یہ فرمایا۔ آپ نے اپنے ساتھیوں سے کہ تم جاسکتے ہو۔ سنا ہے نا آپ نے؟ یہ نہیں کہا تم جھاؤ۔ اگر کہتے جھاؤ۔ پھر وہ رک نہ سکتے۔ پھر انہیں جانا پڑتا۔ یہ نہیں کہا، یہ کہا کہ تم جاسکتے ہو۔ تمہاری مرضی۔ انہوں نے جواب میں کہا کہ ہم نہیں جاتے گئے، جو آپ نے سنا ہے۔ تو امام نے فرمایا۔ اچھا تم ایک کام کرو۔ اپنے خیمے کا اُردو جہاں جہاں لگے ہوئے ہیں۔ اور سیدانہوں کے خیموں کے چاروں طرف لگاؤ۔ سن رہے ہو، تاکہ سادات کے خیموں کی رات میں حفاظت ہو سکے۔ اور یہ بے حیا فوج اگر رات میں حملہ کرنا چاہے تو ان سادات کی حفاظت ہو سکے۔ چنانچہ سب اصحاب کے خیمے اکھڑ کے چاروں طرف لگ گئے۔ میری بات سن رہے ہو نا غور سے۔ انہوں نے اپنے خیموں میں بیٹھ سکے قرآن پڑھنا شروع کر دیا۔ مناجاتیں پڑھنا شروع کر دیں۔ مذہب الہیہ کے قصیدے پڑھنا شروع کر دیے۔ مرنے کی عید ہو رہی تھی۔ ایک دوسرے کو مبارکباد دے رہے تھے کہ جیسا مبارک ہو۔ کل مرنا ہے۔ رات کے ایک بجے کا وقت اور ان کے خیموں سے آوازیں آرہی تھیں قرآن کی۔ حدیث کی، مناجاتوں کی۔ تم تیار ہو نا۔ اب بات جو میں کہنا چاہتا ہوں۔ جب ان کی آوازیں بلند ہوئیں۔ خیموں میں قرآن پڑھنے کی مناجات پڑھنے کی اس وقت امام زین العابدینؑ کو غشی سے آفاقہ ہوا۔ آپ ذرا بیدار ہوئے۔ بیدار ہو کے پوچھا اپنے تیار دار سے کہ کس کی آواز میں سن رہا ہوں۔ تو خاتون نے کہا کہ جو مجھے اصحاب ہیں جو ہمارے جانشین ہیں۔ وہ اپنے خیموں میں قرآن پڑھ رہے ہیں۔ دعائیں مانگ رہے ہیں۔ ان کی آواز آرہی ہے یہ۔ آپ نے فرمایا اچھا۔ او میرے آبا کہاں ہیں۔ کہ وہ وہاں مٹے یہ بیٹھے ہیں۔ کہ تم جاؤ اور میرے آبا کو یہ کہو کہ بیٹے کو غشی سے آفاقہ ہے

اُور آپ کو سند مکتوب ہے۔ اس خاتون نے آکے امام کو سلام پہنچایا۔ امام مکتے سے اٹھے اور سیدھے بیارکے خیمے میں گئے۔ امام زین العابدینؑ تعظیم کو اٹھے۔ امام نے بیٹھایا۔ نبض دیکھی۔ بدیشانی پہ ہاتھ رکھا۔ بیٹا بخار کا کیا حال ہے؟ طبیعت کیسی ہے؟ بیٹا جلدی جلدی اچھے ہو جاؤ۔ بڑا کام کرنا ہے۔ میں مومن کو یہ بات کہتا ہوں۔ جس کسی کو پریشانی ہو یہ دُعا پڑھ لیا کرے۔ چھوٹی سی دُعا ہے۔ کتابوں میں لکھی ہے۔ وہ دُعا تعلیم کی۔ جب یہ باتیں ہو چکیں تو نائنے پوچھا۔ بیٹا تم نے مجھے کیوں یاد کیا تھا، موت۔ کہ آبا ایک بات عرض کرنی ہے۔ ہاں کہو بیٹا۔ یہ جو ہمارے اصحاب ہیں۔ یہ جو ہماری فرج ہے۔ جو ہمارے سپاہی ہیں۔ جو ہمارے مددگار ہیں۔ یہ ہمارے محسن ہیں۔ میں قیامت تک ان کا احسان مند رہوں گا۔ ان کے ہم شکر گزار ہیں۔ اور آبا ان کی آخری خدمت جو ہے دفن کی وہ تو بن کر دوں گا۔ اور میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ ان میں سے ہر ایک کی قبر پر کھڑا ہوں گے میں کہوں گا۔ میرے ماں باپ تجھ پر قربان ہوں۔ تم ہمارے محسن ہو۔ تم نے ہماری بڑی مدد کی ہے۔ ہاں بیٹا ٹھیک کہتے ہو یہ ہمارے بڑے فتن ہیں۔ کہ قبیلہ ان تمام باتوں کے باوجود میں جو عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہ بات ہے یہ سب کچھ صحیح مگر میں تو نا محرم۔ ان کی آواز ہمارے زمانے خیموں میں آتی ہے۔ لیکن بے ہماری سورتوں کی آواز وہاں جا رہی ہو۔ ان کے خیمے ذرا ناصلے پر نہیں ہو سکتے۔ یہ کہنا تھا کہ امام بیٹھے تھے۔ اُٹھے۔ سید الشہداء پھر بیٹھے۔ پھر اٹھے۔ پانچ چھ مرتبہ کبھی اُٹھے، کبھی بیٹھے۔ گھبرا کے کہتے ہیں بیٹے سے، بیٹا زین العابدین۔ آج کی رات تو یونہی رہنے دو۔ کل جرات آئے گی، تم جانو اور خیمے، ایک دفعہ پھر غش آگیا امام زین العابدین کو۔ اس غش سے کہ آئنا تہ سوا یہ پھر بتاؤں گا۔ اب آرام آرام سے سنتے چلیں کہانی کی طرح۔ اور میرے سوا جہاں معین ہر سال میں حاضر ہوتا ہوں۔ تہ نہیں اٹکتے کہ آنا ہو۔ امن ہے یہ عیب و اعور ریارت ہو۔ میں آپ سے بڑے خلوص سے یہ معافی مانگتا ہوں۔ یہ میں آپ کو اسنے لکھ کر کہانی سنار ہا ہوں۔ میں شرمندہ سرتا ہوں، مجددی بن گئی۔

کہانی ایسی ہے میں کیا کروں۔ دل نہیں چاہتا سنانے کو۔ مگر کہانی ایسی ہے۔ بات کو میری سنو گے؟ اہم کی فوج میں جو موزی تھے ان کا نام تھا حجاج ابن سعد۔ جب صبح ہوئی تو وہ اذان کے لئے اٹھے۔ اہم نے فرمایا۔ حجاج بھائی آج تم اذان نہ کہو۔ انہوں نے کہا بہت اچھا۔ اور آپ نے فرمایا علی اکبر بیٹا آج تم اذان نہ کہو۔ شہزادہ علی اکبر نے اذان کہی۔ ادھر کہا اللہ اکبر۔ ادھر لوگوں کے کانوں میں رسول کی آواز گونجی اور تمام خواتین خیموں سے نکل کر باہر آگئیں۔ اور زینب نے حکم دیا بی بیہ غاموشی سے اذان سنو۔ اس کے بعد یہ آواز نہ سن سکی۔ اذان ہوئی۔ نماز ہوئی۔ اور اس کے بعد اہم نے تیاری کی، رحلت ہوئے۔ میدان میں آگئے۔ میں مختصر کرتا جا رہا ہوں اب بات کو۔ چند لمحوں میں تیاری مٹنے لگی میدان کی۔ اور شہدائے کرام کے کان میں آواز آتی رہی۔ مولائیں گریں۔ میرے آقا میں گر گیا۔ اور ہر آواز پر اہم جاتے رہے۔ جب تقریباً قریب قریب پچاس لاشیں جبین اٹھا چکے تو اس وقت ایک بج گیا۔ پچاس لاشیں اٹھانے کے بعد۔ حیثین کے صحابیوں میں ایک صحابی تھے مسیب کے مرنے والے۔ سید نام تھا۔ بڑھے آدمی تھے۔ وہ آئے مولائے کے سامنے اور کہنے لگے قبلہ ظہر کا وقت ہے۔ آپ نے فرمایا ہاں۔ خراج تھے نمازیوں میں مشور کرے ظہر کا وقت ہے۔ کیا چاہتا ہے تو سعید؟ کہ قبلہ یہ میری آخری نماز ہے۔ میں آپ کے ساتھ جماعت سے پڑھنا چاہتا ہوں۔ چند ساتھی جو باقی رہ گئے تھے بیٹھ کے سب نے تیمم کیا اور آپ نے فرمایا اس فوج سے کہہ دو کہ چند منٹ کے لئے تیر روک دے۔ ہم یہ جماعت کی آخری نماز پڑھ لیں۔ فوج نے تیر نہ روکے۔ صف بن گئی۔ اور یہ سعید صف میں سے نکلے، جنہوں نے نماز کا کہا تھا۔ کہا مولائے آپ نماز پڑھائیں میں سامنے کھڑا ہوں۔ کہ کہوں کہ میں آپ تک کوئی تیر نہیں آنے دوں گا۔ ادھر سے تیر آتے رہے۔ ادھر سے یسعید پسلیوں پر تیر روکتا رہا۔ تمام تیر گھس گئے بدن ہیں۔ ادھر اہم نے سلام پھیرا۔ ادھر یہ گرا گود میں مع ان تیروں کے۔ اور کر کر پوچھتا ہے ہل و فیت یا بن رسول اللہ۔

رسول کے بیٹے اب مجھ سے راضی ہیں۔ میری نماز ہو گئی ہے قبلہ؟ اور امام جواب میں فرماتے ہیں
 انت اما نحن فی الجنتہ سبعۃ میں تجھ سے وعدہ کرتا ہوں۔ جب میں جنت میں جاؤں گا تو میرے
 آگے آگے چلے گا۔ سعیدؓ نے فرمائش کی۔ قبلہ اگر میں وہاں آگے چلوں گا تو میری ایک
 فرمائش ہے۔ کیا؟ کہ یہ تیر میرے بدن سے نہ نکالنا۔ میں ان تیروں سمیت تیرے نانا
 کے سلام کو جاؤں گا۔ اسی طرح جنت میں جاؤں گا ان تیروں سمیت اور اس کے بعد
 سعیدؓ کو دین لیٹے ہیں۔ ایک دم کہنے لگے قبلہ یہ کسی نے میرا سرا اپنی گود میں لے لیا ہے۔
 امّ نے فرمایا سعیدؓ میرا سلام کہو یہ میرے نانا آگے۔ قبلہ یہ کوئی میرے سینے پر ہاتھ پھیر
 رہا ہے کہ میرے بابا حیدر کو لڑا ہیں۔ یہ کوئی میرے ہاتھ دبا رہا ہے۔ کہا یہ میرے بھائی حسن
 آگے۔ اور ایک دفعہ گھبرا کے سعیدؓ نے کہا یہ میرے پیروں کے پاس کوئی آگیا۔ امّ نے
 فرمایا سعیدؓ ذرا پاؤں ہٹا دو میری آنکھیں۔ میری آنکھیں۔ اور میرے معزز سامعین!
 سعیدؓ کی شہادت ہو گئی۔ اس واقعہ کو مومنانہ روم نے اپنی مثنوی میں نظم کیا ہے انہوں نے
 نماز کی بجائے یہ کام کیا تھا۔ اس بات کو مولانا روم مثنوی میں لکھتے ہیں۔

نماز ظاہری ذکر و سجدہ است ، نماز عاشقان ترک و جود است

یہ ذکر اور سجدے، یہ ظاہری نماز ہے، وہ عاشقوں کی نماز تھی جو تیر کھائے کرے،

میں نے جب کہ بلائے معلیٰ میں محرم کیا تھا نا بھائی تو دسویں محرم کو ہزاروں قافلے ماتمی آئے
 تھے۔ ایک دروازے سے آتے تھے تو دوسرے سے نکل جاتے تھے۔ ایک بجے ظہر کے وقت
 ایک قافلہ آیا۔ سچیں تمیں جواؤں کا۔ کُرتے انہوں نے اتارے ہوئے تھے۔

حسین حسین۔ ماتم کرتے جیسے حرم میں داخل ہوئے۔ اور تمام لوگوں نے انہیں راستہ
 دے دیا۔ وہ آکے ضریح کے چاروں طرف کھڑے ہو گئے۔ ایک ہاتھ سے ضریح پکڑ لی
 اور ایک ہاتھ سے ماتم شروع کر دیا۔ تمام حرم میں کہرام مچا ہوا تھا۔ میں نے پوچھا یہ کون
 ہیں؟ تو مجھے بتایا کہ یہ سعیدؓ، جنہوں نے نماز پڑھائی تھی۔ یہ اسکی اولاد ہیں۔ یہ ہر سال

ظہر کے وقت آتے ہیں یہاں۔ اب ان کا نوحہ سنو یہ کیا نوحہ پڑھ رہے ہیں۔ اور وہ نوحہ میں کہہ رہے تھے۔ حسین ظہر کا وقت ہے اٹھو۔ سعید کی اولاد حاضر ہے۔ اور اسی نماز کے وقت حضرت حبیبؓ بھی شہید ہو گئے۔ اصحاب سب شہید ہو گئے۔ اب باری اولاد کی آگئی۔ اور مولا، آقا کی آواز آئی بند ہو گئی۔ اب صرف اولاد باقی رہ گئی بنی ہاشم کی۔ یہ باقی رہ گئے صرف تو اہلؑ نے جو ان کے سامنے کھڑے ہوئے تھے مسلم کے بچے عقیل کے بچے۔ حضرت مسلم کے بھائی جناب عباس چاروں بھائی سمیت، جناب میٹر کے دوسرے صاحبزادے، امام حسن کے بیٹے، یعنی اولاد بنی ہاشم۔ یہ سامنے کھڑے ہوئے اہلؑ نے ایک نظر سب پر ڈال کر اور خود فرمایا ”سستی یا نبیۃ“ ان سب سے پہلے بیٹا اکبرؑ تم جاؤ میدان میں۔ میں یہ نہیں گوارا کرتا کہ دوسرے بچے شہید ہو جائیں اور میرا بیٹا بچ جائے سب سے پہلے تم جاؤ بیٹا۔ بس اس حکم کا سونا تھا علی اکبرؑ روانہ ہو گئے۔ ابھی دس بیس قدم گئے ہوں گے کہ اہلؑ نے آواز دی واپس آؤ۔ علی اکبر واپس آئے۔ حکم؟ کہہ جانے سے پہلے خیمہ میں جاؤ۔ ماں کو سلام کرو، چھو بھی سے ملو۔ بہنوں سے رخصت ہو۔ پھر جو۔۔۔ علی اکبرؑ نے گھبرا دیں چھوڑا۔ اتر کے گھوڑے سے خیمے میں گئے، اور اہلؑ سامنے گئے۔ اہلؑ ساتھ گئے۔ سنو جہاں جہاں بیٹھے ہو۔ سب سے پہلے ماں کے پاس گئے لیلیٰ کے۔ اور جا کے سلام کیا۔ اہلؑ سلام۔ جو جو مستورات میری بات سن رہی ہوں عورتیں، وہ بھی سن لیں۔ اور مرد بھی سن لیں کہ لیلیٰ جواب کیڑتی ہے؟ لیلیٰ کہتی کیا ہے سلام کے جواب میں۔ اکبرؑ تم ابھی زندہ ہو؟ میں تو منت مانے بیٹھی ہوں میرا لالہ کہ تیری میت آئے تو شکریے کی نماز پڑھوں۔ سنو علی اکبرؑ بیٹا۔ میرا معاملہ بڑا نازک ہے بیٹا۔ میرا اس کم سخت سے رشتہ ہے یزید سے۔ تجھے پتہ ہے یا نہیں؟ اگر تو کسی سے سچے رہ گیا چاہے کسی اور وجہ سے رہ جائے۔ کہیں دنیا یہ نہ کہہ دے کہ ماں نے روک لیا ہوگا۔ بیٹا تیری ماں کی عزت کا سوال ہے۔ جلدی جا۔ اور بیٹے نے کہا اماں میں جا رہا ہوں۔ تم فکرت کرو۔

یہ کہہ کے آئے بھوپھی کے پاس۔ باپ نے فرمایا زینب سے بہن زینب، اکبر تم سے کچھ بات کرنا چاہتے ہیں۔ یہ کچھ بات کرنے آئے ہیں۔ آج میں سننا چاہتا ہوں کہ بھوپھی جتنی بات کہیں گے۔ زینب ذرا سنبھل کر بات کرنا آج۔ علی اکبر گئے۔ اماں سلام زینب نے دعائیں دیں۔ لیٹ گئے۔ گود میں سر رکھ دیا بھوپھی کے۔ اور بھوپھی نے پیار سے سر پر ہاتھ پھرنا شروع کر دیا۔ اماں دیکھ رہے ہیں کہ بات کیا ہوگی۔ بات کیا کی بیٹے نے اماں۔ بیٹا۔ میں نے ساری عمر کبھی کوئی بات پوچھی تو آپ سے۔ کوئی مسئلہ پوچھا تو آپ سے۔ سب کچھ تو آپ سے۔ کوئی سوال کیا تو آپ سے۔ آج میں آپ سے ایک سوال کرتا ہوں۔ اور زینب کہتی ہے ماں بیٹا پوچھو کیا پوچھنا ہے۔ کہ سوال۔ کہ اماں یہ بتلاؤ کہ خدا کی نظروں میں آپ کا مرتبہ زیادہ ہے یا دادی فاطمہ کا۔ اور زینب جواب میں کہتی ہے کہ بیٹا۔ اتنے سمجھ دار ہو کہ یہ کیا پوچھ رہے ہو۔ میں تو فاطمہ کی ادنیٰ کینز ہوں۔ میں کبی۔ فاطمہ کبی۔ جب زینب نے یہ کہا تو اٹھ کے بیٹھ گئے، اور بیٹھ کے کہتے ہیں اماں۔ اگر یہ بات ہے کہ دادی فاطمہ کا مرتبہ بہت زیادہ ہے آپ سے تو آج ایک کام تو کر دو۔ کیا بیٹا؟ کہ آج فاطمہ کے بیٹے پر اپنے بیٹے کو قربان کر دو۔ اور اماں نے فرمایا۔ زینب میں نہ کہتا تھا ذرا سنبھل کے بات کرنا۔ اب بتاؤ کیا جواب دوگی بہ زینب نے سر جھکایا۔ اور دونوں بہن بھائیوں نے گھر سے ہو کر باس پہنایا اور اکبر کو رخصت کیا۔ خیمے سے۔ خود فوج بزیں اس بات کی راہی ہے۔ ہم غور سے دیکھ رہے تھے۔ حسین کے خیمے کا پردہ کبھی اٹھتا، کبھی گرتا تھا۔ بڑی دیر لگ گئی۔ تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ علی اکبر رخصت ہو کے گھر سے جب باہر نکلنے لگتے ہیں کبھی کوئی بہن اس کے دامن پکڑ لیتی ہے۔ کبھی کوئی بھوپھی روک لیتی ہے۔ کبھی چچی روک لیتی ہے۔ جب بڑی دیر ہو گئی تو اماں نے منہ پایا۔ بی بیو مسافر کا راستہ نہ روکو۔ اکبر کو جانے دو۔ بی بییاں دم بخود ہو گئیں۔ علی اکبر آخری مرتبہ روانہ ہوئے۔ تو جہاں جہاں بیٹھتا،

صاحبو۔ اب کسے جو چلے ہیں آخری مرتبہ تو ایسا منظر بن گیا کہ حسینؑ جیسا صابری بھی آنکھوں پہ
 دیوان رکھ کے باہر آگیا۔ دیکھ نہ سکا اس منظر کو۔ وہ یہ تھا کہ اکبرؑ روانہ ہوئے
 کانوں میں ایک آواز آئی۔ اکبرؑ سمجھتے نہیں ملتا۔ اب جوڑ کے دیکھا تو بیمار بھائی
 چلا آ رہا تھا۔ اور دونوں بھائی ایک دوسرے کے گلے لگ گئے۔ اب یہ منظر حسینؑ بھی
 نہ دیکھ سکے۔ باہر آئے۔ اور بس بکھائیو اب میں مختصر کر دوں۔ میں بھی تھک گیا ہوں
 بھائی سے رخصت ہو کے علی اکبرؑ باہر آئے۔ کس کس بات کو کیوں نہ کہیں۔ یہ انور
 نوجوانو تم نے ماتم کرنا ہے اور میرا ذاتی ایمان ہے کہ بیس صفر کی چلم کی مجلس میں چلے وہ
 کہیں بھی ہو دو معصوم ضرور آتے ہیں۔ ایک امام زین العابدینؑ اور ایک جناب
 زینبؑ۔ اور بی بی زینبؑ سے آپ کی سفارش ہے کہ بی بی آج یہ شہنشاہ جہاں
 جہاں مجلس ہو رہی ہے۔ میں ان سادات کی اجازت سے جنہوں نے یہ مجلس کی ہے۔ یہ
 اعلان کرتا ہوں کہ تم تیرے علی اکبرؑ کا چلم کر رہے ہیں تاکہ ہماری یہ جس ابتری مجلس
 ہو جائے۔ باہر نکلے اور امام نے خود گھوڑے کی رکا۔ پکڑ کے سوار کرایا۔ سوار
 ہوئے۔ چلے۔ پیچھے پیچھے حسینؑ اور آگے آگے اکبرؑ۔ جب دس بیس قدم چلے۔ گھوڑا
 رکا۔ بابا میں نہ جاؤں؟ آپ کیوں آ رہے ہیں۔ حسینؑ نے بس ایک جواب دیا۔
 علی اکبرؑ بیٹا، تم میں میرے دل کا اندازہ نہیں۔ تمہارے کوئی جوان بیٹا جانیسیں۔
 حسینؑ بیٹھ گئے۔ اکبرؑ چلے گئے۔ اب میں اپنی وہ مختصر گفتگو کر دوں۔ اکبرؑ
 میدان میں، حسینؑ ریت کے ٹیلے پر۔ زینبؑ دروازے میں۔ ابلی مقبلے پر۔ بابا
 کی نظر زینبؑ پر۔ زینبؑ کی نظر حسینؑ پر، حسینؑ کی نظر اکبرؑ پر۔ اکبرؑ کی نظر جہاں
 پر۔ سن رہے ہونا میری بات کو؟ اور مختصر کر دوں۔ دس گزے پونچے
 اکبرؑ گھوڑے سے گدے، حسینؑ ٹیلے سے گدے۔ زینبؑ دروازے پر کھڑی۔ ابلی
 میں کھڑی۔ گھوڑی دیو بعد حسینؑ اٹھے۔ میدان میں آئے۔ جب علی اکبرؑ کی میت

نودس قدم کے فاصلے پر رہ گئی۔ تو کھڑے ہو کر آواز دی۔ اکبر بیٹا، یہیں بڑا رہو،
 یہیں آواز دو۔ ہم تمہاری آواز کے سہارے تم تک پہنچیں گے۔ یہیں بیٹا رستہ نظر نہیں
 آ رہا۔ ہماری آنکھیں کام نہیں کر رہی ہیں۔ اور اکبر نے آواز دی ”ایسا یا اجت؟“
 بابا میں یہاں ہوں۔ پیچھے۔ لاش کو دیکھا۔ اکبر تو اب رہے تھے۔ جوان کا تھکا ہوا
 باپ نے دیکھا۔ گھبرائے۔ میں نے کہہ دیا یہ لفظ تو۔ اب تمہیں میں خدائے سخن ابوالکلام
 انیسویں کا ایک شعر سناتا ہوں۔ جب بیٹے کو تڑپتے دیکھا تو حسین نے کیا کہا۔ اس کو انیس
 نے نظم کیا ہے۔ تڑپتے دیکھ کر علی اکبر کو حسین کی فرماتے ہیں کہ بیٹا
 بے چین ہو تم دل میرا گھبراتا ہے بیٹا

تم بے چین ہو میری دل گھبراتا ہے

میرا کہ اب میری فرق آتا ہے بیٹا

بیٹھ گئے۔ لاشے کو گود میں لیا۔ اکبر ہم آئے۔ بابا آپ نے بڑی تکلیف فرمائی۔ سنو گے
 جوانو۔ حسین نے ہزاروں دفعہ کہا ہے زندگی میں کہ اکبر سم سے کچھ مانگو۔ میرا دل
 چاہتا ہے کہ تم کچھ مانگو۔ آج پینا مرقعہ ہے کہ اکبر کہتے ہیں، بابا میں ایک چیز مانگتا
 ہوں۔ حسین کی تنہا ہے سارے عمر کی۔ حسین نے کہا مانگو بیٹا کیا مانگتا ہے۔ پہلی مرتبہ
 مانگا ہے بیٹے نے۔ کیا؟ بابا ایک شے چاہیے۔ کیا میرے لالہ؟ ایک گھوٹ پانی کا۔
 مانگا بھی تو کیا مانگا۔ حسین نے آسمان کو دیکھا اور کہا بیٹا یہ تو ممکن نہیں ہے۔ اور کوئی شے
 مانگو میرے لالہ۔ آبا اور شے یہ مانگتا ہوں کہ مجھے جینے میں سے چلو تاکہ میں بھی اماں
 سے جاکے بات کر سکوں۔ اے یہ بات، ہم کریں گے۔ تو اب میں ختم کر رہا ہوں گفتگو کو۔
 توجہ سے سنا جوانو۔ تم نے آج جوانوں کا ماتم کرنا ہے یہاں۔ اماں نے لاش اٹھائی۔
 دھتکہ کانپے۔ لاش گرنے لگی۔ لٹائی، دوبارہ اٹھائی۔ سہ بارہ اٹھائی۔ جب جوان
 کی میت بڑھے باپ سے ڈانٹو سکی، تو باپ نے فرمایا اکبر بیٹا یوں کرو۔ دونوں ہاتھ میرے

گئے میں ڈال لو۔ کچھ تم سہارا کرو۔ کچھ میں سہارا دوں۔ اکبر نے ایک ہاتھ باپ کے گلے میں ڈال دیا۔ باپ نے فرمایا، بیٹا دونوں ہاتھ۔ کہ آبا میں بایاں ہاتھ اپنے سینے سے بٹھائیں چاہتا۔ مولائے کہا کیا بات ہے؟ میں اپنا سینہ آپ کو دکھانا نہیں چاہتا آبا۔ نہیں میرے دل دکھاؤ کیا بات ہے؟ امم نے حکم دیا۔ اکبر نے ہاتھ بٹھایا۔ حسین نے دیکھا۔ کیا دیکھا؟ کہ برجی ٹوٹ کے نہیں لگی ہوئی ہے۔ ایک انچ باہر نکلی ہوئی ہے۔ حسین نے کہا یہ بات حق ہی بٹھا۔ گھبراؤ نہیں بیٹا۔ ٹھیک بیٹھے کو۔ ایک ہاتھ رکھا سینے پر، ایک ہاتھ سے پکڑی برجی اور بلند آواز سے کہا۔ نانا رسول اللہ، دادا ابراہیم کو ساتھ لے کر کہ بل میں آؤ، اور آکے دیکھو میری آنکھوں پر پٹی نہیں ہے۔ میرا ہاتھ نہیں کانپ رہا۔ آکے دیکھو تو سہی۔ یہ کہہ کے برجی ہل گئی۔ برجی ملی تو اس میں جھپٹا ہوا اکبر کا دل ہلا۔ دل ہلا تو سالار بدن کانپا۔ بدن کانپا تو کہہ کی زمین کانپ گئی۔ کہہ ملک زمین لرزی تو حیدر کے خیمے لرزے۔ خیموں کا لرزنا تھا کہ دروازے سے آواز آئی۔ بہن کو آنے دے۔ دونوں بی کے یہ کام کریں گے۔ اکیلے نہ کریں۔ زینب کی آواز حسین نے سنی کہ باہر آنا چاہتی ہے۔ ادھر حسین نے سڑک کے صدم دیا کہ بحیثیت امم کے حکم دیتا ہوں علی اکبر کے گھوڑے دروازے پہ جا کے زینب کو روک دے۔ امم نے کہا۔ سنتے ہی گھوڑا دروازے پہ پہنچا، تاکہ زینب دروازے پہ رک جائے۔ کہیں ایسا نہ ہو زینب دروازے سے باہر آجائے۔ اور حسین نے لاش اٹھائی اور سے کے روانہ ہوئے۔ بس بھائیو میری گفتگو کا انتہام تھا۔ یہاں بات میں نے ختم کر دی۔ نوجوانوں تم نے ماتم کرنا ہے آج۔ کرنا ہے نا؟ بلو بھئی۔ ایک دفعہ میرے سامنے تو بیٹے پہ ہاتھ مار کے کہو حسین۔

انسان اور انسانیت

میں آج گفتگو میاں سے شروع کرنا چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو کسی خاص مقصد کے لئے خلق فرمایا ہے اور سب سے بڑا مقصد یہ ہے اور سب سے بڑی بات اللہ ہم سے چاہتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اُس نے ہمیں انسان پیدا کیا ہے۔ تو ہم میں انسانیت ہو۔ جسے اُس نے انسان بنایا ہے۔ وہ دُنیا میں انسان بن کے رہے۔ فرشتہ بنانا ہمارا یہ بھی اُس کا مقصد نہیں اور ہمارا حیوان بن جانا یہ بھی اُس کی مشیت کے خلاف ہے۔ وہ یہ چاہتا ہے کہ انسان۔ انسان ہی بن کر دُنیا میں رہے سمجھے نا۔! حضور۔ میرے محترم سامعین میں آسان ترین الفاظ میں آپ سے کہنا یہ چاہتا ہوں کہ ہمارے لئے حیوان بننا انتہائی آسان ہے۔ فرشتہ بننا انتہائی آسان ہے۔ اگر کوئی ذات مشکل ترین ہے ہمارے لئے تو وہ انسان بننا ہے۔ مثلاً خدا خواستہ اگر ہم ابھی حیوان بننا چاہیں۔ تو یہ مشکل بات نہیں۔ انسان کو بھی بھوک لگتی ہے۔ اور حیوان کو بھی بھوک لگتی ہے۔ اس بھوک کے معاملے میں ہم مشترک ہوئے یا نہیں۔ اب فرق کیا ہے۔ کہ حیوان کو بھوک لگی۔ وہ گھر سے چلا بھوک میں۔ اس کے سامنے جو آیا وہ کھا گیا۔ اُس نے یہ نہیں سوچا ”اپنا ہے یا پرانا۔ جائز ہے یا ناجائز۔ مناسب ہے یا نامناسب۔“ اس نے کھا یا یہی اُس کا مقصد ہے۔ بغیر کسی سے پوچھے۔ اور اگر میں بھی اسی طرح اپنی بھوک کا انتظام کروں اور کھا جاؤں اور نہ سوچوں کہ جائز ہے یا ناجائز۔

مناسب ہے یا نامناسب۔ آپ نے چارہ منگایا تھا۔ اپنے جانور کے لئے کھا گیا ہمسائے کا جانور۔ آپ نے اُس کے چار ڈنڈے مارے۔ دیکھنے والے اس کے حائیتی ہو گئے۔ ارے بھائی جانے بھی دو حیوان ہے بیچارہ۔ سارا چارہ کھا گیا۔ پھر بھی اس کے حائیتی۔ سارا کھیت کھا گیا پھر بھی اُس کے حائیتی۔ ہمارا پورا باغ ہضم کر گیا پھر بھی اُس کے حائیتی۔ توحیدان بننا بڑا ہی آسان ہے۔ فرشتہ بننا بڑا ہی آسان ہے۔ آپ نے بازاروں میں نوکری، ولی اللہ، دیکھے ہوں گے۔ ہر کوئی کہہ رہا ہے کہ فرشتہ نظر آ رہا ہے۔ ولی نظر آ رہا ہے۔ یہ انسان بھی کتنا عجب ہے کہ اگر مانے پہ آجائے تو "بازاری" کو دلی۔ مان لے نہ مانے پہ اڑ جائے تو عیسیٰ کو دلی نہ مانے۔ نہ اللہ انسان کا حیوان بننا پسند کرتا ہے نہ فرشتہ بننا پسند کرتا ہے وہ کہتا ہے کہ اے انسان۔ انسان بن۔ آرام سے رہ۔ اچھا لباس پہنو۔ اچھی خوراک کھاؤ۔ خوشبو لگاؤ۔ نماز پڑھو۔ اور امن سے زندگی بسر کرو۔ یہ چاہتا ہے اللہ آپ سے۔ یہ نہیں کہ ساری رات بند آواز سے چیختا رہے۔ نیند آتی نہیں۔ بیکاری کا مشغلہ ہے۔ بلند آواز سے چہلے جا رہا ہے کہ "میرے مولا بلا کو مدینے مجھے۔ اب مولا کو کیا فرض پڑی ہے بولنے کی۔ اب مولا کے پاس بھی جانا ہے تو مولا ہی کو کہا جا رہا ہے کہ خود ہی بول لے۔ خود جاؤ۔ ہمسائیوں کو تنگ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ تم خود جانے کی تیاری کرو۔ خود ارادہ کرو۔ تو بلائے صبح کی نماز تم میں پڑھو۔ ظہر کی نماز مشہد میں پڑھو۔ عصر کی نماز کاغین میں پڑھو۔ مغرب کی نماز کربلا میں پڑھو۔ عشاء کی نماز نجف میں پڑھو۔ پھر اُسے بلانے کا سزا بھی آئے۔ حلال کھاؤ۔ حلال کھاؤ۔ آرام سے رہو۔ مگر یہ عادت انسان میں پیدا ہو گئی ہے۔ حضرت نوح کے طوفان کے بعد۔ دو لفظوں میں بیان کرتا ہوں۔

— ہے تو لمبی چوڑی — تاریخ کی بات — یہ ہے کہ حضرت نوحؑ کے طوفان کے بعد — اُن کے بیٹوں کی نسل دُنیا میں پھیل گئی — اُن کے بڑے بیٹے کا نام تھا — سام — دوسرے بیٹے کا نام تھا — یافث — ایک سام دوسرے یافث اور تیسرے تھے — حام — سام — یافث — سام چونکہ بڑے بیٹے تھے لہذا سام کے بیٹے نے حکومت سنبھالی — یافث اور حام کی اولاد اس کی رعایا ہو گئی — صرف اس لئے سام کی اولاد نے حکومت سنبھالی کہ وہ بڑے بیٹے کی اولاد تھے — چونکہ سوچا اس برس اسی طرح گزر گئے تو یافث اور حام کی اولاد یہ سمجھ بیٹھی کہ ہم دُنیا میں پیدا ہی اس لئے ہوئے ہیں کہ رعایا بن کے رہیں — اور سام کی اولاد یہ سمجھ بیٹھی کہ ہم دُنیا میں پیدا ہی اسی لئے ہوئے ہیں کہ حکومت کریں — تو ہر وہ حکومت جو بغیر کسی دلیل کے محض "بڑے پن" کے دوسرے پہ قابض ہو جائے تو وہ آج بھی سامراج کہلاتی ہے تو میں عرض یہ کر رہا تھا کہ انسان کو دُنیا میں انسان ہی بن کر رہنا چاہیے — یہ اللہ کا احسان ہے کہ اُس نے ہمیں انسان پیدا کیا ہے لہذا انسان ہی بن کر رہے — آپ حضرات کی خدمت میں ایک نقطہ پیش کرتا ہے اور نقطے کی حیثیت بھی بڑی ہے — اسے پڑھنے کے لئے احتیاط کی ضرورت ہے — ایک نقطے کے بدلنے سے خدا "جدا" ہو جاتا ہے — تو عرض کرنا چاہتا ہوں کہ انتخاب کا ترجمہ بتا ہے چھانٹنا — چُنتنا نہیں ہے — اور چُنتنے کے لئے ہے امدطفی — اس کا امدطفی بتا ہے جو چُنا ہوا ہوتا ہے — اور جس کا انتخاب ہوتا "چُنا" ہوا ہوتا ہے — اور اللہ کے چُنتنے ہوئے میں معاذ اللہ کوئی شبہ ہو سکتا ہی نہیں غلطی کا شائبہ تک نہیں — اگر چُنتے ہوئے میں ذرا سی بھی غلطی نکل آئے تو وہ چُنتنے والے کی بھی غلطی ہے — اور اگر غلطی نکل آئے تو یا اُس میں خرابی ہے یا چُنتنے والے نے غلط چُنا — ایک بات ہے اگر آپ حضرات کی سمجھ میں آجائے — کہ ایک شخص نے بڑی خوبصورت کوٹھی بنوائی — عظیم الشان — لاکھوں روپیہ خرچ کیا

اس کے بننے میں — اس میں ایک بڑا قیمتی کمرہ بھی بنوایا — جہلا سا نام ہوتا ہے — بتائیں آپ یہ نہیں اس کا کیا نام ہے — ڈرائنگ روم — ہاں — یہی ہے — ڈرائنگ روم — ہاں اس کا نام ڈرائنگ روم اس لئے کہ عزیز لوگ اس کو دیکھ کر ڈرجاتے ہیں — اسے سجایا گیا — امریکہ سے تحفے منگوائے — ایران سے قالین منگوائے — ہر ملک سے کچھ کچھ منگوا لاکھوں روپے لگائے — شہرت ہو گئی — کوٹھی بنی — ڈرائنگ روم تو سبحان اللہ — اب جو شور مچ گیا — عام — ایک نابینہ بھی چلا گیا — جاتے ہی چیزوں سے ٹکراتا گیا — لا حول ولا — ”اب نظر خود کو نہیں آتا“ — اگر آنکھ ہوتی تو جلوہ دیکھتا — خرابی چیز میں نہ تھی دیکھنے میں خرابی تھی — تو صاحبان! آدم سے لے کر خاتم تک کسی میں کوئی عیب ہو سکتا ہی نہیں ان میں غلطی ہو سکتی ہی نہیں — کبھی بھول ان سے ہو سکتی ہی نہیں یہ نامکن ہے — نہ ان میں معاذ اللہ کوئی خرابی ہو سکتی ہے — نبی سرشے کا علم رکھتا ہے — یہ خاق کا تخلیقی کمال ہیں اور اس کے کمال میں نقص بتانا یہ اپنی بے ہنری بتانا ہے — یہ جہالت کی دلیل ہے — سارے انبیاء کا بادشاہ بنی تھا ہمارا بیٹا — اب کئی صاحبان بتلتے ہیں کہ جب پہلی وحی آئی اس کے پاس جبرائیل نے آکر وحی سنائی — تو وہ ڈر گیا — جبرائیل کو پہلی دفعہ دیکھا تھا ڈر گیا — ڈرے ہوئے گھر آئے اگر بیوی سے کہا — ام المؤمنین کو بتایا — کہ مجھے آج یہ واقعہ پیش آیا — وہ بیچاری اسے اپنے بھائی کے گھر لے گئی — اور ان کے بھائی کا نام تھا ”درتہ“ اس ”درتہ“ نے سارا قصہ سنا اور کہا کہ ”واقعی سچ مچ ہے“ کہا کہ ”ہاں“ کہ پھر تو تم بنی ہو گئے ہو — اچھا تو یہ بات ہے — کہ — ہاں — اب ایک فقرہ کہتا ہوں صاحبان ذوق کے لئے کہ — اب بتائیے کہ — اب ام الکتاب — اُس نبی کو سمجھائے گا کون — ایک درتہ — اُسے سمجھا رہا ہے ایک درتہ — اُس کا علم کجا — اُس کا علم کجا — اُس

کی تعلیم کجا۔ اُس کی عقل کجا۔ جس درجے پر وہ فائز ہوتے ہیں وہاں تک ہماری عقل کی رسائی نہیں ہمارا فہم ان تک پہنچ نہیں سکتا۔ وہ انسان بنانے کے آتے ہیں ہم بننے کے لئے آئے ہیں۔ انسان کو انسان بنانے کے ان کے پاس مختلف طریقے ہوتے ہیں۔ وہ انسان کو انسان بناتے ہیں پاس بٹھا کے۔ محبت کر کے۔ پیار کر کے۔ سمجھا کے۔ کہیں دور لے جل کے۔ جتنے ذرائع ہو سکتے ہیں سمجھانے کے وہ استعمال کرتے ہیں۔ دیکھو اگر تم انسان بننا چاہتے ہو تو اس طرح کر دو۔ کہ مجھے نام کام کرتے ہوئے دیکھتے چلو۔ میں جس طرح نماز پڑھتا ہوں مجھے دیکھ کر ویسی ہی پڑھو۔ اب جو دیکھا ہے۔ اس میں سب کچھ آتا ہے نماز پڑھنا کس طرح۔ کھڑا کس طرح ہوتا ہے۔ رکوع کس طرح کرتا ہے۔ سجدہ کس طرح کرتا ہے۔

دیکھو۔ کس کو۔ رسول کو۔ دن میں پانچ دفعہ دیکھا۔ اب اندازہ لگا لو کہ زندگی میں کتنی ہزار دفعہ دیکھا ہوگا۔ کتنی ہزار دفعہ دیکھی ہوئی لاکھوں صحابیوں کی نماز۔ آج تک وہ نماز متنازعہ ہے کہ کس طرح پڑھی جائے۔ کوئی ہاتھ باندھ کے پڑھتا ہے۔ کوئی ہاتھ کھول کے پڑھتا ہے۔ اس نماز کو جس کو ہزاروں مرتبہ صحابہ نے دیکھا اس کا پتہ نہیں ہے کہ ہاتھ کھول کر پڑھنی ہے یا باندھ کر پڑھنی ہے۔ اگر رسولؐ نے ہاتھ باندھ کر پڑھی تھی تو کھولنا غلط اور اگر ہاتھ کھول کر پڑھی تھی تو ہاتھ باندھنا غلط۔ اور یہ فیصلہ نہیں کر سکے مسلمان۔ ہاتھ باندھنے والے کو ہاتھ کھولنے والے کہہ رہے ہیں اور ہاتھ کھولنے والے کو ہاتھ باندھنے والے غلط کہہ رہے ہیں۔ دونوں نمازی ایک دوسرے ہی کو بُرا کہہ رہے ہیں۔ اور جو نہ باندھتے ہیں نہ کھولتے ہیں۔ انہیں کوئی پوچھنے والا ہے ہی نہیں۔ جو ہزاروں مرتبہ دیکھی ہوئی نماز کا مسلمان فیصلہ نہ کر سکے۔ کہ ہاتھ کھول کر پڑھی تھی یا کہ ہاتھ

کھول کر پڑھی تھی۔ اب بتائیں ایمان سے۔ کہ جس قوم کو اپنے رسول کے لاکھوں دفعہ دیکھے ہوئے ہاتھ یاد نہیں رہے اُس قوم کو اگر ایک دفعہ کے اٹھائے ہوئے ہاتھ یاد نہ رہیں تو کون سی بڑی بات ہے۔ تو اللہ نے ہمارے لئے رسول اس لئے بھیجے کہ اے رسول! انہیں انسان بناؤ۔ انہیں نماز روزہ سکھاؤ۔ انہیں جینے کا طریقہ سکھاؤ انہیں بسنے کا سلیقہ سکھاؤ بھائی بھائی کے تعلق بتاؤ رشتہ داروں کے حقوق بتاؤ یہاں تک کہ سوا لاکھ تک انبیاء بھیجے۔ صرف سمجھانے کے لئے۔ ایک لاکھ چیس ہزار تک تو کتابوں میں تعداد ملتی ہے۔ یا اللہ جب انبیاء کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ اس کے بعد جو ہم پیدا ہوئے۔ ہمارا کیا قصور ہے۔ پہلے لوگوں میں تو سمجھانے والے نبی موجود تھے اور ہم نے کون سا قصور کیا۔ اب کیا بنے لگے۔ اللہ کہتا ہے کہ میں نے نبوت ختم کی ہے ہدایت تو ختم نہیں کی۔ نبوت الگ بات ہے ہدایت الگ بات ہے۔ قبلہ! ہدایت کیسے قائم ہے؟ اب اس بات کی وضاحت کرتا ہوں یہ اپنی بات ہے۔ یہ ہمارے یو۔ پی کی بات ہے۔ یہ ہمارے باں طریقہ ہے۔ کہ ہمارے ہاں ایک درخت ہوتا ہے ”آم“ اس کثرت سے کہ۔ ”عام“ بس عام۔ ”آم“ عام۔ ”عام“ عام۔ ”عام“ اور ہم یو۔ پی والوں کو اتنا پیار تھا۔ ”آم“ سے کہہ جی نہیں چاہتا تھا کہ یہ پھل ہمارے ملک سے باہر نکلے۔ اسے اپنے علاقے میں محدود رکھنے کے لئے ہم نے اس کی ٹانگیں توڑ کے اُسے ننگرا کر دیا۔ مگر اُسے ننگرا بنادینے کے باوجود وہ لاہور میں پک رہا ہے۔ کراچی میں پک رہا ہے۔ نامراد تو یہاں کیسے آگیا۔ تجھے تو ”دباں“ کے لئے چھوڑ آئے تھے۔ تو صاحبانِ ذوق۔ جس کا دل ”گھر“ میں نہ لگے اُسے کون روکے۔ یہ ”آم“ کی بات تھی۔ بالکل مختصر کرتا ہوں حضور والا!۔ خیر۔ ”آم“ ہوا کرتے تھے ہمارے علاقے میں۔ بعض بڑے اچھے بڑے میٹھے ہوتے تھے اور بعض ذرا ترش۔ حالانکہ ہوتے ایک ہی

”باغ“ کے تھے۔ بعض میں تو مٹھاس بہت زیادہ تھی اور کئی بڑے نرش۔ حالانکہ وہ ”میٹھے“ آم کے دائیں بائیں اکثر ہوا کرتے تھے مگر تاخیر وہ نہ تھی۔ ذرا غور سے سنا اور کوئی بات یاد نہ رہے گی تو یہ آم کی بات یاد رہے گی۔ خدا تمہیں سلامت رکھے۔ اب آم میں ہر سال میوہ آتا تھا۔ کئی سال گزر گئے۔ سالہا سال بیت گئے۔ اب کیا ہو گیا۔ اب ”فصل“ نہیں ہوگی۔ اس کی دلیل کیا ہے۔ کہ یہ ”بلا فصل“ ہے۔ جب ”فصل“ ختم ہوئی تو اب ہو گیا۔ ”بلا فصل“۔ پریشان ہو گئے کہ اتنا قیمتی پھل درخت۔ فصل آتی نہیں۔ اسے کیسے باقی رکھا جائے۔ تو مالی نے جاننے والے نے کہا۔ کہ اس کا طریقہ میں بتا ہوں۔ اسے ”بلا فصل“ ہو جانے دو اسے ختم ہو جانے دو۔ ایک آم کا پودا۔ اس کی جنس کا پودا۔ آم ہی کا پودا۔ اُسے گھر میں اگاؤ۔ اور جب تمہارے گھر میں اگا ہوا پودا ذرا سیانا ہو جائے نا! تو اُسے ختم ہونے والے درخت کے نیچے رکھ دو۔ اور اُس جیسی آب د ہوا ہی میں اُسے رہنے دو اور اس ختم ہونے والے کی ایک شاخ اس پودے ساتھ پیوند کر دو۔ اور اگر پیوند ہو جائے پکا تو شاخ کو کاٹ دو۔ کہ پودا اس قلم کو لے کر پھراپنے گھر چلا جائے۔ نیا درخت تیار ہو جائے۔ باغ عالم میں شجرِ نبوت نے ایک لاکھ چوبیس ہزار بہاریں دیکھیں۔ اور نبوت کا شجر جب بلا فصل جو ہوا۔ تو اللہ نے اُسی جنس کا۔ جس جنس کی نبوت تھی۔ ایک پودا اپنے گھر اگایا۔ پودا اتنا زوردار تھا کہ گلے میں شکاف آگیا۔ اب جو اللہ کے گھر میں اگا ہوا نبوت کا پودا۔ اُسی جنس کا۔ اب جو ذرا پر پرزے نکلے۔ تو اُسے ختم ہونے والے شجرِ نبوت کی آغوش میں دے دیا۔ اب دہوا بھی ویسی ہی مل سکے اور ذرا سنبھل جائے۔ اب اس آب ہوا میں جب ذرا شاداب ہوا۔ تو اُس ختم ہونے والے شجرِ نبوت کی ایک ہری مہری شاخ۔ کا پیوند لگ گیا۔ اور یہ پودا اس شاخ کو لے کر اپنے

گھر آگیا۔۔۔ وہ منتہم ہونے والا تھا قیامت تک کے لئے "قائم" ہو گیا۔ میرے معزم
 سامعین!۔۔۔ اب ادھر ایک نیا درخت تیار ہو گیا۔ ختم ہونے والے درخت کا
 نام آپ نبوت رکھ دیں۔ قائم رہنے والے کا نام "امامت" رکھ دیں۔ جنس
 دونوں کی ایک ہے۔ معصوم کی معصوم سے ہوئی قلم بندی جناب والا! اب نئی
 شے تیار ہو گئی۔ نبوت کے پلنے کا انداز اور تھا۔ امامت کے پلنے کا انداز
 اور تھا۔ اب جو درخت بنا ہے۔ نبوت و امامت کے اتصال سے۔۔۔
 اس کے جو ثمر ہوں گے ان میں نبوت کا اثر بھی ہوگا امامت کا اثر بھی ہوگا۔ اسے میں
 مختصر کرتا ہوں حضور والا!۔۔۔ اس نئے درخت پر ثمر آنا شروع ہو گئے۔ بالکل مختصر
 کر دیا ہے میں نے اپنی بات کو۔ ثمر آنے شروع ہو گئے اس درخت پر۔ میرے سامعین!
 اس نئے شجر پر پہلا ثمر جو آیا ہے۔۔۔ وہ تو ہر ای پک گیا۔ وہ ہر ای پک گیا۔
 ۔۔۔ اور دوسرا ثمر جو آیا وہ سرن ہو گیا۔۔۔ اور باغیوں میں بٹ گیا۔ جب دوسرا پکے
 ایک سن اور ایک حسین۔۔۔ کائنات کئی دفع ختم ہو۔۔۔ اور پھر بنے۔ مگر کسی
 ماں باپ کے حسن حسین جیسے بیٹے نہ ہوں گے۔ علی کی لاکھ فضیلتیں سہی۔۔۔
 سیدہ کے لاکھ شرف سہی۔ مگر جب یہ کہا جاتا ہے۔ حسین کا آبا۔۔۔ حسین کی
 اماں۔۔۔ ان کی شان ہی اور جو جاتی ہے۔۔۔ کہاں کسی کی ایسی اولاد۔ کہاں
 کسی کے ایسے بیٹے۔۔۔ کہنے نصیب میں ملے۔۔۔ اب اس شجر میں جو ثمر آیا حسن
 اور حسین کے بعد۔۔۔ اُس کی شان ہی اور تھی۔ اور علی نے اس ثمر کو سفید رومال میں
 لپیٹا۔۔۔ لپیٹ کے رسول کے سامنے لے آئے۔ قبلہ حضور نے یہ "نعت"
 فرمائی ہے۔ رسول نے علی کو دیکھا۔ باپ کو دیکھا پھر بیٹے کو دیکھا۔ اور فرماتے
 ہیں کہ یہ تو اپنے باپ کی زینت ہے۔ علی کو بڑا پیار ہے۔ بے انتہا پیار ہے
 اس نعت سے۔۔۔ جس کا نام زینب ہے۔۔۔ جب بھی باہر سے گھر میں آتے

تھے۔ پہلی بات پوچھتے تھے میری زینب بیٹی کہاں ہے۔ باپ کے ساتھ بیٹھ کے کھانا کھاتی۔ باپ کی گود میں کھیلتی۔ سیدہ فرمایا کرتیں۔ یا علی ہے تو بیٹی مگر مجھ سے زیادہ آپ سے پیار کرتی ہے۔ باپ کی گود میں اکثر سو جاتی۔ ہر وقت باپ کا ہی خیال رہتا۔ اور علی سیدہ سے کہتے کہ ناظرہ مجھے اس بیٹے کو اٹھا کے اتنا سکون ملتا ہے میں اتنا مانوس ہوں اس بیٹی سے کہ بیان سے باہر ہے۔ اب حضور۔ پیدل چلنے لگی۔ زینب بیٹی۔ باپ کے ساتھ ٹھہلا کر دو۔ معصوم پیدل چلنے کی عادت ڈالنے لگے تو خاندان کے افراد پر نشان ہو گئے۔ جب چار سال کی تھی کہ ماں کا سایہ سر سے اٹھا ماں نے وصیت کیا کہ تھی بیٹی سے۔ کہ ہے تو زینب۔ ہے تو بیٹی۔ یہ حسن اور حسین تیرے بڑے بھائی ہیں۔ اب میں جا رہی ہوں۔ اب یہ بن ماں کے بورے ہیں ان سے اتنا پیار کرنا کہ انہیں ماں یاد نہ آئے۔ اب بھائیوں نے کیا کیا جب بھی حسن یا حسین گھر میں آئے زینب کو سلام کا موقع نہیں دیا۔ بلکہ پہلے کہدیا گھر میں داخل ہوتے ہی۔ بہن سلام۔ اب میرے معزز سامعین یہ شریف ترین خاندان زمانے کا۔ روانہ ہو رہا ہے مدینے سے۔ روانہ ہوئے مدینے سے۔ اٹھا بیس رجب تھی۔ آدھی رات کا وقت تھا۔ سادانیوں کی محفلیں اور ناقے دروازے کے ساتھ آ کے بٹھائے جا رہے تھے۔ ایک ناقہ بیٹھا اور خاندان کے نوجوان آواز دیتے۔ مٹے والو۔ ہوشیار فلاں خاتون سوار ہو رہی ہے۔ وہ خاتون سوار ہو جاتی۔ ناقہ چل جاتا۔ سب کے بعد سیاہ پردے لگے ہوئے ناقہ آیا دروازے پر۔ اور آکر بٹھایا گیا اور قرعہ بنی ہاشم نے آکر آواز دی۔ مٹے والو۔ کوئی شخص باہر نہ نکلے۔ کوئی سوار ہو کر نہ گزرے۔ دروازے بند ہوں۔ کوئی بچہ شور نہ مچائے۔ اس نیت علی سوار ہوئے۔ اُدھر حشر

میں ہیں رشتہ داروں میں ہیں — حسین اٹھے — بھائیو اب اجازت دینا —
 میں خود جا کے ذرا زینب کو سوار کرا دوں — امام آئے — بہن کو سوار کرایا —
 ایک بازو حسین کے ہاتھ میں ایک بازو علی اکبر کے ہاتھ میں — عون و محمد نعلین
 سنبھالے ہوئے — عباس نے محل کا پردہ اٹھایا — اب جو محل کے قریب
 آئیں — تو فرماتی کیا ہیں — حسین بھائی میرا بازو چھوڑ دو — اکبر بیٹے میرا ہاتھ
 چھوڑ دو — امام فرماتے ہیں — بہن کیا بات ہے — کچھ نہیں ذرا سیر
 بیٹے زین العابدین کو آواز دو — زین العابدین آگئے — زین العابدین بیٹا زینب
 کو تم سوار کراؤ — اور سوار ہو گئیں — جناب زینب — اور عبد اللہ ابن جعفر
 طیار محل کے پاس خاموش کھڑے ہیں — صرف اتنا کہا کہ خدا حافظ —

میرے محترم سامعین میں بات کو متفرکرتا ہوں — یہ لوگ سکتے پہنچے —
 اور جب سکتے سے حسین روانہ ہوئے — تو شہر مکہ سے نکل کے یہ قافلہ ایک
 میل پہنچا ہوگا — کہ ایک آواز آئی — حسین ٹھہرو — اور حسین ٹھہر گئے
 قافلہ ٹھہر گیا — گھوڑے کو روک کر حسین نے آواز کی طرف دھیان دیتے ہوئے
 قافلے میں کہا کہ عباس بھائی دیکھو کس کی آواز ہے — حضور نے اُدھر دیکھ کے
 کہا — غالباً عبد اللہ آرہے ہیں — شوہر حضرت زینب — سکتے سے —
 سب لوگ اتر گئے — عبد اللہ آگئے — آئے کس شان سے — ایک ہاتھ عون
 کے کندھے پر اور ایک ہاتھ محمد کے کندھے پر — پہنچے — اما ہم نے فرمایا
 کہ آپ نے کیوں تکلیف فرمائی — میں تو ابھی مل کے آیا تھا — حسین ایک کام رہ
 گیا تھا — ایک بات رہ گئی تھی — اور عون و محمد سے کہا کہ بچو! مجھے اس محل
 کے قریب لے چلو — جہاں تمہاری اماں بیٹھی ہے — عون و محمد لائے ناظر بٹھایا
 گیا — عبد اللہ مخاطب ہوئے — علی کی بیٹی جا رہی ہو — اور زینب چھوڑ

میں کہتی ہیں۔۔۔ اپنی تم تیری اہلات نہ ہو تو اتر آؤں۔ میں تو تیری اجازت سے جا رہی ہوں۔۔۔ مگر یاد رکھنا کہ حسین کے بغیر زینب کا جنازہ اُٹھے گا۔۔۔ میں روکنا کب ہوں۔۔۔ میں تو تاکید کرنے آیا ہوں کہ جاؤ تو ضرور محمد زہرا کی بیٹی زعفر طیار سے رئیس کی بہو ہے اور سفر کا معاملہ ہے۔ ملک عراق کا سفر ہے۔ حسین جیسی قیمتی شے تیرے ساتھ ہے۔۔۔ خالی ہاتھ جا رہی ہو۔۔۔ اگر کہیں حسین پہ مصیبت بن گئی۔۔۔ اور مصیبت کو ٹالنے کے لئے اگر صدقہ دینا پڑا۔ تو کیا کرو گی تم خالی ہاتھ جا رہی ہو۔ امد عون و محمد کے زینب کے ہاتھ میں دے کے کہا کہ یہ روزوں بچے حاضر ہیں۔ انہیں بجائی کا صدقہ کر دینا۔۔۔ اپنی طرف سے صدقہ کر دینا۔ اب زینب نے بیٹوں کو باقی زندگی عمن و محمد کہہ کے نہیں پکارا۔۔۔ بھائی کا صدقہ کہہ کے پکارا۔۔۔

معزز سامعین کرام!۔۔۔ رات کے ایک بجے کا وقت۔۔۔ امام مصلیٰ پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ کہ اتنے میں جناب فضہ آئیں فرماتی ہیں حسین۔ بہن نے یاد کیا ہے۔۔۔ حسین آئے۔ کیا دیکھتے ہیں۔ زینب کے ایک طرف عون کھڑے ہیں۔ ایک طرف محمد کھڑے ہیں۔ حسین نے آتے ہی کہا۔ زینب سلام۔ فرماتی ہیں حسین!۔۔۔ تھوڑی دیر کیلئے مجھے بہن نہ کہنا۔ تجھے میں نے بھائی سمجھ کے اب نہیں بلایا۔۔۔ میری بات سنو۔ تم ہوجید کے بیٹے۔ میں ہوں جعفر طیار کی بہو۔ آج میں حیدر کے بیٹے سے جعفر کے پوتوں کے لئے شہادت کی صوبیک مانگتی ہوں۔ اور بھائیو قفقہ ختم ہوتا ہے۔ بات ختم کرتا ہوں۔ صبح ہوئی۔ ایک ایک شہید کی لاش آتی رہی خیمے میں۔ اور زینب بدھتی رہی کہ ابھی عون و محمد زندہ ہیں۔ ابھی عون و محمد کی لاشیں نہیں آئیں۔ بچے گھر میں آگئے اتنا سلام۔ ہائیں ابھی تم زندہ ہو۔۔۔ میں تو صبح سے مصلیٰ پچائے بیٹھی ہوں کہ تمہاری لاشیں آئیں اور میں سرخرو

بوجاؤں۔ تم ابھی تک میدان میں نہیں گئے۔ دروازے تک آئی۔
 بچے میدان میں گئے۔ رٹتے رہے۔ خیموں سے جدا بند ہوئی کہ زینب کے بچے
 شہید ہو گئے۔ کہا زینب کہاں ہے۔ رک گئے۔ دیکھا کہ جدے میں ہیں
 امام لاشیں لے کے آئے۔ یا اللہ تیرا شکر ہے۔ اب جو ماں آئی بیٹوں
 کی لاشوں پر بیٹھ گئی۔ بیٹھی ہی تھی کہ چھوٹے کے لب ہلے۔ کیا کہنا چاہتا ہے۔
 بچہ کہہ رہا تھا۔ اماں اب تو قوراضی ہو گئی ہے نا! ہم پیار سے تھے۔ دندنہ جڑی لعل
 اور دیرینک رٹتے۔ اور زینب سر کے بال چوم کر۔ ماتھے کے زخم چوم کر کہہ
 رہی ہیں کہ میرے پیارے بیٹو! اگر کبھی جبر کا ہو تو معاف کر دینا۔ عوں و محمد۔ میں تمہارا
 شکر گزار ہوں۔ اب میری ایک اور بات یاد رکھنا ابھی تھوڑی دیر بعد تم اپنے نانا حیدر
 کنارے کے پاس پہنچو گے۔ کوثر کے کنارے۔ اگر ساقی کوثر۔ کوثر کے کنارے
 تمہیں پانی پلائے تو میرے پیارے بچو! ماں کی بات ضرور یاد رکھنا۔ کوثر
 پر جا کے بھی حسین سے پہلے پانی نہیں پینا۔ جی بھر کے رولو۔ ان کی ماں کو کسی
 نے نہیں رونے دیا۔ جی بھر کے رولو۔ یہ زینب کے بچوں کی مجلس
 ہے۔ اب میں پردہ نشین خواتین سے کہنا چاہتا ہوں کہ تمہاری مجالس دن کو ہوتی
 رہیں۔ جب تمہاری مجلس ہو تو تمام اکٹھی ہو کر سر کے بال کھول دینا اور زینب کو عوں
 و محمد کا پرستہ دینا۔ زینب ہم تیرے بچوں کو رونے آئی ہیں۔ اللہ آپ
 کی مجلسوں کو قبول و منظور فرمائے۔

شامِ غریبان

صاحبان — مختصر سی گفتگو کو پورے غور اور توجہ سے سنیں تاکہ آپ کو وہ بات یاد رہے جو میں کہنا چاہتا ہوں — میں آج کی یہ گفتگو اس بات سے شروع کرتا ہوں کہ جتنے بھی انبیاء دُنیا میں تشریف لائے — جن کی تعداد کا صحیح اندازہ ابھی تک نہیں لگے — شہرت عام یہ ہے کہ ایک لاکھ اور چوبیس ہزار — یہ شہرت عام ہے — یہ نہیں کہ یہ تعداد طے شدہ ہے — یہ ایک شہرت عام ہے — پھر ان تمام انبیاء میں سے بعض کا ذکر قرآن میں ہے اور اکثر و بیشتر کا تذکرہ نہیں — مگر ایک بات ان سارے انبیاء کے متعلق مشترک طور پر قرآن میں موجود ہے — کہ ان انبیاء نے اپنے تشریف لانے اور ہدایت فرمانے کا مقصد یہ بیان کیا ہے، بزبان قرآن — بزبان خدا — وَمَا عَلَيْنَا إِلَّا الْبَلَاغُ — ہم اس لئے دُنیا میں آئے ہیں کہ اسے دُنیا والو تمہارے سامنے حتیٰ کی، اور حکم خدا کی تبلیغ کریں — یہ بیان کرتے کرتے کرتے کرتے — جب نبوت چلتے چلتے خاتم النبیین پر پہنچی — ان سے بھی لوگوں نے پوچھا کیا آپ بھی اسی طرح نبی ہیں جس طرح وہ تھے؟ — آپ بھی تبلیغ ہی کے لئے آئے ہیں، جس طرح وہ آئے تھے — تو آپ نے فرمایا نہ — میں تبلیغ کے لئے نہیں آیا — میرا مقصد بلاغ نہیں ہے — بلاغ کے معنی یہ ہیں کہ بالکل سلجھے ہوئے انداز میں کسی بات کو کسی سے کہدیا جائے — اس کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے اس کا ذمہ دار وہ کہنے والا نہیں ہے — اسے تبلیغ کہتے ہیں — سمجھ میں آیا نہ آپ کے — آپ کا کیا مقصد ہے؟ تبلیغ؟ کہ نہ میں تبلیغ کے لئے نہیں آیا — میرے اللہ نے میرے آنے کا مقصد تبلیغ کے علاوہ مقرر کیا ہے — کیا؟ کہ يُعَلِّمُ هُمُ الْكِتَابَ الْحَكِيمَةَ — میرا مقصد تبلیغ نہیں تعلیم ہے۔

تعلیم چیز اور ہے، تبلیغ چیز اور ہے۔ میں مبلغ نہیں ہوں میں معلم ہوں۔۔۔۔۔
 سمجھ میں آیا صاحبان کے؟ یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آتی جا رہی ہے۔ ایک
 یہ بڑا فرق ہے، باقی انبیاء میں اور ہمارے بنی میں کہ وہ سب مبلغ تھے، ہمارا رسول معلم
 تھا۔ سمجھ رہے ہونا حضور والا۔۔۔۔۔ مبلغ کے لئے کوئی لمبے چوڑے علم کی ضرورت
 نہیں۔ مگر معلم کے لئے۔۔۔۔۔ جس چیز کی وہ تعلیم دے رہا ہے اس کی ہر جزئیات
 تک کی مہارت ضروری ہے۔ مبلغ کا کام ہے کہدینا۔ اور معلم کا کام ہے
 سمجھا دینا۔ دونوں میں لحاظ بڑا مشکل ہے۔ اس لئے کہ مبلغ کے سامنے
 بھی اور معلم کے سامنے بھی جو جمع آئے گا اس میں ذہین ہوں گے۔ کچھ کم ذہین کے
 ہوں گے۔ کوئی کند ذہین ہوں گے۔ کوئی تو تجربہ کرنے والے ہوں گے۔۔۔۔۔
 کوئی کھانا ٹری ہوں گے۔ تو مبلغ نے بات کہہ دی کند ذہین سن رہے ہیں۔
 تو تجربہ والے تو تجربہ دے رہے ہیں۔ مگر معلم کو اس طرح بات کرنی پڑے گی کہ ہر
 طبقے کے آدمی کے ذہن میں وہ بات بیٹھ جائے۔ گویا اس کا کام ہے سمجھانا۔
 تو اتنا فرق تو یہ ہو جائیگا مبلغ اور معلم میں کہ مبلغ کہے گا کہ بھائی ذرا جو سمجھ دار ہیں۔ وہ
 آگے آجائیں اور جو نا سمجھ ہیں وہ پیچھے بیٹھیں۔ مگر معلم کا کام ہے سمجھانا۔
 وہ یہ نہیں کہے گا۔۔۔۔۔ وہ تہذیب کرے گا کہ بھئی وہ جو ذرا نا سمجھ ہیں جن کی سمجھ ذرا
 کمزور ہے وہ ذرا اور قریب آجائیں۔ سمجھے حضور۔ یہ تین فرق ہے۔
 مبلغ میں اور معلم میں۔۔۔۔۔ اگر یہ بات آپ لوگوں کے ذہن میں اگلی ہے اور یقیناً آ
 عینی ہوگی۔ کہ ہمارے بنی کا کام ہے تعلیم۔ اُن کا کام ہے تبلیغ۔ میں
 کئی دفعہ آپ کو یہ بات سمجھا چکا ہوں۔ آپ ان باتوں کو سرسری سمجھ کر بھول جاتے
 ہیں۔ نظر انداز کر دیتے ہیں۔ مگر یہ بھولنے کی باتیں نہیں۔ انہی کے اندر ساری
 بات ہے۔۔۔۔۔ یہی سارا فلسفہ اور منطق ہیں۔ کہ تعلیم کا کام یہ ہے۔۔۔۔۔ لفظ قاعدہ

یاد رکھنا۔ کہ جب بچہ مدرسے میں داخل ہو تو اسے پہلی کتاب جو دی جاتی ہے وہ قاعدہ ہے۔ تعلیم کا قاعدہ یہ ہے کہ جو لفظ بچے بتایا جائے اس کے سامنے اس لفظ کی ایک تصویر بھی بنادی جائے۔ یہ طریقہ تعلیم ہے۔ الف سے آم تو آم کی ایک تصویر بھی ہو۔ سمجھے۔ اور س سے سانپ۔ سانپ کی ایک۔ تصویر بھی ہو۔ ش سے شیر، شیر کی ایک تصویر بھی ہو۔ تاکہ ادھر بچے ذہن میں ہو شیر۔ ادھر بچے کے داغ میں ہو شیر کی تصویر۔ دونوں چیزیں جب ذہن میں ہوں تب مقصد تعلیم پورا ہوتا ہے۔ اگر یہ تصویر کا قاعدہ کسی بچے نے پڑھا ہے، اُسے یہ تو یاد ہے ش سے شیر۔ شیر کی تصویر نہیں دیکھی اس نے۔ وہ باپ کے ساتھ گیا لاہور۔ آبا بچھے چڑیا گھر دکھا دے چل کے۔ آبا اسے چڑیا گھر لے گیا۔ بچے نے پوچھا۔ ”آبا یہ کیا ہے؟“ کہ بیٹے یہ شیر کا بیخود ہے۔ اب یہ تو یاد تھا اسے ش سے شیر۔ تصویر نہیں دیکھی تھی اس نے شیر کی۔ وہ شیر کا بیخود دیکھنے لگا۔ چڑیا گھر والوں کا شیر مر گیا تھا۔ انہوں نے خالی بیخود دیکھ کر اس میں ایک گدھا بند کر رکھا تھا۔ اس بچے نے شیر کی تصویر نہیں دیکھی تھی۔ وہ شیر کی جگہ بیٹھا دیکھ کے گدھے کو شیر سمجھ بیٹھا۔ اگر کہیں وہ ش سے شیر کی تصویر بھی دیکھ چکا ہو تا تو لا کھ اس کا باپ بھی کہتا کہ بیٹا یہ شیر ہے۔ وہ کہتا ”آبا کیوں جھوٹ مارتا ہے۔ میں تو شروع میں ہی دیکھ چکا ہوں۔ شیر کی تصویر۔ یہ تو کوئی اور ہے جو شیر کی جگہ آگیا ہے۔ سمجھ میں آیا۔ قاعدہ یہ ہے تعلیم کا۔ جو بات کہی جائے اس کی تصویر بھی ساتھ ہو۔ دیکھو جو میں کہہ رہا ہوں یہ اس کی تصویر ہے۔ دیکھو یہ کہہ رہا ہوں یہ اس کی تصویر ہے۔ سمجھے نا حضور، تصویر سے قطع نظر کرنے والے طالب علموں نے دھوکا کھا لینا ہے اور انظر میں اگر کتاب اور تصویر دونوں رہیں تو طالب علم کبھی دھوکا کھا سکتا ہی نہیں۔ اسے کبھی مغالطہ لگ سکتا ہی نہیں۔

میری بات ابھی طرح ذہن میں اٹھنی نا آپ کے؟ — خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا میرا مطلب یہ تھا کہ رسول اکرام ہے — ہمارے رسول اکرام ہے — کہ وہ مبلغ نہیں ہے بلکہ معلم ہے — معلم تعلیم دیتا ہے — تو تعلیم کے لئے سارے لوازمات تعلیم رسول کے پاس موجود ہیں — رسول خود معلم ہے — اس کا ماحول جو ہے وہ درس گاہ ہے — اس میں کئے والے جو ہیں وہ طلبہ ہیں — سمجھے؟ — ان کا امتحان بھی ہوتا ہے — ان کو پاس نیل کی ڈگری بھی ملتی ہے — کوئی اس میں مدل پاس کرتا ہے — کوئی میٹرک تک چلتا ہے — کوئی ایف اے تک چلتا ہے — کوئی بی۔ اے تک جاتا ہے — کوئی ایم۔ اے تک پڑھتا ہے — کوئی بی۔ ایچ۔ ڈی ہو جاتا ہے — یہ مزدوری نہیں کہ کالج میں جتنے داخل ہوں سب یکساں ہوتے ہیں — دماغ کے اختلاف کے مطابق کوئی ڈاکٹر ہو گیا — کوئی وکیل ہو گیا — کوئی انجینئر ہو گیا — کو جو نیل کر نیل ہو گیا — اب ہر ایک سے توقع رکھیں کہ وہ اچھا جرنیل ہے یہ غلط ہے — ہر ایک سے یہ توقع رکھیں کہ وہ اچھا ڈاکٹر بنے یہ غلط ہے — جیسا جیسا جس کا دماغ — جیسی جیسی جس کی طبیعت — ویسا وہ بن جاتا ہے — کوئی اچھا تاجر بن گیا — کوئی اچھا سنگرم بن گیا — مزاج جیسا ہے اسی طرح — کوئی اچھا بلیک مارکیٹیا بن گیا — تو غرض جیسا جیسا جس کا دماغ ہے ویسے وہ بن جاتا ہے — طلبہ — سارے — انجام کار یکساں نہیں بنتے — تو رسول ہیں معلم — ان کا جو ماحول ہے وہ ہے درس گاہ — اس میں داخل ہونے والے ہیں — طلبہ اور لطف یہ کہ فیس کوئی نہیں — آؤ بھی بسم اللہ داخل ہو جاؤ — پھر طلبہ کے لئے عمر کی قید بھی نہیں — جس عمر کا طالب علم آنا چاہے — آؤ بسم اللہ تشریف لاؤ، بیٹھ جاؤ پھر کسی وطن کسی علاقے کی قید بھی نہیں — کوئی کوڑا مقرر نہیں ہے کہ ایران سے اتنے اور عرب کے اتنے اور روم کے اتنے — جہاں کا جو آ جائے — ڈھائی سو برس والا، بسم اللہ

یہ۔ یہ۔ سو برس کا ہے۔ — یسٹم اللہ تم بھی آجاؤ۔ — یہ صاحب ایسی اچھی پیدا ہوئے ہیں۔ — یسٹم اللہ تم بھی آجاؤ۔ — کوئی قید نہیں — جیسا جیسا طالب علم ہے، آتا رہے، اس کے مطابق اسے پڑھایا جائے گا۔ تو اس طرح یہ درس گاہ ہے — خوب سمجھ میں آرہی ہے نابات صاحبان کے؛ — یہ کالج ہے — یہ درس گاہ ہے — جس میں مختلف جماعتوں میں مختلف سکولوں اور طبیعتوں کے طلبہ داخل ہیں اور اپنی اپنی صلاحیت و استعداد کے مطابق وہ علم حاصل کر رہے ہیں — معلم ذرہ برابر بھی کوتاہی کس کے پڑھانے میں نہیں کرتا — سب پہ یکساں توجہ کرتا ہے — یکساں سب سے سلوک کرتا ہے — سب سے مہربانی سے پیش آیا ہے — یہ اور بات ہے کہ گھر جا کے اپنے بچوں کو ٹیوشن کے طور پر بھی پڑھا دیتا ہے — باقی مدرسے میں سب کے ساتھ یکساں سلوک ہے — مدرسے میں سب کو یکساں طور پر پڑھاتا ہے — یہ ہمارا رسول معلم ہے — جب معلم ہے — درس گاہ ہے — کالج ہے — تو اس میں درجات بھی ہیں — یہ میٹرک ہے — یہ ایف ایس ہے — یہ بی اے ہے — تو اس کے درجات جمہ ہیں — وہ جو سلیبس کی کتاب ہے اس درس گاہ کی — جو اس نصاب تعلیم اس کا مقرر کیا ہے وہاں اس کے درجات بھی مقرر کئے ہیں — پہلی کلاس یہ ہے — دوسری یہ ہے — تیسری یہ ہے — چوتھی یہ ہے — چھٹے — وہ کلاسیں جہاں مقرر ہوئی ہیں — وہ آیت میں آپ کو سنا کر پھر مجلس شروع کرتا ہوں — اب آپ حضرات نے میری بات پہ غور کر لیا ہے اچھی طرح سے؛ ہوں — آگئے نامدرسے میں — آگئے تم؛ امتحان دینا پڑیگا — یہ نہیں ہوگا کہ چھ مہینے میرا سر کھپاؤ اور امتحان کے وقت بھاگ جاؤ — یہ نہیں ہو سکتا — یہ غلط ہے — امتحان بھی دینا پڑے گا اگر آگئے تو — سال بھر بیٹھے رہے کہ یہ پڑھاؤ اور جب میں امتحان کے لئے جاؤں تو بھاگ جاؤ — یہ نہیں ہو سکتا

— امتحان بھی دینا پڑے گا — سمجھے حضور؟ اور یہ امتحان بڑی نامراد شے ہے
 — یہ بچے جو امتحان دیتے ہیں ان سے پوچھو — بڑی ہی نامراد شے ہے یہ امتحان
 — امتحان کے سنٹر سے بڑھ کر کوئی جیل نہیں ہے — کوئی خطرناک جگہ نہیں
 جتنا امتحان کا سنٹر خطرناک ہوتا ہے، جتنا وہ جیل بڑی ہوتی ہے — امتحان بڑی سخت
 چیز ہے — یاد رکھو درستو — میری بات کو بھولنا نہیں — ان باتوں کو یاد رکھنا
 — امتحان انسان کا بھی ہوتا ہے — امتحان حیوانوں کا بھی ہوتا ہے — درختوں کا بھی
 ہوتا ہے — پتھروں کا بھی ہوتا ہے — آپ زمیندار ہیں — آپ تو گندم کا
 امتحان دیتے ہیں — یہ کس قسم کا ہے؟ اور یہ کس قسم کا؟ — تب اسے کاشت کرتے
 ہیں — روٹی کا، کپاس کا امتحان لے کر — کون سی؟ کس قسم کی ہے؟ تب اسے
 کاشت کرتے ہیں یا نہیں — پتھروں کا امتحان بھی ہوتا ہے — حیوانوں کا بھی —
 ضلع سرگودھا میں وہ کیا نام ہے؟ ڈپو — کیا نام ہے اس کا؟ — مونا ڈپو —
 اس میں گھوڑے پلتے ہیں — فوج کے لئے — تو ہر سال جو گھوڑے تیار ہوتے
 ہیں ا — وہ جاتے ہیں فوج میں — یہ نہیں کہ جتنے گھوڑے مونا ڈپو میں تیار ہوتے
 وہ فوج میں چلے گئے سارے — ایک ماہر آکے ان کا امتحان لیتا ہے گھوڑوں کا
 — بڑے بڑے تیار، تندرست، اعلیٰ درجے کے گھوڑے، پچھلے سامنے کھڑے
 ہیں — اس نے ان میں سے دس چھانٹ لئے — باقی ان فٹ کر دیئے —
 وہ تو بڑے خوبصورت، شاندار تھے — یہ کیوں ان فٹ کئے تم سب؟ — کہ
 ہمارا معیار ہے امتحان کا؟ ہم نے انہیں فوج میں لے جانا ہے — ہم نے ان سے
 تو پیسے کھنچوائی ہیں — تو ہم یہ بات دیکھے ہیں کہ فوج میں جو گھوڑے جاؤ جو توپ
 کھینچ کے میدان میں لے جائے — چاہے گولے برسیں — چاہے ہوائی جہاز
 اوپر سے بم بارش کریں — چاہے کچھ ہو — وہ کہیں توپ لے کے بھاگ نہ جاؤ

— سینہ سپر ہونا چاہیے اس کو — کہیں ایسا نہ ہو کہ ہماری توپ ہی کو لے کر بھاگ جائے
 نامراد — دوسرے بیکہ جنگ کے میدان میں ہیں ہفتوں، مہینوں خندقوں میں رہنا
 پڑتا ہے — دشمن کو تپہ نہ چلے کہ ہم کہاں ہیں — وہیں ان گھوڑوں کو ہمارے ساتھ
 رہنا پڑتا ہے — یہ صفت ہو اس میں کہ اگر کہیں دشمن کے خطرے سے چھینا پڑے تو
 کہیں نہ ہانے نہ لگ جائے — ایسے گھوڑے بداصل ہوتے ہیں نامراد — اسی بات
 ان کا امتحان ہوتا ہے — تو ہر چیز کا امتحان ہے — رسولؐ کا ایک مکتب ہے —
 کالج ہے — مدرسہ ہے — حضورؐ معلم ہیں — دنیا ان کی طالب علم ہے —
 اس کی کلاس میں ہیں — یہ پہلی ہے، یہ دوسری ہے، یہ تیسری ہے — اب یہ ان
 کی توفیق ہے کہ جس کلاس کا کوئی پہلے پاس کرے — ان کلاسوں کی جو ترتیب سلیبس
 میں ہے وہ یوں ہے — بھائی — **لَبِّمِ اللّٰہُ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ ط وَالْعَصْرُ اِنَّ**
الانسان لَفِیْ خُسْرٍ ۝ پہلی کلاس — **اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَوَعَدُوْا بِالصّٰلِحٰتِ**
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ تَسْرِیْ کُلّٰس — **وَتَوَاعَدُوْا بِالْحَقِّ ۚ فَاُولٰٓئِکَ سَلَامٌ —** **وَتَوَاعَدُوْا**
بِالصَّبْرِ ۚ پانچویں کلاس — اب دیکھنا یہ ہے کہ کون انسان کس کلاس میں کامیاب ہوتا
 ہے — کون داخل ہونے والا کس کلاس ... ؟ **اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ —**
 ہنسا نہیں — کہیں ایسا نہ ہو کہ طالب علم تو بڑا پرانا ہو اور خسر سے ہی راضی ہو جائے
 یہ پہلی کلاس ہے — **اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ —** بالکل پہلی کلاس ہے — اس میں
 تم داخل ہوئے آگے — اس میں تم سب نقصان میں ہو — سب گھٹے میں ہو —
 یہ گھٹا کیا ہے انسان کو؟ — نقصان کیا ہے انسان کو؟ اس میں بڑی تفصیلیں ہیں قبلہ
 — یہ ساری تفصیلات آپ کے سامنے بنیان کرنے کے لئے بڑا وقت چاہیے کہ انسان کہاں
 کہاں، کس کس طرح نقصان میں ہے — گھٹے میں رہتا ہے — یہ وہ کلاس
 ہے جس میں سب شامل ہیں — **لَفِیْ خُسْرٍ ۚ** والی — اب اس کلاس کو پاس کیا

کسی نے اگے کلاس آئی۔ ان الذین امنوا۔ یہ ہے گویا کچی کلاس۔
 اب تم امنوا بن گئے۔ آمنو کے معنی کیا ہیں؟ تمہارے مزاج میں، تمہاری طبیعتوں
 میں، تمہارے اخلاق میں، تمہاری عادات میں امن پسندی پیدا ہو۔ یہ ہے امن
 ۔ آمنو، کوئی ایسی شے نہیں جو آسمان سے برستی ہو۔ کوئی لباس نہیں جو آدمی
 کو پہنا دیا جاتا ہو۔ کوئی اور رنگ نہیں جو آدمی پر چڑھا دیا جاتا ہو۔ آمنو کا لفظ
 ایمان سے اور ایمان کا لفظ امن سے بنا ہے۔ یعنی اب تم میں جھگڑا فساد نہیں
 رہا۔ رٹائی فساد نہیں رہا۔ خواہ مخواہ کو الجھنا نہیں رہا۔ اب تم امن پسند
 بن گئے ہو یا نہیں۔ سمجھنا حضور؟ اب امن والی کلاس کا جو معلم ہو گا وہ خود
 ایسا ہو کہ اس امن میں اس دے بے پہ پہنچ چکا ہو کہ امن قائم رکھنے کے لئے باوجود طاقت کے
 دنیا بھر کا پیسہ، کچھ بھی کہتی رہے، مگر وہ امن کی خاطر اپنے حقوق کو چھوڑ کر خاموش
 بیٹھ جائے۔ ایسا امن پسند، مکمل ایمان کہلا کر آمنو کا مصداق بن جاتا ہے۔
 ایسا ہی معلم دوسروں کو امن سکھا سکتا ہے۔ تم آمنو کلاس پاس کر چکے۔
 اس لئے تمہارا نام آج سے ہو گا۔ امیر المومنین۔ یہ مومنین کی کلاس تمہیں مبارک
 ہو۔ امیر تو چھوٹی سی چیز ہے، یہ اور بلند ہو گا۔ یہ نہیں کہ امیر المومنین پہ جا کے بات ختم
 ہو گئی۔ سمجھ حضور۔ اب تم آمنو کلاس کو پڑھانا۔ تم ہو امیر المومنین۔
 اس کے بعد کیا ہو گا۔ اس کے بعد ہے۔ عمل الصالحات۔ محض پر امن بن
 کے بیٹھ جانا ہی کافی نہیں۔ آرام سے بیٹھے ہیں۔ کہہ دیا کہ امن ہے۔
 گھر بیٹھے ہیں بڑے حوصلے سے۔ کیا ہے؟ کہ امن ہے۔ یہ امن نہیں۔
 سمجھ میں آیا نہ آپ کے۔ کسی کے گھر میں آگ لگ رہی ہے۔ اندر بیٹھے ہیں۔
 ہم تو نہیں جاتے۔ کہ کیا ہے؟۔ جی امن ہے۔ گھر دوسرے کا بجے،
 تم آرام سے بیٹھو، اس کا نام امن رکھو۔ یہ ہے دنیا کی سب سے بڑی حماقت اور

سب سے بڑی ذلالت — اپنا گھر چل رہا ہو اور اُسے نہ کرے آدمی یہ اور بات ہے۔
 گھر کسی کا چلے، صبر ہم کریں — کیا ہے جی؟ امن ہے — یہ بات دنیا کی سب
 سے بڑی ذلالت ہے — سمجھنا حضور والا — تو امن یہی نہیں ہے کہ جی آرام سے بیٹھے
 ہیں کیا ہے جی؟ امن ہے — غلط ہے — اسے امن نہیں کہتے — تو جہے نا حضور
 والا — اسے امن نہیں کہتے — امن کے معنی یہ ہیں کہ اس کے ساتھ ساتھ عمل الصالحات
 بھی ہوں تم ہاتھ پاؤں توڑ کے نہ بیٹھ جانا بلکہ جو نیک کام میں دو بھی کرتے رہنا —
 اب یہ جو نیک کام کا لفظ ہے نا — یہ بڑا مشکل لفظ ہے — حضور — ہر آدمی کے
 مزاج کے مطابق نیک کام کا معیار الگ الگ ہوتا ہے — نیک کام ہر ایک کے نزدیک
 الگ الگ ہے — ایک کام ایک کیسے نیک اور عبادت ہے دہی کام دوسرے کے لئے
 بد اور بدعت ہے — نیک کا معیار الگ الگ ہے — سمجھو؟ کوئی کسی بات کو
 نیک سمجھتا ہے، کوئی کسی بات کو — کلاس کے لڑکے بیٹھے ہیں — ایک نے کہا
 چل یا دوڑیں — سیر تفریح کریں — اس کے نزدیک بہت کمال ہے یہ کہ کلاس
 سے بھاگ کے کھیلا جائے — کھیل رہے ہیں — کسی کے نزدیک یہ نیکی ہے — وہ بیٹھ
 کے پڑھ رہے ہیں — اپنی اپنی بات ہے — اصل میں نیکی کا معیار —
 اگر ہم اپنی عقل سے فیصلہ کرنا شروع کر دیں تو پھر نیکی ایسا عجوبہ بن جائے کہ دنیا میں کہیں
 اس کا وجود نہ پایا جائے — ہر ایک الگ الگ شے کو نیکی سمجھے گا — کوئی کسی بات
 کو، کوئی کسی بات کو — ایک مصیبت بن جائے گی یا نہیں — لہذا ضروری ہے کہ
 نیکی کے کام کو طے کرنے کے لئے کہ عمل الصالحات کیا شے ہے — یہ طے کرنے کے
 لئے معلوم ہی کی طرف رجوع کیا جائے — جناب آپ فیصلہ کریں کہ یہ — اس کا معیار
 کیا ہے — ہمارے کرنے سے نہیں — ہم تو اپنے اپنے مزاج کے مطابق صالحات
 بنائیں گے — آپ بتائیں کہ عمل صالح کیا ہے؟ تاکہ ہم ایمان کے بعد وہ عمل صالح کریں —

اور چونکہ آپ معلم ہیں۔ لہذا جو عمل صالح آپ نہیں بتائیں۔ وہ محض محض بتائیں ہی نہیں۔ اس لئے کہ آپ مبلغ نہیں ہیں۔ وہ کر کے دکھائیں۔ آپ اگر فہمے مبلغ ہی نہیں جو صرف بتائیں۔ آپ معلم ہیں۔ عمل صالح ہیں کر کے دکھائیں۔ اس نے کہا اچھا۔ ٹھہرو۔ آؤ۔ تمہیں کر کے دکھانا ہوں۔ تم دیکھتے رہنا۔ چونکہ یہ عمل کا معاملہ ہے، یہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ قول کا معاملہ سننے سے تعلق رکھتا ہے۔ جو میں کہوں اسے سن لو اور جو عمل ہے اسے دیکھو۔ سمجھو۔ تمہیں دیکھنا پڑے گا۔ اب میں تمہیں عمل صالح دکھاتا ہوں۔ دیکھو۔ اے۔ اے۔ اے۔ یہ ہے عمل صالح۔ دیکھو اسے۔ نماز سن کے نہ پڑھنا۔ میں نے کہہ دیا نماز پڑھو۔ تم نے پڑھ لی نا؟ جس کو کیا دایتھوئی۔ دیکھو مجھے میں کس طرح نماز پڑھتا ہوں۔ دیکھو۔ آؤ دیکھو۔ نماز عمل صالح جب بنے گی، جب مجھے دیکھ دیکھ کر میرے طریقے سے نماز پڑھو گے۔ دیکھتے رہو اچھی طرح۔ دیکھ رہے ہو۔ ہیں؟ دیکھ رہے ہونا؟ دیکھو کہاں نماز ٹوٹتی ہے۔ کہاں نماز مکمل ہوتی ہے۔ دیکھتے رہو۔ اگر نماز پڑھتے ہوئے ایک آدمی نے گھڑی کو جابی دینا شروع کر دی۔ ٹوٹ گئی۔ یہ زائد عمل ہے۔ اس سے غلط ہو جائے گا۔ نماز پڑھتے پڑھتے کسی روتے ہوئے بچے کے سر پر ہاتھ پھیر دیا۔ نماز ٹوٹ گئی نا؟ یہ غلط ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ پھر اگر ان افعال سے نماز ٹوٹتی ہے کسی معلم نے بتایا ہے۔ تو یہ دیکھتے رہو کہ کہاں نہیں ٹوٹتی۔ اگر بچے کے سر پر ہاتھ پھیر دو تو ٹوٹ گئی۔ اور بچے کو گھنٹہ بھر کر پٹ بھائے رکھو تو نہیں ٹوٹتی۔ یہ معلم بتاتا ہے۔ ہمارے کان کا۔ سمجھو۔ تمہارے فیصلے سے نہیں ہو گا۔ یہ معلم بتائے گا کہ عمل صالحات میں کیا ہے؟ کہاں نماز میں نقص آتا ہے کہاں نماز پوری ہوتی ہے۔ یہ معلم سمجھاتا ہے۔ سمجھو۔ کسی سے عداوت نہ کرو۔ کسی سے جھگڑا نہ کرو۔ تمہیں کوئی حق نہیں کسی کو بُرا یا بھلا کہنے کا۔

معلم کو دیکھو جا کے وہ کیا کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے نماز پڑھو۔ اور نماز کی قبولیت کے لئے درود شریف پڑھو۔ پڑھو نا درود شریف۔ اللہ صلی علی محمد و آل محمد والہ الصالحین علیہ السلام۔ یہی درود شریف ہے۔ کیا نماز میں یہی درود شریف پڑھو گے۔ نہ وہاں تو نہیں پڑھنا۔ کیوں؟ کہ نماز نہیں ہوگی۔ کہ وہاں کتنی پڑھنی ہے۔ کہ میں الا آل محمد تک۔ اور نماز کے بعد۔ پھر ۱۸۱ اصحابِ محمدی اور نماز میں اگر اصحابِ محمد کہہ دو تو نماز نہیں ہوگی۔ اور اگر آلِ محمد نہ کہہ دو تو نماز نہیں ہونے کی۔ یہ عملِ صالح بتایا۔ کہ دیکھو ہم کسی کو بڑا کہتے۔ مگر آل اور اصحاب میں یہ فرق ہے کہ آل کا نام نہ لینے سے نماز غلط اور اصحاب کا نام لینے سے نماز غلط۔ اگر وہاں اصحاب کہہ دو تو نماز غلط۔ آل نہ کہہ تو نماز ہوگی۔ نہیں۔ یہ عملِ صالح ہے جو ہمیں بتایا۔ دیکھو ادھر آؤ۔ جس طرح میں غل کروں اسی طرح عملِ صالح بنتے ہیں۔ تمہارے لئے یہ قانون ہے اللہ کا۔ کیا؟ لا ھو قعو اصواتکم فوق صوت النبی۔ یاد رکھو مسلمانوں، اتنے ادب سے رہنا رسول کے سامنے کہ تمہاری آواز رسول کی آواز سے بلند نہ ہونے پائے۔ جس آواز سے بول رہا ہے۔ اگر تم بولو تو اس کی آواز سے کم آواز میں بولنا۔ خبردار اس کی آواز سے تمہاری آواز بلند نہ ہونے پائے۔ رسول کے ساتھ تمہارا برتاؤ۔ قد جھس بعضکم بعضاً۔ نہ ہو۔ جس طرح تم آپس میں ملتے ہو اس طرح نہ ملنا کہ گلے مل رہے ہیں۔ ہاتھ مل رہے ہیں۔ نہ۔ اس کا فرق رکھنا۔ رسول کا یہ ہے تمہارے لئے، مسلمانوں کے لئے حکم۔ کہ اگر تم رسول کو سامنے آنا دیکھو تو چاہے تم نماز ہی کیوں نہ پڑھ رہے ہو۔ یہ حکم ہے۔ نماز پڑھ رہے ہو اور رسول نے آواز دی۔ ادھر آؤ۔ فوراً۔ اگر تم نے نماز کی وجہ سے اس کی تعمیل نہ کی تو مر گئے، کُفر ہے۔ فوراً۔ رسول کے جواب میں۔ یہ بھی حکم ہے۔ سمجھے حضور۔

یہ عمل صالح ہے ہمارے لئے — یہ ہمارا عمل صالح ہے — مگر ہم رسول کا عمل صالح کیا دیکھ رہے ہیں — کہ ہم تو آواز ادبچی نہیں کر سکتے — اس کے بلائے پہ نہ بولیں تو کفر ہو جائے اس کے آگے چل پڑیں تو کفر ہو جائے — اس کے سامنے بے لوبی سے بیٹھیں کفر ہو جائے — اسی کے گھر میں جہانکرامت — خبردار — کفر ہو جائے گا — اگر وہ تمہیں کھانے پہ بلائے اس کے برتنوں کو نہ دیکھنا کہ یہ کس چیز کا ہے — یہ کس چیز کا ہے نہ دیکھنا — کفر ہو جائے گا — جس فرش پہ وہ بیٹھا ہے — اس پہ بیچ کے ادب سے بیٹھو ورنہ کفر ہو جائے گا — یہی ہوا تھا نا کہ ام المومنین حضرت ام حبیبہؓ — ام المومنین رسولؐ کی زوجه محترمہ — حضرت ابوسفیان کی بیٹی — امیر معاویہ کی حقیقی بہن — یزید کی سگی چھو بھی — جناب ام حبیبہؓ رسولؐ کی حرم محرم تھیں — رسولؐ کی بیوی تھیں ام حبیبہؓ — سمجھ گئے ہونا حضور — وہ جو رسولؐ کے گھر میں تھیں جناب ام حبیبہؓ — ان کے باپ ابوسفیان اپنی بیٹی سے ملنے آئے رسولؐ کے گھر — آئے — بیٹی نے سلام کیا — کھڑے ہو کے تعظیم کی — باپ تھے — جب بیٹھے لگے تو کہا ابا ذرا ٹھہرنا — اب جو درمی بچی تھی، پیٹ لی — بسم اللہ ابا تشریف رکھو — زمین پر — تو ابوسفیان نے بڑے رعب سے کہا — ام حبیبہ جانتی ہو میں کون ہوں — میں عرب کا بے تاج بادشاہ ہوں — میں لاکھوں فوجیں اکٹھی کر لاتا ہوں محمدؐ کے مقابلہ میں — عرب میں میری دھاک مٹی بھی ہوئی ہے — تو مجھے اس بیٹی ہوئی دری پہ نہیں بیٹھنے دیتی — ام حبیبہؓ نے کہا — یہ رسولؐ کے بیٹھے کی ہے — تم چاہے کچھ بھی سہی نہیں بیٹھ سکتے — آج مسلمانوں کی کتابیں مہری پڑی ہیں اور وجد آتے ہیں — لوگوں کو کہو — کہ واہ ام حبیبہؓ کیا کہنے تیرے — ام المومنین ہو تو ایسی ہو — کہ نہیں بیٹھنے دیا — باپ کو رسولؐ کی جگہ پہ — ام المومنین ہو تو ایسی ہو — جو رسولؐ کی جگہ باپ کو نہ بیٹھ دے — ام المومنین کی یہ شان ہے — یہ اس کا احترام کہو — یہ عمل صالح ہے —

ہمارے واسطے — میں زیادہ تشریح میں نہیں جاتا — مگر ادھر تو رسول کا یہ احترام کہ اس کی جگہ کوئی نہ بیٹھے — کہیں اس کی بچھی ہوئی دری پہ کوئی نہ بیٹھ جائے — اس کے سلسلے کوئی اونچا بولے نہیں — اسے آواز نہ دو — اس کے سلام کا طریقہ بھی اور ہونا چاہیے — دیکھو اس کو پکارنا نہ جب وہ گھر میں ہو — یہ کرنا — اور ادھر ہم دیکھتے ہیں کہ وہی رسول ایک بچی کو دیکھ کر فوراً سر جھکائے تعظیم کو کھڑا ہو جاتا ہے — یہ عمل صالح کی تعلیم ہے جو میں سکھائی — یہ عمل صالح ہے جو میں سکھایا جا رہا ہے — کہ دیکھو اسے عمل صالح کہتے ہیں — ٹیٹری نازوں پر نہ اٹھنا — پیسے روزوں پر نہ اٹھنا — پیسے قرآن پڑھنے پہ نہ اٹھنا — وارثین پر نہ اٹھنا — پیسے نہ اٹھنا — دیکھو یہ عمل صالح بھی سیکھو — یہ دو سال کی بچی ہے — — — دھائی سال کی بچی ہے — یہ آ رہی ہے اور دیکھو — اے — اے — یہ دیکھو — میں رسول اس کی تعظیم کو کھڑا ہوں — یہ دیکھتے رہنا — کہیں ایسا نہیں ہوا — گھر میں — صحن میں — کمرے میں — باورچی خانے میں کہیں ایسا نہیں ہوا کہ رسول کی جگہ ہوا بیٹھی آئی ہو اور فوراً تعظیم کو نہ اٹھے ہوں — اسی وقت تعظیم کو کھڑے ہو جاتے تھے — اور یہ رسول اٹھتے تھے تعظیم کو تو جو پاس بیٹھی ہیں — اہل بیت المؤمنین یا اصحاب ان کی مجال ہے جو وہ نہ اٹھتے ہوں — وہ یقیناً اٹھتے ہوں گے — یہ عمل صالح ہے — یہ میری کلاس ہے رسول کے کتب کی — کہ عمل صالح بھی ہونا چاہیے جو رسول نے بنایا ہے — کہ دیکھو — اے — اے — یہ عمل صالح ہے — اور جب عمل صالح کا امتحان بھی پاس کر لو گے جب اس امتحان میں تم پورے اتر جاؤ گے تو پھر تمہاری اگلی کلاس آئے گی — تواصو بالحق — کہ اب حق کا دامن بھی پکڑو — اب یہ کلاس آئے گی — سمجھنا حضور — اور جب حق کی کلاس میں پاس ہو جاؤ گے تو پھر تواصو بالصبر — وال بات آئے گی — یعنی صبر کی — بس یہ آخری کلاس ہے — تواصو بالصبر جو ہے — یہ بالکل آخری کلاس ہے — سمجھ میں

انگلی ناساجان کے۔ بس بعضی جوبات تھی نہ آن کی وہ یہیں ختم ہو گئی۔ یہ مدرسے کا تعارف
نہ تھا آپ سے۔ یہ جو مجالس ہیں یہ آپ حفلات کو معلوم ہے کہ یہ امام زین العابدین علیہ السلام
والسلام کے ذکر میں ہیں یہ مجلسیں۔ یہ سب سے بڑا عزا دار کر بلا کی عزا داری کے سلسلہ
میں یہ مجلسیں ہیں اور بعض لفظوں میں اور ناموں میں اللہ نے یہ تاثیر رکھی ہے کہ ان ناموں سے
ایک خاص اثر پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً اگر رستم کا نام لو تو خود بخود تصور آتا ہے عدالت
کا۔ اور زین العابدین۔ کچھ نہ کہو بالکل، خود بخود تصور آتا ہے انتہائی مظلومت
کا۔ دنیا کے سب سے بڑے مظلوم اعظم کی یادگار میں یہ مجلسیں ہیں۔ اور میں بلا غروب
تردید پوری ذمہ داری سے یہ کہتا ہوں کہ تواصو بالصبر کے امتحان میں جتنا یہ انسان
کامل کامیاب ہوا۔ جسے زین العابدین کہتے ہیں نہ اس سے پہلے کوئی ہوسرکانہ
بعد میں۔ تواصو بالصبر کے امتحان میں یاد رکھو کہ زین العابدین کا ذکر نامکمل ہے
جس طرح خدا کا کلمہ لا الہ الا اللہ نامکمل ہے، بغیر محمد رسول اللہ کے اسی
طرح ذکر زین العابدین نامکمل ہے جب تک اس کی شریک صبر زینب کا ذکر نہ ہو
سمجھے۔۔۔ زینب، شریک حسین نہیں۔ شریک زین العابدین ہے۔
کر بلا کے معرکے کی ہیرو ہے۔ مرکزی کردار ہیں یہ دونوں پہو بھی جھنجھے۔
اور حسین کے ساتھ شریک نہیں ہے۔ حسین کے زمانے میں تو پر دے میں بیٹھی
تھی۔ حسین میدان میں ٹڑ رہے تھے۔ شریک زندگی ہے، شریک عمل
ہے تو زین العابدین کی۔ یہ امام زین العابدین کی شریک عمل ہے۔ حسین
کی شریک کار نہیں۔ اور جب تک حسین کا سر نیزے پہ نہیں آیا زینب کا قدم
خیمے سے باہر نہیں نکلا۔ بالکل آیا ہی نہیں۔ حسین نے کہا ہی تھا کہ
ہن میری ایک بات یاد رکھنا۔ بس گھر سے باہر نہ آنا۔ کہ حسین نہ آؤنگی
نہ آؤنگی۔ کہہ جو دیا مجھ سے کہ نہیں آؤں گی۔ اگر اس حکم کے بعد زینب

گھر سے باہر ایک تدم بھی رکھ دیتی تو آج یہ بات مشہور ہوتی کہ جناب عورتوں کی یہ فطرت ہوتی ہے کہ وہ باوجود سمجھانے کے گھر سے نکل آتی ہیں، اسی لئے زینب نکل آئی — نہ بالکل نہیں — اکبرؓ شہید ہو یا عونؓ و محمدؓ — چاہے حسینؓ خود کیوں نہ شہید ہوں — کہہ جو گئے ہیں، گھر سے باہر نہیں آنا — بس نہیں آنا زینبؓ تو شریکِ عمل ہے امام زین العابدین علیہ السلام کی — سمجھے حضور — جس وقت حسینؓ اپنا کام ختم کر چکے تو اس نے آکر جگایا ہے امام زین العابدینؓ کو — بیٹا اٹھو — تم غور نہیں کرتے — قُم یا بُنِیَا — بیٹا اٹھو — پتہ نہیں کتنی دفعہ پکارا ہے بیٹا بیٹا کہہ کے — بیٹا اٹھو — امّ نے آنکھ نہیں کھولی بیٹا کہہ کے پکارتی رہیں — سمجھ گئیں — ایک دم پوش میں آ کے کہتی ہیں — قُم یا امامؓ زماننا — میرے زمانے کے عیٰ اٹھ میری مدد کر — اے امام زمانہؓ اٹھ — اب بیٹا ہمیں کہا — اب امّؓ کہا — امام کہہ کے جو پکارا فوراً اٹھ کے بیٹھ گئے — اب یہ ذمہ داری ہے — کہ امان کیا کہہ رہی ہو؟ — کہ بیٹا تو اس وقت زمانے کا امام ہے — اس فقرے سے ہی سمجھ گئے کہ کیا ہو گیا — بیٹھ گئے اٹھ کے — ذرا خیال نہیں کہ بیماری ہے یا تکلیف ہے — اٹھ کے بیٹھ گئے — ”اچھا امان! میں امام ہوں؟“ کہ ہاں بیٹا تو امّؓ ہے امام زمانہؓ ہے اور میں تیری بھوٹی زینبؓ ہوں — امّؓ میں نے پہچان لیا — کہ بیٹا تو تو مجھے پہچانتا ہی ہے — مزدور تو مجھے ہے تجھے پہچاننے کی — ورنہ میں جاہلیت کی موت مچاؤں گی — بیٹا اگر تجھے نہ پہچانا — تجھے مزدور پہچاننا ہے — تو زمانے کا امام ہے — امّؓ تم سے بہتر معرفت امامؓ کسی کو نہیں بیٹا یہ تو بات ہو چکی — اب میں تجھ سے یحیٰیؓ امّؓ کے یہ حکم لینا چاہتی ہوں کہ جن خیرو سے حسینؓ کہہ گئے تھے باہر نہ آنا وہ سب جل گئے — جن خیموں سے باہر نہ

اُنے کو حسین نے منع کیا تھا وہ خیمے کچھ جل گئے کچھ جل رہے ہیں۔ اب میرے ساتھ یتیم بچے ہیں۔ بیوہ عورتیں ہیں اور بیٹیا یہ بھی سُن لے کہ میں بڑی شرمندہ ہو رہی ہوں ان عورتوں سے۔ کسی کا شوہر مر گیا ہے۔ کسی کا بھائی مر گیا ہے۔ یہ غیر خاندانوں کی ہیں میں ان سے شرمندہ ہوں۔ ہماری حمایت میں یہ سب تباہ ہو گئیں۔ میں ان میں سے ایک ایک کو سمجھا رہی ہوں۔ بی بیوہ، تمہارا بڑا احسان ہے۔ اور بیٹا سب سے زیادہ شرم مجھے اپنی بھرجائیوں سے آتی ہے۔ بڑے بڑے گھرنے کی خواتین ہیں۔ ہمارے گھر میں ان کی شادیاں ہوئی تھیں۔ ہیں ان کے سامنے بڑی شرمندہ ہو رہی ہوں۔ وہ کیا سوچتی ہوں گی کہ فاطمہ کی بہو بن کے یہی حال ہونا تھا۔ بیٹا میں بڑی مشکل میں پھنس گئی ہوں تو زمانے کا امام ہے۔ مشکل کشا ہے۔ میں تجھ سے حکم لینا چاہتی ہوں۔ دل میرا بڑا گھبرا گیا ہے۔ آخر خاتون ہوں۔ میرا دل بڑا گھبرا گیا ہے۔ تو امام زمانہ ہے۔ حکم دے کہ ان سب عورتوں، بچوں کو ساتھ لے کر تیرے حکم کی دیر ہے ان ہی خیموں میں جل کے مرجائوں۔ میں ذرا دریغ نہیں کر دنگی اس بات سے۔ حکم دے جل کے مرجائوں؟ کیا کروں بنا؟ میں آپ کو کیا بتاؤں اس وقت امام زین العابدین یہ کیا گذر گئی۔ اس کا اندازہ دنیا کا کوئی انسان کر سکتا ہی نہیں، جب آپ نے چھو بھی کو حکم دیا ہے۔ علیکنا بالصالح۔ اماں بحقیقت امام میں یہ حکم دیتا ہوں کہ ان سب کو لے کے خیموں سے باہر آ جاؤ۔ کوئی بچہ جل نہ جائے۔ باہر نکل جاؤ۔ اس حکم کے دیتے وقت جو گذری ہے امام زین العابدین پر اس کا اندازہ کوئی کر سکتا ہی نہیں۔ کہ کیا گذری اس وقت۔ اور نکل گئے۔ اور میرے محترم سامعین یہ سب ہماری باتیں ہیں، ہم جو آپ سے کہہ دیتے ہیں کہ انہیں جلا ہو خیمہ کسی نے دے دیا تھا۔ یہ غلط ہے۔ جھوٹ ہے۔ اُن کے خیمے کا ایک ایک

ذرہ جل گیا تھا ————— جب نکل گئیں نا باہر ————— جب باہر آگئیں —————
 آکے ریت کے ٹیلوں پر بیٹھ گئیں ————— اب ان کے سامنے کیا تھا ————— ان مسنورات
 کے ایک طرف جلے ہوئے خیموں کی راگھ اور ایک طرف بے سر کے لاشے ————— کبھی ادھر
 دیکھ رہی تھیں، کبھی اُدھر دیکھ رہی تھیں اور اٹھارہ بجائیوں کی بہن بیٹھی ہوئی یہ سوچ رہی
 تھی کہ کیا ہو گیا ————— کیا ہو گیا؟ یہ سوچ رہی تھی اٹھارہ بجائیوں کی بہن اور رات ہو گئی
 ————— اور آپ یقین فرمائیں کہ وہ بچے جو تائب عاشور ساری رات روتے رہے ————— آج
 نہیں روتے، ایک پتہ نہیں روتا ————— سب ماؤں کی گرد میں چُپ ————— یادِ ن کے
 حادثہ سے ہم گئے ————— اتنے ڈر گئے بچے کہ سہمے ہوئے تھے ————— یا اس نے نہیں
 روتے کہ ہم رو کے کیا کر سکتے ہیں ————— کرن مدد کو آنے گا؟ کسے پکاریں ہم —————
 سب بچے سہمے ہوئے ہیں ————— بالکل سہمے ہوئے ہیں ————— اب ٹیلوں کی آڑ میں جو
 مسنورات بیٹھی ہیں ————— چار کسی ٹیلے کی آڑ میں، دس کسی ٹیلے کی آڑ میں ————— جہاں
 جہاں کسی کو جگہ ملتی گئی وہ بیٹھی گئی بے چاری ————— سُن رہے ہونا بھئی ————— اور جب
 رات تو امام زمانہ اپنی جگہ سے اُٹھے ————— حضرت امام زین العابدین —————
 ایک ایک ٹیلے کے قریب گئے جہاں دو خواتین بیٹھی تھیں ————— پوچھا جا کے کہ کون ہے؟
 کہ فلاں صحابی کی بیوہ ہے ————— فلاں شہید ہونے والے کی بہن ہے ————— فلاں شہید
 ہونے والے کی ماں ہے ————— اور کے قریب کھڑے ہو کے کہتے ————— بہن تیرے مرنے
 والے کا بڑا افسوس ہے ————— میں تیرا احسان مند ہوں ————— میں تیرا شکر گزار ہوں —————
 اور جب ایک ایک بی بی کو امام نے پُرسادے دیا تو یہ سب اکٹھی ہوئیں امام کے روبرو
 اور سب نے بیک و نت، بیک زبان ہو کے کہا ————— اسی کو بہن کہتے ہیں جو مل کر گریہ
 کیا جائے ————— تو سب نے یک زبان ہو کے کہا کہ ————— زین العابدین ————— تیرے
 سہرے گھر کے اہل جانے کا بڑا افسوس ہے ————— تو آپ نے دعا مانگی —————

اُن سب کا شکریہ ادا کیا — اور سجدے میں سر رکھ دیا اور سبحان ربی الاعلیٰ کی آواز
 بکرا کی فضا میں گونجی اور صبح تک گونجتی رہی — جب صبح صادق طلوع ہوئی تو فوج بزیلہ
 خود اس بات کی تامل ہے کہ ہم سب نے اپنے کان سے سنا کہ کوئی غیبی آواز آرہی تھی —
 ارفع راسک انت سید الساجدین — اس عالم میں سجدہ کرنے والے تو سارے
 سجدہ کرنے والوں کا بادشاہ ہے — بس اب تو سر اٹھالے — سمجھ — اور یہ
 بات اور آپ کو بتانا چاہوں کہ رات کے دس بجے جب چیرسہ داری ہو چکی — بچے ہیں
 ہوتے بیٹھے تھے، امام نے فرمایا انا — اب ان بچوں کے لئے خوراک کا بندوبست بھی
 ہونا چاہیے — کوئی کھانے پینے کی چیز — سمجھ حضور — حضور نے کہا —
 بی بی نے دیکھا — اپنے ہی جلے ہوئے خیموں میں ایک مشک پڑ گئی تھی — بی بی خود
 وہ مشک لے کر فرات پر گئیں اور وہاں سے وہ مشک بھر کے لائیں — اور جب مشک لا
 رہی تھیں بھر کے تو کہہ رہی تھیں — عباس یہ نہ کہنا — تم سب نے مل کر جو کام کئے ہیں
 وہ سب میں کر رہی ہوں — میں اب پانی لے جا رہی ہوں — ان ننھے بچوں کیلئے
 لے کے آئیں — ان بچوں نے پانی پیا — اس وقت سے امام زین العابدین کی
 زندگی اور زینب کی زندگی شروع ہو گئی — ان دونوں کا تذکرہ جب تک ساتھ
 ساتھ نہ ہو — جب تک ذکر مکمل ہوتا ہی نہیں — انشاء اللہ العزیز بشرط خیرت بقیہ
 زندگی، اگر میں زندہ رہا تو آپ کو ان دونوں کا مفصل ذکر سناؤں گا — اور اس
 تذکرے کا انعام میں نے انہی سے لینا ہے — امام زین العابدین سے — ان سے انعام
 لینا ہے — اور آپ سے یہ کہنا ہے کہ آپ میری ان سے سفارش کر دیں — کہ ان بات
 ہیں — مومن میں — مولا زین العابدین چالیس سال ہو گئے تیرے دروازے
 پر صدا لگاتے ہوئے کوئی اور دروازہ نہیں دیکھا تیرے دروازہ کے بغیر — دنیا تو گذر
 گئی ہے اور گذر جائے گی — عاقبت میں تو ہی سہا رہا ہے اور انجام تمہارے

ہے یہ تم دونوں چھوٹی بھتیجیوں کے ہاتھ ہے میں نے پنجاب ابلکہ مغربی
 پاکستان کے گاؤں گاؤں میں زینب کا ذکر پہنچا دیا ہے لوگ زینب سے آشنا
 نہیں تھے لوگوں کو زینب کا پتہ نہیں تھا آج لوگوں کو پتہ چل گیا کہ زینب کے
 ذکر کے بغیر یہ ذکر نامکمل ہے باقی انشاء اللہ کل بشرط زندگی آج اتنی
 ہی بات اللہ تمہیں سلامت رکھے تمہیں اس ذکر کی برکات سے نوازے
 بحق محمد وآل محمد آمین

— ۲ اپریل ۱۹۶۰ کوٹ کرم شاہ (سیر محل) —



اضافہ شکرہ

اضافہ شکرہ

دربار شام

فضائل

مصائب

باطل کو کھنکھاتے شام کی جانب
زینب نہیں شبیر کی تحریک چلی ہے

افسوس

جو کہ میں بوجہ اپنی بیماری اور کمزوری کے مختصر وقت میں بڑھتا ہوں۔ زیادہ لمبی تقریر اب مجھ سے نہیں ہوتی۔ کسی زمانے میں دو اڑھائی گھنٹے پڑھ کے مجھے پتہ بھی نہیں چلتا تھا کہ پڑھا بھی ہے یا نہیں۔ اب دس پندرہ منٹ کے بعد تھک جاتا ہوں۔ تو اگر ایسا مضمون شروع کر دوں جو تھوڑے وقت میں پورا نہ ہو سکے تو پھر سامعین بھی بے لطف و بے خط ہوتے ہیں اور مجھے بھی کوئی لطف نہیں آتا۔ اب میں کوشش کرتا ہوں اس بات کی کہ کوئی ایسی بات کہی جائے جو تھوڑے وقت میں پوری ہو سکے۔ تو بزرگانِ مَن۔ ایک بڑا پرانا مضمون تھا جو میں کبھی پڑھا کرتا تھا۔۔۔ ابھی جب میں یہاں آیا تو ذکرِ صاحب پڑھ رہے تھے۔ مجھے وہ بات یاد آگئی۔ پہلے وہ میرے ذہن سے نکل چکی تھی۔ وہ ابھی مجھے یاد آگئی ہے۔ وہی میں شروع کر رہا ہوں۔ وہ مضمون ایسا ہے اسے جہاں ختم کر دو وہیں ختم ہے۔ جہاں شروع کر دو وہیں شروع ہے۔ وہ اس طرح کا ہے۔ آپ میری بات کو غور سے سنیں۔ اور میں آپ کو وہ سناتا ہوں۔

اس مضمون کی جو میں شروع کر رہا ہوں۔ جو تمہید ہے وہ شروع ہوتی ہے انسان سے۔ کہ انسان کے اندر انسان کے پیدا کر نیوالے نے کتنی طاقتیں، قوتیں اور صلاحیتیں رکھی ہیں۔ گویا اس چیز سے شروع ہوتا ہے یہ مضمون کہ انسان میں خود کتنی صلاحیتیں، کتنی طاقتیں، کتنی قوتیں اور کتنے کام کرنے کے جذبے، خود انسان کے اندر، انسان کے خالق نے رکھے ہیں۔ اور پڑھئے کچھ حضرات ہیں یہاں ایک لفظ کہہ کے آگے بڑھتا ہوں کہ انسان کے اندر ولایت کہ وہ صلاحیتیں اور طاقتیں جن کا انسان کو خود علم نہیں کہ مجھ میں کتنی طاقتیں ہیں، اُن ساری انسانی طاقتوں کے

— یہ شکرِ نعت میں مل رہا تھا۔ وہ سید الساجدین تھا اور زین العابدین بھی تھا جو اللہ نے شکرِ نعت میں عطا فرمایا۔ اب جب یہ نعت مل گئی سید الساجدین، زین العابدین والی نور رسول نے کہا لاؤ وہ بھی شکر یہ ادا کر دیں۔ اس کا شکر یہ ادا کیا تو اللہ نے کہا محمد سنتے بھی ہو، اس شکر کے میں تمہیں محمد ہی نہ دے دیں؟ محمد کے شکر کے میں محمد مل گیا جس کو آپ محمد باقر کہتے ہیں۔ سمجھے حضور۔ اس نے کہا۔ یا اللہ تیرا شکر۔ اس نے کہا اچھا۔ یہ یسان صدق سے شکر یہ ہے نا؟ تمہیں صادق نہ دے دیں۔ اللہ نے جعفر صادق دے دیا۔ شکر کے ملتے جا رہے ہیں۔ رسول کا شکر چلتا رہا، اللہ کا اضافہ چلتا رہا۔ چلتے چلتے جب گیارہویں پہنچے۔ اب تو اللہ کو اپنے خزانے کا جائزہ لینا پڑا۔ یہ تو شکر ختم ہی نہیں ہوتا۔ یہ تو مجھے اضافہ کرنا پڑے گا۔ کہا محمد! سنتے بھی ہو۔ اب بالقطع طے کر لو۔ بار بار نہیں۔ گیارہویں تک تو ہم دیتے رہے۔ آج سے بالقطع سودا کر لو۔ کر کیا؟ تمہارا شکر یہ دائم رہے ہمارا اضافہ "قائم" رہے۔ آج یہ چیز جو چلے۔ ہمارا عطیہ قائم ہوا اور تمہارا شکر یہ دائم ہو۔ جاؤ تم تمہیں یہ چیز عطا کرتے ہیں۔ تو جہے ناما جان؟ بہت اچھا یا اللہ دے دے۔ اب ایسا عطیہ دوزخ کا جو قیامت تک قائم رہے گا۔ سمجھے نا حضور۔ میرے محرم سامعین۔ میں شور کوٹ پھر کبھی آؤنگا یا نہیں۔ دیے ہی زندگی کا بھروسہ نہیں اور ہم تو اس منزل پہ پہنچ گئے ہیں جہاں بھروسہ رہا ہی نہیں لہذا کیوں نہ چلتے دقت آپ کو یہ بات کہتا جاؤں کہ خدا کا شکر ادا کرو۔ اللہ کا احسان مانو۔ مانو گے؟ کہ خدا نے تمہیں قائم جیسا امام دیا۔ ماشا اللہ چشم بد دور۔ سو منین خدا تمہیں مبارک کرے کہ تم بے امام نہیں ہو۔ اللہ نے تمہیں امام عطا فرمایا ہے۔ تمہارا امام قائم جیسا ہے۔ ہے نا؟ اللہ وحدہ لا شریک ہے۔ محمد، اللہ کا رسول ہے۔ تھا۔ تو نہیں۔ اور بارہاں امام؟ ہمارا امام ہے۔ "تھا" تو نہیں۔ ہمارا امام ہے۔

عمل اور موقع کے مطابق عمل میں لانے کا نام اسلام ہے۔ سمجھے۔ اسلام انسان کی کسی طاقت کو معطل نہیں کرتا۔ بلکہ انسان کی طاقتوں کو صحیح طریقے سے استعمال میں لانے کا نام اسلام ہے۔ اسلام، طاقتوں کے تعطل کا نام نہیں۔ وہ طاقتیں جو انسان کے اندر ہیں انہیں صحیح طریقے سے استعمال کرنے کا نام ہے اسلام۔ گھبرا تو نہیں ہے۔ یہ ذرا خشک ہو گیا ہے نامعلوم۔ آپ گھبرا نہیں۔ تو میرے محترم سامعین ایک بات اور بھی کہنا چوں آپ سے۔ یہ علم لغت کی بات ہے۔ زبان کی۔ آپ میری پہلی بات سن لی ہے جو اب تک میں نے کہی ہے۔ انسان کے اندر بے شمار طاقتیں اور قوتیں انسان کے خالق نے ودیعت کر دی ہیں۔ اتنی طاقتیں ہیں انسان میں کہ انسان ان طاقتوں کو گن ہی نہیں سکتا۔ اور ان تمام طاقتوں کو جو خالق نے انسان میں رکھی ہیں صحیح طور پر استعمال میں لانے کا نام اسلام ہے۔ توجہ فرمائی نا آپ نے۔ کسی طاقت کو معطل کرنا اسلام نہیں۔ ان طاقتوں کو صحیح استعمال کرنے کا نام اسلام ہے۔ اسے میں علم لغت یعنی زبان کے اعتبار سے ایک بات آپ سے عرض کرتا چوں کہ عربی زبان میں طاقت کے کمال کو کہتے ہیں مکہ۔ سنا ہے فلاں شخص کو اس کام میں مکہ حاصل ہے۔ مکہ کے معنی یہ ہیں کہ پوری طاقت حاصل ہے۔ تو عربی زبان میں مکہ کا لفظ طاقت کے عروج کو کہتے ہیں۔ خوب۔ میری بات پر غور کیا آپ نے۔ اسی شے کو آپ مد نظر رکھتے ہوئے یہ سوچیں کہ جب اللہ نے انسان کو پیدا کیا تو کل ملائیک کو حکم دیا کہ اس کے تابع ہو جاؤ۔ دنیا کی جتنی قوتیں اور نورسز ستی ہیں ان سب کو حکم ہوا کہ تم انسان کے تابع ہو جاؤ۔ تمام طاقتیں ان کے تابع ہو گئیں۔ صرف ایک نفس انسانی کی طاقت تھی جو شیطان بن کے باقی ہو گئی۔ سمجھے نا حضور!۔ اور جو اس طاقت پر بھی غائب ہو جائے۔ اپنے نفس انسانی کی طاقت پر۔ باقی طاقتوں پر غالب ہونے والا غالب کہلاتا ہے اور جو اپنے نفس

کی طاقت پر غالب ہو جائے وہ غالب علیٰ کل غالب کہلاتا ہے۔ جو اپنے اوپر بھی غالب ہو جائے۔ بہر نفع تمام طاقتوں کا منبع و مرکز ہے یہ انسان۔ ان طاقتوں کو صحیح استعمال کرنا یہ ہے اسلام۔

اس تمہید کے بعد میں رُخ بدل کے آپ سے آسان طریقے سے بات کروں۔ جہاں اور ہزاروں طاقتیں انسان میں ہیں۔ وہاں یہ بھی ایک طاقت ہے انسان میں۔ وہ کسی حد پر جا کر رُکنا پسند نہیں کرتا۔ یہ بھی ایک طاقت ہے۔ کسی حد پر پہنچ کر بھی وہ رُکنا پسند نہیں کرتا۔ یہ بھی انسان میں ایک طاقت ہے۔ سمجھے نا حضور۔ یہ نہ سمجھیں کہ انسان چاند پر جا کر رُک جائے گا۔ وہاں سے کوشش کرے گا کہیں اور جانے کی۔ یہ کسی حد پر بھی رُکنا پسند نہ کرنا۔ کسی بھی حد پر جا کر نہ رُکنا یہ بھی انسان کی ایک طاقت ہے جو انسان کے اندر موجود ہے۔ توجہ ہے نا میرے محترم سامعین۔ مثال کے طور پر جو کبھی میں آپ کو سمجھایا کرتا تھا۔ اور اب سمجھاتا ہوں۔ ایک بچہ مجھے کہتا ہے زبیدی صاحب مجھے نوکر کرادو۔ کتنی نوکر سی چاہیے بیٹا۔ کہ یہی دس بیس پچاس روپے کی ملی جائے گزارہ ہو جائے گا۔ آپ نے اسے سو روپے کی نوکر سی دلا دی۔ اس سے پوچھو مہائی بس۔ جی ہاں۔ آں۔۔۔ سو سو روپے ہو جائیں۔ اچھا اس کے ڈیڑھ سو ہو گئے۔ کہ بھئی بس۔ کہ۔۔۔ آں۔۔۔ جناب دو سو روپے ہو جائیں۔ اس کے آپ نے ہزار روپے ماہوار کر دیئے۔ کہ بس؟ کہ آں۔۔۔ آں۔۔۔ دو ہزار۔۔۔ کیا مجال جو کسی جگہ رُکنا ہو انسان۔ یہ طاقت انسان میں ہے یا نہیں سمجھیں۔ ہے۔ سمجھ میں آرہی ہے نا بات۔ سنا بات۔ تو میرے محترم سامعین اسے تم پچاس ہزار روپے ماہوار دے دو۔ کہ بس؟ کہ ابھی کچھ اور۔ اسے آپ ایک ضلع دے دیں سالم، کہ بس۔؟ ابھی اور۔ کیا مجال جو اس کی ابھی ادھ ختم ہو جائے۔ یہ انسان میں طاقت ہے یا نہیں۔ اگر آپ نے اس چیز کو ذہن میں رکھا۔ بڑا اچھا انسان بنے تقریر کا۔ اگر ذہن میں

رہا تو۔ کہ ابھی اور، کی طاقت ہر انسان میں موجود ہے۔ آپ، مجھ میں، سب میں یہ ہے۔ ایں... ایں... ابھی اور... کہیں بھی پہنچے کے ایں ایں ابھی اور۔ اکثر میں یہ کہا کرتا تھا اور اب بھی یہ کہتا ہوں کہ اس ابھی اور جذبے نے انسان کو بڑھا بڑھا کے خدا بنادیا۔ انسان جو خدا بن گیا نام، یہ ابھی اور میں تھا۔ سرور بنا۔ ابھی اور بڑا سرور بنا، ابھی اور۔ بادشاہ بنا، ابھی اور۔ شہنشاہ بنا، ابھی اور۔ ملک آگئے، ابھی اور۔ ایں ایں خدا بن گیا اب خدا بن کے اس نے بس نہیں کی۔ یہ سوچ رہا تھا کہ اب کیا ہوں کہ موت آگئی۔ اگر موت نہ آئی تو یہ کچھ اور بقا۔ یہ موت نے آکے روک دیا۔ ورنہ خدا بن کے سوچ رہا تھا کہ ابھی وہ اور کیا بنے۔ آپ یقین فرمائیں یہ خدا بننے والے پاگل نہیں تھے۔ احمق نہیں تھے۔ چہ تھا انہیں کہ خدا نہیں ہیں۔ یہ ان میں ابھی اور کا جذبہ تھا۔ جہاں خدا بنوارہا تھا۔ ورنہ وہ کوئی احمق یا پاگل مقہورے تھے۔ جانتے تھے کہ ہم خدا نہیں ہیں۔ مگر اس ابھی اور، والے جذبے نے بنا دیا۔ اور ایک چیز نے اس کے سمندر نازک پر ہمیں کر دی کہ پاس بیٹھنے والے جو تھے، انہوں نے کہا کہ حضور بجا۔ اس نے اُن کا دماغ خراب کر دیا۔ دو چیزیں انسان کا دماغ خراب کرتی ہیں۔ ایک اس کا جذبہ "ابھی اور ایک پاس بیٹھنے والوں کا کہنا کہ حضور بالکل درست ہے۔ حضور بالکل بجا ہے۔ وہ یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ گویا اب بے جا ہمارے پاس ہے ہی نہیں۔ جو بک دیا وہ بجا ہے۔ یہ پاس بیٹھنے والے بناتے ہیں۔ بیچارے غمزدہ، بیچارے غمزدہ نے ہزاروں دفعہ کہا کہ بابا ہم نہیں بننے خدا، ہم خدا نہیں ہیں۔ مگر پاس بیٹھنے والوں نے کہا کہ نہیں تمہیں بننا پڑے گا۔ بن گئے۔ بنا جو دیا۔ ان میں "اور" کا جذبہ تو تھا ہی۔ لوگوں نے بنا دیا۔ بن گئے۔ شروع شروع میں تو انکار کرتے تھے۔ پھر بن گئے۔ یہ انسان میں "ابھی اور" کا جذبہ موجود ہے۔ آپ میں ہے نا ابھی اور گئے کا جذبہ؟ آپ لوگوں میں ابھی اور" کا جذبہ ہے۔؟

یہ انسان کی عادت ہے جو کثرت استعمال سے فطرت بن جاتی ہے۔ یہ انسان کی فطرت نہیں عادت ہے۔ تو اس کی توجیہات علماء نے بہت کی ہیں کہ یہ انسان کی ابھی اور کی عادت کیوں لپے؟ تو اس کی ایک سیدھی سی بات میں آپ کو بتا دوں۔ انسان میں جو بڑی ہے 'ابھی اور کی' اس بڑی کا مرکز ہے انسان کا دماغ۔ دل میں بڑی نہیں ہوتی، دماغ میں بڑی ہوتی ہے۔ دماغ انسان کے سر میں ہے۔ اور انسان کا سر پیالے کی شکل کا۔ یہ پیالہ ہے اُٹا۔ دیکھو نا، اُٹا پیالہ ہے یا نہیں؟ اور اُٹے پیالے میں چاہے تم سمندر بھر دو، یہ خالی رہے گا۔ اس لئے ابھی اور چلتا ہے۔ جب قبر میں جائیگا۔ کیٹے کھائیں گے اُٹا پیالہ سیدھا ہوگا۔ تب اگر اور نہ کہے تو نہ کہے۔ یہاں تو کہتا ہی رہے گا۔ جب تک یہ پیالہ اُٹا ہے۔ انسان کا یہ جذبہ ابھی اور رہے گا۔ اور یاد رکھو، جتنی جنگیں جتنی لڑائیاں، جتنی مقدّمے بازیاں، جتنے فساد، جتنے جھگڑے دنیا میں ہو رہے ہیں۔ ان سب کا اگر آپ کھونچ لگائیں تو نتیجہ یہی ابھی اور کا ہی نکلے گا۔ یہ سارا جذبہ ابھی اور ہے جو انسان کو لڑائیوں، جھگڑوں اور فساد پہ آمادہ کر دیتا ہے۔ یہ جذبہ ہے ابھی اور کا۔ اب میں دوسری طرف رُوح بدلتا ہوں اس بات کا۔

میرے محترم سامعین! جس خدا نے ہمارے اندر ابھی اور کا جذبہ پیدا کیا ہے اور جس خدا نے ہمیں فتنہ و فساد سے منع کیا ہے۔ ایک طرف ابھی اور پیدا کر دیا۔ ایک طرف کہہ دیا بغیر و فساد نہ کرنا۔ سمندر میں پھینک کے کہنا کہ اس زور و جوار ہمارا سخت امتحان ہے کہ نہیں؟ ہم اسی خدا سے پوچھتے ہیں کہ ایسا کرنا اور کا جذبہ بھی پورا ہوتا رہے۔ اور دنیا میں فساد بھی نہ ہو۔۔۔ میرے محترم سامعین! اسے میں نے مختصر کیا ہے بات کو۔ اللہ نے کہا ہو جاتا ہوں میں تمہیں طریقہ جس سے تمہارا ابھی اور کا جذبہ بھی پورا ہوتا رہے۔ اور فساد بھی نہ ہو۔ آپ گھبرائے نہیں اس بات پہ۔ میں۔ مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ دس بیس آدمی میری بات بڑی غور سے

کتاب ہے یہی۔۔۔ باتوں کا مجھے پتہ نہیں۔ ابھی اور کا جذبہ بھی پورا ہوتا رہے اور دنیا میں فدا بھی نہ ہو۔ اس کا طریقہ اللہ نے یہ بتایا کہ سونے کی قمیض سے عطر لگا کر تاہوں، اگر تمہیں میرے وعدے پر یقین ہو۔۔۔ پتہ نہیں اللہ کے وعدے پر لوگوں کو یقین ہے کہ نہیں۔ یہ مجھے پتہ نہیں۔ کیوں بھی آپ کو یقین ہے؟ میں؟ اللہ کے وعدے پر یقین ہے؟ پتہ نہیں ہے یا نہیں۔ اپنے دل کی گہرائیوں میں سوچ کے مجھے جواب دو۔ اللہ کے وعدے پر یقین ہے؟ میں؟ ویسے ہی ناکہ دینا سچ سچ بتانا۔ ہے یا یقین اللہ کے وعدے پر۔ یقین ہے تو وہ تم سے وعدہ کرتا ہے اللہ۔ کہ اگر تم ابھی اور کا جذبہ پورا کرنا چاہتے ہو۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ۔۔۔ لان شکرتم لا یدینکم۔ اگر ایک نعمت کے ملنے پر تم شکر ادا کر دے گے میں اللہ تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اس میں اور اضافہ کروں گا۔ تمہارے جذبہ ابھی اور کا میرا ذمہ رہا۔ اور چونکہ اضافہ میرے ذمہ ہے، میری عطا لا محدود ہے۔ تمہارا ابھی اور تک، جاؤ گا میری عطا نہیں تھکے گی۔ میرے ذمہ ڈالو اس بات کو۔ میں تمہیں عطا کروں گا۔ تمہارا اور کا جذبہ میں پورا کروں گا، نعمت کا شکر تم ادا کر دو۔ ابھی اور میں تمہیں دیتا رہوں گا۔ تو جبے صاحبان۔ قبلہ بڑے اختصار کے ساتھ چلنا پڑ رہا ہے۔ بات بھی ہو جانے اور میں تھک بھی گیا ہوں۔ اب مثلاً اس نے نعمت دی ہے ہمیں آنکھوں کی۔ اس کا شکر ادا کر دو۔ اس کا شکر یہ نہیں ہے کہ آنکھوں پر ہاتھ پھیرا۔ یا اللہ تیرا شکر ہے۔ یہ لفظوں کے شکر سے اللہ مطمئن نہیں ہوتا۔ شکر کے معنی میں اس کی ہر دی ہوئی طاقت کو اسی طرح استعمال کرو جس طرح وہ چاہتا ہے۔ بس یہ ہے اس کا شکر۔ آنکھوں سے دیکھو۔ لازماً دیکھو۔ ضرور دیکھو۔ انہیں بند نہ کرنا۔ یہ بند کرنا تو کفرانِ نعمت ہے۔ آنکھیں بند کر کے کوئی بیٹھا رہے۔ مگر وہاں دیکھو جہاں وہ چاہتا ہے۔ وہاں مت دیکھو جہاں وہ نہیں چاہتا۔ ابھی آپ نے وعدہ کیا تھا کہ میں اللہ کے وعدے پر یقین ہے۔

آپ اپنی آنکھوں سے وہ تو نہیں دیکھتے جہاں وہ چاہتا ہے کہ نہ رجھو۔۔۔ یہ کفرِ ناستہ ہو جائے گا۔ آپ کے شہر میں نہیں۔ تو بہ تو بہ یہ تو مسلمانوں کی بستی ہے۔ لاہور جیسے شہروں میں جلکے دیکھیں قطاریں لگی ہوئی ہیں دیکھنے کے لئے۔۔۔ ٹرک پر ٹریفک رکا ہوا ہے۔ قطاریں لگی ہوئی ہیں۔ دیکھنے کے لئے۔ قطاریں لگی ہوئی ہیں، کہ ہم نے ٹکٹ لینا ہے دیکھنے کے لئے۔ یہ معلوم ہو رہا ہے کہ جنتِ کالمٹ تک رہا ہے۔ ٹوٹے پڑ رہے ہیں ایک دوسرے کے اوپر دیکھنے کیسے۔۔۔ سارا دن کا بازار میں مزدوری کی پانچ روپے کما کے لائے۔ تین روپے کالمٹ لے لیا، ایک روپے کی سگریٹ پی لی۔ دہاں دیکھنے کے لئے۔ آٹھ آنے کا کچھ کھایا دہاں دیکھنے کے لئے۔ تین چار آنے لے کر گھر آئے۔ بیوی بچوں نے کھانے کے لئے مانگا۔ دہاں میں نہیں پیسے۔ وہ تو خرچ کر آئے تھے۔ صبح کو جلوس نکال لیا زندہ باد مُردہ بار برکت نہیں۔ ہائے اوکیمونٹ ہو جاؤ۔ اللہ کو معلوم ہو جاؤ۔ برکت نہیں رہی۔ برکت کا ردنا رونے والو۔ کبھی اپنی حرکت بھی دیکھی۔ کمائی کے پیسے تو دہاں ضائع کر آئے۔ یہاں یہ کر لیا۔ اللہ نے کب منع کیا ہے دیکھنے کو ضرور دیکھو۔ مگر وہ دیکھو جو وہ چاہتا ہے۔ وہ مت دیکھو جو وہ نہیں چاہتا۔ بزرگانِ من! پیروں سے چلو۔ سپر چلنے کے لئے ہیں ضرور چلو۔ کون کہتا ہے کہ نہ چل۔ ادھر چلو جدھر چلانا چاہتا ہے۔ اگر تم پیروں سے پورا کام لو۔ دوڑو، بھاگو۔ بلندیوں پہ چڑھ جاؤ، پہاڑوں پہ چڑھ جاؤ۔ اگر ہماری مرضی کے خلاف ہو تو ہم کیا کریں۔۔۔ چلو ادھر جدھر ہم چلانا چاہتے ہیں۔ سمجھے۔ ہاتھوں سے ضرور کام لو، انہیں معطل نہ کرو۔ یہ خدا کی نعمت ہے۔ اسے باندھو کے رکھنا کفرانِ نعمت ہے۔ ان سے کام لو، ہاتھوں سے۔ یہ تمہارے کام کے لئے پیدا کئے ہیں۔ اللہ نے تمہیں ہاتھ دیئے ہیں انہیں معطل نہ کرو۔ انہیں خراب نہ کرو۔ وہ کام کر دو جو اللہ چاہتا

ہے۔ در نہ یہ زبان بڑی نامراد شے ہے قبلہ۔ سمجھے۔ اس کی بڑی احتیاط رکھنا۔ سارے اعصاب میں سب سے زیادہ خطرناک شے ہے۔ زبان۔ اس لئے اللہ نے اسے حوالات میں بند رکھا۔ دانتوں کا پہرا سامنے کھڑا کیا۔ حضور۔ ہونٹوں کے پچھلے لٹکائے۔ دھن کے قتل میں بند کیا۔ کہیں بے موقع گھر سے نہ نکل لائے۔ در نہ فساد ہوگا۔ یہ گھر کے اندر رہے۔ اگر یہ کہیں گھر سے نکل آئی بے موقع تو جنگ ہوگی فساد ہوگا۔ لڑائی ہوگی۔ جو گھر میں رہنے کے لئے ہے وہ گھر ہی میں ہے تو ٹھیک ہے۔ اللہ ہی چاہتا ہے۔ زبان کی پوری احتیاط رکھنا۔ در نہ کیا فائدہ فساد ہوگا خواہ مخواہ کے لئے۔ ہے ناصاحبان۔ ہمارے پر۔ پی میں محاورہ تھا۔ ہمارے دیہات میں۔ کہ آدمی کا سر اٹھ کے صبح، آدمی کی زبان سے کہتا ہے ہاتھ جوڑ کے کہ دیکھنا زبان تو زبول کے اندر چلی جائے گی میری شامت آئے گی ذرا خیال رکھنا۔ یہ بات ہے حضور۔ یہ اللہ کی دی ہوئی نعمت ہے زبان اسے ضرور استعمال کر دے ضرور بولو۔ مگر وہ بولو جو وہ چاہتا ہے، وہ مت بولو جو وہ نہیں چاہتا سمجھے۔ تو اللہ کی نعمت کا شکر یہ ہے جو اس کے منشاء کے مطابق اس کی نعمتوں کو استعمال کرے۔ تو جہے ناصاحبان! یہ تو ہو گیا میرا دغظ۔ اگر آپ گھبرائے نہیں تو اب میں اس کا پھر رُخ بدلوں تقریر کا۔ اسے مختصر کرنا ہے ساری بات کو۔ یہ آیت جو ہے کہ شکر کر دے تو نعمت میں اضافہ ہوگا یہ کس پر نازل ہوتی ہے۔ یہ آیت مجھ پر، آپ پر، ہم پر نازل ہوئی۔ ہیں۔ اللہ چاہتا تو ہم پر بھی کوئی آیت نازل کر دیتا؟ نہیں، تو قطعاً نہیں۔ اللہ چاہے بھی تو نہیں کر سکتا۔ اللہ ایسی بات چاہتا ہی نہیں جو نہ ہو۔ ہاں اللہ کیوں چاہے ایسی بات جو نہ ہو۔ تو یاد رکھو میرے بزرگو اللہ جیسا تاد مطلق جس کی قدرت میں کوئی شک نہیں ہم تک پہنچنے کے لئے رسول کو وسیلہ بتاتا ہے۔ تو ہم اللہ تک بے وسیلہ کیسے پہنچیں۔ جب اللہ ہم تک بے

دبیلے کے نہ پہنچا تو رسید ہونا عیب کی بات نہیں ہے۔ سچے خیر بہ انگ مضمون ہو جائے گا۔ اسے میں چھوڑتا ہوں۔

تو یہ آیت نازل ہوئی رسول پر کہ۔ تم شکر کرو گے تو میں اضافہ کر دوں گا۔ یہ تباؤ اس آیت کی تعمیل رسول نے بھی کیا یا نہیں۔ شکر کیا ہو گا یا نہیں نے۔ ہیں۔ اور شکر کر کے۔ اللہ نے اپنے حسب وعدہ اضافہ کر لوں۔ اللہ کا وعدہ ہے۔ اب چاروں طرف نظر ڈال۔ جتنی نعمیں اللہ نے دی تھیں رسول کو وہ پہلے ہی کا دن اتنی حد کی دے دی تھیں ان میں اضافے کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ اب رسول صوبیں کہ اس کا شکر کر کے اضافہ کس شے کا کروں۔ میرے پاس جو نعمیں ہیں وہ پہلے ہی اس حد کی ہیں اس میں اضافہ ہو سکتا ہی نہیں۔ تباؤ بٹھی۔ اللہ نے رسول کو سیادت دی تھی۔ اس سے بڑھیا اور کوئی سیادت ہو سکتی تھی۔ شرافت دی تھی اس سے بڑھیا شرافت ہو سکتی ہے؛ خلق دیا تھا۔ اس سے بڑھ کر کوئی خلق ہو سکتا ہے۔ انسانیت دی تھی اس سے بڑھ کر کوئی انسانیت ہو سکتی ہے۔ سب بڑی نعمت رسالت دی تھی۔ وہ پہلے ہی ایسی دی تھی کہ ختم کر بیٹھا۔ اور ہے ہی نہ تھی اس کے پاس۔ کس چیز کا شکریہ ادا کرے جو اس میں اضافہ ہو جائے تو جہاں صاحبان نے جہاں جہاں بیٹھے ہو صاحبان ذوق۔ ایک نعمت تھی رسول کے پاس ایسی کہ جس کا شکریہ ادا کر کے وہ اس میں اضافہ کر سکتے تھے۔ اضافہ بھی طوئی نہیں، عرضی۔ ایک اضافہ ارسی ہوتا ہے ایک طوئی۔ طوئی تو اضافہ ختم ہو چکا تھا۔ عرضی اضافہ اس میں کر سکتے تھے۔ وہ کیا تھی۔ وہ تھی نعمت عصمت۔ توجہ ہے صاحبان۔ اللہ نے رسول کو معصوم بنایا تھا یا نہیں۔ نعمت عصمت۔ عصمت جو ہے میرے بھائیو۔ یہ کچھ شک ہے۔ کلمہ شک اسے کہتے ہیں جو ہر جگہ کیساں نہ ہو۔ اُسے کہتے ہیں کلمہ شک۔ جس طرح ہے لفظ سفید۔ تو تباؤ یہ میرے کہنے کا کیا رنگ ہے؟ سفید۔ اور یہ جو کہ اپنے ہوئے ہیں اس کا رنگ کیا ہے؟ سفید۔ کیا دونوں کا رنگ یکساں ہے؟ حالانکہ دونوں سفید ہیں۔ اور یہ رنگ کیا ہے؟ سفید۔ حالانکہ یہ سب سفید ہیں۔ مگر کہیں زیادہ ہے کہیں کم

ہوا میں گئے سب کو سفید۔ اسی طرح عصمت ہے سب معصوم ہیں۔ کہیں زیادہ کہیں کم۔ آدم کی عصمت اور
 ہے عیسیٰ کی عصمت اور ہے محمد کی عصمت اور ہے۔ آپ آدم کی عصمت کا تیس محمد کی عصمت پر نہ کریں۔
 وہاں ترک اولیٰ کی گنجائش ہے یہاں نہیں ہے۔ اسے اُردو زبان میں یوں ادا کر دیکھنا کہ انبیاء کی عصمت میں اور
 چودہ معصوم کی عصمت میں یہ فرق ہے کہ انبیاء وہی کام کرتے ہیں جو ٹھیک ہو، غلط کام کرتے ہی نہیں۔ وہی کرتے
 ہیں جو ٹھیک ہو۔ پہلے وہ تلاش کرتے ہیں ٹھیک۔ پھر کرتے ہیں۔ اور چودہ معصوم جو کر دیں وہ ٹھیک
 ہو جاتا ہے۔ بس یہ فرق ہے ان کی عصمت میں۔ سمجھے حضور! وہ پہلے ٹھیک تلاش کر کے کرتے ہیں۔
 یہ جو کر دیں وہ ٹھیک ہے۔ جو کہہ دیں وہ ٹھیک ہے۔ جو کر دیں وہ ٹھیک ہے۔ توجہ ہے اصحاب!
 عصمت اللہ نے دی تھی رسول کو۔ اس عصمت کا شکر یہ ادا کرنا تھا رسول کو۔ اس عصمت کا
 شکریہ ادا کرنا تھا۔ پوری توجہ اصحاب! شکر یہ زبان سے نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ تیرا شکر ہے شکر یہ کے معنی
 میں نے ابھی بتائے ہیں۔ اس طرح بڑا جو طرح اللہ چاہتا ہے۔ تو رسول نے عصمت کو اس نشان سے بڑا کر دیا
 سے دشمن بھی مان گیا کہ صادق ہے اور امین ہے۔ یہ عصمت کی نعمت کو بڑا تھا۔ اسی صداقت اور راست
 کے جوئے کو عصمت کہتے ہیں۔ اور کیا ہے؟ افعال میں عصمت ہو تو ابھی ہے۔ قول میں عصمت ہو تو
 صادق ہے۔ قول و فعل کی عصمت کو صداقت و امانت کہتے ہیں۔ گویا دنیا مان گئی کہ معصوم ہے۔ ابھی
 رسول نہیں کہا تھا۔ یہ نعمت عصمت کا استعمال تھا یا نہیں تھا۔ توجہ ہے اصحاب! بات کو نہ بڑھاؤ
 مختصر رکھوں۔ دیر نہ ہو جائے۔ چالیس سال مسلسل نعمت عصمت کا اس انداز سے شکر یہ ادا کیا
 کہ امانت مان گئی۔ وہ دشمن مان گئے کہ صادق بھی ہے اور امین بھی ہے۔ اتنا شکر یہ جس نے
 ادا کیا ہو عصمت کا۔ اللہ کرے یہ وعدہ اس میں اضافہ کرنا چاہیے یا نہیں۔ عصمت میں۔ اب
 رسول کی عصمت اتنی ہے۔۔۔ طوفاً تو اس میں اضافہ ہو نہیں سکتا۔ عرض ہو سکتا ہے۔ اللہ نے کہا
 میں جس میں اپنے اضافے کے وعدے کو پورا کرتا ہوں اس طرح۔ تو اپنی عصمت کا شکر یہ ادا کر رہیں
 اس شکر یہ میں اضافے کے طور پر تجھے ایک اور عصمت عطا کرتا ہوں جس کا نام ہے۔ فائزہ۔ گویا
 شہیدہ طاہرہ بیٹی جو رسول کو ملی ہے، شکر یہ عصمت کے اضافے میں ملی ہے۔ اور

بیشوں کی بات اور ہے، اس بیٹی کی بات اور ہے — اگر رسولؐ کے تھیں بھی اوڑھیاں
 اس جھگڑے میں نہیں پڑتا — وہ تھیں یا نہیں تھیں — کوئی کہتا ہے چار تھیں — میں
 کہتا ہوں چار سو بیس ہوں چلو — جھگڑے کی کیا بات ہے؟ چار کدڑ تھیں — مگر شکرِ
 عصمت کے اضافے میں جو بیٹی ملی اس کا نام ہے — فاطمہ — یہ رسولؐ کو شکرِ عصمت
 کے اضافے میں ملی ہے۔ اس کا نام ہے فاطمہ — توجہ ہے اصحابان — اور چونکہ شکرِ
 عصمت میں اضافہ ہو کے سبلی ہے — لہذا اس کی عصمت کی شان اور ہے، محمدؐ کی عصمت
 کی شان اور ہے — آپ کہیں گے کہ عورتوں میں مریم بھی معصومہ تھی — وہ تو تھیں
 مگر ان کی عصمت کسی شکرِ یہ میں نہیں ملی تھی اُس کو — عطیہ الہی تھا اس میں — عصمت
 کی اتنی ہی مقدار تھی کہ بس ایک پشت چل کے عیسیٰؑ ختم ہو گئی — اور یہ شکرِ
 عصمت میں ملی ہوئی عصمت تھی جو سیدہ کی شکل میں ملی تھی — توجہ ہے اصحابان!
 — اور یہ شرف اللہ نے اس شکرِ عصمت کو عطا کیا تھا کہ قیامت تک اس کی پیدا ہونے
 والی نسل معصوم تو نہیں ہوگی مگر بے حکومت کے 'شاہ' کہلائے گی — ہے یا نہیں
 حضورِ والا؟ — کہلاتی ہے کہ نہیں کہلاتی؟ بغیر سرداری کے سید کہلائے گی —
 دُنیا اُن کے پیر چھونا فقر سمجھے گی — یہ اس نے کہ شکرِ عصمت کا صلہ ہے حضورِ والا —
 — اگر پیسے پاس ہوں گے تو امیر کہلائیں گے، کچھ نہیں ہوگا تو پہنچے ہوئے فقیر کہلائیں گے
 — مر جائیں گے تو پیر کہلائیں گے — یہ شرف یاد ہے شکرِ عصمت کا — تو
 سیدہ طاہرہ، عصمت کے شکرِ یہ کے طور پر ملی ہے۔

میرے محترم سامعین! — اب رسولؐ چاہتا ہے کہ اس نعمت کا بھی شکرِ یہ
 ادا کروں، تاکہ اللہ اور اضافہ کرے اب فاطمہ کی نعمت کا کس طرح شکرِ یہ ادا کیا اُس نے
 — بڑے اختصار کے ساتھ بات کرتا ہوں — بیٹی چلی آرہی ہے — اگر نری بیٹی
 ہوتی تو بیٹھے رہتے — چونکہ اضافہ شکر تھا لہذا اس کے لئے شکرِ یہ یوں ادا کیا

کہ بیٹی کا تعظیم کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے — تعظیم کو اٹھنا اس نعمت کا شکریہ تھا۔
 اللہ نے دیکھا — تمہنے اس نعمت کا شکریہ ادا کیا — لاؤ ہم نعمت کا اور اضافہ کر دیں۔
 فاطمہ کی تعظیم کے لئے اٹھے — اللہ نے ایک نعمت حسن کی شکل میں دے دی، لو۔
 یہ شکریہ نعمت کا سلسلہ ہے جو ہم تمہیں ادا کرتے ہیں — توبہ ہے ناما جان — اب
 یہ فاطمہ والے شکریہ میں اضافہ ہو کر حسن والی نعمت ملی — پوری توبہ صاحبان —
 رسولؐ نے کہا لاؤ اس نعمت کا بھی شکریہ ادا کروں گا — اس کا شکریہ کس طرح ادا کیا۔
 نماز پڑھانے جا رہے تھے عید کی — حسن جو نعمت کا شکریہ ملا تھا اسے بٹھا رکھا تھا
 کندھے پر — زلفیں اسے پکڑا رکھی تھیں — بوٹیا چلو — یہ ہے شکریہ نعمت
 حسن جو جمع عام میں رسولؐ ادا کر رہے تھے — اللہ کو یہ ادا پسند آگئی —
 محمدؐ نے حسن کی نعمت کا خوب شکریہ ادا کیا — ہم اضافہ کر کے تمہیں حسین دے دیں۔
 اللہ نے اضافہ کر کے حسین دے دیا — حسین جو نعمت ملی — کہ اس کا بھی شکریہ ادا
 کروں گا — فاطمہ کا شکریہ بعض تعظیم کر کے — حسن کی نعمت کا شکریہ یہ تھا کہ نماز
 کو جانے وقت کندھے پہ بٹھا لیا — نماز کو جاتے ہوئے، نماز میں نہیں — نماز کو
 جاتے ہوئے — حسین نامی نعمت ملی تو شکریہ کا انداز بڑھ گیا — اسے جاتے ہوئے
 نہیں — عین نماز میں، سمجھے — سجدہ میں یہ شکریہ ادا ہو رہا تھا — اور فقرہ میں کہتا
 ہوں صاحبانِ ذوق — یہ آپ کے ذوق پر منحصر ہے — حسین کی نعمت کا جو شکریہ ادا
 کیا — وہ عین نماز میں — نماز میں بھی رکوع میں نہیں، قیام میں نہیں — سجدے میں
 پشت پہ بٹھا لیا حسین کر — یہ حسین نامی نعمت کا شکریہ تھا — کہاں شکریہ ادا
 ہوا؟ سجدہ میں — کہاں؟ عبادت میں — چونکہ اس شکریہ میں عبادت اور سجدہ
 دونوں شامل ہیں — اب جو اضافہ بھی ہو گا اس میں سجدہ بھی ہو گا اور عبادت بھی ہوگی —
 لہذا حسین نعمت کے شکریے میں جو ملا وہ سید الساجدین بھی تھا اور زین العابدین بھی

خدا ہے، رسول ہے، ہمارا امام ہے۔ اس لئے ہمارا وجود ہے۔ دُنیا نے ہمیں، تمہارا کرنے کی کوشش کی۔ مگر نہیں۔ ہم ہیں۔ اور میں اس لئے کہ ہمارا وارث ہے، ہمارا امام ہے۔ یہ شیعان کا مہینہ ہے حضور۔ اور شیعان کی مناسبت سے یہ دروچار جلے آپ کے کہ دوں کہ خدا کے فضل سے ہمارا امام ہے۔ بولو ہے۔ اسی امام کے ہونے کی وجہ سے ہم دنیا کے سامنے سینہ تان کے کہتے ہیں کہ دنیا دلو کیا یاد کرو گے ہم ہیں امامیہ۔ اور کوئی فرقہ دنیا امامیہ نہیں۔ ہم ہیں امامیہ۔ سمجھے۔ امامیہ؟ کے کیا معنی؟ امام والا۔ جیسے لاہوریا۔ امامیہ، امام والا۔ سمجھے۔ ہم ہیں امامیہ۔ اور کوئی دنیا میں امامیہ نہیں۔ ہم ہیں امامیہ۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ بے امام تو کوئی انسان نہیں دنیا کا۔ کس سے آپ پوچھیں کہ بعض مسلمان! بتانا تیرا امام کون ہے؟ وہ بڑے ادب سے کہنے گا۔ ماشاء اللہ چشم بد دور۔ میرے امام فلاں بزرگ رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ سمجھے۔ کہ بھی تمہارا امام کون ہے؟ کہ میرے امام فلاں بزرگ رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے۔ کوئی اپنے امام کے ساتھ سوائے تھے کے نہیں کہتا۔ یہ ہم ہیں کہ سینہ تان کے کہتے ہیں کہ کوئی ہم سے پوچھ کے دیکھے۔ ہمارا امام ہے۔ دُنیا کے امام تھے۔ ہمارا امام ہے۔ اس لئے ہم امامیہ ہیں۔ دنیا کے لئے امامیہ نہیں کہ ان کے امام تھے۔ ہمارا امام ہے۔ توجہ نا صاحبان۔ اور یہ شکرِ نعمت رسول میں جلا ہوا ہے۔ اس نے کبھی ختم نہیں ہونا۔ ہمارا امام خدا کے فضل و کرم سے ہے۔ ہمارا امام ہے۔ موجود ہے۔ کہاں ہے؟ غائب۔ دیسے ہر جگہ ہے۔ غائب ہے۔ اس کی غیبت کا فقرہ سن لو اور پھر میں بیٹھ جاؤں گا قبہ۔ حضور امام علی نقی علیہ السلام ہمارے دسویں امام کی خدمت میں کسی نے عرض کیا کہ حضور وہ امام جو آخری امام ہوگا۔ جو دائم و قائم ہوگا، ذرا اس کی صفت تو بیان کریں کہ کس شان کا ہوگا۔ اب جناب لطافت کو دوسری نگ سمجھ سکتے ہیں۔ جنس ان لطافتوں کا لطف ہے

بیان کرنے والی ہر معیوم کی زبان — امام بیان والا ہو۔ — امام کی فضیلت ہو۔
 پھر اس کے اندر کتنی لطافتیں ہونگی۔ — یہ وہی جانتے ہیں۔ — ہم تو اس کا اُردو ترجمہ ہی
 نہیں کر سکتے صحیح۔ — امام علی نقی علیہ السلام نہرتے ہیں۔ — ہمارے امام کے متعلق کہ
 کیا ہو چھتے ہو اپنے امام کی شان۔ —

صاحب الدعوة النبویہ و صولت الحیدریہ

تمہارا امام اس طرح دین کی دعوت دیتا ہے جس طرح اس کا جبر رسولؐ دعوت دیتا تھا۔
 و صولت الحیدریہ۔ — اس کا اقبال حیدر کرار جیسا ہے۔ — وعصمت الفاطمیہ،
 اس کی عصمت ناظر کبریا جیسی ہے۔ — وحلم الحسینیہ، حسن جیسا اس کا علم ہے۔
 و شجاعت الحئیثیہ، اور حسین جیسی اس کی نہایت ہے۔ — اور چلتے چلتے۔ — آپ
 صفت بیان کرتے کرتے گیارہویں پہنچے۔ — والہیۃ العسکریہ، حسن عسکری
 جیسی اس کی ہیبت ہے۔ — یہاں آگے اپنے رک کے فرمایا۔ — تم اس کی غیبت پر چھتے
 ہو۔ — والغیبة الالہیہ۔ — اللہ جیسے اس کی غیبت ہے۔ — اب بتاؤ اللہ کسی بزرگ
 یا غار میں نائب ہے۔ — اللہ کسی مکان میں غائب ہے۔ — اللہ ہر جگہ ہے اور غائب ہے
 ۔ اسی طرح وہ ہمارا امام خدا کے فضل سے ہر جگہ ہے اور غائب ہے۔ — اس مجلس میں بھی موجود
 ہے۔ — بولہ ہے۔ — اور یہ مجلس کیوں کرتے ہو؟ یہ جلسے کیوں کرتے ہو۔ — یہ اتنا
 خوش کیوں کرتے ہو۔ — مولوی صاحبان کی اتنی خوشامدیں کیوں کرتے ہو۔ — پڑھنے والوں
 کی اتنی خوشامدیں کیوں کرتے ہو۔ — تمہاری کیا عرض والبتہ ہے ان سے۔ — تمہارا
 کیا کام والبتہ ہے ان سے؟ ہے یا نہیں؟ محض اس لئے کہ تمہیں یقین ہے کہ ہمارا
 امام ہے اور اس کو راضی کرنے کے لئے یہ اس کے دربار لگاتے ہیں۔ — کہ ہمارا مولانا ہمارا
 امام ہم سے راضی ہو جائے۔ — ہم یہ تصور کہ کے بیٹھتے ہیں مجلس میں کہ ہمارا امام یہاں بیٹھا
 ہے اور ہم سب اس کی رعایا اس کے سامنے حاضر ہیں کہ مولانا تیرے سامنے تیرا دربار لگوانے

کے لئے تیری رعایا نے یہ سب کچھ خرچ کیا ہے۔ لوگوں کو بلایا ہے۔ موزیوں کی خوشامد کی ہے۔ تیرا ذکر سنتے کے لئے۔ ہم تجھے تیرے بزرگوں کا پڑوسہ دیتے ہیں۔ اور تیرے سامنے تیرے بزرگوں کے فضائل بیان کرتے ہیں۔ اصل سامع مجلس دہی ہے۔ اسی تصور کی دہر سے میں نے عمر بھر کبھی بیٹھ کے نہ پڑھا۔ میرا ایمان ہے کہ وہ میرا مولا موجود ہے۔ اس کے ہوتے میں کرسی پہ بیٹھ جاؤں یہ بڑی گستاخی ہوگی۔ یہ اس کی شان کے خلاف بات ہے حضور۔ اسی لئے کبھی بیٹھ کے نہ پڑھا آج تک۔ اب تو اس قابل ہو گیا ہوں کہ مولا بہار ہوا تو کیا۔ پہلے دونوں پاؤں سے کھڑا ہو کے پڑھتا تھا۔ اب تیری بارگاہ میں ایک پاؤں سے کھڑا ہو کے پڑھتا ہوں۔ تو اسے قبول فرما۔ ہمارا مولا موجود ہے۔ لو بھائیو! گفتگو ختم ہوتی ہے۔ گرمی کا دت ہے۔ میں نے خود اپنے کانوں سے سنا تھا۔ کر بلائی معنی میں مجلس تھی۔ ایک عالم بیان کر رہے تھے اور وہ کہتے تھے کہ جب تم مجلس منعقد کرتے ہو اس میں امام زمان آکے بیٹھتے ہیں تو تم یہ تصور کر کے پڑھا کر دو کہ تم امام کو سنا رہے ہو اور اس کے طفیل میں یہ مجمع بھی مسن رہا ہے۔ اصل میں امام کو سنا رہے ہیں۔ تو انہوں نے فرمایا کہ جب تم امام کے سامنے معائب پڑھو۔ بے شک حسین کی شہادت پڑھ دینا کوئی پرزادہ نہیں۔ امام سن کے روتے ہیں۔ تم علی اکبر کی شہادت پڑھ دینا پرزادہ نہیں۔ علی اصغر کی شہادت پڑھ دینا کوئی بات نہیں۔ عباس کی شہادت پڑھ دینا کوئی بات نہیں۔ امام ان باتوں کو سن لیتے ہیں۔ مگر ایک بات کی احتیاط کرنا۔ کیونکہ امام موجود ہوتے ہیں۔ کہ ذرا سوچ سمجھ کے پڑھنا وہ چیز ایسی ہے جسے سن کے امام بے ہوش ہو جاتے ہیں۔ ہاں امام بے ہوش ہو جاتے ہیں۔ پھر فرشتے آکے ان کے پاؤں ملتے ہیں۔ اُن کی دادی آکے ان کے سر کو گود میں لیتی ہیں۔ پھر انہیں غش سے افادہ ہوتا ہے۔ کیا؟ اس کے سامنے زینب کی قید نہ پڑھ دینا۔ کیونکہ اس کے

لئے ناقابلِ برداشت ہے۔ وہ ہر شہادت کو سن لیتا ہے۔ زینب کی قید برداشت نہیں کرتا۔ یہ چیز اس کے لئے قابلِ برداشت نہیں ہے۔ یہ چیز ذرا سنبھل کے پڑھنا۔ یہ چیز ذرا سوچ کے پڑھنا۔ بیشہ وہ نہیں برداشت کر سکتا۔ اسے ذرا سوچ کے پڑھنا۔ زینب کی قید بڑی مشکل شے ہے۔ اسے ذرا خوب سنبھل کے پڑھنا۔ اسے پڑھتے وقت ذاکر کو، مولوی کو بڑی احتیاط کرنی چاہیے۔

امام سن رہا ہے۔ زینب کی قید پڑھنی ہے۔ امام سن رہا ہے۔ میرے محترم بھائیو! امام نے بھی بتایا ہے، ہمیں نصیحت نہیں تھا۔ امام کے دہچلے کہسے میں بیٹھنا ہوں۔ امام نے بتایا ہے ہیں۔ ہمیں کیا خبر تھی۔ ہم تو یہ سمجھے ہوئے تھے۔ ایسا کون ظالم ہے جیسا ہوگا دنیا میں جو بے ضرر سیدانیوں کے ہاتھ باندھ دے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ شاہ صاحب میں خود قید ہوا تھا۔ میں اپنی جگہ ہوتی جاتا ہوں۔ رات کے دو بجے تھے۔ ۲۹ جنوری سردی کی رات تھی۔ تقریباً پانچو آدمی پولیس کو مجھے گرفتار کرنے آیا۔ پانچو آدمی۔ سارے محلے کا میسرہ تھا۔ چھتلی پہ پولیس تھی۔ ایک ہنگامہ تھا اور سارا خد سہما تھا۔ خدا جانے کیا ہوتا ہے۔ کیا بات ہے؟ کیا عقد ہے؟ جب مجھے گرفتار کیا انہوں نے مجھے ہار میں بٹھایا۔ تو کسی سپاہی نے ایسی۔ پی۔ سی۔ کہا۔ جناب ہتھکڑی لگاؤں۔ تو اس نے کہا خبردار بکواس بند کرو۔ کیوں شریف آدمی کو پریشان کر رہے ہو۔ اس کا یہ کہنا تھا کہ میں نے کہا۔ ایس۔ پی۔ صاحب کاش تم کہ بلا میں کھڑے ہوتے۔ بجائے یہاں کے دامن کھدیتے کیوں شریف آدمیوں کو پریشان کرتے ہو۔ میرے ساتھ یہ ہوا۔ اور جس دن میں گرفتار ہوا تھا بھائی۔ یہ بھی میں آپ کو بتا دوں۔ وہ تاریخ وہ تھی جس تاریخ کو اراد کی فوج نے محاصرہ کر کے امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کو گرفتار کیا تھا۔ بالکل وہی تاریخ تھی جس دن مجھے گرفتار کیا تھا۔ بہر فوج چلے گئے۔ سیدانیوں کے ہاتھ بندھ گئے

— مجھے یہ خیال رہا، فکر لگا — کہ ہاتھ بندھ گئے — کہ اں بے ضرر سیدانہوں کے
تو ہمارے ذاکر، مولوی، ہم سب یہ سوچے رہے کہ ہاتھ پتہ نہیں کس طرح بندھے تھے
— پتہ نہیں بازو بندھے تھے ہے نا۔

شامیاں بستند بازو زینب و کلثوم را

پتہ نہیں ہاتھ کس طرح بندھے تھے — یہ امامؑ نے مرثیہ میں فرمایا — امام کا فرمان ہے
یہ — کسی ذاکر کی بات نہیں کہ روایت غلط ہے — یہ امامؑ نے فرمایا ہے کہ میرا سلام ہو۔
— میری دادی زینب پر — تم سب بھی سلام کر لو — ہمارا سب کا، مولانا خیرن دادی
زینب کو سلام — ان کا فقرہ ہے یہ — ہمارا نہیں — میرا سلام ہو میری دادی
زینب پر جس کے دونوں ہاتھ جس کی گردن سے بندھے ہوئے تھے — امامؑ نے
بتایا تھا کہیں — اس کے ہاتھ — یہ بات ہمیں امامؑ نے بتائی کہ اس طرح میری دادی
کے ہاتھ گردن سے بندھے ہوئے تھے — کہ بلا میں ہاتھ بندھ گئے — اوجب
دشمن کے شہر میں پہنچے ہیں — زائرین کو، تمام زائر جو جاتے ہیں وہ تقریباً کہلا کے ساتھ
شام بھی جلتے ہیں — اس لئے کہ اس زمانہ میں جو زری کہلا کی زیارت کر کے چلا آئے اس
کی زیارت قبول ہی نہیں ہوتی جو زینب کے سلام کو نہ جاتے — اب تو جاتے ہیں زائر
وہاں کوئی خاص فرق نہیں ہے — جاتے ہیں بی بی کے سلام کے لئے — حضور جو
شہر آج ہے نا دشمن کا، اُس زمانے میں نہیں تھا — اس زمانے میں تو پرانا شہر تھا
— جواب بھی اندر ہے — باہر تو نیا شہر ہے — اندر کی طرف وہ پرانا شہر اب بھی
ہے — اس زمانے کا شہر تھا — جس میں بی بی گئی تھی — اور یہ فقرہ بھی آپ سے کہہ
دوں، ساداتِ عظام مجھے معاف کرنا — مجھے مجبوراً یہ کہنا پڑھتے ہیں — ساری گلیاں
سڑکیں ہلا کے تقریباً ڈھائی میل بن جاتا ہے — اس میں بی بی گردن سے ہاتھ بندھے
ہوئے پیدل گئیں — یہ مجھے کہنا پڑتا ہے ورنہ اس وقت بی بی کے ہاتھ گردن سے بندھے

ہوئے تھے۔ اور جب بی بی کو طاعونی طاقت کے سامنے پیش کیا گیا تو بھی ہاتھ بندھے ہوئے تھے اور شام کے زائردوں نے دیکھی ہوگی وہ جگہ جہاں جا کے یہ سادات کھڑے کر دیئے گئے۔ وہاں ایک لکڑی کا چوترہ سا بنا دیا گیا ہے۔ یہ جگہ بھی جہاں وہ کھڑے ہوئے تھے آگے۔ جگہ محفوظ رکھی ہے۔ جہاں وہ کھڑے تھے اور سامنے طشت میں بھائی کا سر رکھا تھا اور یہاں وہ کھڑی تھیں اور اتنے گردن سے بندھے ہوئے تھے۔ میں اپنی بات ختم کرتا ہوں۔ جیسی سن رہے ہو۔ خدا تمہاری عزت کی حفاظت کرے۔ جو نقرہ میں نے کہنا تھا وہ یہ تھا۔ ہائے کیا بتاؤں۔ کھڑے تھے اس طرح۔ کوئی مصیبت تھی ایسی جو ان پہ نہ گذر گئی ہو۔ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کا فرمان ہے کہ میری دادی پر وہ مصائب گذر گئے کہ جنہیں نہ کوئی سوچ سکتا ہے۔ نہ سمجھ سکتا ہے۔ انہی کو پتہ تھا ان پہ کیا گذر گئی۔ نہ کوئی دماغ انہیں ذہن میں لا سکتا ہے۔ نہ سمجھ سکتا ہے۔ امام موسیٰ کاظمؑ نے فرمایا۔ کوئی مصیبت تھی ایسی جو ان پہ نہ گذری ہو۔ اور یزید کے دربار میں کھڑی تھیں۔ یہ نقرہ میں نے کہنا تھا آخری اب۔ اور میرے عزیز ڈھائی تین گھنٹے گذر گئے کھڑے کھڑے اور یزید اتنا مشغول ہے اپنے شہ قلعہ میں۔ قیدیوں سے بات نہیں کرتا۔ اور یہ کھڑے تھے۔ چھوٹی بچوں کے پاؤں میں ورم آگئے تھے۔ پیدل چل کے آنا اور کھڑے رہنا۔ اور زمانے کا امام بالکل خاموش کھڑا ہے۔ بی بی خاموش کھڑی ہیں اور گردن سے سیدائینوں کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔ سب کھڑے ہیں۔ جہاں جناب رباب جو ساتھ کھڑی تھیں وہاں امام حسنؑ کی بیوہ جناب قاسمؑ کی والدہ ساتھ تھیں صرف فاطمہؑ کی بہوؤں میں یہ دو بہوئیں تھیں قید میں۔ ایک علیؑ کی والدہ اور ایک قاسمؑ کی والدہ۔ جناب اسمٰعیلؑ جو تھیں علیؑ کی والدہ۔ ان کا راستے میں انتقال ہو گیا تھا۔ وہ شام تک پہنچی ہی نہیں تھیں۔ یہ دو بہوئیں

تھیں انہوں نے سر جھکا رکھے تھے۔ اور انہوں بالکل سر نہ اٹھائے۔ اور بانی نے امام زین العابدین سے کہا تھا دربار سے آگے۔ کہ بیٹا مجھے کھاگئی یہ بات کہ میری بھاد جس کھڑی تھیں اور ان کے پیچے کے لوگ کرسیوں پہ بیٹھے تھے۔ وہ کیا کہتے تھے کہ کس خاندان میں بیاہی گئی ہیں ہماری طرف کیاں۔ مجھے شرم کھا رہی تھی۔ یہ لوگ کیا کہتے ہوں گے۔ تو اس وقت یزید نے ڈھائی تین گھنٹے کے بعد ٹوکا ہے انہیں اور کہا کہ ان قیدیوں کے نام بتاؤ یہ کون کون ہیں؟ کیا ہیں؟ یہ چیزیں غور کرنے کی ہیں قبلہ۔ انہیں دیکھ کے لوگوں کو بتاؤ۔ انہیں عام کرو۔ اور پڑھے لکھے حضرات کو بتاؤ کہ دنیا کی ہر تکلیف اور مصیبت اٹھائے ہوئے۔ کہتی کیا ہے اس وقت۔ فقرہ کیا اُس کی زبان سے نکلا ہے۔ یہی تو میں کہتا ہوں۔ یا اللہ یاد رکھ تیری قدرت تو ہے ہی بے انتہا۔ پر ایسے بندے بھی نہیں ہوں گے۔ یہ کمالی بھی نہیں ہوگا۔ کہتی کیا ہیں؟۔ الحمد للہ لا اکرمن۔ ہم خدا کا شکر ادا کرتے ہیں جس نے ہمیں یہ عزت عطا کی۔ قبلہ کوئی اور ہوتا تو کہتا کہ واہ اللہ میاں ہم کس طرح تیرا شکر ادا کریں۔ تیرے نام پر ہم مر گئے اور تو نے ہماری خبر نہ لی۔ وہاں یہ کہہ کے کہ ہم شکر ادا کرتے ہیں کہ خدا نے ہمیں یہ عزت دی۔ بانی نے منادیا کہ خدا ہے، خدا کوئی ہے۔ یہ زینب کا احسان ہے کہ آج دنیا خدا کو مان رہی ہے۔ ان حالات میں منوایا کہ خدا ہے اور اگر یہ خدا کا وعدہ ہے کہ اگر تم شکر کرو گے تو میں لٹاؤں گا۔ نیکب کے اس شکریہ پہ مجھے نہیں معلوم کہ کیا اضافہ ہوگا۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ میں خدا کا شکر ادا کرتی ہوں جس نے مجھے یہ عزت عطا فرمائی۔ جس نے ہمیں یہ شرف عطا فرمایا۔ جس نے ہمیں یہ شان عطا فرمائی۔ ہاتھ بندھے، ظالم کے دربار میں ایک خاتون یہ کہہ رہی ہے کہ خدا کا شکر ہے جس نے ہمیں یہ عزت عطا فرمائی کہ ہم اس کے دین کے محافظ ہیں۔ اس کی حفاظت میں یہاں قید ہوئے کھڑے ہیں اور ہم خدا کا شکر ادا

رکھتے ہیں۔ جو مومنین یہاں موجود ہیں یا اللہ ہم تیرا شکر ادا کرتے ہیں کہ تو نے ہمیں
 ان شکر گزاروں کے حق کا شناسا بنایا۔ محمد وآل محمد کی معرفت ہمیں دی۔ ان
 کا ذکر کرنے اور ان کی مجالس ہر پا کرنے کی توفیق ہمیں عطا فرمائی۔ بس بھائیو اللہ
 تمہیں سلامت رکھے۔ خدا تمہیں خوش رکھے۔ میرا بیان ختم۔ زندگی رہی۔ تو
 انشاء اللہ بھری کبھی

اللَّهُمَّ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ وَآلِ مُحَمَّدٍ

شورکوٹ شہر
 ۸ اکتوبر ۱۹۷۱ء

حسینیت

عنوان

حسینیت

دربارِ شام

فضائل

مصائب

دربارِ میرِ شام کا منظر عجیب ہے
زینبؓ کو ل رہی ہے وراثتِ بول کی

لختِ جبینہ

عظمتِ انسان

اسلام اور انسانیت مترادف لفظ ہیں۔ خلاق عالم کی قدرتِ کاملہ نے انسان کو عجیب و غریب صفات سے تصف کر کے صحنِ عالم میں بھیجا ہے۔ نیابتِ اقدس و خلافتِ ارضی کا امانت دار۔ انسان جہاں عزت و شان کی اعلیٰ منزل پر فائز ہے اور تمام مخلوق عالم من جانب اللہ انسان کی اطاعت پر مجبور اور معول ہے۔ کرہ مانع آسمانی کی عظمت سے لے کر ادنیٰ سے ادنیٰ چیز تک انسان کی مطیع خدمت گزار اور تابع فرمان ہے۔ انسان نے عقلِ خدا داد کی طاقت سے قواءِ عالم کو مسخر و تابع بنا کر ”وسخر لکم ما فی الارض جمیعاً“ کی عملی تصویر اپنے بے پناہ عزم و ارادہ سے مکمل کر دی ہے۔ اور صنفِ انسانی اس تسخیر کی تکمیل میں بہترین مصروف و مشغول ہے مگر یہ انسان جہاں اعلیٰ صفات برگزیدہ اخلاق اور تحلقوا باخلاق اللہ کا نمونہ کامل ہے اس کے ساتھ ہی شرکی طائفیں بھی انسانی جدوجہد کے ساتھ مشغول عمل ہیں۔ محبوبہ حلقہٴ انسانی شرکی طاقتوں کے سامنے باوجود ملکی صفات ہونے کے اکثر و بیشتر سپر اند و ختمہ و سرنگوں ہو جاتا ہے۔ طاغوتی لشکرِ ہمیشہ انسانی ضمیر کو شکست دینے پر آمادہ پیکار و رزم رہتا ہے۔ خداوندِ عالم نے اپنی رحمتِ کاملہ سے انسان کو طاغوتی کی یلغار سے محفوظ رکھا۔ انتظام فرماتا رہتا ہے۔ انبیاء و رسل کے سلسلہ عالیہ اور دماغِ انسانی میں عقل و ور اندیشی کی مشعل اسی لئے ہے کہ ان قدرتی طاقتوں سے مدد لے کر انسان ”اسفل السافلین“ کی دال میں نکل کر آسمانی کی اوج کی پہنچے۔ یاد رکھئے

— قانونِ اسلام اسی ہدایتِ الہی و توفیقِ غیبی کا نام ہے اسلام انسان کی انفرادی و اجتماعی و نوعی و شخصی اصلاح و درستی کا ذمہ دار ہے۔ اسلام کی تعلیم اور اس پر عمل تہذیبِ اخلاق - تدبیرِ منزل سیاستِ مدن وہ ذریعے اور قیمتی اصول اپنے دامنِ رحمت میں لئے ہوئے ہے کہ جس نے آنکھ جھپکنے میں ایک وحشی محض قوم کو معتمدِ اخلاق و استادِ انسانیت بنا دیا تھا۔ اسلام کی فطری آسان سہل مزاج انسانی تعلیم و تبلیغ نے دشت و صحرا - بحور و کوہ و وادی میں اسلام زندہ باد کی دلائل آواز بلند کرادی تھی۔ پیغمبرِ اسلام کی عظیم شخصیت اور پیغامِ اسلام کی جاذبیت ہر خشک و تر - بلند و پست - یگانے و بیگانے سے کلمہ پڑھوانے میں کامیاب ہوگئی۔ عرب کا فرزندِ صحرا اس فطرت سے جلد مانوس ہو گیا اور ہادیِ اعظم اس پیغامِ مکمل کو اتنا تک پہنچا کر نعیمِ دائمی کی طرف انتقال فرما گیا۔ آپ میری بات سمجھ بھی رہے ہیں نامہ اجابا۔ بات ذرا دور چلی گئی۔ تو میں عرض کر رہا تھا۔ وہ ہادیِ انتقال فرما گیا مگر اتنی عظیم الشان تعلیم اور آخری خدائی پیغام کو دنیا کے ذہن نشین کرانے کے لئے ابھی اور عصمت پوش معلمینِ الہی کی ضرورت تھی۔ جو اپنے علم و عمل سے مسلمانوں کو صحیح معنوں میں مومنِ کامل بنا دیں۔ ابھی لوحِ دماغ پر اسلام کا نقش سادہ ہی تھا۔ قیصر و کسریٰ کے تخت و تاج اور فتوحاتِ ملکی کی ہوائے غرور نے اسلام کی سادگی کی جگہ لے لی۔ خلافتِ راشدہ تک نیا کپڑا لباس کسی قدر جسمِ اسلام پر باقی رہا۔ مگر اس دور کے بعد ملوکیت و استبداد پوری شان سے جلوہ گر ہو گیا۔ قصرِ حکومت اسلامی تعلیم اور خدا کی بجائے "السلطان ظل اللہ" کے نعروں سے گونجنے لگا۔ اسلام کے نام پر وہ بدعتیں تو ہیں کہ کفر بھی جن سے شرعاً جائز ہے۔ زبان و دل کی ہم آہنگی رخصت ہو گئی۔ نفاق نے ایمان کا روپ دھار لیا۔ احکامِ الہی مامٹھک ہونے لگا۔ زبانی و عوامی اسلام عین ایمان بن گیا۔ اعمالِ صالح کی

ضرورت ہے ضرورت ہوگئی علماء راہزن اور ذمہ داران مذہب دین فروش بن گئے۔
 تہذیب انسانی نے سرپیٹ لیا۔ قانون الہی بلائے طاق رکھ دیا گیا۔
 یہ سب کچھ بانی اسلام کے صرف چند سال بعد حرم خلافت سے اٹھی ہوئی نوحوت
 و غرور۔ بد اعمالی و سفاکی کی سیاہ آندھی چراغِ حرم کو بجھاتی ہوئی۔ شمع دین و ملت
 کو گل کرتی ہوئی دنیا نے اسلام پر چھا گئی۔ آمین الہی بحکم خلیفہ
 غرقِ غم نے ناب ہو گیا۔۔۔

یہ ور فتنہ نما جب کہ بد اخلاقی۔ اخلاق، بے دینی۔ دین بے ایمانی۔
 ایمان، بے حیائی۔ عفت۔۔۔ انکارِ معبود عبادت ہو گیا تھا۔ ایسی حالت میں
 زبانوں پر مہریں لگ گئیں اور قوا و عمل مفلوج ہو گئے۔ آخر غیرت خداوندی نے
 اس نازک دور کے لئے جب کہ کفر اسلام بن کر ہم رنگ زمینِ دام میں دنیا کو پھنسا
 رہا تھا اپنے قاعدہ جاریہ کے مطابق ترفین الہی و تائید کی غیبی کوششیں حسین دنیا کے
 سامنے پیش کیا۔ کون حسین؟ جو ابی طالبؑ محافظِ رسولؐ کا اور خدیجہ الکبریٰؓ محمدؐ اسلام
 کا نواسہ۔ فاجر، سب اسد کا نبیرہ جلیل اور آبِ وحی میں دھلی ہوئی زبانِ رسالت
 چوسنے والا۔ اسدؑ کے فاتح اعظم اسد اللہ علی ابن ابی طالبؑ کا فرزند میدانِ عمل میں
 آیا۔ چونکہ رنگِ الحاد زیادہ گہرا ہو گیا تھا۔ عوام دین کے نام پر بے دین
 ہو رہے تھے۔ اور شر۔ خیر کا لبادہ اوڑھ کر شرارت پھیل رہا تھا۔ اس
 لئے اس کو روکنے کے لئے اہم ترین اقدام کی ضرورت تھی۔ کسی مصلوب کے انھوں
 میں ٹھکی ہوئی چند کیلیں اور محض کسی نبی زادے کا پھری کے نیچے آجانا اس انقلابِ اعظم
 کو روک نہ سکتا تھا۔ ضرورت تھی کہ اس بڑی ہنگامی مصیبت کو مصیبتِ اعظمی سے
 رد کیا جائے اور اس تخریبی انقلاب کو ذبحِ عظیم سے دبایا جائے۔ سمجھے نامیرے
 محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم۔ فرزندِ رسولؐ اسی دن کے لئے آغوشِ رسالت میں پل کر پروان

چڑھا تھا حسین کی عظیم القدر قربانی نے خیر و شر میں حدِ اِجاصِل قائم کر دی —
ایمان و بے ایمانی کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا۔ — رکت مگردماغ اور سرِ نو پیدا
کی — علامہ میں اِتہاد اور عوام میں طاعوتی طاقتوں کے خلاف جذبِ جہاد پیدا کیا اور
آج تک جو اسلام کے نام پر کسی قدر نیکی دنیا میں موجود ہے وہ اسی بطلِ جلیل کی شہادتِ
عظمیٰ کا صدقہ ہے۔ مگر آج پھر دین کا نام تہذیب — اور اسلام دشمنی کا نام خدمتِ
دین ہو گیا ہے علامہ علی حکام بے عدل اور عوام شتر بے مہار بن گئے ہیں اور کلمہ گو یوں
کے خلاف فتویٰ کفر و اجتہاد ہے۔ آج زمانے کے بے شمار نیریز دین کو ختم کرنے کی
دکھن میں لگے ہوئے ہیں — اتحاد و اتفاقِ اسلامی عنقا ہو گیا ہے پابندیِ احکامِ الہی کا
نام حماقت اور خدا و رسول کے احکام دفترِ پارہِ نیہ بن گئے ہیں — مسلمان کہلانے
والے معاشرت میں یہودِ تمدن میں ہنود چمک دمک میں عیسائی اور برادر کشی و فتنہ
پروری میں شہرہ آفاق ہو چکے ہیں روحِ مذہب فنا ہو چکی ہے کچھ آثارِ رسم و رواج
آثارِ قدیر کے طور پر حائل بہ انہدام باقی ہیں — اور بس آج بھی ایمان کی روح ہدایت
کی تڑپ — توفیقِ الہی و تائیدِ ایزدی کی ضرورت مشعلِ عقل و خرد ہاتھ میں لے کر
حسین کے رُخِ زیبا تلاش کر رہی ہے اس زمانے کا حسینِ پردہِ غیب سے آئے تو
پھر دنیا عدل و انصاف سے پُر ہو جائے ۛ

آج پھر تیری زمانے کو ضرورت ہے حسینؑ

— × — × — × — × — × — × —

حضرت قائم آل محمد علیہ السلام



يُؤَيِّدُونَ أَنْ يُطَقِّدُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَاللَّهُ مُنِمْ نُورِهِ
وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ ۝

خدا نے بزرگ و بڑی نعمتیں اور رحمتیں مخلوق پر بے حد و بے شمار ہیں۔
انسانی طاقت ان کے شمار اور ادائیے شکر سے عاجز و قاصر ہے ان لامتناہی نعمات
میں سب سے عظیم نعمت حضور ختمی مرتبت کا وجود سراپا رحمت ہے۔ یہ اتنا
جبراً خدائی انعام جس نے مخلوق کے عرفان و معرفت کے سلسلے خلقت کی سرحد سے
ملا دیے۔ عالمین کے رب سے آشنا کیا۔ مخلوقی طاقتوں کو ہمیشہ کے لئے
شکست دی اور پورا مہمن عالم خدائے بزرگ کی باجبروت شہنشاہی کا کلمہ پڑھنے لگا۔
دستورِ دنیا کے مطابق شرارِ بولہبی نے چراغِ مصطفویٰ کو خاموش کرنے کی سرتور کو شش
کی سمجھے نامہاجان۔ مگر ارادۃ الہی اس بات پُرل گیا کہ اس نوری شمع کو مخالف
آندھیوں سے ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دے۔ چنانچہ قادرِ مطلق نے یہ بارہ حجابِ نور
جن سے چھین کر شعاعِ محمدی تاقیامت نور پاش رہے گی۔ اس انداز سے
بنائے کہ ان کے ازل کا جو انداز ہے وہی آخری کا ناز ہے۔ اگر اول کے سر پر تلج
ولایت ہے تو آخری کے بیکر موزوں میں خلعت دوام ہدایت ہے۔ ذاتِ محمدی تتمہ
رسالت سے تو یہ بارہ بردجِ ہدایت آخری گردشِ انتخابِ امامت ہیں۔ یہی وہ
نور کا نور ہے جو بیست و شریعت میں علمی اور عملی طور پر مظہرِ کمالاتِ الٰہیہیت ہے۔

یہ سلسلہ قبل ازل سے شروع ہو کر آخر ابد تک دائم و قائم ہے۔۔۔ خلاق عالم نے ایک ایسی جماعت پیدا کی ہے جن کے دل و دماغ ان عصمت پوش ذوات قدسیہ کے انوارِ مودت سے جگمگا رہے ہیں اور اس جماعت پر یہ خدا کا فضل ہے کہ وہ محبتِ محمد و آلِ محمد کو دنیا کی ہر متاع سے زیادہ عزیز اور عاقبت میں واحد و یغیر نجات سمجھتے ہیں اور اپنا جان و مال اور اولاد - عزت - آبرو سب اُن کے عشق میں قربان کر دینا سب سے بڑی سعادت جانتے ہیں اُن کی خوشی میں خوشی اور اُن کے غم میں غم مٹانا یہی ان کا ایمان ہے اور اسی پر اُن کے زمین و دنیا کی حیات کا دار و مدار ہے۔۔۔ سن رہے ہیں نا صاحبان آپ میری بات۔۔۔ چنانچہ دنیا نے دیکھا کہ پاکستان کے عظیم تاریخی شہر لاہور میں پورا رجب کا مہینہ حضورِ تاجدارِ ولایت کی پُر شکوہ آمد کے جشن بلئے مسرت سے جگمگا رہا!۔۔۔ یوری فہمہ نعرہ لگے حیدری کی آسمانی نواؤں میں گونجتی رہی۔۔۔ اور دلائے ساتی کو شتر کے منوالے قشنگانِ معرفت کو مے خانہ الست کے ساغرِ بلانے رہے۔۔۔ برقی روشنیوں میں دلوں کا نور دونوں مل کر دین و دنیا کی برکت سے صاحبانِ توفیق کو مالا مال کرتے رہے۔۔۔ ابھی ماہِ رجب کی ایمان افروز فضا صحنِ عالم میں ضیا پاشی کر رہی تھی کہ اچانک افق پر ماہِ مبارک شعبان کا ہلال نمودار ہوا۔۔۔ شعبان وہ مہینہ ہے کہ اس کی کوئی تاریخ بھی جاننا رائے آلِ محمد کے لئے یومِ غم نہیں۔۔۔ تیسری شعبان شہیدِ اعظم کی ولادت کی عید ہے۔۔۔ اور اُس پُر مسرت تقریب میں خوشی کے آسوا جانا تقاصدائے محبت ہے۔۔۔ چار شعبان سے پوری دنیا مودت چودھویں بدرِ کامل کے لئے سراپا انتظار ہوتی رہے۔۔۔ تو صاحبان اُرھر آسمان پر چاند بڑھتا ہے اِدھر مہتابِ برجِ عصمت کے شوقِ دید میں اہل ایمان کے چہروں میں نور اور دل میں سرور بڑھتا ہے۔۔۔ زندہ دلائلِ لاہور حدیثِ عشق سننے کے لئے مقبرہ راوی کی تلاش میں گھروں سے

نسل پرست ہیں اور ستریت و کامرائی کے لمحات گزارنے کے لئے آتما غشری متوالے کامرائی کی بارہوی میں راوی کے قدموں میں ہر نین گوشت ہو کر جا بیٹھے اور مرد قلندر کی عاشقانہ کاوشوں نے جنگل میں منگل کر دیا۔۔۔۔۔ باب مدنیہ علم کے آستانہ اور س پر سر جھکانے والوں کو مسلسل بارہ دروازے نظر آتے۔۔۔۔۔ ہر دروازہ جنت کا باب اور حل مشکلات کے لئے عمل فتح۔۔۔۔۔ باب محمدی سے عباسی دروازے تک نور کا سماں تھا۔۔۔۔۔ فطرت نکھر گئی تھی۔۔۔۔۔ فضا میں نیباد پاشی اذکار سے جنگ گائیں۔۔۔۔۔ راوی کا بیل سراط مستقیم کا راہ پر گیا۔۔۔۔۔ اور ایک دیران درختوں کا ٹھہرٹ دیکھتے ہی دیکھتے رشک فرزدن بریں ہو گیا۔۔۔۔۔ حوران جنت۔۔۔۔۔ جنت کے در پہلو سے حورنقارہ۔۔۔۔۔ چشمہ کوثر امواج راوی سے ہم آغوشی کے لئے بے چین۔۔۔۔۔ سماں کا عرش و کرسی اپنے منسی نور چھوڑ کر۔۔۔۔۔ زمین پر شہنشاہ ارض و سماں کے مستقبل کے لئے حاضر ہو گئے۔۔۔۔۔ کائنات کا ذرہ ذرہ اشرفیت اقدس و سماں کا رتبہ کی تسبیح پڑھنے لگا۔۔۔۔۔ راوی کا اندر روکش عرش بریں ہو گیا۔۔۔۔۔ پوری فضا روحانیت سے معمور ہو گئی۔۔۔۔۔ کہیں نعرہ ملے درود و سلام۔۔۔۔۔ کسی طرف رکوع و سجود و تسبیح و تہلیل کی نضا کہیں ہے اصحاب العصر و الزمان ادگئی کا نورانی اور روحانی سرور۔۔۔۔۔ ایک طرف نوجوانانِ ملت کی مغل قصیدہ خوانی کا شہاب دوسری طرف علامہ کا عرفانی خطاب اور حمد نظر تک پھیلے ہوئے مجمع کی لگا ہوں کامرکز۔۔۔۔۔ اسی میں خانے کا ساقی خاکساری میں غلام ابوتراب۔۔۔۔۔ شہرت میں نواب ابن نواب۔۔۔۔۔ عالم کے لئے باعث برکت و فرخ حال۔۔۔۔۔ مغل اہل ایمان کے لئے مرد و اقبال۔۔۔۔۔ میں نے بھی باکر عرض کیا۔۔۔۔۔ آج یہ کیا منظر ہے کہ جس کے نظارے میں چودھویں کا چاند ادب و سکوت کے ساتھ محو ہے۔۔۔۔۔ دنیا کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔۔۔۔۔

— اور عالم کی بنفیع حد اعتدال پہ آگئی ہیں پوری کائنات ایک دوسرے سے لگے
 مل کر فرحتِ مسترت سے تبھوم کر بہ مژدہ جانفزاسنار ہی ہے یہ
 ہوئی کہے میں ذاتِ صبح کا تارہ چمکا
 بارھواں برسِ امامت کا ستارہ چمکا

سفینہٴ آلِ محمدؐ میں سوار ہونے والے اپنی نجات کے عریفے لے کر کشتیِ ایمان
 میں سپرد کرنے کے لئے پورے ادب و احترام سے کھڑے ہیں میں نے بھی ادب سے
 عرض کیا۔ حضور عالم پناہ؟ صبح کے وقت ادا کر کے فریضہ ساقی پیش کر دے
 ابھی میرا بھی عریفہ ساقی مومنِ عالم کو عموماً اور عامور کو خصوصاً جشنِ ولادت مبارک ہو
 اور اس ولادت کی برکت سے یملاً اللہ الارض قسطاً وعدلاً
 کما ملئت ظلماً وجوراً — اللَّهُمَّ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ وَآلِ مُحَمَّدٍ

عشقِ خدا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

خداوندِ عالم کی حمد و ثنا کے بعد حضرات محمد و آلِ محمد پر درود و سلام

محترم سامعین!

مجھ سے پہلے میرے ایک عزیز پر و فیروز سیدِ عمن رضا صاحبِ میاں و عظمِ فرما رہے تھے۔ ساری تقریر تو مجھے یاد نہیں رہی۔ اتنا یاد ہے کہ وہ کچھ "نور" کے بارے میں کہہ رہے تھے۔ لہذا میں بھی چاہتا ہوں کہ آج آپ کے سامنے نور ہی کے موضوع پر تھوڑی سی گفتگو ہو جائے۔

حضرات! دیئے تو ہمارا سب کا یہ ایمان ہے کہ تمام انبیاء کرام معصوم اور نور تھے مگر ایک طبقہ و فکر کا یہ خیال ہے کہ وہ نور نہیں تھے۔ اللہ جانے اُن کی بات صحیح ہے یا ہماری درست ہے۔

ایک دفعہ بہاولپور میں اس بات پر مناظرہ ہو گیا کہ حضور رسالتِ مآب نور تھے یا خاک؟ چنانچہ جو نور کے منکر تھے انہوں نے مناظرہ رکوانے کے لئے نواب بہاولپور کو ایک درخواست لکھی۔

موجود پر نور۔ نواب بہاولپور! آپ بتائیں کہ رسول نور تھے یا خاک؟ اب اُن سے پوچھیے کہ بہاولپور کا نواب تو پر نور اور رسول بے نور نہ کیوں؟ ہم نے کہا "کوئی ایسی بات تباؤ جس سے پتہ چل جائے کہ رسول نور نہیں تھے؟"

انہوں نے کہا " حدیث ہم بتاتے ہیں۔ حدیث بھی وہ جس کا راوی حضرت عثمان ذوالنورین ہے۔

بھئی اذوالنورین کیوں کہتے ہو؟

جواب دیا " تمہیں معلوم نہیں کہ حضرت عثمان کے گھر رسول کی دو صاحبزادیاں تھیں۔ چونکہ رسول کی لڑکیاں تھیں لہذا نور تھیں؛ اب ان سے کوئی پوچھے کہ جب باپ بے نور تھا تو بیٹیاں کیسے نور بن گئیں — بہر زور مولوی صاحبان میں ایسے جھگڑے چلتے رہتے ہیں۔ بے کاری کا مشغلہ ہے۔ چلو اور نہیں تو مناظرہ ہی کرو — جس طرح ایک رات ہندوستان کی تمام چمکاڑیں ایک پرانے برگد کے درخت پر اکٹھی ہو گئیں اور اپنی اس کانفرنس کا صدر ایک بڑھے اُلو کو بنایا۔ کانفرنس میں متفقہ طور پر فیصلہ ہوا تھا کہ سورج نہیں ہے۔ اگر ہوتا تو ہمیں بھی نظر آتا۔ اب آپ لاکھ دلیلیں دیں کہ سورج ہے مگر ان کی کانفرنس جو فیصلہ کر چکی ہے وہ درست ہے — بہر زور ایسے جھگڑے چلتے رہتے ہیں اور بے نور آنکھیں بوجہ اپنی بے نوری کے، نور سے منکر رہتی ہیں۔

سامعین! اصطلاحی لفظوں میں نور کے معنی "ہیں حسین" "حین" ایسا لفظ ہے جس کے معانی آج تک متعین ہی نہیں ہو سکے۔ اس لئے کہ ہر شخص کے مزاج کے مطابق "حین" علیحدہ ہے۔ ہر آدمی کا حین الگ الگ ہے۔ جنوں کی نظر میں کالی لیلی حسین تھی۔ ایران کا حین اور ہے۔ افغان کا حین اور ہے۔ حبشیوں کا حین اور ہے۔ ہم ہندوستان کا حین اور ہے اور ان شاعروں کا حین اور ہے۔ شاعروں کے سارے دیوان تعریفِ حین میں بھرے پڑے ہیں۔ اب ان سے کوئی پوچھے۔

"شاعر و! تمہارے حین میں کیا حین ہے؟"

شاعر جواب دیتے ہیں۔ حضور! ہمارے حین کا تدمسرو کی طرح ہے۔ اس کی گردن راجی ہے۔ اُس کے رخسار دو انگارے ہیں۔ اُس کی آنکھیں ہرن کی سی ہیں۔ اس کی پکیں

تیر ہیں۔ اس کی جہنویں "توار ہیں۔ اُس کی زلفیں کالے ناگ ہیں۔"
 سامعین! اگر آپ مناسب سمجھیں تو آنکھیں بند کر لیں اور شاعروں کے اس حین کا تصور
 کریں۔ ایک سرد کا درخت۔ اوپر رکھیں صراحی۔ اس میں لگائیں دوسری آنکھیں۔ ذوقداروں
 کو بانٹھ دیں۔ دس بیس تیر لٹکا دیں اور ساتھ ہی ایک کالا ناگ لٹکادیں — بتائیے ایک بلا
 بن گئی یا ایک حین بنے گا؟

جب ہی تو میں کہتا ہوں "دنیا والو! بنایا نہ کرو۔ تم حین بنتے ہو مگر وہ بلا بن جاتی
 ہے۔" اگر عقل انسانی حین کے معانی بیان کر سکتی ہے تو وہ مرث یہ ہیں۔ بے عیب
 گویا جس کی کو بے عیب سمجھے وہ اس کا حین ہے۔ اب اگر حین کے معنی ہیں بے عیب
 تو بتاؤ۔ سوائے اللہ کے دنیا میں کوئی بے عیب ہے؟ چونکہ اللہ حین ہے لہذا بے عیب
 مسلمانو! تمہارے رسول میں کوئی عیب ہے؟ سبگز نہیں۔ جب رسول بے عیب
 ہے تو پھر بے ناسیں۔ ہے نانوڑ۔ چونکہ نور کے معنی ہیں حین لہذا حین کے معنی ہیں
 بے عیب۔ مگر رسول میں اور کچھ نہیں تو حادثہ ہونے کا عیب تو ہے۔ قدیم تو
 نہیں رسول۔ مخلوق تو ہے نا۔ صرف اللہ وہ ہے جس میں کوئی نقص نہیں ہے۔ اللہ وہ
 ہے جس میں کوئی عیب نہیں ہے۔ گویا اصلی بے عیب اگر دنیا میں کوئی شے ہے تو وہ اللہ
 ہے۔ اصلی حین اگر دنیا میں کوئی شے ہے تو وہ مرث اور صرف اللہ ہے۔

سامعین!

یاد رکھو! ہر حین کا فطری خواہش و تقاضا یہ ہے کہ میرا چاہنے والا بھی کوئی ہو۔ حُسن
 ادا اس ہو جاتا ہے، حُسن نعلین ہو جاتا ہے، حُسن مرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ اگر حُسن کا کوئی
 چاہنے والا نہ ہو — گویا حُسن نظر تازیہ چاہتا ہے کہ جس حیثیت کا میں حین ہوں اسی حیثیت
 کا میرا کوئی چاہنے والا ہو۔ اب اگر اللہ حین ہے تو نہ صرف حُسن کے مطابق اللہ کا دل
 بھی یہی چاہتا ہے کہ کوئی میرا چاہنے والا بھی ہو۔ مگر اس حیثیت کا عاشق ہو جس حیثیت کا

میں حسین ہوں۔ گویا اللہ کا حُسن بے تاب رہے گا۔ جب تک اللہ کے حُسن کے مطابق اُسے عشق نہ مل جائے — لہذا اللہ نے چاہا کہ اپنے حُسن کو نمایاں کروں۔

”میرے حُسن کو کوئی پہچانے۔ میرے حُسن کا کوئی عاشق ہو۔“

چنانچہ اللہ نے اپنے حُسن کا پہلا عاشق آدم کو بنایا۔

”آدم! ہم سے عشق کرو گے؟“

آدم نے کہا۔ ”کریں گے۔“

”تم آج سے ہمارے عاشق؟“

”ہاں۔ عاشق۔“ جب آدم نے کہا ”میں عاشق ہوں“ تو معشوق نے شرط لگا دی

”یقین کرنے جانا۔ جو تھے کونے نہ جانا۔“ مگر آدم چہتے کونے چلے گئے۔ اللہ نے کہا

”بس اتنا ہی عشق ہے۔ ایک برخت کی خاطر معشوق کی بات نہ مانی۔ جاؤ زمین پر تمہارے

عشق کو میں نے آزما کے دیکھ لیا۔ میرے حُسن کے مطابق تمہارا عشق نہیں ہے۔“

اب اللہ نے کہا ”کوئی اور عاشق ہے جو میرے حُسن کے مطابق عشق کر کے دکھائے؟“

چنانچہ ایک عاشق نے کمر ہمت باندھی۔

”خداوند! میں تیرے حُسن کے مطابق عشق کروں گا۔“

اللہ نے کہا ”شاباش۔ میرے حُسن کے مطابق عشق کر کے دکھاؤ۔“

چنانچہ اس عاشق نے تقریباً نو سو سال منازلِ عشق طے کیں۔ ریاضتیں کیں۔ معنیتیں

پتھر کھانے۔ تکلیفیں اٹھائیں۔ اللہ سے عشق کی مکمل مشق کی اور سب اپنے نزدیک عشق

س کامل ہو گیا تو اللہ نے کہا۔

”میرے چاہنے والے! ہمارے عشق کا امتحان دو۔“

کیا؟

”گشتی میں سوار ہو جاؤ۔ اور دیکھو کسی نالائق کو آواز نہ دینا۔“ چنانچہ وہ بیٹھ گیا

اور مجبوراً نالائق کو بلیا سمجھ کے آواز دے دی

اللہ نے کہا ”بس اتنی سی بات۔۔۔“ چنانچہ نو سو سال کا عشق ایک امتحان میں ناکام ہو گیا اور زمین شرم سے پانی پانی ہو گئی۔ پھر ایک اور بندے نے کمر ہمت باندھ لیا۔ خداوند۔۔۔ میں تجھے عشق کر کے دکھاؤں گا۔ تو بھی کیا یاد کرے گا کہ کوئی عاشق ملا تھا۔ اللہ نے کہا:

”اچھا آجاؤ میدان میں“

بہر نوع۔ اُس نے امتحانِ عشق دینا شروع کیا۔ پہلا امتحان میدان یہ تھا کہ

بے خطر گود پڑا آتشِ فرود میں عشق

اللہ گواہ ہے۔ ابراہیم نے وہ امتحان دیا کہ لطف آگیا۔ اللہ کا عشق جب کرین سے جھٹکا دے کر آگ میں پھینکا گیا تو آپ بتائیں جب وہ فضا میں آ رہا تھا۔ آگ تک ابھی پہنچا نہیں تھا۔ کرین سے چل پڑا تھا۔ جب فضا میں تھا تو پورا بے بس تھا یا نہیں؟۔ ”بے بس“ ایسی بے بسی کے عالم میں تو ڈوبتے کو تنگے کا سہارا ہی کافی ہے۔ اگر کوئی شے اُس کے ماتھے آجاتی تو وہ اُسے اپنے بچانے کے لئے پکڑ لیتا یا نہیں؟ پکڑ لیتا۔ اس بے بسی کے عالم میں جبریل جیسا قوی فرشتہ اُس کے پاس آیا اور گود میں لے لیا۔

”ابراہیم آگ میں جا رہے ہو؟“

”ہاں“

بچاؤں۔ مدد کروں؟۔ ابراہیم نے جواب دیا۔

”مدد تو مجھے ضرور چاہیے۔ مگر تم سے نہیں۔ جاؤ، ہٹو، میرا رستہ چھوڑو۔“

جبریل سر جھکائے سدرہ پر آکے بیٹھ گئے۔ اللہ نے پوچھا۔

”جبریل کیسا مزاج ہے؟“

جبریل نے کہا، خداوند۔ کیا بتاؤں۔ عجیب بندہ ہے۔ ایسے موقع پر مجھے جھڑک دیا۔

اللہ نے کہا ”جبرئیل! یہ امتحانِ عشق تھا۔ میں نہ کہتا تھا کہ انی اعلم ما لا تعلمون اب چرکہ اس بندے نے عشق کی اس ادا کو دکھایا ہے لہذا اس کا انعام یہ ہے کہ عشق و آگ دونوں مکر میں گئے۔ دیکھتے ہیں عشق کی آگ قوی ہے یا یہ آگ؟ چنانچہ آتشِ عشق نے اس آگ کو بھی گلزار بنا دیا۔ بہر نزع! اللہ نے امتحان لیا اور ساتھ ہی یہ بھی فرمادیا ”ابراہیم! شاہش تم تو میرے عشق میں پورے اترے۔ ذرا ایک امتحان اور بھی دے دو۔“

» خداوند! کیا؟

» اپنے بیٹے کو ہمارے عشق پر قربان کر دو۔

» خداوند! یہ بھی کوئی بات ہے۔ میں ابھی اپنے بیٹے کو تیرے عشق میں ذبح کئے

دیتا ہوں۔ چنانچہ بیٹے کے گلے پہ چھری تو رکھ دی۔ اللہ کے حُسن کے مطابق عشق میدان میں آگیا۔ مگر کیا بتاؤں عینِ وقت پہ اچھے خاصے عاشق کی آنکھوں پہ کیا پٹی بندھ گئی۔

اللہ نے کہا

» ابراہیم! تم میرے عاشق نہیں۔ درست ہو۔

بہر نزع۔ اس کے بعد ایک اور زوردار انسان میدانِ عشق میں کود پڑا۔

» میرے اللہ! میں تجھ سے عشق کروں گا۔

سامعین!

کوئی عاشق یہ گوارہ نہیں کر سکتا کہ کوئی میرے محبوب کا مقابلہ کرے۔ چنانچہ اتفاقاً

تحتِ مصر پہ بیٹھنے والا فرعون، موسیٰ کے محبوب کا تسخیرِ اژدار باغیا مکر عاشق زوردار تھا ڈنڈا لے کر پہنچ گیا۔

» تُو ہے جو میرے اللہ کا مقابلہ کر رہا ہے؟

» ہاں۔ میں ہوں۔

”شرم نہیں آتی؛

”نہیں آتی“

”کیا یاد کرے گا؟“

یاد کیا کروں گا۔ بس میں اللہ ہوں۔

اب جو فرعون نے یہ کہا تو موسیٰ کو غصہ آگیا اور پکڑ کر دریائے نیل میں وہ غرطے دیئے
ہیں کہ ”مصری“ تھا گھل کے رہ گیا۔ بہر نوع یہ اللہ کے عشق کا کمال تھا۔ موسیٰ کے بعد
اللہ نے چاہا کہ کوئی اور عشق ملے جو میرے عشق کو کمال تک پہنچا دے۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ
تشریف لے آئے۔

”عیسیٰ! ہمارے حق کے مقابلے کا عشق پیش کر دو گے؟

”ہاں خداوند! میں عشق کرنے آیا ہوں۔ مجھ میں بڑا کمال ہے“

”عیسیٰ! تم میں کیا کمال ہے؟

”خداوند! مجھ میں بڑا کمال ہے۔ مجھ میں بڑی خرابیاں ہیں“

مگر جب امتحان عشق کی باری آئی تو گھبرا کے کہا۔

”خداوند! بات یہ ہے کہ اب تو واپس بلائے۔ پھر سہی“

چنانچہ اللہ نے عیسیٰ کو واپس بلا لیا۔ اب ان کے بعد حضور خاتم الانبیاء تشریف
لئے۔ محمد اور اللہ کی رازدینا زکی بائیں بہت پرانی تھیں۔

اللہ نے محمد سے یہ نہیں کہا ”ہم سے عشق کر دو گے یا نہیں؟“ بلکہ محمد نے خود کہہ دیا۔

”خداوند! وہ وقت تو گزر گیا۔ اب میں امتحان عشق دیتا ہوں۔ اگر تیرے حق

کے مطابق عشق پیش نہ کیا تو اپنا کلمہ پڑھو نا چھوڑ دوں گا اور اگر تیرے حق کے مطابق عشق
پیش کر دیا تو تجھے بھی میرا کلمہ پڑھنا پڑے گا۔“

اللہ نے کہا ”محمد! تو آج میرے نزدیک عشق ہو“

”ہاں۔ زبردست عاشق ہوں۔ اللہ سن!

چونکہ میں ایک نہیں ہوں، پانچ کا مجموعہ مل کے محمدؐ بنا ہوں۔ لہذا اگر میں نے امتحان دے دیا تو تو کہے گا۔
”باقی چار رہ گئے۔“

تو یوں کرتے ہیں میرے اللہ! جو سب سے چھوٹا ہوا سے اپنے عشق میں آزمائے۔ اگر اس نے تیرے حُسن کے مقابلے میں عشق دکھایا پھر تو تو مان جائے گا نا۔“ پھر تو تو تامل ہو جائے گا۔

بس بھائیو!

جب اللہ نے کہہ دیا ”ہے کوئی جو میرے حُسن کے مقابلے میں عشق پیش کرے تو پروردہ آغوش محمدؐ سے ایک بچہ اٹھا۔

”خداوند! — نام ہے میرا حسین۔ تو ہے حسین اور میں ہوں حسین۔ اب تیرا میرا مقابلہ ہے۔ حُسن میں تو کامل اور عشق میں، میں کامل۔ تو حُسن کی انتہا۔ میں عشق کی انتہا۔ نہ تیرے حُسن کی کوئی حد نہ میرے عشق کی کوئی حد۔
میرے اللہ!

”میں تیرے حُسن کے مقابلے کا عشق دکھاتا ہوں۔ تب کیا چاہتا ہے؟
اللہ نے پوچھا ”حسین! دِلن چھوڑنا آسان بات ہے؟

فرمایا ”نہیں۔ مشکل بات ہے۔ جس زمین پر گھٹنوں چلے ہوں۔ کھیل کے جوان ہوئے ہوں اُسے چھوڑ دینا آسان بات نہیں۔ مگر تیرے عشق پر سب کچھ چھوڑ دیا۔“
”حسین! پردیس میں جانا پڑے گا؟

”ہاں! پردیس میں جا رہا ہوں۔

اللہ نے کہا حسین! جنگل میں جانا ہو گا؟

”اں میں جگہ میں جارا ہوں۔ تو اپنا امتحان لے۔ اگر تجھ سے ”بس“ نہ کھلوادیں تو حسینؑ نہ کہنا“

”حسینؑ اتیرے سامنے پانی ہے“

”اں ہے“

”حسینؑ! پیاسا رہنا پڑے گا“

”اں پیاسے رہیں گے“

آج حسینؑ اور عشق میں ضد پڑ گئی۔ ادھر اللہ کا بے پناہ حُسن ہے۔ ادھر بندے کا بے پناہ عشق ہے۔

اللہ نے پوچھا

”حسینؑ! بلو۔ بیٹے کے معاملے میں امتحان دو گے؟“

اں — ایک نہیں — در بیٹے —

دیکھ میرے اللہ! تیرے اسماعیل سے زیادہ شاندار ہے میرا بیٹا۔

اور دیکھو!

میں اس کے کیچے سے بر چھی کیچ رہا ہوں۔

اچھی طرح دیکھ لے میرے اللہ!

میری آنکھوں پر کوئی پٹی تو نہیں بندھی ہوئی۔ میرا ہاتھ تو نہیں

لرز رہا — میرے لبوں پر سکاہٹ ہے یا نہیں۔ میرے اللہ

اچھی طرح دیکھ لے۔ کوئی یہ نہ کہے کہ حسینؑ کے دل میں جذبات

محبت تھے ہی نہیں — جذباتِ محبت دہا کے عشق دکھار رہا

ہوں۔ جذباتِ محبت تو اتنے ہیں کہ گالی دلاؤں سفید ہو گئی اور

چند سو سال پہلے کے بر چھی کیچ رہا ہوں۔

بہر نوح! حسین نے جب عشق کی ساری منزلیں طے کر لیں تو اللہ نے کہا۔
 ”حسین! تُو نے تو کمال کر دیا۔“

حسین نے جواب دیا۔ ”میرے اللہ! ابھی کیا کمالی تُو نے دیکھا ہے۔ دیکھ تو سہی
 میرا کمال کیا ہوتا ہے۔“

”حسین! میں تو جب جانوں تیرا عشق کامل ہے جب زینبؓ شکسہ ہو جائے۔
 بس یہاں آکے حسین ذرا چپ ہوا ہی تھا کہ ”پیرنا تو اندھیرا تمام کسند“
 زین العابدینؑ اٹھ کے کھڑا ہو گیا۔

”خداوند! اس معاملہ میں زینب! امتحان دوں گا۔ بے شک میرے سامنے زینبؓ
 شکسہ ہو جائے۔ بے شک میری بہنیں شکسہ ہو جائیں بے شک میری ماں
 شکسہ ہو جائے۔“

بہر نوح! زین العابدینؑ نے کہہ دیا۔ ”خداوند! میں تیرے حق کے مطابق عشق پیش
 کروں گا۔“

آج زین العابدینؑ قیدی بن گئے جا رہے۔ پاؤں میں بیڑیاں بھی ہیں، ہاتھوں میں
 ہتھکڑی بھی ہے۔ گتے میں طوق بھی ہے۔ ننگے سر، ماں بہنوں کے اونٹوں کی مہار
 بھی ماتھے میں ہے۔ مگر ازل وقت پہ نماز بھی ہے۔ ادھر نماز کا ازل وقت ہے ادھر وہی قیدی
 ہتھکڑی بیڑی کے ساتھ اونٹوں کی قطار پکڑے ہوئے ازان کہہ رہا ہے۔ قدرت نے
 جب یہ نماز دیکھی تو اللہ جیسا معبود کہہ اٹھا۔ ”تو سیدنا ساجدینؑ ہے۔“ جب رات
 بھر اس قیدی کی عبادت دیکھی تو معبود مان گیا۔ ”تو زین العابدینؑ ہے۔“
 ادھر زین العابدینؑ کہتے ہیں۔

”خداوند! تُو نے میرا عشق دیکھا۔ میرا بھائی۔ میرا قوت بازو۔ میرا حراں بھائی علی اکبرؑ
 میدان میں گیا۔ باپ نے ابراہیمؑ والا صبر دکھایا۔“

خداوند! فرما میرا صبر بھی دیکھو سے۔

سامعین!

یوم عاشور جب علی اکبرؑ میدان میں تشریف لائے تو امام زین العابدینؑ نے قسم دیا۔
 ”میرے خیمے کا پردہ اٹھا دو۔ میں اپنے بھائی کا جہاد دیکھنا چاہتا ہوں۔“ چنانچہ خیمے کا پردہ
 اٹھا دیا گیا۔ آپؑ ہتھیار لگا کے بیٹھ گئے۔ اکبرؑ میدان میں جہاد کر رہے تھے اور جب اکبرؑ کے
 پیچھے پرہیزگاری کی تو امام زین العابدینؑ نے اپنی آنکھوں سے برہنہ ہوتی دیکھی، اکبرؑ نے بعد
 میں پکارا ہے۔ ”زین العابدینؑ نے پہلے آواز دی۔“ بابا اکبرؑ زخمی ہو گیا۔ اسی دوران حصین
 ابن میر نے وہ برہنہ کچرا کے کھینچے۔ حیران ہو کر اس میں چھٹی ہوئی برہنہ۔ اس نے جھٹکا دے
 کے کھینچی تو برہنہ پھیل دیں ٹوٹ کے رہ گیا اور اس کی چوب خون سے تر ہو کر اس کے
 ہاتھ میں آگئی تو اس نے خون آنسو پر بھند کر کے آواز دی۔

”حسین! زین العابدینؑ!

”دیکھو یہ علی اکبرؑ کا خون ہے۔“

گویا علی اکبرؑ کو نقل کرنے سے بھی یہ زیادہ شقاوت تھی جو باپ، بھائی کو اس طرح
 خون دکھایا۔ اس موقع پر زین العابدینؑ نے حکم دیا۔ ”خیمے کا پردہ گرا دو!“
 بس بھائیو!

اب ایک واقعہ اور سن لو۔ جب زین العابدینؑ قید سے رہا ہو کر مدینہ پہنچے تو یزیدؑ
 نے ایک لشکر بھیجا جس نے مدینہ کو لٹا۔ پھر وہی لشکر مکہ کو لٹے آیا۔ جب انہوں نے
 مکہ کا محاصرہ کیا جو اتنا تو یزید کے مرنے کی اطلاع آگئی۔ اور یزیدؑ کی موت کی خبر سن کے
 وہ فوج اپنے سردار کو چھوڑ کر بھاگ گئی اس وقت اس فوج کا سردار حصین ابن نمیرؑ تھا
 شہزادہ علی اکبرؑ۔ اب وہ اکیلا رہ گیا۔ مدینہ کو لٹا تھا۔ مکہ پر غلام کیا تھا۔ وہ یہ سمجھا کہ
 اگر ان لوگوں کے ہاتھ آگیا تو اللہ جانے کیا سزا دیں گے۔ چنانچہ جنگلوں میں مار مارا پھرتا رہا۔

تاکہ یہاں سے کسی طرح نکل کر شام پہنچ جائے۔ مگر کوئی سبیل نظر نہ آئی۔ آخر بھوک پیاس سے مرنے لگا۔ پانی کی تلاش میں جنگل میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ دیکھا کہ سامنے خیمے لگے ہوئے ہیں۔ قریب گیا۔ پوچھا۔

یہ کس کے خیمے ہیں؟ — کسی نے کہا ”امام زین العابدین کے۔“

اب جو اُس نے امام زین العابدین کا نام سنا تو کربلا کا واقعہ یاد آگیا۔ سوچنے لگا۔ انہیں تو میں نے بہت ستایا ہے۔ اگر ان کے ہاتھ آگیا تو اللہ جانے مجھے کیا سزا دیں گے؟ وہیں سے واپس لڑنے لگا۔ ابھی چند قدم چلا ہی تھا کہ اُس کے کان میں بڑی شیریں اور پیاری آواز آئی۔

”بھائی عرب! واپس آؤ۔ کیوں جا رہے ہو؟“

وہ واپس آیا۔ دیکھا تو امام زین العابدین سامنے کھڑے ہیں۔ دل میں خوش ہوا کہ امام نے مجھے پہچانا نہیں۔ آخر کچھ دیر بعد وہ ظالم بولا۔

”قبلہ مجھے بھوک لگی ہے۔“

امام نے فرمایا۔ ”ہاں بیٹھو۔“

جب وہ بیٹھ گیا تو امام نے اپنے باورچی کو حکم دیا۔

بھائی عرب کے لئے گرم روٹی لاؤ۔ ٹھنڈا پانی لاؤ۔“

پہلے اُسے کھانا کھلایا۔ پھر اپنے ہاتھ سے جام بھر کے پانی پلایا۔ جب وہ خوب سیر ہو کے کھا چکا تو اسے نیند آگئی۔ سو گیا۔ اب جو تین چار گھنٹے بعد اُس کی آنکھ کھلی تو اُس نے سوچا۔ ”اب تک تو کسی نے مجھے پہچانا نہیں اگر پہچان لیا تو قتل کر دیں گے۔ بہتر ہے فوراً چلا جاؤں۔ چنانچہ ایک دم آنکھ کھلتے ہی چل پڑا۔ ابھی تھوڑی دور چلا ہی تھا کہ امام نے آواز دی۔“

”جناب مجھے جلدی ہے“

امامؑ نے فرمایا ”اچھا۔ یوں کرو۔ میری سواری کے اونٹوں میں سے ایک اونٹ لے لو۔ تین چار دن کا کھانا ساتھ باندھ لو۔ پانی کی مشک بھی رکھ لو تاکہ تمہیں راستے میں کوئی تکلیف نہ ہو۔“

اب جبرائیلؑ نے یہ فرمایا تو حصین ابن زبیرؓ کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔
”حضور! شاید آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔“

امامؑ نے فرمایا۔ ”میں نے پہچان لیا ہے۔ تو حصین ابن زبیرؓ ہے نا۔“
بس اب جبرائیلؑ نے اپنا نام سنا تو ہر تھرا کاپنے لگا۔

”قبلہ وہی ہوں۔“

امامؑ نے فرمایا۔

”ڈرو مت۔ گھبراؤ مت۔ کربو میں ہم تمہارے مہمان تھے۔ آج تم ہمارے مہمان ہو۔“

سامعین! یہ فرق ہے آل محمدؑ میں اور ہم میں۔ اُن کا عشق اللہ سے ہے۔ بس اس عشق کو دیکھ کے اللہ پکار اٹھا۔
”لے نفس مطمئنہ!“

تم نے میرے عشق کا کمال کر دیا۔“

شجاعت

ادھر ملوکیت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

خداوندِ عالم عز و اسمہ جل جلالہ کی حمد و ثنا کے بعد حضراتِ محمد و آلِ محمد پر درود و سلام
حضراتِ گرامی !

اللہ نے انسان میں جو اقدار و قیمتیں دی ہیں ان میں اسے متفاد و طاقتور کا ایک بنایا ہے
اور انسان کی خوبی ہی یہی ہے کہ اس میں بیک وقت متفاد و طاقتور موجود ہیں۔ گویا انسان
انتہائی مہربان و رحیم بھی ہے اور انتہائی بے رحم بھی ہے۔ انتہائی عادل و انصاف بھی ہے
اور انتہائی ظالم بھی ہے۔ انتہائی کمزور بھی ہے اور انتہائی طاقتور بھی ہے۔ انتہائی جالب بھی
ہے اور بہترین عالم بھی ہے۔ انسان اگر اپنی عزت و شرافت پر آجائے تو فرشتوں سے بھوکھ
کروائے اور اگر اپنی خافت پر اتر آئے تو پتھروں کو خود بھوکھ کر دے۔ کہاں انسان کا وہ شرف
کفر نشین اسے جمع ہو کر اور کہاں اس کی روپیہ کی یہ خود پتھروں سے ملتا ہے کہ سے یا
گلا کے سامنے گھٹے ٹیکے دے۔

اہلِ لاہور! آپ تو دنیا میں رہتے ہوئے ہیں۔ آپ نے تو انسانی اقدار و قیمتیں یاد
ہیں اور "راوی" سے واسطہ رکھا ہوگا۔ مگر ہندوستان میں جا کر دیکھیں تو دنیا بھر سے
تقریباً بیس کروڑ انسان کی زبانیں گنگا کرناں کہتے کہتے ٹھس رہی ہیں۔ ادھر گنگا جی پر بھوکھ

بیٹھی کہ بغیر بچہ ہوئے، اماں بن بیٹھی ہوں۔ اس سے بہتر اند کیا ہے۔ بہ نزع پر سے میں کروڑ ہندوؤں نے گنگا اماں کہہ کر گنگا کا دماغ خراب کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہر سال۔ اماں کو خفہ جو آتا تو سیلاب آجاتا اور اپنے ہی بچوں کو بہلے جاتی۔ بچے لاکھ کہہ رہے ہیں۔ اماں! جانے بھی دو مگر اماں کو خفہ آیا ہوا ہے۔ چنانچہ اماں کی یہ حالت دیکھ کر بچے رات دن دعائیں مانگتے ہیں۔

یا اللہ! اماں کو خفہ نہ آئے!

اماں کناروں سے باہر نہ نکلتے۔ اس لئے کہ اماں گھر سے نکلی نہیں تو بچوں کی خیر نہیں ہے۔ آج سے ایک عرصہ پہلے انگریز قوم ہمارے ملک میں آئی تھی۔ وہ سمجھ گئی کہ گنگا میں سیلاب کیوں آتا ہے؟ چونکہ گنگا اماں بن کے بیکار بیٹھی ہے (اور یہ بیکاری کا مسئلہ ہے کہ چلو اور نہیں تو کناروں سے ہی اچھل پڑو۔ لہذا انگریزوں نے جگہ جگہ نہریں کاٹ کاٹ کسے چکیاں لگادیں۔ اب جزا اماں کو کھلی پینا پڑی تو بگڑا ہوا دماغ صحیح ہو گیا۔ بہ نزع، انسان کی عزت تو یہ ہے کہ دنیا کی ہر شے اس کے تابع فرمان ہے۔ جبریل میسا فرشتہ اس کا غلام ہے۔ گویا اگر انسان بلندی پر پہنچنا چاہے تو کعبہ کو فتن اس کے غائبین کو چھوے اور اگر بستی پر گنا چاہے تو پتھر کو سجدہ کرے۔ انسانی فطرت میں یہ عجیب تضاد ہے۔

سامعین! بات سے بات نکلتی ہے اور سلسلہ گنگو بڑھتا جاتا ہے۔ آپ ایمان سے بتائیں کہ کون احسن انسان ایسا ہو گا جو بلا متنی ہوش و حواس پتھر کر خد کہتا ہو۔؟ "نہیں" مگر بڑے بڑے عقلمند کہہ رہے ہیں کہ پتھر کو سجدہ کر دو، اور عقل مند بھی وہ جو لگا بھلی میں تکریر کریں تو دنیا کو حیران کر دیں۔ سیاسی گنگو کریں تو ساری دنیا کو چکر میں ڈال دیں اور اگر گھر سے باہر میں تو پتھر کے سامنے مانتہ جوڑ کر بیٹھ جائیں۔ یا تو عقل کی وہ تیزی یا دماغ کی بے خرابی۔ اب اگر ان سے کوئی پوچھے، تمہاری عقل پر کیا پردہ پڑ گیا کہ تم ان پتھروں کو پاؤ۔ چناں چہ ان کو جواب دینے میں تمہاری عقل خراب ہے، کون کہتا ہے کہ ہم پتھر کو سجدتے ہیں۔ ہم تو ذرا لہو پوجتے ہیں۔ ہم تو پراکشر کو پوجتے ہیں۔ ہم تو برہما کو پوجتے ہیں۔

پھر تم نے پتھر کیوں سامنے رکھا ہوا ہے؟

وہ جواب دیتے ہیں: یہ پتھر ہمارا وسیلہ ہے:

ہم نے پوچھا: "پتھر کو کیوں وسیلہ بنایا ہے؟"

انہوں نے جواب دیا: "ہم گنہگار ہیں۔ پتھر بے گناہ ہے۔ وسیلہ وہی بن سکتا ہے جو بلیکناہ ہو۔"

اب تمہیں بھی چُپ ہو گیا کہ گنہگار سے تو پتھر ہی کو وسیلہ بنانا بہتر ہے۔ بہر نزع انسانی فطرت

کی یہ عادت ہے کہ ہر انسان خواہ وہ بڑھا ہوا ہوا جان۔ نادان ہو یا بچہ اُسے ضد ہوتی ہے ٹوکنے والے

سے اور پیار ہوتا ہے نہ ٹوکنے والے سے۔ اب چونکہ اللہ بھی ٹوکتا ہے لہذا انسان نے سرچا کر

چھوڑ دیا ایسے اللہ کو جو ٹوکتا ہو۔ کیوں نہ ہم ایسا اللہ بنائیں جو ٹوکتا نہ ہو۔ چنانچہ بتوں کو اللہ بنالیا جو

کسی کو ٹوکتے ہی نہیں تھے۔ پُرچ لڑوا د نہیں کہتے۔ تو زور تو بڑا نہیں کہتے۔ لہذا یہ نہ ٹوکنے والے

اللہ اچھے ہیں۔ — سامعین! اگر چند پشتیں نہ ٹوکنے والے کو پر جتنے گزر جائیں اور حبیب الہی

دو چیزیں سامنے آئیں گی۔ ایک ہر ٹوکنے والی۔ ایک ہونہ ٹوکنے والی۔ تربت پرستی کی عادت یہ

کہلوا دے گی کہ تمہیں نہ ٹوکنے والی کافی ہے۔ چونکہ عمر بھر نہ ٹوکنے والی کو پر جتا رہا اس لئے ٹوکنے

والے سے نفرت ہو گئی۔ بہر نزع انسان اپنے اعمال و افعال سے فرشتہ بھی ہے اور ذلیل و خوار

بھی ہے۔

عزیز سامعین! انسان کے اندر خدا نے ایک شے رکھ دی ہے جسے "عقل" کہتے ہیں۔

عقل ایک ایسی شے ہے جسے ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ مجھ میں سب سے زیادہ ہے۔ اپنی ہر

بات اچھی معلوم ہوتی ہے۔ اور لفظ "اپنا" ہی میں بڑا پیار ہے۔ اپنا گھر، اپنا کنبہ، اپنا قبیلہ

اپنا خاندان، اپنی اولاد۔ اپنا مذہب۔ اپنا وطن۔ گو یا جہاں لفظ اپنا آجائے بڑا پیار آتا ہے۔

ضلع جنگ کے ایک گاؤں میں چند دیہاتی اکٹھے بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے بات ہو

رہی تھی۔ ایک نے کہا: "ساڑے بابا سائیں بڑے چکے لوگ تھے۔"

یہ کہانی سن کر وہ سب ہنس پڑے۔ ایک دہاڑے چوری

سامعین! آپ نے سنس کے ٹال دیا اور میری ساری زندگی کا محور یہی بات ہے۔ بھاپنا تھا۔ اس لئے باوجود چر ہونے کے نہ ہمیشہ تھا اور گھر والے چونکہ جاگ رہے تھے وہ یوں بیان بن گئے۔ — یہ ہے اپنی کی طرف داری کی بات کہ جتنے اپنا بنا لیا وہ اگرچہ بھی ہے تو ہمیشہ اپنے اور گھر والے تھے وہ اگر جاگ بھی رہے ہیں۔

بہر حال انسان اپنے سے زیادہ عقل مند کسی کو سمجھتا ہی نہیں چاہے وہ اتنا ہی بے عقل سکون نہ ہو۔

یا در کھو، سامعین !

اگر دقتاً انسان میں عقل ہے اور اس کے انحال و عادات، اس کا اٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا اگر عقل کے ماتحت ہے تو یہ انسانیت ہے۔ اور اگر عقل کے خلاف ہے تو انسانیت نہیں ہے۔ نہ کھانا پینا یا گھر بنانا، یہ تو عقل نہیں ہے۔ صرف ان باتوں کو عقل کہا جائے تو آپ ایمان سے تباہیں کہ انسانی خوراک میں اب تک سب سے اعلیٰ شے کیا آئی ہے؟ "شہد"۔ شہد سے بہتر غذا آج تک انسان نے ایجاد ہی نہیں کی۔ ہم نے شہد کھایا اور ذرا بونٹوں پر لگا رہنے دیا۔ سو گئے اگر طے ہونے کہ ہم نے شہد کھایا ہے۔ انسانوں کے سامنے تو اکڑایا مگر مکھی نے جو دیکھا تو کہا "میری تے کھا کے اکڑ رہا ہے۔"

بہر نوع ! شہد کھایا تو کھسی کی خیرات ، مکھن کھایا تو بھینس کی خیرات اور اونی لباس پہنا تو بھیر
نے بُرا منایا کہ میرے بدن کا آئینہ — یہ تو ہے انسانی خوراک و لباس کا عالم۔

انسانو! اگر مکان بنانے پر ناز کرو کہ ہم نے تاج محل بنایا جس کے لئے سینکڑوں انجینئرز لگوائے ہوں گے۔ ہزاروں نقشہ نویس لگوائے ہوں گے۔ لاکھوں کاریگر اور مزدور آئے ہوں گے۔ کروڑوں اینٹ پتھر مصالح اکٹھا کیا ہو گا۔ تب جب کہ یہ مکان بنا ہو گا۔ یہ تو ہمارے مکان بنانے کی شان ہے۔ مگر ایک نفی سی جان و ذرا سادہ چھوٹی سی حیثیت۔۔۔ بے حقیقت سہی سمجھی، جب مکان بنانے کا

ارادہ کرتی ہے۔ تو اللہ پر توکل کیا۔ نہ کسی انجنیر سے نقشہ بنوایا نہ کسی مزدور کو بلایا۔ نہ کسی معمار کو آنا دیا۔ نہ کسی کاریگر کو پکارا۔ گھر بیٹھ کے کہا۔

”پیکر کرنے والے! میں غنی سی کمی ایک مکان بنانا چاہتی ہوں۔ تیریری موزن۔ چنانچہ اللہ نے وحی کی روشنی دے دی۔ وحی کی مشعل ہاتھ میں لے کر کھینچ کر سے نکلی۔ باغ میں پہنچی۔ باغیوں کی طرح باغ کو پامال نہ کیا۔ باغ کی ایک ایک کھوگئی۔ ایک ایک کلی چمی۔ ایک ایک پتے کو چار کیا۔ ایک ایک شلخ کو سلام کیا۔ ایک ایک درخت پہ جا کے میٹھی۔ ایک ایک پھول سے گفتگو کی۔ اور تمام پھولوں میں سے ایک پھول کا انتخاب کیا۔ قریب جا کے سلام کیا۔ اس ادا سے سلام کیا کہ پھول جواب میں مسکرایا۔ اور جب مسکرایا تو منہ کھول دیا اور یہ چپکے سے پھول کی گود میں جا کے بیٹھ گئی۔ کتنی پھول سے میٹھی میٹھی باتیں کرتی رہی اور پھول ہنستا رہا۔ عارض گل پہ خراش نہ آنے دیا۔ دامن گل پہ گرد نہ پڑنے دی۔ چنانچہ پھول مسکراتا رہا اور یہ اپنے گھر کا مصالحو بھی بننے کرتی رہی اور خوراک بھی اکٹھی کرتی رہی۔ پھر ایسا گھر بنایا کہ بنا رہے تو بے کار اور اگر ٹوٹ جائے تو ہمارے لئے ”فی شفا اللہ“

بہر زور۔ صرف مکان و عمارت بنانے سے عقل نہیں آتی۔ عقل کے معنی یہ ہیں کہ انسان یہ سمجھ لے کہ اس وقت مجھے کیا کرنا چاہیے۔ اور یہ سوچ لے کہ عقل اس وقت کیا چاہتی ہے وہ اصل انسانیت ہے۔ اگر عقل یہ چاہتی ہے کہ اس وقت تلوار چلائی ہے تو پھر تلوار اتنی چلائے کہ اس کی چلائی ہوئی تلوار کو قلعوں کے دروازے روکیں۔ پہلوانوں کے سر نہ روکیں۔ حد یہ کہ جبریلؑ کے پر نہ روکیں۔ اور اگر عقل کہہ دے ”نہیں“ اب تلوار بند کرنی ہے“ تو بڑے بڑے بزدل اگر گلے میں رستی ڈال لیں تو پرواہ نہیں۔ اگر عقل کہے کہ اب جاگتے رہنا ہے تو ساری رات جاگ کے گزر جائے اور ”لیلی المرئیہ“ دنیا کی تاریکی رات بن جائے۔ اور اگر عقل کہے کہ اب سونا ہے تو ساری رات سو کے گزر جائے تو صبح تک سوٹ نلی جائے۔ اگر عقل کہے کہ روٹی کھانی ہے تو کھالی جائے اور اگر عقل کہے کہ بچپن کو فاقے سے نکلنا اور اپنی روٹیاں تینوں مسکینوں میں

بانٹ دو گویا قدرت عقل کا تقاضا یہ ہے کہ وہ کام کرو جو عقل کے مطابق ہو۔

میرے بھائیو! فلسفہ اخلاق کی اصطلاح میں عقل کے مطابق نقل و حرکت کو شجاعت کہتے ہیں چاہے وہ گھر کے اندر ہو یا گھر سے باہر ہو۔ لڑنے جھگڑنے کو شجاعت نہیں کہتے۔ مالک لکناک بننے کو شجاعت نہیں کہتے بلکہ عقل کے مطابق عمل کرنے کو شجاعت کہتے ہیں۔

یاد رکھو! عقل کی باتیں اور ہیں۔ دنیا پر قبضہ کرنے کی باتیں اور ہیں۔ دنیا پر تو قبضہ اس طرح ہوتا ہے کہ۔۔۔ رات کو میں سو رہا تھا۔ ایک شخص دبے پاؤں کالی چادر اوڑھے رات کی تاریکی میں میرے کمرے میں گھس آیا اور میری ٹوپی چڑا کر لے گیا۔ بتاؤ جو آدمی میری ٹوپی لے گیا وہ کون ہے؟ ”چور۔ اگر وہ چور پکڑا جاتا تو آپ بھی اس کی پٹائی کرتے۔ پولیس بھی رہنا نڈر لیتی۔ اور عدالت بھی سزا دیتی۔ مگر اُسے سزا نہیں دی گئی اس لئے کہ وہ پکڑا نہیں گیا۔ گویا گورنمنٹ سزا اس بات کی دیتی ہے کہ چور پکڑا کیوں گیا۔ صرف پکڑے جانے کی سزا دی جاتی ہے۔ نہ پکڑا جاتا تو ہمارا دست بھی تھا۔ ہمارا بھائی بھی تھا۔ گویا پاس بھی بیٹھنا اور چوری بھی کرتا۔ بہر نزع وہ چور پکڑا نہ گیا۔ اس کا حوصلہ بڑھ گیا۔ اگلے دن پھر آ گیا۔ اور میرا کس اعٹا کر لے گیا۔ اسی طرح اور تین چار چوریاں کرنے کے بعد وہ پکڑا نہ گیا۔ اس کا حوصلہ اور بڑھ گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس نے دس بیس آدمیوں کا ایک گروہ بنالیا۔ اب تو اس کے پاس چاقو وغیرہ بھی آ گیا۔ پستول بھی لے لیا۔ سڑک پہ کھڑا ہو گیا۔ ادھر سے کوئی گزرا تو دو لمبے مارے اور سب کچھ چھین لیا۔ اب وہ کیا کہلائے گا؟ ”ڈاکو“ گویا جو چور پکڑا نہ جائے اس کی ترقی یافتہ شکل کو ڈاکو کہتے ہیں۔ دس بیس اور ڈاکے ڈالے۔ اب بھی وہ نہ پکڑا گیا۔ ہزار دو ہزار کا گروہ بنالیا تو وہ اشتہاری ڈاکو بن گیا۔ اب بھی وہ پکڑا نہ گیا۔ اس کا حوصلہ اور بڑھا۔ چنانچہ اس نے دس بیس ہزار ساتھیوں کو اکٹھا کر لیا۔ کہیں سے اسلحہ بھی لے لیا۔ اور ایک شہر پر ٹوٹ پڑا۔ وہاں کی پولیس کو مارا۔ شہریوں کو قتل کیا اور قبضہ کر کے وہاں کے گورنمنٹ ہاؤس پہ بیٹھ گیا۔ اب وہ کیا کہلائے گا؟ ”اعلیٰ حضرت“ ظل سبحانی گویا جو پکڑا نہ جائے۔ اعلیٰ حضرت بھی ہے۔ ظل سبحانی بھی ہے اور فاتح اعظم بھی ہے۔

چونکہ عمر بھر کھڑا نہ گیا لہذا فاتح اعظم ہے۔ ہماری کیا مجال کہ ہم اسے چر کہیں۔ یوں بنتی ہے ملکیت۔ یوں بنتی ہے شہنشاہیت۔ یوں بنتا ہے تخت و تاج۔ تخت و تاج کوئی آسمان سے نہیں برستا۔ قتل و غارت اور غضب شدہ تخت کو کہتے ہیں۔ یہ ہمیں خدا نے عطا کیا ہے۔ یہ ہمیں اللہ نے بخشا ہے۔

سامعین! مصیبت بن گئی ہے کہ وہ خدا نے عطا کیا ہے" کا لفظ بھی مولویوں نے سکھا دیا۔ ایک تھانیدار کے گھر مولوی صاحب کی دعوت تھی۔ مولوی صاحب کے اعزاز میں پچاس آدمی اور بلوائے گئے۔ پچاس قسم کے کھانے۔ یہاں سے وہاں تک دسترخوان۔ اب جو مولوی صاحب نے دسترخوان دیکھا تو فرمایا۔ ماشا اللہ۔ دین زندہ ہے۔ اسلام خطرے میں نہیں ہے۔ بہر نوع! مولوی صاحب بہت خوش ہوئے اور پوچھنے لگے۔

"تھانیدار صاحب! آپ کی تنخواہ کیا ہے۔"

قبلہ! انداز ہوتا ہے۔ تین بیٹے ہیں۔ بڑا بیٹا یورپ میں پڑھتا ہے۔ اسے ایک ہزار ماہوار عیجتا ہوں۔ دوسرا گرانٹ کالج میں پڑھتا ہے۔ تین چار سو روپیہ وہ خرچ کر ڈالتا ہے۔ تیسرا سکول میں پڑھتا ہے۔ سو روپیہ وہ خرچ کر دیتا ہے۔ والدین زندہ ہیں۔ دوسروں پر یہ انہیں بھیج دیتا ہوں۔ اور تقریباً پچاس روپیہ ماہوار گھوڑے کا خرچ ہے۔ تقریباً تین ہزار روپے کا خرچ تبا دیا اور ساندھی کہہ دیا "قبلہ! تنخواہ تقریباً دو سو روپیہ ہے۔"

مولوی صاحب نے فرمایا۔ "ماشا اللہ۔ اللہ فضل کرے گا۔ بس اس سے لوگوں کو بہت ہو گئی کہ وہ اس تخت و تاج اور آمدنی کو اللہ کا فضل کہنے لگے۔ حالانکہ ایک چرک کی ترقی یافتہ شکل کو ملکیت کہتے ہیں۔"

سامعین! ایک حقیقی واقعہ سماعت فرمائیے گا۔ جب کابل کا امان اللہ امیر تھا۔ وہ اعلیٰ حضرت تھا۔ یورپ گیا۔ بیوی (شریا) ساتھ تھی۔ وہاں جا کے وہ اڑنے لگی تو پڑکھنے ہو گئی۔ ناراض البال ہو کے۔ واپس آئی تو بچہ ستہ شور مچا کہ ایک دن کے لئے تخت کابل پر

میٹھا جب وہ شور مچا رہا تھا تو زمیندار اخبار کے ایڈیٹر مولانا طغیانی خان نے *Times of India* پر ایک نظم لکھی تھی کہ جس میں اس کی بے پناہ برائیاں کہیں۔ نظم کا ایک مصرعہ ملاحظہ ہو۔
خدا کی شان ہے ستے کا بچہ مقابل ہے محمد زایوں سے

اگلے دن جب یہ خبر آئی کہ وہ بادشاہ ہو گیا تو اسی زمیندار اخبار کے (TITLE PAGE) پر بچہ ستے کی شان نہ تصور برہتی اور اس کے نیچے لکھا ہوا تھا: "اعلیٰ حضرت حضور پرنورؐ گویا بچے ستے کو حضور پرنورؐ وہ کہہ رہے تھے جو رسولؐ کے نور ہونے کے قابل نہیں تھے۔ بہر نوع وہ حضور پرنورؐ ہو گیا۔ اُس کے بعد جنرل نادر آیا۔ اُس نے بچے ستے کو باہر نکال کیا۔ اب یہ ادارہ لکھا گیا: "اچھا ہوا ایک بد معاش کو قتل کر دیا گیا۔ اب جنرل نادر اعلیٰ حضرت بنا دیئے گئے اقبال نے بھی ایک قصیدہ جنرل نادر کی شان میں لکھ کر بھیج دیا۔ چونکہ نادر امان اللہ کا کزن تھا لہذا اسی کی طرف سے "بچے ستے کے خلاف لڑا۔ نفع ہوئی تو خود تخت پر بیٹھ گیا۔ ادھر اقبال نے قصیدہ مدح میں لکھ دیا۔ سارا قصیدہ تو مجھے یاد نہیں ہے۔ ایک شعر سناتا ہوں (بچو! ترجمہ تم خود کرنا)۔

قتل کردی کافرِ زندین را (تو نے کافرِ زندین) بچے ستے کو قتل کر دیا۔
زندہ کردی سنتِ صدیق را (تو نے سنتِ صدیق زندہ کر دی۔

ہم بھی بہت خوش ہوئے کہ جنرل نادر نے سنتِ صدیق زندہ کر دی پھر یہ تشریف ہوئی کہ سنتِ صدیق کس طرح زندہ کی گئی۔ رات بھر سوچا۔ دن چڑھے سہجائی کی جنرل نادر امان اللہ کا نوکر تھا۔ اس کی طرف سے لڑا اور نفع ہونے پر خود تخت پر بیٹھ گیا۔ گویا مالک کے تخت پر بیٹھا سنتِ صدیق ہے۔ بہر نوع جو چرک پڑا نہ جلے وہ اعلیٰ حضرت بھی بنے علیٰ سبائی بھی ہے اور حضور پرنورؐ بھی ہے۔ اگر عقل کے مطابق عمل ہو تو شجاعت کہلاتی ہے ورنہ وہ چوری ہے۔ اور چوری کی ترقی یافتہ شکل کو ملکیت کہتے ہیں۔

عزیز سامعین! میں یہاں اپنے بیان کو ختم کرتا ہوں کہ نوجوان بچے مجھ سے فرمائش کرتے ہیں

• زیدی صاحب! خیر ساؤ۔ خندق ساؤ!

میں کہتا ہوں ”بچو! تہار گرم خون ہے۔ لڑائی میں تمہیں لطف آتا ہے۔ مگر میں بڑھا آدمی ہوں مجھ سے خندق وغیراب بیان نہیں ہو سکتا۔ چونکہ خیر اور سفید دالڑھی کا آپس میں کوئی جڑ ہی نہیں ہے۔ لہذا عزت اسی میں ہے کہ خاموش بیٹھا رہوں۔ اگر میں تمہارے کہنے پر خیر شروع بھی کر بیٹھوں تو بیچ میں سے چھوڑ کر آنا پڑے گا۔ پھر کیا فائدہ۔ بچو! تم ہی میرا مذاق اڑاؤ گے؟“ بابا! جب چھوڑ کر آ ہی جانا تھا تو گلیا ہی کیوں تھا۔“ بہر زوع خیر کی جنگ ہو یا خندق کی، اُحد کی لڑائی ہو یا بدر کی۔ اگر عقل کے مطابق تلوار چل رہی ہے تو شجاعت ہے ورنہ بیکار ہے۔

اب بتاؤ! جن علیؑ کو رسولؐ ”اسعد اللہ“ کہتا ہوں۔ جسے محمدؐ ”ید اللہ“ کہتا ہوں اس کا کوئی عمل انسانی عقل سے ادھر ادھر تھا؟ ہرگز نہیں۔“ مومن بھائیو! تمہارے سینے فخر سے تن نہیں جاتے جب تمہارے سامنے کوئی کہتا ہے۔ ”علیؑ وہ ہے جس نے خیر فوج کیا۔ علیؑ وہ ہے جس نے خندق فوج کیا۔“ ہمیں غرور پیدا ہوتا ہے۔ جب کوئی ہمیں شیعانِ علیؑ کہتا ہے۔ گریا علیؑ ہمارے غرور کا سامان ہے۔ خدا گواہ ہے۔ ہمارا جی چاہتا ہے دنیا کو کوئی شے نہ نکھیں۔ تختِ جہم کو ٹھوکر اڑیں۔ جب ہم یا علیؑ کہتے ہیں اُس وقت ہمارا سرور ہی کچھ اور ہوتا ہے، ہماری شان ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ علیؑ وہ ہے جس نے خیر کی پڑلیں ہلا دیں۔ علیؑ وہ ہے جس نے خندق کی گرداڑ اڑی۔ اتنا بہادر انسان اتنا شجاع انسان، بتاؤ! جنمِ فلک نے علیؑ جیسا انسان دیکھا ہے؟۔ ”ہرگز نہیں“

سامعین! میں تم سے نہیں پوچھتا۔ علیؑ سے پوچھتا ہوں۔ یا علیؑ!

میرا ایمان ہے کہ آپ سے زیادہ بہادر انسان دنیا میں آج تک پیدا نہیں ہوا۔ آپ سے زیادہ شجاع انسان جنمِ فلک نے آج تک نہیں دیکھا۔ ”یا علیؑ“ کہنے کو میں اسمِ اعظم سمجھتا ہوں۔ مگر میرے مولا! میں آپ ہی سے پوچھتا ہوں کہ خیر کا فوج کرنا ایک طرف۔ خندق کا فوج کرنا ایک طرف۔ بسترِ نبیؐ پر بے خطر سو جانا ایک طرف۔ ان سب شجاعتوں کو ایک پلے میں رکھو اور دوسرے پلے میں تین دن کی پیاس میں گرمی کے موسم میں دریا میں جا کر پیاسہ نکل آنا۔ اس

کی مثال پوری کائنات کی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ مگر ایک بہادر دنیا میں ایسا بھی گزرا ہے جس نے تین دن کی بھوک پیاس کے باوجود دریا میں جا کے پانی نہ پیا۔ اتنا قابل جرنیل جس نے بہتر کرنا کھوں سے لڑا دیا۔ اتنا قابل سپاہی جس کیلئے کے اوپر پورے کونہ کا ڈھارس تھا۔

فری محرم کا دلی۔ عصر کا وقت اور امام نماز سے ناراض ہو کر مصلے پر سر جھکا لئے بیٹھے ہیں۔ عالم حریت ہے کہ اچانک بے حیا فوج نے حملہ کر دیا۔ یہاں تک کہ گھوڑوں کے ٹاپوں کی گرد سیدانیوں کے خیموں میں آنے لگی۔ سیدانیاں "ناوعلی" دم کر کے بچوں کو لے کر خیموں میں دم بخود کھڑی ہیں۔ جب بدہ کافی قریب آگئے تو حینی سرکار کے کاہن اور انجیٹ نے عرض کی۔

مولانا!

مولانا نے نظر اٹھائی۔ "بھائی عباس کیا بات ہے؟"

آقا! فوج سیدانیوں کے خیموں کی طرف بڑھی چلی آ رہی ہے۔ میرے سپاہی تیار کھڑے ہیں ہمارے لئے کیا حکم ہے؟ عباس اسنی انتظار میں ہیں کہ مولانا فرمائیں گے۔ "روک دو" مگر مولانا نے حکم دیا۔ عباس بھائی! میں حکم دیتا ہوں۔ تم خود اس فوج کے سامنے جاؤ اور ان سے کہہ دو۔ میرا امام ایک رات کی مہلت چاہتا ہے۔ اب جو حینی نے یہ فرمایا تو عباس نے گھبرا کر پوچھا۔ "مولانا! اب ان سے مہلت مانگوں؟"

"ہاں میں تمہیں حکم دیتا ہوں۔ تم خود جا کے ان سے مہلت مانگو۔"

عباس نے سر جھکا دیا۔ نیام سے تلوار نکال کے کھڑی گھوڑے پر سوار ہوا۔ سر جھکا ہوا۔ مہلت مانگنے جا رہا ہے۔ ابھی چند قدم چلے ہی ہوں گے کہ امام نے فرمایا! حبیب! ازبیر کو ساتھ لے کر احتیاطاً تم بھی چلے جاؤ۔ ہو سکتا ہے کسی بات پر میرے بھائی کو غصہ آجائے۔ چنانچہ دونوں بزرگ بھائی بھی ساتھ ہوئے۔ دائیں طرف حبیب۔ بائیں طرف ازبیر تین اور درمیان میں اپنے وقت کا حیدر کرار۔ فوج کے سامنے پہنچ کر گھوڑا روک کر فرمایا۔ "چچا حبیب! مہلت والی بات تم ہی کہہ دو۔ مجھ سے کہا نہیں جاتا۔"

شہزادے! مولائے آپ کو حکم دیا ہے :

عباسؑ آگے بڑے۔ سر جھکا ہوا۔ بدن پینٹہ میں تر۔ دل دھڑک رہا ہے۔ بدن کانپ رہا ہے۔ ہونٹ لرز رہے ہیں۔ بھرائی آوازیں فرمایا۔ ”عمر سعد! میرے امامؑ نے ایک رات کی مہلت ۔۔۔۔۔۔“ بس اتنا ہی فقرہ کہا۔ مانگنے کا لفظ نہیں بولا۔ بہر نوع اُس فرج نے مشورہ کیا اور مہلت ہو گئی۔ والیں لوٹے۔ بیچ میں قمر بنی ہاشمؑ اور داہنے بائیں حبیبؑ زبیرؑ تھوڑی دور چلے تھے کہ دونوں بڑھے آپس میں باقی کرنے لگے۔ حبیبؑ نے زبیرؑ سے کہا۔

”زبیرؑ! تمہیں یاد ہے۔ جب اس نوجوان کی ماں سے علیؑ نے عقد کیا تھا؟“

زبیرؑ نے جواب دیا ”ہاں حبیبؑ“

حبیبؑ نے کہا زبیرؑ! عقد کے بعد علیؑ نے کہا تھا کہ اس خاتون کے بطن سے جو بیٹا پیدا ہوگا وہ میری بہادری کا وارث ہوگا۔“

زبیرؑ نے کہا ”ہاں۔ مجھے یاد ہے۔“

دونوں مذہبوں نے جو یہ بات کہی تو وقت کے حیدرؑ کو آرنے ایک انگڑائی جولی تو گھوڑے کی رکابیں ٹوٹنے لگیں اور گھوڑا رک کے فرماتے ہیں۔

”حبیبؑ! زبیرؑ! یہ فقرہ سنا کے مجھے بہادری کا جوش نہ دلاؤ۔ میں ٹھہرا ہوں۔ تم دونوں مولائے کے پاس جاؤ اور مجھے لڑنے کی اجازت دلا دو۔ اگر صبح سے پہلے کونے کے دارالامارے پر حبیبؑ کا جھنڈا نہ لہراؤں تو علیؑ کا بیٹا نہ کہنا۔“

عباسؑ نے یہ فقرہ جو پڑے جوش میں کہا تو امامؑ نے سُن لیا۔ وہیں سے آواز دی کہ کس نے میرے شیر کو غصہ دلا دیا۔ عباسؑ بھائی آؤ۔ میں انتظار کر رہا ہوں۔ امامؑ نے بھائی کے گلے میں اپنی باہیں ڈال دیں۔ سینے سے لگایا۔ پیشانی چومی۔

میرے پیارے بھائی۔ کیا بات ہوئی؟ مولائے کوئی بات نہیں تیرا تابع فرمان ہوں۔ جو تو حکم دے گا تعمیل ہوگی۔“

سامعین! میں اپنے بیان کرانِ افکار پر اگر ختم کرتا ہوں کہ جب دونوں بھائی بیت الشرف میں تشریف لائے تو زینب نے پوچھ لیا۔
 ”عباسؑ بھائی! کیا فیصلہ ہوا۔“

عباسؑ تو چپ رہے۔ حسینؑ نے کہا ”کل تک کی مہلت —“
 زینبؑ نے رات کو گھر کی تمام عورتوں کی کانفرنس بلا لی۔ جب تمام عورتیں آپس میں آجس کی توبیہ لی
 اُن سے کہتی ہے۔

”بی بیو! مجھے جانتی ہو۔ میں ملٹی کی بیٹی ہوں۔ میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ تمہاری چادر کی
 میں خاص ہوں۔“

عورتوں نے کہا۔ ”بی بی! تیرے وعدے کے بعد ہم بے فکر ہیں۔“ بات ختم ہوئی۔ رات ڈھل گئی
 صبح عاشور ہوئی۔ دہرہ ڈھلوا۔ حسینؑ جب علم لے کر خالی آئے تو وہی زینبؑ عورتوں سے کہہ رہی تھی۔
 ”بی بیو! میں نے رات جو تم سے وعدہ کیا تھا۔ اب میں اپنے الفاظ واپس لیتی ہوں۔ جس بھرے
 پہ کہا تھا وہ ختم ہو گیا۔ میرا بھائی عباسؑ مارا گیا۔“

سامعین! فلسفہ اخلاق کی اصطلاح میں عقل کی اس نقل و حرکت کو شجاعت کہتے ہیں۔ تین
 دن کی محسوس پیا س کے باوجود دریا میں جا کے پیاسہ کل آنا وہ عمل ہے جسے آج تک
 چشمِ نمک نے کہیں نہیں دیکھا۔ مگر اللہ کے چنے ہوئے بندوں نے کر بلا میں عملاً کر دکھایا جس پر
 قدرت نے بڑھکر ان بندوں کا چرم لیا اور فرمایا۔

”اے نفسِ مطمئنہ!“

دنیا نے تمہاری شجاعت دیکھ لی ہے۔ تم نے وہی کر دکھایا جو اللہ چاہتا تھا۔“

اللہ سے ڈرو

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

خداوند جل جلالہ و عزہ! اسمہ کی حمد و ثنا کے بعد حضرات محمد و آل محمد پر درود و سلام! حضرات گرامی قدر! اللہ کا یہ فرمان ہے۔ "قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ"

اے رسول! میرے ان بندوں سے کہہ دو، ان تک یہ پیغام میرا پہنچا دو کہ اگر تمہیں خدا سے پیار ہے، اگر تمہیں خدا سے محبت ہے۔۔۔۔۔ ماشاء اللہ! جمع تو کافی ہے اتنے بڑے جمع سے میں پوچھ رہا ہوں۔ "آپ کو خدا سے محبت ہے۔ کیوں بھی خدا سے محبت ہے"۔۔۔۔۔

بات یہ ہے حضور! مجھے پتہ ہے کہ آپ اس محبت کے جواب میں سچ کیا کیوں گئے۔ آپ نے "ہاں کیوں نہیں کہا ایک دم۔ اس لئے شاید آپ نے ہاں نہیں کہا کہ ساری عمر گزر گئی آپ کی۔ اور میری بھی۔ علمائے کرام کی زبانی یہ سنتے ہوئے کہ "اے ایسا مذاور۔ اللہ سے ڈرو" اور اتنا ڈرایا ہے اللہ سے ہمیں ان اللہ والوں نے کہ "محبت" میں ہاں کہتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں۔۔۔۔۔ جو آدمی اٹھتا ہے یہی کہتا ہے "اللہ سے ڈرو" اور کوئی ان کو راسلے والوں سے یہ نہیں کہتا کہ "تم بھی اللہ سے ڈرو" کیوں اللہ کے بندوں کو اللہ سے ڈراتے ہو۔۔۔۔۔ مگر ہر ایک یہی کہہ رہا ہے۔ "اللہ سے ڈرو" اور اتنا ڈرایا ہے اللہ سے ہمیں ان اللہ والوں نے کہ "میرے دوستوں کا تو میں کچھ کہتا نہیں۔ آج کی جوان نوجوانی ڈر گئی ہے کہ جہاں کہیں اللہ کا نام ہو وہاں نہیں جاتے۔ جہاں اللہ کا ذکر ہو۔ وہاں نہیں جاتے۔۔۔۔۔ اگر جارہے ہوں اور سامنے مسجد آجائے تو فوراً راستہ

کاٹ کے گزریں گے۔ ڈر کے مارے کہ نہ وہی صاحب جو کہتے ہیں کہ اللہ سے ڈرو۔ وہ مجھے سمجھ نہیں آتی کہ اللہ کوئی ظالم شے ہے جو اس سے ڈرو۔ وہ کوئی ڈراؤنی شے ہے جو اس سے ڈرو۔ وہ کوئی مستاتا ہے جو اس سے ڈرو۔ وہ کوئی تکلیف پہنچاتا ہے جو اس سے ڈرو۔ مگر کہتا ہر ایک یہی ہے کہ اللہ سے ڈرو۔ اور ڈراؤں کے اللہ سے آج ہمارے دل اتنے کمزور کر دیئے ہیں۔ کہ ہم سچ بچ اللہ سے ڈرنے لگے۔

آج میں آپ سے ایک بات کہتا ہوں۔ اللہ جانے میری یہ بات کسی کو پسند آئے گی یا نہیں۔ میں اپنی ذمہ داری سے کہہ رہا ہوں۔ کہ "اللہ سے مت ڈرو" اللہ کوئی ڈرنے کی شے ہے۔ اللہ تو محبوب ہے۔ اللہ تو بڑی پیاری شے ہے۔ اللہ تو بہت ہی محبت کرنے کے قابل شے ہے۔ اللہ سے تو پیار کرنے کو دل چاہتا ہے۔ وہ ہم سے ہم پر زیادہ مہربان ہے۔ اُسے ہم سے اتنا پیار ہے۔ کہ ہماری ضرورت کی چیزیں جو ہم سے پہلے ہتیا کر دے۔ ہم دُنیا میں آئے نہیں تھے۔ ہمیں سانس کی ضرورت تھی، ہوا پہلے پیدا کر دی۔ ہمیں بسنے کی ضرورت تھی۔ زمین پہلے پیدا کر دی۔ جس نے ماں باپ جیسے مہربان ہمیں دیئے جس نے پرورش کے سارے سامان ہتیا کئے۔ جو دُنیا میں ہماری حفاظت کرتا ہے۔ جو چوبیس گھنٹے ہمارے ساتھ لگاؤ رکھتا ہے۔ ہم سوتے ہیں۔ وہ کبھی سوتا نہیں۔ ہم بھڑک جاتے ہیں۔ وہ کبھی بھڑکتا نہیں۔ ہم اُسے پکارتے ہیں۔ وہ فوراً ہمیں جواب دیتا ہے۔ وہ ہم سے بات کرتا ہے۔ وہ ہماری دعاؤں سنتا ہے۔ ہماری انتہائیں سنتا ہے۔ ایسا پیارا اور محبوب اللہ۔ ایسے پیارے اللہ سے ڈرو کہوں۔ اُس سے پیار کرو۔ اُس سے محبت کرو۔ اُس سے الفت کرو۔ اور یہ جو تمہیں بتا جاتا ہے۔ "اللہ سے ڈرو" اس کے معنی یہ ہیں جو کہ وہ محبوب ہے چنانچہ اُس سے محبت ہے۔ اور اس بات سے کہ وہ محبوب کہیں روٹے نہ جائے۔ اور اگر تمہیں یہ اندیشہ

ہو جائے گا۔ کہ وہ رد ٹھک گیا ہے تو اس کو ٹھٹھے ہوئے کو منانے کا طریقہ یہ ہے۔ ”وَكُونُوا مَعَ
الْمُضِلِّينَ“ بچوں کا ساتھ دو، وہ راضی ہو جائے گا۔

بہر نوح اللہ کو ہم سے محبت ہے۔ اور اللہ فرماتا ہے۔ ”رسول! ان سے کہہ دو۔ اگر تمہیں
مجھ سے محبت ہے۔ تم مجھے چاہتے ہو۔ تمہیں مجھ سے پیار ہے۔ تو تم ایسا کرو۔ کہ محبت ہے تمہیں۔
اللہ سے اور پیروی کرو تم رسول کی۔ اتباع کرو تم رسول کا۔ حکم مانو تم رسول کا تو مجھ کو اللہ“
مجتہد اس کا یہ ہو گا۔ کہ ”اللہ کہ بھی تم سے پیار ہو گا۔ اللہ کو بھی تم سے محبت ہو جائے گی جس طرح
تمہیں اللہ سے محبت ہے اُس طرح اللہ کو بھی تم سے محبت ہو جائے گی۔

میرے سامعین! اب آپ ہی بتائیں کہ ہم اللہ سے محبت کریں۔ یہ مرتبہ زیادہ ہے۔ یا اللہ
ہم سے محبت کرے یہ مرتبہ زیادہ ہے۔ —————؟ بہر نوح اللہ فرماتا ہے کہ تم رسول کی پیروی کرو۔
اللہ تم سے محبت کرے گا۔ خداوند عالم تم سے پیار کرے گا۔

ہمارا سب کا دل چاہتا ہے کہ ہم اللہ کے قریب ہو جائیں۔ چونکہ اللہ سے
محبت ہے۔ صبح سو کے اٹھتے ہیں۔ نیند آنکھوں میں بھری ہوتی ہے۔ اور
اُسی نیند کے عالم میں با وضو ہو کر اللہ کے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں اور
کہتے ہیں۔ ”قُوْبَةُ اِلٰی اللّٰہ“ اس لئے سامنے کھڑا ہوں کہ اللہ سے
قریب حاصل ہو جائے۔ اس سے ہمیں محبت ہے۔ اس کے ہم قریب ہو
جائیں۔ اور لطف یہ آتا ہے۔

نمازی بھائیو!

ہم رات کو سوئے۔ صبح کو اٹھے۔ آنکھ میں نیند بھری ہوئی ہے۔ اٹھ کے وضو
کیا۔ اب جی چاہتا ہے کہ اللہ سے بات کریں۔ چونکہ اُس سے ہمیں محبت ہے۔ اور ہمیں بتایا گیا ہے۔
کہ ہر طرف اللہ ہے۔ کائنات میں جہدھر رخ اٹھا کے دیکھو اللہ ہے۔ ہر طرف اللہ ہے۔ شمال میں
بھی اللہ ہے، جنوب میں بھی اللہ ہے، مشرق میں بھی اللہ ہے۔ مغرب میں بھی اللہ ہے، چاروں
Presented By: www.jafrilibrary.com

ظرف اللہ ہے، پھر جہد چاہو نماز پڑھ لو۔ لیکن اللہ کتنا ہے ”نہیں“ اگر تمہیں ہم سے پیار سے تو رسول کی پیروی کرو۔ جب تک رسول کی پیروی نہیں کرو گے میں تم سے بات تک نہیں کرنا۔ لہذا جب چار میں سے ایک کو قبلہ نہیں بناؤ گے میں نماز نہیں قبول کروں گا۔ میرے رسول کو کچھ وہ کس طرح نماز پڑھتا ہے۔ وہ کس ظرف رُخ کر کے نماز پڑھتا ہے۔ اگر تم بھی اسی طرح نماز پڑھو گے تو اللہ کا قرب حاصل ہو جائے گا۔ تم اللہ کے قریب ہو جاؤ گے۔

اب ہم نے نماز پڑھنا شروع کر دی۔ اللہ کے قریب ہو گئے۔ (۲۱) ادا سے اللہ نے ہم سے گفتگو کی ہے۔ اس پیار سے اللہ نے ہم سے بات کی ہے کہ ہمیں بھی نطفہ آگیا۔ اور اللہ کو تو یہ کچھ کہہ نہیں سکتا۔

ہم نے جا کے اللہ سے کہا کیا؟ ہم کھڑے ہو گئے جا کے اللہ کے سامنے کیوں کہ ہم اللہ کے سامنے کھڑے ہیں۔ شہنشاہوں کے شہنشاہ کے سامنے کھڑے ہیں۔ ایسے عالم میں جب اتنی بڑی جہت سے بات کرنا ہو۔ تو بات کرتے ہوئے ادھر ادھر دیکھنا بڑی گستاخی ہے بڑی بے ادبی ہے۔ ادب سے۔ آرام سے کھڑے رہو۔ نظر ادھر ادھر نہ ہونے پائے۔ پھر دونوں ہاتھ اٹھاؤ۔ کانوں تک لے جاؤ اور کہو ————— ”اللہ اکبر“ یا اللہ تجھ سے بڑا کوئی نہیں مگر یہ بات کہنا ہاتھ اٹھا کے۔ یعنی اللہ سے یہ اقرار کرنا کہ ”اب ہم تیرے سامنے کھڑے ہیں، ہم نے دنیا کی ہر شے سے ہاتھ اٹھا لیا ہے۔ اب دنیا کی کسی چیز سے ہمارا واسطہ نہیں رہا۔“

اللہ نے کہا ”لو لو ————— کیا کہنا چاہتے ہو“ تو ہم نے کہا۔

ہے۔ تو یومِ اربعہ کا ایک ہے۔ تو میرے ہر طرف مستقیم پر قائم رکھو۔
اللہ نے کہا ”سبحان اللہ! ایسی اچھی بات کہہ رہے تم نے۔ یہ باتوں
تو نے کہاں سے سیکھ لیں؟“

ہم نے کہا۔ حضور! ہم نے ایک کتاب میں پڑھی تھیں۔ ”اللہ نے
کہا“ اس کتاب کی کوئی اور بات بھی تو ہیں یا ہے؟ ہم نے بسم اللہ
پڑھ کے ایک سورۃ اور پڑھ دی۔

سورۃ پڑھ دی۔ تو اللہ کی عظمت دل میں پیدا ہوئی۔ فوراً سر جھکا کر
کہا ”سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيمِ“ تو کتنا عظیم ہے جو مجھ جیسے
حقیر کی سنتا ہے۔ اب تو سر جھکا کر سر اٹھایا۔ تو اللہ نے فوراً اپنی
گفتگو کی، رسید دے دی ”سُبْحَانَ اللَّهِ وَلِيَّ حَمْدِهِ“ اے اللہ نے
بندے جو تو نے حمد کی۔ پھر ہم نے اس شکر یہ کیا کہ اس
نے ہم جیسے حقیروں کی بات سُن لی۔ سجدے میں سر رکھ دیا۔
”سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيمِ“ تو کتنا عظیم ہے۔ کہ مجھ جیسے ادنیٰ کی بھی سُن لی
سجدہ کیا۔

اب اللہ نے پیار سے کہا ”بندے! تو میرے سامنے کھڑا بھی رہا۔ سر
بھی جھکایا۔ تو نے سجدہ بھی کیا۔ خشک کیا ہو گا۔ بیٹھ جا۔“
چنانچہ ہم سجدہ کر کے بیٹھ گئے۔ اور ہم نے سوچا کہ ”اس نے بیٹھنے
کا موقع دیا ہے۔ اتنا مہربان ہے۔ اس وقت
کو مناسب نہ کرو۔ اب بھی کچھ مانگ لو۔“

اب ہم نے بیٹھ کے مانگا کیا؟ نزاولاد مانگی۔ نرزوق مانگا۔ نزلولت
مانگی۔ نزول مانگا۔ پھر کیا مانگا؟ ”اسْتَغْفِرُ اللَّهَ رَبِّي وَأَتُوبُ إِلَيْهِ“

خداوند! اٹھایا ہے تو گناہ بھی معاف کر دے، گنہگار ہو کے
بیٹھنا اچھا نہیں معلوم نہیں ہوتا، اور اس استغفار کے شکر لیے
میں ایک سجدہ اور کر لیا۔ ”خداوند! ایک سجدہ اور کرتا ہوں“

پھر اٹھ کے کھڑے ہو گئے

یہی ہے گفتگو جو نمازی اللہ سے کرتا ہے۔ پھر اللہ سے پیار
محبت کی باتیں ہونے لگیں۔ پھر سر جھکا کے اُسے عظیم کہا۔
پھر اس نے رسید دی۔ سمع اللہ کہہ کے۔ پھر ہم نے سجدے
میں سر رکھ کے ”سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلَى“ کہا۔ جب دو سجدے کر
لئے خدا کے سامنے تو اللہ نے کہا: ”بندے تو نے مجھ سے
باتیں کی ہیں، تو نے مجھ سے گفتگو کی ہے۔ تیرا میرے ساتھ
پیار ہوا ہے۔ مگر یہ بتا۔ کسی فرنی، خیالی دہمی اللہ کی تو تو نے
عبادت نہیں کی۔“

اب ہم نے دوسری رات کے دو سجدے ادا کر کے بیٹھ کے اللہ سے
گفتگو کی۔

میرے اللہ! میں نے کسی نفل اللہ بات نہیں کی،
”پھر کس سے کی؟“ اللہ نے پوچھا

میں نے فوراً کہہ دیا ”أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ“
میں نے اس اللہ سے بات کی ہے جو لا الہ الا اللہ ہے۔ جو وحدہ لا شریک ہے
اللہ نے کہا۔ شاباش! تجھے کیسے پتہ چلا کہ میں لا الہ الا اللہ ہوں؟ تجھے کیسے پتہ
چلا کہ میں واحد لا شریک ہوں؟ میں نے عرض کی کہ مجھے تو خاک بھی پتہ نہیں تھا
مجھے تو یہ بات ایک بندے نے بتائی ہے۔

اللہ نے پوچھا ”کون بندہ؟“

یہ، نے فوراً کہہ دیا "اَشْهَدُ اَنْ مُحَمَّدًا عَبْدُكَ وَرَسُولُكَ"
 "مجھے تو یہ بات محمدؐ نے بتائی ہے۔ جو تیرا عبد بھی تھا اور رسول بھی تھا۔"
 اللہ نے پوچھا "محمدؐ کو دیکھا ہے۔"
 میں نے کہا نہیں۔

پھر تجھے کیا خبر کہ محمدؐ نے بتائی ہے۔"

میں نے عرض کیا "میرے پاسنے والے۔ محمدؐ کی بتائی ہوئی یہ بات مجھ تک
 کچھ لوگوں نے پہنچائی ہے۔"

تو اللہ نے کہا "اِنَّ كُنَا مَ بَہی تَوَے جَنہو ا نے یہ بات تجھ تک پہنچائی ہے۔"
 میں نے فوراً کہا "اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَآلِ مُحَمَّدٍ"
 اب جو کہہ تو اللہ کے بات ہو گئی۔ قرب ہو گیا، پیار ہو گیا۔

میرے محترم سامعین! تم کا بھی یہی چاہتا اللہ سے پیار کرنے کو کس کا
 نہیں چاہتا بڑی جہت سے پیار کرنے کو۔ اگر گورنمنٹ ہاؤس جا کے
 گورنر سے بات کر آئے تو چار دن گھر والوں سے بات نہیں کرتے۔ اور اگر
 صدر سے کوہیں، آئے۔ تو جتنی دالے سے بات نہیں کرتے۔

مگر یہ اللہ کا پیار ہے کہ وہ روزانہ پانچ مرتبہ بلاتا ہے "اَللّٰہُ اَکْبَرُ"
 مجھ سے بات کر دو۔" اور مجھ سے گفتگو کر دو۔" کوئی چپڑا ہی نہیں
 نہیں رو کے گا۔ کوئی زبان تمہیں نہیں رو کے گا۔ کوئی نقیب
 تمہیں نہیں رو کے گا۔ کوئی زبان تم سے رشوت نہیں لے گا۔
 اور سنتے بھی ہو، اگر میرے گھر آنے کی تمہیں فرصت نہیں، تم مجھے
 اپنے گھر پا رو۔ میں آؤں گا۔ تم میرے ساتھ بات کر دو۔ میرے ساتھ
 گفتگو کر دو۔ اور پھر دیکھو ایسے محو ہو جانا مجھ سے بات کرنے میں کہ
 "اَللّٰہُ اَکْبَرُ" کوئی سے یاد نہ رہے۔ میں ہوں اور تم ہو۔

۳۱) ادا سے بات کرنا کہ بس میں ہوں۔ یا تم ہو۔ یہاں تک کہ میرے
ساتھ بات کرتے وقت اگر تمہارے پیر میں لگا ہوا تیر بھی کھینچ لیا
جائے۔ تو تمہیں پتہ نہ چلے (۳۱) سے میں سمجھوں گا کہ تم مجھ سے گفتگو
کرو رہے ہو۔

خداوند! یہ تیر "وہاں بات تو ہم نے سُن لی۔ مگر جس کے پیر سے تیر کھینچا تھا۔ اور
اسے پتہ نہیں چلا تھا۔ اس کی یہ بات بھی تو ہم نے سُن لی ہے کہ وہ نماز پڑھ رہا تھا۔ اور نماز
کے عالم میں سائل نے آواز دی۔ اور سائل کی آواز سن۔ اور اٹھ کر آگے بڑھ کر دے رہا۔
یا تو اتنی بے خبری۔ نماز میں اتنی محویت کہ تیر کھینچ گیا اور پتہ نہ چلا۔ یا سائل کی آواز بھی سن۔ اور
اللہ نے کہا تو کیوں؟ تم کس بات کو غور سے نہیں سنتے۔ اس نے اعتراض
کرتے ہو۔ کوئی کہتا ہے کہ اس نے سائل کی بات سُن لی تھی۔ بتیں کس
نے بہکا دیا۔ کہ اُس نے سائل کی گفتگو سُن لی تھی۔ تم نے اچھی طرح سے
سارا قصہ پڑھا نہیں۔ تم نے۔ مارے فتنے پر غور نہیں کیا۔ بات
یہ ہے۔ نماز ہو رہی تھی۔ سائل مسجد کے دروازے پہ آکر کھڑا ہوا۔ اس
نے نمازیوں سے خبرت مانگی۔ وہ مانگتا رہا۔ کسی نے نہ دی۔ (۳۱)
لئے کہ جواز کو نہ دینے والا تھا۔ وہ سُن ہی نہیں رہا تھا سائل کی گفتگو۔
وہ نماز میں مشغول تھا۔ وہ اللہ کے سامنے کھڑا تھا۔ جب
سائل کو کچھ نہ ملا۔ تو اس نے دعا کے لئے اٹھ اٹھا کے کہا "یا اللہ
میں تیر سے رسول کی مسجد سے محروم جا رہا ہوں۔" جب تک سائل
مسجد والوں سے مانگتا رہا۔ (۳۱) نے کچھ نہ سنا۔ اور جب اللہ سے دعا
کی۔ اور جو اللہ کے ساتھ پہنچا ہوا تھا (۳۱) نے سُن لی۔ اور اگر آپ میری
زبان میں سننا چاہیں تو یوں سمجھو۔ جب سائل نے اللہ سے دعا کی تو اللہ
نے کہا مجھے نماز میں مشغول ہیں۔ اللہ کی بات ہے۔ اور اگر آپ میری

ہے تو اللہ کے ہاتھ سے ہے، اللہ نے اپنے ہاتھ سے زکوٰۃ دے دی۔ مہر نوریہ اللہ سکھ پیار کی باتیں ہیں۔ اللہ سے محبت کی باتیں ہیں۔ ہوا اللہ سے پیار کرے اللہ اسے محبوب بنا لیتا ہے۔ اللہ اُسے پیار کرتا ہے مگر

میرے محترم سامعین! محبت جو ہے۔ پیار جو ہے۔ یہ بڑی مشکل منزل ہے۔ بڑی کٹھن منزل ہے چاہے نہ کسی سے ہو۔ اور شاغر نے تو کہا ہے کہ پہلی ہے عشق بشر عشق خدا مشکل ہے۔

محبوب یہ چاہتا نہیں کہ ”جب مجھ سے محبت ہو تو کوئی اور بھی دل میں آئے“ یہی اللہ چاہتا ہے کہ جب مجھ سے محبت ہے تو پھر تیرے دل میں میں رہوں گا۔ اور کوئی نہ آئے“ اور یہی ہے ناصحیت قدسی کا مفہوم! میں نہ زمینوں میں رہتا ہوں، نہ آسمانوں میں رہتا ہوں۔ میں تو اپنے چاہنے والوں کے دل میں رہتا ہوں۔“

کچھ ناصحاب! اللہ آپ لوگوں کے دل میں رہتا ہے مگر اس دل میں رہنے والی بات کو نہ رایوں بھی دل میں سوچو۔ اللہ کا گھر ہے تمہارا۔ دل میں اللہ نے اپنا گھر بنایا ہے تمہارے دل میں۔ خوب سمجھ لو اچھی طرح سے سوچو کہ اللہ نے اپنا گھر بنایا ہے تمہارے دل میں۔ اور تمہارا گھر بھی اللہ نے ایک بنایا ہے جس کا نام ہے۔ ”جنت“ جنت تمہارا گھر ہے اور تمہارا دل اللہ کا گھر ہے جنت میں تم بسو گے۔ اور تمہارے دل میں اللہ رہتا ہے۔

اب کسی نووی سے مت پوچھو ”جس جنت ملے گی یا نہیں“ کسی پر سے مت پوچھو

ہمیں جنت ملے گی یا نہیں؟“ یہ تو معاملے کی بات ہے کہ اللہ کا گھر تمہارا دارا ہے جو تمہارے پاس ہے۔ اور تمہارا گھر جنت ہے جو اللہ کے پاس ہے۔ تم اگر اللہ کے گھر میں کسی اور کو بسا دے گے۔ اللہ تمہارے گھر میں کسی اور کو بسا دے گا۔ اور اگر تم اللہ کے گھر میں اللہ کے گھر کو رکھو گے تو اللہ بھی تمہارے گھر میں تمہیں رکھے گا۔ اگر تم اللہ کے گھر کو کھڑکی سے بد اخلاقی سے اللہ کے گھر کو تباہ رکھو گے۔ تو اللہ جنت میں تنگ سامکان دے گا۔ اگر خوش اخلاقی سے فیاضی سے اللہ کے گھر کو کشادہ رکھو گے۔ تو وہاں تمہیں کشادہ سامکان ملے گا۔ اگر گناہ کر کے اللہ کے گھر میں اندھیرا کھو گے۔ تو تمہیں اللہ اندھیرا مکان دے گا۔ اگر نیکیاں کر کے اس میں چراغ روشن کر دے گے۔ تو اللہ تمہیں روشن مکان دے گا۔ جیسا کہ اللہ کے گھر کو رکھو گے۔ ویسا ہی اللہ تمہیں گھر دے گا۔

پھر نور اللہ کا گھر تمہارے پاس ہے۔ اسے تم آراستہ کر دو۔ اور اُسے آراستہ کرنے کے لئے اللہ نے بطور ماڈل ”بطور نمونہ“ اپنا ایک گھر بنایا ہے مکتہ میں ”جوہیت اللہ“ ہے۔ اس کو دیکھ دیکھ کر اُسے سجاؤ۔

فقہہ میں کہتا ہوں صاحبان! مجھ تم لینا یہاں کچھ نہ آئے۔ تو گھر جان کچھ لینا جس طرح اللہ نے اس گھر کو سجایا ہے۔ اسی طرح تم اس گھر کو سجاؤ۔ جس طرح اس گھر کو آراستہ کیا ہے۔ اسی طرح تم اس گھر کو آراستہ کر دو۔ دنیا کے ہاتھوں نے بنوائے ہوئے اس گھر سے نکال دو۔ جیسے اس نے گھر طرح دینا کئے بتائے ہوئے اس گھر سے نکال دو۔ جیسے اس نے گھر میں بیٹا دیا تھا۔ اسی طرح اُسے اس گھر میں بٹاؤ۔ بس گھر سچ گیا۔ یہی طریقہ ہے اس گھر کے سجانے کا۔ ایسا سجایا ہو گا گھر لے گا جنت میں کہ ٹکٹ آجائے گا۔ اللہ نے وہ گھر اسی لئے بنوایا تھا۔ اور بنوایا ہی ہے خلیل بندے سے تھا۔ جس سے اللہ کو پیار تھا جس سے اللہ کو محبت تھی

جسے اللہ پسند کرتا تھا۔ اور خدیل کو نکم ہوا تھا۔ کہ میرا گھر تو بنا دیا اور کھینا
اگر مزدور چاہیے۔ تو بیٹے اسمعیل کو۔ کھانا اور مددگار چاہیے۔ تو
بہرئیل کو بھیج دوں گا۔ اور نقشہ چاہیے۔ خود بنا کے بھیج دوں گا۔

ابراہیم کو خدا کا گھر بنانے کا حکم ہو گیا۔ اب خدا ہاؤس بنے گا رہم نے کیا چچی
میں گورنمنٹ ہاؤس دیکھا تھا جس میں تقریباً پانچ سو کنبے بس جائیں۔ جب ہماری
گورنمنٹ کا اتنا بڑا گورنمنٹ ہاؤس ہے تو خدا کا خدا ہاؤس کتنا بڑا ہو گا، آخر ہم نے عرض کی
”یا اللہ! کتنا بڑا گھر بنوایا ہے“

اللہ نے فرمایا ”بڑے گھر کی جگہ کیا ضرورت تھی۔ میں نے ابراہیم سے کہہ دیا تھا میرا
گورنمنٹ ہاؤس بس اتنا بڑا ہو۔ جس میں بوقت ضرورت ایک عورت بیٹھ سکے ہیں
اتنا گھر بن جائے اور ابراہیم نے وہ گھر بنا کر شروع کر دیا۔ ایک ردا لگاتے اور رو نہ ہونے
والا ردا مانگتے خداوند میں تیرا گھر بنا رہا ہوں۔

اللہ نے کہا۔ ”ہاں بھی بنا رہے ہو۔“
”میرے اللہ! میری اولاد کو یہ دینا۔ میری ذریت کو یہ دینا۔ میرے بچوں کو یہ دینا“
اور جب گھر بن کے تیار ہو تو ابراہیم نے عرض کی۔

”خداوند! معائنہ کرے گھر بنا رہے“ اور اعلیٰ حضرت نے معائنہ کیا ”ٹھیک
ہے“ بہت اچھا بنایا مگر ایک کام کر۔ طواف کرنے والوں کے لئے اس
میں اعتکاف کرنے والوں کے لئے میرے گھر کو پاک بھی کر۔ اب خدا کے گھر کو پاک
کرنے کا حکم تھا۔ بیگار میں دنیا بھر کے سقے ”پکڑے گئے ہوں گے۔ مگر وہاں ہم نے بچھا
کہ ابراہیم خدا کے گھر کو کس طرح پاک کر رہے ہیں۔ جتنے پتھر کعبے کی دیوار میں لگائے
گئے تھے۔ ایک ایک پر ہاتھ رکھا اور کہا کہ ”سبحان اللہ“ دوسرے پر ہاتھ رکھا سبحان
تبارک پر ہاتھ رکھا ”سبحان اللہ“ جب ساروں پتھروں پر سبحان اللہ کہہ دیا۔ تو اللہ نے کہا۔

تس میرا گھر پاک ہو گیا! گویا ابراہیم نے کعبے کی دیواروں کے ایک ایک پتھر پر۔
سبحان اللہ! کہہ کے تمام پتھروں کو قبیح کا دانہ بنا دیا۔ اور جب دیوار دانہ قبیح بن گئی تو اُمّ
کو خود ہی راستہ مل جائے گا۔ اُمّ کے بغیر قبیح مکمل ہو سکتی ہی نہیں۔

ہر فرقہ مومن کا دل گھر ہے اللہ کا اور مومن کا گھر جنت ہے۔ اللہ کے پاس تم اللہ
کے گھر کو پاک صاف رکھو گے تو اللہ تمہارے گھر کو پاک رکھے گا۔ اگر ایک لمحہ کے لئے بھی
ان کی توجہ خصوصی ہم سے ہٹ جائے تو ہماری بقاء فنا میں بدل جائے گی۔ ہمیں اپنی زندگی
میں اور اس زندگی کے بعد کی زندگی میں ان کی بہت ضرورت ہے۔ ہماری زندگی۔ حیات
خوشی، ہمارا غم۔ ان کے لئے ہے۔ ہم جیسے گے تو آل محمد کی مودت میں۔ اور میں گے
تو آل محمد کی مودت میں۔ آل محمد کی مودت کے بغیر ہمارا گزارا ہو سکتا ہی نہیں۔

میرے محترم سامعین! میرا بیان یہاں ختم ہوتا ہے۔ کہ عشرہ محرم الحرام کی یہ مجالس پاک
ہیں۔ آل محمد کی مودت میں۔ جو انہوں نے اللہ کے حاکم الملک ہونے کی گواہی دی۔ اور
اللہ کے حاکم الملک ہونے کی گواہی دینے کے لئے حبیب اپنے عزیزوں و جاں نثاروں کے
ساتھ کربلا میں تشریف لائے۔ ساتویں تک مقدمہ کی سماعت ہوتی رہی۔ دسویں
محرم کو گواہیاں پیش کرنی شروع کیں۔ اور جب تمام گواہیاں ختم ہو گئیں۔ تو خود
نفس نفیس آگے بڑھے۔ اور شہادت عظمیٰ کا اہم لینے کے لئے سر مبارک جھکا دیا۔
اللہ نے کہا۔ کیا چاہتے ہو؟۔ نبوت تو پہلے ختم کر چکا۔ اُمّت پہلے دے
چکا۔ رحمت تمہاری والدہ کا حصہ تھی وہ مل چکی۔ رضا تمہارے باپ
کو حاصل ہوئی۔ اب ایک شے میرے پاس باقی ہے۔ اور وہ شہادت کبریٰ
ہے۔ اور وہ تم سے لو۔ چنانچہ انعام دیا گیا۔ اور فرمایا گیا۔
”حییٰ! آج سے جتنے میرے گھر ہیں۔ اتنے ہی تیرے گھروں گے جہاں جہاں
میرا تذکرہ ہوگا۔ وہاں وہاں تیرا تذکرہ ہوگا۔“

چنانچہ نیربید کے خلاف ڈگر بھی ہوئی۔ وہ ذلیل و خوار ہوا۔ اور حضور امام حسین کا نام عالم میں روشن ہوا۔

اللہ ہمیں موت محمد و آل محمد عطا فرمائے۔ اور میں آپ سے آنحضرت کو تائبوں کے مندرجہ محترم الحرام کا آغاز ہو چکا ہے اور دس دن حضور سید الشہداء کی سواری آپ لوگوں کی جہان ٹھہرتی ہے۔ آپ ان کی جہان نوازی کرتے ہیں پورے ادب و احترام سے جہاں سماعت فرمائیں۔ یہ درس ہے ان بے کفن شہیدوں کا جو حسین کے ساتھ کربلا میں اللہ کے مالک الملک ہونے کی گواہی دینے آئے ہیں۔
بجی محمد و آل محمد رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ

جب چیز ہو ایک ————— دعویدار ہوں دو

ایک ہو ————— جھوٹا ————— ایک ہو ————— سچا

اگر

اس شے کے بگڑنے کا اندیشہ ہو جائے

تو

سحب

گھر بیٹھا جاتا ہے

اللہ گواہ ہے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

”خداوند عالم کی حمد و ثناء کے بعد حضرات محمد و آل محمد پر درود و سلام“

بزرگوار محترم!

اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں حضور محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جیسا آدمی عطا فرمایا ہے۔ — وہی ہمارے آدمی ہیں اور وہی ہمارے رسول ہیں اور ہم ان کے ادنیٰ غلام ہیں۔ — چونکہ رسول پیدا ہی رسول ہوتا ہے۔ نبی پیدا ہی نبی ہوتا ہے۔ — یہ نہیں کہ بعد میں کوئی ترقی کر کے پڑھ لکھ کے محنت و ریاضت کر کے وہ رسول یا نبی بنتا ہے۔ — نبی کو خدا پیدا ہی نبی کرتا ہے۔ — تو جب حضور پیدا ہوئے وہ اس وقت بھی نبی تھے۔ جب اس دنیا میں نہیں تھے اس وقت بھی نبی تھے۔ جب یہ دنیا نہیں تھی جب بھی نبی تھے۔ جب یہ کائنات پیدا ہی نہیں ہوئی تھی حضور اس وقت بھی نبی تھے۔ اور جب وقت بالفاظ ہی دنیا میں نہیں آیا تھا۔ جب بھی نبی تھے۔ جب کوئی وقت نہیں تھا۔ — جب بھی نبی تھے۔ اب اگر کوئی جھوٹے پوچھے ”کب نبی تھے۔“ حضور جب سے نبی تھے جب لفظ ”کب“ نہیں پیدا ہوتا تھا۔ بس وہ نبی تھے۔ اور اگر ان کی نبوت کی شہادت کسی نبی سے ہم لینا چاہیں۔ تو ہمارے اہل بیت کے باپ جناب آدمؑ یہ کہتے ہیں کہ یہ تو مجھے بھی معلوم نہیں کب سے نبی تھے۔ یہ اہل بیتؑ اور پانی میں تھا اور یہ نبی تھے۔ — تو وہ نبی بنے۔ بلکہ نبی تھے۔ — انہوں نے

”یہ شخص نہ جھوٹ بولتا ہے نہ خیانت کرتا ہے یہ صادق بھی ہے۔ اور
امین بھی ہے۔ اس کی ہر بات سچی ہے۔ اس کا ہر عمل درست ہے۔ جو یہ
کہتا ہے ”ٹھیک“ — جو یہ کہتا ہے ”ٹھیک“ — اور

یہ جانتے کو ان تھے — عرب کے زمانے والے۔ جن کی صفت تھی کسی بات کو نہ اٹانا۔ وہ جانتے تھے — وہ عرب! انہوں نے قسطنطین کی حکومت کو نہ مانا۔ اور وہ فرزند صحرا! جو اتنا آزاد تھا کہ ریت کے ٹیلوں پر بیٹھ کر حکومت کے تخت کا مذاق اڑاتا تھا۔ اور آزادی کے ساتھ عرب کی کھلی فضا میں اپنی آزادی کے پر چم لہراتا۔ کسی حکومت و سلطنت کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ کسی فوج اور رسالے کو نظر میں نہ لاتا تھا۔ وہ ان زمانے والوں کے بچ ہیں ہے۔ اور وہی زمانے والے یہ مان گئے کہ یہ صادق بھی ہے اور ایمن بھی ہے۔ اور چالیس سال میں مسلسل یہ منوانے کے بعد جب رسولؐ نے یہ اعلان فرمایا کہ ”میں رسول ہوں“ — تو بات ذرا الجھ ادر گئی

وہی لوگ جو پاس بیٹھے تھے۔ انہیں پاس نہ رہا۔ جن سے خون کا رشتہ تھا وہ سوکے پیاسے ہو گئے۔ جو گلے ملتے تھے۔ انہیں گلا پیدا ہو گیا۔ جن سے پیار تھا وہ درد رہنے لگے۔ جن کے دل نوم کی طرح نرم تھے۔ وہ سنگدل ہو کر پتھر بن گئے۔ جو بھول کی طرح کہتے تھے۔ وہ کانٹے بچھانے لگے۔ جن کے ساتھ دوستی تھی۔ وہ دشمنی کے سانچے میں آنے لگے۔ جن کے منہ مسکراتے تھے۔ وہ مڑبٹانے لگے۔ جن کی عزت بڑھادی تھی۔ وہ ذلیل کرنے کے درپے ہو گئے۔ جن کے گھر بنا دیئے تھے۔ وہ گھر سے بے گھر کرنے کو تیار ہو گئے۔ جو اپنے تھے۔ وہ بیہوش ہو گئے۔ جو ادم تھے۔

وہ ادھر چلا گئے جو یہاں تھے وہ وہاں جا بیٹھے ————— غرض
تمام کائنات اکٹھی ہو گئی۔ ایک اکیلے انسان کے مقابلے میں — دینا بھر کے دولت والے
مال والے — زر والے — خزانے والے — حکومت والے — سلطنت والے
قبیلے والے — خاندان والے — زور والے — ہمت والے۔ ادھر والے
ادھر والے ————— غرض

ایک طرف ساری خدائی — اور کئی والا ایک طرف اکیلے کا اکیلا نمائندہ —
اور اتنا بے بس نمائندہ! نہ سر پہ باپ کا سایہ، نہ آستین پر بیوی کا سایہ، نہ خاندان
کا سایہ، نہ کسی محافظ کا سایہ — حد یہ کہ نہ اپنا سایہ — اتنا بے سایہ انسان پوری
ہمت و استقلال سے میدان میں، جم کے کتا ہے "میں رسول ہوں"
مجھے اللہ نے رسول بنایا ہے — آج نہیں تو کئی تمہیں ماننا پڑھے — اگر تم
سے اپنا لکھ نہ پڑھو ادوں — تو آمنہ کا فعل نہ کہنا — تمہیں بانٹا پڑیکا — اور
یہ خدا جو تم نے بنا کے اٹھائے ہیں — یہ جو تم نے اپنے ہاتھ سے گھڑائے ہیں
— یہ تمہارے جبل و منات، — تمہارے ہاتھوں سے نہ توڑا دوں۔
تو بعد اللہ کا بیٹا نہ کہنا۔

میرے سامعین!

محمد نے دعویٰ کر دیا کہ میں رسول ہوں — بس یہ کہنا تھا کہ میں رسول
ہوں، — ایک آگ، ایک گہ، عرب میں — وہ دلیل دیتا ہے اپنے رسول ہونے
کی — مگر عرب نہیں مانتے — آخر اللہ نے یہ آیت نازل کی۔

"کانزکتے ہیں کہ تو رسول نہیں" — انہیں جواب میں یہ کہہ دت

کیوں، اسمعیل!

ایسا، سے بتانا۔۔۔ میں، جو یہاں، منبر پر بیٹھا ہوں آپ کے سامنے
اگر میں، یہ کہہ دوں کہ ”میں نہیں ہوں۔۔۔ آپ کیا کہیں گے؟“
یہ کہہ دوں گے نا۔۔۔ ”ہم نہیں مانتے“۔ تو میں پوچھوں گا۔ ”بھئی
کیوں نہیں مانتے۔۔۔“

”بس۔۔۔ ہم نہیں مانتے۔۔۔“ تو میں، کہتا ہوں جناب! میرے نبی
ہونے کی دلیل، یہ ہے۔ کہ میرے نبی ہونے کا اللہ گواہ ہے۔۔۔“
اب میں، نے اللہ کی گواہی پیش کر دی۔ اور آپ لوگوں نے ابو
ہنسی میں طمانیہ دیا، اس بات کو۔۔۔ دیکھو۔ یہ اللہ کو گواہ کرتا ہے۔ اس
اللہ کی گواہی، میں نے کوئی جانتے۔۔۔ کون پوچھے اللہ سے کہ تو گواہ
ہے یا نہیں،۔۔۔ اور نہ ہی، مانتے مجھ میں، سے کوئی اللہ کے گھر جانے
کو تیار ہے۔۔۔ اور اگر کسی کو نہ بردہ ہو، تو وہ اور چلا جاتے۔
تو وہ اے کے بتانا نہیں، کہ اللہ نے کیا کہا ہے۔ اور یہ اللہ کے
گھر جانے کا بورسنہ ہے نا۔ پورا دن (ONE WAY) ہے
قدرت کی ٹریفک کا۔ انسان آتا بھی اکیلا ہے۔۔۔
اور جاتا بھی اکیلا ہے۔ اللہ کے پاس، جانے کے بعد کوئی بتاتا
نہیں، کہ اللہ نے کیا کہا ہے۔ تو اللہ کی گواہی کس طرح ماننے
کوئی، کہ اللہ گواہ ہے۔۔۔

میرے محترم اسمعیل!

اللہ کے گواہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ

اگر دنیا میں کسی شخص کی سچائی کو ثابت کرنے کے لئے کوئی ناممکن بات ممکن ہو جائے
تو بھئی، یہ اللہ کی گواہی ہے۔ اس کا اللہ گواہ ہے۔۔۔ ویسے اللہ زبان سے آئے

کچھ نہیں کہتے۔ اگر کوئی ناممکن بات ممکن ہو جائے۔ تو یہ اللہ کی گواہی ہے۔ اور ناممکن بھی وہ جو عادتاً ناممکن ہو۔ وہ ممکن ہو جائے۔ تو یہ اللہ کی گواہی ہے۔ — اور یہ ہمارے رسولؐ کی کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اس سے پہلے بھی بے گناہ اور معصوم ہستیاں اپنی عصمت کو ثابت کرنے کے لئے ”اللہ کو گواہ“ کو قہر رہی ہیں۔ اور اللہ ناممکن کو ممکن بنا کر ان کی گواہی دیتا رہا ہے

مثالی کے طور پر میں آپ سے عرض کروں کہ آج سے ۱۹۷۲ سال پہلے ایسا ہی ایک واقعہ پیش آگیا تھا۔ کہ جناب مریمؑ کی عصمت خطرے میں تھی۔ ایک معصوم خاتون، ایک عبادت خانے میں رہنے والی خاتون، جو اللہ کی مہمان ہو کے رہتی تھی۔ اور جب وہ اپنے گود میں ایک بچہ لے کے عبادت خانے سے باہر آئیں۔ تو دنیا کے لئے اپنی بات تھی۔ اب لوگوں نے چاروں طرف سے آکے گھربلا۔ اور پوچھنے لگے۔

”مریمؑ! یہ بچہ گود میں کہاں سے آیا۔؟“
 رتناؤ میرے خترم بہاؤ! ان کا پوچھنا کوئی بے جا بات تو نہیں تھی۔ انہیں حق تھا پوچھنے کا۔ کہ تم جو رہتی تھی خدا کے گھر میں۔ تو یہ بچہ کہاں سے آیا۔؟ — اب مریمؑ بیچارہ کیا کہے۔ وہ خود بڑی پریشان دکھرائی ہوئی، گود میں بچہ لئے ہوئے۔ کہنے لگی۔
 ”میں بالکل بے گناہ ہوں۔ میری بے گناہی کا میرا اللہ گواہ ہے۔“
 اب اللہ کس طرح گواہی دے۔؟

اللہ نے کہا۔ میں گواہی دوں گا۔ — میری گواہی کی شان یہ ہے کہ اگر کوئی ناممکن بات ممکن ہو جائے تو سمجھ لو کہ اللہ نے گواہی دی ہے۔ اور اللہ نے مریمؑ کی پاکبازی کی بھی گواہی دے دی۔ اور وہ کیسے! —
 کہ ایک دو گھنٹے کا بچہ جس کا بولنا عادتاً ناممکن ہے اس کو ممکن بنا دیا۔

اور برخور وار نے پورے شباب میں بلند آواز سے کہا
 ”میں عبد اللہ ہوں۔ اللہ نے مجھے کتاب عطا کی ہے۔ اللہ نے
 مجھے نبی بنایا ہے۔“
 اور سب اعتراض کرنے والے واپس چلے گئے۔ مریم کو اطمینان ہو گیا۔ اور
 اگر ان جانے والوں کو روک کر کوئی پر پوچھے۔ ”نالائقو۔ تمہیں کیا ہو گیا۔
 یہ تم نے کیا کیا۔ تم تو یہ کہہ رہے تھے کہ مریم نے گناہ کیا ہے۔ مریم نے تصور کیا
 ہے تم تو مریم کی عصمت کے خلاف بات کر رہے تھے۔ اور گواہ جواب میں یہ
 نہیں کہتا ”میری ماں بے خطا ہے۔“ ”میری ماں معصوم ہے۔“ بلکہ وہ جواب میں
 یہ کہتا ہے کہ۔ ”میں نبی ہوں۔“ تمہارا سوال یہ تھا کہ مریم گنہگار ہے۔ اور
 وہ گواہ کہتا ہے کہ ”میں نبی ہوں۔“ اور تم خاموش ہو گئے۔
 تو وہ یہودی جواب میں کہتے ہیں

”جناب خاموش نہ ہوں تو کیا کریں۔ ہم نے آسمانی کتابیں پڑھی ہیں۔
 ان میں لکھا ہے کہ جو بیچر نبی ہوتا ہے اس کے ماں باپ گنہگار نہیں ہوتے۔“
 سرنورہ بات ختم ہوئی۔ بچے نے بول کے گواہی دے دی۔ اور۔ اگر
 آپ اجازت دیں۔ تو ہمارے معترفہ کے طور پر ایک واقعہ آپ کو سناتا جاؤں۔ کہ
 جب ہمارے رسولؐ کا گواہ خدا کے کفر میں پیدا ہوا۔ اور رسوا، اسے لینے گئے خدا کے
 گھر سے۔ اور گود میں لیا جا کے بچے کو۔ تو بچے کی ماں نے یہ بات کہی۔
 ”مستند!“

یہ بچہ جیسے گاہنیں۔
 کیوں؟ رسولؐ نے پوچھا
 تو بچے کی ماں نے کہا۔

”اس میں زندہ رہنے کے آثار ہیں ہی نہیں۔ بچے کی جو زندہ رہنے کی علامتیں ہیں وہ اس میں ہیں ہی نہیں۔ عین دن ہو گئے ایک تو اس نے آنکھ ہی نہیں کھولی دودھ بھی نہیں پیا۔ اودھین دن ہوئے یہ رویا ہی نہیں۔ یہی زندہ رہنے کی علامتیں ہیں۔ نہ دودھ پیتا ہے، نہ روتا ہے اور نہ ہی آنکھیں کھولتا ہے۔ یہ کیا زندہ رہے گا۔“

رسولؐ نے بچے کو سینے سے لگایا اور فرمایا

”دُبر خردار۔ تم نے آنکھ کیوں نہیں کھولی۔“

”جناب! میں جس گھر میں پیدا ہوا ہوں۔ اس کے طاقوں میں جھوٹے خدا رکھے ہیں۔ اگر میں آنکھ کھولتا تو ان سے نظر پڑ جاتی۔ اور نظر پڑ جاتی تو ہر سکتا ہے توڑتے ہوئے مر دے آ جاتی۔ اس لئے میں نے آنکھ نہیں کھولی۔ اب آپ آگئے ہیں۔ تو لیجئے۔“

آنکھ کھول دی۔

اب رسولؐ نے پوچھا

”بچے! ایک بات اور بتاؤ۔ آنکھ تو تم نے کھول دی۔ مگر تم روئے کیوں نہیں۔“

”حضور! جی تو میرا بہت چاہا روئے کو۔ مگر کعبہ میں میری ماں تھنی۔ اور میں دوسرا اُس کا ساتھی تھا۔ اور کوئی تیسرا آدمی نہیں تھا۔ اور ساتھی برتنہ ہوئے دنا مجھے پسند نہ آیا۔“

پھر رسولؐ نے پوچھا

”بچے! تم نے اپنی ماں کا دودھ کیوں نہیں پیا۔“

”قبلہ۔ بڑے زور کی جھوک لگی ہوئی تھی۔“

”وہاں۔ جھوک لگی ہوئی تھی تو دودھ پی لیتے۔“

”قبلہ۔ دودھ کیوں پی لیتا۔“ جھوک تو بے جھجے۔ مگر آپ نے مجھے گواہ کر کے

بلایا ہے۔ میں خود تو نہیں آیا۔ آپ کا گواہ ہو کر آیا ہوں۔ اور جب گواہ ہو کر

آیا ہوں — تو دنیا کے وکیلوں سے پوچھ لو۔ کہ گواہ کا خرچ خوراک ”دعی“ کے ذمہ ہوتا ہے —

لہذا آپ میری خوراک کا انتظام کریں تو میں پیڑوں کا —

رسولؐ نے اپنی انگشت مبارک دہن میں داخل کی — اُس سے دودھ جاری ہوا —

بچے نے مت پھیر دیا — رسولؐ سمجھ گئے کہ گواہ ذرا تر مال چاہتا ہے — لہذا آپ نے ہاتھوں

پر بلند کیا — اور اپنی زبان مبارک دہن میں داخل کر دی — اب زبان سے جو دودھ جاری

ہوا تو خوب پیٹ بھر کے پیا — اور جب پی چکے — پیٹ بھر گیا۔ تو ننھے ننھے پیارے

ہوٹوں سے زبان مضبوط پکری —

اب رسولؐ اشارے سے کہتے ہیں

”چھوڑو بھی —“

اور بچہ آنکھوں سے کہتا ہے

”ٹھہرو بھی —“

”پی چکے“

ہاں — پی چکے —

پیٹ بھر گیا —

ہاں — بھر گیا —

اب ذرا زبان چھوڑو —

”نہیں چھوڑتا —“

اسی طرح رسولؐ کی زبان دہن میں بٹے ہوئے گھر آگئے — گھر کے بزرگوں نے

دیکھ لیا —

بچے نے آنکھوں آنکھوں میں بزرگوں سے اشارہ کیا ”خاندان کے بزرگو! گواہ رہنا —

میرے پیدا ہونے ہی محمدؐ مجھے ”زبان“ دے چکے ہیں“

بہرِ نوح۔ یہ ایک ایسا نامن ہے جو ممکن ہو گیا ہے۔ اے دیکھ کر ماننا پڑے گا
کہ اس میں خدا کا ہاتھ ہے۔ اس میں خدا کی گواہی ہے۔

سامعین!

ایک دفعہ میں نے یہ بات مجلس میں کہہ دی۔ سننے والوں نے
کہا۔ ”بالکل جھوٹ ہے۔ غلط ہے۔“ تمہیں شرم نہیں آتی۔ منبر پر
بیٹھ کے جھوٹ بولتے ہو۔“

تو میں نے کہا

”حضور! جو منبر پر بیٹھ کے جھوٹ بولے اُس کے برابر کا کوئی بُرا
ہے ہی نہیں۔ جھوٹ تو نہیں کہتا ہوں میں۔“

”پھر صاحب! بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تین دن کا بچہ بون شروع کر
دے۔“ تو اب ان کو کون سمجھائے کہ جب اللہ گواہی
دینا چاہتا ہے تو نامن کو ممکن کر دکھاتا ہے۔ کسی کو یقین نہ آئے تو سرِ نَم
سے پوچھ لے۔ جس کے ایک گھنٹہ بھر کے بچہ نے بیرون کے گواہی دے
دی کہ میں اللہ کا نبی ہوں۔ اور کتابِ ساقی لے کر آیا ہوں

میرے محترم سامعین!

بتائیے۔ جذبات میں انسان کے اندر سب سے قوی جذبہ جو ہے۔ وہ جذبہ غم ہے۔
غم سے بڑا کوئی جذبہ ہے ہی نہیں۔ غم ایسی چیز ہے جو انسان کی صحت پر اثر کرتا ہے۔
زندگی پر اثر کرتا ہے۔ سب سے قوی جذبہ ہے جذبہ غم۔

مگر دنیا کا دستور یہ ہے کہ وہ اس جذبہ غم کو مٹا دیتی ہے۔ وہی باپ اچھے کی
میت پر آج مرنے کو تیار تھا۔ مگر مینے بھر کے بعد جا کر دیکھو۔ تودہ معمول ہی چلا ہوا۔ سال
کے بعد جا کر دیکھو تو باہمی نہیں رہا۔ گویا دنیا کا دستور ہے کہ وہ جذبہ غم کو بہت حد تک مٹا دیتی ہے۔

اور ایک طرف تو دنیا کا قانون یہ ہے کہ غم کو مٹائے۔ پھر اگر دنیا کے اس قانون کے ساتھ کچھ دنیاوی حکومتیں بھی شامل ہو جائیں۔ اور غم کو مٹانا چاہیں۔ تو ایسا غم تو مٹ جانا چاہیے مگر اتنی مٹانے کی طاقتوں کے ہوتے ہوئے اگر کوئی غم نہ مٹے۔ تو ناممکن کا ممکن ہوتا ہے اس سے پتہ چلتا ہے۔ اس میں اللہ کا ہاتھ ہے۔ ورنہ اگر اللہ کا ہاتھ نہ ہوتا تو یہ مٹ جاتا۔ اتنی طاقتوں کے باوجود کسی غم کا زندہ رہنا۔ یہ اللہ کا ہاتھ ہے۔ اس کی عدیت کی اند گواہی دیتا ہے۔ اور کربلا کا سارا واقعہ تو ہے ہی سارا اللہ کا ہاتھ۔ اگر اللہ کا ہاتھ اس میں نہ ہوتا۔ تو یہ ناممکن باتیں ممکن نہ ہوتیں۔ یہ اللہ کا ہاتھ ہے بس۔ ورنہ کس انسان میں یہ طاقت ہے۔ کس انسان میں یہ قوت ہے جب تک اللہ کا ہاتھ نہ ہو۔ کہ ایک بوڑھا باپ ۱۰ اپنے جوان بیٹے کی میت اٹھائے۔ اور بنس پڑے۔ یہ انسان کا کام ہے بنس کے میت اٹھانی۔؟ یہ ماؤں کا کام ہے کہ بیٹوں کو کفن پناہیں مرنے کے لئے۔ اور رات بھر نشیں مانتی رہیں کہ صبح میرے بیٹے کی میت آئے۔؟ یہ سب کچھ اللہ کی طرف سے ہوتا تھا۔ میرے سامعین!

ذرا غور کریں۔ ایک ایسا شخص جس میں علیؑ کی طاقت ہے۔ علیؑ کی قوت ہے۔ اور اپنے زمانے کا جبردرکڑا ہے۔ اپنے زمانے کا ملٹی ہے۔ اور حسینؑ حکم دیتے ہیں اپنے زمانے کے علیؑ کو ”عباسؑ عباسؑ! میں تمہیں حکم دیتا ہوں۔“

عباسؑ! جیسی فوج کا سپہ سالار ہے۔ سپاہی ہے۔ اور سپاہی کا مزاج ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ سپاہی کے تیور ہی کچھ اور ہوتے ہیں۔ اور ادھر دشمن کی فوج ہے کہ بڑھی چلی آ رہی ہے۔ فوجیں محرم کی شام ہے۔ اور حسینؑ حکم دیتے ہیں۔ کہ اس بڑھی ہوئی فوج کو روکو نہیں۔ بلکہ جا کر کہو

”میں تم سے ایک رات کی مہلت چاہتا ہے۔“

دنیا تو سمجھتی ہے۔۔۔ یہ ناممکن ہے کہ عباسؓ جیسا آدمی اور غصہ کو روک لے۔۔۔
 مگر ناممکن کا ممکن بنانا ہی تو اللہ کا ہاتھ ہے۔۔۔ اور ادھر حسینؓ نے عباسؓ کو
 حکم دیا کہ انہیں جا کے کہو
 ”ہمیں ایک رات کی مہلت دو۔“
 عباسؓ نے اتنا جواب دیا
 ”مولاً! میں۔۔۔ ان سے مہلت مانگوں!“
 اور مولاً نے جواب میں کہا
 ”ہاں۔۔۔ میں تمہیں حکم دیتا ہوں۔۔۔“
 ”بہت اچھا“

”نوار کھول کے دیں دکھ دی۔ گھوڑے پہ سوار ہوئے۔ امامؑ
 نے احتیاطاً حضرت حبیبؓ ابن مظاہرؓ اور حضرت زبیرؓ کو حکم دیا کہ
 تم دونوں بڑے بھی ساتھ جاؤ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ عباسؓ
 کو کسی بات پہ غصہ آجائے۔ کسی پہ حلال آجائے۔۔۔
 اب دائیں بائیں حبیبؓ اور زبیرؓ۔ اور بیچ میں گھوڑے پر
 اپنے وقت کا حیدر رکھنا۔۔۔ فرج کے سامنے پہنچنا۔ گھوڑا
 روکا۔۔۔ فرجیں بھی رک گئیں۔ اور سر جھکا کے چپکے سے
 کہتے ہیں

چچا حبیبؓ! وہ مہلت والی بات تم کہہ دنا۔۔۔ مجھ سے نہیں کہا جاتا۔۔۔“
 اور جب حبیبؓ نے کہا
 ”عباسؓ! آپ کے لئے حکم ہے مولاً کا۔۔۔“
 تو سر جھکا کے۔ زبان میں کلمت۔ اور خاموشی سے کہتا ہے

”میرے مولا کا حکم ہے۔۔۔ ایک رات کی مہلت چاہیے۔۔۔“
 یہ کہتے ہی عباسؓ پسینے میں تر ہو گئے۔۔۔ بدن میں لرزہ آ گیا۔۔۔ پورا بدن کانپ رہا تھا۔
 اور فوج نے کہہ دیا
 ”مہلت ہے۔“

اب جو واپس لوٹے تو حبیبؓ دُور میرؓ دونوں بڑھے آپس میں باتیں کرنے لگے۔۔۔
 حبیبؓ نے زبیرؓ سے پوچھا
 ”زبیرؓ!“

”تہیں یاد ہے نا۔۔۔ جب اس جوان کی والدہ سے علیؓ کا نکاح ہوا تھا۔۔۔ تو ہم دونوں نکاح
 میں شامی تھے اس وقت۔۔۔“
 زبیرؓ نے کہا
 ”ہاں۔۔۔ مجھے یاد ہے۔“

اب حبیبؓ بولا
 ”دُور میرؓ! نکاح کے وقت بھلا علیؓ نے کیا کہا تھا۔۔۔“
 ”یہی کہا تھا نا۔۔۔ کہ اس خاتون کے بطن سے جو میرا بیٹا ہوگا۔۔۔ وہ میری
 شجاعت کا وارث ہوگا۔“

اب وہ بڑھار ہیر کہنے لگا
 ”ہاں۔۔۔ بالکل یہی بات تھی۔“
 حبیبؓ نے زبیرؓ سے تو آپس میں یہ بات کی۔ اور قرنیؓ ہاشمؓ جناب عباسؓ غازیؓ نے سُن کے گھوڑے
 کی باگ روک لی۔۔۔ اور ایک انگریزی جہلی تو گھوڑے کی رکابیں ٹوٹ گئیں۔ اور بھرائی
 آواز میں فرماتے ہیں
 ”چچا حبیبؓ!“

ایسی باتیں کر کے مجھے شجاعت کا جوش دلا رہے ہو — تو میں نہیں ٹھہرا ہوا
ہوں۔ تم دونوں جاؤ۔ اور سلا سے مجھے اجازت لا دو — اگر
کلی سورج نکلنے سے پہلے کو نہ کہے والا لاہور میں کاظم نہ لہرا دوں۔ تڑپا لے گا
بیٹا نہ کہنا —

عباسؑ نے یہ فقرہ جو پرے جوش میں کہا۔ تو امامؑ یہاں سے اٹھے — تیزی سے پہنچے
— اور نینوں بزرگ گھوڑوں سے اتر آئے امامؑ کو اتنا دیکھ کر — اور حینؑ نے آکے بھائی
کے گلے میں ہاتھ ڈال دیئے — اور فرمایا
”میرے پیارے بھائی!

کیا بات ہے — تمہیں غصہ کیوں آگیا —

”قبیلہ!

میری کیا مجال ہے کہ تیرے حکم کے بعد غصہ کروں — یہ کچھ
کہہ رہے تھے — میں نے بات کر دی —

اور حسینؑ، بھائی کے گلے میں بائیں ڈالے ہوئے خیمے میں سے آئے — اور
دنیا نے دیکھا کہ اللہؑ نے اپنی گواہی دے کر کس طرح ہر ناممکن کو ممکن بنا دیا — یہ محاسن
یہ عزاداری ختم ہو جاتی۔ اگر اس میں اللہؑ کا ہاتھ نہ ہوتا — انہوں نے اللہؑ کے مالک الملک
ہونے کی شہادت دی — اور اللہؑ نے ان کی شہادت کی گواہی دے دی۔

اور سامعین!

میں اپنے بیان کو یہاں آ کر ختم کرتا ہوں کہ حضرت ابراہیمؑ کے لئے اللہؑ نے آگ گھوار کر
دی — اس میں اللہؑ کا ہاتھ ہے۔ اللہؑ جانے ہوئی ہوگی یا نہیں — تو یہیں
عرش کرتا ہوں

پرانی بات کی کیا بات ہے — تم آج ہی جا کے دیکھ لو —

”آج بھی مجلس کے بعد آگ پر ماتم ہو گا۔۔۔۔۔ وہاں بھی گلزار ہوئی تھی۔
یہاں بھی دیکھ لیا۔۔۔۔۔ اور حضرت ابراہیم نے اللہ جانے کیا کیا ہو گا
جس سے آگ گلزار ہو گئی تھی۔۔۔۔۔ ہمیں جو فقرہ یاد ہے۔۔۔۔۔ وہ
ہم کہہ دیں گے۔ اور وہ یہ کہ ایک دفعہ کہا
”دائے حسین“۔۔۔۔۔ آگ بجھ گئی۔

سامعین!

دائے حسین، کہتے ہیں یہ آگ بجھ کیوں جاتی ہے۔۔۔۔۔
حسین کا نام سن کے آگ شرم جاتی ہے۔۔۔۔۔ جہاں حسین کا نام لیا۔
آگ کو شرم آگئی۔۔۔۔۔
بات کیا ہے۔۔۔۔۔؟

آگ جانتی ہے کہ میں وہی آگ ہوں نا۔۔۔۔۔ جس نے حسین
کے خیمے جلائے تھے۔۔۔۔۔ اس لئے یہ ناسُراد آگ شرم
جاتی ہے۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔
سامعین!

وہاں صرف مردوں نے جا کر آگ پر ماتم دیکھنا ہے
۔۔۔۔۔ اس لئے کہ مستورات کے لئے وہاں پردے لگا کوئی
انتظام نہیں ہے۔۔۔۔۔ اور وہ اس لئے بھی کہ۔۔۔۔۔
پردہ نشین عورتیں آگ کو دیکھ چکی ہیں۔۔۔۔۔ کہ بلا میں اُن پر
گزر چکا ہے وائے۔۔۔۔۔

اور مردوں نے چونکہ آگ میں جلتے خیمے دیکھے نہیں جیب
خیروں میں آگ لگی تھی۔۔۔۔۔ مرد نہیں تھے۔۔۔۔۔ عورتیں دیکھ چکی ہیں۔

لہذا صرف مرد ہی جائیں گے آگ پر ماتم دیکھنے کے لئے —
اللہ میں موت محمد وآل محمد عطا فرمائے — اور ہم ان کی موت میں بیٹھ
وران کی موت میں مریں ۔

بج محمد وآل محمد
«وَبِنَا قَبْلُ مَنَا أَنْكَ اِسْتَا سَمِيعُ الْعِلْمِ»
(اللہ صلی علی محمد وآل محمد)

~:~~

اے آل محمد!

اچھے غلاموں کو «اپنا» کہنا تو ہر آقا کا

کام ہے

تمہاری شان تو یہی ہے کہ ہم جیسے

گنہگاروں کو «اپنا» کہدو۔

(خطیب آل محمد)

معرفتِ امام

(شہادتِ حضرت سعید)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

”خداوند عالم عزوجل جلالت کی حمد و ثناء کے بعد حضرات محمد دآل محمد پر درود و سلام“
حضرات گرامی!

اللہ کی طرف سے مسلمانوں کے پاس آج ذریعہ علم دو چیزیں ہیں۔ ایک کتابِ خدا۔ ایک حدیثِ رسول۔ جسے کتابِ ہدایت کہا جاتا ہے۔
کتاب کے متعلق تو تمام مسلمانوں کا ایمان ہے۔ کہ یہ اللہ کی کتاب ہے۔ اختلافِ مباحی میں ہو جاتا ہے۔ درمیانِ کتب کا تعلق ہے۔ اُسے دنیا کے تمام مسلمان مانتے ہیں۔
اور سب کا ایمان ہے کہ یہ اللہ کی کتاب ہے۔ اور کتاب اللہ ہونے میں کسی کو اختلاف نہیں ہے۔
سب کا ایمان ہے کہ یہ کتاب اللہ ہے اور خدا کا کلام ہے۔ اس میں کوئی شک و شبہ ہے ہی نہیں۔

اور حدیثِ رسولؐ جو ہے۔ وہ حضور رسالت آپؐ کا فرمان ہے۔ اللہ کی کتاب کی نشر و توضیح ہے۔ جسے ”حدیث“ کہتے ہیں۔ اور جہان تک حدیثوں کا تعلق ہے۔
اس میں مسلمانوں میں اختلاف ہے۔ کہ یہ حدیث ضعیف ہے یا قوی ہے۔ یہ حدیث صحیح ہے یا غلط ہے۔ یہ حدیث ہے یا نہیں ہے۔ یہاں تک اختلاف برداشت ہو سکتا ہے۔

یہ ایک تحقیق ہے۔ اور انسان کو تحقیق کرنی چاہیے کہ واقعاً یہ رسولؐ نے فرمایا ہے یا نہیں۔ مگر ان اصول و قواعد کے مطابق جو کسی حدیث کو پرکھنے کے لئے علمائے حدیث نے سمیٹ رکھے ہیں۔ اور ان اصول کے مطابق جب یہ طے ہو جائے کہ واقعاً یہ رسولؐ کا فرمان ہے۔ تو پھر اس کا نہ مانا دہی ہے جیسے کتابِ خدا کا نہ ماننا۔ گویا یہاں تک تو اختلاف ہو سکتا ہے کہ یہ حدیث ہے ہی کہ نہیں۔ مگر جب یہ فیصلہ ہو جائے کہ واقعاً یہ حضورؐ نے فرمایا ہے۔ تو پھر اس میں شک کرنا یا نہ ماننا ایسا ہی ہے جیسا کہ کتابِ خدا کا نہ ماننا۔ اس لئے کہ حدیث جو ہے۔ اصل میں یہ تفسیر ہے۔ تاویل ہے۔ تعبیر ہے کتابِ خدا کی۔ اس سے انکار کرنا گویا کتابِ خدا سے انکار کرنا ہے۔

اور مختصر سے لفظوں میں یہ بات بھی سننا چاہوں کہ کتابِ خدا میری مراد یہ صرف ”قرآن“ نہ کتابِ خدا اور بھی ہیں۔ آج روئے زمین پر ایسی کتاب ہے جس کی ابتداء یہاں سے ہوتی ہے کہ ”کتابِ ربّ“۔ اس کتاب میں کوئی شک و شبہ ہو سکتا ہی نہیں۔ ”دورۃ دنیا کی کسی کتاب پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ ”کتابِ ربّ“ ہے۔ یہ صرف اس کتاب کی خصوصیت ہے جو اعلان کرتی ہے اس بات کا کہ ”کتابِ ربّ“ اور اس میں ربّ ہو سکتا ہی نہیں۔ اس میں کوئی شک ہو سکتا ہی نہیں۔ اس کی بات کبھی غلط ہو سکتی ہی نہیں اس کا مصدق وہ ہے جو کبھی غلط بات کہہ سکتا ہی نہیں۔ اور اس ساری کائنات کا پیدا کرنا۔ یہ خدا کا فعل ہے۔ اور ”قرآن“ خدا کا قول ہے۔ اور یہ کبھی ہو سکتا ہی نہیں کہ ایک جاہل مطلق کے قول و فعل میں اختلاف ہو۔ جو قول ہے وہی فعل ہے۔ جو فعل ہے وہی قول ہے۔ اور اگر کہیں غلطی نظر آجائے۔ تو یہ سمجھیے۔ یہ ہماری سمجھ کی غلطی ہے۔ دورۃ غلطی نہیں ہے۔

سامعین! ایک شخص سے کسی نے کہا۔ برتری آنکھیں پٹھن ہیں۔
تجھے ایک کے دو نظر آتے ہیں۔

تو اس نے کہا

”بالکل غلط۔ تم جھوٹ بڑھاتے ہو۔ مجھے تو ایک کا ایک ہی نظر آتا ہے۔
اگر مجھے ایک کے دو نظر آتے تو چاند مجھے چار کیوں نہ نظر آتے۔
دو ہیں۔ دو ہی نظر آتے ہیں۔“

بھائیو۔۔۔ اس بات کا علاج نہیں کسی کے پاس۔ یہ ہماری نظر کی
غلطی ہے۔ ہمارے بچنے کی غلطی ہے۔۔۔ درنہ کتاب میں تو کوئی
دریب ہو سکتا ہی نہیں۔

اب یہ خود عقلِ انسانی بتاتی ہے۔ کہ اگر کتاب ایسی ہے کہ ”کلاسیک فیہ“ ہے۔
جس میں دریب ہو سکتا ہی نہیں۔ تو اس کا مفسر بھی وہ ہونا چاہیئے۔ جس کی
صفت ہو ”لا عیب فیہ“ جو نہ غلطی کرنے والا انسان ہو۔۔۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ
غلطی کرنے والا انسان مفسر بن بیٹھے اس کتاب کا جس میں ”دریب“ ہے ہی نہیں۔
”کلاسیک فیہ“ کا مفسر بھی وہی ہو جو ”کلاسیک فیہ“ ہو۔ جس سے کبھی غلطی ہو سکتی
ہی نہ ہو۔ ایسا مفسر ہونا چاہیئے کہ کتاب اللہ کا۔۔۔

حضور والا!

لوگ کہتے ہیں کہ انسان میں عقل ہے اور حیوان میں عقل نہیں ہے۔۔۔ حالانکہ
یہ غلط ہے۔۔۔ حیوان بھی بڑا عقل مند ہوتا ہے۔ بلکہ بہت سے حیوان تو انسانوں سے زیادہ
عقل مند ہیں۔ بہت سے حیوان دنیا میں ایسے ہیں جو انسانوں سے زیادہ عقل مند ہیں۔
اور اگر آپ کو یقین نہ آئے تو میں ابھی مثال دیتا ہوں آپ کے سامنے۔۔۔ کسی
بے چوڑے تندر کے حیوان کی نہیں۔ بلکہ ایک نما ساجیوان۔ ایک چھوٹی سی جان۔
دیکھیں میں بے حقیقت۔ مگر انسانوں سے زیادہ ذی عقل۔۔۔ اسے کہتے ہیں ”شہد
کی کھٹی“

اری دنیا کے انسان مٹی کے ذرا متبادل تو کر دیجیں اس شہد کی مکھی کی قتل کا — کتنی
 قتل مند ہے یہ — آپ بھی گھر بناتے ہیں — دو منزلی، پانچ منزلی، دس منزلی
 بیس منزلی ہم نے کوٹھی بنائی — مگر اس کے بنانے میں سینکڑوں معماروں کی
 خوشامد کرنا پڑی — اور خلا جانے ہزاروں مصیبتیں ہیں — جب جا کے کہیں عمارت
 بنی — گھر تیار ہوا — مگر شہد کی مکھی — ایک نخی سی جان !
 جب یہ گھر بنانے پہ آتی ہے — تو یہ کس شان سے گھر بناتی ہے — اس کو
 نہ کسی مہار کی خوشامد کرنا پڑی — نہ کسی انجینئر کی خوشامد کرنا پڑی — نہ کسی نقشہ نویس کی
 خوشامد کرنا پڑی

اپنے گھر سے اڑی — سیدی بانغ میں پہنچی — دگر بانیں کی طرت
 نہیں — (مقداروں کی طرح) — سب پھولوں کو دکھایا — ہر پھول پہ پھولی نہ
 سائی — ہر پہ نہیں دیکھتی بلکہ ان پھولوں میں سے انتخاب کیا کہ —
 ”میرے قابل کو نسا ہے“ — ہیں سب ایک ہی بانغ کے پھول
 — مگر ایک بانغ میں ہونے سے شہد کی مکھی ہر پھول پہ نہیں بیٹھتی
 — وہ دیکھتی ہے — ”میرے لئے مناسب کو نسا ہے“

اور پھر وہ مناسب پھول کے پاس پہنچتی ہے — اور جا کے پھول کو
 سناتی نہیں — اُسے پریشان نہیں کرتی — اس کی
 پتیاں نہیں کھیرتی — اس کی موت نہیں لاتی — بلکہ
 بڑے ادب سے پھول کے قریب جا کے کہتی ہے
 ”سلام علیکم“

اور پھول کہتا ہے جواب میں — ”وعلیکم السلام“
 بس پھول کا منہ کھلا اور یہ گودی میں بیٹھ گئی — اور گودی میں بیٹھ

کے آرام سے گفتگو شروع کر دی۔ اور اس خواہ کے ساتھ بات کرتی
 ہے بھول سے۔ کہ یہ بات کرتی رہی اور بھول سنا رہا۔
 یہ اپنی خوراک جمع کرتی رہی بھول کو پتہ بھی نہ چلا۔ عارضہ گُل
 پر خراش بھی نہ آیا۔ دامن گُل پہ گرد بھی نہ پڑی۔ اور
 اس نے اپنی شے اکٹھی بھی کر لی۔ اب گھرے کے آگئی۔
 اور ایسا عجیب گھر بنایا کہ گھر کا گھر بھی بتا رہا اور خوراک کا ذخیرہ بھی اکٹھا
 ہوتا رہا۔ اگر ہمارا بنایا ہوا گھر ٹوٹ جائے تو بے کا
 ڈھیر۔ اور اس کا بنایا ہوا گھر ٹوٹ جائے تو
 ”لوگوں کے لئے شفا بھی ہے اور لذت بھی ہے“

اب بتاؤ!

شہد کی کھٹی تم سے زیادہ ہوشیار ہے یا نہیں۔
 تو آپ کہیں گے۔ ”ہوشیار نہیں ہے۔“
 ”بات کیا ہے!۔ کہ وہ جو گھر بناتی ہے۔“
 ”اللہ اُسے ”وحی“ لکھتا ہے۔ اور ہم جو بناتے ہیں۔ ہم اپنی عقل سے بناتے ہیں۔
 وہ بناتی ہے۔ ”وحی“ سے۔ اور ہم بناتے ہیں اپنی عقل سے۔
 پس یہاں سے پتہ چلتا ہے۔ کہ اپنے بنائے ہوؤں اور وحی کے بنائے ہوؤں میں
 کیا فرق ہے۔ جو ”وحی“ سے ہے۔ اُن کی کیا شان ہے۔ اور جو ہم بنائیں
 ان میں کیا مصیبت ہے۔ اور ایسا عظیم گھر بن کے تیار ہوتا ہے۔ اب بتاؤ۔
 شہد کی کھٹی ذی عقل ہے کہ نہیں۔ اس کے عقل مند ہونے میں آپ کو انکار تو نہیں۔
 بہر حال۔ یہ سب جانور عقل مند ہیں۔ ان میں بھی عقل ہے۔ ان میں بھی سمجھ ہے۔ جو ان
 سے مراد سے پیش آئے۔ اس سے پیار کرتے ہیں۔ اور جو ڈنڈے کو مارنے بھاگے۔

تو ذرا جھگ جاتے ہیں۔ اچھوں سے محبت اور بُروں سے نفرت کا مادہ ان میں بھی موجود ہے۔
 اور جس راستے سے ایک دفعہ گزر جائیں۔ کیا مجال جو اس راستے کو بھول جائیں۔
 ہم چاہے بھول جائیں۔ مگر وہ اُسی راستے پہ چلیں گے۔ اور اگر خطرہ سامنے آجائے۔ تو
 وہیں رُک جائیں گے۔ کیا مجال جو آگے بڑھ جائیں۔ مالک کی حفاظت اور اطاعت بڑی
 شان کے ساتھ کرتے ہیں۔

یہاں تک کہ دنیا کا نجس ترین جانور ہے کُتا، اور کُتے کو اسلام نے بڑا ہی نجس جانور
 قرار دیا ہے۔ مگر اس نجس جانور کی شرانت بھی آپ نے دیکھی ہوگی۔ اپنے
 مالک کی حفاظت کرتا ہے۔ غیر کو آنے نہیں دیتا۔ بے کُتا مگر اس میں بھی یہ
 خوبیاں ہیں۔ صرف اس لئے پالنے سے روک دیا ہے۔ کہ اس میں ایک عیب
 ہے۔ اور وہ یہ۔ کہ ”غیر کے سامنے دُم ہلاتا ہے۔ اور اپنی جنس کو کاٹنے کو
 ددھتا ہے۔“ اگر تم اسے گھر میں پالو گے۔ تو کہیں تمہیں یہ عادت نہ پڑ جائے۔
 کہ ”اپنے بھائیوں سے لڑو۔ اور غیر کی خوشامد کرو۔“ یہ عیب ہے اس میں
 — ورنہ حجاب۔ بڑا اچھا جانور ہے۔ ساری عقل مندیاں ہیں اس میں۔ سارے
 شعور ہیں اس میں۔

انسان تو خواہ مخواہ اگر کتاب ہے کہ مجھ میں عقل ہے۔ حالانکہ اس سے زیادہ ان
 حیوانوں میں عقل ہے۔ فرق کیا ہے۔ انسان ناطق ہے۔ اور حیران بیچارہ
 ناطق نہیں۔

اب ناطق کے معنی کیا ہیں؟

بر لئے کالا۔ ”یہ غلط ہے۔ وہ بھی جوتا ہے۔ یہ ادبانت ہے
 کہ آپ ان کی بولی نہیں سمجھتے۔ اور آپ کے نہ سمجھنے سے توان کی بولی میں کوئی
 فرق نہیں آیا۔ جس طرح انسان، انسان کی بولی نہیں سمجھتا۔ اسی بیان کوئی چیتا

بہجی زبان بولنے لگے۔ حالانکہ وہ انسان ہے۔ بلبل رہا ہے۔ مگر۔۔۔
آپ کیا کہیں گے۔

”میاں۔ بیٹھ جا۔ کیا ”چپیں چپیں“ شروع کر دی“

_____ حالانکہ انسان ہے۔ بلبل رہا ہے۔ مگر وہ ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔
جب انسان، انسان کی زبان نہیں سمجھ سکتا۔ تو حیوان کی بھی زبان ہم نہیں سمجھ سکتے
_____ در نہ حیوان بولتے ہیں۔ یہ غلط بات ہے کہ وہ نہیں بولتے۔ حیوان بولتے ہیں
_____ نطق اُن میں بھی ہے۔ اگر اُن میں نطق نہ ہوتا۔ تو قرآن میں یہ لفظ نہ ہوتا کہ
”ہم نے سیلان کو ”منطق طائر“ سکھائی ہے۔“ _____ طائروں کا نطق سمجھا لکھا
_____ ہے۔ _____ صاحبان! دیکھیے۔ جانور کا برنا میں قرآن سے بتاتا ہوں۔ کہ جانور
_____ بولتا ہے۔ اور جانور بھی ایک ننھا سا جانور ”چوینٹی“ ہے۔ ننھا سا جانور۔
مگر بولتا ہے۔ قرآن میں بھی مروجہ ہے کہ بولتا ہے۔
حضرت سیلان اپنی فوج کے ساتھ جا رہے تھے کہ۔

”بولی ایک چوینٹی“

کیا کہا بلبل کے اس چوینٹی نے اپنی باقی برادری سے کہ وہ اپنے اپنے گھروں میں چلے
جاؤ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ سیلان کی فوج تمہیں کچل دے اپنے پیروں کے نیچے۔ _____
_____ اب اس کی بولی حضرت سیلان نے سمجھ لی تو انہوں نے حکم دیا

وہ اس چوینٹی کو گرفتار کر کے لے آؤ۔

اب چوینٹی کی گرفتاری کے آرڈر ہو گئے۔ _____ مگر

صاحبان!

تم ہی ایمان سے کہو۔ اگر ملزم چوینٹی ہو۔ تو پولیس کونسی گئی ہوگی

اُسے پکڑنے کے لئے ————— کوئی ٹھہر دینا بھیج دیا ہو گا کہ

”جاؤ۔ چیونٹی کو گرفتار کر کے لے آؤ۔“

اور چیونٹی بیماری کے ماتھے پاؤں باندھ کے حضرت سلیمان کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ اب

نصفی سی جان۔ ذرا سادل ————— اس کا دل تو دھک دھک کرنے لگا۔

اتنے بڑے شہنشاہ کے سامنے ایک بیماری چھوٹی جان ”چیونٹی“ لازم کی حیثیت سے کھڑی ہے۔

سلیمان نے کہا

”یہاں لاؤ۔“ ————— اور چیونٹی آگئی۔

دوبلو ————— تم مجھے ظالم سمجھتی ہو۔“ حضرت سلیمان نے نصیحتیں پوچھا۔

”میں نہیں غائب“ چیونٹی نے بڑی عاجزی سے جواب دیا۔

اب سلیمان فرماتے ہیں

”چیونٹی!

تم سمجھتی ہو کہ مجھے نظر نہیں آتا کہ تم چل رہی ہو۔“

”غائب آتا ہے۔“

”پھر تم نے کیوں کہا۔“ اپنی برادری سے کہ بھٹ جاؤ۔ سلیمان کہیں نہیں کھل نہ دیں۔

ہم راستے میں کھلتے ہیں کسی کو ————— تم نے یہ بات کیوں کہی۔“

چیونٹی نے عرض کی

”محضور۔ گذارش یہ ہے۔“ کہ ذرا میرے ہوش دھواس ٹھیک ہو لینے دیں۔ پھر

اب دوں گی۔“

جب چیونٹی کے ذرا ہوش دھواس ٹھیک ہوئے۔ تو بلی

”تنبہ!“

گذارش یہ ہے۔ کہ ہماری غار کا وقت تھا۔ اور ہماری ساری برادری آپ کی فوج کا تماشہ

کہتے گی۔۔۔ مجھے یہ ڈر ہوا کہ کہیں تماشے میں نماز نہ قضا ہو جائے۔ اس لئے میں نے انہیں ڈرا کے ہٹا لیا تھا۔ کہ نماز ان کی قضا نہ ہو جائے۔۔۔ ہماری عبارت ضائع نہ چلی جائے۔“

”راجھا۔۔۔ یہ بات تھی۔۔۔ اب سیما بہت خوش ہوئے

دشناماش۔ تم نے بڑا اچھا کیا ہے۔ تم بہت اچھی ہو چوٹی۔“

اب سیما نے چوٹی کو اپنے ہاتھ کی پتیلی پہ بٹھالیا۔ اور پتیلی پہ بٹھا کے فرمایا

”چوٹی! تم نے بڑا اچھا کیا ہے۔۔۔ ہم تم سے بہت خوش ہوئے۔“

اب ذرا چوٹی کی بھی جان میں جان آگئی۔۔۔ اور حضرت سیما چوٹی کو ہاتھ کی پتیلی پہ بٹھا کے کہنے لگے

”چوٹی! تم بہت بر شیار ہو۔ ایک بات بتاؤ۔۔۔ تم بہتر ہو یا میں۔۔۔؟“

سامعین!

چشم بدور۔ آپ پڑھے لکھے حضرات تشریف فرما ہیں۔ ایک بات بتاؤ۔۔۔ کہ اگر چوٹی یہ کہدے سیما سے کہ۔۔۔ ”آپ بہتر ہیں۔“ تو یہ سیما کی توہین نہیں۔۔۔ کہ کون سیما؟۔۔۔ جو چوٹی سے بہتر ہے۔“

اسی لئے تو کہتا ہوں کہ جب مقابلہ کیا کرو تو کسی مقابلے والے سے کیا کرو۔

اب سیما کو اشتعار ہے کہ چوٹی کیا جواب دیتی ہے۔

سیما پر چھتے ہیں

”چوٹی! بوزنا۔۔۔“

”قبلہ کیا بتاؤں۔۔۔“ اگر یہ بتاؤں کہ آپ مجھ سے بہتر ہیں۔۔۔ تو مجھ

سے بہتر ہونا بھی کوئی بات ہے۔۔۔“

”پھر کچھ تو کہو۔“

”قبلہ۔ اگر آپ مجبور ہی کرتے ہیں۔۔۔ تو ایک بات کہتی ہوں۔۔۔ کہ اس وقت

آپ کو کیا شے اٹھائے ہوئے ہے۔۔۔

سلطان نے کہا

”دہوا۔۔۔ ہوا کے اوپر میرا تخت ہے۔۔۔“

اب چیونٹی نے کہا

دہمالی باہ! آپ کو تو اٹھائے ہوئے ہے ”دہوا۔۔۔“ اور مجھے کیا اٹھائے

ہوئے ہے۔۔۔

سلطان نے کہا

”میرا اٹھ۔۔۔“ تو چیونٹی بولی

”اب قبل آپ ہی بنائیں۔۔۔ وہ بہتر ہے جسے ہوا اٹھائے ہوئے ہے یا وہ

بہتر ہے جسے نی اٹھائے ہوئے ہے۔۔۔“

سلطان بہت خوش ہوئے۔۔۔ اور دالسی پر اسے چھوڑ دیا جہاں سے لے اٹھا باخا

اور یہ بات چیونٹی کی طرح آج تک کسی کتابوں میں آگئی۔۔۔ بات تو چیونٹی کی

تھی۔۔۔ مگر ہمارے دلوں میں آج بھی چیونٹی کی چال کی طرح چل رہی ہے۔۔۔ کہ

اگر نبی کسی کو اٹھائے۔۔۔ چاہے وہ چیونٹی ہی کیوں نہ ہو۔۔۔ اس کی بات ہی اور ہے۔

اس کی شان ہی اور ہے۔۔۔ اس کا انداز ہی اور ہے۔۔۔ اس کا وقار ہی اور ہے۔۔۔

اب اس کے مقابلے کا ایک واقعہ اور سن لیجئے۔

امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ الصلوٰۃ والسلام اور ان کے ساتھ غلاب حضرت سلمان مارشی

چلے جا رہے تھے مدینہ سے باہر ایک جنگل میں۔۔۔ اتفاق سے ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں یہ

چیونٹیاں اپنے دل سے نکل آئیں۔۔۔ تو سلمان مارشی نے اس دل کو دیکھ کر کہا۔۔۔

دیکھ ہے وہ ذات جو ان کی تعداد کو جانتی ہے۔۔۔“

حضرت امیر المومنین نے فرمایا

”سلمان! تو یہ کر۔۔۔۔۔۔ یہ کیا کہہ دیا تو نے۔۔۔۔۔۔ بکدروں کو کہہ چکا ہے، وہ ذات جس نے انہیں پیدا کیا ہے۔۔۔۔۔۔ اور رہی تعداد! وہ تو میں بھی جانتا ہوں۔۔۔۔۔۔ اور تری تعداد ہی نہیں جانتا۔ بلکہ یہ بھی جانتا ہوں کہ ان میں نہ کتنے ہیں اور مادہ کتنے ہیں۔ ان میں فرد کتنے ہیں۔۔۔۔۔۔ یہ کہاں جا رہے ہیں اور کہاں سے آرہے ہیں۔۔۔۔۔۔ آتا تو میں بھی جانتا ہوں۔۔۔۔۔۔ اور سلمان! ادھر آؤ۔۔۔۔۔۔ تجھے بتا دوں۔ تو بھی سمجھ لے۔۔۔۔۔۔“

اپنے دوٹانے سلمان کے چہرے پہ ماتھ پھیرا۔۔۔۔۔۔ اور سلمان سمجھنے لگا چیونٹی کی بات۔۔۔۔۔۔
تو ان چیونٹیوں کا سردار اپنی برادری سے یہ کہہ رہا تھا
”جلدی جلدی اپنے گھروں سے نکل کے باہر آؤ۔۔۔۔۔۔“

سامعین!

حضرت سلمان کے وقت چیونٹی اپنی برادری سے کہہ رہی تھی۔۔۔۔۔۔
وہ اپنے گھروں میں جاؤ، اور وہ اس نے کہہ رہی تھی کہ کہیں عبادت
میں فرق نہ آجائے۔ اس سے اپنے گھروں میں جاؤ،۔۔۔۔۔۔
اور یہاں خباب امیر کے وقت چیونٹی کا سردار اپنی برادری
سے کہہ رہا ہے کہ

”جلدی جلدی اپنے گھروں سے نکل کے باہر آؤ، کیونکہ وہ آگیا ہے
۔۔۔۔۔۔ جس کا چہرہ دیکھنا۔۔۔۔۔۔ عبادت ہے۔۔۔۔۔۔“

بہرغور۔۔۔۔۔۔ یہ تو بھی عقل مند ہیں۔ ان میں بھی شعور ہے۔۔۔۔۔۔ یہ بھی سمجھتے ہیں۔۔۔۔۔۔
بولتے ہیں۔۔۔۔۔۔ یہ اور بات ہے کہ ہمیں ان کی اس سمجھ کا شعور نہیں ہے۔ ورنہ وہ بولتے۔
ان میں بھی شعور ہے۔۔۔۔۔۔ اور ان ہی چیزوں سے قدرت اپنے منظر کو تیار کر داتی ہے۔۔۔۔۔۔ یہ
گواہی ہے قدرت کے منظر کی۔۔۔۔۔۔ حالانکہ بظاہر یہ ناممکن ہے کہ ہم ان جانوروں کی عقل و شعور

کو انسانی عقل کے برابر سمجھیں۔ مگر جب خدا چاہتا ہے تو اپنی قدرت کی گواہی دینے کے لئے وہ ان جانوروں کی عقل و شعور کا تعارف کروانا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ کی قدرت کیا ہے۔ اس کا شاہکار کیا ہے میرے سامعین !

جب کسی ناممکن بات کو ممکن کر دکھانا ہو۔ تو اللہ اپنی قدرت کے ذریعہ اس کی گواہی دیتا ہے۔ اور اللہ والے اس گواہی کی ضمنی بھرنے کے لئے اپنی شہادت پیش کر دیتے ہیں۔ غلط شہادت کے معنی بھی ہیں جو گواہی کے معنی ہیں۔

اب آج ہمارے رسولؐ کا کبڑہ کر بلا میں بٹھا ہوا ہے۔ اللہ کے مالک الملک ہونے کی گواہی دینے کے لئے حسینؑ امینؑ علیؑ اپنے عزیزوں و جاتاروں کے ساتھ کر بلا میں قسز لایا گئے ہوئے ہیں۔ سازشیں تک مقدمہ کی سماعت ہوتی رہی۔ دسویں محرم کو گواہیاں پیش کرنا شروع کر دیں۔ اور خاندانِ رسولؐ کو ابی دے رہا ہے کہ دو گواہ!

جو کچھ ہماری جِد نے کہا ہے۔ جو کچھ اللہ نے کہا ہے۔ جو کچھ کتاب اللہ نے کہا ہے۔ وہ بالکل حق ہے۔ اس میں کوئی غلطی نہیں۔ اور اگر اس میں کوئی غلطی ہوتی۔ تو ہم اتنی بڑی قربانی نہ دیتے۔ ہم اس کی گواہی دینے آئے ہیں۔ ہم اس کی شہادت دینے آئے ہیں۔

اور لطف یہ ہے میرے پیارے بھائی سیکڑوں آدمی ساتھ ہیں سینکڑوں کھمبے اور موم انہیں فرماتے کیا ہیں۔ بھائیو! میں مر جاؤں گا۔ جو میرے ہاتھوں کے وہ بھی مریں گے۔ کفن نہیں ملے گا۔ قبر نہیں ملے گی۔ کہ بچے قید ہو جائیں گے۔ عورتوں کے سر پر چادر نہیں رہے گی۔ اگر یہ مصیبت منظور ہو تو

میرے ساتھ ٹھہرو ————— ورنہ جاؤ۔۔۔۔۔

سینکڑوں آدمی چلے گئے ————— سینکڑوں آدمی واپس بھیج دیئے ————— اچھے خاصے
جوان بہادر۔ جن کو ساتھ رکھنے کی ضرورت تھی۔ ان سب کو مولاً نے واپس بھیج دیا۔
آخر چھپٹ کے بنتر رہ گئے۔

اب بوجھے کئی۔۔۔۔۔ در مولاً!

وہ واپس کیوں بھیج رہے ہو۔۔۔۔۔

مولاً فرمائیں گے

مجھے ان کی ضرورت نہیں۔۔۔۔۔

اب جو کئی منزلوں سے حسین کے ساتھ تھے انہیں تو مولاً واپس بھیج رہے ہیں ————— اور
اپنے گھر بیٹھے ”حبیب“ اسے خط لکھ رہے ہیں کہ آ جاؤ۔

آپ نے غور فرمایا ————— اگر ضرورت تھی اپنے مددگاروں کی تو انہیں کیوں بھیج دیا

اور ضرورت نہیں تھی تو اسے یوں مل رہے ہیں ————— تو حسین
فرماتے ہیں

”سنو!“

میں لڑنے نہیں جا رہا۔۔۔۔۔ جو اب میں ساتھ رکھوں ————— میں شہادت کے لئے جا رہا

ہوں ————— فہمے وہ آدمی چاہیئے جو گواہ بن سکتا ہو۔۔۔۔۔ اور یہ جو میرے ساتھ
تھے۔ یہ گواہ نہیں بن سکتے تھے۔ مجھے ان کی ضرورت نہیں تھی ————— مجھے حبیب کی ضرورت
ہے جو گواہ بن سکتا ہے۔۔۔۔۔ جو شہادت دے سکتا ہے۔

بس بھائیو!

میرنی گفتگو یہاں آگے ختم ہوتی ہے کہ کس شمار سے حبیب نے شہادت دی —————
یہ حبیب اور سعید دو بزرگ تھے کہ بلا میں حسین کے ساتھ ————— اور ہم طور پر یہ

مشہور ہو گیا ہے کہ حبیبؑ بہت بڑھے تھے۔ حالانکہ حبیبؑ تو امام حسینؑ کے ہم سن تھے۔ وہ تو مولائے بچپن کے دوست تھے۔ اور حضرت سعیدؑ بہت بڑھے تھے۔ ان کی عمر کہ بچپن کوئی نوے سال کے قریب تھی۔ اور جب دن کے ایک بجے تک کہ بلا میں شہادت کا بازار گرم رہا۔ اور چند آدمی باقی رہ گئے۔ اس وقت یہ حبیبؑ اور سعیدؑ سامنے آئے مولائے۔ اور عرض کی۔
 ”مولائے!

ظہر کا وقت ہے۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ یہ آخری نماز حضورؐ کی جماعت کے ساتھ پڑھیں۔“
 آپؐ نے فرمایا۔
 ”خدا تمہیں جزائے خیر دے۔ تم نے اس وقت نماز کو یاد کیا ہے۔ تم اس فوج کو کہہ دو! کہ ذرا دیر کے لئے ٹھہر جائے۔ تاکہ ہم آرام سے نماز پڑھیں۔“
 اور حبیبؑ نے یہ بات کہی جا کے۔ اس فوج نے کوئی گستاخانہ جواب دیا۔ اور حبیبؑ تو وہیں شہید ہو گئے۔
 سعیدؑ نے آکے کہا۔
 ”مولائے!

حبیبؑ تو شہید ہو گیا۔ میں موجود ہوں۔ آپؐ نماز شروع کریں۔“ آپؐ کے سامنے کھڑا ہوں۔ آپؐ نماز شروع کریں۔ اور حبیبؑ تک۔ از ختم نہیں ہوگی۔
 ”ہیں آپؐ تک کوئی تیر نہیں آئے دوں گا۔“

باسمیں! نوے برس کا بڑھا آدمی۔ سعیدؑ کھڑا ہو گیا حضورؐ کے سامنے۔ اور نماز شروع ہو گئی۔ جو تیرا دھرے آتا۔ سعیدؑ اسے اپنی بڑھی پسروں پر روک دیتا۔ پسلیاں ٹوٹ گئیں۔ تیر کھس گئے سینے میں۔ اور ادھر اُدھر نے سلام پھیرا۔ ادھر یہ گود میں جاگرا۔ اور گر کے گود میں پرتھا کیا ہے۔ مہل و منت۔ اور رسول اللہؐ

”لے رسول کے بیٹے! آپ میری اس کارگزاری سے خوش ہیں؟“

”تو امام نے جواب میں یہ فرمایا

”یا سَعِيدُ! اَنْتَ اَمَامِي فِي الْجَنَّةِ۔“

”سعيد! انشاء اللہ جنت میں تو میرے آگے آگے چلے گا۔“

قیامت کے دن جب میں جنت میں جاؤں گا۔ تو تو میرے آگے آگے چلے گا۔

اور جب میں مانا کے، بابا کے سلام کو جاؤں گا تب بھی تو میرے آگے آگے ہوگا۔“

تو سعيدؑ کیا التبا کرتا ہے

”مولا! اگر یہ بات ہے۔ تو میری ایک گزارش ہے۔ کہ میرے بدن سے تیرا نکالنا۔

میں تیرے مانا اور بابا کے سامنے اسی طرح جانا چاہتا ہوں۔“

اور یہ کہہ کے موت کا پسینہ آگیا۔ آخر بڑھا آدمی تھا۔ اُسی موت کے پسینے میں کہتا ہے

”مولا! “

کسی نے میرا سر لے لیا ہے گود میں۔ مجھے بڑا آرام مل رہا ہے۔“

تو امام فرماتے ہیں

”سعيدؑ!“

میرا سلام کہو۔ یہ میرے مانا رسول اللہ ہیں۔

”مولا!“

کوئی میرے بازو دبا رہا ہے۔ مجھے بڑا آرام مل رہا ہے۔“

”مولا نے فرمایا

”سعيدؑ! یہ میرے بابا حیدر کو ڈر رہی ہیں۔“

”مولا! کوئی میرے سینے پر ہوا جھلی رہا ہے۔“

تو امام نے فرمایا

”یہ میرے بھائی حسن ہیں۔“

اور سونگے بھی آخری فقرہ !

سعید نے کہا

”مولانا کوئی میرے پیروں کے قریب بھی ہے۔“

تو امم نے فرمایا

”سعید ! ذرا پرہٹا ہے۔ یہ میری ”آماں“ آگئی ہیں۔“

اسے کہتے ہیں قید ! معرفتِ امم

اسے کہتے ہیں امم کا پہچانا۔

اللہ آپ کو، مجھے، سب کو وہ نظر عطا فرمائے جس سے ہم اپنے امم کو، اپنے آتما

درمہر کو، اپنے مولانا و سردار کو، اپنے پیر کو پہچان سکیں۔

”بحق محمد و آل محمد۔ ربنا تقبل منا انک انت السميع العليم“

اللهم صلی علی محمد و آل محمد

— — —

آلِ محمد !

تمہارا قصور صرف یہی ہے کہ تم اتنے

اچھے کیوں ہو۔
(خطیب آلِ محمد)

شام شہیدان

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ سَّاجِدُونَ

سید زادو!

آج تم اپنے گریبان چاک کر کے زمین پہ بیٹھ جاؤ۔ آج سیدانیاں سرکھول
کے زمین پر بیٹھ جائیں۔ آج کی رات ہمارے گھروں میں روشنی نہیں جلنی پڑی ہے
آج حسینؑ کی زندگی کی آخری رات ہے۔ کل اس وقت دنیا میں حسینؑ نہیں ہوگا۔
”مولّا تیری غربت کی حد ہو گئی۔ آج رات بھی تو نے مانگ کے
لی ہے۔“

مولّا! ہم نے تیرا جلوس نکالا۔ بازاروں میں ماتم کیا۔
مولّا! ہم اللہ کو گواہ کر کے کہتے ہیں کہ ہمیں اپنا وطن عید کو یاد نہیں
آتا۔ مگر جب محرم کا چاند دیکھتے ہیں تو اپنا وطن یاد آ جاتا ہے۔
مولّا! آج جب ہم تیرا جلوس لے کر آرہے تھے تو سوچا جلوس کہاں لے جائیں؟
آخر عقل نے کہا۔

”آج کہیں نہیں جانا۔ آج خیمہ سادات کے سامنے بیٹھ جانا ہے“

بھائیو!

آج نویں محرم کو سادات کا خیمہ آباد ہے۔ بیٹی کے پاس باپ موجود ہے۔ بہن کے پاس بھائی موجود ہے۔ بیوی کے پاس شوہر موجود ہے اور عزیزوں کے پاس عزیز موجود ہیں۔ گویا آج شہیدوں کی رات ہے اور کل رات جو آئے گی وہ عزیزوں کی رات ہوگی۔
 — لہذا میں آج آپ کے سامنے مجلس پڑھنے نہیں آیا ہوں بلکہ پوچھنے آیا ہوں کہ آپ لوگ اس طرح زمین پر کیوں بیٹھے ہیں۔ تمہارے سر کیوں ننگے ہیں۔ تمہارے گریباں کیوں چاک ہیں۔ تم ماتم کیوں کر رہے ہو تم پر کیا گزری؟

بھائیو!

میں تو یہ کہنے آیا ہوں کہ نہ ہمارا کوئی جوان رہا نہ بچہ۔ نہ ہمارے بوڑھے رہے۔ نہ ہمارا گھر رہا۔ لوگوں نے ہمارے کپڑے کے گھر بھی جلا دیئے۔ آج ہمارا بھرا ہوا گھر تباہ ہو گیا۔ آج ہم زمین پر بیٹھے ہوئے گرے کر رہے ہیں۔

سامعین!

تم سب مل کر ایک دفعہ آواز تو دو —
 حسین

کر بلا دالے حسین!

شہنشاہ حسین!

تیرے دروازے پر بھکاری حاضر ہوئے ہیں حسین!

نودن تک تیرا ماتم کیا ہے حسین!

آج تیرے ماتم کو الوداع کہنے آئے ہیں حسین!

حسین! تیری مہمانی نہ کر سکے۔ دل بھر کے تیری عزاداری نہ کر سکے۔

حسین! اگر زندہ رہ گئے تو اگلے سال پھر یہ غم منائیں گے۔ اگر مر گئے تو —
 مولا! یہ ہمارا آخری سلام قبول فرما۔

مولّا! ہماری پریشانیاں رفع فرما
مولّا! ہمارا ملک محفوظ رہے۔“ مولّا کو تو ہم نے پکار لیا ہے۔ اب ایک آواز
اور دو۔

”بی بی زینب! آج شام شہیدیاں ہے۔ تیری پریشانی پہ ہماری
جان قربان۔“

بی بی! آج شام ہی سے تو نے چادر نہیں اڑھی۔
بی بی! ہماری عورتیں، ہمارے بچے تیری پریشانی پہ قربان ہیں
ہم سب تجھے پُر سارینے آئے ہیں۔
(خصوصاً چھوٹے بچے مل کے پکاریں)

”بی بی سکیئن! تمہارے غلام حاضر ہیں۔“
کل صبح تو یتیم ہو جاؤ گی سکیئن!
آج دل بھر کے باپ سے مل لے سکیئن!
ہمارے ماں باپ تیری یتیمی پہ قربان ہیں سکیئن!

بس بھائیو!

میں اپنی گفٹگو ختم کرتا ہوں کہ
یوم عاشور۔ جب تمام عزیز واقارب جام شہادت پی چکے توحید بیت الشرف
میں تشریف لائے۔ زہرا کا چاند۔ چہرے پہ کر بلا کی گرد۔ دل میں عزیزوں کے درد لئے
بھرائی آواز میں کہہ رہا ہے۔

• زینب! •

آج تمہارا بھائی تم سے جدا ہو کے رخصت ہو رہا ہے۔
مہین! مجھے گلے مل کے رخصت کرو۔ اور دعا کرو کہ خدا مجھے اتنی

عاقبت دے کہ میں اس مقصد کو جس کے لئے مجھے میری اماں نے
 چکی بیس کے پالا تھا۔ نانا نے کاندھے پہ سوار کیا تھا۔ باپ نے
 سینے پہ سلا یا تھا۔ آج اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے خدا مجھے توفیق
 دے۔ خدا حافظ بہن! میں جا رہا ہوں۔

سکینہ نے عبا کا دامن کپڑ لیا۔

”بابا! آپ وہاں جا رہے ہیں جہاں صبح سے جو گیا ہے واپس نہیں
 آیا۔ اگر آپ آج رات کو واپس نہ آئے تو بابا جان! سکینہ کس
 کے پاس سوئے گی؟“

”بیٹا! تم آج رات سے اپنی اماں کے پاس سونا۔“

بابا! اماں کے پاس تو چھوٹے بھائی علی اصغر سوتے ہیں۔ میں کیسے سوؤں گی؟
 ”نہیں۔ میرے لال! آج سے علی اصغر میرے پاس سویا کرے گا۔ تم اپنی اماں کے
 پاس سو جایا کرنا۔ اور دیکھنا بیٹا! ضد نہ کرنا۔ بہار بھائی کے ہاتھ بندھے ہوں گے
 چھو پھیاں مجبور ہوں گی مگر تم آرام سے زمین پر سو جایا کرنا۔“
 ”اچھا زینب!“

خدا حافظ۔ میں جا رہا ہوں۔

شبیر برآمد ہوئے یوں خیمے کے در سے
 جس طرح نکلتا ہے جازہ کسی گھر سے

شہادتِ عظمیٰ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

حضراتِ گرامی!

آج کی مجلس کا افتتاح کرنے کے لئے، بھٹے درودِ سلام کے سب حضرات متفق
آواز سے ایک دفعہ کہہ دیں۔ "اَتَا اللّٰهُ وَاَتَا الْیَوْمَ رَاجِعُونَ"

میرے محترم سامعین!

آج میرے ذمے یہ فرض عائد کیا گیا ہے کہ میں آپ کے سامنے مقصدِ شہادتِ عظمیٰ
بیان کروں۔ لہذا میں آپ کے سامنے اور خدا اور رسول کے حضور میں اقرار کرتا ہوں
کہ یہ موضوع وہ ہے جسے اللہ یا اللہ کا رسول بیان کر سکتا ہے۔ شہادتِ عظمیٰ بیان کرنا
میرے بس سے باہر کی بات ہے۔ سمندر کو قطرے میں سمونا۔ دریا کو کوزے میں بند کرنا۔
اور کائنات میں پھیلی ہوئی حقیقت کو چند لفظوں کی قید میں لانا میرے امکان کی بات
نہیں ہے۔ بہرِ نزع اُس رداً ہی کی طرح جو اپنا کاتا ہوا سوت لے کر خریدارانِ
یوسف میں شامل ہو گئی تھی۔ میں بھی حسین کے نام لیواؤں میں نام مکھوانے کے لئے
حاضر ہو گیا ہوں۔

میرے بزرگو!

یاد رکھو! جس نظام کا نام اسلام ہے۔ جس ضابطے کا نام اسلام ہے جس میں
کا نام اسلام ہے۔ جس قانون کا نام اسلام ہے۔ انسانی زندگی کے جس پروگرام کا نام اسلام

جو ہماری زبان پر ہر وقت رائج ہے۔ جسے ہم ہر وقت اپنے ساتھ وابستہ کئے ہوئے ہیں۔ اس اسلام نے اقتدارِ اعلیٰ، حاکمیت اور ماکیت اللہ کے لئے مخصوص کر دی ہے۔
گرایا۔

اسلامی ضابطے میں مالک ہے "اللہ"

حاکم ہے "اللہ"

سلطنت ہے اللہ کی

حکومت ہے اللہ کی

بادشاہت ہے اللہ کی — گویا۔

اللہ اور صرف اللہ کی حاکمیت کے اقرار کو اسلام کہتے ہیں۔

سامعین! ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء تشریف لائے ان کا اقتدار۔ ان کی طاقت توت ایسی تھی جن کے سامنے ساری دنیا سرنگوں تھی۔ بتائیے موسیٰ کے عصا کے سامنے فرعون کی طاقت کا سر جھک گیا تھا یا نہیں؟

ابراہیم نے آگ کو گلزار بنا کر فردوسی نحر کو ٹھکرت دے دی تھی یا نہیں؟ عیسیٰ نے مردے جلاد کر اپنے زمانے کے زندہ مخالفوں کے دل کے چراغ بجھا دیئے تھے یا نہیں؟ اور محمد نے معجزے دکھا کر ابو جہل جیسوں کی جہالت کو ملیا میٹ کر دیا تھا یا نہیں؟ ہر نبی نے اپنے اقتدار سے تمام دنیا سے کلمہ پڑھوایا تھا یا نہیں؟ — مگر کسی نبی نے یہ نہیں

کہا کہ "میں مالک ہوں" بلکہ ہر ایک یہی کہتا رہا۔ "میں مالک کا نمائندہ ہوں" یہاں تک کہ ختم الانبیاء کے بعد حکومتیں آئیں۔ سب سے پہلے اسلامی حکومتوں نے اپنے حاکم کے لئے لفظ "خلیفہ" تجویز کیا۔ گویا اس سے پہلے لفظ "خلیفہ" انسانی لغت میں تھا ہی نہیں یہ لفظ اسلام نے پیش کیا ہے۔ خلیفہ کے معنی یہ ہیں کہ حاکم کوئی اور ہے یہ صرف نمائندہ ہے۔ مالک کوئی اور ہے۔ یہ شخص صرف سربراہ ہے لہذا خلیفہ کو ماکیت حاصل نہیں تھی

اور رسول کا وہ آخری خطبہ جس میں آپؐ نے فرمایا تھا۔

” آج قیصر و کسریٰ کی حکومتیں میرے پیر کے پیچھے ہیں اب ملکیت کا راج ختم ہو گیا ہے۔ اب حاکمیت ختم ہو گئی ہے۔ اب سوائے اللہ کے کوئی مالک نہیں ہے۔“

اس نظریہ سے مسلمان زندہ تھا۔ اسلام زندہ تھا۔

محترم سامعین !

دہر سکتا ہے کہ الفاظ کی کوتاہی میرے اُس مقصد کو واضح نہ کر سکے۔ جہاں کہتا چاہتا ہوں۔ مگر آپ کا علم و ذہن میری کہی ہوئی بات کو خود ٹھیک کر لے گا۔ رسولؐ فرما کر چلے گئے۔ اب رسولؐ کے بعد آنے والوں نے لفظ ”خلیفہ“ سے یہ تبادلیا کہ بتانے والا کوئی اور ہے۔ ہم صرف اُس کے نمائندہ ہیں۔ گویا جب تک خلافت اپنی سربراہی کا اعلان کرتی رہی ”راشدہ کہلاتی۔ ہدایت یافتہ کہلاتی۔ اور جب خلافت نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ ”ہم بھی کچھ ہیں“ تو وہ خلافت ”راشدہ“ نہ رہی بلکہ ”ملوکیت“ بن گئی۔

حضورؐ والا زمانے کا انقلاب کہو یا دنیا کی گردش کہو کہ شام کے ملک (دشمن) میں ایک البیلا نوجوان تختِ شاہی پر بیٹھ گیا۔ اُس نے اپنے باپ کے تخت پر قدم رکھا۔ وہ اپنے آپ کو کسی کا احسان مند نہیں سمجھتا۔ تخت کو اپنے باپ کا مال سمجھ کے بیٹھا ہوا ہے۔ جوانی کی عمر۔ شعر و شراب میں پلا ہوا شہزادہ۔ بے شمار سلطنت۔ بے اندازہ دولت کروڑوں انسان حضورؐ پر کارکنے والے خزانہ انشرفیوں سے بھر پور۔ فوج کا جائزہ لیا تو بیٹھا سپاہی۔ اسلحہ کا جائزہ لیا تو بے تعداد اسلحہ۔ اور اپنی رعایا کی مردم شماری کرائی تو اُس زمانے کی بارہ کروڑ آبادی اس کی رعایہ تھی جو اُسے اعلیٰ حضرت، اُطلِ سبحانی، جہاں پناہ، جی حضورؐ، جی سرکار کہنے والے موجود تھے۔

اب تباؤ! جب بارہ کروڑ انسان اُسے جہاں پناہ، جی حضورؐ، کہہ رہا تھا تو اگر اُس کے

دماغ میں غرور پیدا ہو بھی جائے تو ممکن ہے اگر کسی اور کو یہ اسباب فراہم ہوتے تو وہ بھی مغرور ہو جاتا، گویا نیزہ نیزہ بھی مغرور ہو گیا۔

اُس نے کہا، "آج بارہ کروڑ انسان مجھے جہاں پناہ مان رہے ہیں۔ میرے پاس دولت ہے۔ خزانہ ہے۔ کوئی ایسا بھی ہے جو مجھے نہیں مانتا۔"

نیزہ کو بتایا گیا کہ ایک شخص ہے جو تمہیں اور تمہاری ملکیت کو نہیں مانتا۔ نیزہ نے پوچھا، کیا اُس کے پاس مجھ سے زیادہ فوج ہے؟

• نہیں۔

• مجھ سے زیادہ خزانہ ہے؟۔

• نہیں۔

• مجھ سے زیادہ اسلحہ ہے؟۔

• پھر وہ کون ہے؟

• ایک مزدور باپ کا مزدور بیٹا، چکی پیسنے والی ماں کا ایک بچہ، پیرنوں کا لباس پہننے والا ایک فقیر، بریاد پر بیٹھنے والا ایک تلندر، نانے کی قبر پر چراغ جلانے والا ایک مجاور، وہ مجھے تسلیم نہیں کرتا۔

نیزہ نے کہا، "نہیں، اس سے ہماری حکومت کی اطاعت قبول کرائی جائے اور ہماری بیعت لی جائے۔"

حضرات! اگر بارہ کروڑ انسان کسی شخص کی بیعت کر لیں اور اُس زمانہ میں بیعت وہی شے تھی جو اس زمانے میں دوث ہے، اگر کسی کو بارہ کروڑ دوث مل جائیں اور ایک آدمی کا دوث نہ بھی ملے تو اسے کوئی پرواہ نہیں ہوتی۔ مگر بارہ کروڑ دوث لینے کے بعد ایک انسان کے دوث پہ ضد کر کے نیزہ نے یہ ناوانستہ طور پر بتادیا کہ بارہ کروڑ ایک طرف اور یہ ایکلہ ایک طرف ہے۔ گویا اس اکیلے میں اتنا وزن ہے کہ اگر اس نے پاؤں نہ کھینے تو

یہ بارہ کروڑ ناکام ہو جائیں گے۔ پوری دنیائے اسلام کا فیصلہ ایک طرف ہے اور اس اکیلے کا فیصلہ ایک طرف ہے۔

محترم سامعین! یزید کا اعلان یہ نہیں تھا "میں خلیفہ ہوں"۔
اگر یہی اعلان ہوتا تو کوئی بات ہی نہیں تھی۔ مگر یزید کا اعلان یہ تھا کہ میں مالک الملک ہوں۔

اب بتائیے۔ رسول کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پلنے والا حسین! جبریل کو راز کی گود میں پلنے والا حسین! غافلہ کا دودھ پینے والا حسین! جبریل کے پروں پر سونے والا حسین! اللہ سے ناز برداری کرنے والا حسین! جنت سے لباس منگوا کر پہننے والا حسین! جنت کے میوے کھا کر پلنے والا حسین!

اللہ کے ہوتے ہوئے کسی اور کا مالک ہونا براشت کرے گا؟ "نہیں"
ادھر اللہ کہتا ہے۔ "اللهم مالک الملک" صرف اللہ مالک ہے۔
ادھر یزید مسخرہ کہتا ہے۔ "نہیں" میں مالک ہوں۔

حضرات! آپ دانشوروں سے پوچھ رہا ہوں۔
اللہ کہتا ہے۔ "میں مالک الملک ہوں" مگر یزید کہتا ہے۔ "نہیں، میں مالک الملک ہوں۔"

اب بتاؤ۔ مقابلہ کس کا ہو گیا؟ اللہ اور یزید کا۔
اگر یزید کہتا

"میں فرزند رسول ہوں۔ میں امام معصوم ہوں" تب تو یزید کا حسین سے مقابلہ تھا۔ مگر یزید براہ راست کہتا ہے "میں مالک الملک ہوں۔"

— معلوم ہوا کہ یزید کا مقابلہ براہ راست اللہ سے ہے۔ اب اگر اس مقابلے میں یزید جیت جائے تو ہمارے گاکون؟

• اللہ! اور اگر یزید مار جائے تب جیتے لگاؤں؟
 • اللہ! گویا مار جیت ہے اللہ اور یزید کی۔
 حسین کا تریزیہ سے مقابلہ ہی نہیں تھا۔
 اللہ نے کہا۔

• یہ روز کا جھگڑا ہے۔ کبھی نزعان مسخرہ میرے سامنے آ بیٹھا ہے۔ کبھی نزعان مسخرہ
 میرے مقابل آ بیٹھا ہے۔ کبھی ایسے میرے مقابلے میں آ جاتا ہے۔ آج میں اس روز
 روز کے جھگڑے کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔
 اللہ نے کہا۔

• یزید! اگر تم مالک الملک ہو تو اپنے مالک ہونے کا ثبوت لے کر کسی میدان
 میں آ جاؤ۔ ادھر میں ثبوت لے کر آؤں گا کہ میں مالک الملک ہوں؟
 گویا یزید اپنے مالک الملک ہونے کا ثبوت لے کر بطور گواہ میدان کر بلا میں آ گیا۔
 • اللہ! دیکھ لے۔ میں مالک ہوں
 میری فوج دیکھ۔ میں مالک ہوں
 میرا اسلحہ دیکھ۔ میں مالک ہوں
 میری سلطنت کی سطوت دیکھ۔ میں مالک ہوں؟
 اب جو یزید نے یہ کہا تو اللہ نے آواز دی۔

• ہے کوئی اس بھری دنیا میں جو میرے مالک ہونے کی گواہی دے۔ مگر یہ سوچ لے
 کہ مدعی اللہ ہے۔ لہذا گواہ کوئی کم حیثیت کا نہ ہو۔
 ادھر اللہ نے اعلان کیا کہ

• ہے کوئی جو میرے مالک الملک ہونے کی گواہی دے؟
 ادھر سردار جراحان حنت کو جوش آ گیا۔

حسینؑ نے کہا۔

”خداوند! میں گواہی دوں گا کہ تو مالک الملک ہے۔ میں گواہی دوں گا کہ ملکیت تیری ہے۔ میں دنیا کو بتاؤں گا کہ یزید مسخرہ جھوٹا ہوتا ہے۔“

اللہؑ نے کہا۔

”حسینؑ! اگر تم واقعتاً گواہی دینا چاہتے ہو تو دیکھو! میدانِ کربلا عدالت گاہ بن چکا ہے۔ یزیدؑ اپنے گواہ لے کر آگیا ہے۔ حسینؑ! تم بھی اپنے گواہ لے کر آؤ اور میرے مالک الملک ہونے کی گواہی دو۔“

چنانچہ حسینؑ اپنے گواہ لے کر کربلا کے لئے روانہ ہو گیا۔ جتنی دستاویزیں اپنی گواہی کے لئے ضروری تھیں۔ وہ بھی ساتھ لے کر مدینے سے چل پڑا۔

سامعین!

بتاؤ۔ حسینؑ مدینے سے کربلا کی طرف کیوں چل پڑا۔

لڑنے کے لئے؟۔ ”نہیں“۔ مرنے کے لئے؟۔ ”نہیں“۔ کسی کو مارنے کے لئے؟۔ ”نہیں“۔ کسی کا ملک چھیننے کے لئے؟۔ ”نہیں“۔ کسی کی سلطنت چھیننے کے لئے؟۔ ”نہیں“۔

پھر بتاؤ۔ کیوں جا رہا تھا؟

حسینؑ! خدا کے مقدسے میں گواہی دینے کے لئے جا رہا تھا۔ بلکہ یوں کہیے: حسینؑ کربلا میں ”شہادت“ کے لئے جا رہا تھا۔ ”چونکہ شہادت کے معانی گواہی دینا ہے لہذا حسینؑ کربلا میں اللہ کے مالک الملک ہونے کی گواہی دینے کے لئے جا رہا تھا۔“

حسینؑ! کربلا کیوں جا رہے ہو؟۔

• شہادت کے لئے۔ میری گواہی پر اللہ مالک الملک ہے:

اسی لئے حسینؑ کے جلوس نکلتے ہیں تاکہ اللہ کے مالک الملک ہونے کی گواہی تازہ ہوتی رہے۔ جو اس جلوس کو روکے گا۔ مگر یا اللہ کی مالکیت کو روک رہا ہے۔ بہر فرغ حسینؑ اللہ کے مالک الملک ہونے کی گواہی دینے کے لئے جود ستاویزیں گواہی میں ضرور کا عقیں۔ وہ بھی ساتھ لے کر کربلا میں تشریف لارہے ہیں۔

حسینؑ نے بہن کو آواز دی۔

زینب! تم بھی چلو۔

حسینؑ!

میں عورت زرات۔ تم عدالت میں گواہی دینے جا رہے ہو۔ مجھے کیوں ساتھ لے جا رہے ہو؟

حسینؑ نے کہا۔

”زینب! جب کربلا میں، میں مقدمہ جیت جاؤں گا۔ اللہ کی مالکیت منوالوں گا۔ اور یزیدؑ مار جائے گا تو تم شام میں جا کر یزیدؑ کی حکومت کے خلاف ڈگری کا اجرا کروا کے اس کی حکومت کو نیلام کر دینا۔ تم یزیدؑ کی شہنشاہی کو گالی بنا دینا۔“

چنانچہ بہن بھی ساتھ چل پڑی۔ گواہ بھی ساتھ چل پڑے اور اللہ کے مالک الملک ہونے کی شہادت دینے والا کربلا میں تین محرم کو آکے بیٹھ گیا۔ تین سے لے کر سات تک مثل کا معائنہ کرتا رہا۔ سات سے اتنا مشغول ہوا کہ نہ کھانے کی فرصت نہ پینے کا ہوش دسویں کو مقدمہ پیش ہو گیا۔ حسینؑ نے گواہی دینا شروع کر دی۔ ایک ایک دستاویز گواہی میں پیش کرتا رہا۔

”خدا و ندا۔ تیرے مالک الملک ہونے کی گواہی میں میرا اکبر موجود ہے۔ میرا قائم“

موجود ہے۔ میرا بھائی عباسؑ موجود ہے۔ میرا نوادر و مہمان خرمو موجود ہے۔

یہ سب گواہی دیں گے۔ ان کی شہادت ہوگی۔

سامعین !

جب اکہتر شہادتیں ہو چکیں تو خدا مقدمہ جیت گیا۔

”حسین !“ میں مقدمہ جیت گیا ہوں۔ تیری ساری گواہیاں قبول ہو چکی ہیں۔ اب میری حاکمیت منظم ہو گئی ہے۔“
حسین نے کہا ”خداوند جیت گیا۔“
”ہاں جیت گیا۔“

”خداوند !“ تیرے دربار میں شہادت دینے کے لئے اب میں خود آ رہا ہوں۔“

حسین بیت الشرف میں تشریف لائے۔ بہن کو سلام کیا۔

بہن زینب ! سلام

زینب نے جواب دیا ”حسین ! سلام

زینب ! مبارک“

”حسین ! خیر مبارک“

بہن ! میری تمام گواہیاں قبول ہو گئیں۔ میرا عباس بھی منظور۔ قاسم بھی منظور۔ اکبر بھی منظور۔ میرا نوادہ مہمان خڑ بھی منظور۔ میرے درست بھی منظور۔
بہن ! میں تو مقدمہ جیت گیا ہوں۔ اسلام کا میاب ہو گیا ہے۔“
زینب نے پوچھ لیا۔

”حسین ! اسلام نے مجھے کیا انعام دیا ہے؟“

حسین نے جواب دیا۔ ”اسلام نے مجھے یہ انعام دیا ہے کہ ”حسین تو نے اللہ کو مالک
منوا کے اسلام کی عظمت رکھ لی۔ اب اسلام کا تجھ سے یہ وعدہ ہے۔“
”حسین ! یاد رکھو ! اسلام تجھ سے وعدہ کرتا ہے۔“

جس دل میں حسینؑ! تو نہیں ہوگا دہاں میں نہیں ہوں گا۔
 جس گھر میں حسینؑ! تو نہیں ہوگا دہاں میں نہیں ہوں گا۔
 جس علاقے میں حسینؑ! تو نہیں ہوگا۔ دہاں میں نہیں ہوں گا۔
 "اسلام نے تو مجھ سے یہ وعدہ کیا ہے"

زینبؑ نے پوچھا۔

"حسینؑ! خدا تمہیں کیا انعام دے گا؟

بہن! اپنا انعام لینے کے لئے خدا کے دربار میں میں خود جا رہا ہوں۔

بہن! سجدے کے بل جاؤں گا۔

زینبؑ! اتنے بڑے دربار میں جانا ہے۔ خالی ہاتھ جاتے ہوئے شرم آتی ہے۔

کوئی تحفہ لے جانا چاہتا ہوں۔

زینبؑ بہن! کوئی تحفہ ہے تیرے پاس؟

زینبؑ نے کہا "حسینؑ! میرے پاس تو دو عمل تھے وہ ختم ہو گئے"

"قاسمؑ کی ماں! تیرے پاس کوئی تحفہ ہے؟

"حسینؑ! میرے پاس تو ایک ہی زبرد تھا جو ختم ہو گیا۔"

"اکبرؑ کی ماں! تیرے پاس کوئی تحفہ ہے؟

"حسینؑ! میرے پاس تو ایک ہی شب چراغ تھا وہ بھی ختم ہو گیا۔"

حسینؑ ابھی پوچھ ہی رہے تھے کہ ایک کونے سے آواز آئی۔

"حسینؑ! میرے پاس ایک چھوٹی سی کٹی میرے پاس ہے۔ اگر تحفہ کئے لئے کام

آئے تو لے جاؤ۔"

چنانچہ حسینؑ نے چھ مہینے والے کو ہاتھ پہ اٹھالیا۔

"خداوند! شہادتیں تو ہر یکیں۔ اب یہ تحفہ لایا ہوں۔"

چنانچہ اللہ کے حضور میں حسینؑ نے تحفہ پیش کر دیا۔ - دفن کر کے گھڑائے۔ بہن نے پوچھا۔
 حسینؑ! تمہارا تحفہ منظور ہوا!

”ہاں بہن! میرا تحفہ بھی منظور ہو گیا“

”بہن! اب میں خود جا رہا ہوں۔ ذرا مجھے اپنے ہاتھ سے لباس بھی پہنا دے۔“
 سامعین!

ایک مغلطہ ورود العار ہے جسے میں دور کرنا چاہتا ہوں۔ ہمارے ذاکرین اکثر یہ
 پڑتے ہیں کہ حسینؑ نے زینبؑ سے کہا۔

”بہن مجھے پرانے کپڑے پہنا دو۔“

حالانکہ غلط ہے۔ خدا کی قسم! میں نے کربلا کی ساری تاریخ پڑھ ڈالی مگر کہیں نہیں
 پڑھا کہ حسینؑ نے پرانے کپڑے پہنے ہوں۔ بلکہ میں نے تو یہ پڑھا ہے کہ حسینؑ نے کہا۔
 ”زینبؑ! آج میں پرانے کپڑے نہیں پہنوں گا۔ آج میں شہنشاہ بن کے جا رہا ہوں
 مجھے آج بہترین لباس پہنا دو۔“

چنانچہ نائما کے معراج والا امام حسینؑ نے سر پہ باندھا۔ اپنی اماں کی چادر سے کمر
 باندھی۔ جعفر طیار کی شہپر کمر سے لگائی۔ حمزہ کی زرہ پہنی۔ حیدر کرار کی تلوار لٹکائی اور حق
 عجبے کے نعلین پہنے۔ گویا آج حسینؑ نے بزرگوں کا لباس زیب تن فرمایا اور بہن سے کہا۔
 ”زینبؑ! خدا حافظ! اب میں جا رہا ہوں۔“ چنانچہ سر سے پیر تک بزرگوں کا لباس
 تھا اس لئے زینبؑ نے جو اس وقت تاریخی فقرے کہے ہیں وہ آج ہمہ فضا میں گونج رہے
 ہیں۔

جب حسینؑ اپنے بزرگوں کا لباس پہن کر چلے تو زینبؑ نے کہا۔

”بی بیو! آؤ۔ دیکھو۔ آج میرے نانا رسول اللہؐ جا رہے ہیں۔ آج میرے بابا

حیدر کرار جا رہے ہیں۔ آج میری اماں فاطمہؑ رخصت ہو رہی ہے۔ آج جانی حق جا رہی ہے۔“

آج میرے سارے بزرگوں کا مایہ میرے سر سے اٹک رہا ہے :

بہر نزع ! حسین میدان میں تشریف لائے۔

مولاً جس دقت فوج کے سامنے پہنچے ہیں تو اُس بے حیا فوج نے طنز کیا۔

• حسین ! اب تو بالکل تنہا ہے۔ تیرے سارے عزیز مر چکے ہیں۔ اب ہمیں کیوں تکلیف دیتا ہے۔ گھوڑے سے نیچے اتر آؤ۔ تاکہ جلدی تیز خاتمہ کر کے جنگ ختم کی جائے۔
اب جو فوج نے یہ طنز کیا تو حیدر کرار کی بیٹی کو جوش آگیا اور وہیں دروازے سے آرازدی۔

• حسین ! یہ تجھے مجبور سمجھتے ہیں۔ زینب چاہتی ہے، ذرا تنواری دیر کے لئے میری اماں کے دودھ کی طاقت بھی دکھا دے :

حسین نے جواب دیا۔

• اچھا بہن ! اگر تیری یہی مرضی ہے تو ایسا ہی ہو گا :

چنانچہ حسین نے ہم اللہ کہہ کے تلوار نکالی۔ نخلیہ تک فوج کو بھگاتے ہوئے پہنچے تو فوج کا پچھلا دستہ کوفے کے بازاروں سے ٹکراتا اور جب حسین گھوڑا دوڑاتے ہوئے نخلیہ سے واپس کر بلا آئے تو ایک بلند ٹیلے پر چڑھ کے بلند آواز سے کہتے۔

”یا ایھا الناس ! انا بن رسول اللہ !“

لوگو ! میں رسول کا بیٹا ہوں۔

زینب فوراً جواب میں کہتی ہیں : ”مرحبا یا بن رسول اللہ !“

”شاہش۔ اے رسول کے بیٹے۔“

بہر نزع ! حسین نے اس شان سے تین حملے کئے اور حملوں کا انداز یہ تھا کہ

آنسو نکل آئے جسے دم توڑتے دیکھا

تلوار نہ ماری جسے منہ موڑتے دیکھا

فرزندِ رسولؐ نے اس طرح جہاد کیا۔ دورانِ جہاد اللہ کی طرف سے غائبی آواز آگئی۔
 "حسین! شجاعت دنیائے دیکھ لی۔ اب آجا ہمارے پاس۔
 اے نفس مطمئنہ! آجا ہمارے پاس۔
 حسینؑ نے گھوڑے کی باگ اس کے کاندھوں پر رکھ دی اور فرمایا۔

"ذوالجناح!"

یہ تیری میری آخری ملاقات ہے۔ اب میں اللہ کے ہاں جا رہا ہوں۔

آؤ تیرو — آ جاؤ

دشمن کی تلواروں — آ جاؤ

دشمن کے نیزوں — آ جاؤ

امام رضا علیہ السلام کا فرمان ہے۔

"میرے جد کے زخم کوئی گن ہی نہیں سکتا۔"

مولاً فرماتے ہیں جتنے قرآن میں حرف ہیں اتنے ہی میرے جد کے بدن پر زخم تھے۔

گویا اتنے زخم کھا کے جب مولاً زمین پر گرنے لگے تو گھوڑے نے پاؤں جھکا دیئے۔

امام زماں زیارتِ ناحیہ میں فرماتے ہیں۔

"میرا سلام ہو اس شہید پر جو زمین پر مہمانِ زمین پر تھا۔"

لوگوں نے پوچھا "مولا پھر کہاں تھا؟"

فرمایا "گھوڑے سے گر گیا تیروں پر رہ گیا"

بہرِ نوح۔ حسینؑ کا بدن کافی دیر تک تیروں پر معلق رہا۔ مولاً نے زور دیا تو ادھر کے

تیرا دھڑ بھل گئے۔ اور

حسینؑ نے سجدے میں سر رکھ دیا "سبحان ربی الاعلیٰ"

"خداوند اگواہ رہنا۔ میں تیرے اعلیٰ ہونے کی گواہی دے

رہا ہوں۔ میں تیرے اعلیٰ ہونے کی شہادت دے رہا ہوں۔
تدرت نے بڑھ کے منہ چوم لیا۔
حسین!

”اب قیامت تک ”سماں ربی الاعلیٰ“ جو بھی کہے گا تیرے سجدے
کے صدقے میں کہے گا۔“

حسین! تیری اس شہادت کا انعام تجھے یہ دیتا ہوں۔

”میں بھی باقی تو بھی باقی۔ نہ میں ختم ہوں گا نہ تو ختم ہوگا۔“

حسین! میرا ذکر بھی قیامت تک رہے گا۔ تیرا ذکر بھی قیامت تک رہے گا۔

حسین! میری اذان ہوگی تیری نوبتِ شاہی ہوگی۔

حسین! جہاں جہاں میرا تذکرہ ہوگا۔ وہاں وہاں تیرا تذکرہ بھی ہوگا۔ جتنے میرے گھر لے

حسین! اتنے ہی تیرے گھر ہوں گے۔“

چنانچہ یہی یہی کے خلاف ڈگری ہوئی اور امام حسین علیہ السلام نے اللہ کی طرف سے
شہادتِ عظمیٰ کا انعام پایا۔ جس کی یاد آج ہم بازاروں میں جلوس کی شکل میں منا رہے ہیں۔

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ

فلسفہ اخلاق کی اصطلاح میں

عقل کے مطابق نقل و حرکت کرنے کو

”شجاعت“

کہتے ہیں

رضی اللہ عنہ

اصحابِ حسین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

خداوندِ عالم کی حمد و ثنا کے بعد حضراتِ محمد و آلِ محمد پر درود و سلام

حضراتِ گرامی!

کربلا کا واقعہ آج واقعہ ہو چکا ہے۔ لہذا اس وقت کی یہ مجلس پورا واقعہ کربلا پر ایک تبصرے کی شکل میں ہونی چاہیے۔ گویا یہ سب سے اہم ترین مجلس ہے اور تمام مجالس کی روح مجلس ہے۔

محترم بزرگو! جس رسول کی ہم امت ہیں اس کے لئے اللہ نے قرآن میں یہ فیصلہ کیا ہے کہ۔

”إِنَّا أَتَيْنَا بِكَ الْبَيِّنَاتِ وَأَنبَايَا يَعُونُكَ اللَّهُ“

جو تجھ سے بیعت کرتے ہیں وہ اللہ سے بیعت کرتے ہیں

يَدُ اللَّهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ فَمَن نَّكَثَ فَإِنَّمَا يَنكُثُ عَلَىٰ نَفْسِهِ

جو اس بیعت کو توڑ دے گا وہ اس کا خود نقصان اٹھائے گا۔

وَمَن أَدْفَأْ بِمَا عَاهَدَ عَلَيْهِ اللَّهُ فَمَآ يَصْوَئِهِ أَجْرًا عَظِيمًا

اور جو اللہ سے کئے ہوئے عہد کو پورا کرے گا اللہ اُسے اجرِ عظیم دے گا۔

گویا اُس وقت سے لے کر آج تک ہم رسول کے ہاتھ پر بیعت کر رہے ہیں۔

ہم نے رسول سے ایک عہد کیا ہے اور وہ عہد یہ ہے ”یا رسول اللہ! ہم مسلمان ہیں۔ ہم

آپ کے ہاتھ پر بیعت کر رہے ہیں۔ ہمارا آپ سے اور آپ کے واسطے خدا سے

خدا سے عہد یہ ہے کہ

ہم اور ہماری ہر شے۔ ہماری جان، ہمارا دل، ہماری اولاد، ہماری ہر عزیز شے آج سے آپ کی بیعت کرنے کے بعد ہماری نہیں رہی بلکہ اللہ کی ملکیت ہے۔

اب اللہ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ اس عہد کو کسی بندے نے پورا بھی کیا ہے یا نہیں۔ لہذا اللہ نے اعلان کیا: ”مے رسولؐ کے ساتھ عہد کرنے والے۔ میں تمہارا امتحان لوں گا۔ کیا تم اس عہد میں ثابت قدم بھی ہو یا نہیں۔“

مگر جس وقت امتحان ہو گا اس وقت تمہاری حالت یہ ہوگی کہ تم پر خوف بھی ہو گا۔ بھوک بھی ہوگی۔ پیاس بھی ہوگی۔ مال و جان کا خطرہ بھی ہو گا۔

سامعین! یہ تو حقیقی مختصر سی تہید۔ اب میں پوچھتا ہوں: ”یا اللہ! تو ہی بنا کسی نے اس امتحان میں کامیابی بھی حاصل کی یا نہیں۔ کوئی ایسی جماعت پیدا ہوئی ہے جس نے پوری قابلیت کے ساتھ تیرے اس امتحان کو پاس کیا ہو اور تو نے بھی جہنم کے کھردیا ہو؟“

تم جیسا کوئی پاس نہیں ہوا۔

اللہ جواب میں کہتا ہے۔

”اُن ہی مومنین میں سے ایسے بہادر مرد بھی ہیں جنہوں نے اس عہد کو سچا کر دکھایا۔“

میرے بھائیو!

آؤ ہم سب مل کر ان بہادروں کو ڈھونڈیں جنہوں نے اس عہد کو پورا کر دکھایا ہو جن کی ہر شے اللہ کی ہے۔ اب جہنم ڈھونڈنے چلے تو دنیا کے کسی خطے میں ہمیں ایسے آدمی نہ ملے۔ آخر ڈھونڈتے ڈھونڈتے ہم کربلا کے تپتے ہوئے صحرا میں پہنچے۔ دھوپ

ذبحہ ذرہ بے کل تھا۔ عرب کا صحرا تپ رہا تھا۔ آفتاب نصف النہار پر ٹھہرا ہوا تھا کہ ایک بے ضرر تانکہ مرحوم کر کر بلا کے صحرا میں چاروں طرف حق و دق جنگل۔ بیچ میں چھوٹی سی منبر۔ اس منبر کے کنارے تانکہ اُترا۔ نیسے لگے۔ خیموں میں عورتیں جا کے بیٹھیں۔ بچے ماؤں کی گود میں بیٹھے۔ مرد خیموں سے باہر بیٹھے۔ گن کے دیکھا تو تھوڑی کا تعداد۔ ان میں بڑے بھی ہیں، جوان بھی ہیں۔ بچے بھی ہیں اور عورتیں بھی ہیں۔

”خداوند! یہ تھوڑے سے آدمی یہاں کیوں آئے ہیں؟“

اللہ نے جواب دیا۔

”مجھ سے کئے ہوئے عہد کا امتحان دینے آئے ہیں۔“

”خداوند! — ساری دنیا میں یہ تھوڑے سے آدمی ہی پاس ہو سکتے ہیں؟“

اللہ نے کہا:۔

”تم انہیں تھوڑا نہ سمجھو۔ یہ گنتی میں تو تھوڑے ہیں مگر ساری دنیا سمٹ کے یہاں آگئی ہے۔“

اب جو ہم نے دیکھا تو پتہ چلا کہ تمام دنیائے انسانیت کی نمائندگی اس جماعت

میں ہے۔ ان میں افریقی بھی ہے۔ یورپی بھی ہیں۔ ایشیائی بھی ہیں (ان دنوں میں تین بڑے عظم تھے) ان میں گورے بھی ہیں۔ کالے بھی ہیں۔ ان میں عرب بھی ہیں۔ ان میں غلام بھی ہیں۔ آزاد بھی ہیں۔ ان میں امیر بھی ہیں غریب بھی ہیں۔ ان میں عالم بھی ہیں۔ جاں بھی ہیں۔ ان میں بڈے بھی ہیں جوان بھی ہیں۔ ان میں بچے بھی ہیں۔ عورتیں بھی ہیں۔ غرض ہر انسانی طبقہ کی نمائندگی یہاں موجود ہے۔ گویا پوری عالم انسانیت اس جماعت میں سمٹ کے آگئی ہے۔ — اور ان کا تانکہ! سبحان اللہ!

منا ہے۔ اگر پارس سے لوہا نکلا جائے تو اُسے سونا بنا دیتا ہے۔ مگر ان پہنڑ کا تانکہ

ایسا پارسی کہ اُس نے سونا نہیں بنایا بلکہ جو بھی اس کے ساتھ وابستہ ہو گیا اُسے بھی پارس

بناتا گیا۔ گویا حسینؑ نے کربلا میں بہتر حسینؑ بنا کے کھڑ کر دیئے جو امتحان دینے کے لئے تیار ہو گئے۔۔۔ لہذا آج کا دن جس میں آپؐ نے ماتم کیا۔ جلوس نکالا۔ عشرہ مناپا۔ آج ایک قوم اپنے عہد کا امتحان دے رہی ہے۔ بڑھے بھی ہیں، جوان بھی ہیں، بچے بھی ہیں، اپنے بھی ہیں، پرانے بھی ہیں۔ غرض سب آج امتحان دینے کے لئے تیار کھڑے ہیں۔۔۔ بوڑھوں میں سب سے پہلے ایک حبشی بڑھے کو پیش کرتا ہوں جن کا نام تھا جُورُنؑ۔ بچکانوے سال کا بڑھا۔ حسینؑ کے بارہوی خانہ میں کام کرنے والا آج اپنے عہد کا امتحان دے رہا ہے۔ جُورُنؑ ٹھکی ہوئی گردن کے ساتھ حسینؑ کے سامنے کھڑا ہوا۔

”حسینؑ!“

میں بھی چاہتا ہوں آج تیرے اوپر قربان ہو جاؤں۔ حسینؑ نے سر سے پیر تک بڑھے غلام کر دیکھا اور بڑی شفقت سے فرمایا۔

”جُورُنؑ! تو میرے بزرگوں کی یادگار ہے۔ تُو نے میرے بزرگوں کی آنکھیں دیکھی ہیں۔ تو بہت بوڑھا ہو چکا ہے۔ کسی طرف نکل جا۔“

جب امامؑ نے یہ فرمایا تو بڑھے حبشی کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

”حسینؑ! ٹھیک ہے۔ میں نے اپنی حد سے بڑھ کر بات کہی ہے۔

”حسینؑ! کہا میں۔ کہا تیرے اوپر قربان ہونا۔“

حسینؑ تیرے اوپر قربان ہو نہ والا تو عباسؑ جیسا لاشی چاہیے۔ اکبرؑ جیسا زہنہال چاہیے۔ حبیبؑ جیسا بنی اسد چاہیے۔ مگر چونکہ میں ایک حبشی غلام ہوں۔ میرا رنگ کالا۔ میرے خون میں بدبو، میرا نسب نامہ معلوم۔ لہذا مجھے یہ ہمت نہیں کرنی چاہیے تھی۔ مجھ سے گستاخی ہو گئی۔ حسینؑ! میں کسی طرف نکل جاؤں گا۔ مجھے درندے کھالیں گے۔“

اب جو جُورُنؑ نے یہ فقرہ کہا تو حسینؑ نے بڑھ کے جُورُنؑ کا سراپنہ سینے سے لگایا۔

”چچا جرن! ٹو بڑا مانگیا۔ تو مجھے عباس کی طرح پیار ہے۔ فکر نہ کر تو بھی اسٹائن دے گا۔ جا۔ اپنے اسٹائن کی تیاری کر۔“

امام کے فرمان کے بعد جرن کا چہرہ شگفتہ ہو گیا۔ نہ کوئی اسکو پاس تھا۔ نہ کوئی گھوڑا پاس تھا۔ سید حامید لان میں جا کے کھڑا ہو گیا۔

”اے بے حیا قوم! میں عمر کے بیٹے کی حمایت کے لئے آیا ہوں۔ رادھر سے جرن نے یہ فقرہ کہا رادھر سے پتھر برسے۔ بڑھی پسلیاں ٹوٹ گئیں۔ گرا آواز دی۔

”حسین! میں گر گیا۔“

امام پیچھے۔ سرگودھیں لیا اور رخسارہ پر رخسارہ رکھ دیا۔ اب جو امام نے رخسارہ پر رخسارہ رکھا تو جرن کو ہنسی آگئی اور ہنس کے کہتا ہے۔

”حبیب! رادھر آؤ۔“

حبیب آئے تو بڑھا حبشی مسکرا کے کہتا ہے۔

”حبیب! تم میرا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ دیکھتے نہیں ہو کہ عمر کے بیٹے کا رخسارہ میرے رخسارے پر ہے۔“

جرن نے جان دے دی اور کہ بلا مشک عمر سے مہکتا رہا۔ یہ اس بڑھے کی بات تھی۔

اب آپ کو ایک جوان کی بات سنا دوں۔ عبداللہ ابن وہب کہتی۔ نیا دلو لہا نوجوانی کا عالم۔ کہ بلا کا پہلا شہید میدان میں جا رہا ہے۔ بیوی سے رخصت ہونے لگا۔ کچھ دیر ہو گئی تو انہوں نے کہا۔

”بیٹا! بیوی کی باتوں میں تو نہیں آگیا؟“

عبداللہ خیمے سے باہر نکلا تو انہوں نے دیکھا کہ بیوی شہر کا دامن پکڑے یہ کہہ رہی ہے۔

”عبداللہ! خدا حافظ۔ جاؤ مرنے کے لئے۔ شہادت مبارک ہو
مگر ایک وعدہ کرو کہ قیامت میں جب تو رسولؐ کے سلام کو جائے تو
مجھے نہ بھولنا۔“

بہر فرغ۔ نوجوان میدان میں گیا۔ دورانِ جہاد ہاتھ کی انگلیاں کٹ گئیں۔ تلوار گر گئی۔
تو اس کی بیوی دوڑی اور تلوار اٹھا کے شوہر کو دی۔ چنانچہ عبداللہؑ نے دوسرے ہاتھ
میں تلوار پکڑ لی اور دانتوں سے بیوی کا دامن پکڑ کر خیمے میں واپس لایا اور مولّا سے عرض کی
”مولّا! اسے زینبؑ کی خدمت میں پہنچا دو۔“

عبداللہؑ ابنِ وہب کبھی کے بعد ایک اور بڑھامرت سے ہم کلام ہوا۔ وہ تھے
حضرت خادۃِ صحابیؑ رسولؐ۔ جب وہ شہید ہو گئے تو امامؑ لاشے پر پہنچے۔ لاشہ اٹھایا
گنچ شہیداں میں رکھا۔ جب واپس آ رہے تھے تو امامؑ نے دیکھا کہ خیمے کا پردہ اٹھا اور ایک
بچہ خیمے سے دوڑتا ہوا نکلا جیسے ابر میں سے چاند نکلتا ہو۔ امامؑ نے آواز دی۔
”الہیبت! اس بچے کو روکو۔“

بچہ قریب آیا۔ امامؑ نے بڑھکے گود میں اٹھایا۔ پوچھا

”بیٹے تم کہاں جا رہے ہو؟“

مولّا! میں مرنے جا رہا ہوں۔

”تم کس کے بیٹے ہو؟“

مولّا! میں خادۃؑ کا بیٹا ہوں جو ابھی شہید ہوا ہے۔“

حسینؑ نے پوچھا۔ تیری ماں کہاں ہے؟

”خیمے میں۔“

”بیٹے! تیری ماں تو بیدہ ہو گئی۔ جاؤ۔ اپنی ماں کے پاس جا کے بیٹھو۔“

اب جو مولّا نے یہ کہا تو بچے نے ایڑیوں پر کھڑے ہو کر عرض کی۔

”مولا! یہ کرتا اماں نے ابھی پنہایا ہے۔ یہ کمر میری اماں نے باندھی ہے۔ یہ تنواری
مجھے اماں نے دی ہے۔ میری ماں نے مجھے مرنے کے لئے بھیجا ہے۔“ ابھی بچہ
یہ باتیں کہہ ہی رہا تھا کہ خیمے کے دروازے سے آواز آئی۔

”حسین! جلدیہ کی ماں خرش نصیب تھی۔ مگر مجھ بیوہ کے ہر یہ کو
رو نہ کرو حسین! اسے مرنے دو تاکہ میں بھی اس امتحان میں کامیاب
ہو جاؤں۔“

ساعتیں! ظہر کا وقت آگیا۔ حضرت سعیدؓ نے برس کا بڑھا صباہی حسینؓ کے سامنے
پہنچا اور عرض کی۔

”مولا! ظہر کا وقت ہے۔ ہم آپ کے ساتھ جماعت کی نماز پڑھنا چاہتے ہیں۔
مولائے کہا۔“

”شاباش۔ خدا تمہیں اجر خیر دے۔ اس عالم میں بھی نماز تمہیں یاد ہے۔“
چنانچہ مولائے نماز شروع کرادی اور حضرت سعیدؓ کے سامنے کھڑے ہو
گئے تاکہ کوئی تیر فرزند رسولؐ تک آنے نہ پائے۔ اب جو مولائے نماز شروع کی تو
دشمن کی طرف سے برابر تیر آنے لگے۔ سعیدؓ نے تیروں کو اپنے سینے پر روکنا شروع کر
دیا۔ بڑھا آدمی۔ بڑھی پللیاں تیروں سے ٹوٹ گئیں۔ ادھر مولائے سلام پھیرا ادھر
سعیدؓ کی گود میں اگر۔ اور اگر کے پرچتا ہے۔

”هَلْ وَفَيْتَ يَا بَنِي سُرَسُولِ اللَّهِ“

”مولا! میں نے جو عہد کیا تھا وہ پورا کر دیا۔؟“

امامؑ نے جواب میں فرمایا: ”انت امامی فی الجنة۔“ سعیدؓ میں جنت میں جاؤں گا
تو تو میرے آگے آگے چلے گا۔ اب جو مولائے یہ فرمایا تو سعیدؓ کہتا ہے۔
”مولا! اگر یہ بات ہے تو میری ایک عرض ہے۔“

امامؑ نے فرمایا "سعیدؓ کہو کیا بات ہے؟"

"مولاً! میرے بدن سے تیرا نکانہ میں تیروں سمیت تیرے نانائے پاس جانا چاہتا ہوں۔" اور یہ کہہ کے سعیدؓ کہتا ہے۔

"مولاً! کوئی میرے سر نہ بیٹھا میرا سر دبا رہا ہے۔ مجھے آرام مل رہا ہے۔ مجھے بڑا آرام مل رہا ہے۔"

مولاً نے فرمایا "سعید سلام کرو۔ یہ میرے نانا رسول اللہؐ آئے ہیں؟"

مولاً! کوئی میرے سینے پر ہاتھ پھیر رہا ہے؟

سعیدؓ! یہ میرے ابا حیدرؓ کر آئے ہیں؟

مولاً! کوئی میرے بازو دبا رہا ہے؟

سعیدؓ! یہ میرے بھائی حسنؓ آئے ہیں؟

مولاً! کوئی میرے پاؤں کے پاس بھی ہے؟

سعیدؓ! پاؤں سمیٹ لو۔ تیرے استقبال کو میری اماں آئی ہے؟

بہر نوح! اصحابِ حسینؑ اپنے کئے ہوئے عہد کو پورا کر رہے ہیں۔ اور جب تمام

اصحاب اپنا اپنا امتحان دے چکے تو اب حسینؑ کا اپنا امتحان ہے۔

"یا اللہ! تیرے حضور میں امتحانِ عشق دینے کے لئے میں خود آ رہا ہوں۔ اپنا

کیا ہوا عہد پورا کرنے کے لئے میں آ رہا ہوں؟"

حسینؑ میدان میں آئے۔ خمیوں میں عورتیں دم بخود ہیں۔ دروازے پر زینبؓ خاموش

کھڑی ہے۔ دورانِ جہاد بے حیا فوج نے تسخّر کے لیے میں کہا۔

"حسینؑ! اب تیرا آخری وقت ہے۔ کیوں ہمیں بھی پریشان کرتے ہو؟ کھڑے

سے اتر آؤ۔ تاکہ یہ جنگ جلدی ختم ہو جائے۔"

جب بے حیا فوج کا یہ طنزیہ فقرہ زینبؓ نے سنا تو علیؑ کی بیٹی کو جوش آ گیا۔

دروازے سے آواز آئی۔

”حسین! یہ تجھے مجبور سمجھتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے لئے میری آٹاں“ کے

دودھ کی طاقت دکھا دے۔ تاکہ یہ سمجھیں کہ حسین مجبور ہے۔“

”اچھا زینب! اگر تیری یہی مرضی ہے تو ایسا ہی ہو گا۔“

حسین نے جب بسم اللہ پڑھ کے تلوار نکالی اور فوج پر حملہ کر دیا۔ تاریخ عالم گواہ ہے

کہ حسین فوج کو نخلیہ تک بھگاتے ہوئے پہنچے تو فوج کا پچھلا دستہ کوفے کے بازاروں سے

ٹکرا گیا۔ اور جب حسین دوڑتے ہوئے نخلیہ سے واپس کر بلا آئے تو بلند ٹیلے پر چڑھ کے

بلند آواز سے کہتے۔ اَنَا ابْنُ رَسُولِ اللَّهِ۔ ”لوگو! میں رسول کا بیٹا ہوں۔“

زینب فوراً جواب میں کہتی۔ مَرَّ جِیَا ابْنُ رَسُولِ اللَّهِ۔ ”شاباش۔ اسے

رسول کے بیٹے۔“

بہر نزع! حسین نے جب اس شان سے تین حملے کئے تو دوران جہاد اللہ کی طرف

سے غائبی آواز آئی۔

”اے نفس مطمئنہ! دنیا نے تیری شہادت دیکھ لی۔ اب آجاؤ

ہمارے پاس۔“

اے آلِ محمد

اگر محبت میں ہم پورا نہیں مہترتے تو اتنا دعویٰ ضرور ہے

کہ تمہارے دشمنوں سے ہمارا کوئی

واسطو نہیں ہے۔

(خطیب آلِ محمد)

انسان کی فطرت میں داخل ہے کہ جس سے اُسے عقیدت ہو جائے، اُس کیلئے وہ اپنی اُلفت کے اعتبار سے اچھے سے اچھا لفظ استعمال کرتا ہے۔ جتنا اچھا لفظ اُس کے ذہن میں آئے وہ اپنے ذہن کے مطابق اچھے سے اچھا لفظ استعمال کرتا ہے، چاہے وہ خود حقیقت میں اچھا نہ رہے، مگر چاہتا ہی ہے کہ اچھا لفظ استعمال ہو۔ جس طرح ایک مُرید اپنے پیر کے پاس گیا، پیر سائیں! ایک تعویذ لکھ دو، تاکہ میرے گھر چوری نہ ہو۔ پیر نے کہا، میں تعویذ بھی لے جاؤ اور ایک گنا بھی پال لے جو تیرے گھر کی حفاظت کرے۔ مُرید نے عرض کیا، جناب میرے تو پیر بھی تھی اور گتے بھی تھی۔ مُرید نے اپنے پیر کی بڑی عزت کی تھی۔ بڑا شرف بڑھایا تھا، اپنی عقل کے مطابق بات کی تھی، مگر خدا ایسے نادان دوستوں سے بچائے جو بظاہر تو تعریف کرتے ہیں۔ بات کچھ اور ہوتی ہے۔ اسی طرح کی یہ ایک کہانی ہے کہ لوگ کچھ بات کرتے ہیں۔ نتیجہ کچھ اور نکلتا ہے۔

سیرے خترم سامعین!

انسان کی لکھی ہوئی تاریخ کے مطابق آج سے پینتالیس سو سال پہلے عراق کی سرزمین پر عمر نامی ایک مقدس اللہ نے ایک بچہ پیدا کیا۔ جس کا نام تھا۔ ابراہیم۔ اور یہ وہ زمانہ تھا جب ہمارے بزرگ عظیم پاک و ہند میں راجہ رام چندر کے بعد جبرق کی حکومت تھی۔ ابراہیم پیرائش کے بڑے قصبے میں جن کا ذکر کیا جائے تو کہانی طویل ہو جائے گی۔ بہرِ نوع۔ جہاں ابراہیم پیدا ہوتے یہ وہ جگہ ہے جو شہر بابل کہلاتا ہے۔ جن کے کھنڈرات اب نکالے جا رہے ہیں۔ بابل شہر دُنیا میں سب سے بڑا شہر تھا۔ اُس کا رقبہ تقریباً ڈھائی سو مربع میل میں پھیلا ہوا تھا۔ بابل شہر کے محلوں کے نام یہ تھے۔ غازیہ، نینوا، کر بلا، اہلہ و عینرہ۔ یہ سب بابل کے محلے تھے۔ اُس شہر میں اُس وقت دُنیا میں جتنے مذہب

تھے۔ ہر مذہب کے آدمی آباد تھے۔ ہر مذہب کا پیشوا دامن رہتا تھا۔ ہر مذہب کا عبادت خانہ دامن موجود تھا۔ ان تمام مذاہب میں کچھ لوگ خدا پرست بھی تھے۔ خدا پرستی دنیا میں ہمیشہ رہی ہے۔ خواہ کسی شکل میں رہی ہو۔ بہر نوع — اظہر پست بھی تھے وہ۔

عبادت خانے کو بالی زبان میں "کرب" کہتے ہیں۔ یہ عبادت خانہ فلاں بُت کا، یہ عبادت خانہ فلاں بُت کا۔ جہاں اللہ کا عبادت خانہ تھا اسکو "کرب اللہ" کہتے تھے۔ جسے آج کر بلا کہتے ہیں، یہاں وہ قوم آباد تھی جو اللہ کو پوجتی تھی اور ارباب سے — ایک — کر بلا جس جگہ کو کہتے ہیں یہاں سے لے کر کوڈنک جو اڑتالیس میل کا ٹکڑا ہے، یہ سب ایک جھیل تھی پھر ایک زلزلہ آیا — زلزلے کا اثر یہ ہوا کہ وہ جھیل خشک ہو گئی اور جھیل کی جگہ دامن ریگستان ہو گیا — عربی زبان میں جھیل کو کہتے ہیں "نہ" — آپ نے جغرافیہ میں پڑھا ہوگا لفظ "انباتے" لہذا جھیل کہتے ہیں "نہ" کہ اور خشک ہو جانے کو کہتے ہیں "جف" — وہ جھیل تھی اور خشک ہو گئی اس لئے اس جگہ کا نام رکھا گیا "نہ جف" جسے آج "نجف" کہتے ہیں۔

بہر نوع — آپ یہ کہنا کی سُن رہے ہیں کہ اہل شہر میں حضرت ابراہیم پیدا ہوئے اور جب انکا زمانہ عروج آیا۔ انہوں نے سب سے پہلے دنیا کو علم نجوم کا دغظ کیا — دستاروں کے علم، کا تعارف کروایا۔ ان کی شہرت ہوئی کہ عراق میں ایک الیا شخص ہے جو ستاروں کا علم بتاتا ہے چنانچہ راجہ جسر تھ نے یہاں سے طلبہ کی جماعت بھیجی۔ ابراہیم سے نجوم کا علم سیکھنے کے لئے — انہوں نے جا کے نجوم کا علم سیکھا اور واپسی پر بجائے ہندوستان آنے کے وہ مصر رہ گئے۔ کافی عرصہ تک وہ مصر میں رہے۔ یہاں تک کہ جناب ابراہیم کے انتقال کے ہزار، ڈیڑھ ہزار سال بعد مصر پر حکومت ہو گئی فرعون کی فرعون کسی کا نام نہیں تھا بلکہ فرعون کہتے ہیں بادشاہ مصر کو تو ان میں سے ایک

فرعون کے جی میں آیا، چلو ہندوستان کی سیر کریں، اور ایسے آدمی چاہیں جو مجھے ہندوستان کی سیر کرادیں۔ ابراہیمؑ کے شاگرد جو نجوم سیکھ کے آتے تھے، وہیں ٹھہر گئے تھے وہ اُس وقت بھی ہندو کہلاتے تھے۔ انہیں ساتھ لے کر وہ بادشاہ ہندوستان میں آیا۔ بادشاہ کا نام تھا، ہری، گویا اُس بادشاہ کے ساتھ وہ مصری آتے جنہوں نے حضرت ابراہیمؑ سے علم نجوم سیکھا تھا۔ ہندوستان کی سیر کرتی جب وہ گنگا کے دبانے پر پہنچا وہاں وہ ”ہری“ مر گیا۔ اُسے وہاں دفن کر دیا گیا اور اُس کے دفن کی جگہ کا نام ”ہری دھار“ ہو گیا جسے ”ہر دھار“ کہتے ہیں بہر نوع! آپ کو کہانی سنارہا ہوں۔ حضرت ابراہیمؑ کو اللہ نے حکم دیا خانہ کعبہ جس جگہ ہے وہاں جا کر تم اپنے بچے کو اور اس کی ماں کو آباد کرو۔ چنانچہ حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسماعیلؑ اور ہجرہ کو اس جگہ جا کر بسا دیا۔ اسماعیل جب جوان چوتے تو انہوں نے یہ ٹھہرایا جو آج خانہ کعبہ کہلاتا ہے۔ یہاں بنی حبریم نامی ایک قبیلہ آ کے آباد ہو گیا۔ اس قبیلہ بنی حبریم کا جو شیخ تھا اسکی کوئی زیرِ اولاد نہ تھی۔ صرف ایک لڑکی تھی۔ اُس نے اپنی اکلوتی لڑکی کا عقد اسماعیلؑ کے ساتھ کیا۔ گویا اسماعیلؑ اس ”بنی حبریم“ کے داماد ہو گئے۔ اور جب وہ بہت بوڑھا ہوا اُس نے ایک بیٹے پر کھڑا ہو کر اپنے بنی حبریم کے قبیلے سے کہا۔

”مجھے سردار مانتے ہو“

دسبے کہا، ماں مانتے ہیں

”سند! جن کا میں سردار ہوں اُس کا آج سے میرا داماد سردار ہے۔ چنانچہ سرداری کا اعلان ہو گیا۔ گویا شہر مکہ کی آبادی ”داماد“ کی سرکاری کے اعلان سے قائم ہوئی اور جس جگہ کھڑے ہو کر اُس نے اعلان کیا تھا اُس جگہ یہ عمارت بنائی گئی، جو خانہ کعبہ کہلاتی۔ گویا خانہ کعبہ کی عمارت داماد کی سرداری کے اعلان کی یادگار ہے۔

کہ کچاڑوں طرف بنی حرم بھی آباد ہو گئے اور اسل اسماعیل بھی آباد ہو گئی۔ کعبہ کی حکومت آل اسماعیل کے پاس تھی۔ بنی حرم بطور رعایہ رہتی تھی ان کی تعداد ذرا زیادہ تھی۔ آل اسماعیل کی تعداد ذرا کم تھی۔ جب رعایہ کی تعداد ذرا زیادہ ہو جاتے تو وہ کثرت کے غرور میں آکر حلیل القدر سرداروں سے الجھ پڑتی ہے چنانچہ انہوں نے بھی یہی کیا۔ اولاد اسماعیل سے جھگڑا کیا، لڑائی کی اور اولاد اسماعیل تنگ ہو کر مکہ چھوڑ کر ادھر ادھر چلی گئی اور بنی حرم وادئ قبا یعنی ہوکے بیٹھ گئے۔ دعویوں کا پرستور رہے کہ لڑائی کی بھی دے دی اور دیران بھی کر دیا ان بے پاروں کو۔ یہ عربوں کی پرانی عادت ہے اولاد ابراہیم دنیا میں منتشر ہو گئی جہاں جہاں جس کے جی میں آیا وہاں جا کے بس گئے چنانچہ اولاد ابراہیم کی ایک شاخ یمن میں جا کے آباد ہو گئی۔ سینکڑوں سال یہ بے پایاں اسی طرح منتشر رہے پھر خدا نے جو اولاد ابراہیم جو منتشر تھی، انہیں اکٹھا کیا۔ دوبارہ مکرچسدا کی اتفاق ہو گئی۔ اس طرح آل اسماعیل نے اپنی حکومت حاصل کی۔ "قرش" کے معنی میں بکھرے ہوئے کو اکٹھا کرنا "چوکھو قحی" نے یہ عمل کیا تھا اس لئے وہ "شرش" کہلائے اور انکی اولاد "شرشی" کہلائے۔ اس طرح آل اسماعیل کی حکومت دوبارہ وادئ قبا میں ہو گئی۔ یوں تو اسماعیل کی ساری اولاد کو میں اگر بس گئے تھے مگر جو یمن چلے گئے تھے وہ دوبارہ مکہ واپس نہ آئے بلکہ وہیں یمن میں آباد رہے۔ یمن میں انہوں نے بڑی تجارت شروع کر دی۔ بڑا کاروبار شروع کر دیا۔ ان کی دکان بڑی عزت ہو گئی۔ بڑی شان۔ ہو گئی۔

میرے سامعین! آج بھی پتہ ہے کہ عیسائی مذہب میں سب سے بڑا مذہب یہی وہ لہلاتا ہے جو راہب ہوتا ہے۔ راہب کے معنی ہیں، دنیا چھوڑی اور کہیں جنگل میں جا کے بیٹھ جاتے وہ راہب عیسائی مذہب میں سب سے بڑا گویا مذہبی ہوتا ہے۔ یہ خاندان چوکھو عیسائی ہو گیا تھا ان میں جو راہب بنا اس کی دولت باقی

خاندان میں بٹ ماتی - یہاں تک کہ تقریباً سارا خاندان راہب ہو گیا اور پورے خاندان کی دولت سٹ کے ایک شخص کے پاس آگئی اُن کا نام تھا خولید - سارے قریش جو کہنی تھے اُن سب کی دولت کے وہ تہہ دار ٹ ہو گئے۔ خولید کے گھر لڑکا تو نہیں تھا - ایک لڑکی تھی جس کا نام تھا "خَدِيجَةُ الْكُبْرٰی" — گویا "خدیجہ الکبریٰ" سارے قریش یعنی خاندان کی دولت کی تہہ دار واحد مالک تھیں۔ — یمن میں کافی عرصہ گزارنے کے بعد خولید اپنی لڑکی کو لے کر مکہ شریف لائے۔ وہاں خولید کا انتقال ہو گیا اور خدیجہ اس تمام دولت کی مالک ہو کر وہاں رہنے لگیں۔ وہاں بڑی عظیم الشان تجارت شروع کر دی — تقریباً نوے ہزار اونٹ اونٹ مال تجارت سے دسے ہرے یمن جایا کرتے تھے اور نوے ہزار اونٹ شام جایا کرتے تھے۔ اتنے اونٹ ہر وقت نقل و حرکت میں رہتے تھے (تخی بڑی تجارت تھی جناب خدیجہ الکبریٰ کی اگر اُن کی آمدنی اُس زمانے کے دس لاکھ بھی سمجھ لی جائے تو اس زمانے کے دس کروڑ کے برابر ہوگی — !

بہر فوج ! اتنی دولت تھی خدیجہ الکبریٰ کے پاس — مگر عرب کیا کرتے تھے اُن کے مال تجارت پر ڈاکہ ڈال دیتے تھے اگرچہ وہ مال غریبوں ہی میں بانٹ دیا جاتا تھا — مگر — عادت تھی، عربوں کی — لوٹ لیتے تھے اس لوٹ سے بچانے کے لئے انہوں نے بیفۃ البلد، شیخ البطحا، سید القرم امیر البصر، حضرت ابی طالب سے درخواست کی کہ آپ ایسا انتظام کریں کہ ڈاکہ زنی میسر ہی جاتیہ ادیر نہ ہو — چنانچہ ابی طالب نے یہ انتظام کیا کہ جتنے عرب قبیلے تھے اُن سب کے سربراہوں کو بلایا اور یہ کہا "میں چاہتا ہوں تم سب تجارت کرو"

یہ نہیں کہا! "تم ڈاکے نہ ڈالو" — بلکہ کہا

”تجارت کرد“ جس کے پاس جتنے پیسے ہیں لے آؤ۔ کوئی ایک سو۔
 کوئی پانچ سو اور کوئی ہزار لے کر آیا۔ پختہ کسی کے پاس تھے لے آیا۔ خدیجہؓ
 کی دولت سے ملا دیتے اور منہ دیا ”یہ تم سب کی مشترک تجارت ہے۔ جو
 منافع ہوا کرے گا۔ تم سب میں تقسیم ہو جایا کرے گا۔“ چونکہ وہ سب
 کی مشترک تجارت ہو گئی تھی اس لئے بجائے ٹوٹنے کے سب اس کے محافظ
 بن گئے۔ سرمایہ مشترک سے تجارت کرنے کا طریقہ سب سے پہلے حضرت
 ابی طالبؓ نے بتایا ہے اس سے پہلے یہ بات کسی کو معلوم ہی نہیں تھی
 عربی میں کمپنی بنا کے تجارت کرنے کو ”ایلاف“ کہتے ہیں۔ اسکے
 معنی میں اُلفت پیدا کرنا۔ اور مشرکان نے ابی طالبؓ کے اس عمل کو
 ان لفظوں سے یاد کیا۔ ”جو قریش نے کمپنی بنالی ہے۔ اپنے
 سردی اور گرمی کے تجارتی سفروں کے لئے یہ اصل میں ان پر احسان کیا ہے
 ربّ کعبہ“ نے۔ ”یا تو ابی طالبؓ کو ربّ کعبہ مانو۔ یا۔!
 بہر نوع۔ اس طرح وہ تجارت ہوتی تھی۔ کہانی بڑے مختصر
 لفظوں میں آپ کو سنار رہوں۔ غریبہ کے خاندان کا ایک فرد تھا
 ”امراقیس“ جو یمن میں رہتا تھا۔ یہ بھی عیسائی تھا۔ اُسے پڑھتا
 کہ میرے خاندان کی ایک خاتون ”خدیجہ الکبریٰ“ کہ جاکر رسولؐ کی حرم
 بن گئی ہے۔ امراقیس کی شرافت و لطافت اور اخلاق کی داستانیں عرب کی
 ادبی کتابوں میں مختلف جگہوں پر درج ہیں۔ نہایت شریف النفس اور نیک
 انسان تھا۔ خدا نے اسکو دو بیٹیاں عطا فرمائیں۔ ایک کا نام سلمیٰ تھا۔ اور
 ایک کا نام سلمہ تھا۔ جو رستہ میں چلتی تھیں جناب خدیجہؓ کے گھر
 کی۔ سلمیٰ حیران ہو گئی تھی اور سلام اچھوٹی سی بچی تھی جب اس کی ماں مر گئی

اُمّ القیس کے دل میں غدا جانے کیا خیال آیا اُس نے ارادہ کیا — مسلمان ہوئے کہ
 یہ اُس وقت کا ذکر ہے جب مدینے میں تیسری عکرمت منبر حکومت پر تھی —
 اُمّ القیس اپنی دونوں بیٹیوں کو لے کر مدینے آگئی — سو چنے لگا — پہلے تو میں
 مسلمان ہو لگا — پھر بڑی بیٹی کی شادی کسی شریف زادے سے کر دوں گا
 اور چھوٹی بیٹی اپنی بڑی بہن کے ساتھ رہے گی — جب یہ بڑی ہوگی تو اس کی
 بھی شادی کر دوں گا اس نیت سے وہ دونوں بیٹیوں کو لے کر مدینہ آگئی
 مدینے میں آکر اُس نے یہ تلاش کیا کہ ”شریف ترین انسان کون ہے جس سے
 اپنی لڑکی کی شادی کر دوں“

اب تم باؤ بھائیو!

دُنیا کے اصول کے مطابق معیار شرافت کیا ہے؟ — اگر پیسہ ہے
 تو بڑا شریف ہے — دُنیا بھر کے عجیب ہوں، پیسہ ہے، بڑا شریف ہے۔ جتنا
 ہی نیک ہو، وہ غریب ہے، تو بھوکا ہے، کنگال ہے، گویا پیسہ ہی شرافت ہے اور اگر
 پیسہ کے ساتھ ساتھ حکومت بھی مل جاتے تو شرافت کا بادشاہ بن جاتا ہے۔؟
 چنانچہ اُمّ القیس نے آکر مدینے میں دریافت کیا، ”یہاں کوئی شریف بھی ہے؟“
 لوگوں نے کہا، ”بھائی شریف تو وہ ہمد گاہی کے پاس دولت ہو، حکومت ہو اور
 اگر دونوں مل جائیں — تو سبحان اللہ“

ابنہذا اتفاق سے غنی بھی تھا اور صاحب حیثیت بھی تھا — اُمّ القیس
 اُس کے دربار میں گیا دو چار باتیں کیں۔ دو چار دن جا کر بیٹھا — جوہر کو جوہر کا
 پتہ چلنا ہے — کہنے لگا نہیں! — یہ اس قابل نہیں کہ میری لڑکی کا رشتہ
 اس سے کیا جاتے — چند دن اور ٹھہرا — اس انتظار میں کہ کوئی شریف

لے —!

سامعین! — آپ بتائیں کہ یہودیوں کے باغ میں کام کرنے والا مزدور —
 —! بھلا اُس کی طرف اشارہ کون کرے — کسی نے بھی نہ کہا کہ ایک
 شریف ایسا ہے جو صبح سے لے کر شام تک مزدوری کرتا ہے — ایک دن
 وہ اتفاق سے دینے میں کسی اجتماع میں بیٹھا ہوا تھا کہ اُس نے دیکھا کہ یہودیوں پر
 مزدوری کی گرد پڑی ہوئی ہے۔ کہنیدوں پر پسینے کے چھائے پڑے ہوئے ہیں — پسینے
 شرابور ہے۔ مٹھی میں مزدوری کے پیسے ہیں، ایک شخص سر جھکائے ہوتے چلا آ رہا ہے
 اور کرتا کیا کہے کہ غریبوں کے قیمتی بچے اُسے دوسرے دیکھ کے ڈرے آتے ہیں وہ دوسرے
 بچوں سے نظر بچا کے ایک بچے کو پیسہ دیتا ہے — پھر دوسرے کو۔ یہاں تک کہ گھر پہنچنے
 تک کچھ بھی نہیں رہا — یہ منظر اُمّ القیس نے چار دن متواتر دیکھا (بھائیو غور سے سنا،
 میری اس کہانی کو یہ سہاے گھر کی کہانی ہے جو سوائے آنسوؤں کے کچھ بھی نہیں)

اُمّ القیس چند دن دیکھتا رہا اُس مزدور کو ایک دن وہ ایک قبیلے کے افراد میں بیٹھا ہوا
 تھا کہ اتفاق سے وہی مزدور سامنے آیا۔ سارے آدمی کھڑے ہو گئے اور خیمے کے مرنے نکلا۔
 ”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مَا أَشْرَفَهُ هَذَا الْقَتْلَى“

سامعین! — مسلمانوں کی سب سے بڑی قسم کلمہ ہے۔ اگر مسلمان کلمہ پڑھ کے
 کہہ دے، — کوئی بات، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بات کبھی جھوٹ ہو سکتی ہی
 نہیں۔ دوسرے مسلمان پر فرض ہے کہ وہ اگر مسلمان ہے تو مان لے درہم اس کا اسلام
 غلط ہو جانے کا۔ اسی لئے ہم اتنا یقین ہے علیؑ کی ولایت کا کہ ہم قسم جلال اٹھا کے کہتے ہیں کہ
 ”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ عَلَىٰ دَلِيلِ اللَّهِ“

علیؑ کے دلی ہونے کا ہم قسم اٹھا کے اعلان کرتے ہیں۔ اب جو نہیں
 مانے گا تو وہ مسلمان نہیں رہے گا

”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ“ — یہ قسم کھاتے ہو کیا اللہ شرف نہا “ یہ

جوان جو آرا چھڑا ہی شریف ہے۔ اب جوان کے لئے عربی میں "شباب" کا لفظ بھی ہے۔ مگر انہوں نے شباب نہیں کہا۔ فتیٰ کہا ہے۔ فتیٰ اور شباب میں فرق ہے۔ ہر نو جوان شباب ہے۔ مگر ہر جوان فتیٰ نہیں ہے۔ جب ابراہیمؑ مزدکے بت خانے کے بت توڑ کے آتے تو دہاں کے بت پرستوں نے جب بت توڑے جھڑے دیکھے، تو انہوں نے فوراً کہا۔

”يُذَكِّرُهُمْ لَيْتَالُ لَهُ اِبْرَاهِيمُ“

”ایک فتیٰ ہے جو جوان کرتا ہے اور ابراہیمؑ اس کا نام ہے“ معلوم ہوا فتیٰ اس جوان کا نام ہے جو بت شکن ہو۔ فتیٰ ہر جوان نہیں کہلاتا۔ بت شکن فتیٰ کہلاتا ہے۔ اب جتنے مسلمان تھے بتوں سے توبہ کو نفرت تھی، مگر بت شکن سب نہیں تھے اس لئے یہ فقرہ بنانا پڑا۔

”لَا فَتًى إِلَّا عَلَى“

کوئی بت شکن نہیں ہے سوائے علیؑ کے۔ اور۔ اس لفظ کی جان میں اتنی طاقت آگئی کہ اگر ساری دنیا کے مٹا بھی دیں کہ کسی کو بے دین بنادیں۔ (اصیبت یہ بن گئی ہے کہ مجھے تو جماعت کا پتر ہی نہیں اس لئے کہیں اہل جماعت رہا ہی نہیں۔ ایک جماعت جی 'لا فتی' کہنا شروع کر دے تو فتح اُسے ضرور ہو جاتی ہے۔

بہرِ نفع۔ فتیٰ اسے کہتے ہیں جو بت شکن ہو۔ انہوں نے یہ نہیں کہا، لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مَا اشْرَفَ هَذَا الشَّبَابُ ہے۔ یہ جوان کتنا شریف ہے بلکہ کہا۔

”ما اشرف هذا الفتى“ لفظ فتیٰ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ مخصوص جوان ہے جس نے بت توڑے ہیں، بت پڑے کبھی نہیں اور کہا، ”اشرف“

شریف نہیں کہا۔ شریف اور چیز ہے۔ اشرف اور چیز ہے۔ مگر خدا شاد ہے کہ شریف کہنے کی تو ہمیں اتنی عادت پڑ گئی ہے کہ جس انسان کو دیکھا اُسے شریف کہہ دیا۔ اگر پاکستان و ہندوستان کے شریف گنا شروع کریں تو صبح ہو جائیگی شریف ختم نہیں ہو سکے گا مثلاً اجیر شریف۔ سیال شریف۔ تولہ شریف۔ فلان شریف مصیبت شریف اور آفت شریف۔ ایمان سے میں تو ان شریفوں سے تنگ آ کے کراچی گیا۔ جہاز میں بیٹھا۔ جاؤ اتر اترے میں سوچا! شریفوں سے تو جان بچی۔ بصرے میں ریل گاڑی میں سوار ہوا اور صبح ہی صبح جو اسٹیشن پر آکھ کھلی تو سامنے کھتا ہوا تھا "بغداد شریف"۔ لوہ شریف نے یہاں بھی جان نہ چھوڑی شریف یہاں تک بھی آ گیا۔ آخر کار میں نے ایک ٹیکسی کرایہ پر لی اور ٹیکسی ڈرائیور سے کہا "مجھے کسی اچھی جگہ لے چل" وہ لے کے چل دیا۔ ابھی دس میل دور تھی وہ جگہ کہ دوسرے طحانی گنبد نظر آیا۔ طحانی مینار نظر آتے۔ آکھ چپک گئی۔ دل ٹپ گیا۔ رُوح میں روانی آ گئی۔ نفیس تیز ہو گئیں۔ کان میں غیبی آواز آئی "ہا ادب بلا حلقہ ہوشیار!" یہاں جبریل امیں ار دل ہے یہاں جنت کی بہاریں ہیں، یہاں انبیاء تعظیم کو کھڑے ہیں، یہاں کوثر لگتا ہے یہاں ایمان بڑھتا ہے۔" میں نے کہا "یہ ہے کیا؟"

"یہ نجف ہے۔"

عادت جو بھی مُنہ سے نکل گیا "شریف"

ڈرائیور نے میرے مُنہ پر ہاتھ رکھا اور کہا

"خبردار! شریفوں کی مدح ختم ہو گئی۔ یہ شریف نہیں ہے۔ یہ ہے شریف گھ۔ جو اس کا صرف نام ہی لے لے شریف بن جاتا ہے۔ اسے کہنا، و نجف اشرف"۔ اب اشرف دماغ میں بیٹھ گیا۔ اب جو کسی کا نام لوں گا تو شریف نہیں کہوں گا۔ زیارت کی نجف اشرف کی۔ لطف آ گیا۔ سواد آگیا۔

مذبح کے پاس گیا، وہاں جا کر عرض کیا، "مولا تے کائنات! آواز دے مجھے!"
جبریلؑ طاقت پر داز دے مجھے۔ میں کس کے دیار میں آ گیا ہوں"

وہاں سے میں نے پھر ٹھیکسی لی اور آگے چل پڑے تقریباً چالیس میل چلے ہونگے کہ
دور سے طلحہ کی گنبد نظر آئے۔ میں نے پوچھا، "یہ کونسی جگہ ہے؟"

"ٹھیکسی والے نے کہا، 'یہ ہے کربلا'۔"

میں نے پوچھا، "یہ اشرف ہے؟"

"نہیں اشرف نہ کہنا اسے۔ اشرف وہاں کی بات تھی۔ یہ ہے کربلا معلیٰ۔"

بس بھائیو! لفظ معلیٰ معراج کی یادگار ہے۔ دنیا میں صرف دو ہی معلیٰ ہیں،
ایک عرش معلیٰ ایک کربلا معلیٰ۔ نائنے کی معراج نے عرش کو معلیٰ بنا دیا۔
نوا سے کی معراج نے فرش کو معلیٰ بنا دیا۔

بہر نوح! شریف توہم ایک کو کہتے ہیں مگر اُمّ القیس نے کہا، "ما اشرف القی"۔
"وہ کتنا شریف گھر ہے؟" قیس نے کہا۔ میں تو شریف کی تلاش میں آیا تھا مگر یہ ایسے انسان کو
اشرف کہہ رہا ہے جس کے پاؤں پر عبا ر پڑا تو، پسینے میں تر، پچھتے ہوئے کپڑے پہنے ٹہرتے
انسان کی یہ امیر العبد، قالین پر بیٹھنے والے، بڑے بڑے رتیں اٹھ کر تعظیم کر رہے
ہیں۔ اشرف کہہ رہے ہیں اور میں انہیں بھی غلط نہیں کہہ سکتا چونکہ یہ کلمہ پڑھ کے کہہ رہے
ہیں۔ اسلئے قیس اٹھ کے اُس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ اور جب پہنچا گھر کے دروازے پر
تو اُس نے دروازے پر لگا ہوا بورڈ پڑھا۔ "دوں لکھا تھا" انشاء اللہ

قیس گھڑا پس آ گیا۔ رات بھر سوچتا رہا، "یہ کس انسان کو میں نے دیکھا؟" قیس ساری
رات بھر بے چین رہا۔ صبح کو اٹھ کر پھر اُسی گھر کی طرف روانہ ہوا۔ اُدھر صوبہ
کی سپی کرن اس گھر پہ آئی ادھر یہ جا کر پہنچا۔ دستک دی۔ وہی مزدور باہر آیا
"تم کون ہو؟" "نہد! میں یمن کا۔" "ہاں ہاں! سمجھ گئے۔" اُمّ القیس کہتی

آپ مجھے جانتے ہیں؟“ فرمایا ”ہاں! جانتے ہیں“ آج بھی کتابوں میں دُعا ئے یمنی موجود ہے کوئی مشکل پڑے تو اس دُعا کو پڑھ لو، فوراً دور ہو جائے گی“ مولانا نے فرمایا ”تمہیں مجھ سے کوئی کام ہے؟“ فرمایا ”ہاں! قبسہ“ ”اچھا بیٹھ جاؤ“ ابو تراب کا ہمان پر بیٹھ گیا ”قبس! مٹی پر بیٹھنے سے آپ کو کوئی عار تو نہیں“ ”مولانا! آپ نے مجھے بیٹھنے کو کہہ دیا یہ مٹی اب مجھے مٹی نہیں نظر آتی“ میں اپنے کو یہ محسوس کرتا ہوں کہ کوثر کا کنارہ ہے طوبی کا سایہ ہے، جنت کی بہاریں ہیں، خودیں میرے چاروں طرف کھڑی ہیں۔ اللہ جانے! میں کس جگہ آگیا ہوں۔ عرش سے فرش تک مجھے نور نظر آرہا ہے۔“

حضور مسلمان تو ہیں ہو گیا مگر آج مجھے تو پتہ چلا کہ علم اسلام کا مجھے کہاں سے ملے گا؟ ہر در سے بھیک مانگنے کے بعد اصلی در پر آیا ہوں، حضور! میری دو لڑکیاں ہیں ایک بچی ہے، ایک قابل شادی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ حضور کے شہزادگان محترم اگر میری لڑکی کو قبول فرمائیں تو میری دین دُنیا میں فلاح ہوگی۔“

چنانچہ قبس کی بڑی لڑکی سلامہ کا عقد اسی دن امیر المومنین نے اپنے فرزند اکبر شہزادہ کوئین حضور امام حسن مجتبیٰ سے کیا۔ اسی خاتون کے بطن طیبہ طاہرہ سے حق کے گھر وہ بچہ پیدا ہوا جو قائم ابن حسن کے نام سے آج دُنیا میں مشہور ہے۔ امیر المومنین کی شہادت کے بعد۔ امام حسن کی بھی شہادت کے بعد خلیفہ اسلام کی چھوٹی بہن جناب سلمیٰ جب جوان ہو گئی تو ان کا عقد حضور سید الشہداء امام حسین علیہ السلام سے ہوا۔ اب اُمرا نقیب کی قیمت جاگ اٹھی۔ اسے اس کی شرف کا پورا اصل مل گیا۔ یاد رکھو! سُسرالی رشتہ بڑا مفید ہوتا ہے بشرطیکہ لڑکی صاحبِ اولاد ہو کسی بڑے آدمی کے گھر لڑکی بیاہی جائے اگر اللہ اس لڑکی کے باپ کو شرف نہ دینا چاہے تو اس لڑکی کے اولاد نہیں ہوتی۔ کیونکہ سُسرالی رشتہ نواسے، نواسی،

سے ہوتا ہے ناکہ داماد سے رشتہ تو ایک لفظ میں جوڑ دیا — ایک لفظ میں توڑ دیا۔ اصل رشتہ نواسے نواسی کا ہوتا ہے — اللہ کسی کو عزت نہ دینا چاہے تو لڑکی بے شک بڑے گھر چلی جائے۔ نواسہ نواسی نصیب نہیں ہوگا — میں کتا ہوں سادات کرام! تم قیامت میں منظر دیکھنا، جب حکم ہوگا "آتش پرستوں کو جہنم میں بے جاؤ" نو شیرواں بھی آتش پرست تھا — وہ جائیں گے جہنم میں، اگر چلتے وقت اس نے کہہ دیا "ذرا جانے سے پہلے مجھے میرے نواسے زین العابدین سے بلا دو" چونکہ نواسے ہیں زین العابدین اسی لئے تمام مسلمانوں کا یہ فیصلہ ہے کہ جہنم میں تو وہ جائے گا مگر اُسے ایسا نکمھا عطا فرمایا جائے گا کہ جہنم کی آگ اس پر اثر انداز نہیں ہوگی — !

یہ نوع! سلام و سلمیٰ حسن و حسین کی زوجیت میں آگئیں — اسی خاندان کی خدیجۃ الکبریٰؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجیت میں آئیں۔ اس خاندان کی عزت بنی اور دوسری عزت اس خاندان کی یہ ہوئی کہ سلمیٰؓ اور سلامۃؓ اُمّ الفیس کی بیٹیاں، حسن و حسینؓ کی زوجیت میں آئیں — سلمیٰؓ کے بطن سے نوشہرہ زادہ قاسم پیدا ہوئے۔

جو دوسری بھینیں امام حسینؓ کی زوجہ محترمہ اس کے گھر سب سے پہلا بچہ جو ہوا، وہ لڑکا نہیں ہوا، بلکہ لڑکی ہوئی — اس خاندان رسالت نے ہر لڑکی کا نام فاطمہ رکھا — ہر لڑکے کا نام علی رکھا — پہچان کے لئے آگے لگا دیتے تھے، اکبر، اصغر، باقر وغیرہ۔ چنانچہ اس بچی کا نام بھی فاطمہ رکھا — سارے خاندان کو اسی بچی سے پیار تھا خصوصاً اس بچی کا عجیب و غریب چچا شمس الشہداء حضورِ مہربانیؐ شہم جناب عباسؓ غازی کو اپنی اس بھتیجی سے اتنا پیار تھا۔ نام تو فاطمہ تھا مگر وہ پیار سے سکیئہ کہتے تھے سکیئہ بڑی پیاری بچی تھی۔ سید الشہداء کو اور دوسرے گھر والوں کو اتنا پیار تھا اپنی اس بچی سے کہ اس کی ماں کو سُسرالی کی طرف سے رُباب کا خطاب دیا۔ نام تو اصلی سلامۃؓ تھا مگر سُسرالی

سے رُباب کا نام دیا گیا۔ گھر بھر کی لاڈلی بچی۔ چار سال کی ہو گئی مگر گھر والوں نے پیدل چلنے نہ دیا۔ کبھی حیثین کی گود میں۔ کبھی عباس کی گود میں راقسم کی خانہ زاد بہنیں رہی تھیں۔ اور چچا زاد بہن بھی کبھی ماں کی گود میں کبھی زینب کی گود میں کھنٹو تم کی گود میں۔ بڑی لاڈلی بچی تھی سکینہؑ۔

۱۶ رجب سنہ ۱۱۰ھ کو رُبابؑ کے بطن طاہرہ سے خدا نے ایک فرزند عطا فرمایا سید الشہداء کو۔ جس کا نام علی اصغرؑ مشہور ہوا۔ سکینہ کا سگا بھائی تھا۔ ایک دفعہ پھر کتاہوں علی اصغرؑ کا یوم ولادت ۱۶ رجب سنہ ۱۱۰ھ ہے اور ۲۸ رجب سنہ ۱۱۰ھ کو جب حیثین نے مدینہ سے سفر کیا ہے اس وقت علی اصغرؑ کی عمر صرف ۱۲ دن تھی گویا ساری عمر علی اصغرؑ کی سفر میں گزری، علی اصغرؑ اور سکینہ دونوں بہن بھائی کر بلا سید الشہداء کے ساتھ گئے تھے ۶۸ سال کا سن سکینہ کا تھا اور صرف ۱۲ دن کا اصغرؑ تھا جب گھر سے مولا چلے گئے۔ کر بلا میں اصغرؑ تقریباً چھ ماہ کا ہو گیا تھا، جس طرح ہر بہن کو بھائی سے محبت ہوتی ہے۔ اُسی طرح سکینہ کو بھی اپنے بھائی علی اصغرؑ سے محبت تھی۔ گھر والے سکینہ کو اپنی گود میں اٹھائے رکھتے، سکینہ بھی اپنے بھائی کو ہر وقت بہلاتی رہتی، جب دیکھو اس کا جھولا جھلنا ہی ہے۔ جب دیکھو اسے کمرے پہننا ہی ہے۔ جب دیکھو اسے سر پر لگا رہی ہے۔ اہم دیکھو کہ آنکھوں میں آنسو بھر کے کہہ کر تے تھے "سکینہ! اتنا پیار نہ کر۔۔۔ ہے تو تیرا بھائی پر اتنا پیار نہ کر، اس کی جدائی کا صدمہ شاید تجھے برداشت نہ ہو" یہ دونوں بہن بھائی کر بلا میں تھے۔ سکینہ بھی اور علی اصغرؑ بھی۔ میرے معزز دھرم سامعین! میں اپنے بیان کو مختصر کرتا ہوں کہ جب دسویں محرم کا دن چڑھا۔ سکینہ بھی پیاسی اور اصغرؑ بھی پیاسا۔ جب سید الشہداء اپنی آخری قربانی، علی اصغرؑ کو سے کے جانے لگے تو اصغرؑ کی ماں رُبابؑ نے عرض کی "حضور! میں بڑے کو یم باپ کی بیٹی ہوں۔ مگر چاہے میرا باپ کتنا ہی کریم ہی میں سیدانی نہیں ہوں، میری آپ کے گھر آنے سے کوئی نسبت نہیں جو سب زینب و کاظمؑ

لا حصہ ہے وہ مجھے کہاں ملے گا۔ میں اُتتی ہوں قبل!۔ میں ذرا اپنے بچے کو سمجھانا چاہتی ہوں۔ چنانچہ علی اصغر اور سکینہ کو لے کر رُباب اپنے خیمے میں چلی گئی۔ اچھا لباس پہنایا، کان میں وہ دد مونی پہنائے جو چچا نے تحفہ کے طور پر دیئے تھے علی اصغر کو بھی نیا گرتہ پہنایا، بال ٹھیک کئے۔ اُستین بھی چڑھا دیں، آنکھوں میں سرمہ ڈالا۔ ایک رومال سے کمر باندھی۔ جب رباب نے خیمے سے باہر آئیں تو ایک ہاتھ سے سکینہ کی انگلی پکڑے ہوئے اور دوسرے ہاتھ سے اصغر کو گود میں لئے ہوئے اور عرض کیا "مولا! میری ایک گزارش ہے" کیا؟ "اپنی بہن کو بلا لو"۔ زینب بھی آگئیں۔ دونوں بہن بھائی سامنے کرسی پر بیٹھیں پھر میں کہوں گی۔" زینب اور حسین سامنے کرسی پر بیٹھ گئے۔ رُباب کہتی ہے "فاطمہ کی بیٹی اور فاطمہ کے بیٹے! میں غیر خاندان کی تمہارے خاندان میں آئی ہوں تم نے میری عزت بڑھائی، تم نے میری شان بڑھائی، فاطمہ کی بہو کہلائی۔ تمہاری طرف سے دو تحفے مجھے ملے ہیں۔ ایک لڑکی۔ ایک لڑکا۔ یہ بچے تمہارے ہیں۔ ان سے میرا کوئی واسطہ نہیں۔ مجھے پتہ ہے کہ آج شام سے پہلے میں بوہ ہو جاؤں گی۔ میرا دنیا میں کوئی سہارا نہیں رہے گا۔ نہ میرا کوئی میکا ہے، نہ میرا کوئی عزیز ہے۔ میں تمہاری اس امانت کی، سکینہ اور اصغر کی حفاظت نہیں کر سکوں گی، میں آپ کی امانت کو سبھا کے لائی ہوں۔ آپ ہی کے سپرد کرتی ہوں" یہ کہہ کے رُباب نے کیا کیا؟ کہ سکینہ کو اٹھا کے زینب کی گود میں پھینک دیا اور اصغر کو حسین کی گود میں۔ حسین نے چند منٹ بعد اصغر کو دفن کر دیا اور سکینہ کو سینے سے زینب نے لگا لیا۔ زینب کی مجھ جیسی سمجھو کر لکھیے سے تو لگاتے رکھا مگر کانوں کو نہ بچا سکی۔ اس کی کلائیوں کو نہ کھول سکی۔ اس کے گلے کو نہ کھول سکی۔ اسی طرح زینب۔ سکینہ کو بندھے ہوئے ہاتھ اور بندھے ہوئے گلے کے ساتھ لے کر شام آگئی۔

میرے محترم سامعین! قید خانے میں زینب نہ بن پر سوئی تو اپنے ساتھ سکینہ کو سلاتی

— بچی سونے سے پہلے پوچھتی ”ابا کب آئیں گے؟“ بتاؤ زینب کیا جواب دیتی —
 بچی کو کہا کہ کہہ کے بھلائی بچی کہتی ”میرے چچا کب آئیں گے؟“ کبھی کہتی ”زمین پر چڑھ سے
 سو یا نہیں جاننا —“ بتاؤ اسے کس طرح زینب سمجھاٹے اسے کس طرح تسلی دے؟ اور
 یہ روایت اکثر آپ نے ذاکروں سے سنی ہوگی، مودوسی صاحبان بھی بیان فرماتے ہیں —
 سکینہ نے شام کو پرزدل کو اڑاتے ہوئے دیکھ لیا پوچھا ”بھائی زین العابدین! پرند کہاں
 جا رہے تھے — فرمایا — ”ہن! دن بھر چرکے، پیٹ بھر کے اپنے گھروں کو جا رہے ہیں“
 بچی پوچھ بیٹھی ”بھائی! کبھی ہم بھی اپنے گھر واپس جاتیں گے۔ ہمارا بھی کوئی دنیا میں گھر ہے!“
 ایک روایت یہ بھی ہے کہ ایک رات جو سوئی تو باپ کو خواب میں دیکھ لیا۔ جیسے
 باپ گود میں لئے بیٹھے ہیں — آنکھ جو کھلی تو ہائے آبا ”باپ کو یاد کر کے رونے لگی —
 روئی تو محلے کے لوگ اکٹھے ہو گئے ”کیا بات ہوئی بچی کیوں رو رہی ہے؟“ بتایا گیا کہ باپ
 کو یاد کر رہی ہے — انہوں نے یزید لعین کا محل گھیر لیا ”ایک معصوم بچی رو رہی ہے
 ظالم! اس کا تو کچھ خیال کہ باپ کو یاد کرتی ہے“ یزید نے اور تو کچھ نہ کیا، باپ کا سر دے
 دیا — جب سرقید خانے میں آیا بچی ایک دم گھبرا کے کہنے لگی — اماں! ابا کی
 خوشبو آ رہی ہے — میرے ابا آ گئے ہیں“ سر کو گود میں سے کوڑ بیٹھ گئی — ابا تم
 آ گئے —“ سکینہ نے ایک ایک بات سنائی ہے باپ کو — ابا میرے کان دیکھو
 — ابا مجھے تنہا چھوڑ گئے“ ابا! میری اماں کی چادر چھن گئی“ یہ کہہ کے سکینہ نے باپ
 کے منہ پر منہ رکھا تو اب نہیں اٹھایا — کافی دیر ہو گئی زینب نے کہا ”بیٹا!
 زین العابدین! دیکھنا، بات کیا ہے؟“ زین العابدین نے دیکھا ”اماں! پڑھو سب مل کے“

سامعین!

مسلمانوں کی بستی میں، فاطمہ کی پوتی، اُسی کرتے میں دفن ہو گئی جو پہنا ہوا تھا۔ جب فاطمہ

آل محمد مدینے روانہ ہوا ہے تو ان کے دل پر جو سب سے بڑا صدمہ تھا وہ یہ تھا کہ سکینہ ہمیں چھوڑ گئی ہے۔

زینب نے وعدہ کیا تھا، بیٹی نگر نہ کر، میں بھی یہاں آؤں گی تیرے پاس، اسی شام میں — اور وہیں قبر بنی زینب کی بھی: — شام میں۔

یہ ہمارے گھر کی کہانی تھی۔ سکینہ کی کہانی — اب دشمنان آل محمد کچھ ہمارے بیس میں کچھ دشمنوں کے جیس میں خدا جانے کیا کیا بلکواس لگاتے ہیں — جب ان کے ہاتھ میں تلواریں خفیں۔ تو آل محمد کو تلواروں سے ذبح کیا۔ اب قلم ہے تو قلم سے ذبح کر رہے ہیں — آخر میں میں اپنے فوجوانوں سے گزارش کرتا ہوں کہ وہ اس کہانی کو جہاں تک ممکن ہو سکے پہنچائیں۔ تاکہ میرا کہانی سنانے کا مقصد کامیاب ہو جائے اللہ تمہارے بچوں کو ہمیشہ نکرے — بخئی محمد ذال محمد

جب آل محمد

آمریت کی تلواروں سے نہ کٹ سکے تو ان پر ذرہ

موت خیں نے اپنے ہر اکو قلم سے آل محمد کو قتل کرنا شروع کر دیا

خلیبہ آل محمد

ق

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

خداوند عالم کی حمد و ثناء کے بعد حضرات محمد و آل محمد پر درود و سلام
حضرات گرامی قدر!

اللہ کا یہ فرمان ہے: اِلَّا لَهُ الْخَلْقُ وَلَهُ الْاَمْرُ
لفظی ترجمہ اس آیت کا سببی دالوں کے نزدیک یوں ہے۔
”یاد رکھو:

اے قرآن پڑھنے والو۔ قرآن سننے والو۔ قرآن کو ماننے والو۔ اے
اللہ کی طرف سے آیا ہوا کلام ماننے والو۔ اے محمد کا پہنچایا ہوا برحق پیغام ماننے والو
اس کے ہر زیر و زبر کو حق تسلیم کرنے والو۔ اس کی ہر حرکت و سکون کو اللہ کی طرف
سے نازل شدہ ماننے والو۔ اس کے ہر زیر و زبر اور زیر کو زیر سمجھنے والو! اس
کے زیر کو کبھی زیر نہ کرنے والو۔ اور اس کے زبر کو کبھی زیر نہ کرنے والو!
پوری طرح سمجھ لو۔ اس بات کو پوری طرح۔ اپنے ذہن میں چٹھا لو۔ اس
بات کو اپنے دل سے مت نکالنا۔ کہ تمہارا ایک اللہ ہے۔ تمہارا ایک خالق
ہے۔ جس نے تمہیں دینا میں بھیجا ہے۔ وہ تمہارا مالک ہے۔ وہ تمہارا اللہ ہے۔

اور

— اس اللہ کو دو اختیار حاصل ہیں اس کے معنی یہ نہیں کہ اللہ کو اور اختیار نہیں

ہیں۔ اللہ کو اور بھی اختیارات حاصل ہیں۔ یہ دو
 اختیار تمہارے اللہ کو حاصل ہیں۔
 ایک "خلق" کا۔ ایک "امر" کا۔
 یہ دونوں اختیارات مخصوص ہیں صرف اللہ کے لئے۔ "خلق"
 میں بھی اللہ کو اختیار ہے۔ "امر" میں بھی اللہ کو اختیار ہے۔
 اللہ کے علاوہ نہ "خلق" میں کسی اور کو اختیار ہے نہ "امر" میں کسی
 اور کو اختیار ہے۔

اگر

اس مجلس میں کوئی عربی دان بزرگ موجود ہو۔ تو ان
 حضرات سے گزارش ہے کہ علم و معانی و بیان کے اعتبار
 سے کسی "توخر" کو اگر "مقدم" کر دیا جائے۔ تو اس سے
 "حصر" پیدا ہوتا ہے۔ اور جار و مجرور جو عربی میں
 ہے۔ وہ بعد میں آیا کرتا ہے۔

مگر۔

اس آیت میں پہلے آیا ہے۔
 اللہ نے یہ نہیں کہا۔ المخلق والامر لہ۔ بلکہ
 "الا لہ المخلق ولہ الامر فرمایا ہے۔

"لہ" میں جار و مجرور ہے۔ وہ پہلے آیا ہے۔

اس کا پہلے آنے کے معنی یہ ہیں کہ

سوائے اللہ کے، صرف اللہ کو، محض اللہ کو، فقط اللہ کو اختیار ہے "خلق" کا
 بھی اور "امر" کا بھی۔ اگر یہ "لہ" بعد میں ہوتا تو پھر اس کے معنی یہ بنتے کہ

اللہ کو بھی اختیار ہے۔“ مگر

یہاں ”بھی“ نہیں ہے۔ بلکہ ”اللہ ہی کو اختیار ہے۔“ کسی کو خلق و امر،
کا اختیار نہیں سوائے اللہ کے۔۔۔۔۔ (یہ لفظی ترجمہ ہے اس آیت کا)
اب اس میں جو حضرات علمائے اکرام کی ”علمی مشقائیاں“ ہیں۔ وہ مجھے آتی
نہیں۔ اس لئے آج آپ کے سامنے سیدھی سادھی گفتگو کرنا ہے۔
”خلق، اور امر“ کا اختیار اللہ کو اور صرف اللہ کو ہے۔۔۔۔۔
اگر آپ مناسب سمجھیں تو ایک دفعہ کہہ دیں ”اللہ“

شرم کرو بندو!

”اللہ تمہارے منہ سے نکلا ہے۔۔۔۔۔

اب آپ کہیں گے۔

زیدی صاحب!

شرم۔۔۔ تم کرو۔۔۔ یہ اللہ نہیں نکلا ہمارے منہ سے
یہ لفظ ”اللہ“ نکلا ہے۔۔۔ چونکہ ”لفظ اللہ اور ہے۔۔۔۔۔
ذات اللہ اور ہے۔۔۔ یہ لفظ ”اللہ“ ہے جو ہمارے منہ سے
نکلا ہے۔۔۔۔۔

یاد رکھو میرے سامعین!

خدا کرے تمہارے ذہن میں یہ بات آجائے۔ اور میں اسے سمجھا
۔ سکوں۔۔۔۔۔

ہر لفظ جو انسان کے منہ سے نکلتا ہے جس میں صوتی و حرکاتی وجود
کا عنصر نمایاں ہوتا ہے۔۔۔ اُسے لفظ کہتے ہیں اور جو لفظ ہوتا ہے۔ اس کا خالق
خود انسان ہے۔۔۔ انسان پیدا کرتا ہے ہر لفظ کو۔۔۔ انسان کے منہ

سے نکلتا ہے لفظ — اور
لفظ بنتا اس طرح ہے — کہ مٹا جاتا ہے — بنتا جاتا ہے —
مثلاً :-

جب آپ کہیں گے لفظ ”پانی“ — یہ لفظ آپ کے منہ سے نکلا ہے — آپ ہی
اس لفظ کے خالق ہیں — آپ نے یہ ہی یہ لفظ پیدا کیا — مگر کس طرح ؟
جب آپ کہہ رہے تھے ”پا“ — اس وقت ”نی“ موجود نہ تھا — اور
جب آپ نے کہا ”نی“ — تو ”پا“ ختم ہو چکا تھا — اگر پہلا حرف زبان پر
رگڑ رہے — تو دوسرا آ سکتا ہی نہیں — بہرہ نوح — لفظ کا خالق انسان ہے اور لفظ مٹنے
سے بنتا ہے —

”اللہ“ بھی ایک لفظ ہے (ذات اللہ نہیں) اللہ بھی ایک لفظ ہے — اور
ہر لفظ کے لئے یہ طے شدہ بات ہے کہ — بولنے والے کے منہ سے نکلتا ہے —
لہذا لفظ ”اللہ“ بھی کسی کے منہ سے نکلا ہوگا — کسی نے یہ لفظ بھی بولا ہوگا — جب
ہی تو یہ لفظ آیا دنیا کے سامنے — اگر یہ لفظ اللہ کی ذات کا نام ہے تو اس
وقت کسی نے بولا ہوگا — جب اس کی ذات کے سوا اور کوئی نہیں تھا —
معلوم ایسا جوتا ہے کہ اللہ نے جو اصلی اللہ ہے — جو ذات اللہ ہے —
اس نے جب اس کی ذات ہی ذات تھی — اس وقت کسی کو بنایا — اور بنا کہ
اس سے پوچھا —

بولو! — نہیں کس نے بنایا۔ — ؟

اس نے کہا

میرے بنانے والے ! تو ہی بتا مجھے کس نے بنایا —
تو اللہ نے کہہ دیا ھُوَ لَا ۛ

لفظ تو ابھی مُنہ سے نکلا ہی نہیں تھا۔ یہ تو انسان کے مُنہ سے نکلتا ہے۔
 اب بنانے والے نے کہا۔ ھُوْ لَا عِ اُسی نے بنایا۔
 تو اس بنے ہوئے کے مُنہ سے نکل گیا۔ ”اللہ“
 اور اللہ نے جملہ مکمل کر دیا۔ قُلْ ھُوَ اللہ۔

یہ اسی انسان کے مُنہ سے نکلا ہے۔ بغیر انسان کے مُنہ سے نکلا ہو ”لفظ“
 بننا ہی نہیں۔

اب اللہ جانے۔ جب صرف اللہ کی ذات تھی۔ تو وہ کون انسان تھا۔
 جس کے مُنہ سے نکلا ”اللہ“۔ اور اللہ نے اسی لفظ کو اپنی ذات کا نام بنالیا۔
 ”میری ذات کا نام ہے اللہ“
 سامعین!

اب جو ”اللہ“ کہہ دیا اس نے۔ تو اس سے پوچھا۔
 ”بتاؤ۔ اللہ کے متعلق اور کیا جانتے ہو۔“
 انہوں نے کہا۔

اور یہ جانتے ہیں۔ وہ اَحَد ہے۔
 اب مجملہ یوں مکمل ہوا۔

”قُلْ ھُوَ اللہ اَحَد“ اللہ احد بھی ہے۔ اور اَحَد کے معنی ہیں۔

عربی لغت میں لفظ۔ کے کیا معنی ہیں۔ ”ایک“ یہ غلط ہے
 میرے محترم سامعین!

”احد“ کے معنی ”ایک“ نہیں ہے۔

یاد رکھو!

اللہ ایک نہیں ہے۔

جو کہتا ہے "اللہ ایک ہے" ——— دو غلط کہتا ہے ———

اللہ ایک نہیں ہے ——— اور اگر آپ کو میری بات کا یقین نہ ہو تو در سے
میں پڑھنے والے بچوں سے پوچھ لو۔ یہ ابھی تصدیق کریں گے۔ جنہوں نے ریاضی پڑھی
ہے۔

علم حساب میں یہ بات بتائی گئی ہے کہ ——— ایک کا ہندسہ
دو آدھوں کا مجموعہ ہے ———

دو آدھوں "کو جوڑ دو۔ تو بن گیا" ایک،

اگر ہم کہیں "اللہ ایک" ——— تو اس کے یہ معنی ہیں کہ پہلے
آدھے آدھے "دو" تھے۔ پھر جوڑ کے ہو گیا "ایک" اور

دوسرے معنی علم ہندسہ میں "ایک" کے ہیں،

———— "دو کا آدھا"

اگر اللہ کو ہم "ایک" کہیں گے تو اس کے معنی ہیں ———

پہلے دو تھے۔ پھر آدھا رہ گیا۔ تو ہو گیا "ایک"

———— اللہ "ایک" نہیں ہے ——— بلکہ

اللہ "احد" ہے ———

"احد" کے معنی کیا ہیں؟

———— ایک کا پیدا کرنے والا،

گویا اللہ نے سب سے پہلے جسے پیدا کیا تھا۔ وہ ایک تھا۔ اللہ اُس
کا خالق ہے۔ ———

اب ایک کے معنی یہاں لگاؤ ———

ایک کہتے ہیں:- دو ہوں۔ انہیں جوڑ دو تو ایک ——— اور الگ

کردر تو دو

معلوم ہوا۔

اللہ نے جسے سب سے پہلے پیدا کیا تھا —

وہ ایک بھی تھا۔ اور دو بھی تھے —

گویا سب سے پہلی جو مخلوق تھی۔ وہ دو بھی تھے — ایک بھی تھا۔

اب اس کو حدیث سے آپ سمجھ لیں — حدیث میں یہ ہے

أَنَا عَلِيٌّ مِنْ نُورٍ وَاحِدَةٍ

”اَنَا کے معنی ہیں — ”میں“ — اور علیؑ،

سامعین!

جہاں لفظ ”اور“ بیچ میں آجائے تو ”و“ ہو جاتے ہیں —

”میں اور علیؑ“ — ہیں نا دو

اب دو بھڑ گئے — تو ہو گئے ”ایک“ —

— دو کے دو بھی ہیں — ایک کا ایک بھی ہے —

چونکہ دو اور ایک، عوام کی سمجھ میں نہیں آتا تھا —

اس لئے سمجھانے کے لئے ایک اور فقرہ کہہ دیا۔

أَوَّلُ مَا خَلَقَ اللَّهُ (القلم)

پہلی شے جو اللہ نے خلق کی — القلم

وہ تھا۔ ”قلم“

سامعین!

اب یہ قلم ”میری عمر والوں کی سمجھ میں تو ضرور آئے گا۔ جو اپنے ہاتھ

سے ”قلم“ بنایا کرتے تھے۔

ایک قلم تراش یا۔ ایک "کانا" یا۔ پہلے اسے چھبلا قلم بنانے کے لئے۔ اور جب وہ پھیل گیا۔ تو آپ نے قلم بنانے کے لئے اس کے بیچ میں "شگاف" دینا ہے۔ یعنی اسے دو کرنا ہے، جب تک وہ قلم دو نہیں ہوگا۔ لکھے گا نہیں۔ لہذا آپ نے دو کرنا ہے مگر وہ دو آپ نے قلم تراش کی نوک سے کرنا ہے۔ اس طرح دو ہو جائے۔ کہ دو ہونے کے باوجود "حرف" ایک لکھے۔ دو کا دو بھی ہو۔ ایک کا ایک بھی ہو۔ دو ہوئے بغیر قلم کچھ سکتا ہی نہیں۔ مگر دو ہونے کے باوجود۔ اس میں یہ صفت ہو کہ لکھے "حرف" ایک۔ اور اگر اس قلم کے دونوں حصوں کے بیچ میں ایک ذرا سا تنکا بھی آ جائے تو قلم کا کچھ نہیں گبڑے گا۔ ہمارا لکھا گبڑ جائے گا۔ ہماری تحریر خراب ہو جائے گی۔ اس طرح دو ہوں۔ کہ دو ہونے کے باوجود "فصل" نہ ہونے پائے اس طرح بنتا ہے۔ "قلم"

اب آپ کا قلم بن گیا ہے۔؟

"نہیں"۔ ابھی اور محنت درکار ہے قلم بنانے میں۔ ابھی لگا:

ہے آپ نے اس میں۔ "قط"

اب قط لگایا۔ آپ نے۔ سیدھا؟ نہیں۔

ذرا سا ٹیڑھا۔ (قط اگر سیدھا ہو تو لکھا ہی نہیں جاتا)

اب "قط" کا ذرا سا ٹیڑھا ہونے سے یہ فرق ہو گیا۔

۔ ہیں تو دونوں ایک ہی "قلم" کے حصے۔ مگر ذرا ٹیڑھا "قط" لکھنے سے ایک:

بڑا ہو گیا۔ ایک ذرا چھوٹا ہو گیا۔ معلوم ہوا جس لئے سب سے پہلے
 اللہؑ کا تھا۔ وہ ”قلم“
 دو بھی تھے۔ ایک بھی تھا۔
 قلم لگنے سے ایک ذرا بڑا تھا۔ ایک ذرا چھوٹا تھا۔

سامعین !

تھے ایک ہی ”قلم“ کے دونوں حصے۔ ایک کو جدا کر دو تو دوسرا نہ لکھ سکے
 دونوں ”قلم“ کے ساتھ ساتھ رہیں گے۔ ایک ذرا بڑا۔ ایک ذرا چھوٹا۔ بڑا
 لکھنے کا کام دے گا۔ چھوٹا بڑے کی مدد کرے گا۔ ایک مددگار ہو گا۔ دوسرا لکھے گا
 بات یہاں اگر ختم ہوتی ہے کہ کسی ایسے باپ سے پوچھو۔ جس کے دو بیٹے ہوں
 ایک بڑا۔ ایک چھوٹا۔ دونوں میں سے ضدی کون سا ہوتا ہے۔؟

بڑا ذرا متین، سمجھدار۔ اور چھوٹا ضدی۔ وہ باپ سے ضد کرتا ہے
 نماز کرتا ہے۔ چھوٹا جو ہوا۔ اور اس کی وجہ یہ بھی ہے۔ کہ اس کے نابز روا
 دو ہوتے ہیں۔ ایک باپ۔ ایک بڑا بھائی۔ اس لئے اسے
 زیادہ ضد کرنے کی عادت ہو جاتی ہے۔

یہاں بھی دو قلم تھے ”نا“ ”قلم“ سے۔ ایک ذرا بڑا۔ ایک ذرا چھوٹا۔ اللہ
 نے یہ انتظام کیا۔ جو بڑا تھا۔ اسے رسالت دے دی۔ اب چھوٹا ضد کر گیا
 ”ہمیں بھی دو“

چنانچہ اللہؑ نے یہ کہہ کے پہلا یا چھوٹے کو۔
 ”بڑے کو بنانا ہوں آخری نبی۔“
 وہ آخری نبی بنے گا۔ تو پہلا امام بنے گا۔
 بس بھائیو !

بات یہاں آکر ختم ہوتی ہے۔

اللہ نے بڑے کو ”عبد اللہ“ کے گھر بھیج دیا — چھوٹے کو ”اللہ“ کے گھر بھیج دیا اور وہ بڑا جو اول مخلوق تھا — جو عبد اللہ کے گھر آیا تھا۔ اس کو اللہ نے ایک بیٹی عطا فرمائی۔

اب کائنات میں اس سے بڑا کوئی تھا ہی نہیں۔ اتنے بڑے گھر میں بیٹی پیدا ہو گئی — اللہ کو اس کی شادی کی فکر پیدا ہو گئی۔

اب تباؤ محمد کی بیٹی بیاہی جائے کسی گھر میں — اور شوہر سے وہ یہ کہہ دے۔

”میں وہ ہوں جو محمد کے گھر پیدا ہوئی۔“

اب شوہر بھی ایسا تلاش کرو۔ جو مسکرا کے جواب دے دے۔
میرے سامنے کیا کہتی ہے — میں وہ ہوں جو اللہ کے گھر پیدا ہوا۔“

بہر نوح۔ اللہ نے بڑے کو ”عبد اللہ“ کے گھر پیدا کر دیا۔ اور چھوٹے کو۔
”اللہ“ کے گھر پیدا کر دیا۔

اس ضمن میں تھوڑا سا ذکر جناب ”سیدہ“ بھی آگیا۔ ذکر خدا و رسول بھی آگیا
”اُمّ“ کی بات اتنا اللہ العزیز کل آپ سے کمون گا۔ اور کل کا وعدہ سنت رسول ہے
رسول نے بھی ”خیر“ میں فرمایا تھا۔

”کل میں علم اُسے دوں گا جو کرتا رہو گا۔“ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ

مَرَجُ الْبَحْرَيْنِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

خداوند عالم کی حمد و ثناء کے بعد حضرت محمد و آل محمد پر درود و سلام

محترم سامعین !

میرے ایک حقیقی بھائی مجھے حکم فرماتے ہیں کہ آج اپنی گفتگو شروع کرنے سے پہلے مولوی صاحبان کے دستور کے مطابق چھوٹا ساعری کا خطبہ بھی آپکو سنا دوں۔ چنانچہ اس حکم کی تعمیل میں دو چار جملوں کا ایک خطبہ آپ کو سناتا ہوں

أَعُوذُ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي جَعَلَ الشَّمْسُ ضِيَاءً وَالْقَمَرَ نُورًا

وَالصَّلَاةُ

وَالسَّلَامُ عَلَى مَنْ أَرْسَلَهُ لِلْخَلْقِ بُشِيرًا وَنَذِيرًا

وَعَلَى آلِهِ الَّذِينَ أَذْهَبَ اللَّهُ عَنْهُمْ الرِّجْسَ

وَطَهَّرَهُمْ تَطْهِيرًا

حضرات گرامی !

اگر آپ مجھے حکم دیں تو میں ساری مجلس عزری میں ہی پڑھ دوں ؟

خدا شاہد ہے میں نے آج تک اس بات کو کبھی ظاہر نہیں ہونے دیا کہ میں

بھی عربی جانتا ہوں۔ اس لئے خطبہ بھی کبھی نہیں پڑھا۔ خطبہ کے متعلق حکم صرف اتنا

ہے کہ بِسْمِ اللہ پڑھو اور خدا کی حمد کرو۔ مگر اس زبان میں پڑھو جس زبان میں

تمہیں تقریر کرنا ہے۔ لہذا میں اس بات کا ہمیشہ خیال رکھتا ہوں کہ سامعین کی زبان میں ہی گفتگو کی جائے۔

سامعین کرام!

آج میں آپ سے مختصر لفظوں میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ کلام مجید کے سورہ "رحمن" میں اللہ نے اپنی جن نعمتوں کا تذکرہ فرمایا ہے ان میں سے ہر نعمت خود اللہ کی نظروں میں اتنی بادتارا اور باعزت ہے کہ ہر نعمت کے بعد خدا جیسے عالی ظرف محسن کو یہ کہنا پڑا **الْآخِرُ تَكُنْ تِلْكَ بَلَدٌ** ط چونکہ میں سورہ حسن کی تشریح نہیں کرنا چاہتا اس کے لئے بڑی فرصت چاہیئے اس لئے اختصار کے ساتھ یہی کہہ سکتا ہوں کہ اللہ کی نعمتوں کی نہ ہمیں حد معلوم ہے نہ تعداد معلوم ہے جس کو ہم نہ گن سکتے ہیں اور نہ ہم اعادہ کر سکتے ہیں۔

بقول سعدی: "اگر سعدی جیسی ہوشیار نظر ہو تو ہر سانس کی آمد و شد میں دو نعمتیں موجود ہیں گویا جو سانس باہر آئے وہ مہجیتا ہے۔ اور جو اندر جائے وہ مفرج ذات ہے۔ لہذا جب ایک سانس میں دو دو نعمتیں ہیں تو کس میں دم ہے کہ نعمتیں گن گن کے بتائے۔"

کیسے پڑھے لکھ! کیسے سمجھ دارو!

دُنیا بھر کے علوم جاننے والو! یونیورسٹی کی ڈگریاں لینے والو! بتاؤ! دُنیا میں آج تک کوئی ایسا حساب ایجاد ہوا ہے جو بے گنتی کے ہو جائے۔ ہرگز نہیں۔

گویا حساب کی جڑ ہے گنتی۔ حساب کا اصل اصول ہے گنتی۔ لہذا جب کوئی حساب گنتی کے بغیر نہیں ہو سکتا اور خدا کی نعمت کو تو کوئی گن ہی نہیں سکتا تو پھر اس چیز کا جس کی گنتی نہیں، قیامت میں حساب کیسے ہو گا۔ حساب تو ان نعمتوں کا ہو گا جن کی تعداد مقرر ہے اور جن کی تعداد کا اندازہ ہی نہیں ہے ان کا حساب کیسے ہو گا؟ بہر نوع یہ ایک جملہ معترضہ تھا جو میں نے کہہ دیا۔

بزرگانِ من!

اللہ اپنی نعمتوں کے تعارف میں فرماتا ہے۔ "مَرْجُ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ" میں نے جہاں اور نعمتیں عطا فرمائی ہیں۔ ایک یہ نعمت بھی ہے کہ "میں نے دو بحر جاری کر دیئے۔"

دیکھو نا! اب اگر سمندر ترجمہ کرتا ہوں تو سمندر جاری نہیں ہوتا کیونکہ سمندر میں تو بہاؤ نہیں ہے۔ وہ تو اپنے علاقے میں ایک ٹھہری ہوئی چیز ہے۔ لگ رہاں بحر چاٹیں۔ جن میں بہاؤ ہو۔ جو جاری بھی ہوتے ہوں۔ "مَرْجُ الْبَحْرَيْنِ" دو بحر جاری کر دیئے۔ اور جاری کس شان سے کئے اُن دو بحر کے جاری ہونے کا طریقہ کیا ہے؟ "يَلْتَقِيَانِ"

سامعین!

"يَلْتَقِيَانِ" مضارع کا صیغہ ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ دونوں بحر جاری ہوتے ہوئے کہیں مل جاتے ہیں اور کہیں جدا ہو جاتے ہیں۔ گویا نہ ہمیشہ جدا رہتے ہیں اور نہ ہمیشہ مل کے رہتے ہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ جب تک یہ دو بحر جدا رہتے رہے رہتے رہے۔ اور جہاں مل گئے "يَخْرُجُ مِنْهُمْ لَوْنٌ وَالْمَرْجَانُ"

"جہاں وہ دونوں بحر مل جاتے ہیں وہیں ان میں سے موتی نکل آتے ہیں" بزرگانِ من!

اہل علم حضرات میں ان بحروں کی بہت تشریحیں کی گئی ہیں۔ بڑی بڑی اس کے اندر روایاں دکھائی گئی ہیں۔ بڑی بڑی آبدار باتیں کی گئی ہیں۔ علم کے بے شمار دریا بہا دیئے ہیں۔ ادھر شعراء اُٹھے تو اس بحر میں قصیدے کہہ دیئے۔ شروان اُٹھے تو انہوں نے اس بحر کو نثر کے میدان میں پھیلا دیا۔ فخر الدین رازمی اُٹھے تو بحروں کا ترجمہ کرتے ہوئے چھ صفحے لکھ کر بھی راضی نہ ہوئے اور ایاز کے علماء نے ان بحروں کا ترجمہ فرات کر دیا۔ ہندوستان کے مولوی ثناء اللہ پانی پتی نے

گنگا اور جہنا کر دیا اور مصر میں پہنچا تو ترجمہ نیل ہو گیا اور بنگال میں پہنچا تو ترجمہ خلیج ہو گیا غرض جہاں جہاں جیسے لوگ تھے وہ ویسے ویسے ترجمے کرتے رہے اور کثرتِ ترجمہ اور کثرتِ تاویل سے بحرین کا خواب تعبیروں کی زیادتی سے منتشر ہو کے رہ گیا اور پتہ بھی نہ چل سکا کہ کیا ہوا۔

محترم و معظّم سامعین !

اگر آپ تیار ہوں میری بات سُنانے کے لئے تو میں بھی آپ کو بحرین کی ایک بات سُنادوں۔ ۹

دیکھو نا ! بحرین کی جہاں اور تعبیریں اور تاویلیں ہوئی ہیں وہاں معدن النبوت مخزن الرسالت کی زبان سے بھی کچھ ضرور نکلا ہے کہ بحر کے کتے ہیں۔

صادق آل محمد صلوٰۃ اللہ وسلامہ علیہ، جہاں سے

علم کے سرچشمے پھوٹتے ہیں۔ جہاں سے دنیا کو علم ملا ہے جہاں سے

کائنات نے علم سیکھا ہے۔ وہ بے پڑھے لکھے جنہوں نے دنیا

کو پڑھایا۔ جنہوں نے مکتب کی شکل نہیں دیکھی اور جن کے مکتب نے

دنیا کے مکتب فکر بلند کر دیئے۔ جن کا درس گاہ وہ تخلصان تھا کہ

علم و ادب کی دھوپ سے تپتے ہوئے انسان جہاں جا کر پناہ لیا کرتے

ہیں۔ ان سے کسی نے پوچھا: ”مولا“ ”بحرین“ سے کیا مراد ہے؟

فرمایا: ”مجدور الہدایت“ یہ ہدایت کے سمندر میں۔

سامعین !

اُمّام یہ کہہ کے خاموش ہو گئے۔ یہی اُمّام کے کلام میں لطف ہے کہ ایک تھوڑی سی

بات کہتے ہیں پھر آگے سمجھنے والے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

یاد رکھو سامعین ! جس چیز کا نام ہدایت ہے جس چیز کا نام ہدایت کا راستہ

دکھانا ہے۔ یہ کام اللہ نے کبھی ایک سے نہیں لیا بلکہ ہمیشہ ہادی بیک وقت دو ہی ہے

گردیا ہدایت ہمیشہ دو کرتے ہیں۔

دیکھو نا! آنکھ ہادی ہے اس لئے دو ہیں۔ کان ہادی ہیں دو ہیں۔ ہاتھ ہادی ہیں دو ہیں۔ اور زبان! چونکہ کبھی کبھی ہدایت میں جھوٹ بول جاتی ہے اس لئے ہادی نہیں بنایا۔ بلکہ اسے قابو میں رکھنے کے لئے سامنے بتیس دانٹوں کا پہرہ لگا دیا گیا ہے اور ہونٹوں کا پھاٹک لگا کر دہن کے قفل میں بند کر دیا گیا ہے۔ اس لئے کہ یہ بڑی خطرناک چیز ہے۔ حالانکہ دیکھنے میں تو بڑی نازک ہے مگر بڑی شرمیہ ہے۔ اگر کہیں گھر سے باہر نکل آئے تو فساد و لڑائی کروا دیتی ہے بہر نوع اللہ نے ہدایت کا کام اس کے سپرد نہیں کیا ورنہ زبان کو لگام دینا مشکل ہو جاتا۔ اسی طرح دل و دماغ دونوں مل کے ہدایت کا کام کرتے ہیں۔

غور فرمائیں صاحبان! آدم ہادی نہ بنے جب تک شیٹ ساتھ نہ ہوئے
نوح ہادی نہ بنے جب تک سام ساتھ نہ ہوئے۔ ابراہیم ہادی نہ بنے جب تک اسماعیل ساتھ نہ ہوئے۔ موسیٰ ہادی نہ بنے جب تک ہارون ساتھ نہ ہوئے
گویا جب تک دونوں ہوں اللہ ہدایت کا کام سپرد نہیں فرماتا۔ آخر ہدایت کا پیسہ چلتے چلتے جب عیسیٰ تک پہنچا تو وہ اکیلے رہ گئے۔ اللہ نے کہا عیسیٰ! تم اکیلے ہو لہذا میں تم سے ہدایت کا کام نہیں لوں گا۔ بہتر ہے تم غائب ہو جاؤ چنانچہ عیسیٰ غائب ہو گئے۔ آخر میں محمد مصطفیٰ ہادی بنے تو علی ساتھ ہوئے۔ علی ہادی بنے تو حسن ساتھ ہیں۔ حسن ہادی بنے تو حسین ساتھ ہیں۔ یہاں تک کہ گیارواں ہادی ہے۔ بارہواں ساتھ ہے اور جب بارہواں اکیلا رہ گیا تو وہ غائب کر دیا گیا۔

اللہ نے کہا "تم اکیلے ہو اور اکیلے سے ہم ہدایت کا کام نہیں لیا کرتے لہذا تم غائب ہو جاؤ۔"

سامعین! ادھر بارہواں اکیلا رہ گیا وہ غائب کر دیا گیا ادھر عیسیٰ اکیلا رہ گیا وہ غائب کر دیا گیا اور ہم بارہویں والے اور عیسیٰ والے دونوں اڑے بیٹھے ہیں کہ ہمارے غائب ہیں۔

اب عیسیٰ والے فخر یہ کہتے ہیں کہ ہمارا آسمان پر غائب ہے اور تمہارا زمین پر غائب ہے۔ لہذا ہمارا تمہارا کیا مقابلہ ہے کیونکہ ہمارے اور تمہارے غائبوں میں تو زمین و آسمان کا فرق ہے۔

ہم کہتے ہیں۔ ”بھئی! تم نے سوچا ہی نہیں۔ اللہ نے دونوں کو غائب کرتے وقت دونوں کی عزت کو عدل کی میزان میں تو لا تھا۔ ایک کا پلہ آسمان پہ پہنچ گیا اور ایک کا زمین پہ۔ چونکہ یہ تو عزت تُو لی جا رہی تھی لہذا وہ اکیلا وہاں غائب اور یہ اکیلا یہاں غائب۔ جب تک دونوں اکیلے رہیں گے غائب رہیں گے اور جب اللہ ان سے ہدایت کا کام لینا چاہے گا پھر ان دونوں کو ملا کر دو کر دے گا۔ کیونکہ جب تک دو نہ ہوں گے ہدایت کبھی ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ اور بات ہے کہ زمین والا جائے گا یا آسمان والا آئے گا۔ یہ بات تو وقت بتائے گا۔ بہر نوع دو ہوں گے تو ہدایت ہوگی۔

سَامِعِین !

لُطَف آجائے گا جب یہ زمین والا بھی آجائے گا اور آسمان والا بھی آجائے گا تمام دُنیا کٹھی ہو جائے گی۔ خاص طور پر تمام مسلمان اکٹھے ہو جائیں گے اور عرض کریں گے ”فرزند رسول! نماز تو پڑھا دیں“ ”مولا فرمائیں گے“ ”اچھا یہ بات ہے۔ پھر صفیں باندھو“ چنانچہ ہم صفیں باندھیں گے۔ قطاروں میں کھڑے ہو جائیں گے اور وہ آسمان والا بھی نماز پڑھنے کے لئے زمین والے کے پیچھے کھڑا ہو جائے گا۔

حضور والا! اب اگر معترض یہ کہے کہ ایسا کیوں ہوا۔ کہ تمام آگے میں درنہ پیچھے ہے؟ تو اس کا جواب میں نہیں دیتا۔ بلکہ آپ بن گورنمنٹ کے محکمہ مال سے پوچھ لو۔ وہ یہ بتائیں گے کہ۔ مولوی صاحبان! تم کیوں خواہ مخواہ کے لئے الجھ رہے ہو۔ دیکھو نا! یہ مسئلہ تو ہمارے سمجھانے کا ہے۔ نماز چونکہ اس نے پڑھائی ہے جو زمین پہ موجود ہے اور عیسیٰ زمین

چھوڑ کے بے دخل ہو گئے تھے۔ لہذا جو آدمی بے دخل ہو گیا ہو اسے ذلیل کار کے متوتے ہوئے زمین پر امامت کروانے کا کیا حق حاصل ہے۔

صاحبان !

اگر یہ نکتہ سچے ذہن میں آ گیا ہے کہ دو ہوں تو اللہ ہدایت کا کام لینا ہے۔ اب لفظ "بحرین" پر غور فرمائیں زیادہ دُور سے ڈھونڈنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ بحرین کا مرکز منبع حضرت ابراہیم سے جاری ہوا۔ حضرت ابراہیم گویا بحرین کا نکتہ مرکزی ہیں۔ بحرین کا شجرہ میں۔ اور آپ حضرت کو یہ بات معلوم ہے کہ ابراہیم کی پیدائش ملک عراق میں ہوئی اور آپ کا بیٹا اسمعیل بھی عراق ہی میں پیدا ہوئے۔ پھر ابراہیم نے حکم خدا مکہ میں خانہ کعبہ بنایا۔ اور جس راستے سے ابراہیم اپنے بیٹے اسمعیل اور اپنی بیوی باجرہ کو ساتھ لیکر عراق سے مکے آئے تھے۔ وہ راستہ پھر بالکل بند ہو گیا۔ پھر کوئی اور اس راستے پر نہ چل سکا۔ اس کے بعد ساڑھے تین ہزار سال بعد حشیش بن علی اسی راستے پر چل کر مکے سے کربلا تک شریف لائے۔ گویا ابراہیم نے جس راستے کی سنگ بنیاد رکھی تھی اس پر حشیش چل کر آئے۔ ادھر اس واقعہ کو قبائل نے اپنے اس شعر میں نظم کیا ہے

کتنی پُر سادہ و رنگیں ہے داستانِ حرم

نہایت ہے اسکی حشیش ابتداء ہے اسمعیل

بہر ذرا حضرت ابراہیم منبع البحرین ہیں۔ ایک بحر بنی اسرائیل کہلاتی اور ایک بحر بنی اسمعیل کہلاتی۔ ایک اسحق کی اولاد۔ ایک اسمعیل کی اولاد۔ منبع ابراہیمی سے یہ دو بحرین دنیا میں جاری ہوئیں۔ بحر اسحق مصر و شام وغیرہ کی وادیاں کو سیراب کرتا رہا اور بحر اسمعیل عرب کے ریگستان کو سیراب کرتا رہا۔ بحر اسحق جو مصر و شام کو سیراب کرتا تھا کہیں اس کی شاخیں بنیں کہیں اکٹھا ہوا۔ یہاں تک کہ اس کی دو شاخیں ہو گئیں۔ ایک موسیٰ کی شاخ ایک شعیب کی شاخ۔ پھر اللہ نے موسیٰ اور شعیب کو ملا کر "بَنَتْنِیَّان"

کر دیا۔ اور ملا یا کس شان سے کہ ایک گھر لڑکی پیدا کر دی اور ایک کے گھر لڑکا پیدا کر دیا۔

سامعین !

اللہ جب دو کو ملاتا ہے یا یَلْتَقِیَانِ کرتا ہے تو یہ سنت الہی ہے کہ ان دونوں میں سے ایک کے گھر لڑکی پیدا کرتا ہے اور ایک کے گھر لڑکی شادی کر دیتا ہے۔ اور جس شاخ کو روکنا ہو وہاں لڑکی پیدا ہوتی ہے اور جس شاخ کو آگے چلانا ہو وہاں شادی ہو جاتی ہے۔ گویا قدرت کا یہ قانون ہے چنانچہ اللہ نے شاخ شعیب کو روکنا تھا وہاں لڑکی پیدا کر دی اور موسیٰ کی شاخ کو چلانا تھا وہاں شادی کر دی۔ یہ ”یَلْتَقِیَانِ“ ہو گیا۔

حضور والا ! یہ ”یَلْتَقِیَانِ“ پھر چلتا رہا۔ آگے جا کے پھر جُدا ہو گیا پھر ملا دیا۔ پھر جُدا ہو گیا۔ اسی طرح اسحقؑ کی نسل میں چلتا رہا۔ اسمعیلؑ کا سلسلہ اپنی جگہ چلتا رہا اور اسحقؑ کا سلسلہ اپنی جگہ چلتا رہا۔ آخر میں جُدا ہو گیا۔ نسل اسمعیلؑ کی ایک شاخ عبد اللہ کی طرف پہنچی اور ایک شاخ ابی طالب کی طرف پہنچی۔ ابی طالب کے گھر لڑکا پیدا ہوا۔ عبد اللہ کے گھر جو لڑکا پیدا کیا اُسے بحر نبوت بنایا اور ایسی بحر بنایا نبوت کی کہ آگے نبوت ختم ہو گئی۔

بزرگانِ من !

بات سے بات نکلتی ہے۔ اور دائرہ گفتگو بڑھتا جاتا ہے۔ دیکھو نا اب ایک آم کا درخت ایک شخص کو پسند آ گیا۔ ”واہ۔ واہ۔ یہ آم بڑا اچھا ہے۔ پتلا رس ہے۔ صوف بالکل نہیں۔ انتہائی میٹھا ہے۔ سواد آ گیا۔ جی چاہتا ہے آم کبھی ختم نہ ہو“ چنانچہ آم کھایا اور گھٹلی زمین میں ڈال دی۔ کچھ عرصہ بعد نیا آم ہو گیا۔ پھر کھایا۔ اور گھٹلی زمین میں ڈال دی اور نیا آم ہو گیا۔ یہاں تک کہ چلتے چلتے ایک وقت ایسا آ جاتا ہے کہ آم کے درخت سے آم آنے بند ہو جاتے ہیں گویا آم بوڑھا ہو گیا۔ بڑا فسوس ہو ا۔ درخت بہتر بن تھا۔ میٹھے

آم تھے۔ اب گٹھلی کہاں سے آئے گی۔ مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ آم کا وجود اب بھی ہم باقی رکھ سکتے ہیں۔ کیسے؟ کہ اب اس کی گٹھلی کا انتظار نہ کرو بلکہ جو آم "بلا فصل" ہو گیا ہے اسے باقی رکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کی جنس کا آم کا ایک پودا گلے میں اپنے گھر اگاؤ اور جب تمہارے گھر میں اگا ہوا آم کا پودا ذرا سا بڑا ہو جائے تو اسے ختم ہونے والے درخت کے نیچے رکھ دو۔ اس کی آب و ہوا میں پل کے جب ذرات و تازہ ہو جائے تو اس کی ایک شاخ اس کے ساتھ قلم بند کر دو جب قلم بند ہو کے یک جان ہو جائیں۔ تو شاخ درخت سے اتار دینا۔ اب یہ پودا اس شاخ کو لے کر اپنے گھر آ جائے گا۔ لیجئے نیا درخت تیار ہو جائیگا۔

سامعین !

ختم ہونے والے آم کو باقی رکھنے کا یہی طریقہ ہے۔ بس "بحرین" میں بھی اللہ نے ایسا ہی کیا۔ ایک پیدا کردہ عبد اللہ کے گھر اور ایک پیدا کردہ ابو طالب کے گھر عبد اللہ کے گھر پیدا کیا محمد کو۔ جو شجرہ نبوت کا آم تھا۔ یہاں آ کر سو لاکھ فصلیں دے کر ختم ہو گیا۔

اب اللہ اس درخت کو باقی رکھنا چاہتا ہے۔ اور باقی رکھنے کا طریقہ وہی رکھا جس جنس کا شجرہ نبوت تھا اسی جنس کا ایک پودا اللہ نے اپنے گھر لگایا۔ مگر پودا ذرا زوردار تھا اگتے وقت گلے میں ذرا شکات آ گیا۔ ہر نوع اللہ نے یہ پودا اپنے گھر لگایا۔ جب پودا ذرا ترقی کر گیا تو ختم ہونے والے شجرہ نبوت کے نیچے رکھ دیا اور اس کی ایک ہری بھری شاخ اس پودے سے قلم بند کر دی۔ قلم بند ہونے کے بعد وہ پودا اپنے گھر لگایا۔ اس طرح ختم ہونے والا ہمیشہ کے لئے قائم ہو گیا۔ گویا یوں "یُلْتَقِیان" ہوا۔

بزرگوار محترم !

حضور سیدہ طاہرہ سلام اللہ علیہا ہی ختم ہونے والے شجرہ نبوت کی

وہ ہری بھری شاخ ہے کہ اس کی جنس سے قلم بند ہو کر نبوت کے شجرہ کو قیامت تک قائم رکھا۔ اور علیؑ اسی جنس کا پودا ہے گیادونوں کی ایک ہی جنس ہیں۔ اسی بات کو دیکھ کر رسولؐ کہا کرتے تھے، "اگر علیؑ نہ ہوتے تو میری بیٹیؑ کی شادی نہ ہوتی"۔ گویا ہم جنس پودا نہ ہو تو قلم بند ہی نہیں ہوتی اور اگر ہم جنس ہو تو قلم بند ہی ہوتی ہے۔ بہر نوع سیدہ۔ علیؑ کے گھر آگیش۔ نبیؐ شجر تیار ہو گیا۔ اب اس نئے شجر نے نئے انداز سے ہدایت شروع کر دی۔ بحرین کا اجتماع تھا اور اس نئے انداز سے ہدایت ہو رہی تھی۔ مردوں کی ہدایت باہر ہوتی رہی اور عورتوں کی ہدایت اندر ہوتی رہی۔ باہر کی ہدایت سے سلمانؓ و قنبرؓ تیار ہوئے اور اندر کی ہدایت سے فضہؓ تیار ہوتی رہیں۔ ادھر سلمانؓ اتنے تیار ہوئے کہ رسولؐ نے من اهل البيت کہا۔ ادھر قنبرؓ اتنے تیار ہوئے کہ اسے کہا کہ یہ اصدق الناس ہے۔ اور قنبرؓ ایسا تیار ہوا کہ علیؑ نے پیار میں بیٹا کہہ دیا۔ مگر فضہؓ کی تیاری عجیب شان کی تھی۔ گویا بحرین کے منہ سے موتی نکل رہے تھے۔ فضہؓ اس طرح تیار ہوئیں کہ ایک دن رسولؐ پوچھ بیٹھے، "فضہؓ! کہو کیسا حال ہے؟" فضہؓ نے عرض کی، قبلہ! کیا حال بناؤں۔ میرا حال تو یہ ہے کہ مجھ سے بہتر حال کسی کا نہیں ہے، رسولؐ نے پوچھا، "فضہؓ! کیا بہتری دیکھی تو نے؟"

عرض کی، "قبلہ اس سے بہتر بھی کوئی بات ہو سکتی ہے کہ فاطمہؓ مجھے "ہن" کہتی ہیں۔ اور میری خوشی میرے دل سے پوچھو! جب میں صبح کو سوتی اٹھتی ہوں تو حسینؓ "امام" کہہ کے سلام کرتے ہیں۔ زینبؓ مجھے ماں کہہ کے سلام کرتی ہے۔ اس سے زیادہ مجھے کیا عزت چاہیے"

معزز سامعین!

جناب سیدہ طاہرا سلام اللہ علیہا جن کا نام لینے سے پہلے کانوں کی بھی

حضور والد! ایک دن رسل اللہ صحن مکہ میں خانہ کعبہ کے سامنے نماز میں مشغول تھے کہ ابو جہل، عتبہ، عتبہ بن ابی لہب کے بیٹے اور قریش کے بڑے سرکش نوجوان اکٹھے ہو کے آئے اور انہوں نے اونٹ کی لالٹن سجدے میں سونے کی کمر پر رکھ دی۔ اُدھرا انہوں نے یہ عمل کیا اُدھر سیّدہ گھر سے باہر نکل آئیں۔ اس وقت سیّدہ تقریباً تین سال کی تھیں۔ اب جو سیّدہ کو انہوں نے آنے دیکھا تو یہ سارے کے سارے سرداران قریش کہتے ہیں کہ محمد کے دو پر پڑی ہوئی یہ غلامت جلدی جلدی اٹھا لو کہیں خدیجہ کی بیٹی نہ دیکھ لے۔ اس نے دیکھ لیا تو ماں کو جا کر بتائے گی پھر ہم خدیجہ کو کیا منہ دکھا دیں گے ؟

سایمانیہ !

یہ ایک تاریخی واقعہ ہے جسے پڑھ کر عقل حیران ہوتی ہے کہ جو عتبہ اور
عتبہ خدیجہؓ کی تین سالہ بیٹی کا اتنا احترام کریں کہ رسولؐ کی کمر پہ رکھی ہوئی عدالت
مٹالیں تو پھر اُسی عتبہ اور عتبہ نے خدیجہؓ کی بڑی بیٹیوں کو کیوں حدق سے رے رے
یا تو یہ تاریخ جھوٹی ہے یا پھر وہ بیٹیاں نہیں تھیں۔ ————— بہر حال سیدہ
طاہرہؓ نے باپ کی خدمت کر کے دنیا کو بہ بنا دیا کہ دُنیا کی عورتوں! باپ کی محبت
یوں کرنا۔ یہ سیدہ طاہرہؓ کا دیا ہوا سبق ہے کہ آج دنیا کا ہر انسان کا علیحدہ خوشی
سے اچھلنے لگتا ہے۔ دل باغ باغ ہو جاتا ہے جب بیٹی باپ کے گئے ہیں۔
ڈال کے کہتی ہے "ابا جان، گویا اتنا پیار کسی اور بات میں آتا ہی نہیں جنت
بیٹی کے "ابا" کہنے میں پیارا آتا ہے۔

جناب موسیٰ نے بھی اللہ سے یہی دعا کی تھی۔

اللہ نے پوچھ لیا ”موسیٰ! بیٹی کیوں مانگتا ہے؟“
فرمایا: خداوند! اگر میرے پاس بیٹی ہوگی تو میرے جنازے کی رونق ہو جائے گی۔

خداوند! بیٹا ہے شک صحن کی رونق ہے مگر بیٹا جنازے کی رونق ہے۔
بیٹے کے رونے سے باپ کا جنازہ سچ جاتا ہے۔
ہر نوع سیدہ طاہرہ نے اپنے عمل سے دنیا کو بتا دیا کہ باپ کی خدمت یوں
کر۔ پھر اس سیدہ نے دنیا کو سمجھا دیا کہ شوہر کی اطاعت یوں کر کر۔
بھائیو!

آپ کو وہ واقعہ یاد ہو گا کہ جب سیدہ کے فاتح خیبر شوہر نے خیر فتح کیا ہے اس دن خیبر میں دو ہزار سال کا یہودیوں کا مال کٹھا تھا۔ گویا خیبر دنیا کی مال دار قوم کا مالی مرکز تھا۔ جب تلحہ خیبر علیؑ کے ہاتھ سے فتح ہوا تو مسلمانوں نے اس مال غنیمت کو لوٹا۔ مال غنیمت کا اندازہ آپ اس بات سے لگا بیٹیں کہ علاوہ پارچہ ت کے، علاوہ جانوروں کے، علاوہ زیورات کے، خالص سونا جوڑیوں کی شکل میں تھا۔ ہر مسلمان کے حصہ میں چوبیس سو سیر آ رہا۔ جو مسلمان اپنی عبادتوں کے ساتھ باندھ کر لوٹے۔ اور لا کے وہ گٹھر طیان اپنے من میں ڈال دیں۔ قرآن کی آیات میں اور۔ جہوں نے اس دن فتح خیبر کے دن کی عید منائی جس دن پر و۔ زردے پکے کیونکہ عربوں کے گھر سونا آگیا تھا۔ یہ ایک تاریخی فقرہ ہے کہ فتح خیبر کے بعد عربوں کے بچے مدینہ کی گلیوں میں سونے کی ڈلیوں سے کھیل رہے تھے۔ اور دغا کورسے تھے۔

ناجیخیر! خدا تیرے بچوں کی خیر کرے۔ تیرے صدقے میں آج ہمارے گھروں میں بلاؤزدردے لگے ہیں۔

سما معین:

جب ہر مسلمان خاتون اپنے گھر کے دروازے پہ اپنے شوہر کے استقبال کے لئے کھڑی تھی اور شوہر سونے کی گھڑیاں لارہے تھے۔ تو ماتح خیر کی بیوی بھی رسم عرب کے مطابق بچوں کی انگلیاں پکڑے ہوئے دروازے پہ کھڑی تھی۔ اور بچوں سے کہہ رہی تھی: ”تمہارے ابا ابھی آتے ہوں گے“ تھوڑی دیر بعد بچوں کو دوسرے باپ آتے نظر آئے۔ بچوں نے کہا: ”اماں! وہ ابا آگئے“ بی بی نے فرمایا: ”ہاں“ — اتنے میں رسول آگئے۔ رسول نے دروازے پہ کھڑے ہو کر کہا:

فاطمہ بیٹا! مبارک - تیرے شوہر کو اللہ نے فاتحِ خیر بنایا ہے۔

سیدہ باپ کے سامنے کیا کتنی بشرہ کا کہتا ہے۔

جب باپ آگے بڑھ گئے تو سیدہ نے فوراً اپنا سر سجدے میں رکھ دیا۔

”یا اللہ! تیرا شکر ہے۔ تو نے مجھے کتنا عظیم شوہر عطا فرمایا۔“

اب جو سیدہ نے سجدے سے سر اٹھایا تو سامنے سے شوہر آتے ہوئے نظر آئے

بچوں نے بڑھ کر باپ کا استقبال کیا۔ سیدہ نے سلام کیا۔ علی مسکرا رہے ہیں۔

گھر میں اندر تشریف لائے۔ علی کے پیروں پہ پڑی ہوئی مٹی سیدہ نے اپنی چادر

سے - ناف کی - اب سیدہ نے دیکھا کہ علی خالی ہاتھ ہیں۔ خیال کیا کہ بچے چروغہ

پہ لدا تو اسامان آ رہا ہو گا۔ خاموش رہیں۔ بچے بھی کھڑے علی کا منہ تک رسے

تھے۔ آخر تھوڑی دیر بعد سیدہ نے بڑے ہی متانت سے پوچھا۔

حسین کے ابا! بچے یہ پوچھتے ہیں کہ خیر کے مال غنیمت سے آپ کو

کیا ملا۔؟

بس بھائیو! سیدہ کا یہ پوچھنا تھا کہ فاتحِ خیر فقیر تھا کہ اپنے لگا

اب بتاؤ! علی کی وہ تصویر زیادہ خوبصورت تھی جب خیر فتح کیا تھا۔

ایہ تصویر زیادہ حسین ہے جو فقیر تھا کہ اب رہا ہے۔ سر جھکا ہوا ہے۔ رنگ زرد ہو

گیا ہے اور کہہ رہا ہے۔

”محمد کی بیٹی! اپنے باپ کے صدقہ میں مجھے معاف کر۔ حصہ تو مجھے سب سے دوگنا ملا تھا مگر تیرے باپ کی سلامتی کی خاطر راہِ خدا میں سب بانٹ کے خالی ہاتھ گھر آگیا ہوں۔“

گو یا جس دن عرب کے ہر گھر میں پلاؤ پکے تھے۔ فاتحِ خیبر کے بچے اس رات نانے سے سوئے تھے اور سیدہ نے وہ ساری رات عبادت بھی میں بسر کی تھی اور ہزاروں مرتبہ اللہ کا شکر ادا کیا۔

”خدا وندا! تیرا شکر ہے تو نے مجھے کتنا عظیم و کریم شوہر عطا فرمایا۔“
بہرِ نفعِ سیدہ نے اپنے عمل سے دنیا کو بتا دیا کہ شوہر کی اطاعت یوں کرنا اور رہ گئی بچوں کی تربیت تو جنابِ سیدہ کی گود میں پلے ہوئے بچے عالم کے مصلحِ عظیم بن گئے۔ دنیا کے رہبرِ اعظم بن گئے۔

سَامِعِین !

ہماری مائیں تو بچوں کو یہ کہہ کر سُنتی ہیں۔

”میرا بچہ بڑا ہو کر افسر بنے گا۔ حاکم بنے گا۔“ مگر سیدہ یہ کہہ کر سُلا یا کرتی تھیں ”میرا بچہ اللہ کی راہ میں قربانی دے گا۔ میرا بچہ خدا کی راہ میں سر دے گا۔“
گو یا سیدہ نے بچوں کو اس شان سے پالا تھا۔ سیدہ کا احسان تمام دنیا پر ہے کہ اس نے باپ کی خدمت بھی سکھا دی، شوہر کی اطاعت بھی سکھا دی۔ اور بچوں کی تربیت بھی سکھا دی۔

مگر ایک شے ایسی رہ گئی جو میں سیدہ نہ سکھا سکی۔ باپ کی خدمت سکھا دی شوہر کی اطاعت سکھا دی اور بچوں کی تربیت سکھا دی مگر ایک ایسی شے ہے جو سیدہ ہمیں نہ سکھا سکی اور وہ ہے ”بھائی سے محبت“ اور وہ اس لئے کہ سیدہ کا کوئی بھائی نہیں تھا۔ چنانچہ سیدہ نے عرض کی۔

”خدا وندا! میں دنیا کو کیسے بتاؤں کہ بھائی سے محبت کس طرح کر دے؟“

اللہ نے کہا "فاطمہ! فکر نہ کر۔ میں تجھے بیٹی عطا کرتا ہوں۔ وہ دنیا کو بتا دے گی کہ بھائی سے محبت کس طرح کی جاتی ہے۔"

چنانچہ سیدہ کے گھر بیٹی پیدا ہوئی اور حسب دستور زمانہ ماں کو بیٹے سے زیادہ پیار ہوتا ہے اور باپ کو بیٹی سے زیادہ پیار ہوتا ہے چنانچہ جب بیٹی پیدا ہوئی تو علیؑ اپنی گود میں اٹھائے رسولؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ عرض کی "قبلاً! خدا نے یہ رحمت مجھے عطا فرمائی ہے۔"

رسولؐ نے بیٹی کا چہرہ دیکھا۔ پھر علیؑ کا چہرہ دیکھا اور دونوں چہرے ملا کے کہا۔

"یا علیؑ! یہ بچی "زین اب" ہے۔"

"اپنے باپ کی زینت ہے۔"

گویا زینبؑ اپنے باپ کے اتنی مشابہ تھی کہ رسولؐ کی بات سن کر علیؑ نے سر اٹھایا۔ دیکھا کہ رسولؐ کی آنکھوں میں موٹے موٹے دو آنسو تھے۔

علیؑ نے پوچھا "قبلاً! رو کیوں رہے ہو؟"

رسولؐ نے فرمایا "یا علیؑ! کوئی بات نہیں۔" ذرا یہ بچی میری گود

میں دو۔"

رسولؐ نے بچی گود میں لے لی اور علیؑ کھڑے دیکھ رہے ہیں کہ رسولؐ نور اسیدہ بچی کے کبھی بال چومتے ہیں۔ کبھی کلاشیاں چومتے ہیں۔ کبھی بازو چومتے ہیں۔ کبھی سینے سے لگاتے ہیں۔ ہر نوع اس شان سے شہزادی کی پرورش ہو رہی تھی۔ علیؑ سینے پہ سلاتے تھے۔ جب علیؑ گھر میں آتے تو زینبؑ دوڑ کے باپ کے گلے سے لپٹ جاتی اور کہتی "آبا جان"۔۔۔۔۔ علیؑ کو اتنا فخر محسوس ہوتا تھا۔ وہ ابوالحسنؑ کہلانے میں اتنا فخر نہیں کرتے تھے۔ ابوالحسنؑ کہلانے میں اتنا فخر نہیں کرتے تھے۔ جتنا "ابو زینبؑ" کہلانے میں خوش ہوتے تھے۔

اول وقت فجر کے بعد زینبؑ کو اٹھانے اور فرماتے "بیٹی اٹھ کے بیٹھو۔"

بچی پوچھتی ”آبا حضور! کیا حکم ہے؟“
 مولانا فرماتے ”بیٹا! گھر کے صحن میں ذرا ٹہسلد تاکہ تمہیں چلنے کی
 عادت پڑ جائے“
 میرے لعل! بچپن سے پیدل چلنے کی عادت ڈالو شاید کبھی کہیں
 چلنا پڑ جائے“

گویا اس شان سے جناب زینب کی تربیت ہو رہی تھی۔ جب بی بی جوان
 ہوئی تو مولانا عبداللہ ابن جعفر طیار سے شادی کر دی۔ عقد میں یہ شرط لگائی کہ
 ”عبداللہ! تم میرے اپنے بیٹے ہو۔ سکا بھتیجا بیٹا ہوتا ہے۔ تم میرے
 اپنے بیٹے ہو۔ میں زینب جیسی محترم بیٹی تمہارے عقد میں دے رہا
 ہوں۔ مگر شرط یہ ہے کہ اگر زینب کسی سفر میں جانا چاہے تو روکنا نہیں“
 عبداللہ نے عرض کی ”مولانا! میری کیا مجال جو میں زینب کو روکوں“
 بہر نوع جناب زینب کی عبداللہ سے شادی ہو گئی۔ خدا نے پہلی اولاد ایک
 بیٹی عطا فرمائی جن کا نام تھا کثوثم۔ پھر خدا نے دو بیٹے عطا فرمائے۔ وقت
 آہستہ آہستہ گزرنا لگا اور شہزادے سیانے ہوتے گئے اور وہ وقت بھی آگیا جو
 شرط علی نے لگائی تھی کہ زینب سفر میں جائے تو روکنا نہیں ”چنانچہ زینب کے
 سفر کرنے کا وقت آگیا۔“

میرے سامعین!

حیثین کے ساتھ زینب مدینہ سے روانہ ہوئیں مکہ میں قیام ہوا۔ بعد میں عبداللہ
 بھی بچوں کو ایک مکہ میں تشریف لائے۔ حج سے ایک دن پہلے حسین مکہ چھوڑنے
 پر مجبور ہو گئے۔ رات کو یہی عبداللہ جو حیثین کے بہنوئی تھے اور محمد حنفیہ جو
 بھائی تھے حیثین کے پاس بیٹھے کہہ رہے ہیں۔
 ”حیثین! ہمارا جی کہہ رہا ہے کہ تم نہ جاؤ۔“

امام فرماتے ہیں ”بھائیو! رات میں نے اپنے نانا کو خواب میں

دیکھا ہے۔ وہ میرے انتظار میں ہیں۔ میں نے جانا ہے۔
 سب سمجھ گئے کہ حسین اب ضرور جا بیٹھ گئے۔ چنانچہ خاموش ہو گئے۔
 ایک روائت میں ہے کہ جب موٹا نے فرمایا کہ ”بھائیو! مجھے جانے دو“
 تو جناب عبداللہ نے کہا ”حسین! اگر گستاخی نہ ہوتی تو میں تیری
 پریشانی کے بال کپڑ کے بیٹھ جاتا اور تجھے ملنے نہ دیتا مگر کیا کرو حسین!
 میں مجبور ہوں۔ میں امامت کے اُن رازوں کو نہیں سمجھتا جنہیں تو سمجھ
 رہا ہے۔ اچھا حسین! خدا حافظ۔ جاؤ۔“

دوسرے دن صبح کے وقت حسین ایک ایک کے گلے مل کے روانہ ہوئے
 ب یکے سے تین میل باہر یہ تافلہ پہنچا تو حسین کے کانوں میں ایک آواز آئی
 ”حسین! ذرا ٹھہرو۔“

آپ نے گھوڑے کی باگ روک لی جسک دیا۔ عباسؓ بھائی! دیکھو
 یہ کون ہے؟ قمر بنی ہاشم نے مڑ کے دیکھا۔ عرض کی۔
 ”موٹا! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عبداللہ آ رہے ہیں۔“

چنانچہ سب گھوڑوں سے اتر آئے۔ اتنے میں عبداللہ آ گئے۔ سخت بخار
 ایک ہاتھ محمدؐ کے کندھے پر۔ ایک ہاتھ عیون کے کندھے پر۔ عبداللہ فرماتے ہیں۔
 ”عیون و محمد! مجھے حسین کے پاس لے چلو۔“

چنانچہ عبداللہ حسین کے پاس آئے اور حسین گھوڑے سے اترے اور فرمایا
 ”عبداللہ! آپ نے بڑی تکلیف فرمائی۔ میں تو آپ سے مل کے آیا تھا۔ پھر
 آپ نے کیوں زحمت فرمائی؟“

”حسین! جی چاہا ایک بار اور تجھے جی بھر کے دیکھ لوں۔ حسین! تو“

جبار ہے۔ اب تجھے کہاں تلاش کروں گا؟

عبداللہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ گلے ملے۔ بڑی دیر تک ملے رہے۔ ایک
 بعد عبداللہ نے اپنیوں بیٹیوں سے کہا۔

”عون و محمد! مجھے اُس ناتنے کے قریب لے چلو جس ناتنے پہ تمہاری

آناں سوار ہے“

عبداللہ پہنچے چوہ محل سے سر لگا کے کھڑے ہو گئے اور کہتے ہیں
”علیٰ کی بیٹی! جا رہی ہو؟“

زینب نے محل سے آواز دی ”یا بن العم“ اے میرے چچا کے بیٹے!
تو شوہر ہے۔ میں تیری محکومہ ہوں۔ اگر حکم دے تو اتر آؤں مگر یہ سُن لے
کہ ادھر تو نے اُترنے کا حکم دیا ادھر میری رُوح نکل جائے گی۔ میں زندہ نہیں
رہوں گی! عبداللہ نے جواب دیا ”نہیں زینب! میں تمہیں روکنے نہیں آیا۔
ضرور جاؤ۔ بلکہ میں تو یہ کہنے آیا ہوں زینب!“

”حیئن جیسی قیمتی شے تمہارے ساتھ ہے — اور پردیس کا
معاملہ ہے۔ ممکن ہے راستے میں کوئی مصیبت پڑ جائے اور حیئن
کی جان بچانے کے لئے صدقہ دینا پڑے۔ چونکہ تم خالی ہاتھ جا رہی
ہو لہذا تمہارے لئے صدقے کا انتظام کر کے لایا ہوں۔“

یہ کہہ عبداللہ نے عون کا ہاتھ زینب کے ہاتھ میں دے دیا۔
”زینب! اسے اپنی طرف سے حیئن پر صدقہ کر دینا۔ اس کے بعد
محمد کا ہاتھ بھی زینب کے ہاتھ میں دے دیا اور فرمایا۔
”زینب! اسے میری طرف سے حیئن پر صدقہ کر دینا۔“

حضور والا! زینب نے دونوں بچوں کو سر سے پیرنگ دیکھا
ساتھ بٹھالیا۔ اگر زینب سفر میں ہے تو یہ بچے بھی ساتھ ہیں۔ زینب نے
کر بلا تک اپنے بچوں کو عون و محمد کہہ کے نہیں پکارا۔ بلکہ جب پکارا یہی کہہ
کے پکارا ”میرے حیئن کے صدقے کو بلاؤ“
سامعین کرام!

شب عاشور سید الشہداء عبادتِ خداوندی میں مشغول ہیں۔ فضہؓ

تشریف لائی عرض کی۔ ”مولا! بہن نے بلایا ہے۔“
 امّ اسی طرح اٹھ کے بیت الشرف میں تشریف لائے۔ صحن میں
 زینب نے استقبال کیا اور حسین نے دیکھا کہ زینب نے عون و محمد
 کو جنگی لباس پہنا رکھا ہے۔ مگر میں تلواریں باندھ رکھی ہیں۔ سر پہ
 عمامے باندھ رکھے ہیں۔ اور زینب نے جنگی لباس کے اوپر بچوں
 کو کفن پہنا رکھا ہے۔

حسین نے کہا ”بہن! فرمائیے۔ میں آگیا ہوں۔ کیا حکم ہے؟“
 حسین! بہن بھائی کی باتیں تو ہوتی رہیں گی۔ مگر آج میں نے
 تجھے بحیثیت بہن کے نہیں بلایا۔ آج جعفر طیار کی بھو نے حیدر کرار
 کے بیٹے کو بلایا ہے۔“
 حسین فرماتے ہیں ”کہو زینب! کیا بات ہے؟“

بی بی فرماتی ہے ”حسین!
 ”جعفر طیار کی بھو حیدر کرار کے بیٹے سے جعفر کے پوتوں کی شہادت
 کی بھیک مانگ رہی ہے۔ لہذا زینب کی خوشی یہ ہے کہ کل
 سب سے پہلے ان کی لاشیں آئیں۔ چونکہ بچے ہیں اس لئے مجھے
 ڈر ہے کہ کہیں ڈرنے جاویں۔“

امّ نے دونوں شہزادوں کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔ گویا منظور کر لیا
 یوم عاشور جب ہر شہید کی لاش آتی رہی تو زینب پوچھتی ”عون و محمد
 ابھی زندہ ہیں؟“

تھوڑی دیر بعد شہزادے گھر میں آئے۔ ماں کو سلام کیا۔
 ”اماں! سلام“

بی بی نے پوچھا ”بیٹا! ابھی تم زندہ ہو؟“
 بچوں نے کہا ”اماں! ہم مرنے کی اجازت لینے آئے ہیں۔“

زینبؓ نے فرمایا ”شاباش۔ جادو میرے بچوں۔ خدا حافظ۔“
 زینبؓ نے دروازے تک شہزادوں کو رخصت کیا۔ اور ایک فقرہ کہا۔
 جس نے حشیں جیسے صابرا بن کوڑ لادیا۔
 ”بچو! ایسا جہاد کرنا کہ دشمن کی فوج یہ کہہ اُٹھے کہ یہ جعفر طیار کے پوتے ہیں“
 جادو تمہیں جنت مبارک ہو۔

بہر نزع شہزادے میدان جنگ میں تشریف لائے۔ جعفر طیار کے پوتوں
 نے جہاد شروع کر دیا۔ دس بیس منٹ کے بعد باجے بجنے لگے۔ لاش آنے
 لگیں۔ عورتوں نے گھر میں رونا شروع کر دیا۔ ادھر زینبؓ دروازے پہ کھڑی
 ہیں اور فرماتی ہیں۔

جے بیو! ”رو نہیں بلکہ خوشی مناؤ۔ کیونکہ میرے بچوں کی برات آرہی ہے“
 یہاں ابیس مرحوم کا ایک شعر سناتا ہوں کہ زینبؓ نے ان بیویوں کو کہا
 ہا جے والوں کی صد اذیت فئات آتی ہے
 کیسے لائے، میرے بچوں کی برات آتی ہے

بہر نزع تھوڑی دیر بعد امّ لائے لے آئے۔ جیسے کے صحن میں بٹا
 دیئے۔ بڑے بچے کا دم نکل چکا تھا۔ چھوٹے میں دم باقی تھا۔
 امّ نے فرمایا ”زینب! ایک دفعہ انہیں سینے سے لگالے“

صاحبان:

ماں کی ماما بھی تھی اور امّ کا فرمان بھی تھا۔ زینبؓ نے چھوٹے شہزادے
 کو جو سینے سے لگایا تو بچے کے لب ہلے۔ گویا ماں سے یہ کہہ رہا تھا۔
 ”اماں! اب تو خوش ہے نا“

بزرگانِ من!

گیارہ محرم کو اہلبیتؑ رسول قید ہو کر کربلا سے شام کے لئے روانہ ہوئے
 ہیں اور راستے میں شہیدوں پر الوداعی ماتم کیا۔ جناب زینبؓ سیدالشہداء،

کے لاشہ پر پہنچی۔ اصغر کی ماں اصغر کی تہمت لاش کر رہی ہے۔ اکبر کی ماں اکبر کی لاش پر بیٹھی ہے قاسم کی ماں قاسم کی لاش پر لڑھکناں ہے۔ غرض ہر خاتون اپنے اپنے وارث کے لاشے پر الوداعی ماتم کر رہی ہے۔

اُس وقت یزید کی فوج کے سپاہیوں نے دیکھا کہ دو لاشیں ایک طرف پڑی ہیں جس پہ کوئی خاتون نہیں رو رہی۔ تو ان سپاہیوں نے امام زین العابدین سے کہا۔

”قبلہ! ہم ہیں تو دشمن مگر آخرا انسان ہیں۔ ہمارا دل بھرا آیا۔ کیا ان دونوں بچوں کا کوئی وارث نہیں ہے۔ کیا انہیں رونے والا کوئی نہیں ہے؟“

امام اُٹھے۔ دونوں بھائیوں کو گود میں اٹھالیا۔ اب جو امام زین العابدین نے عوث بن محمد کے لاشوں کو گود میں اٹھایا تو زینب نے وہیں سے آواز دی

”بیٹا زین العابدین! یہ تم کیا کر رہے ہو؟ — کیا تمہیں پتہ نہیں کہ صدقہ ہم پہ حرام ہے۔ بیٹا! یہ میں نے تیرے باپ پہ صدقہ کر دیئے ہیں۔ لہذا انہیں ہاتھ مت لگاؤ۔“

بسے بھائیو! — آج ہم سب بوڑھے۔ جوان بچے مل کر ان بچوں کو رو رہے ہیں۔ جن بچوں کی ماں نہ روتی۔ اور خواتین نے! — تم بھی ایک دفعہ کہو

”ہائے زینب“

بی بی زینب! تیرے بچوں کو تیری کنیزیں رو رہی ہیں۔ ہماری بچیاں روئیں گی۔ ہمارے بچے روئیں گے۔ اور ہم قیامت تک روتی رہیں گی۔

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ

فَرِّتْ رَبَّ الْكَعْبَةِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

خداوند عالم کی حمد ثنا کے بعد حضرات محمد و آل محمد پر درود سلام

حضرات محترم!

میرے ایک دوست نے مجھ سے یہ فرمائش کی ہے کہ آج میں آپ کے سامنے احوال پر گفتگو کروں۔ جہاں تک اعمال پر عالمانہ بحث کا تعلق ہے۔ وہ آپ کسی مفتی سے پوچھیں اور چونکہ میں "مفتی" نہیں ہوں بلکہ "قیمتی" ہوں۔ لہذا جہاں تک مجھ سے ممکن ہو سکا مختصر لفظوں میں آپ کی خواہش کو مد نظر رکھتے ہوئے آپ کی فرمائش بجالاتا ہوں۔

سامعین کرام!

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ نمازیں پڑھنا، روزے رکھنا اور داڑھی زیر رکھنا گویا اس قسم کی چیزوں کا نام اعمال رکھا گیا ہے۔ حالانکہ صرف نماز روزہ وغیرہ ہی اعمال نہیں ہے۔ میرا یہ مقصد نہیں کہ یہ اعمال نہیں ہیں اعمال تو ہیں۔ مگر ان اعمال کا تعلق ہے دلی لگاؤ سے جسے دوسرے لفظوں میں عشق کہتے ہیں۔ لہذا جب تک "عشق" طبیعت کے اندر نہ ہو تب تک نماز ایک "کھوکھلی" شے ہے اور روزہ ایک "فاقہ" کی چیز ہے۔ اور داڑھی کا بال و بال ہے۔ جب تک اس کے ساتھ "شع" عشق" روشن نہ ہو۔ گویا عشق ہے اصل شے۔ اور دلی لگاؤ ہے اصل چیز۔ جس طرح اگر کسی شخص کو پتھر سے عشق ہو جائے تو وہ حلال مشکلات

بن جاتا ہے، ”مُتَجَابُ الدَّعَوَاتِ“ ہو جاتا ہے۔ جو اس پتھر کی تاثیر نہیں بلکہ عشق کے اثرات ہیں۔

اور یہ عشق ایسا نشہ ہے کہ اسے دُنیا کی کوئی طاقت سمجھ سکتی ہی نہیں۔ اگر دُنیا بھگے واعظ، لیکچرار اور مصنف کتابوں کی کتابیں لکھ دیں اور ساری عمر تقریر کرتے رہیں یہ سمجھانے کے لئے کہ عشق کیا چیز ہے، وہ سمجھای نہیں سکتے۔ گو یا عشق کی دیوانگی جس پہ گزرتی ہے وہی جانتا ہے کہ یہ کیا شے ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور شخص سمجھ سکتا ہی نہیں کہ عشق کیا ہے۔

بزرگانِ من!

ہیں تو کہانیاں نگران کے اندر بڑی باتیں پوشیدہ ہیں۔ آج سے دو ہزار سال قبل بکر مرچیت کے زمانہ کی بات ہے کہ یوپی کے شہر بنارس میں ایک پیڑتِ تلسی داس گزرا ہے جو ایک برہمن تھا۔ اس نے ”رامائن“ نظم کی ہے۔ یہ ایک بڑا آوارہ مزاج لڑکا تھا۔ آوارگی کے عالم میں کسی مکان کی چھت پر چڑھنا چاہتا ہے۔ چنانچہ اس نے کند ڈال کر مکان پر چڑھنا شروع کر دیا۔ اتفاق سے اس کے ہاتھ سے کند چھوٹ گئی اور وہ بے خبری کے عالم میں ہی ایک کالے سانپ کو پکڑ کر چڑھنے لگا۔ نہ تو سانپ ہی گرا اور نہ ہی اسے محسوس ہوا کہ یہ سانپ ہے۔ آخر جب وہ چھت تک پہنچ گیا تو تب اسے معلوم ہوا کہ کند کی بجائے اس کے ہاتھ میں سانپ ہے۔

تلسی داس خود اس بات کا راوی ہے کہ جب میں نے سانپ دیکھا بس اُسی وقت سے میرے ذہن میں خیال آیا۔ کہ اگر دلی لگاؤ کسی سے ہو جائے تو کیا مجال کہ سناںپ کوئی نقصان پہنچا دے۔ گویا دُنیا کا فانی اور ناچیز عشق موزی کا منہ بند کر سکتا ہے۔ ستانے والے کو زد کر سکتا ہے، جانوروں کی فطرت بدل سکتا ہے اور ڈنک مارنے والے

زہریلے کو ساقھی بنا سکتا ہے۔ ”اگر میں بھی کسی حقیقت سے عشق کروں تو اللہ جانے کیا ہو گا۔“ بس وہیں سے یہ تلسی داس تاریخ کی ایک مشہور و معروف شخصیت بن گیا جس کے فلسفہء عشق نے اسے مشہور کر دیا جو اسے کسی ذات سے ہو گیا تھا۔

بہر نوع اصل شے جو ہے جسے عمل، قول، عقل کی روح کہتے ہیں وہ ہے دلمے لگاؤ۔ بے دلی سے کہی ہوئی بات کا وزن اور ہے اور دل سے نکلی ہوئی بات کی طاقت اور ہے۔ گویا جو زبان سے نکلتی ہے وہ صرف کان تک پہنچتی ہے اور جو دل سے نکلتی ہے۔ وہ دل تک پہنچتی ہے۔ مثلاً نماز پڑھنا ایک فعل ہے سر جھکایا اور خاک پر رکھ دیا۔ اگر اس نماز میں عشق ہے تو ہماری نماز کے ایک سجدے کا بار زمین اٹھانے کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ عشق کا سجدہ ہو تو زلزلے آ جاتے ہیں، آندھیاں آ جاتی ہیں اور اگر بے دلی کی باتیں ہوں تو چاہے صبح سے شام تک سجدہ کرتے رہیں۔ ”کنفک الغراب“ جس طرح کو آ زمین پہ ٹھونگیں مارتا ہے، اس طرح کے سجدے تو دنیا بہت کرتی پھرتی ہے۔ اصل عمل وہ ہے جو دل سے ہوتا ہے۔

سامعین !

اسلامی نقطہ نظر سے عمل ”جس چیز کا نام ہے وہ ہے عبادتِ خدا“ عبادت نہ کسی رسول کی ہو سکتی ہے، نہ کسی امام کی اور نہ ہی کسی اور کی عبادت ہوتی ہے صرف اللہ کی۔ اللہ کے علاوہ اور کوئی معبود ہو سکتا ہی نہیں۔

سامعین ! ————— ”معبود ہے صرف اللہ۔ عبادت ہے

صرف اللہ کی ————— گویا عبادت کا لفظ جہاں کہیں

بھی آئے اس سے مقصود ہو گا ”اللہ“۔

اب دنیا کے کسی مولوی سے مت پوچھو کہ عبادت کس کی

ہوتی ہے ————— معبود کون ہے ؟

بس بھائیو ! ————— یہ بات اگر سے اور یقیناً ہے کہ عبادت ہے

صرف اللہ کی ————— تو آج ہم حضرت ابو بکر صدیق کو کہاں سے تلاش کر کے لائیٹ اور ان سے پوچھیں۔

اے صحابی رسول! — جب عبادت کا لفظ مخصوص ہے صرف اللہ کے لئے۔ تو آپ نے دنیا کو کیا فرمایا کہ
”میں نے اپنے کانوں سے رسول اللہ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے“
کہ ”علیؑ کے چہرے کا دیکھنا عبادت ہے“

سامعین!

رسول ”نثار ہے“ کہہ دیتے تو بڑی خوشی کی بات تھی مگر رسول نے لفظ ”عبادت“ کہا ہے۔ اور لفظ ”عبادت“ مخصوص ہے صرف اللہ کے لئے۔ ابے بتاؤ! — اگر نصیری بگڑ جائیں تو آپ کو بگڑیں گے یا نہیں؟ کہ آپ نے کیا کہہ دیا کہ علیؑ کے چہرے کی طرف دیکھنا عبادت ہے۔
 بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ چونکہ ساری عمر ہوگی عمل والوں سے ہم بے عملوں کو یہ محنتیں سننے کہ ہم عبادت نہیں کرتے بلکہ علیؑ علیؑ کرتے ہیں اس لئے ہم جہنم میں جائیں گے۔

سامعین!

جب لوگ یہ کہتے ہیں کہ علیؑ علیؑ کرنے والے جہنم میں جائیں گے تو نہ جانے یہ علیؑ علیؑ کرنے والے بُرا کیوں منا جاتے ہیں۔ حالانکہ ان کا بُرا منانا اس بات کی دلیل ہے کہ انہیں علیؑ سے عشق نہیں ہے۔ ورنہ خدا شاہد ہے کہ اگر علیؑ سے انہیں عشق ہوتا تو یہ علیؑ علیؑ کرنے والے جہنم میں جانے پر کبھی بُرا نہ مناتے۔

میں کہتا ہوں۔ اگر علیؑ علیؑ کرنے سے جہنم ملتا ہے تو میں اور کچھ نہیں چاہیے۔ خُدا احمی قسم! اگر یا علیؑ کہنے سے جہنم ملتا ہے تو کر دُر ہا جنتیں قربان کرتا ہوں۔ مجھے جہنم ہی ملوے۔ گویا یا علیؑ کہنے سے جو کچھ ملتا ہے میں منظور ہے۔ میرا ایمان ہے کہ جب

جہنم میں یا علیؑ کہہ کر چھلانگ لگائی جائے گی تو وہ جہنم فدا
 گلزار ہو جائے گا۔ کیا مجال جہنم کی جو علیؑ کا نام شکر شانہ جائے
 بہر نوح میرا عرض کرنے سے مطلب یہ ہے کہ عبادت ہے صرف اللہ
 کے لئے اگر نمازی کے دل میں یہ آجائے کہ لوگ مجھے نماز پڑھتے دیکھ کر یہ کہیں
 یہ بڑا نیک آدمی ہے تو گویا نماز نماز نہ رہی بلکہ وہ گناہ ہو گیا ہے۔ معلوم ہوا نماز
 ٹی دقت تک عبادت ہے۔ جب تک صرف اللہ کے لئے ہو اور اللہ نے
 رمایا ہے کہ خبردار میری عبادت میں کسی کو شریک نہ کرنا کیونکہ میں وحدہ لا شریک
 ہوں۔

سَامِعِينَ! — وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ" کے معنی یہ ہیں کہ معبود ہونے
 میں اس کا کوئی شریک نہیں۔ در نہ موجود ہونے میں ہم سب اس کے شریک ہیں
 وہ موجود ہے اور ہم موجود ہوتے ہیں اور جب تک ہم زندہ ہیں۔
 ہم اس کے حقیقی ہونے میں بھی شریک ہیں اور حقیقی جتنی کسی میں قدرت ہے
 ہم قادر ہونے میں بھی اس کے شریک ہیں اور جتنا جتنا کسی میں علم ہے۔
 ہم عالم ہونے میں بھی اس کے شریک ہیں — صرف "معبودیت" ایسی
 چیز ہے جس میں اس کا کوئی شریک نہیں۔ وہ ہی "وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ" ہے۔
 لہذا "وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ" کے معنی یہ ہیں کہ معبود ہونے اور مالک
 ہونے میں اس کا کوئی شریک نہیں۔ یہ دو ایسی چیزیں ہیں جو شرک سے متبرا
 ہیں۔ اب اگر نماز ہے خدا کی عبادت تو اس میں کسی کا شریک ہو جانا گویا
 شرک ہو جائے گا۔

دیکھو نا! — اب میں آپ کو نماز کا داعظ کرتا ہوں اگر آپ مجھ پر
 یہ شرط عائد کر دیں۔ کہ نماز میں سوائے خدا کے کوئی نہ آنے پائے ورنہ شرک
 ہو جائے گا۔

تَوْسُو حَضْرَاتِ! میں عرض کرتا ہوں کہ نماز یوں پڑھا کرو سب پہلے
 Presented By: www.jafrilibrary.com

نماز کے لئے کھڑے ہوتے ہی کہا کرو۔ ”اللہ اکبر“

مگر یاد رکھو! — اس کے معنی یہ نہ کرنا کہ ”اللہ سب سے بڑا ہے“
درنہ اس کے معنی یہ ہو جائیں گے کہ ایک طرف ہم نے سب کو رکھا اور ایک طرف
اللہ کو رکھا۔ پھر ہم نے میزان میں مقابلہ کیا تو سب چھوٹے نکلے اور اللہ سب کے
کے مقابلہ میں بڑا ہوا۔ اور جو مقابل میں آکر بڑا ہو وہ اللہ نہیں ہوتا — لہذا
”اللہ اکبر“ کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ”وہ سب سے بڑا ہے“ حالانکہ ہر اُردو دان یہی ترجمہ
کر دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہیں اُردو آتی ہی نہیں۔

اب آپ پوچھیں گے زیدی صاحب! پھر آپ ہی بتائیں کہ ”اللہ اکبر“
کا ترجمہ کیا ہے؟

نہیں کہتا ہوں۔ دیکھو! ”اللہ اکبر“ کا ترجمہ یہ ہے کہ اللہ کے سامنے ہم
کھڑے ہوئے اور اس سے کہا تو اکیلا رحمن والرحیم ہے۔ ساری حمد تیرے ہی لئے
ہے تو سارے عالمین کا رب ہے۔ تو یوم الدین کا مالک ہے۔ تو ہیں صراط مستقیم
پر قائم رکھنا اور صراط ان کی ہوجن پر تیرا نام ہوگا۔

سامعین!

ہم تو صرف اللہ کی نماز پڑھ رہے تھے۔ مگر یہ انعمت علیہم کا خیال کہاں
سے کہاں تک پہنچ گیا۔ کون میں وہ لوگ جن پر اللہ کا انعام ہو گیا۔
پھر سوچا۔ ان کا نام آنے سے یہ شریک نماز ہو گئے۔ کیوں نا ان کا نام ہی
نیچ سے نکال دوں۔ آخر اللہ سے پوچھا۔

”خدا وندا! یہ فقرہ نماز سے نکال دوں؟“

اللہ غصہ سے جواب دیتا ہے۔

”خبردار“

آخر چپ ہو گیا۔ کہ کوئی تو انعمت علیہم ہو گا۔

بہر نوع میں نے الحمد پڑھ لی پھر کہا سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْظِيمِ وَبِحَمْدِهِ

”بندے! تو نے میری حمد کی۔ مجھے عظیم داعی بھی کہا۔ اب
وحدہ لاشد یک بھی کہہ رہا ہے۔ مگر یہ بتا کہ تو نے یہ ساری باتیں
کہاں سے سیکھی ہیں؟“

میں نے عرض کی، "خداوند! — مجھے تو خاک بھی پتہ نہیں تھا۔ یہ باتیں تو تیرے ایک بندے نے مجھے بتائی ہیں جس کا نام محمد ہے جو تیرے عبد بھی ہے اور رسول بھی ہے۔" اَشْهَدُ اَنْ مُحَمَّدًا عَبْدُكَ وَرَسُولُكَ۔

بس بھائیو! غازی پوری ہو گئی نہیں۔

دیکھو سامعین ! — آپ نے کیا کہہ دیا کہ درود باقی رہ گیا —
کیا غضب کر رہے ہو ! مولوی صاحبان ماریں گے۔ وہ تو کہتے ہیں کہ سوائے خدا کے
کسی کا نام لینا بھی بدعت ہے، گناہ ہے۔ _____ مگر
اللہ کہتا ہے " نمازیو ! اے جاؤ اپنی غار۔ مجھے ایسی بے دم درود کی
نماز نہیں چاہیے "

اب نماز بے چاری وہیں کھڑی ہے اور کہتی ہے ۔
نمازیں! "خدا کے لئے مجھے درود کا پاسپورٹ دو۔ تاکہ ملک قبول
میں جا سکوں۔"

آخر میں نے غازی علی محمد و آل محمد کا پاسپورٹ دیا۔ اور ہماری ملک قبول میں جا پہنچی۔

حضور والا! آل محمد پر درود بھیجنے کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ آل محمد

عبادت خدا میں شریک ہو گئے۔ عبادت تو صرف اللہ کی ہوتی ہے۔ مگر عبادت بغیر عشق کے خالی پسیر ہے۔ بے رُوح ہے۔ اس لئے اللہ چاہتا ہے کہ عبادت ہو مگر ساتھ میں عشق بھی شامل ہو۔ چنانچہ ہم اللہ سے کہتے ہیں۔

”خدا وندا! ہم تجھ سے عشق کر لیں؟“

اللہ کہتا ہے ”پاگل نہ ہو۔ تم میرے عاشق نہیں بن سکتے“

پھر ہم نے عرض کی۔

”خدا وندا — تجھ سے عشق ہو نہیں سکتا۔؟ اور تو کہتا ہے کہ مجھ سے عشق کرو۔ پھر تو ہی بتا تجھ سے کس طرح عشق کیا جائے؟“

اللہ نے کہا۔ ”چونکہ براہ راست مجھ سے عشق نہیں ہو سکتا۔ لہذا میں ایسا انتظام نہ کروں کہ ایسے اپنے بناؤں جنہیں عبادت میں شریک کر لوں۔ عشق ان سے ہو اور عبادت میری ہو تاکہ عبادت میں رُوح عشق آجائے اور عبادت، عبادت ہو جائے“

سامعین!

اگر اللہ کے ان اپنوں کو بیچ سے نکال دیں تو عبادت کھوکھلی رہ جائیگی اور نماز گھبرا کے ادھر ادھر دیکھے گی کہ اب میں کہاں جاؤں۔

لہذا ان ”اپنوں“ کے عشق کے ساتھ پڑھی ہوئی نماز اتنی قیمتی اور روزنی ہوتی ہے کہ نمازی تین مرتبہ کہتا ہے۔ ”اللہ اکبر“ گویا رُوح عبادت خدا عشق آل محمد ہے۔ جو نہ دولت خرچ کرنے سے آتا ہے نہ کتابیں پڑھنے سے آتا ہے اور نہ ہی مولوی بننے سے آتا ہے۔

”ذَا لِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاءُ اللّٰهُ“ یہ اللہ کا فضل ہے کہ وہ جس بندے کو چاہے یہ نعمت عطا فرما دے۔

اور یاد رکھو اے عشق آل محمد کی دولت رکھنے والے مہرز انسانے! — عشق آل محمد نہایت قیمتی جوہر ہے جو تجھے اللہ نے

دیا ہے۔ لہذا اسے چہروں سے بچائے رکھنا۔ چونکہ جو ہر بڑا قیمتی ہے اسلئے
ڈاکو بھی بڑے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی ڈاکو دوستی کے پردے میں تجھے
نماز روزے کی طرف لگا کے عشق آل محمد کی دولت لوٹ کر لے جائے۔
لہذا اسکی بڑی حفاظت کرنا۔ نماز بھی پڑھنا۔ کیونکہ نماز سپرکے ہے مگر رُوح
اس کی عشق آل محمد ہے۔

سَامَعِین!

مولوی صاحبان کا یہ متفقہ فیصلہ ہے (چاہے سُنی ہو یا شیعہ) کہ جو
نماز قبول نہیں ہوتی وہ نمازی کے منہ پر مار دی جاتی ہے۔
اے بتاؤ! — نماز کوئی اینٹ ہے یا پتھر ہے جو
اُٹھا کے منہ پر مار دی جاتی ہے؟

اس کا مکمل جواب تو آپ خود ہی سوچیں۔ مگر میں تو ہر نماز پڑھنے
والے کا منہ تکتا نہ ہتا ہوں۔ اگر نماز کے بعد اس کا منہ ٹھیک رہا
تو میں سمجھتا ہوں کہ نماز قبول ہو گئی اور جہاں ذرا منہ پھرا فوراً سمجھ گیا
کہ نماز منہ پر مار دی گئی ہے۔

سَامَعِین!

دیکھو نا — کربلا میں تقریباً ستوا دی یہ شور مچا رہا تھا کہ حسین کو

جلدی قتل کر دو تاکہ نماز عصر قضا نہ ہو جائے؟

گویا نماز کا یہ زور ہو رہا تھا۔ یہ ان ہی لوگوں کی سکھائی ہوئی بات ہے۔
کہ بس نماز پر ہی زور دیتے جاؤ چاہے فرزند رسول قتل ہو جائے۔

بناؤ — یہ کوئی نماز ہے؟ مغرب کا وقت ہے خیمے جل

رہے ہیں۔ بچوں کے بیٹھنے کی جگہ نہیں اور زینب کے سر پر چادر
نہیں اور سلمان آل محمد کو قتل کر کے اور ان کے خیمے جلا کر منہ

کی نماز ادا کر رہے ہیں۔ ایمان سے بناؤ، یہ کوئی نماز ہے؟

بہر نوع عشق آل محمد کے بغیر نماز ہو ہی نہیں سکتی۔ نماز سپیکر ہے اور عشق آل محمد اس کی رُوح ہے اور یہ عشق آل محمد نہ عقیدت سے آتا ہے نہ پڑھنے سے آتا ہے اور نہ ہی خرچ کرنے سے آتا ہے یہ وہ ذالک **فَضْلُ اللَّهِ**، اللہ کا فضل ہے جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے اور یہ اللہ سے لو لگانے سے آتا ہے۔ اسی چیز کے لئے اللہ کہتا ہے "أَعِدُّوْنِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ" تم مجھ سے دُعا کرو کہ یا اللہ ہمیں عشق آل محمد دے دے دے۔ میں اسے قبول کروں گا۔ ورنہ رزق کا خدا نے خود وعدہ کیا ہے۔ لہذا رزق کے لئے دُعا کرنے کی ضرورت نہیں۔ زندگی جتنی ہے اتنی ہی ہوگی۔ اس کے لئے مانگنا مانگنا بے کار ہے جن دعاؤں کے لئے قرآن میں تاکید ہے کہ تم مجھ سے مانگو میں قبول کروں گا: وہ دُعا ہی یہ کرو کہ "خدا ہمیں عشق آل محمد عطا فرمائے تاکہ ہماری نماز سچی ہو جائے۔ ہمارا روزہ سچا ہو جائے۔ ہمارا ہر عمل سچا ہو جائے۔ بات سے بات پیدا ہوتی ہے حضور! یہ عشق کی بات ہے کہ نوتے سالہ سعید سب کے نصیبے کا رہنے والا کر بلا میں حسین کی فوج میں موجود تھا۔ یوم عاشور یہی سعید امام سے کہتا ہے۔

"مولا! ظہر کا وقت ہے"

مولا نے فرمایا "سعید! کیا چاہتے ہو؟"
 مولا! — "میں چاہتا ہوں کہ زندگی کی یہ آخری نماز آپ کی جماعت کے ساتھ ادا کروں۔"

بتاؤ مسلمانو!
 حسین کے پیچھے نماز پڑھنے کی تمنا کرنا دنیا کی بہترین تمنا ہے یا نہیں؟
 اب جو سعید نے یہ کہا تو امام نے جواب میں فرمایا:
 "سعید! تو نے اس وقت اللہ کی نماز یاد کی۔ اللہ تمہیں اس کا اجر دے گا۔"

دُریائے فرات کے کنارے نمازیوں نے تیتیم کیا۔ نماز شروع ہو گئی اور سعید کے دل کی گہرائی سے جو تمنا نکلی تھی وہ پوری ہو رہی ہے۔ سعید اٹام کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ اقامت کہی۔ اچانک تیرا نماز شروع ہو گئے۔ اب سعید نے جو دیکھا کہ تیرا اٹام کی طرف آ رہے ہیں تو اس نے نماز کی نیت باندھنے کے بعد نیت توڑ کے صفِ چھوڑ دی اور اٹام کے سامنے آ کھڑا ہوا اور بولا:-

”فرزندِ رسول! آپ نماز پڑھیں۔ میں تیروں کو روکتا ہوں۔“ چنانچہ باقی آدمی اٹام کی جماعت میں نماز پڑھ رہے ہیں اور جس کی یہ تمنا تھی کہ آخری نماز اٹام کے ساتھ پڑھوں وہ غریب کھڑا ہوا تیر کو رہا ہے۔ جو تیر بھی اٹام کی طرف آتا ہے۔ سعید اپنی بڈھی پسلیوں پر روک رہا ہے۔ اور تیر بڈھی پسلیوں میں گھس گئے۔ ادھر اٹام نے سلام پھیرا۔ ادھر سعید اٹام کی گود میں جاگرا۔ بڈھا آدمی چہرے پر موت کا پسینہ آ گیا۔ اور گرتے ہی اٹام سے پوچھتا ہے ”هَلْ وَفَيْتُ يَا بِنَ رَسُولِ اللَّهِ“ ”کیوں فرزندِ رسول! آپ مجھ سے خوش ہیں۔ کیا میری نماز ہو گئی؟“

اٹام جواب میں فرماتے ہیں ”سَعِيدُ اَنْتَ اُمَامِحِي فِي الْجَنَّةِ“ میں تجھ سے وعدہ کرتا ہوں کہ حبیب میں جنت میں جاؤں گا تو تو میرے آگے آگے چلے گا۔“

سعید نے عرض کی ”مَولَا! میرے تیر نہ نکالنا میں تیرے نانا کے پاس ان تیروں کے ساتھ جانا چاہتا ہوں۔“ اس کے بعد سعید کہتا ہے۔

”مَولَا! کوئی میرا دہنا بازو دبا رہا ہے؟“ اٹام نے فرمایا ”سَعِيدُ! سلام کرو۔ یہ میرے نانا رسول اللہ ہیں۔“

”قبلہ! کوئی میرے بائیں طرف بھی ہے؟“

”سعیّد! یہ مرے بابا حنیف رکڑا آئے ہیں“

”مولّا! کوئی میرا سردار ہے؟“

”سعیّد! یہ میرے بھائی حسن ہیں“

آخر میں سعیّد پوچھتا ہے۔

”مولّا! کوئی میرے پاؤں کی طرف بھی ہے؟“

امام فرماتے ہیں۔

”سعیّد! پاؤں سمیٹ لو۔ یہ میری اماں فاطمہ ہیں“

اس منظر کو دیکھ کر مولانا روم اپنی مثنوی میں کہتا ہے۔

نماز ظاہری ذکر سجدہ است

نماز عاشقان ترک وجود است

یہ ظاہر میں پڑھی ہوئی نماز ذکر سجدہ دور کو رخ ہے اور عشق کی

نماز وہ ہے کہ اپنے آپ کو فنا کر دیا۔

یہ ہے وہ عمل جسے عبادت کہتے ہیں اور عبادت اس وقت تک

کھوکھی ہے جب تک اس میں ”روح عشق آل محمد“ شامل نہیں ہوگا

اور روح عشق آل محمد بے کار ہے جب تک اس کے لئے ”عمل“ کا پیکر

ہو۔ گویا روح کے لئے جسم اتنا ضروری ہے جتنا جسم کے لئے روح ضروری

حضور والا!

اگر ہمارا پید اہونے کا مقصد عبادت ہے۔ تو اس مقصد عبادت کو

اس ظاہری دنیا میں سب سے زیادہ کس شخص نے پورا کیا ہے؟

حضور امام حسن فرماتے ہیں ”جہاں تک عبادت کا تعلق ہے

میں اپنے باپ علی کے مقابلہ میں ایک ہزار کی نسبت سے ہوں۔

گویا علی اتنا بڑا عابد ہے۔

سَامِعِينَ!

یہ تو آپ نے سن لیا کہ مسلمانوں میں پہلی نماز جس نے پڑھی وہ علی ابن ابی طالب ہیں۔۔۔۔۔ لیجئے ایک قصہ بھی سماعت فرمائیے گا۔

ایران کا ایک تاجر بغرض تجارت مکہ میں ہر سال حج کے موقع پر اپنی دکان لگایا کرتا تھا۔ وہ رادھی کہ ایک سال جو میں گیا تو میرے دوست حضرت عباس (رسول خدا کے چچا) میری دکان پر بیٹھے تھے۔ میں نے دیکھا کہ اچانک ایک شخص آیا اور ایک طرف کو منہ کر کے کھڑا ہو گیا۔ پھر جھجک گیا۔ پھر سجدے میں گیا۔ پھر کھڑا ہو گیا اور ایک معصوم چھوٹا سا بچہ اس کے ساتھ یہ حرکت کر رہا تھا۔ میں نے عباس سے پوچھا ”یہ جوان کون ہے اور یہ بچہ کون ہے؟“ عباس نے جواب دیا ”یہ جوان میرا بھتیجا محمد ہے“

میں نے پوچھا یہ کیا کہہ رہا ہے؟“

عباس بولے ”یہ کہتا ہے کہ میں رسول ہوں اور یہ مجھ خدا اپنی نماز پڑھ رہا ہے۔“

”یہ لڑکا کون ہے۔“

”یہ میرا دوسرا بھتیجا علی ہے۔“

ایرانی کہتا ہے کہ میں سوچ میں پڑ گیا کہ ایک معصوم جس کی اطاعت کر رہا ہے وہ یقیناً سچا ہوگا۔ ورنہ بچے کو کیا تھا۔ اس کے کھیلنے کے دن ہیں اسے کیا مصیبت تھی کہ یہ بھی ایسا ہی کرتا جیسا یہ جوان کر رہا ہے۔ یہ ضرور کوئی نیا ہوگا۔

حضور والا! ————— علیؑ کی پہلی نماز آپ نے دیکھ لی۔ آئیے

اب ذرا علیؑ کی وہ نماز دیکھیں جو علیؑ نے بستر پر سو کر پڑھی۔ انیس سال کا جوان۔ رات بھر خوب سویا اور کائنات کا عظیم نمازی کہلا یا جس پر اللہ کو یہ آیت نازل کرنا پڑ گئی کہ ”آج تیرا سونا بھی میری مرضی کا مالک ہو گیا۔“

ہم نے صبح عبا کے علی سے پوچھا۔

”یا علی! کہو کیا حال ہے۔ آپ کی نماز کا؟“

اب تو آپ بڑے خوش ہوں گے کہ اللہ نے اپنی مرضیاں دے دیں۔
 علی جواب میں فرماتے ہیں ”میں اللہ کا ذلیل بندہ ہوں۔ میں نے کیا
 عبادت کو نہ ہے۔ اگر خدا قبول کرے تو یہ اسکی مہربانی ہے۔“ علی جیسا انسان
 آج یہ کہہ رہا ہے کہ ”عبدُکَ حقاً عبادُکَ“ ہم تیری عبادت نہ کر کے
 جتنا عبادت کرنے کا حق ہے۔ پتہ چلا کہ اس انسان کے دل میں عبادت
 کا اتنا بڑا تصور ہے۔ گویا اس شخص کے ذہن میں عبادت کی آخری منزل کا
 کوئی اتنا بڑا تصور ہے کہ اُس منزل کے تصور کو جب یہ دیکھتا ہے تو اپنے مرضیوں
 کے مالک ہونے کو یہ اس کے مقابلہ میں کوئی شے نہیں سمجھتا۔

بزرگانِ من!

اب علی کی ایک اور نماز دیکھئے۔ دورانِ جنگ پاؤں میں گھٹنہ کے قریب
 کی ہڈی میں تیر چھب گیا۔ تیر کا اگلا حصہ ہڈی میں ٹوٹ کر رہ گیا۔ بڑی تکلیف
 ہے۔ چلا نہیں جاتا۔ نہ ہی بیٹھا جاتا ہے۔ اگر جراح اسے نکالنا چاہے تو
 چھوٹے نہ دے۔ آخر رسول نے فرمایا

”ٹھہر جاؤ۔ نماز کا وقت آنے دو۔ پھر تیر نکال لینا۔“ چنانچہ یہی ہوا۔
 علی نماز کے لئے مصلّا پر کھڑا ہوا۔ اور کہا ”اللہ اکبر“۔ سجدہ میں گیا۔
 جراح نے چیرا دے دیا۔ اور تیر نکال لیا۔ اور جب علی نے نماز ختم کر لی تب
 پتہ چلا کہ کیا ہوا۔

سامعین!

بات تو تیر کی تھی مگر تیر کی طرح سیدھی ہمارے دلوں میں جا اُتری اور ہم نے
 جان لیا کہ علی وہ نمازی ہے کہ نماز میں چاہے پاؤں سے تیر کھینچ لیا جائے
 اسے پتہ ہی نہیں چلتا۔ مگر۔۔۔۔۔ کچھ عرصہ بعد ہم دیکھتے کیا ہیں کہ وہی

علیؑ ہیں اور وہی ظہر کی نماز ہے اور مسجد نبی کے دروازے پر ایک سائل کھڑا ہو کے کہتا ہے:-

”مسجد والو! اللہ کے واسطے مجھے کچھ دو“

کسی نے کچھ نہ دیا۔ کیونکہ جو زکوٰۃ دینے والا تھا وہ سن ہی نہیں رہا تھا۔ آخر اس نے تنگ آ کے کہا:-

”یا اللہ! تیرے رسول کی مسجد سے خالی ہاتھ جا رہا ہوں“

سامعین!

سائل نے جب تک نمازیوں سے مانگا۔ مانگتا رہا۔ اور جب اس نے اللہ سے مانگا تو جو اللہ تنگ پہنچا ہوا تھا اس نے سن لی۔ چنانچہ علیؑ نے حالت بکوع میں سائل کو زکوٰۃ دے دی۔ ہم ادھر حیران کھڑے تنگ رہے ہیں۔

”یا علیؑ! اس دن تو اتنی محویت کہ پاؤں سے تیر نکال لیا گیا اور پتہ نہ چلا یا آج کے دن اتنی خبر ہے کہ سائل کو زکوٰۃ دے دی“

پھر حال اتنا بڑا نمازی، اتنی محویت سے نماز پڑھنے والا کہ پاؤں میں چُجھے ہوئے تیر کھچ جائیں مگر پتہ نہ چلے۔ یہ ہے نماز کی آخری منزل مگر علیؑ کیا فرماتے ہیں کہ میں کہاں اور نماز کہاں؟ اللہ جانے نمازی کے ذہن میں نماز کا تصور کیا ہے۔ اتنی اچھی نماز کو کہتا ہے کہ کوئی بات نہیں۔

ادھر قرآن علیؑ کی عبادت کی تشریح فرماتا ہے کہ اس کی ”ایک ضرب ثقلین“ کی عبادت سے افضل ہے۔ اب تو علیؑ بھی بہت اگڑے ہوں گے کہ میری لگاؤ ہوئی ایک ضرب ثقلین کی عبادت سے بڑھ گئی ہے۔ اور جب ”ثقلین“ کا لفظ رسولؐ نے بولا ہو گا تو سمٹ سمٹ کے ساری کائنات دائرہ ثقلین میں آگئی ہوگی۔ خدا جانے عرش اور اس کے اوپر بیٹھ کر اللہ کی عبادت کرنے والے ملک ثقلین کے دامن میں شامل ہو گئے۔ ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء ثقلین کے ایک کونے میں بسے کھڑے ہیں۔ ابراہیمؑ اپنی خلعت لئے کھڑے ہیں۔ موسیٰؑ اپنی ہیت

لئے کھڑے ہیں اور عیسیٰ اپنی حیاتِ جاوداں میں پسٹی ہوئی عبادت
لئے کھڑے ہیں۔ گویا ساری کائنات اپنی اپنی عبادتیں لئے ہوئے کھڑی ہے
اور تھر تھر کانپ رہی ہے۔ اور ضربِ علیؑ ان سب پر حاوی ہو چکی ہے۔

ہم کہتے ہیں ”یا علیؑ!“ — مبارک ہو اتنی بڑی عبادت ہے۔
علیؑ مسکراتے ہیں اور فرماتے ہیں۔ ”خاکِ مبارک۔ کچھ بھی نہیں ہوا میں نے
کچھ بھی نہیں کیا۔“

ہم حیران ہیں کہ اللہ جانے یہ بندہ چاہتا کیا ہے۔ آخر یہ کہاں جا کے کہے
کہ یہ عبادت ہے۔

سامعین!

یہ تو رسولؐ کی زندگی کی باتیں تھیں۔ اب رسولؐ کے بعد علیؑ آگیا۔ اب تو علیؑ
کو دنیا کے کاموں سے بھی فرصت مل گئی۔ کیونکہ دنیا کے دھندے اوروں
نے سنبھال رکھے ہیں۔ اب گھر ہے اور عبادت ہے۔ ۲۶ سال اسی طرح
گزرے۔ اگر چار سال کے لئے شہنشاہی آ بھی گئی تو ساری عمر کی پڑی ہوئی
عبادت کی عادت کی وجہ سے شہنشاہیت بھی عبادت میں گزر گئی یہاں تک
کہ شخصی جنگ کا وقت آگیا۔

سامعین!

شخصی جنگ، جہادِ اسلام کا ایک جزوِ اعظم ہے۔ اسلام کا منشا
یہ ہے کہ سربراہِ حکومت فیلڈ مارشل ہو جو میدانِ جنگ میں بھی
آئے۔ یہ نہیں کہ مسجدوں میں ہی بیٹھا خوش خبریاں سناتا رہے۔
یا درکھو! — کسی فیلڈ مارشل کا صدر ہونا اسمیں
بڑائیاں بھی ہوں گی کچھ اچھائیاں بھی ہوں گی۔ سب سے پہلی اچھائی
تو یہ ہوتی ہے کہ فیلڈ مارشل بن رہا ہے۔ وہ سکرینگ کا
عادی ہوتا ہے۔ اور پبلک کے بنائے ہوؤں کا عیب نکالتا ہے۔

اب اسے لاکھ سمجھاؤ کہ انہیں عوام نے بنایا تھا۔ وہ دوڑے
 بنے تھے۔ اب ان کی حکومت بھی گزر گئی۔ اب تم کیوں مڑے
 اٹھاتے ہو۔۔۔۔۔ مگر فیلڈ مارشل کہتا ہے ”نہیں“ چاہے وہ
 گزر گئے ہوں چونکہ عوام کے بنائے ہوئے تھے۔ لہذا ان کے عیب
 نکالو۔۔۔۔۔ اس کے علاوہ اور بہت سی ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں
 ہیں جو فیلڈ مارشل کرتا ہے۔ مثلاً فیلڈ مارشل حکومت نے حکم
 دے دیا کہ ”بکریاں ختم کر دو“

اب بتاؤ۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ بکرے کی نسل کو ختم کر دو۔
 آخر کیوں؟ بکرے چارہ کیا بگاڑتا ہے؟ تو فیلڈ مارشل
 کہتا ہے کہ تمہیں پتہ نہیں کہ بکرے باغ کا دشمن ہے۔ اور باغ کے
 دشمن کی نسل ہی ختم کر دینی چاہیے۔

بہر نوع جب چوتھے مرتبہ یہ ہمارا فیلڈ مارشلے حاکم ہوا ہے جسے
 علی کہتے ہیں۔ اس کے زلمے میں جو جنگیں ہوئیں ہیں جل۔ صفین اور
 ہزدان وغیرہ ان میں ایسا نہیں ہوا کہ فیلڈ مارشل گھر میں ہی بیٹھ کر فوجیں
 رہا ہو بلکہ کہتا ہے۔

”اگر جہاد عبادت ہے تو میں خود اس عبادت سے بہرہ مند
 ہوں۔ گویا وہ خود میدان جنگ میں موجود رہا۔
 میرے محترم سامعین!“

عرب کا یہ دستور ہو گیا تھا کہ اگر کوئی عرب کا بہادر اس فوج کا معمولی
 سپاہی ہوتا تھا۔ جس فوج نے علیؑ کا مقابلہ کیا ہو تو اس کا خاندان فخریہ
 کہا کرتا تھا کہ میں اس بہادر فرد کے خاندان سے ہوں جو علیؑ کے مقابل فوج
 میں تھا۔ اگر علیؑ کے مقابل ہونا اتنے بڑے فخر کی بات ہے تو آپ اس
 فخر کو کس طرح مٹا سکتے ہیں۔

اگر ایک سید کھڑے ہو کر یہ کہہ دے کہ تمہارے مردوں کو یہ فخر ہو گا۔
آؤ دیکھو! میں ایک تیز رفتار گھوڑے پر سوار ہو کر جہاد میں جاتا ہوں
جہاں بھاگ آنے کی توقع قوی ہو اور بات ہے اور بادانی ڈاچی پر چڑھ
کر جانا اور بات ہے۔

دیکھو نا۔ جنگ جمل میں تاریخِ حرب و ضرب کے لکھنے والوں کو
علیؑ نے حیرت میں ڈال رکھا ہے۔ یہ پہلا موقع ہے کہ شہنشاہِ ہند خود جنگ
میں ایک سپاہی کی حیثیت سے ہے۔ علیؑ یہ کہتا ہے کہ چونکہ جہاد ثواب ہے۔
اس لئے میں اس جہاد سے کیوں محروم رہوں۔ اور آپ حیران ہوں گے
کہ پوری جنگ جمل میں علیؑ نے چہرے پر نقاب رکھا۔

میں کہتا ہوں۔ خدا گواہ ہے۔ علیؑ شرمائے گئے۔ اب اگلا فقرہ کیا کہوں
بس علیؑ شرمائے گئے کہ ”کون میرے مد مقابل آگیا ہے“

سامعین!

جنگ صفین جنگِ جمل کا ہی نتیجہ تھا۔ کیونکہ جنگ صفین میں بھی کھلم کھلا
کو اگسایا تھا کہ اگر علیؑ سے لڑنا گناہ ہوتا تو مسلمانوں کی مائے کیوں مقابلہ کیے
آجاتی۔ لہذا علیؑ سے لڑنا حق ہے۔ بس علیؑ سے لڑنے کے لئے اسی بات پر
مسلمان صفین میں اکٹھے ہو گئے اور تقریباً ڈیڑھ لاکھ آدمی کھڑے علیؑ
سے مقابلہ میں لڑنے کے لئے اور علیؑ لڑ رہے ہیں۔ چوبیسویں دن لڑائی
ہوئی تیس سو اسی دن جو تھا اس دن فیصلہ کن جنگ ہو رہی تھی۔ دونوں
اطراف کی فوجوں نے یہ سوتل لیا تھا کہ شام کو جو جنگ بند کر دی جاتی ہے
آج مت بند کرو۔ اب جنگ بند اس وقت کریں گے جب تک اس کا مکمل
فیصلہ نہ ہو جائے۔ گویا فیصلہ کن جنگ ہو رہی تھی۔

حضرت علیؑ کی فوج کا کمانڈر انچیف حضرت مالکؓ اشتہر تھے۔
جن کے لئے علیؑ نے فرمایا ہے کہ ”یہ میرے لئے دیسا ہی ہے جیسے میں محمد مصطفیٰؐ

کے لئے، ”گو یا اس سے بڑھ کر کوئی خطاب کسی کو مل سکتا ہی نہیں۔ ادھر حضرت مالکؓ اشتر بڑے خوش تھے کہ آج فیصلہ کن جنگ ہو گی۔ مالکؓ کے دونوں ہاتھوں میں تلواریں تھیں اور اپنے سپاہیوں سے کہنا تھا۔ ”سپاہیو! آگے بڑھو۔ کوثر تمہارے قریب ہے۔ جنت تمہارے قریب ہے۔“

بہر نوع جس وقت جنگ ختم ہوئی ہے اس وقت مالکؓ اشتر معاویہ کے خیمہ کی طنائیں کاٹ رہا تھا۔ صرف دو ہاتھ ابھی باقی تھے جس وقت امیر المومنین کا پیادہ پہنچا اور کہا، ”مالکؓ! موٹلانے بلایا ہے۔“ مالکؓ نے کہا، ”تھوڑی دیر ٹھہر جاؤ۔“

پیادے نے کہا، ”نہیں۔ موٹلا کا حکم ہے کہ جنگ بند کر دو۔“ مالکؓ موٹلا کا حکم سنتے ہی اٹھ کھڑا ہوا اور امیر المومنین کی خدمت میں پہنچا۔ عرض کی، ”یا امیر المومنین! اب تو معاملہ ہی ختم ہو گیا تھا، موٹلانے فرمایا۔“ ہاں مالکؓ اشتر! خدا یہی چاہتا ہے کہ معاملہ یہیں ختم ہو۔ اب ہمدردی کا پورا جوش یہ ہے کہ تلواریں پھینک کے بیٹھ جاؤ۔ اب تلوار اٹھا جرم ہو جائے گا۔“

اتام کے حکم پر جنگ بند کر دی گئی اور اس ایک رات کی جنگ کو اللہ نے ”لیلۃ الحویر“ کہہ کر یاد فرمایا۔
سامعین!

”حویر“ کہتے ہیں باریک کپڑے کو۔ اس دن علیؓ نے زندگی میں پہلی دفعہ باریک کپڑا پہنا ورنہ ساری زندگی سوائے موٹے کھدر کے کرتے کے کچھ نہیں پہنا۔ تمام موثر خین اس بات پر متفق ہیں کہ علیؓ کے لباس سے فخر کا لباس زیادہ قیمتی ہوتا تھا۔ علیؓ نے وہ باریک کرتا پہن کر جہاد شروع کیا اور اتفاق سے آپ کے پاس زرہ بھی نہ تھی کیونکہ وہ بیوی کے مہر میں دیدی گئی تھی۔

سامعین ! علیؑ جب اپنی زرہ بازار میں بیچنے گئے ہیں۔ رسول اللہؐ نے فرمایا تھا کہ علیؑ ہمر کے لئے بھی کچھ ہے۔
 فرمایا، قبلہ ! ایک تلوار ہے۔ ایک خنجر ہے اور ایک میری زرہ۔
 رسولؐ نے فرمایا، ”یا علیؑ ! ان میں سے خنجر بھی ضروری ہے تلوار بھی ضروری ہے اور زرہ بیچ دو۔“

جب امیر المومنین بازار میں زرہ بیچنے گئے تب پتہ چلا کہ زرہ کیسی تھی۔ سامنے تھوڑے ساٹو ہالگا ہوا۔ باقی کپڑا۔ حالانکہ ساری زرہ لوہے کی ہوتی ہے خریدار نے کہا، ”قبلہ ! آپ نے اس زرہ کا کیا تکلف فرمایا ہے ؟“

مولانا نے فرمایا، ”بھئی ! سامنے سے معلوم ہو کہ ہم بھی زرہ پہنے ہوئے ہیں۔ خریدار نے عرض کی، ”قبلہ ! اگر کوئی پیچھے سے حملہ کر دے تو پھر ؟“
 فرمایا، ”ابنی طالب کا بیٹا اس دن مرنا جائے جس دن دشمن کو پیچھے آنے کا موقعہ دے۔ یہ محض فوجی تعظیم کے لئے میں زرہ پہن لیتا ہوں ورنہ مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں۔“

بزرگوار ! ————— یہ تو تھی علیؑ کی زرہ کی حالت اب ذرا علیؑ کے گھوڑے کا واقعہ سنئے گا۔ ایک دن کوئی عرب مسخرہ بن کے مولانا سے کہنے لگا۔
 ”قبلہ ! اپنے خنجر کو بیچ کر کوئی اچھا سا گھوڑا خرید لو جو خوب دوڑتا ہو۔“
 مولانا نے فرمایا، ”کسی بھاگتے کے پیچھے میں نے دوڑنا نہیں اور میدان سے میں نے بھاگنا نہیں۔ لہذا مجھے یہی خنجر چاہیے۔ چاہے سست رفتار ہی ہے۔“

سامعین !

اسی لیلۃ الحزیرؑ میں علیؑ بذات خود میدان میں تشریف لائے۔ اور اگر سارا قصہ سنو تو لطف آجائے کہ علیؑ نے اپنا لباس اپنے چھوٹے بیٹے عباسؑ کو پہنا دیا جس کا گیارہواں سال کا سن تھا۔ عباسؑ کو لباس پہنا کر میدان جنگ میں

بھیج دیا گویا علیؑ نے "لیلة الحویر" میں عباسؓ کو زندگی میں پہلی دفعہ میدان جنگ میں بھیجا ہے۔ "جاؤ بیٹا! لڑنے جاؤ"

چنانچہ عباسؓ میدان جنگ میں تشریف لائے اور معاویہ کی ایک لاکھ فوج یہ کہہ کر بھاگ گئی کہ "علیؑ آگئے ہیں" انہیں پتہ ہی نہ چل سکا کہ کوئی اور آیا ہے جب مالکؓ اشتر نے اکرامیر المؤمنینؓ کو رپورٹ دی ہے کہ "مولا! چھوٹے شہزادے نے تو کمال کر دیا۔ کہ تلوار پھینک دی اور دو سواروں کو اٹھاتا۔ ٹکراتا اور پھینک دیتا میں ابھی ابھی گن کے آیا ہوں عباسؓ نے تقریباً پانچ سو چھترسے سر ٹکرا کر مار دیئے ہیں۔ لہذا میں اب شہزادے کو واپس لایا ہوں" امیر المؤمنینؓ نے فرمایا "مالکؓ! میرے عباسؓ کو تم کیوں واپس لائے ہو؟"

مرضؓ کی حضورؐ والا! کافی دیر تک جہاد کرتے کرتے تھک گیا ہوگا۔ چنانچہ امیر المؤمنینؓ نے عباسؓ کو گود میں لیکر فرمایا۔

"بیٹا! تھک گئے؟"

عباسؓ نے مرضؓ کی "نہیں آبا"

علیؑ نے عباسؓ کے بازو چوم لئے۔ پیشانی چومی، سینے سے لگا کر پیار کیا۔ اور فرمایا "عباسؓ بیٹا! بس۔ اب نہ لڑنا۔ دُنیا نے تمہاری شجاعت کھلی بزرگانِ من!"

اس جنگ "لیلة الحویر" میں خود حضور امام حسنؓ مجتبیٰؓ اور حضور سید الشہداء امام حسینؓ علیہ السلام نے جہاد فرمایا۔ اور حضرت محمد حنفیہؓ نے بھی گویا علیؑ کے سادے بیٹے اس جنگ میں لڑ رہے تھے۔ اور جب پلٹ کے آئے تو دیکھا کہ امیر المؤمنینؓ باریک کرتا اپنے نماز پڑھ رہے ہیں اور نماز کا عالم یہ ہے کہ نہ کوئی جلدی ہے اور نہ ہی کوئی گھبراہٹ ہے۔ بڑے اطمینان سے نماز ہو رہی ہے۔ حسنینؓ تو خاموش رہے مگر عبداللہ ابن عباسؓ نے مرضؓ کی

"مولا! یہ میدان جنگ میں کیا ہو رہا ہے؟" مولا فرماتے ہیں "ہونا کیا ہے۔"

غماز پڑھ رہا ہوں؟

”قبلہ اس وقت؟“

فرمایا: ”ہاں اس وقت۔ اپنی طالب کے بیٹے کو کوئی ڈر نہیں کہ موت اس پر آئے گی یا وہ موت پر جا پڑے۔“
سامعین!

یہ ہے وہ لیلۃ المحرمہ کی غماز جس پر ساری دُنیا کی نمازیں ناز کرتی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ علیؑ کے ہی گھر میں کوئی مثال بل جائے تو بل جائے ورنہ ہر جگہ ممکن نہیں ہے۔ بہر نوع جنگ صفین ختم ہو گئی اور مالک شتر نے دشمن کے قتل ہونے والے سپاہیوں کی گنتی شروع کر دی۔ صبح تک گنتا رہا کہ اتنے فلاں شہزادے نے قتل کئے ہیں اور اتنے فلاں شہزادے نے مارے ہیں۔ اتنے عباسؑ غازی کے اور اتنے محمدؑ حنفیہ کے اور تو سونہارے آدمی مالک شتر کے اپنے ہاتھ سے مارے گئے۔ جبکہ ایک ہزار جناب امیر المؤمنینؑ کی تلوار سے قتل ہوئے تھے۔ اچانک مالک شتر کے دل میں خیال آیا کہ اگر ایک آدمی اور مار لیتا تو آج میں اور مٹولا برابر ہو جاتے۔ ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ فوراً ایک سپاہی پہنچا اور کہنے لگا۔ ”مالک شتر! مٹولانے یاد فرمایا ہے۔“

چنانچہ مالک شتر پہنچا۔ مٹولا کو سلام کیا۔ اور مٹولا پوچھنے لگے۔

”مالک شتر! تم کیا سوچ رہے تھے؟“

عرض کی۔ ”مٹولا! کشتے گن رہا تھا،

مٹولانے فرمایا۔ ”سُنو! جس شخص کی پشت سے قیامت تک کوئی مومن آنے والا ہو میں اُسے چھوڑ دیتا ہوں۔ اتنا چھانٹ کے قتل کرتا ہوں۔ اگر میں ایک سرے سے قتل کرنا شروع کر دوں تو یہ کائنات بچی کب ہے۔ اور تیرے دونوں ہاتھوں میں جو تلوار ہے اس نے جو سامنے آیا رہ قتل کر دیا۔ یہ ہے میرے اور تیرے کشتوں کا فرق۔“

مولا کی یہ بات سنکر مالک اشتر نے توبہ کی۔ "مولا! میری توبہ۔ مجھے ایسی بات سوچنا بھی نہیں چاہیے تھی۔ کیونکہ تو تو سوچ بھی جانتا ہے۔ جو دل میں خیال آئے وہ بھی جانتا ہے۔"

مالک اشتر کی یہ بات سنکر علی مسکرا دیے اور فرمایا: "مالک اشتر! میں نے تجھے بتایا نہیں کہ میں بادشاہ ہوں بدنوں کا اور امام ہوں دلوں کا۔ مجھے پتہ ہے دل میں کیا ہے۔"

خالق کا یہ عظیم نمازی کوفہ کی مسجد کے محراب میں کھڑا کہہ رہا تھا: "میرے اللہ! کیا کروں۔ علی! کو بخش دے۔ میرے اللہ! علی سے تیری نماز ادا نہ ہو سکی۔ خداوند! میں حق عبادت ادا نہ کر سکا۔ بس جتنی ناقص ادا ہوئی اسے قبول کر لے" دنیا حیران تھی کہ اللہ چاہتا کیا ہے۔ آخر کس نماز پہ جا کے یہ شخص کہے گا کہ ہاں اب نماز ہو گئی۔

سامعین کو رام!

وقت گزرتا گیا۔ آخر سن چالیس ہجری کا رمضان آ گیا جس میں امیر المومنین کی شہادت ہوئی۔ رمضان کا مہینہ خدا کی نعمتوں کا مہینہ ہے جس میں تقریباً ہر جاہل آدمی بھی نسبتاً زیادہ عبادت کرنے لگتا ہے اور علی نے تو اللہ جانے مضافاً اس طرح گزارا ہو گا۔ امیر المومنین ۱۵ رمضان کے خطبہ میں فرماتے ہیں: "مَاعَبْدُكَ حَقّاً عِبَادَةً" پروردگار! جو حق تیری عبادت کا ہے۔ وہ مجھ سے ادا نہیں ہوا حضور والا۔۔۔۔۔ ذرا اس فقرہ کی لطافت پر غور کرو تو لطف

آجائے گا کہ "مجھ سے تیری عبادت کا حق ادا نہیں ہوا"۔ یہ پندرہ رمضان ۱۵ کا واقعہ ہے گویا زندگی کے تین دن باقی ہیں اور اتنا بڑا عابد ہے مگر آج تک اتنی عبادتوں کے باوجود اس کے منہ سے یہ نکل رہا ہے کہ "مجھ سے حق عبادت ادا نہ ہو سکا"۔۔۔۔۔ بہر نوع رمضان کی سولہ گزری۔ سترہ گزری۔ اٹھارہ گزری۔ اٹھارہ تک عابد یہ کہہ رہا ہے کہ "میں تو کچھ بھی نہ کر سکا"۔ اٹھارہ رمضان کی شام

کو جناب زینب سیدہ علیا علی کی بڑی بیٹی کے گھر امیر المومنین کی دعوت تھی۔
 بزرگو! ایمان سے بتاؤ۔ جب بیٹی کے گھر باپ آ جائے تو
 بیٹی کو میسلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی ساری دولت و نعمت میرے گھر میں آگئی
 ہے۔ اسی طرح شہزادی عظمیٰ اپنے باپ کی دعوت میں مشغول ہے۔ گھر کی ایک
 ایک دیوار صاف کی ہے۔ تمام گھر جاروب کشی کر کے صاف کیا ہے۔ بقول مراد پیر
 فرش آنکھوں سے کیا، جھاڑ کے پلوں سے مکان

زینب آج خوش ہے اور دیوار کے پاس جا جا کے ہمسایوں سے کہتی
 ”جے بیو! بچوں کو شور نہ مچانے دیتا۔ گھر میں مردوں سے کہنا کہ زرا آہستہ
 بولیں۔ کیونکہ آج شام کو میرے آبا آئیں گے“۔ ادھر ہمسایہ کی عورتیں کہتی
 ہیں ”شہزادی! اگر اجازت ہو تو ہم اپنے مکان سے نور الہی کی ایک جھلک
 زیارت کر لیں“۔ زینب جواب دیتی ہیں ”بی بیو! بابا سے پوچھ کے بتاؤ گی۔
 بہر نوع سارا دن زینب مشغول رہی۔ شام کے قریب زینب حسین سے
 کہتی ہیں ”بھکا لیو! تم بھی آنا۔ عباس بھائی تم ابھی سے میرے ساتھ چلو تاکہ
 بابا کی دعوت کا انتظام کریں۔ شام ہوئی۔ امیر المومنین علی ابن ابی طالب، زینب
 کے گھر تشریف لائے اور فرمایا۔ ”بیٹا زینب! ہم آگئے“
 ”بابا! بسم اللہ آ جاؤ“

چنانچہ امیر المومنین علیہ السلام کروہ کے اندر تشریف لائے۔ زینب نے فوراً
 اپنے سر سے چادر زمین پر بچھا دی اور فرمایا۔
 ”آبا جان! چادر پر بیٹھئے“

امیر المومنین نے پہلے وضو کیا پھر زینب کی چادر پر بسم اللہ کہہ کے بیٹھ گئے۔
 سامعین!

غور سے سننا میری اس بات کو۔ یہ ایسا عمل ہے جسے عشق کہتے ہیں۔ اب
 امیر المومنین زینب کی چادر پر بیٹھے روزہ افطار کیا کرنے کے بعد

امیر المؤمنین فرماتے ہیں۔ بیابانِ نبیؐ! ہم نماز مغرب آج نہیں پڑھیں گے، زینبؓ نے جواب دیا: ”ابا حضور! بسم اللہ۔ نماز پڑھ لیجئے“۔ چنانچہ علیؑ نے چادر زینبؓ پر نماز پڑھنا شروع کر دی۔

حضور والا! علیؑ نے اس نماز میں اپنے پاؤں سے کوئی تیر نہ کھنچوایا۔ وہی ایک سادہ نماز ہے۔ پڑھ لی۔ اور وہ عابدِ جدِ اتنی عظیم عبادتوں کے بعد کہا کرتا تھا کہ ”مجھ سے حق عبادت ادا نہ ہو سکا“۔ نین رکعت مغرب کی نماز زینبؓ کی چادر پر پڑھ کر کہتا ہے۔ ”فَوْتُ بَرِّ الْكَعْبَةِ“
 ”رَبِّ كَعْبَةِ كِسْمِ“ آج میں عبادت میں کامیاب ہوا ہوں۔ اب مجھ پر چلا کر میری عبادت مکمل ہو گئی۔

گویا زینبؓ کی چادر پر سجدہ کر کے علیؑ کو پتہ چلا کہ آج میں نے حق عبادت ادا کر دیا ہے۔ یہ ہے وہ رُوحِ آلِ محمدؐ جو آج مکمل ہو گیا۔ آج تک اپنی عبادتوں کو حقیر سمجھنے والا زینبؓ کی چادر پر نماز پڑھ کے کہتا ہے ”فَوْتُ بَرِّ الْكَعْبَةِ“۔ کعبہ کی قسم! آج میں حق عبادت ادا کر دیا۔ آج میری عبادت انتہا کو پہنچ گئی۔

سامعین!

زمانے کی گردش کو یاد دینا کا انقلاب کہو کہ وہی چادر جس پر علیؑ نے نماز ادا کی تو فرستِ برتِ الکعبہ پڑا آج وہی چادر کے متعلق تم منستے ہو کہ شہر نے زینبؓ کے سرے کھینچ لی تھی۔ حالانکہ یہ روایت بالکل غلط ہے۔ شہر کے ہاتھ نہ جل جلتے اگر وہ زینبؓ کی طرف بڑھاتا۔

لہذا آج میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اگر کر بلا میں شکر زینبؓ نے زینبؓ کی چادر نہیں چھینی تو آخر وہ چادر کہاں ہے۔

بزرگانِ من!

زینبؓ گرامِ حرم کو معہِ چادرِ حسنہ کی لاش برآئی اور دیکھا کہ بھائی کی لاش

دھوپ میں پڑی ہوئی ہے۔ زینب کے وہ تاریخی فقرے آج بھی نضا میں گونج رہے ہیں۔

”حسین بھائی! تیری میت دھوپ میں ہے تیرے پاس کفن نہیں ہے اگر اجازت ہو تو میں تجھے کفن منگوا دوں۔ حسین! وہی درزی جو بچپن میں لباس لیکر آیا تھا۔ آج کفن لیکر آئے گا۔ حسین! اگر میری ماں کے کہنے سے لباس آسکتا ہے تو میرے کہنے سے کفن بھی آسکتا ہے۔“ مگر حسین مجھے پتہ ہے تیری مصلحت نہیں ہے۔ لہذا میں تیرے کفن کا انتظام کرتی ہوں۔“

یہ لکھ زینب نے اپنی چادر حسین کی لاش پہ ڈال دی اور سوئم والے دن جب امام زین العابدین نے باپ کو دفن کیا ہے تو وہی زینب کی چادر حسین کا کفن تھا حضورِ والا!

قیامت کے دن ہر ایک اپنا کفن پہنے ہوئے اُٹھے گا۔ میرا یہ اعلان ہے کہ حسین جب آئے گا قیامت میں تو اس کے کاندھے پر زینب کی چادر ہوگی۔ بس بھائیو! نمازی جتنی ہو سکیں پڑھو۔ روزے جتنے ہو سکیں رکھو مگر ان اعمال کے اندر روئے عشقِ آلِ محمد پیدا کرو۔ علیٰ جیسا نمازی ان کی چادر کے طفیل سے کہتا ہے کہ میں آج کامیاب ہو گیا۔ لہذا تم اور تمہاری نمازی کیا ہیں۔ تمہارے اعمال کھوکھلے ہیں۔ جب تک ان میں روحِ عشقِ آلِ محمد نہ ہو اللہ ہمیں مودتِ محمد و آلِ محمد عطا فرمائے۔ ہم ان کے عشق و محبت کے ساتھ زندہ رہیں۔ اور ان ہی کی محبت کے ساتھ دم نکلیں

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ
اللَّهُمَّ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ وَآلِ مُحَمَّدٍ

فَلَا تَكُن مِّنَ السَّوْءِ

بِالْأَعْيُنِ

خداوند جل جلالہ و عز اسلہ کی حمد و ثناء کے بعد حضرات محمد و آل محمد پر درود و سلام

حضرات محترم!

دُنیا میں ہر واقعہ اپنے سابقہ واقعہ سے وابستہ ہے۔ ہم جو کہتے ہیں کہ ”فلان واقعہ اتفاقاً ہو گیا“ گویا اتفاقاً کے معنی ہیں سبب کا معلوم نہ ہوتا۔ ورنہ ہر واقعہ کا پہلے سے کوئی نہ کوئی سبب ضرور ہوتا ہے۔ پھر رفتہ رفتہ وہ واقعہ رونما ہو جاتا ہے گویا جب چھوٹے سے چھوٹا واقعہ بھی بغیر سبب کے رونما نہیں ہو سکتا تو اتنا بڑا حادثہ عظیم جس کی مثال دنیائے انسانیت کی تاریخ میں مل ہی نہیں سکتی۔ کیا یہ واقعہ اچانک ہو گیا؟ ”نہیں“ بلکہ اس واقعہ کا بھی بڑی دُور سے سبب چلا آ رہا تھا جو مخفی تھا۔ اور جب یہ واقعہ ہوا تب دُنیا کو پتہ چلا کہ ہو گیا۔ گویا دُنیا کو اس بات کا علم بھی نہیں تھا کہ سرزمینِ عرب میں اسی جہالت زارِ عرب میں ایک ایسا شخص بھی پیدا ہو جائے گا جس کی تمام کائنات کلمہ گو ہو جائے گی۔ مگر قدرت اُس زمانے سے تمہید اٹھا رہی تھی جہاں یہ اسماعیل کو بسایا۔ پھر اُن کی نسل کو آگے بڑھایا۔ اسکے بعد اللہ نے اسی ملک میں ایک شریف خاندان پیدا کر دیا۔ وہ عرب جن کے لئے لوٹ مار اور قتل و غارت باعثِ فخر تھا۔ جو اپنی بچیوں کو زندہ دفن کرنا اپنا کمال سمجھتے تھے۔ جن کی جہالت آج تک ضربِ المثل ہے۔ گویا عرب بڑے جاہل تھے۔

سَامِعِينَ!

لفظ ”جاہلہ“ میں نے یوں ہی کہہ دیا۔ میں اپنے الفاظ واپس لیتا

ہوں۔ عرب جاہل نہیں تھے۔ جاہل تو اُسے کہتے ہیں جو جانتا نہ ہو۔

جاہل ہونا کوئی عیب نہیں ہے۔ دنیا میں کوئی ایسا انسان نہیں ہے جو ہر بات جانتا ہو۔

اب یہ بچے بڑی حسرت سے مجھے گھور رہے ہیں۔

زیدی صاحب! شرم کرو۔ منبر پہ بیٹھ کے غلط کہتے ہو۔ دنیا میں ایسے انسان بھی ہیں جو ہر بات جانتے ہیں۔ ہمارے آئمہ کو دیکھ لو جو سب کچھ جانتے ہیں۔ میں کہتا ہوں، ”بچو! تم غلط کہہ رہے ہو۔ ہمارے آئمہ بھی سب کچھ نہیں جانتے تھے۔ چند ایسی چیزیں مجھے معلوم ہیں جو وہ نہیں جانتے تھے مثلاً جھوٹ بولنا وہ نہیں جانتے تھے۔ دھوکا دینا وہ نہیں جانتے تھے۔ فریب دینا وہ نہیں جانتے تھے۔ یہ تمام باتیں تو آئمہ سے زیادہ میں جانتا ہوں۔“

بہر نوع جاہل ہونا کوئی عیب کی بات نہیں ہے۔ جاہل انسان پڑھا اور عالم ہو گیا۔ لہذا عربوں میں جہالت نہیں تھی بلکہ ان میں ”جاہلیت“ تھی۔ وہ زمانہ جاہلیت تھا۔ جہالت چیز اور ہے اور جاہلیت چیز اور ہے۔ جہالت کے معنی نہیں ”نہ جانا“ اور جاہلیت کے معنی ہیں ”نہ ماننا“ گویا جو جہلے رکھتا ہو مگر نہ جانتا ہو اسے جاہل کہتے ہیں۔ اور جو سب کچھ جانتے کے بعد ”نہ ماننا ہو“ اسے

الوجہلے کہتے ہیں۔ یہ فرق ہے جاہل میں اور ابو جہل میں۔

بہر کیف عرب کے لوگ جاہل نہیں تھے۔ بلکہ ابو جہل تھے۔ ورنہ عرب تو اتنے عالم تھے کہ ہر گھاس اور بوٹی کے خواص جانتے تھے۔ ان سے اپنا علاج کر لیتے تھے اور نٹوں گھوڑوں کی نسلیں سیکڑوں لشتوں تک معلوم تھیں۔ دوڑنے بڑے پرندے کو دیکھ کر سمجھ لیتے تھے کہ یہ آشیانہ سے آ رہا ہے۔ یا آشیانہ کو جا رہا ہے؟ نشان قدم سے پتہ چلا لیتے تھے کہ یہ کس کا نشان ہے؟ یہ غلین ہے یا خوش ہے؟ گویا اہل عرب اتنا علم رکھنے والے تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ وہ ابو جہل تھے۔ کسی کی بات مانتے نہیں تھے۔ اب خدا نے ان ناماننے والوں کے بیچ میں ایک

خاندان "بنی ہاشم" پیدا کر دیا اور اس خاندان کے تعارف کے لئے مقابلے میں ایک دوسرا خاندان پیدا کر دیا جسے خاندان "بنی اُمیہ" کہتے ہیں۔

زمانے کی ستم نظریفی دیکھو کہ مؤرخین کے قلم حکومت کی تلواروں سے بنتے رہے ہیں اور جس قوم کی تلواروں نے آل محمد کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہوان کے قلم کیا انصاف کرتے۔ جس طرح مؤرخین نے "اُمیہ" اور "ہاشم" کو ایک ہی خاندان بنالیا۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ ہاشم اور خاندان سے تھے اور اُمیہ اور خاندان سے تھا۔ یہ چچا زاد دیرہ ہرگز نہیں تھے بلکہ اُمیہ تو ہاشم کا پالا ہوا ایک غلام تھا۔ غلام نوازی۔ خاندان بنی ہاشم کا شبوہ تھا اور اُمیہ کو اس شان سے پالا کہ آگے چل کر بیٹا مشہور ہو گیا۔ ————— بہر نوع یہ دونوں

خاندان اللہ نے عرب میں پیدا کر دیئے۔ شرافت و عظمت میں بنی ہاشم عرب بھر میں مشہور تھے اور سیاسی تدبیروں اور فریب دہی میں بنی اُمیہ مشہور تھے۔ چنانچہ اللہ نے اپنی حکمت سے خاندان بنی ہاشم کو چُن لیا تاکہ اپنا دین بھی اسی خاندان کے ذریعہ پہنچایا جائے اور اسی دین کی حفاظت کا کام بھی اسی خاندان سے لیا جائے۔ مبلغ دین بھی یہی خاندان ہوا اور محافظ دین بھی یہی خاندان ہو۔ اس لئے اللہ نے بنی ہاشم کی دوشاخیں کر دیں ایک نسل عبد اللہ دوسری نسل ابی طالب۔ ایک کے ذمہ حفاظت کرنا اور ایک کے زتے تبلیغ کرنا۔ اللہ نے کہا:-

دیکھو ابی طالب! تمہارے زتے حفاظت ہے تم ہمارے دین کی حفاظت کرو گے۔ ہمارے رسول کی حفاظت کرو گے!

چنانچہ ابی طالب کے زتے اللہ نے یہ حفاظت سپرد کر دی جس کی نشاندہی قرآن نے کی ہے: میں نے تجھے یتیم دیکھا اور تجھے حفاظت میں لے لیا۔ سامعین!

میں آپ سے پوچھتا ہوں۔ میرے پاس کالے رنگ کا ایک مال

ہے جس کا میں بڑا خیال رکھتا ہوں کہ کہیں کھو نہ جائے لہذا مجلس میں یہ رومال میں کسی ایسے آدمی کے سپرد کرتا ہوں جو مجھے واپس کر دے۔ جب دوڑ دھائی روپے کا کپڑا سپرد کرتے وقت میں یہ تلاش کرتا ہوں کہ آدمی ایسا نادر ہو۔ بے ایمان نہ ہو۔ (کبھی میری تلاش غلط بھی ہو جاتی ہے میں نے ایماندار سمجھا مگر وہ بے ایمان نکلا)۔ مگر اللہ جب کوئی شے کسی کے سپرد کرتا ہے تو اس کے چناؤ میں غلطی ہو سکتی ہی نہیں اب اللہ ابی طالب کو اپنی سب سے قیمتی شے سپرد کرتا ہے کیا اللہ نے یہ دیکھ کے سپرد نہیں کیا ہو گا کہ ابی طالب ایماندار ہے؟ ابی طالب کو ایماندار سمجھا ہو گا جب ہی اتنی بڑی امانت دے دی۔ اب ایسے شخص کو اللہ جیسا معبود ایماندار سمجھتا ہو اسے ایماندار نہ سمجھنا بے ایمانی ہے یا نہیں؟۔ اللہ کو تو ابی طالب پر اتنا یقین ہے کہ محمد جیسا امانت سپرد کر دی اور تم کہو کہ وہ صاحب ایماندار نہیں تھا۔۔۔۔۔ بہر نوع ایسی بات کہنا گویا اپنے آپ کو ایمان سے ہٹانا ہے۔

سامعین!

ایک دن میں نے عالم تصور میں حضرت ابی طالب سے عرض کی:-
 "اے امیر العرب! بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ آپ کے پاس ایمان نہیں تھا۔"
 میری یہ بات سن کر ابی طالب ہنس پڑے۔ میں نے عرض کی:-
 "قبل! آپ ہنستے ہیں۔ یہاں ہماری روزانہ لڑائی ہوتی ہے کہ آپ ایماندار تھے یا نہیں؟"

ابی طالب نے فرمایا "میں ہنسوں نا تو کیا کروں جس کے پاس جو شے ہو وہ دوسرے کو دیتا ہے۔ اللہ کے پاس نبوت رسالت امامت عصمت شہادت اور ایمان تھا۔ وہ اس نے میرے سپرد

کر دیا اور تمہارے پاس درود سلام ہیں وہ تم میری اولاد کو دے دیتے ہو۔ اور جن کے پاس ایمان نہیں ہے وہ ایمان مجھے کہاں سے دیں گے؟

سامعین!

میرا مقصد فضائل ابی طالب بیان کرنا نہیں ہے ورنہ فضائل ابی طالب بیان کرنے کے لئے تو پورا عشرہ چاہیے۔ بہر کیف ابی طالب کے فضائل میں آج اتنا ہی فقرہ کہتا ہوں کہ۔

”اچھے طالبے اتنی فضیلتوں کا انسان ہے کہ علی کا بھی باپ ہے۔“

گویا ابی طالب اتنی بڑی فضیلت والا انسان ہے۔ اب اللہ نے محمد کو ابی طالب کے سپرد کر دیا اور ابی طالب، محمد کو اپنے گھر لے آئے اور فرمایا: ”بیٹا! آج سے تم ہمارے گھر رہو گے۔“

چنانچہ محمد اپنے چچا کے گھر رہنے لگے۔ رات کو محمد جب سوتے اور جب رات کے بارہ بجتے تو اس خطرے کے پیش نظر کہ کہیں اچانک رات میں دشمن کوئی حملہ کر کے اسے نقصان نہ پہنچا دے۔ ابی طالب سوتے ہوئے کو چپکے سے اٹھاتے اور اپنے کسی بیٹے کے بستر پر سلا دیتے اور اپنے بیٹے کو محمد کے بستر پر سلا دیتے تاکہ اگر اچانک حملہ ہو تو بے شک میرا بیٹا مارا جائے۔ مگر محمد بچ جائے۔ اتنی اہمیت سے جو محمد کی حفاظت کر رہا ہوا اسے ایماندار نہ ماننا گویا اپنے آپ کو ایمان سے ہٹانا ہے یا نہیں؟

ابی طالب نے یہ عمل ایک دو دن نہیں کیا بلکہ برسوں کیا کہ اپنے بیٹے کو محمد کے بستر پر سلا دیتے تاکہ دشمن کے حملہ سے میرا بیٹا بے شک مارا جائے مگر محمد کو کوئی تکلیف نہ پہنچے۔

اب اگر آپ کہیں ابی طالب کے بیٹے کو محمد کے خطرناک بستر پر سوتا دیکھیں تو سمجھ لیں کہ یہ باپ کی ڈلوائی ہوئی عادت کی تاثیر ہے۔

گو یا ابی طالب نے اپنی زندگی میں اپنے بیٹوں کو محمد کے خطرناک
بستر پر سونے کی مشق کرواداری تھی۔

بہر نوع اس شان سے ابی طالب اپنے بھتیجے کی حفاظت فرما رہے تھے۔
ایک دن محمد نے اہل عرب کو بلایا اور فرمایا:-

”عرب بھائیو! کیا میں صادق ہوں؟“

”انھوں نے جواب دیا“ جی ہاں۔ آپ صادق ہیں۔“

رسول نے پوچھا ”میں نے کبھی جھوٹی بات تو نہیں کہی؟“

لوگوں نے جواب دیا ”بالکل نہیں“

آپ نے فرمایا ”اگر میں یہ کہوں کہ پہاڑی کے پیچھے ایک فوج تم پر حملہ کرنے
آ رہی ہے۔ تو تم مان جاؤ گے؟“

لوگوں نے کہا جی ہاں۔ مان جائیں گے۔“

رسول پوچھتے ہیں ”کیا تمہیں وہ فوج نظر آ رہی ہے؟“

انہوں نے جواب دیا ”قبلہ ہمیں چاہے نظر آئے یا نہ آئے مگر

آپ جو کہہ رہے ہیں۔ ہم آپ کی بات نہیں جھٹلا سکتے۔ ہمیں نظر نہیں

آتا۔ یہ ہماری آنکھ کا قصور ہے چونکہ آپ جو کہہ رہے ہیں اس لئے

ماننا پڑے گا۔“

اب رسول نے فرمایا ”اگر تم مان لو گے تو میری ایک بات مانو کہ۔۔۔

خدا ایک ہے۔“

انہوں نے کہا ”جناب! یہ کیا فرمایا آپ نے؟“

رسول نے کہا ”کہو۔ خدا ایک ہے۔“

”جناب۔۔۔ بات یہ ہے کہ۔۔۔ خدا۔۔۔ اچھا کل بتائیں گے“

اگلے دن پھر آ گئے۔ رسول نے پھر ان سے پوچھا۔

”بتاؤ۔ میں صادق ہوں؟“

انہوں نے جواب دیا "جی ہاں۔ آپ صادق بھی ہیں اور امین بھی ہیں
رسول نے فرمایا "پھر کہو کہ خدا ایک ہے"

انہوں نے کہا "جناب بات یہ ہے کہ خدا..... اچھا کل"

(اسے کہتے ہیں ابو جہل — جھگڑا بھی نہیں کرتے اور مانتے بھی نہیں)

بہر نوع۔ جب کئی دن گزر گئے — اللہ نے کہا:-

"محمد! سنتے بھی ہو۔ اس طرح تو برسوں گزر جائیں گے اور یہ نامزد

"ہاں" نہیں کریں گے۔ تم میرے بتائے ہوئے طریقے سے ان سے "ہاں"
کر دو!"

خدا ندا۔ وہ کیسے؟

اللہ نے کہا "ان سے یہ پوچھو کہ خدا ہے بھی یا نہیں؟ ایک دُوی بات

چھوڑو —

چنانچہ رسول نے انہیں مٹا کے پوچھا "کیوں بھئی! خدا ہے؟"

انہوں نے کہا "جی ہاں"

رسول نے فرمایا "جاؤ۔ بس اتنا ہی پوچھنا تھا"

لوگ بڑے خوش ہوئے۔ کہ "محمد اب ایک والی بات نہیں کہتا"۔

اگلے دن پھر بلایا تو پہلے سے زیادہ تعداد میں لوگ تشریف لائے۔

رسول نے پوچھا "کل کا سبق سناؤ؟"

انہوں نے کہا "خدا ہے"

رسول نے فرمایا "شبابش۔ ٹھیک۔ یہی تمہارا کل کا سبق تھا۔

اچھا یہ بتاؤ جو خدا ہے وہ "عزت والا ہے یا بے عزت؟"

انہوں نے کہا "خدا بڑی عزت والا ہے"

رسول نے فرمایا "شبابش — جاؤ"

لوگ بہت خوش ہوئے۔ محمد اب ایک والی بات نہیں کہتا تیسرے دن

پھر بلایا۔ ”سبق سناؤ؟“

انہوں نے کہا ”خدا ہے — اور عزت والا ہے“

رسول نے فرمایا ”اچھا۔ یہ بتاؤ کہ خدا کی عزت باپ کے برابر ہے یا نہیں؟“

انہوں نے کہا ”جی ہاں۔ خدا کی عزت باپ کے برابر ہے“

رسول نے فرمایا ”جاؤ چھٹی۔ سبق ختم ہو گیا۔ اب وہ بہت خوش ہیں کہ

محمد ایک دالی بات نہیں کہتا۔ جو تھے دن پھر بلایا۔ پوچھا ”سبق سناؤ“

حضور! خدا ہے۔ عزت والا ہے اور اس کی عزت باپ کے برابر ہے“

رسول نے کہا پھر سناؤ“

”قبہ! خدا ہے۔ عزت والا ہے۔ اور اس کی عزت باپ کے برابر ہے“

جب پانچ سات دفعہ محمد نے ان سے کہلوا دیا کہ خدا کی عزت باپ کے

برابر ہے — تو فرمایا ”اچھا یہ بتاؤ باپ ایک ہے یا دو ہیں؟“

اب چونکہ وہ باپ کہہ چکے تھے اس لئے سوائے ایک کہنے کے اور کوئی

چارہ ہی نہیں تھا۔ مگر وہ خاموش ہو گئے۔

سامعین!

اب آپ کہیں گے کہ زیدی صاحب نے یہ بات گھڑ کے مجلس

میں سنادی۔ میں کہتا ہوں۔ اس شخص سے بڑا آدمی کوئی ہے ہی نہیں

جو منبر پر بیٹھ کر جھوٹ بولتا ہے۔ اگر کسی کو یقین نہ آئے تو کسی مولوی

سے پوچھو کہ قرآن میں یہ آیت ہے کہ:

(یا دکر واللہ کو جس طرح یاد کرتے ہو اپنے باپ کو)

اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ اللہ کو تم قبلہ و کعبہ کہا کرو مدظلہ کہا کرو۔

بلکہ جس طرح تم کبھی پیئیں ماننے لگے کہ باپ دو ہیں اسی طرح کبھی یہ

بھی نہ مانو کہ اللہ دو ہیں۔

”اقر بئیں“ اب جو وہاں سے لوٹے تو بڑے شرمندہ تھے۔ سوچا

یہ کیا ہوا۔ بات ہی کچھ اور ہو گئی۔ یہ تو قصہ ہی کچھ اور بن گیا لہذا اوصاف وہ دشمنی پہ تل آئے اور محمد کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ ادھر ابی طالب محمد کی حفاظت کر رہے ہیں۔

سامعین! محمد سے تو سب کو پیار ہے اس لئے کہ وہ صادق بھی ہے اور امین بھی ہے۔ ملک کی عزت بھی ہے۔ مگر ابی طالب سے سب کو عداوت ہے کہ یہ حفاظت کیوں کرتا ہے۔

حضور والا!

ایک مکان میں سوتا رکھا ہے، چاندی رکھی ہے جو اسات رکھے ہیں اور سامنے ایک چوکیدار حفاظت کے لئے کھڑا ہے اب جو ڈاکو آئیں گے وہ سوتے، چاندی سے تو محبت کریں گے۔ جب ہی تو اُسے لینے آئیں ہیں مگر قتل کسے کریں گے؟ چوکیدار کو۔ مارا بچا۔ محافظ جائے گا۔

گویا محمد کا کلمہ پڑھیں گے اور محافظ کو قتل کریں گے۔ یہی دنیا میں ہوتا ہے۔ اللہ نے کہا۔

”محمد! میری بات سن۔ عوام سے گفتگو نہ کر۔

(”سب پہلے اپنے ”اقربین“ کو سمجھاؤ“)

سامعین!

جب یہ آیت نازل ہوئی کہ اپنے ”اقربین“ کو بلاؤ تو محمد نے اپنے چھوٹے بھائی علیؑ ابن ابی طالب کو حکم دیا: ”یا علی! میرے اقربین کو میرے گھر آنے کی دعوت دے“ چنانچہ علی نے جا کے عبدالمطلب کی تمام اولاد کو دعوت دے دی کہ چلو آج محمد کے گھر میں تمہاری دعوت ہے۔ چنانچہ سب آگئے تیس تیس بیٹیس تو مرد آئے۔ پانچ سات عورتیں جو اقربین تھے وہ سب اکٹھے ہو گئے۔ مردوں کی فہرست تو آپ کو یاد ہی ہو گی۔ اس میں حضرت ابولہب

بھی تھے۔ عتبہ بھی تھے، عتبہ بھی تھے، شعبہ بھی تھے۔ آخر سب اقربین تھے۔ کافر ہوں تو کیا ہے۔ اقرب تو تھے ہی۔ یہ اور بات ہے کہ ع سے "عقرب" تھے۔ مگر تھے اقرب — اور قاضیات کے پیچھے سندرات آ بیٹھیں جن کی فہرست تاریخ والوں نے ہم تک پہنچا دی۔ مورخین یہ بتاتے ہیں کہ ان خواتین میں ایک تو فاطمہ بنت اسد بیٹھی تھیں۔ ایک صفیہ بنت عبدالمطلب بیٹھی تھیں۔ ایک ام ہانی بنت ابی طالب بیٹھی اور ایک چھ مہینے کی بچی بھی تھی۔ یہ کون ہے؟ یہ محمد کی بیٹی فاطمہ ہے۔

حضور والا!

خدا شہد ہے۔ میں نے عینک لگا کے دیکھا۔ ایک ایک لفظ کو ٹوٹ کر کے پڑھا۔ مگر عورتوں کی فہرست ختم ہو گئی۔ میں حیران پریشان ہو گیا۔ کہ جب "اقرب" بلائے گئے ہیں تو محمد نے چھ مہینے کی بیٹی کو تو بلایا مگر اس کی بڑی بہنوں کو کیوں نہ بلایا۔ سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ گویا وہ آج نہیں ہیں تو آئندہ بھی نہیں ہیں۔

بہر نوع۔ وہ تمام مرد اور عورتیں رسول کے اپنے گھر میں تشریف لے آئے سہ ماہیوں! لفظ "اپنے گھر" کو بھی منظور نظر رکھنا۔ رسول نے کسی اور جگہ نہیں بلایا بلکہ اپنے گھر میں بلایا۔ یہ رسول کا اپنا گھر کہاں سے آیا؟ — مورخین نے ہمیں بتایا ہے کہ عبداللہ جو رسول کے باپ تھے انہوں نے یہ گھر بنایا تھا۔ چونکہ محمد ان کے بیٹے تھے اس لئے وہ اس گھر کے مالک تھے۔ ہم نے کہا "سبحان اللہ" باپ کا گھر تھا۔ رسول کا اپنا گھر تھا۔ مگر عقل یہاں حیران ہو گئی کہ رسول کو باپ کا گھر مل گیا۔ اپنا گھر بن گیا۔ ادھر ہم نے یہ سنا ہے کہ "رسول نہ وارث ہوتے ہیں اور نہ ہی ان کا کوئی وارث ہوتا ہے"۔

بہر نوع۔ رسول نے اپنے اقربین کو اپنے گھر بلا کر بٹھالیا اور ان بیٹھنے والوں کا حال یہ تھا کہ:

(ایسے چپ بیٹھے تھے کہ جیسے سروں پہ پرند) (قرآن)

سوچ رہے تھے۔ اللہ جانے آج کیوں بلایا ہے۔ پہلے اُن کے سامنے کھانا رکھا گیا۔ جب وہ کھانا کھا چکے تو آپ نے فرمایا۔

• میرے اقربینے! میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔

انھوں نے کہا، فرمائیے۔ رسول کھڑے ہوئے اور یہ حضور کی سیلکی طور پر پہلی تقریر تھی۔ فرمایا۔

• اے اولاد عبد المطلب! تم میرے اقرب ہو۔ تم میرا خاندان ہو، تم میرا خون ہو۔ تم میرے عزیز ہو۔ تم میرے اپنے ہو۔

سَمَاعِیْن !

لفظ، اپنا، مرکز محبت ہوتا ہے۔ جہاں لفظ، اپنا، آجائے خود۔

بخود پیار پیدا ہو جاتا ہے جس طرح اپنا گھر، اپنا وطن، اپنا دیس، اپنا کنبہ

اپنا قبیلہ، اپنا مذہب، اپنا بھائی وغیرہ۔۔۔۔۔ گویا لفظ، اپنا،

مرکز محبت ہے۔ جب، اپنا، کہو تو لب سے لب ملتا ہے اور غیر کہو

تو نہیں ملتا۔ اتنی لذت ہے۔ لفظ، اپنا، میں۔

رسول نے کہا، تم میرے اپنے ہو۔ میں تمہیں اپنا سمجھ کے ایک بات کہنا

چاہتا ہوں کہ میں اللہ کی طرف سے ایک ایسا پروگرام لیکر آیا ہوں کہ اگر تم نے اس

پر عمل کر لیا تو دنیا کی خیر بھی تمہیں حاصل ہوگی اور عقبے کی خیر بھی تمہیں حاصل ہوگی۔

میرے پروگرام میں دنیا و عقبے دونوں شامل ہیں۔ میں ایسی شے تمہارے لئے

لیکر آیا ہوں۔۔۔۔۔ اور یاد رکھو! میرا پیغام اتنا عجیب ہے کہ اگر تم نے مان

لیا تو قیصر و کسریٰ کے تاج تمہارے قدموں کے نیچے ہوں گے۔ دنیا کی حکومتیں

تمہارے تابع فرمان ہوں گی۔ ساری کائنات تمہارا کلمہ پڑھے گی۔۔۔ رسول

کا یہ فرمان تھا کہ حضرت ابولہب نے عتبہ کی طرف دیکھا اور عتبہ نے شعبہ کی طرف

دیکھا۔ وارڈھیوں پہ ہاتھ پھیرنے لگے اور بولے، بر خور دار! تمہیں کیا ہو گیا؟

پیسہ پاس نہیں ہے اور کہتے ہو، قیصر و کسریٰ۔ تابع فرمان ہو جائیں گے۔

کیسی فضول بات ہے۔ تمہاری مدد کر کے خواہ مخواہ کو مصیبت اٹھانی ہے۔
جلد۔ گھر چلیں، چنانچہ وہ اٹھ کے چلے گئے۔

محمدؐ نے اگلے دن اپنے اقربین کو اپنے گھر پھر بلایا۔ جب تیسرا دن
تھا اور وہ کھانا کھا چکے۔ رسولؐ تقریر کرنے کھڑے ہوئے۔ اب اگر آج بھی کوئی
جواب نہ دیتا تو دنیا یہ کہتی کہ محمدؐ کی تقریر میں اثر نہیں تھا جب ہی تو کسی نے جواب
نہ دیا۔ آج رسولؐ تقریر کرنے کھڑے ہوئے۔

لوگو! میں ایسی شے لیکر آیا ہوں جو دین و دنیا میں تمہارے فلاح

کی ضامن ہے۔ تم میں سے کون ہے جو اس معاملے میں میری مدد کرے

بسے رسولؐ کا یہ کہنا تھا کہ "کوئی ہے جو میری مدد کرے" تو اچانک مجمع میں
ہلچل مچ گئی۔ لوگوں کے چہرے بدل گئے۔ سامعین کا انداز ہی کچھ اور ہو گیا۔
دُور ایک کونے میں سے ایک گیارہ سال کا بچہ اٹھا اور ایڑھیاں اٹھا کے کھڑا
ہو گیا۔ مورخین اس بچے کا تھلیہ یوں بیان کیا ہے کہ "کرتے کے بٹن کھلے ہوئے
تھے۔ جیب میں خرے بھرے ہوئے تھے۔ آنکھیں دھڑک رہی تھیں۔ اُن میں آشوب
کی وجہ سے سُرخ آئی ہوئی تھی۔ پیٹ میں تلی تھی اور پیروں پہ کھیلنے کی گرد پڑی
ہوئی تھی"۔ گویا بالکل بچپن کی اداسی اور بچپن کی اس اُداسے کھڑے ہو کر
کہتا ہے "قُبَد! ذرا اب کے فرماؤ۔ آپ نے کیا کہا ہے؟"

رسولؐ نے فرمایا "بیٹا! میں یہ کہہ رہا تھا کہ میں ایسا پیغام لایا ہوں جو

دین و دنیا، دونوں کی فلاح کا باعث ہو گا۔ کون ہے جو میری مدد کرے؟

رسولؐ کا یہ کہنا تھا کہ "کون ہے جو میرے مدد کرے" کہ بچے نے تو ایڑھیاں

اٹھالیں اور پوری آواز سے کہا

(میں تیری نصرت کروں گا اے اللہ کے رسول)

سامعین!

"اے محمدؐ نہیں کہا بلکہ "اللہ کا رسول" کہا۔ اگر محمدؐ کہہ کے وعدہ

کرتے تو محمدؐ کی زندگی تنگ وعدہ تھا۔ مگر رسولؐ کہہ کر وعدہ کے معنی یہ ہیں کہ جب تک تیری رسالتؐ رہے گی میری نصرت بھی رہے گی۔
 بہر نوع اس جوش سے بچنے نے یہ فقرہ کہا کہ تیس اپنی تیس آدمیوں کا مجمع جو رسولؐ کی طرف دیکھ رہا تھا اچانک اس بچے کی طرف دیکھنے لگا۔ رسولؐ مسکرانے لگے۔
 ”قبلہ مسکرتے کیوں ہو؟“

رسولؐ فرماتے ہیں ”میں مسکراتا اس لئے ہوں کہ میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ جب مجھ سے نظر پڑے تو اس پر رُکے۔“

رسولؐ نے کہا ”بیٹا! قریب آؤ۔“ جب برخوردار قریب آ کے کھڑے ہوئے تو آپؐ نے پوچھا۔
 ”تم نے ہماری بات غور سے سنی؟“
 جواب دیا ”ہاں۔ سنی۔“

”ابھی طرح سوچ لو۔“

”ہاں سوچ لیا۔“

”خوب سمجھ لو۔“

”سمجھ لیا۔“

”بیٹا! یہ بچوں کا کھیل نہیں ہے۔“

”قبلہ! میں نے جان پہ کھیل کے کہا ہے۔“

”بیٹا! یہ بڑا مشکل کام ہے۔“

”قبلہ! میں مشکل کشا ہوں۔ فکر نہ کرو۔ تیرے دشمنوں کے پیٹ پھاڑ دوں گا۔“

تیرے دشمنوں کی آنکھیں پھوڑ دوں گا۔ پرواہ نہ کر۔ آج سے میں تیرا ناصر ہوں جو کہنا چاہتے ہو کہو۔ کیا مجال کسی کی جو تیرے پر دو گرام میں رکاوٹ ڈالے؟

بچہ یہ کہہ رہا تھا اور ابی طالبؐ سر جھکائے ہوئے ”الحمد للہ“ کہہ رہے تھے۔

”یا اللہ! تیرا شکر ہے۔ کیا سپوت بیٹا تو نے مجھے عطا کیا ہے؟“

بہر ذریعہ۔ مجمع برخواست ہو گیا۔ اب جو رسول گھر سے باہر نکلے۔ پیچھے پیچھے یہ بچہ جیب میں خرمے بھرے ہوئے محمد کے ساتھ چلا جا رہا ہے۔ ایک خرما کھا لیتا ہے اور گٹھلی دوسری جیب میں ڈال لیتا ہے (یا لکن پھین کی ادا) اب جو رسول مکہ کے بازار میں پہنچے تو بازاری لوگوں نے رسول کا مذاق اڑانا شروع کر دیا۔ ادھر بچہ بھی محمد سے نصرت کا وعدہ کر کے آیا تھا۔ اب جو کسی نے ذرا بھی کوئی فقرہ کہا تو بچہ نے اپنی جیب سے فوراً ایک گٹھلی نکالی اور تاک کے اُسے ماردی جو مذاق کر رہا تھا۔ سینے پہ لگی تو کمر توڑ کے نکل گئی۔ بس دونوں کے ساتھ یہ کیا تھا کہ لوگ کان پکڑ گئے، تو بے کمر گئے کہ اگر یہ بچہ ساتھ ہوا تو ہم محمد کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے ہیں۔ گویا اس میں اور محمد میں فصل ہو تو پھر ہم کچھ بگاڑ سکتے ہیں۔ ورنہ اگر یہ بچہ بغیر فصل کے ساتھ ہوا تو پھر ہم کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔

سامعین!

ایک دفعہ یہ بات میں نے مجلس میں کہہ دی۔ سننے والوں نے کہا۔ ”بالکل جھوٹ۔ تمہیں شرم نہیں آتی، منبر پہ بیٹھے جھوٹ بولتے ہو“ میں کہتا ہوں ”صاحب! جو منبر پہ بیٹھ کے جھوٹ بولتا ہے اس کے برابر کا کوئی بُرا ہے ہی نہیں“ پھر انہوں نے کہا ”زیدی صاحب! یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ گیارہ سالہ بچے کے ہاتھ میں اتنی طاقت آجائے کہ خرمے کی گٹھلی سے کمر ٹوٹ جائے۔ لہذا ہم نہیں مانتے“

میں کہتا ہوں ”بھئی، نہیں مانتے تو نہ مانو۔ زیر دستی تھوڑی ہے، تمہارے نامانے کا کوئی علاج نہیں ہے کہ علی کے ہاتھوں میں اتنی طاقت کیسے آ سکتی ہے۔ مگر قرآن میں یہ لکھا ہوا ہے کہ ”جب خانہ کعبہ کو ڈھانے کے لئے ہاتھی آگئے تو ابابیل نے بچے میں مسور کے دانے کے برابر کنکر لے کر پھینکے جن سے ہاتھی

ٹوٹ گئے۔

سامعین!

اگر علیؑ والی یہ بات غلط ہے تو ابابیل والی بات میری سمجھ میں نہیں آتی لہذا جو دلیل اس کی ہے وہی دلیل اس کی ہے۔
اب معترض کہتا ہے "جناب - وہ تو بیت اللہ کی حفاظت تھی؟
میں کہتا ہوں "بھئی - اگر وہ بیت اللہ کی حفاظت تھی تو یہ رسول اللہ کی حفاظت تھی،

بہر نوع - بنی ہاشم کا خاندان دونوں کام کرتا رہا۔ تبلیغ کا کام بھی اور حفاظت کا کام بھی۔ رسولؐ نے بچے کو بلایا، سینے سے لگایا، پیار کیا۔
"بیٹے! تم نے بڑا وعدہ کیا ہے"

بچے نے جواب دیا "نبلہ! میرا وعدہ رہا کہ میں آپ کی نفرت کروں گا، رسولؐ نے کہا "اچھا تو پھر میری بات سن۔ اگر تو اپنے اس وعدہ نفرت میں ثابت قدم رہا تو "انت وصحی" (تو میرا وصی ہوگا) "انت وزیر" (تو میرا وزیر ہوگا اور میرے بعد میرے اس مشن کا انچارج بھی ہوگا)

چنانچہ دونوں اطراف سے وعدے ہو گئے۔ ایک طرف سے گیارہ سالہ بچہ وعدہ کرتا ہے کہ میں نفرت کروں گا اور ایک طرف سے تینتالیس سالہ رسولؐ وعدہ کرتا ہے کہ تو میرا وصی ہے۔ تو میرا وزیر ہے۔ تو میرے مشن کا انچارج ہے گویا فریقین سے معاہدہ ہو گیا۔

سامعین!

اب یہ بتاؤ۔ وعدہ سے پھر جانے کا احتمال کس طرف سے ہے؟ - بچے کی طرف ہے۔ اور اگر بچہ اپنے وعدہ پر قائم رہے تو رسولؐ کے متعلق تو پیشکبک بھی نہیں کر سکتے کہ (معاذ اللہ) وہ اپنے کئے ہوئے وعدہ سے پھر جائے۔ اب اگر علیؑ اپنے وعدہ پر قائم رہے ہیں تو رسولؐ کا بھی تو فرض ہے

کہ اپنا وعدہ وفا کر کے جائیں اور علیؑ کو اپنا دمی بنا کر جائیں۔ اور اگر رسولؐ بغیر بنائے چلے جائیں تو ہم غریب آدمی تو کچھ نہیں کہیں گے۔ مگر اللہ تو کہہ دے گا کہ "محمدؐ اگر تو نے یہ کام نہ کیا تو میں یہ سمجھوں گا کہ تو نے رسالت کا کوئی کام ہی نہیں کیا۔ لہذا وعدہ وفا کر کے جاؤ ورنہ رسالت خطرے میں ہے۔"

رسولؐ نے کہا، "خداوند! میں وعدہ وفا کر کے جاؤں گا۔"

حالانکہ میں نے یہ وعدہ اپنے "اقربین" میں کیا ہے۔ مگر میں

اس وعدے کو دنیا کے سامنے پورا کروں گا۔ تاکہ عالم گواہ رہے

میری اس بات کا کہ میں اپنے وعدے کو پورا کر رہا ہوں۔"

حضور والا!

وہ وقت بھی آگیا۔ اللہ نے کہا:

"محمدؐ! آج سے بہتر دن نہیں ملے گا۔ آج اپنے وعدے کو

وفا کر کے جاؤ کیونکہ بہترین موقعہ ہے۔ ابھی ابھی لوگ حج کر کے

آئے ہیں، اللہ کا گھر دیکھ کے آئے ہیں۔ خانہ کعبہ کا طواف کر کے

دنیا کے چکر دو گزروں سے نکل گئے ہیں۔ صفا و مروا میں دوڑ کے

زمانے کی دوڑ بھاگ کو بھول گئے ہیں۔ عرفات میں بیٹھ کے معرفت

کی منزلیں طے کر لی ہیں۔ منیٰ میں قربانی دے کر قربان ہونے کا

عذہ سیکھ لیا ہے۔ شیطان کو کنکریں مار کر بڑوں سے نفرت اور

اچھٹوں سے محبت بھی سیکھ لی ہے۔ سب کے سر بھی منڈے

ہوئے ہیں کسی میں بال برابر کا فرق نہیں ہے۔ ابھی ابھی اللہ کے

سامنے بلیک کہہ کے آئے ہیں۔ ان حاجیوں سے بہتر جمع اور

کہاں ملے گا لہذا آج اپنا وعدہ وفا کر لو آج وہ بات کہہ دو

جو اُس دن کہی تھی،

رسولؐ نے فرمایا، "ست اچھا"

لاکھوں کی تعداد میں حاجی رسول کی قیادت میں جا رہے ہیں، اونٹ سُرست ہو کے چل رہے ہیں۔ شہد سواروں کے گھوڑے زمین پہ قدم نہیں رکھتے۔ ان کے نال پتھروں سے ٹکرا کے چراغاں کا منظر پیش کر رہے ہیں۔ حاجی خوش ہیں کہ ہم نے رسول کی قیادت میں حج کیا۔

بہر ذوق۔ رسول کی قیادت میں حاجیوں کا قافلہ ادھر سے چلا اور جبرئیل کی قیادت میں آیتوں کا قافلہ ادھر سے چلا۔ دونوں قافلے حم پہ آ کے ٹکرا گئے۔ ادھر سے آیتوں کا قافلہ ادھر سے حاجیوں کا قافلہ۔ آفتاب نصف النہار پر ٹھہرا ہوا۔ جبرئیل کی آج وضع کچھ اور تھی۔ اس سے پہلے بھی جبرئیل کی بار محمد کے پاس آیا کرتا تھا اور عرض کرتا۔

يَا أَيُّهَا الْمُرْسَلُ "يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ" "آپ منزل ہیں۔ آپ مدثر ہیں۔" مگر آج جبرئیل اپنی سرکاری وردی پہنے ہوئے۔ پوری شان و شوکت سے آیا اور آ کے رسول کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ! "آج جبرئیل نے مدثر، منزل کہہ کر نہیں پکارا بلکہ عہدے سے خطاب ہو رہا ہے۔

"يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ!"

"اے رسول۔ دیکھو، اُترو۔"

رسول گھوڑے سے اُترے مگر اُترنے میں فرق تھا۔ کوئی دل میں اُتر گیا اور کوئی دل سے اُتر گیا اور بن کی بن آئی جس میں رسول اُتر گئے، جسک کی قسمت چمک اٹھی جس میں رسول اُتر گئے۔ تمام حاجی اکٹھے ہو گئے۔ عرض کی۔

"قبل! بات کیا ہے؟"

آپ نے مؤذن کو حکم دیا، آج اذان میں "حَيَّ عَلَى خَيْرِ الْعَمَلِ" کہو۔ باقی عمل تو سارے تمہیں بتا چکا ہوں۔ آج تمہیں "خَيْرِ الْعَمَلِ" بتایا جائے گا۔ (چونکہ فیقرہ اسی واقعہ کی یادگار ہے۔ اس لئے جزو اذان بن گیا) آج تمہیں

”خَيْرُ الْعَمَلِ“ بتایا جائے گا۔ چنانچہ تمام حاجی سمٹ سمٹ کے رسول کے گرد اکٹھے ہو گئے، سورج کی شعاعیں تیز ہیں۔ عربوں نے اپنی عبا میں نیچے رکھی ہیں۔ رسول کی بات سننے کے لئے سب تیار ہیں۔

”اللہ جانے رسول کیا کہیں گے؟“

جبریل نے کہا ”محمد! ہمارے سامنے وہ بات کہو تاکہ ہم بھی سنیں“

چنانچہ رسول نے حکم دیا ”منبر بنایا جائے“ حاجیوں نے عرض کی۔

”قبیلہ! گھوڑوں کی زین اکٹھی کر کے جگہ بنا دیں؟“

فرمایا ”نہیں۔“

”لکڑیاں کاٹ کے بنا دیں؟“

فرمایا ”نہیں اونٹوں کے پلانوں کا منبر بنایا جائے“

حاجیوں نے عرض کی۔ قبیلہ! اونٹوں کے پلانوں میں کیا خصوصیت ہے؟

رسول نے فرمایا ”اس لئے کہ شترکینوں سے بات کرنی ہے“

بہر نوع۔ پلان شتر کا منبر بن گیا اور رسول اس پہ آ کے کھڑے ہو گئے۔

جمع چاروں طرف سے سمٹ کے قریب آ گیا۔ رسول نے حاجیوں کو دیکھا پھر وہی خلق عظیم والی لبوں پہ مسکراہٹ، چہرے پہ تحیر، نہایت لطافتِ نفسان کے ساتھ حاجیوں کے اس مجمع پر ایک نظر ڈالی۔ بس رسول کی نظر کی یہ تاثیر تھی۔

کہ لوگ تو سرمست ہو گئے۔ ”اللہ جانے۔ رسول آج کیا فرمائیں گے“

یہاں تک کہ تین سو برس کا سٹان کمر پہ ہاتھ رکھ کے کھڑا ہو گیا کہ ”رسول آج کیا کہے گا؟ اور ابو ذریہ کہے کہ میں آج تمام صاحب زر کو فنا کر دوں گا۔“

”رسول آج کتنا کیا ہے؟“

بہر نوع۔ جب لوگ چاروں طرف سے رسول کے گرد اکٹھے ہو گئے تو رسول نے کہا۔

”اے عرب والو! اگر واعظ کروں گا تو گھبرا جاؤ گے۔ لہذا آج

میں تم سے سیٹھی میٹھی باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ تم پینے کے عادی تھے
میں نے تم سے چھڑوا دی۔ مگر آج اگر مناسب سمجھو تو ہم پلائیں گے۔
پیو گے؟

لوگوں نے بلند آواز سے کہا "حضور پیئیں گے"
رسول نے فرمایا، دیکھو۔ سن کے پی نہ جانا،
بس پینے کا اعلان تھا کہ تمام متوالے اکٹھے ہو گئے۔ چاروں طرف
رسول کے متوالوں کا مجمع لگ گیا۔ وہاں ہر قسم کا متوالا موجود ہے
سیدھی مت والے بھی اور الٹی مت والے بھی۔

بہر نوح، متوالے اکٹھے ہو گئے اور ساقی نے پلانا شروع کر دیا۔ مٹھ خانہ
ارض کا ساقی! کچھ آنکھوں آنکھوں میں پلائی۔ کچھ باتوں باتوں میں پلائی۔ کچھ
ہنس کے پلائی۔ کچھ گفتگو سے پلائی۔ جب لوگوں کا نشہ پورے عروج پہ
پہنچا تو ساقی نے لرز کے "تراجی" ساغرا اٹھایا۔ لوگوں نے گردنیں بلند کر دیں
(خدا جانے، عجیب نقشہ ہو گا اس زمانے اگر کیمبرہ وغیرہ موجود ہوتا اور اس
منظر کی تصویر لی جاتی تو اتنا لطیف جمع کہیں دیکھنے میں نہ آتا) تراجی ساغر
ہاتھوں پہ بلند کئے ہوئے رسول لوگوں سے پوچھ رہے ہیں۔

"پیو گے؟"

لوگوں نے کہا "حضور! ضرور پیئیں گے۔ آپ جو پلا رہے ہیں؟"
"دیکھو! یہ دیسی نہیں ہے۔ یہ تمہاری بنائی ہوئی نہیں ہے
یہ بے ہوش کرنے والی نہیں ہے بلکہ خالص" ولایت "کی شراب ہے"

(مَنْ كُنْتُ مَوْلَا فِهَذَا عَلَيَّ مَوْلَا)

حضور والا!

اُردو زبان کا کوئی شاعر عالم ارواح میں اس منظر کو دیکھ رہا تھا
اُس نے ساقی کو پلاتے بھی دیکھا اور پینے والوں کو بھی دیکھا۔ وہی

نقشہ کھینچ دیا اپنے شعر میں ۔
 رسول اپنے ہاتھوں پہ ترابی سا غراٹھائے کھڑے ہیں اور کہتے ہیں
 ہیں " پیو گئے ؟ " _____ لوگ کہتے ہیں " پیو گئے " ۔
 اور شاعر نے کہہ دیا ۔

لے کے خود پر مغال ہاتھ میں مینا آیا
 لیکن اسے بادہ کشو ہم کونہ پینا آیا
 رسول نے کہا " یاد رکھو ! قیامت تک اس کا نشہ نہیں اترے گا ۔
 یہ اُس وعدہ کی دفا ہے جو میں نے اعلانِ رسالت کے وقت کیا تھا "۔
 رسول کی تقریر ختم ہوئی ۔ لوگوں نے جناب امیر کو مبارک بادیں دینا شروع
 کیں ! ایسے ایسے خلوص سے مبارک بادیں دی جا رہی تھیں کہ خدا جانے
 غم بھریا رہیں گی ۔

بہر نوع ۔ رسول واپس مدینہ تشریف لائے ۔ حکم دیا کہ علیؑ کو امیر مومنین
 کہہ کر سلام کر دو ۔ چنانچہ سب سے پہلے جناب سیدہ طاہرہؑ نے امیر مومنین
 کہہ کر سلام کیا ۔ پھر حسنین نے بڑھ کے امیر المومنین کہہ کر سلام کیا ۔ پھر
 اصحاب رسول نے امیر المومنین کہہ کر سلام کیا ۔ علیؑ کی شان ہی کچھ
 اور ہو گئی محمدؐ کا وعدہ دفا ہو گیا ۔

سامعین !

آج رسول کا وہ وقت آیا ۔ جب اہل مدینہ سے جدا ہو گئے جانے
 لگے ۔ اصحابؓ کو بلایا اور فرمایا ۔

" لوگو ! ہم جا رہے ہیں ۔ ہم نے اُس دن جو پلائی تھی وہ
 تمہیں یاد ہے نا ؟ ۔ ممکن ہے نشہ اتر جائے ۔ پھر کون پلانے آئیگا ۔
 لہذا ہم چاہتے ہیں کہ تمہیں اس کا نسخہ لکھ دیں ۔ تاکہ میرے بعد
 تم خود بنا کے پی لیا کرو "۔

لوگوں نے کہا "ہاں قبیلہ لکھ دو"

رسول نے فرمایا "بھلے آؤ کاغذ، قلم، دوات"

"قبیلہ! بس ویسے ہی بتا دو"

رسول نے فرمایا "بھئی، دیکھو! اگر لکھواتے تو بڑی تفسیر سے لکھتا۔

چونکہ زبانی پوچھتے ہو لہذا مختصر بتاتا ہوں۔ کہ اس لٹنے کو قائم رکھنے کیلئے

دو دواہیں یاد رکھنا۔ ایک دوا کا نام ہے "کتاب" اور ایک دوا کا نام

ہے "عترت"

"کتاب" ہر کتاب نہیں۔ بلکہ کتاب ہو "اللہ والی" اور "عترت"

ہر عترت نہیں بلکہ عترت ہو "میرے والی" اور دیکھو۔

ترکیب استعمال ہے یہ ہے کہ "تین" تولے "کتاب" لے لو۔

"چودہ" تولے "عترت" لے لو۔ پھر ایمان کی دہلیج میں طویل

کر "نیک عمل" کا پانی ملاؤ۔ پھر "خلوص" کی ہلکی سی آبیخ دید

تھوڑی سی مودت کی مصری ملاؤ۔ جب قوام ٹھیک ہو جائے

تو پیار کے ہاتھوں سے اُتار کر چھان کر۔ روزانہ "پاتنج" مرتبہ

"سترہ" گھونٹ پی لیا کرنا۔ کبھی بھوک نہیں لگے گی۔ اور

اگر چاہو کہ اس کا نشہ اور بڑھے تو یوں کرنا کہ سال میں چند دن

مقرر کر لینا تاکہ اس کے تذکرہ سے اُترا ہو انشہ دوبارہ تازہ ہو

جائے۔

بزرگانِ من!

جنگل میں جنگل اُس دن ہو گیا تھا جب رسول نے اعلان کیا تھا۔ آج بھی

رسول کا کنبہ جنگل میں بیٹھا ہے اور دشمن کی فوجیں چلی آرہی ہیں۔ اُن کے

گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سیدانہوں کے خیموں میں آرہی ہے۔ بہن بھائی

کو بلا کے کہتی ہے "حسبِین! یہ فوجیں کس طرف آرہی ہیں؟"

حسین جواب میں کہتے ہیں، ”دشمن کی طرف“ زینبؓ نے آسمان کو دیکھا
زمین کو دیکھا اور چپ ہو گئی۔ آخر بی بی پوچھتی ہے۔

”حسین! ہمارا کوئی نہیں آئے گا۔ کوئی ایسا نہیں ہے جسے تم بلاو حسین؟“
مولانا جواب دیا، ”زینب! کون مصیبت میں آئے گا؟“
”حسین! آدمی میں جاتی ہوں۔ بلانا تمہارے رستے ہے“

”ہاں بہن۔ بتاؤ“

”حسین! وہ تمہارے بچپن کا دوست، جو مجھے بہن کہتا تھا اور تمہیں بھائی
کہتا تھا۔ میرے آبانے اس کا نام حبیب رکھا تھا۔ اُسے بلاؤ“

چنانچہ حسینؓ نے خط لکھا۔ قاصد کو دیا اور فرمایا، ”کوئہ میں جاؤ۔ لال ٹیٹی
والا ایک آدمی ملے گا۔ اس کا نام حبیب ہے۔ یہ خط اُسے دے دو“

قاصد پہنچا۔ حبیبؓ کے محلے میں گیا۔ ایک دوکان پہ جا کے ٹھہرا۔

اتفاق سے حبیبؓ اس دوکان میں کھڑے خضاب خرید رہے تھے۔ قاصد

حبیبؓ سے پوچھتا ہے، ”شیخ! کیا اس محلے میں کوئی حبیبؓ نامی آدمی

رہتا ہے؟“

حبیبؓ نے پوچھا، ”کیوں۔ کیا کام ہے؟“

”تم مجھے حبیبؓ، گھر بتا دو“

حبیبؓ میرا دوست ہے۔ تو بات کر (حبیبؓ خود کہہ رہا ہے)

قاصد علیحدہ ہو کر کہنے لگا، ”حبیبؓ اگر تیرا دوست ہے تو سن! میں

حبیبؓ کے نام حسینؓ کا خط لایا ہوں“۔ بس یہ سننا تھا کہ حبیبؓ

کہ حبیبؓ تو قاصد کے پیروں پہ گر گیا۔ ”تو حسینؓ کا قاصد ہے۔ تو حسینؓ کا

خط لایا ہے۔ تو نے چلتے وقت حسینؓ کو دیکھا تھا۔ آ میرے ساتھ میں تجھے

حبیبؓ کے گھر لے چلتا ہوں“۔ دونوں چل پڑے۔ دروازے پہ پہنچے۔

حبیبؓ نے کہا، ”ایک منٹ ٹھہر۔ میں ابھی آتا ہوں۔ یہ کہہ کر حبیبؓ اپنی

زدجبہ کے پاس گیا اور کہا:-

”سنتی بھی ہو۔ آج قسمت یاد رہو گی۔ نصیب جاگ اٹھے۔ آج

تو ہمارا نیراقبال کہیں سے کہیں پہنچ گیا“

بیوی کہتی ہے ”بتاؤ تو سہی۔ بات کیا ہے؟“

حبیب نے کہا ”تم جلدی سے دھوکہ دو۔ دو رکعت نماز پڑھو۔ پھر

بتاؤں گا کیا ہوا“ جب مومنہ نماز پڑھ چکی تو حبیب نے کہا:-

”آج ہمارے گھرا میرا مومنین علی ابن ابی طالب کے تحت جگہ

حسین کا قاصد آیا ہے“

مومنہ جواب دیتی ہے ”حبیب شکر ادا کرو۔ مولا کے قاصد کو اندر لے آؤ“

چنانچہ حبیب نے قاصد کو سفید چادر پہ بٹھایا اور جب وہ بیٹھ گیا تو کہنے لگا:-

”میرے مولا کے قاصد! میں ہی حبیب ہوں۔ مولا کا خط میری نام ہے“

قاصد نے حبیب سے خط نکالا اور حبیب کو دے دیا۔ حبیب نے خط کی تحریر

کو چوما۔ کھولا۔ خاموش پڑھنے لگا۔ مومنہ نے اندر سے آواز دی:-

”حبیب! بلند آواز سے پڑھو تاکہ میں بھی سنوں کہ مولا نے کیا فرمایا ہے“

حبیب نے خط پڑھا۔ خط کی عبارت یوں تھی:-

”یا اخی حبیب! بھائی حبیب!“

حبیب تو بھائی کا نام سنتے ہی سجدے میں گر گیا۔

”حسین اور مجھے بھائی کہے“

حبیب نے آگے پڑھا تو لکھا تھا:- ”حبیب! میں تمہارے

وطن میں آگیا ہوں۔ مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔ میری مدد

کو آؤ“

اگلا فقرہ جس نے حبیب کے کلیجے کے ٹکڑے کر دیئے یہ تھا،

”حبیب! میں تمہیں کبھی تکلیف نہ دیتا مگر مجبوری یہ ہے کہ میرے

ساتھ زینب بھی ہے۔

بس زینب کا نام پڑھتے ہی حبیب گھٹنوں کے بل کھڑا ہو کر کہنے لگا۔

”ہائے۔ زینب بھی ساتھ ہے۔“

بہر نوع، حبیب کو بلا میں پہنچے۔ حسین نے بڑھکے استقبال کیا۔ ہاتھیں ہاتھ ڈال کے دروازے تک آئے۔ حبیب خیمے سے باہر کھڑے ہو گئے۔ مولانا درتشریف لے گئے۔ زینب! حبیب آگیا۔

زینب دروازے پہنچیں۔ بیچ میں پردہ۔ بی بی فرماتی ہیں۔

”حبیب! فاطمہ کی بیٹی تجھے سلام کرتی ہے۔“

حبیب تو بے ہوش ہو کر گر پڑا اور کانپتے ہونٹوں سے عرض کی:

”شہزادی! اب یہ وقت آگیا کہ ادنیٰ غلاموں کو سلام کر رہی ہو۔“

بس بھائیو! بیان ختم کرتا ہوں۔

زینب نے حبیب کو ہمیشہ بھائی کہا۔ اب آپ خود اندازہ کریں کہ زینب کو حبیب پر کتنا اعتماد تھا کہ عاشور کی شام کو جب سیدہ انیسوں کے خیمے جلنے لگے اور چادریں اترنے لگیں تو زینب نے حسین کو نہیں لپکارا۔ عباس کو نہیں لپکارا بلکہ گھبرا کر بلند آواز میں کہا۔

”بھائی حبیب! — آؤ۔ دیکھو۔ میں ٹٹ گئی۔“

اللہ ہماری مجلسوں کو قبول و منظور فرمائے اور یہیں مودۃ محمد وآل محمد

عطا فرمائے۔ آل محمد کی مودۃ کے ساتھ زندہ رہیں اور آل محمد ہی کی مودۃ کے ساتھ دم نکلے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ط
اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّآلِ مُحَمَّدٍ

لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

خداوند عالم کی حمد و ثناء کے بعد حضرات محمد و آل محمد پر درود و سلام

حضرات محترم!

اللہ کا یہ فضل ہے کہ جو چیزیں ذی حیات کے لئے لازمی تھیں۔ انہیں انسان کے تصرف میں نہیں دیا بلکہ اپنے قبضہ قدرت میں رکھا۔ اگر لوازماتِ حیات انسان کے بس میں ہوتے تو کبھی کی یہ دنیا ختم ہو جاتی لہذا اللہ نے دنیا کی بقا کے لئے ان لوازماتِ حیات کو اپنے قبضہ میں رکھا۔ اور جو چیزیں حیات کے لئے ضروری تو تھیں مگر اتنی اہم نہ تھیں وہ انسان کے قبضہ میں دے دیں۔ ورنہ جو چیزیں انسانی زندگی کے لئے نہایت لازمی تھیں۔ انہیں قدرت نے اپنے قبضہ میں رکھا۔ جس طرح انسانی زندگی کے لئے ”ہوا“ نہایت لازمی چیز ہے۔ ہوا کے بغیر انسان کا گزارہ ہی نہیں ہو سکتا۔ لہذا اللہ نے کہا ”اگر میں نے انسان کے سپرد کر دی تو انسان ایک دم سے انسان کو مار دیں گے۔ اسی طرح قدرت نے ”پانی“ اپنے قبضہ میں رکھا اب اگر انسان کبھی خدا کی ان چیزوں پر قبضہ بھی کر لیتا ہے تو انسان کیلئے یہ مصیبتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ گویا

نظام قدرت میں انسانی مداخلت جہاں ہوئی وہاں خرابی پیدا ہو گئی لہذا انسان کو انسان بنانے کے ذرائع بھی اللہ نے اپنے ہاتھ میں رکھے۔ اگر انسانی ہدایت۔ انسان کے سپرد کر دی جاتی تو پھر وہ تماشہ بنتا کہ خدا کی پناہ۔

”جس طرح ساری دنیا کے چوروں سے کہہ دیا جائے کہ ایک ایسی سوامی بناؤ جو چوری کو روکتی ہو۔ چنانچہ وہ چوری چوری ایسی بنائیں گے جو ”چوری“ چلتی رہے گی۔ اور اگر تمام ڈاکوؤں سے کہہ دیا جائے کہ ڈاکہ زنی کے اسناد کے لئے ایک کیٹی بناؤ۔ وہ دعویٰ بڑے کرکے تقریب کریں گے، لیکچر دیں گے کہ ”ڈاکہ بہت بُری بات ہے“ اور پھر ایسے ڈاکے ڈالیں گے کہ پتہ نہ چل سکے کہ کہاں ڈاکہ پڑ گیا۔“

بہرِ نوع۔ ہدایت کی ذمہ داری اگر ایسے انسانوں کے سپرد کر دی جاتی تو خدا جانے کیا ہوتا۔ لہذا۔ اللہ نے فرمایا۔

”میں جس طرح چاہوں ہدایت کروں۔ آخر تمہارا پیدا کرنے والا ہوں، تم میرے پاس لوٹ کر آؤ گے، تم میرے سامنے جوابدہ ہو۔ میں ہی تمہاری ہدایت کا کام کروں گا۔ تم جو اپنی طرف سے تجویزیں پیش کرو گے وہ کہیں نہ کہیں جا کے ختم ہو جائیں گی۔ لہذا انسانی ہدایت کا کام مجھے کرنے دو۔ میرے کام میں مداخلت نہ کرو۔“

مگر انسان خدا کے ہر کام میں مداخلت کرتا رہتا ہے۔ خدا کی بتائی ہوئی بات کی طرف انسان اس لئے تو جبر نہیں دیتا کہ چونکہ مزاج میں سرکشی و آزادی ہے۔ اور کسی کی بات نہ مانتا انسان اپنی آزادی کے منافی سمجھتا ہے۔ گویا انسان خود کشی اور آزادی کی بنا پر ٹوکنے والے کو پسند نہیں کرتا اور نا ٹوکنے والے سے بڑا خوش رہتا ہے۔ اس لئے انسان نے کہا۔

”اللہ ٹوکتا بہت ہے۔ یہ کام نہ کرو۔ وہ کام نہ کرو، یہ نہ کھانا وہ نہ پینا ادھر نہ دیکھنا۔ اُدھر نہ جھانکنا۔ لہذا ایسے اللہ کو اللہ نہ مانو جو قدم قدم پر ٹوکتا ہو۔ ٹوکنے والے اللہ کو چھوڑ کر کسی نا ٹوکنے والے کو اللہ بناؤ۔ اور بناؤ بھی ایسا“ بے حسے“ جس میں ٹوکنے کی طاقت ہی نہ ہو اور اگر اس میں حس بھی ہوگی تو چونکہ ہمارا بنایا ہوا ہو گا۔ اس لئے ہمیں ٹوکنے کی جراثیم نہیں کرے گا۔

بلکہ اسے ڈر رہے گا کہ:-

انہوں نے مجھے بنایا ہے اگر ٹوکوں گا تو یہ بگاڑ بھی دیں گے
چنانچہ ہم اللہ بنانے بیٹھ گئے۔ وہ "اللہ" بھی سمجھتے تھے کہ اگر
ٹوکیں گے تو ہماری آبرو جائے گی لہذا "بُت بنے" بیٹھے رہے۔
کیا مجال جو کسی کو ٹوکتے تھے۔ آرام سے بیٹھے رہے۔ لوگوں نے سوچا
"اللہ تو ہم نے بنا لئے اب ان کے لئے کوئی گھر بھی ہونا چاہیے"۔
چنانچہ وہ اپنے بنائے ہوئے "اللہ" کو اصلی اللہ کے گھر میں رکھ کر
مطین ہو گئے کہ دس بیس سال اللہ کے گھر میں رہ کر آدھے تہائی کچھ تو
اللہ بن ہی جائیں گے۔

سامعین!

چار سو سال کے بعد ہم نے جو دیکھا تو وہی بُت کے بُت —
ہم نے پوچھا "السانوں کے بنائے ہوئے اللہ! بیت میں رہ کر
بھی تمہیں ابھی تک اہلیت نہیں آئی"۔

السان کے بنے ہوئے اللہ نے جواب دیا "اگر واقعی تم ہمیں بنانا
بنا نا چاہتے ہو تو ایسا کرو کہ اللہ کے گھر میں ذرا سی زمین کھود کر یہیں
گاڑ دو۔ کڑونے کے بعد ہم ٹھیک ہو جائیں گے۔ اور اگر ہم ٹھیک
بھی نہ ہوئے تو کوئی بات نہیں۔ تم یہ تو کہہ سکو گے کہ:-
"ہمارے اللہ وہ ہیں جو خدا کے حرم میں گڑے ہوئے ہیں"

سامعین!

ایک دن عالم تصور میں، میں اُن گھر والوں سے بائیں کر رہا تھا۔
"اے السانوں کے بنائے ہوئے اللہ! تم یہاں بیٹھے ہو؟

"ہاں"

اللہ بنے؟

”نہیں — بنے تو نہیں، ہوئے ہیں“

یہ لوگ تمہیں اللہ سمجھتے ہیں؟

”ہاں سمجھتے ہیں“

تم میں کوئی کمال ہے؟

”صاحب! بے کمال بھی کوئی مانتا ہے۔ ہم میں بڑا کمال ہے“

تم میں کیا کمال ہے؟

بتوں نے جواب دیا۔ ”تم ہمیں بت سمجھتے ہو؟ سمجھا کرو۔ پتھر سمجھتے

ہو؟ سمجھا کر۔۔۔۔۔ جو چاہو سمجھو۔۔۔۔۔ مگر

ایک کمال ہے ہم میں۔ خود نہیں جانیں گے۔ کوئی اٹھا کر میدان

جنگ میں لے جائے۔ پھر جتنے تمہاری سائنس کے ایجاد کردہ

اسلحہ ہیں وہ استعمال ہوں۔ ٹینک سے ٹینک ٹکرائیں۔ ہوائی جہاز

سے بم برسیں۔ میدان میں لے جانا تمہارا کام ہے۔ اگر میدانے چھوڑ

کر بھاگیں تو ہمیں پکڑ لو۔ چاہیں ٹکرسے ہو جائیں، چاہے چور چور

ہو جائیں مگر میدان چھوڑ کر ہم نہیں آئیں گے۔۔۔۔۔ ہم میں

اتنا کمال ہے۔ ہماری اس ادا پہ دنیا مرنے لگی ہے“

بہر نوع۔ ناٹو کئے والے فدا۔ اللہ کے گھر میں بیٹھ گئے۔ کوئی پوچھے

تو شاہانہ نہیں کہتے۔ کوئی توڑ دے تو برا نہیں کہتے۔ ادھر انسان بھی بہت خوش

ہے کہ یہ بیچارے ہمارے بنائے ہوئے ہیں لوگ بھی نہیں کہتے۔

محترم سامعین!

جس قوم کی دس بیس نسلیں ناٹو کئے والے خدا کی صحبت میں گزر چکی

ہوں وہ اگر آج انہیں چھوڑ بھی دیں اور ٹو کئے والے کو ماننے لگیں

تو یہ ناممکن ہے کہ ایک دم صدیوں پرانی عادت ختم ہو جائے گی۔ بلکہ اس

عادت کو چھوڑنے کے لئے تو کافی مدت چاہیئے، بھلا عمر بھر کی عادت ختم ہو سکتی ہے

گویا _____ جب ایسی دو چیزیں سامنے آئیں گی۔ جن میں سے ایک ہو بولنے اور لٹوکنے والے اور ایک ہونا بولنے اور نالٹوکنے والی تو بت پرستی کی عادت یہ کھلوا دے گی _____ کہ
 "ہمیں نالٹوکنے والی کافی ہے۔"

اللہ کہتا ہے _____ "ہدایت میری طرف سے ہوگی۔ تم مالو نہ مالو۔ تمہیں ماننا پڑے گا اور _____ دیکھو! میں لٹکتا ہی نہیں بلکہ دو ٹوک بات بھی کرتا ہوں

کیا مجال جو میری بات میں کہیں نقص آجائے۔ میری ہر بات غلطی سے مبرا ہوتی ہے۔ میری کسی بات میں شک و شبہ ہو سکتا ہی نہیں۔
 مسلمانو! تم بھی کیا یاد کرو گے کہ تمہاری ہدایت کے لئے میں نے وہ ہدایہ بھیجا ہے جس کا کمال یہ ہے کہ دنیا کے ہادی بھی اس کے ماتحت ہیں۔
 تمہیں اس رسول کے کلمہ پڑھوا دیا ہے جس کی اُمت ہونے میں تمام انبیاء و فرما کرتے ہیں۔ _____ یہ گویا شہنشاہ ہوا اور وہ بادشاہ اس کی رعایا میں تمہیں شاید یاد نہیں۔ ہم نے تمام انبیاء سے میثاق لیا ہے جس طرح ایک ذمہ دار افسر اپنے عہدہ کا چارج سنبھالنے سے پہلے حلف اٹھاتا ہے۔ اسی طرح ہم نے ہر نبی سے حلف اٹھوایا ہے کہ:

"تمہارے بعد ایک نبی آئے گا۔ تم اس پر ایمان لانا اور اس کی اولاد کی مدد بھی کرنا۔" قرآن

چنانچہ انبیاء کے حلف اٹھانے کے بعد اللہ نے کہا:۔
 "تم مجھے گواہ بناؤ۔ مجھے ضامن بناؤ کہ تم اس حلف سے ٹکرتو نہیں جاؤ گے"

سامعین!

خدا کے فضل و کرم سے ہم سب مسلمان ہیں اور ہر نبی کو مانتے ہیں۔ آدم سے لیکر خاتم تک ہر نبی کی نبوت کے قائل ہیں۔ فرق اتنا ہی ہے کہ اور نبیوں کیلئے

کہتے ہیں "تھے" اور محمد کے لئے کہتے ہیں "ہے"۔ آج سے لاکھ سال بعد محمد کا ذکر آئے گا جب بھی کہیں گے "ہے" یہاں "تھے" آتا ہی نہیں۔ یہاں "تھے" کا سوال پیدا ہوتا ہی نہیں۔ لہذا محمد "ہے" اور جو ہے اس سے مدد مانگنے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ مدد سے تو وہ روکے جو "تھے"۔ مگر محمد آج بھی ہے اور ہمیشہ ہے اگر ہم کلمہ پڑھیں گے تو اس کے بھی یہی معنی ہیں۔ "محمد اللہ کے رسول ہیں"..... باقی انبیاء تھے"۔ اور اگر کوئی یہ حذر کرے کہ محمد اللہ کے رسول تھے۔ تو اس "تھے" کو روکنے کے لئے اللہ نے "مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰہِ" کا دامن "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ" سے بھر دیا۔ تاکہ کہیں بیچ میں "تھے" نہ آجائے۔ "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ" کے معنی بھی یہی ہیں۔ کہ اللہ "وَاحِدٌ لَا شَرِيْکَ" ہے۔ اور اگر اللہ واحد لَا شَرِيْکَ ہے تو محمد اللہ کا رسول ہے..... اور اگر محمد اللہ کے رسول تھے۔ تو پھر یہ کتنا بڑے گاکہ "اللہ بھی واحد لَا شَرِيْکَ تھا"۔..... وہ "ہے" تو یہ بھی ہے۔

پیارے سامعین!

"کلمہ طیبہ" چار لفظوں کو جوڑ کر بنا لیا گیا ہے۔

لا — اللہ — الا — اللہ

پہلا حرفت کہو "لا" جس کے معنی ہیں "کچھ بھی نہیں"۔ لہذا پہلا کچھ بھی نہیں۔ دوسرا جوڑو "لا اللہ" — "اللہ نہیں ہے" گو یا کفر ہو گیا۔

تیسرا جوڑو "لا اللہ الا" — "اللہ نہیں ہے مگر" یہ مہمل ہو گیا۔

پہلا "لا" کچھ بھی نہیں۔ دوسرا "لا اللہ" — کفر ہو گیا

تیسرا "لا اللہ الا" مہمل ہو گیا۔ جب چوتھا "اللہ" ساتھ جوڑو

گئے۔ تو ایمان ہو جائے گا۔

لا اللہ الا اللہ — اب ایمان ہو گیا

علمائے کرام !

خدا تمہارے علم و فضل میں برکت عطا فرمائے۔ مجھ غریب شہر کی بات بھی سن لیا کرو۔

اسمِ جلال کی قسم جو اسلام میں کہلاتی ہے۔ اگر کوئی جھوٹی اٹھالے تو تقریباً گھر ہو جائے۔ اور اگر سچی اٹھالے تو تین روزے رکھے جب وہ درست ہو سکتا ہے۔ اتنی باعزت ہے قسمِ جلال ————— جس طرح بڑے سے بڑا چور مسلمانوں کی پنجائیت میں اگر کلمہ پڑھ کے کہدے۔

”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ“

”میں نے چوری نہیں کی“

لہذا مسلمان اس چور کو چھوڑ دیں گے۔ قسمِ جلال اٹھا کر جو کہہ رہا ہے اگر اب بھی نہیں مانیں گے تو ہم مسلمان نہیں رہیں گے۔

جس بات کا پورا یقین ہو جائے (وہ چاہے کلمہ میں داخل ہو یا نہ ہو اس جھگڑے میں نہ پڑو) وہ جب بیان کرو تو کلمہ پڑھ کے بیان کرو قسمِ جلال اٹھا کر بیان کرو تاکہ سُننے والا اگر نہ مانے تو کافر ہو جائے۔ لہذا ہمیں اتنا یقین ہے علیؑ کی ولایت کا۔ ہم یونہی نہیں کہہ دیتے بلکہ قسمِ جلال اٹھا کر اعتراف کرتے ہیں۔ مسلمان ہو تو ماننا پڑے گا۔ کعبہ میں کہلو۔ مسجد میں کہلو۔ منبر پر کہلو۔

”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ“ ”عَلِيٌّ وَرِثَةُ اللَّهِ“

سامعین !

ابراہیم بھی یہی کلمہ پڑھتے تھے۔ موسیٰ کے زمانے میں بھی یہی کلمہ تھا۔ ورنہ یہ تو محاورے کے طور پر مشہور ہو گیا ہے کہ ابراہیم کے زمانے میں یہ کلمہ تھا۔ ”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ“ (ابراہیم خلیل اللہ) ”یا موسیٰ کے زمانے میں یہ کلمہ تھا۔“ ”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ“ موسیٰ کلمہ اللہ۔ حالانکہ سرخسؒ کے زمانے میں کلمہ

تھا جو ہم پڑھ رہے ہیں۔۔۔۔۔ بہر نوع۔ سب انبیاء اُمتی تھے۔ اور اُمتی کو اپنا کلمہ پڑھوانے کا حق ہی نہیں ہے۔ لہذا انبیاءِ دہی کلمہ پڑھتے تھے جو ان کا بھی رسول تھا۔ اگر ان انبیاء پر بھی کوئی مشکل آن پڑتی تھی تو محمد سے کہتے۔ ”مشکل آئی ہے۔ ہماری مدد کرو“

لہذا محمد کے پاس جو مددگار تھا۔ وہی ان کی مدد بھی کیا کرتا تھا۔
 لطف آجائے گا نیت میں حب اللہ نے عام آواز دے دی۔ ”محمد کی اُمت آجائے“

مومن بھائیو! _____ دیکھنا کس شان سے تم وہاں جاؤ گے
 تم میں سے کسی کا ہاتھ ابراہیم کے ہاتھ میں ہو گا۔ کوئی موٹلے سے بانیں کرتا جا رہا ہو گا۔ کوئی یوسف کے گلے میں باہیں ڈالے چل رہا ہو گا۔ اس لئے کہ ہم سب پیر بھائی جو ہوئے۔ ایک ہی نبی کی اُمت جو ہوئے۔ ایک ہی رسول کے کلمہ کو جو ہوئے۔

سامعین! _____
 اگر آدم کھڑے ہوں رسول کے سامنے تو ان کا اور رسول کا کیا رشتہ ہو گا۔
 ”مومن“ _____ گویا آدم ”مومن“ ہیں۔ نوح ”مومن“ ہیں۔ ابراہیم ”مومن“ ہیں۔ موسیٰ ”مومن“ ہیں۔ عیسیٰ ”مومن“ ہیں۔ عرض ہر نبی ”مومن“ ہے۔ اور اگر سارے انبیاء اکٹھے ہو جائیں تو مومنین کہلائیں گے۔

بسے بھائیو! _____ یہاں تک تو میں نے کہہ دیا کہ ایک نبی ہو تو ہے مومن اور اگر سارے ”انبیاء“ مل جائیں تو ہیں ”مومنین“۔ اب آپ مجھے سوچ کر بتائیں کہ جس نبی کی اُمت میں یہ مومنین ہوں تو ان مومنین کا امیر المومنین ”کون ہو گا۔ جہاں آدم سے لیکر عیسیٰ تک مومنین ہوں گے وہاں امیر المومنین کون ہو گا؟ جسے آدم بھی تسلیم کر لیں۔ نوح بھی تسلیم کر لیں۔ اور ابراہیم بھی مان جائیں کہ ”یہ ہمارا امیر المومنین ہے“

بزرگانِ من !

”امیر المومنین کا سوال آج نیا نہیں پیدا ہوا بلکہ آئیہ میثاق کے فوراً بعد پیدا ہو گیا تھا کہ جب انبیاء مومنین ہیں تو امیر المومنین کون ہوگا؟“ رسولِ جواب میں یہی فرماتے۔ ”جس نے انبیاء کو میرا امت بنایا ہے اسی سے پوچھ کر بتاؤں گا“ ادھر رسول کے پاس پوچھنے کا ذریعہ جبرئیل تھا۔ ایک دن رسول نے جبرئیل سے کہا:-

”جبرئیل ! اللہ سے یہ پوچھ کر آنا کہ میرے بعد میری امت کا امیر المومنین کون ہوگا۔“

جبرئیل سداقتی پر پہنچا۔ اللہ نے پوچھا۔

”جبرئیل کیا بات ہے؟“

جبرئیل نے عرض کی ”خداوند! تیرا حبیب پوچھتا ہے کہ میرے بعد امیر المومنین کون ہوگا؟“

اللہ نے غصہ میں جواب دیا۔ ”جبرئیل ! ان معاملات میں تم دخل نہ دو۔ اپنی حیثیت میں رہو۔“

جبرئیل واپس زمین پر پہنچے۔ عرض کی

”یا رسول اللہ ! اللہ مجھے تو کچھ بتاتا ہی نہیں۔“

آخر رسول نے کہا ”خداوند! جبرئیل کے ذریعے تو بتاتا نہیں۔ لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں۔ مجھے بتانا پڑتا ہے۔ تو ہی بتا دے کہ امیر المومنین کون ہوگا؟“

اللہ نے کہا ”محمدؐ سنتے بھی ہو! ایسی باتیں ان ذرائع سے نہیں

پہنچائی جاتی۔ اگر پوچھنا ہی چاہتے ہو کہ امیر المومنین کون ہوگا۔

تو کسی رات تھوڑا سا دقت نکال کے ہمارے گھر آؤ وہاں تمہیں فرصت

میں بتایا جائے گا کہ امیر المومنین کون ہوگا۔ تم اس کا لہجہ پہچان لینا

اس کے ہاتھ پہچان لینا۔ اس کی گفتگو پہچان لینا۔ آؤ نا ہمارے پاس“

چنانچہ امیر المومنین پوچھنے کے لئے محمدؐ اللہ کے گھر تشریف لے گئے
گویا امیر المومنین پوچھنے جانا ہی محمدؐ کی معراج تھی — رسول پوچھ
کر واپس آئے۔ لوگوں نے پوچھا۔

”محمدؐ! پوچھ آئے؟“

فرمایا ”ہاں۔ پوچھ آیا“

”جسم سے گئے تھے یا خواب میں گئے تھے؟“

سامعین!

ہم پاکستان میں رہنے والے جاہل لوگ۔ ہمیں کیا معلوم کہ رسول گئے
تھے یا نہیں گئے تھے۔ ہم تو اُن ہی لوگوں سے پوچھیں گے جو گردِ پیش تھے
چنانچہ ایک بزرگ فرماتے ہیں ”بمعد جسم گئے تھے“ — اور
ایک خاتون کہہ رہی ہیں ”نہیں۔ گئے تو تھے مگر خواب میں گئے تھے“
اب وہ بھی صدیق — یہ بھی صدیقہ — ہم کس کی مانیں اور کس کی
زمانیں۔ آخر مجبور ہو کر رسول سے ہی پوچھتے ہیں۔ ”قبلہ! کیسے گئے تھے؟“
رسول نے کہا ”بھگڑے میں کیوں پڑتے ہو۔ تم خود سمجھ لو کہ میں کیسے گیا
تھا؟“ — دیکھو نا!

یہ معراج کی بات تو میں پھر بتاؤں گا کہ کیوں گیا تھا۔ اب صرف تمہارے
سمجھانے کو بتاتا ہوں کہ غماز جو ہے یہ مومن کی معراج ہے۔
ابے بتاؤ! یہ غماز بڑی روح سے پڑھتے ہو یا روح و جسم دونوں
ہوتے ہیں؟

اگر نماز ہوتی ہے نری روح سے تو معراج بھی نری روح
کی ہوئی تھی اور اگر روح و جسم دونوں اکٹھے ہوتے ہیں تو معراج
بھی روح و جسم دونوں سے ہوئی ہے۔
لوگوں نے پوچھا۔ ”آپؐ نے وہاں جا کر کیا کیا؟“

فرمایا: ”اللہ نے میرے وہاں جانے کی تاریخ نوٹ کر لی جس طرح
بڑے بڑے واقعات کی تاریخ لکھی جاتی ہے۔ عرش پر میرے
قدم گئے تو وہاں لکھ دیا گیا کہ ”یہ عرش محمد کے قدموں کی بدولت معنی ہو گیا“
بس بھائیو!

یادگار معراج کو اصطلاح میں ”مُعَلّٰی“ کہتے ہیں۔ چاہے وہ عرش مُعَلّٰی
ہو یا زمین پر کوئی مُعَلّٰی ہو۔ محمد کو معراج ہو گی عرش پر، عرش مُعَلّٰی
ہو گیا۔ اور بیٹے کو معراج ہو گی فرش پر۔ وہ مُعَلّٰی ہو گیا۔
گویا نانا کے قدموں نے عرش کو عرش مُعَلّٰی بنا دیا اور نواسے کے سجدوں
نے فرش کو کربلاء مُعَلّٰی بنا دیا۔

ایک روایت میں ہے کہ قیامت کے دن تمام زمین پارہ پارہ ہو جائے گی۔
لیکن کربلاء کی زمین بڑے آرام سے اٹھالی جائے گی۔ اصل مصلحت تو خدا جانتا ہے۔
یا معصومین جانتے ہیں۔ لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ زخمی کو بڑے آرام سے سٹریچر پر
لے جایا جاتا ہے تاکہ کوئی تکلیف نہ پہنچے۔

اللہ نے کہا، ”کربلا کے زخمیوں کو تکلیف نہ دو بلکہ آرام سے اٹھا لو“

عزاء دار سید الشہداء!

کربلا میں ایک سے ایک بڑھ کر زخمی ہے۔ میں کس کے زخموں کا ذکر
کروں؟۔ ماشاء اللہ تم صاحب اولاد ہو۔ خدا جانے تم میری بات
سن بھی سکو گے یا نہیں۔؟

دیکھو نا! جب آل محمد آمرت کی تلواروں سے نہ

کٹ سکے تو ان کے پروردہ مؤرخین نے اپنے زہر آلود قلم سے

آل محمد کا قتل کرنا شروع کر دیا۔ اور تاریخ میں لکھ دیا گیا کہ:-

اٹھارہ بنی ہاشم کربلا میں شہید کر دیئے گئے۔

”بنی ہاشم“ کا لفظ مسلمانوں نے ہمارے خیال کو ادھر ادھر کرنے

کے لئے لکھ دیا ہے۔ حالانکہ ”بنی ہاشم“ کی اولاد تو وہ بے شک تھے۔ ”بنی ہاشم“ تو بہت وسیع اولاد تھی۔ مگر کربلا میں جو اٹھارہ شہید ہوئے وہ صرف اٹھارہ آلے اچھے طالب تھے۔ گویا۔ بنی ہاشم کہہ کے ہمارے خیال کو ابی طالب سے ہٹایا جانا۔ کربلا میں حسین بھی فرمانے تھے۔ ”یہ میرے دادا کی اولاد ہیں۔“ آج ابی طالب کے اس فرمان کی تعمیل ہو رہی تھی کہ ایک دن بھتیجے محمدؐ کو بہت پریشان دیکھا تو گلے سے لگا کر فرمانے لگے۔

”محمدؐ! فکر نہ کر۔ گھبرا نہیں۔ پریشان نہ ہو۔ جب تجھ پر یا ترے دین پر کوئی خوف آئے گا تو ترے دین کے گرد میری اولاد کی لاشیں پڑی ہوئی ہوں گی۔“

مسلمانو!

انصاف چاہتا ہوں۔۔۔۔۔ بتاؤ۔ اللہ نے ابی طالب سے کتنا بڑا کام لیا ہے۔ یہ عجیب حادثہ ہے کہ دین اللہ کا پھیل گیا۔ کلمہ محمدؐ کا پڑھا گیا۔ اور کنبہ غریب ابی طالب کا کٹ گیا۔ بزرگ ہو! اگر کنبہ کے کٹ جانے پر بات ختم ہو جاتی تو شاید بات ہی ختم ہو جاتی۔ دیکھنا تو یہ ہے کہ۔۔

دین بچ گیا اللہ کا۔ کلمہ پڑھا گیا محمدؐ کا اور بہو بیٹیاں قید ہو گئیں غریب ابی طالب کی۔ کتنا بڑا کام لیا ہے اللہ نے ابی طالب سے۔

بہر نوع۔ اٹھارہ آلے ابی طالب کربلا میں شہید ہوئے۔ کسی کا کلیجہ زخمی ہو گیا کسی کی پیشانی زخمی ہو گئی۔ کسی کے بازو زخمی ہو گئے۔ کسی کا گلہ زخمی ہو گیا۔ مگر ایک زخمی ایسا بھی ہے جس کا پتہ نہیں چلتا کہ اس کو کہاں کہاں زخم آئے۔ تمام شہیدوں میں سب سے زیادہ نازک مزاج شہزادہ ”قاسم“ چونکہ بچپن میں ہی یتیم ہو گئے تھے لہذا یتیم بھتیجے کو حسینؑ نے اتنے لاڈ و پیار سے

پالا تھا کہ دیکھنے میں تیرہواں سال تھا مگر جب کھانا کھانے بیٹھتا تو ماں نوالے کھلایا کرتی تھی۔ بازیک سے بازیک لباس پہناتے تھے۔ تیسرے سال کے بچے کو حسین گود میں اٹھاتے تھے۔ کبھی دھوپ میں نہ نکھنے دیا۔ اکبر و اصغر کی اور بات تھی اور اس یتیم بھتیجے کی اور بات تھی۔ اتنا نازک مزاج شہزادہ میدان کی طرف جاتا رہا ہے۔ حسین نے گود میں لیکر گھوڑے پہ بٹھایا اور فرمایا:-

”بیٹا قاسم! جاؤ۔ خدا حافظ“

قاسم میدان جنگ کی طرف روانہ ہوئے مساتھ ساتھ قمر بنی ہاشم جناب عباس غازی میدان کے قریب تک چلتے رہے۔ قاسم کا جہاد شروع ہو گیا عباس ریت کے ٹیلے پہ کھڑے ہو کر شہزادے کو ہدایات دیتے رہے۔

”بیٹا! باگ سنبھال کے رکھنا۔“

”شہزادے! تلوار مضبوطی سے پکڑے رکھنا۔“

بہر نوع۔ شہزادہ لڑتا ہوا فوجوں کے بیچ میں چلا گیا۔ اور اس ہنگامہ دارالگیر میں گھوڑے سے گرا۔ قاسم کے گرنے کا انداز ہی کچھ اور تھا۔ ہر گرنے والے نے ماتم کو پکاسا ”مٹو لا! میں گر گیا“..... مگر قاسم کے بچپن کی ادا یہ تھی کہ جب یہ گرا ہے تو مٹو لا کہ نہیں پکارا بلکہ گرتے ہی کہا..... ”اماں۔“ میں گر گیا حسین لاش پہ پہنچے۔ بیٹا قاسم! مجھے معاف کرنا۔ میں ذرا دیر میں پہنچا ہوں۔

”بیٹا! تیری میت تو اٹھانے کے قابل نہیں“

امام دمان زیارت ناحیہ میں فرماتے ہیں:-

”میرا سلام ہو اس شہید پر جسکی داسنی طرف کی پسلیاں ٹوٹ کے بائیں طرف آگئیں اور بائیں طرف کی پسلیاں ٹوٹ کے دائیں طرف آگئیں۔“

گویا اتنا نازک شہزادہ زندگی ہی میں گھوڑوں کے سموں سے پامال ہو گیا۔ اماں نے لاش کے ٹکڑے عباس میں رکھے اور لاکھ گنغ شہیدان میں علی اکبر کی لاش کے ساتھ گھڑی رکھ دی اور دونوں لاشوں کے بیچ میں بیٹھے۔

ایک ہاتھ تاسم کی لاش پر اور ایک ہاتھ علی اکبر کی لاش پر رکھ کر آسمان کی طرف رخ کر کے حسین نے بلند آواز میں کہا۔ "و غربتاً"

"یا اللہ! میں غریب ہو گیا۔" میرا اکبر نہا نہ میرا تاسم ہا۔
سَامِعِین!

کربلا معلیٰ میں مہدی نانی ایک ذاکر تھے۔ وہ روزانہ حرم میں آتے اور صبح کی نماز کے بعد مٹولا کی ضریح کے پاس کھڑے ہو کر تھوڑی دیر کے لئے مجلس پڑھا کرتے۔ لوگ روتے رہتے۔ یہی گویا نماز کے بعد وہاں کا وظیفہ تھا۔ ایک دن مجلس میں انہوں نے یہ مضمون پڑھا کہ ————— جب تاسم کی لاش کے ٹکڑے اٹھا کر حسین گنج شہیداں میں لائے۔ ایک ہاتھ اکبر کی لاش پر اور ایک ہاتھ تاسم کی لاش کے ٹکڑوں پر رکھ کر حسین نے بلند آواز میں فرمایا:۔

"و غربتاً" "یا اللہ! میں غریب ہو گیا۔"

کربلا حرم۔ مہدی کا پڑھنا۔ صبح کا وقت۔ بڑا اگر یہ ہوا۔ اس کے بعد لوگ گھر چلے گئے اور مہدی بھی اپنے گھر چلا گیا۔ دوپہر کا کھانا کھانیکے بعد سو گیا۔ خواب میں کیا دیکھتا ہے کہ ایک بونقبہ پوش خاتون گھر میں آئی اور مہدی سے فرماتی ہیں۔

"شیخ مہدی! تو نے آج جو روایت حرم میں پڑھی ہے نا۔ پھر دوبارہ کبھی نہ پڑھنا۔"..... مہدی پوچھتا ہے "بی بی! کیا یہ روایت غلط ہے؟"

بی بی نے فرمایا "نہیں۔ صحیح ہے۔ مگر جب سے تم نے یہ روایت پڑھی ہے اس وقت سے میرا حسین بے ہوش پڑا ہے۔" اللہ ہماری مجلسوں کو قبول و منظور فرمائے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ
اللَّهُمَّ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ وَآلِ مُحَمَّدٍ

أَحْسَنُ الْقَصَصِ



خداوند عالم کی محبت شاعری کے بعد حضرات محمدؐ آل محمدؐ پر درود و سلام

محترم سامعین!

آج کے پُر آشوب زمانے میں جہاں آج کل کی نئی پودر دین کی اقدار سے بے گانہ ہوتی جا رہی ہے۔ ہمیں اس بات پر غور ہے کہ اب بھی ہمارے دل میں اور کچھ ہو یا نہ ہو مودت آل محمدؐ ضرور ہے۔ آل محمدؐ کی محبت نہ یزید ستیوں میں پڑھنے سے ملتی ہے۔ نہ کالجوں میں داخلے سے ملتی ہے، نہ کتابیں پڑھنے سے ملتی ہے اور نہ ہی دولت سے خریدی جاسکتی ہے بلکہ یہ وہ نعمت ہے جس کیلئے اللہ نے سورہ جمعہ میں فرمایا ہے:-

(”یہ اللہ کا فضل ہے کہ وہ جس طرف کو اس قیمتی شے کے قابل سمجھتا ہے اسے اس طرف میں رکھ دیا جاتا ہے“)

آل محمدؐ کی محبت چونکہ بڑی قیمتی شے ہے اس لئے اتنی ہی زیادہ اس کی حفاظت کی ضرورت ہے۔ چاروں طرف سے یلغار ہے اور یہ بہترین ہیرا ہمارے پاس ہے، لہٰذا ایسا نہ ہو کہ کوئی چور یا ڈاکو اس سے یہ قیمتی ہیرا چھین لے۔ اس لئے اس کی حفاظت کی بڑی ضرورت ہے۔

سامعین!

محبت کی نہیں جاتی بلکہ ہو جاتی ہے اور اگر محبت کی جائے تو وہ اظہار محبت ہے جسے ”نفاق“ کہتے ہیں۔ اب اگر پوچھو کہ محبت کیوں ہو جاتی ہے؟ اگر محبت کرنے والا ”کیڑا“ بنا دے تو سمجھو اسے محبت ہی نہیں ہے

ورنہ محبت والے کو ”کیڑے“ معلوم ہی نہیں ہوتا۔ ہر ایک کا اپنا دل ہے۔
 جدھر آگیا۔ آگیا۔ اس میں جھگڑنے کی کوئی بات ہی نہیں ہے۔ کسی کو تخت پر بیٹھنے
 والے سے محبت ہو گئی۔ کسی کو بوریا نشینوں سے محبت ہو گئی۔ کسی کو قید کرنے والوں
 سے محبت ہو گئی اور کسی کو قید ہونے والوں سے محبت ہو گئی گو یا جس کا دل جہاں
 مائل ہو گیا۔ محبت ہو گئی۔ محبت ہو جانے کے بعد محبت کرنے والے کو ہوش تک
 نہیں رہتا۔ چنانچہ عالم بے ہوشی میں ظہور محبت ہوتا ہے۔ مثلاً کپڑے پھٹ گئے۔
 گریبان چاک ہو گیا۔ دیکھنے والے ہنسنے لگے اور کہنے لگے ”یہ تو پاگل ہے، دیوانہ
 ہے“ گو یاد دہائی ہی کمال محبت ہے۔

میرے سامعین!

محبت کی قسمت میں دو چیزیں لازمی ہیں۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ اگر محبت ہوئی
 اور محبت نہ کرنے والوں کو محبت کرنے والے سے خلق ہو جاتی ہے۔ بلاوجہ کا
 اعتراض شروع ہو جاتا ہے جس طرح محبت کے ساتھ اگر ایک گھوڑا نکل جائے تو ہزاروں
 اعتراض کئے جاتے ہیں اور اگر ریس میں ہزاروں گھوڑے درڑتے ہوں تو کوئی نہیں چٹھا
 سامعینے! — اللہ جانے میں نے تو ریس دیکھی نہیں ہے۔
 مٹا ہے کہ دن میں بیس گھوڑے ایک لائن میں کھڑے کر دیئے جاتے
 ہیں اور ایک آدمی کے ہاتھ میں رد مال ہوتا ہے اور وہ کہتا ہے۔

”ایکے“ گھوڑے تیار ہو گئے

”دو“ اب انہوں نے پاؤں اٹھائیے

”تین“ وہ گھوڑے دوڑ پڑے۔

میں پوچھتا ہوں ”بات کیا ہے؟ تم نے کبھی پاتخ کہہ کے نہیں دوڑائے
 چار کہہ کے نہیں دوڑائے۔ جب بھی دوڑاتے ہو ”تین“ ہی کہہ کر
 دوڑاتے ہو۔ آخر اس عدد کی خصوصیت کیا ہے؟

بہر ذریعہ۔ محبت پہ اعتراضات ہوتے ہیں۔ اور محبت کرنے والے میدان

محبت میں اپنا سفر جاری رکھتے ہیں۔ پرانے زمانے کا قصبہ ہے جسے قرآن نے بھی احسن القصص قرار دیا ہے کہ جناب یوسفؑ سے زینحہ کو محبت ہو گئی۔ اب اس محبت میں رات بھر آپیں بھرتی ہے تو زینحہ پریشان ہے تو زینحہ!۔ مگر مصر کی رہنے والی ساری عورتیں کہہ رہی ہیں کہ ”زینحہ کو کیا ہو گیا ہے۔ زینحہ کو یوسفؑ سے محبت کیوں ہے؟“

اب اُن سے کوئی پوچھنے ”تہیں کیا تکلیف ہے“

بہر نزع۔ زینحہ بھی روزِ مستحیٰ کہ میری محبت پر اعتراف ہو رہا ہے۔ حاکمِ وقت تھی۔ غصہ تو بڑا آیا مگر اس نے کیا ”غصے سے کام نہیں چلے گا۔ پہلے ان اعتراف کرنے والوں کو گھر بلاؤ اور تبرکاتِ ان کے کھانے کا انتظام کرو اور جب وہ سب آجائیں تو پہلے انہیں کھلاؤ، پلاؤ۔ پھر اُن سے کہو ”آپ کو کیا اعتراف ہے؟“ اب وہ اپنا اعتراف بیان کریں گی۔ پھر جس سے آپ کو محبت ہے جن اداؤں کو آپ پسند کرتے ہیں۔ انہیں بھی دکھاؤ۔ پھر دیکھنا وہ محبت میں تمہارے ساتھ شامل ہوتی ہیں یا نہیں؟ چنانچہ زینحہ نے یہی طریقہ اختیار کیا۔ گھر میں دعوت کا انتظام کیا اور تمام اعتراف کرنے والی مصر کی عورتوں کو اکٹھا کر لیا۔ اُن کو کھلایا پلایا۔ آخر مصری تھیں۔ میٹھی میٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ جب وہ سب کھانا کھا چکیں تو زینحہ نے انہیں ایک ایک لیموں دے دیا اور ایک ایک چھری بھی ہاتھ میں پکڑا دی اور کہا۔

”دیکھو۔ اس چھری سے لیموں کو اس وقت کاٹنا جب یوسفؑ تمہارے سامنے آجائے“

اب وہ تمام عورتیں اس انتظار میں بیٹھی ہیں کہ یوسفؑ کب آتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد زینحہ نے ادھر سے اشارہ کیا اور ادھر مگرے کا پردہ اٹھا۔ یوسفؑ باہر نکلے۔ ایک دم بجلی چمکی اور چھریاں چل گئیں۔ یوسفؑ کو دیکھتی رہ گئیں اور بے ساختہ اُن کے منہ سے نکلا ”ہم غلطی پر تھیں۔ یوسفؑ واقعی محبت کرنے کے قابل ہے۔“

بہر نزع۔ یوسفؑ واپس چلے گئے۔ اور وہ عورتیں بھی اپنے اپنے گھروں میں

چلی گئیں۔ جب وہ گھر پہنچیں جب پتہ چلا کہ ہماری تو انگلیاں کٹ چکی ہیں۔
 ہم نے پوچھا ”عورتو! وہاں تمہیں کیوں نہ پتہ چلا کہ تمہاری انگلیاں کٹ چکی ہیں؟“
 وہ جواب میں کہتی ہیں ”محبت کے لگائے ہوئے زخموں کا پتہ ہی نہیں چلتا۔ یہ نرم
 دہ کسی ڈاکٹر کے محتاج ہوتے ہیں اور نہ ہی کسی طبیب کے محتاج ہوتے ہیں۔“
 میں کہتا ہوں ”مصر کی عورتو! تم خوش نصیب ہو۔ نہ ہوا ہمارے زمانے
 کا کوئی مفتی! در نہ فتویٰ لگا دیتا کہ اپنے جسم کو زخمی کرنا حرام ہے۔“
 مگر یہ پتہ نہیں کہ جمال محبت میں محو ہو کر اپنے بدن کو زخمی کر لینا ہی احسن القصص
 ہے۔ اللہ کی نظروں میں حسین ترین قصہ ہے۔
 سامعین!

اپنے اپنے یوسف کا اقبال ہے۔ کسی یوسف کا احسن اس حد کا ہے کہ وہ بذات
 خود سامنے آئے تو چند عورتوں کی انگلیاں کٹ جائیں اور کوئی یوسف اتنا حسین
 ہے کہ صرف اس کے تذکرے سے کروڑ ہا انسان اپنا جسم پھلنی کر دیتے ہیں۔ بہر نوع۔
 پر اپنا اپنا اقبال ہے۔

دوسری خاصیت یہ ہے کہ آپ کو جس سے محبت ہو جائے کبھی ایسا ہو سکتا
 ہی نہیں کہ آپ کو تو اس سے محبت ہو مگر اسے آپ سے محبت نہ ہو۔ اسے بھی لازماً
 آپ سے محبت ہوگی۔ محبت ہمیشہ طرین سے ہوتی ہے۔ غریب کو امیر سے محبت ہو
 جائے تو اسے بھی اتنی ہی محبت ہوگی۔ رعایا کو بادشاہ سے محبت ہو جائے تو اسے
 بھی اتنی ہی محبت ہوگی۔ ایک لدا کو قیصر سے محبت ہو جائے تو اسے بھی اتنی ہی محبت
 ہوگی۔ یہ اور بات ہے کہ اظہار نہ ہو سکتا ہو۔ مگر محبت ہوتی ہے۔ محبت کرنے والا۔
 آپ کی کسی زحمت کو بھی برداشت نہیں کرے گا۔ مگر شرط یہ ہے کہ
 ہو واقعی اور حقیقی محبت!

سامعین! مصیبت یہ بن گئی ہے کہ جس دنیا میں ہم ہیں
 اس میں بغیر کسی لالچ، طمع یا غرض کے کوئی محبت ہے ہی نہیں۔ ایسی

محبت تو صرف اظہار محبت ہے۔ مثلاً ہم کسی ٹیکسی میں بیٹھے۔ ڈرائیور
 "جی حضور، کہہ کر استقیال کرے گا۔ ہم آپ کے لئے کھڑے ہیں۔ ہم
 آپ کے نوکر ہیں۔ پانچ روپیہ لینا ہیں"

ہم نے کہا "بھئی، دو روپے لے لے"
 ڈرائیور کے تیور فوراً بدل جائیں گے۔ "آگے بڑھو میاں۔ کبھی ٹیکسی
 میں بیٹھا بھی ہے" اور اگر ہم نے حسبِ منشاء پیسے دے دیئے تو کہے گا
 "آپ حضور ہیں۔ آپ سرکار ہیں"

بہرِ نوع۔ ایسی محبت لالچ اور غرض کی محبت ہے جسے ہم غلطی سے محبت
 سمجھ بیٹھے۔

ایک ہوتی ہے "ڈر کی محبت" جس طرح ایک رعایا کو اپنے حاکم سے محبت
 ہوتی ہے۔ "جناب آپ جیسا حاکم تو کوئی آیا نہیں۔ آپ تو بڑے عادل ہیں۔
 ہم لوگ آپ کے بڑے اطاعت گزار ہیں۔" اور جب بدل گیا تو فوراً
 "کہہ دیا" اچھا ہوا۔ نامراد دفع ہو گیا۔ بڑا راشی تھا۔ ایسی محبت ڈر کی محبت ہے
 قیسری محبت ہے وقتی اور فوری محبت! جس طرح ریل کے ڈبے میں مسافروں
 کی آپس میں محبت ہو جاتی ہے۔ اور جب اپنا اپنا اسٹیشن آتا ہے تو ہر مسافر
 محبت کو ساتھ لیکر اترتا جاتا ہے۔ بعد میں یاد ہی نہیں رہتا کہ وہ کون تھا۔ گویا دوڑن
 سفر کی محبت بالکل غیر معتبر ہوتی ہے۔

لہذا ایسی محبتوں کا میں ذکر نہیں کرنا چاہتا۔ واقعی اور سچی محبت ہو تو
 کبھی ایسا ہو سکتا ہی نہیں کہ دوسرے کو بھی آپ سے محبت نہ ہو جائے۔ گویا محبوب
 جتنا ہی شریف ہو گا۔ اتنا ہی آپ کے چاہنے کی قدر کرے گا۔

میرے سامعین!

اگر واقعاً آلِ محمد سے ہیں محبت ہے تو آلِ محمد کو بھی ہم سے زیادہ
 ہم سے محبت ہے۔ ہم تو اپنی محبت کو ہی نہیں سکتے جتنی ہم سے کرتے ہیں۔ وہ

فرماتے ہیں ”ہمارے چاہنے والو! ہمیں تم سے بڑی محبت ہے۔ گویا دنیا کے پیر مرشد کی بات اور ہے اور ہمارے ان محبوب پیشواؤں کی بات اور ہے۔ دنیا آج چاہے تو آزما کے دیکھ لے بے پیر تو دنیا میں کوئی ہے ہی نہیں۔ ہر ایک لاکوئی نہ کوئی پیر مرشد ضرور ہے۔ جس طرح ایک شخص، پیر صاحب کی بیعت کرتا ہے ”پیر صاحب! آج سے آپ میرے پیر ہیں اور میں آپ کا مرید ہوں“ فرمائیے، میرے ذمہ کیا کام ہے؟“

پیر صاحب فرماتے ہیں ”تیرے ذمہ کام یہ ہے کہ جب تنخواہ ملا کرے تو اس کا اتنا حصہ مجھے دیا کرنا۔ جب میرے سلام کو آیا کرے تو اتنا نذرانہ لایا کرنا۔ مرید پوچھتا ہے ”پیر صاحب! کبھی میرے گھر میں تشریف لاؤ گے؟“

”ہاں آؤں گا۔ جب تیرے بیٹے کی شادی ہوگی یا تیرے گھر کوئی خوشی ہوگی۔ اور دیکھو! ایک کام تمہارے ذمہ اور ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ جب میلانام لیا کرے تو ”رحمۃ اللہ عنہ“ کہہ دیا کرنا کہ اللہ مجھ سے راضی ہو جائے۔“

اب مرید بیچارہ سوچتا ہے کہ پیر میں نے اس لئے بنایا تھا کہ اس کی ہزاروں خدمتیں کروں گا جس کی بدولت اللہ مجھ سے راضی ہوگا مگر مصیبت یہ بن گئی ہے کہ اپنے پیر سے اللہ کو راضی کرنا بھی مرید کے ذمہ پڑ گیا۔ بہر لوع۔ پیر صاحب نے کہہ دیا کہ میں جب آؤں گا جب تیرے گھر کوئی خوشی کی تقریب ہوگی۔ مگر میرے محبوب مرشدوں کو دیکھو! وہ ہر وقت اپنے چاہنے والوں کو نہیں بھولتے وہ تو یہ فرماتے ہیں ”ہمارے چاہنے والو! گھرانہ جانا ہم ہر وقت تمہارا لحاظ رکھتے ہیں۔ ادھر ہم عرض کرتے ہیں۔“

”مولا! ہم آپ کے چاہنے والے ہیں۔ ہمیں محبت کا تو پورا دعویٰ نہیں ہے مگر اتنا دعویٰ ضرور ہے کہ آپ کے دشمنوں سے ہمیں کوئی واسطہ نہیں۔ یہ امتحان آپ جب چاہیں ہم سے لے سکتے ہیں۔ لہذا ہم بھی چاہتے ہیں کہ آپ ہمارے گھر تشریف لائیں۔“

چنانچہ آل محمد فرماتے ہیں ”ہمارے چاہنے والے! ہم ضرور آئیں گے۔“

جب تیرے گھر فرشتی ہوگی جب بھی چاہے بلا لینا اور جب تجھ پر کوئی مشکل آپڑے تو جب بھی ہمیں بلا لینا۔ اور دیکھو! اگر تجھ میں بلانے کی طاقت نہیں رہے گی۔ تیرا نزع کا وقت ہوگا جو سخت مشکل ہوگا وہاں تیرے بن بلائے ہم آجائیں گے تیرے سرہانے آجائیں گے۔ نکل نہ کر گھبراہیں ہم ہر منزل پہ تیرا ساتھ دیں گے۔ کسی فرشتہ کی طاقت نہیں کہ ہمارے ہوتے ہوئے تجھ سے کچھ پوچھ جائے۔ یہ بات میرے موٹلانے کو ذک کے منبر پہ بیٹھ کر فرمائی تھی کہ:-

”اُس وقت تک کوئی مری نہیں سکتا جب تک میں سرہانے نہ آ جاؤں“

سامعین!

موٹلا جب یہ فرما چکے تو ہمدان کے رہنے والے حارث نامی آدمی نے سوال کیا ”مٹولا! وہ مرنے والا چاہے مومن ہو یا کافر؟“

فرمایا ”ہاں۔ میں ہر مرنے والے کے سرہانے آتا ہوں اور آکے کہتا ہوں ”سَلَامٌ عَلَيْكَ“۔ میں آگیا۔ تو نے ساری زندگی تکلیفیں اٹھائیں۔ لوگوں کے طعنے سنے۔ تجارت میں۔ ملازمت میں۔ ہر جگہ نقصان اٹھایا۔ مگر میرا دامن نہ چھوڑا میں بے وفا نہیں ہوں۔ اب میں آگیا ہوں۔ اب تو میرے ساتھ ہے اور میں تیرے ساتھ ہوں۔ چنانچہ میری اس بات سے مومن اتنا خوش ہوتا ہے کہ وہ اپنی جان بطور نذرانہ مجھے پیش کر دیتا ہے۔ لہذا میں مومن کو مرنے نہیں دیتا بلکہ اسے کہتا ہوں ”میرے چاہنے والے! میں نے تجھے حیاتِ جاوید بخش دی۔ اب تو میرے ساتھ رہے گا۔ اور جب میں منافق کے سرہانے آتا ہوں کہتا ہوں ”مجھے پہچانا۔ میں آیا ہوں۔ وہ نہیں آئے۔ ساری عمر مجھ سے باغی رہنے والے! اب بول کہاں جائے گا؟ بس میرا اتنا کہنا کہ وہ مرجاتا ہے۔“

پھر اس حارث ہمدانی نے پوچھا ”مٹولا! کیا مومن نہیں مرتا؟“ فرمایا ”نہیں۔ تم قبرستان میں جا کر دیکھو۔ جب میرے والا مرتا ہے تو اُسے قبر میں لٹا کر کہا جاتا ہے۔ ”سن اور سمجھ“

یہ کہیں مردوں سے کہا جاتا ہے ؟ بلکہ یہ تو ان سے کہا جاتا ہے جو زندہ ہوں ۔

حضور والا !

لطف یہ ہے کہ ساری زندگی تو عربی کا ایک حوت نہ سیکھا مگر مرتے ہی ایسے علامہ ہو گئے کہ عربی میں بات ہو رہی ہے ۔

”سن اور سمجھ“ اس لئے کہ مرتے دم اس کے سر ہانے علم کے شہر کا در کھل گیا تھا بہر نوع ۔ ہمارے پیشوا ہر مشکل میں ہمارا الحاح فرماتے ہیں ۔

سالمعین ! ————— بعض اوقات ہمیں غصہ بھی آ جاتا ہے

چونکہ ہمارے طرف تھوڑے ہیں اس لئے مولیٰ سے کہہ بیٹھتے ہیں ۔

”مولیٰ ! اپنے دشمنوں کے پکارنے پر نہ آیا کرو ۔ یہ نامراد ساری

زندگی تو ہمیں تنگ کرتے ہیں مگر جب مصیبت پڑتی ہے تو آپ کو

پکارتے ہیں ۔ لہذا آپ نہ آیا کریں ۔“

مولیٰ جواب میں فرماتے ہیں ”بیٹا ۔ صبر کرو ۔ دیکھو نا ! ہم نے کب

اعلان کیا ہے کہ ہم ”عیش کشا“ ہیں ؟ ہم نے کب کہا ہے کہ ہم

”راحت کشا“ ہیں ؟ ۔ راحت و عیش میں وہ جسے چاہیں بلالیں ۔

ہمارا تو اعلان ہی یہی ہے کہ ہم ”مشکل کشا“ ہیں گویا جس پر مشکل پڑ جائے

وہ ہمیں پکار لیا کرے ۔ ذرا انہیں بھی بلانے دو ۔ وہ بھی کیا یاد کریں گے

کہ کسی کو بلایا تھا ۔“

محترم سالمعین !

امیر المؤمنین کا فرمان تو آپ نے سن لیا ۔ اب ”مناقب شعرا“ کی ایک

روایت سماعت فرمائیے گا ۔

روایت میں ہے کہ جناب سیدہ طاہرہ فرماتی ہیں کہ امیر المؤمنین علی ابن ابی طالب

ہر مرنے والے کے سر ہانے اس لئے آتے ہیں کہ بحیثیت ”ولی اللہ“ ان کا یہ

ولایت میں شامل ہے ۔ لہذا وہ اپنے عہدے کے اعتبار سے تشریف

مرنے والے ! تجھے کوئی تکلیف تو نہیں ہے، تجھے کچھ اذیت تو نہیں ہے؟
 تو میرا محسن ہے۔ تو نے میرے بیٹے کی صف ماتم بچھائی ہے۔ اور جب ملک الموت
 آتا ہے تو وہ چالیس قدم کے فاصلے پر ٹھہر کر امیر المومنین سے عرض کرتا ہے۔
 "مٹو لا ! میں آگے نہیں آ سکتا۔ یہاں تو حضور مکرمہ عالم تشریف فرما ہیں۔
 میری کیا مجال جو میں قریب آ جاؤں، چنانچہ جناب سیدہ فرماتی ہیں "ملک الموت !
 تم آ سکتے ہو" ملک الموت سہما ہوا آتا ہے اور کہتا ہے۔

”بی بی! میں اس کی رُوح ختم کرنے آیا ہوں“

بی بی فرماتی ہیں "ہاں۔ ہمیں پتہ ہے کہ تم اس کی روح قبض کرنے آئے ہو۔"
 "بی بی! پھر میرے لئے کیا حکم ہے؟ اس کے دہن سے قبض کر لوں؟"
 آپ فرماتی ہیں "نہیں" دہن کو ہاتھ نہ لگانا۔ اس سے تو ہزاروں مرتبہ نکلا
 ہے۔ "ہائے حسنین" پھر ملک الموت پوچھتا ہے "بی بی! اس کے سینے
 سے اس کی روح قبض کر لوں؟"

بی بی فرماتی ہیں: "ملک الموت! پھر تو نے سینے کا نام لیا۔ دیکھتا نہیں کہ اس پر ماتم کا نشان ہے؟"

اب ملک الموت کہتا ہے "بی بی! اس کی آنکھوں سے" بس آنکھوں کا نام
 لینا تھا کہ بی بی کو جلال آگیا اور فرماتی ہیں "اس کی آنکھیں تو ہزاروں مرتبہ میں نے
 اپنے رومال سے صاف کی ہیں؟"

آخر ملک الموت حیران ہو کے پوچھتا ہے، "بی بی! ابھر میرے لئے کیا حکم ہے؟"
سیدہ طاہرہ فرماتی ہیں، "ملک الموت! تم جنت میں جاؤ۔ اور غلام و درخت
جو ہے، اس کا بھول لے آؤ"۔ چنانچہ ملک الموت بھول لانا ہے۔ اب بی بی فرماتی

ہیں۔ ”اِسے مرنے والے کو سنگھا دو“ گویا اس کی رُوح خوشبو بن کے اُس پھول میں سما جاتی ہے۔

اب سیدہ فرماتی ہیں ”ملک الموت! بے جاؤ اس پھول کو اور قیامت کے دن اسے میرے سامنے پیش کرنا کیونکہ میرے بیٹے کا عزا دار تھا۔“
بہرِ نوع ہر مشکل میں محمد وآل محمد تشریف لاتے ہیں اور ہماری نفرت فرماتے ہیں۔
حضرات گرامی!

قیامت کے روز ساری دنیا اکٹھی ہوگی۔ جہاں تک روایتوں میں موجود ہے کہ حکم ہوگا ”قیامت والو! سر جھکا کے آنکھیں بند کر دو“ چنانچہ سب آنکھیں بند کر لیں گے سر جھکالیں گے۔ سانس تک رُک جائے گی۔ لوگ ایک دوسرے سے پوچھیں گے ”کیا بات ہے؟“ فرشتے جواب دیں گے ”خاموش رہو۔“ خاتونِ قیامت تشریف لارہی ہیں، چنانچہ سیدہ طاہرہ کی سواری گزرے گی۔ انبیاء اولیاء سب سر جھکائے خاموشی سے کھڑے رہیں گے۔ بی بی عرش الہی پر پہنچ کر فرمائیں گی۔ ”خداوند! آج تیری عدالت کا دن ہے۔ میں زندگی میں دوسری دفعہ عدالت میں آئی ہوں۔ ایک دفعہ دنیا کی عدالت میں گئی تھی۔ آج تیری عدالت میں آئی ہوں۔ میرے اللہ! آج تجھ سے فریاد کرنے آئی ہوں کہ۔“
میرے گھر میں ایک دن میں بہتر قتل ہو گئے۔ میں نے کسی کو کچھ نہیں کہا۔ آج پہلی دفعہ میرا استغاثہ ہے، میری فریاد ہے۔“

ادھر سیدہ طاہرہ نے فریاد کی ادھر زلزلہ قیامت آگیا۔ روایت میں ہے کہ ابراہیم جیسا جلیل القدر پیغمبر قیامت کے خوف سے گھٹنوں کے بل کھڑا ہو جائیگا اتنی ہولناکی ہوگی۔ آخر تمام انبیاء درزتے ہوئے خاتمِ انبیاء کی خدمت میں حاضر ہوں گے۔

”محمد! خدا کے لئے ہماری خبر لیجئے۔ سیدہ نے شکایت کر دی ہے۔ اللہ کو حلال آگیا، چنانچہ رحمت اللعالمین اپنی زریت کے ساتھ تشریف لائیں گے۔“

سأ مصین !

سیدہ! تمہارا مقدمہ بجائے جس کا فیصلہ آج ہم سنائیں گے۔ مگر مثل کو مکمل کرنے کے لئے ہم چاہتے ہیں کہ کسی چشم دید گواہ کا بیان قلمبند کیا جائے۔ ہے کوئی تمہارے اس مقدمے کا چشم دید گواہ؟

بی بی فرمائی گی " خداوند! اگر میرے بہتر شہیدوں کا آئینی گواہ چاہتا ہے تو چشم دید گواہ ہے میری بیٹی زینب - چنانچہ عدالت الہی سے تمام حورانِ جنت کو حکم ہو گا کہ شام میں زینب کے پاس جاؤ اور کہو کہ اماں نے عدالت میں مقدمہ کیا ہے اور تجھے گواہ کر کے بلایا ہے " چنانچہ حواریں جا بیٹھیں گی - اور زینب اسی طرح عدالت الہی میں تشریف لائیں گے جس طرح کوفہ و شام کے بازار میں آئی تھیں - سر کھلا ہوا - ہاتھ بندھے ہوئے اور زین العابدین جہار پکڑے ہوئے قیامت میں منادی ہو گی -

”لوگو! ہسٹ جاؤ۔ زینبٹ آرہی ہے“ ادھر سب دمور کھڑے ہو کر آواز دیں
 ”ہائے حسین، زینبٹ اپنی سواری روک لے گی اور بھائی عباس کو حکم دے گی۔“

”عباس بھائی! یہ میرے حبیبن کے ماتم دار ہیں۔ ان سبکو میرے سامنے لاؤ میں انکی زیارت کرنا چاہتی ہوں۔ چنانچہ ہم بی بی کے قریب ایک حلقہ میں کھڑے ہو جاہیں گے جناب عباس غازی اپنے علم کا پھر یہ کھول دیں گے۔ ”ہائے حسین“ کی آوازیں بلند ہو جاہیں گی۔ ماتم شبیر شروع ہو جائے گا۔ پھر اپنا تک ایک نئی آواز آئے گی۔ ”بس۔ قیامت ہو گئی۔ ماتم داروں کو ایک طرف کر دو اور تماشا میٹوں کو ایک طرف کر دو۔“

اللہ جس مودۃ محمد و آل محمد عطا فرمائے

رَبَّنَا اقْتُلْ مَنَازِلَكَ إِنَّكَ السَّيُّعُ الْعَلِيمُ اللَّهُمَّ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ وَآلِ مُحَمَّدٍ

حَسْبُكَ اِسْلَامٌ



خداوند عالم کی حمد و ثناء کے بعد حضرات محمد و آل محمد پر درود و سلام
سامعین کرام !

تم ایک ایسے دین کے ماننے والے ہو، تم ایک ایسے طریقے پہ چلنے والے ہو، تم
ایک ایسے ضابطے کے پابند ہو۔ تمہارا ایک ایسا آئین ہے، تمہارا ایک ایسا دستور ہے
تمہارا ایک ایسا نظام ہے۔ تم ایک ایسے آئین میں رہتے ہو کہ دنیا بھر کے آئین جو
آئینہ دکھا کے شرمناک جاتے ہیں۔ دنیا بھر کے دستور جس کے سامنے حسب دستور
خاموش ہو جاتے ہیں۔ دنیا بھر کے ضابطے جہاں آ کے ضبط ہو جاتے ہیں اور
دنیا بھر کے عقل مندوں کو جہاں آ کے ضبط ہو جاتا ہے۔ تم ایسے دین کے ماننے
والے ہو۔

تمہارا دین ! اللہ کا پہنچا یا ہوا آخری دین۔ خدا کا کیا ہوا آخری کلام
اللہ کا بھیجا ہوا آخری پیغام۔ خدا کی کی ہوئی آخری گفتگو۔ اللہ کی دی
ہوئی آخری کتاب۔ اللہ کا کیا ہوا آخری خطاب

لہذا تمہارا دین وہ دین ہے کہ اس کے بعد اللہ خاموش ہو گیا۔ کلام
کر کے جس کے بعد کلام ختم کر دیا۔ ایسے اچھے دین کے تم ماننے والے ہو
تمہارے دین کا نام ہے اسلام۔ تمہارا کام ہے دنیا کا انتظام۔ تمہاری
ہستی ہے عالم کا انتظام۔ تم ہوساری کائنات کے امام۔ دنیا کی ہر
شے ہے تمہاری غلام۔ تمہارا ایسا عجیب و غریب بے مثل و عزیز دین ہے
اسلام۔

محترم سامعین !

اگرچہ اسلام کی زندگی بڑی طویل ہے۔ آدم علیہ السلام نہ تھے اسلام تھا کائنات کے ذرے نہ تھے اسلام تھا۔ گویا اسلام کی زندگی بڑی طویل ہے مگر ہمارے سامنے اس آفتاب کے ساتھ یہ اسلام عرب کی سرزمین سے آیا۔ مطلع عرب سے ایک آفتاب طلوع ہوا اور اپنی کرنیں عالم میں پہنچا میں اسکی شعاؤں نے قریب کی گھاٹیاں جگمگا میں ہندستان کے گنگا اور جتنا کو سیرب کیا۔ اس نے ریگستانوں کو سرسبز کیا۔ اس نے بنجر وں کو آباد کیا۔ اس نے انسان کے نبھے ہوئے دل میں ایک نخلستان تازہ کیا۔ گویا عرب کی سرزمین سے ایک آفتاب ابھرا۔ ایسا آفتاب کہ بے پڑھے لکھے جسے بے پڑھا کہتے ہیں۔ ان پڑھ جسے ان پڑھ کہتے ہیں اور اللہ جسے اُمی کہتا ہے۔ آج ہم اس آفتاب کا کلمہ پڑھتے ہیں اُسکے ہم غلام ہیں۔ اس کے نام کی بدولت ہم زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے اور محمد رسول اللہ اس کا نام ہے۔ بہر نزع۔ تم ایک دین کے ماننے والے ہو۔ اور وہ دین ہے اسلام جس میں سلامتی ہی سلامتی ہے۔ دنیا کی ہر شے اس میں موجود ہے گویا وہ تمہاری اپنی پسند ہے

دیکھو نا ! بڈھا، جوان، بچہ، کوئی ایسا ہے جسے پھول پسند نہ ہو۔ پھول ایسی چیز ہے ناجس کو سب پسند کرتے ہیں۔ کیوں بچو ! پھول پسند ہے ؟ جواؤ ! پھول پسند ہے ؟ جواؤ ! اور بچوں کے بعد میں سفید داڑھی والے بابا سے پوچھتا ہوں "بابا ! پھول پسند ہے ؟" — ادھر بابا ہے کہ پھول نہیں سماتا۔ گویا ہر ایک کو پھول پسند ہے۔ اب ہر ایک سے پوچھو کہ کونسا پھول پسند ہے ؟ جتنے جوان ہیں وہ کہیں گے "جناب۔ میں تو وہ پھول پسند ہیں۔ یا تو موتیا کا پھول جس کی خوشبو شباب میں لطف پیدا کرتی ہے یا زنگس کا پھول جس کو دیکھنے میں جوانی کا سوا آتا ہے۔ یہ تو تو جوان کی پسند ہے۔ اب ذرا بابا سے پوچھو "بابا ! تمہیں کون سا پھول پسند ہے ؟"

بابا جواب میں کہے گا "مجھے گلاب کا پھول پسند ہے۔ کیونکہ میں اس کا گلقد

بناتا ہوں۔ لہذا مجھے پسند ہے۔ اس کے بعد میں نے ایک بیچارے بھوکے سے پوچھا ”بھئی تجھے کون سا پھول پسند ہے؟“

بولتا ”بھئی، مجھے تو گوبھی کا پھول پسند ہے۔ پیٹ بھر جاتا ہے۔“

بہر نوع۔ ہر ایک کی اپنی اپنی پسند ہے۔ اس میں جھگڑنے کی کیا بات ہے۔ جسے آپ چاہیں پسند کریں۔ جسے میں چاہوں پسند کر دوں۔ کوئی جھگڑے کی بات تو نہیں۔ جسے انبیاء چاہیں انبیاء پسند کر لیں۔ جسے اولیاء چاہیں اولیاء پسند کر لیں۔ اور جسے مومنین چاہیں مومنین پسند کر لیں۔ جسے بندے چاہیں۔ بندے پسند کر لیں اور جسے اللہ چاہے اللہ پسند کر لے۔ اس میں جھگڑے کی کیا بات ہے۔ جو جس کو پسند آ جائے سبحان اللہ۔ بہر کیف ہمارا دین اسلام ہے جس میں دنیا کی ہر شے، ہر پسند موجود ہے۔ اس دین کا تعارف کروانے کے لئے اللہ نے محمدؐ کا انتخاب فرمایا۔ اور ہادی معظم نے ہمیں ہدایت کی۔ ہم بت پرست تھے۔ خدا پرست ہو گئے۔ ہم جاہل تھے۔ عالم ہو گئے۔ ہم گمراہ تھے۔ پاسبان بن گئے۔ ہم بے ایمان تھے، صاحب ایمان بن گئے۔ ہمیں کچھ نہ آتا تھا، ہم سب کچھ جاننے لگے۔ ہم شاگرد بھی نہ تھے استاد بن گئے۔ گویا ہم نے عالم کی زمام اپنے ہاتھ میں سنبھال لی۔ دنیا کی حکومتیں کو الٹ پلٹ کیا۔ فیصلہ کسریٰ کے محل ہم نے پیروں تلے روند دیئے۔ ایران کے دجلہ و فرات میں ہم نے ٹھوڑے دوڑا دیئے۔ بحر ظلمات ہم سے کانپنے لگے۔ زمین و آسمان ہم سے ڈرنے لگے۔ فرشتے ہمیں سجدہ کرنے لگے۔ ادریہ اٹلی کے بتائے ہوئے علوم کی طاقت ہے کہ آج کا انسان چاند پر کوند پھینک رہا ہے یہ کچھ اسی کی بتائی ہوئی باتیں ہیں۔ اب اسی بتانے والے نے ہمیں یہ بھی بتا دیا کہ دین اسلام ہے۔

اب اسلام کے بتانے والے نے اسلام کو پالنا شروع کیا۔ اللہ نے اس کے ذمہ یہ لگا دیا کہ دو چیزوں کو ساتھ ساتھ پالو۔ ایک دین ہے جسے اسلام کہتے ہیں ایک دین پناہ ہے جسے حسین کہتے ہیں۔ ”دین کو بھی پالنا اور دین پناہ کو بھی پالنا“

چنانچہ محمدؐ نے پانا شروع کیا اور پالنے کا انداز یہ تھا کہ دین محمدؐ کے سینے میں پل رہا تھا اور دین پناہ محمدؐ کے سینے پہ پل رہا تھا۔ محمدؐ کے منہ سے الفاظ نکلتے تو وہ دین کی خوراک بنتے اور زبان محمدؐ سے جو دودھ نکلتا وہ دین پناہ کی خوراک بنتا۔ گویا دین اور دین پناہ ایک ہی گھر میں پیدا ہوئے۔ ایک ہی باپ نے انہیں پرورش کیا۔ ایک ہی خاندان میں پلے اور جب جوان ہوئے تو دین کا نام ہو گیا اسلام اور دین پناہ کا نام ہو گیا حسینؑ گویا حسینؑ اور اسلام ایک گھر میں پیدا ہوئے۔ ایک ساتھ پلے۔ ایک ساتھ بڑھے۔ ایک ساتھ پروان چڑھے اور ایک ساتھ کھیلے۔

سامعین!

حسینؑ اور اسلام کے کھیلنے کا نہیں ایک قصہ سنا دوں۔
ایک دن رسولؐ کی مسجد میں اسلام تھا۔ اور رسولؐ کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ رسولؐ نماز پڑھ رہے تھے۔ یہ اسلام کا کھیل تھا۔ رسولؐ سجدے میں گئے اسلام بھی سجدے میں تھا۔ اتنے میں اسلام نے اپنے بچپن کے ساتھی کو آتے دیکھا دیکھ کر اسلام چل گیا۔ ”آؤ حسینؑ! کھیلیں“ چنانچہ حسینؑ آ کے رسولؐ کی ٹہنی پر بیٹھ گیا اب دونوں ساتھیوں نے کھیلنا شروع کر دیا۔ حسینؑ اور اسلام سجدے میں ہیں۔ دونوں اپنے اپنے کام میں مشغول ہیں۔ ادھر کھیل ختم ہوا ادھر حسینؑ اٹھ کر گھر چلے گئے۔

”اماں سلام“

”بیٹا! کہاں گئے تھے؟“

”اماں! مسجد میں گیا تھا۔ وہاں اسلام اور میرے نانا تھے“

”حسینؑ! پھر تم نے کیا کیا؟“

”اماں! میں اسلام کے ساتھ مل کے نانا سے کھیلتا رہا۔ نانا میری ناز بڑاری

کرتے رہے“

”بیٹا! وہ کیسے؟“

”اماں! نانا سجدے میں کرتے رہے اور مجھے بھی کر رہ بٹھائے رکھا“

”بیٹا! آئندہ ایسا کھیل نہ کھیلنا تمہارے نانا کو تکلیف ہوئی ہوگی۔“
 بس یہ سنکر حسینؑ کو جو شش آگیا اور پورے بچپن کے لہجہ میں فرماتا ہے۔
 ”اتاسے!..... میری بات سن۔ اگر میرے کمر پہ بیٹھنے سے نانا کو
 تکلیف ہوئی ہے تو میں تیرے دُودھ کی قسم کھاتا ہوں کہ اگر سجدہ کا
 بدلہ نہ اتار دوں تو دُودھ نہ بخشے گا۔ اور اتاسے سن! نانا نے سجدے
 سے سڑاٹھا تو لویا تھا چاہے دیر سے اٹھا تھا۔ مگر میں تجھ سے وعدہ کرتا
 ہوں کہ جب میں نے سجدے میں سر رکھ دیا۔ تو خود نہیں اٹھاؤں گا۔
 قاتل اٹھا کر لے جائے تو لے جائے۔ میں نہیں اٹھاؤں گا۔“

بزرگانِ من!

جناب رسالتؐ کی رحلت کے بعد حسینؑ بھی یتیم۔ اسلام بھی یتیم۔
 رسولؐ کے گھر والے اسلام کو پال رہے تھے اور حسینؑ کو بھی پال رہے تھے۔ کچھ عرصہ
 اتفاق ایسا بنا کہ اسلام مدینہ سے چل کر شام میں پہنچا اور شام کے راجہ نے اسلام کو
 جھوٹے فتوے، جھوٹی حدیثیں اور ملوکیت کی زہر پلا دی۔ اسلام کا سارا بدن زخمی
 ہو گیا اور حبيب بالکل زخمی ہو کے مرنے لگا تو اسلام نے آواز دی۔

”مددگار! میں مر رہا ہوں۔ کوئی ہے جو مجھے بچالے؟“

اسلام کی یہ آواز مدینہ میں پہنچی اور حسینؑ نے سن لی۔ فرمایا:

”یہ کون ہیں مدد کے لئے پکار رہا ہے؟“

اسلام نے عرض کی ”حسینؑ! مجھے بچالو۔ میں مر رہا ہوں مجھے زیرِ پیت نامی
 بیماری چٹ گئی ہے۔“ حسینؑ نے کہا ”اسلام! فکر نہ کر۔ پردہ نہ کر
 میں تیرا علاج کروں گا۔“ حسینؑ اٹھے۔ سیدھے گھر میں گئے۔ بہن کو دیکھا اور فرمایا۔

”زینب! سنستی بھی ہو۔ آج اسلام نے ہمیں مدد کے لئے پکارا ہے۔ ہم اس کا
 علاج کرنا چاہتے ہیں۔ زینب! تم میرے ساتھ چلو۔ ہم دونوں بہن بھائی مل کے
 علاج کریں گے!“

اور بہن کو دیکھو! ————— "اگر اسلام کو خون کی ضرورت پڑی تو میں جیسا کر دنگا۔
اور اگر پٹی باندھنے کی ضرورت پڑی تو تنہا ہی چادر کام آئے گی۔ چلو دونوں بہن بھائی مل کے
اسلام کا علاج کریں!۔
حضور والا!۔

دونوں بہن بھائی چل پڑے۔ جتنی مناسب دوا میں تھیں حسین نے سب ساتھ
لے لیں۔ اور کربلا کے جنگل میں جا پہنچے۔ دیکھا کہ اسلام کو ہزاروں کپڑے چٹے ہوئے
ہیں۔ بس طبیب اعظم نے وہیں ڈیرے لگا دیئے۔ دو محرم سے لیکر سانویں تک اپنی
دواؤں کو ٹھیک کرتا رہا۔ ساتویں سے اتنا مشغول ہوا کہ نہ کھانے کی فرصت رہی نہ پینے
کا ہوش رہا۔ آخر دسویں کی رات کو اندھیرا کر کے اپنے سامنے جو ناقص دوا میں تھیں
وہ نکال دیں۔ اور جو قابل تھیں وہ رہنے دیں۔ صبح کو اسلام کا علاج شروع ہو گیا
حسین نے کہا "بہن! یوں کرو۔ تم گھر میں بیٹھو، میں باہر بیٹھتا ہوں۔ میں باہر سے
آواز دوں گا۔ اور تم مجھے وہ دوا بھیجی رہنا، چنانچہ بہن خیمے کے اندر بیٹھ گئی اور
بھائی خیمے سے باہر۔ تھوڑی دیر بعد حسین نے آواز دی۔
"زینب! مجھے اکبر چاہیے! زینب نے سجا کر باہر بھیج دیا۔ تھوڑی بعد
پھر آواز آئی۔

"بہن! مجھے قاسم چاہیے" زینب نے سجا کر بھیج دیا۔ گویا یہ دوا کی شیشیا
تھیں جو حسین استعمال کر رہا تھا۔ دوا اسلام کو پلا دیتا تھا اور خالی شیشی جا کے اٹھلاتا
تھا۔ حسین نے جب ستر دوا میں اسلام کو پلا دیں تو اسلام بالکل تندرست ہو گیا۔
اسلام تروتازہ ہو گیا۔ حسین گھر آئے۔

"بہن! مبارک"

"حسین! خیر مبارک"

"بہن میری ساری دوا میں کام آگئیں۔ اسلام بالکل ٹھیک ہو گیا" مگر مجھے
یہ ڈر ہے کہ اسلام کو کل کوئی اور نہ مار دے لہذا میں اب اسلام کو تھوڑا

سا آپ حیات نہ پلا دوں تاکہ وہ کبھی مرنے نہ پائے۔
 زینب نے کہا، "حسین! میرے پاس تو درہی زمرہ تھے جو ختم ہو گئے۔"
 قائم کی ماں ہتھارے پاس؟
 "مولا! حیرے پاس تو ایک ہی لعل تھا۔ ختم ہو گیا۔"
 اکبر کی ماں ہتھارے پاس؟

"حسین! میرے پاس تو ایک ہی شب چراغ تھا۔ ختم ہو گیا۔"
 چنانچہ جب کہیں سے آپ حیات کی آواز نہ آئی تو کوٹنے میں سے ایک آواز
 آئی۔ "حسین! آپ حیات کی ایک چھوٹی سی شیشی میرے پاس ہے۔"
 حسین! تیرے اسلام کے کام آئے تو لے جاؤ۔
 چنانچہ حسین آپ حیات کی شیشی کے قریب پہنچے۔ گود میں لیا۔ دو قدم چلے
 سامنے رباب آگئی۔

"حسین! یہ بچہ مجھے واپس کرو۔"
 رباب اپنے بچہ کو لیکر خیمے میں آگئی۔ تھوڑی دیر بعد اصغر کو گود میں اٹھا
 سکینے کی انگلی پکڑے رباب خیمے سے باہر نکلی اور عرض کی
 "حسین! کرسی پر بیٹھو۔ زینب! تم بھی سامنے کرسی پر بیٹھو۔" جب دونوں
 بہن بھائی کرسیوں پر بیٹھ گئے تو رباب سامنے آکھڑی ہوئی اور عرض کی۔
 "فاطمہ کے بیٹے اور فاطمہ کی بیٹی! میں فیروز خانہ کی ہوں۔ تمہارے خاندان نے
 مجھے یہ شرف بخشا اور خدا نے مجھے یہ تحفہ دیئے۔ ایک سکینہ، ایک اصغر۔"
 مجھے پتہ ہے کہ تھوڑی دیر میں بیوہ ہو جاؤ گی۔ اور تمہاری امانت کی حفاظت
 نہیں کر سکوں گی۔ لہذا میں ابھی تمہاری امانت تمہارے سپرد کرتی ہوں۔
 رباب نے یہ کہہ کے سکینہ، زینب کی گود میں بٹھادی اور اصغر حسین کی گود میں
 اور اتنا فرمایا۔

"بیٹی سکینہ! تو جانے اور زینب جانے۔ بیٹا اصغر! تو جانے اور حسین جانے۔"

بس بھائیو!

زینب نے سکیڑ کو سینے سے لگایا اور حسین نے اصغر کو ہاتھوں پر اٹھالیا۔
 مولا ابھی دروازے تک پہنچے ہی تھے کہ رباب نے آواز دی "حسین! ذرا ٹھہرنا"
 حسین ٹھہرے۔ رباب بچی۔ اصغر کو ہاتھوں پر اٹھایا اور اتنا فرمایا۔
 "علی اصغر بیٹا! تو محبت خدا کا پوتا ہے۔ تو فاطمہ کا پوتا ہے میں فیضان
 کی ہوں میرے لعل میدان میں جا کے میرے دودھ کو بدنام نہ کرنا"
 میرے لعل! میں دروازے میں کھڑی تمہارا جہاد دیکھوں گی۔
 جاد میرے لعل! خدا حافظ"

ادھر رباب علی اصغر سے یکہر ہی تھیں ادھر بچہ بول تو سکتا نہیں تھا آنکھوں آنکھوں
 میں کہہ رہا تھا۔

"اماں! فکر نہ کر۔ ذرا مجھے میدان میں جلتے دو۔ اگر دشمن سے نہ کھلا دوں

کہ میں جید کرکار کا پوتا ہوں تو مجھے دودھ نہ بخشنا"

سامعین! حسین، اصغر کو ہاتھوں پر اٹھائے ایک ٹیلے پر کھڑے ہو گئے۔
 اُدھر سے تیر چلا ادھر سے رباب نے خیمے کے دروازے سے دیکھا اور سمجھ گئی کہ اصغر آرام سے
 لیٹا ہے گا تو تیرا اصغر کے اوپر سے گذر کر حسین کو لگ جائیگا چنانچہ فوراً وہیں سے آواز دی۔
 "اصغر بیٹا! ہوشیار۔ حسین کو تیر نہ لگنے پائے" فتعلبا لعنئی علی ید یہ
 اصغر بیٹا تھا اٹھ کے بیٹھ گیا۔ تیر لگے پر لگا اور اصغر تیر کھاتے ہی ماتے کی طرف دیکھ
 کے مسکرایا گویا کہ ہا تھا۔ "اماں! اب تو خوش ہے نا؟

حسین نے آپ حیات چلے میں لیا۔ کچھ سلام کے کام آیا۔ کچھ چہرے پہ مل لیا۔
 اور غالی شیشی کو دفن کر دیا اور قیامت تک کے لئے اسلام کو زندہ کر دیا۔

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ط

نتیجہ سی قبر کھود کے اصغر کو گاڑ کے
 شبیر اٹھ کھڑے ہوئے دامن کو جھاڑ کے

سَيِّدُ السَّاجِدِينَ

دمشق کا راجہ ظلم و استبداد اور ملوکیت کے تخت پر شراب کے نشے میں چور بیٹھا تھا۔ ہزاروں لاکھوں ذمہ داران مذہب اُسے جی حضور اہی سرکار کہہ رہے ہیں۔ ہزاروں تقدسین دین اپنی ریش سے وہاں جاڑوب کشتی کر رہے ہیں۔ لاکھوں محدثین و مقررین حکومت کی چوکھٹ کے پائے پکڑے ہوئے ہیں اور علی ابن الحسین ہاتھوں میں تھکڑی، پاؤں میں بٹری اور گلے میں خاردار طوق پہنے سامنے کھڑا ہے۔ بچے دم بخود ہیں۔ محمد کی بیٹیاں اور علی کی بیویاں عالم سکتے ہیں کہ اچانک تخت یزیدیت پہ بیٹھنے والا ایک سفیر (حسین کی چھوٹی بچی کی طرف اشارہ کر کے) یزید سے یہ کہتا ہے:

”یزید! جنگ میں قید ہو کر جو یہ لڑکیاں آئی ہیں ان میں سے اس بچی کو

مجھے کنیزی میں دے دے۔“

اُدھر شانی کی یہ بات سن کر یزید نے بچی کی طرف دیکھا اور دھڑپائی نے ”ہائے“ کہہ کھائی کی طرف دیکھا اور کہا۔

”بھائی جان! یہ کیا ہونے لگا؟“

”اما ابھی خاموش ہی تھے کہ علی کی بیٹی آگے بڑھی اور فرمایا۔

”یزید! خبردار۔ ایسی بیہودہ بات نہ کر۔ ہم کنیز نہیں ہو سکتے۔“

یزید نے کہا۔ ”قی ز می! مجھے اختیار ہے۔ میں بادشاہ ہوں۔ میں اگر اس بچی کو دے دوں تو تم کیا کرو گے؟“ بس یزید کا یہ کہنا تھا کہ امام آگے بڑھے اور فرمایا۔

”یزید! اسیں جلال نہ دلوا۔ خبردار! میری بچو بچی کے سامنے سخت بات نہ کرنا۔“

اب جو یہ رد و قدر ہونے لگی نو شانی آگے بڑھا اور کہتا ہے۔

”قید یو! تہیو معمولی سی بات پر غصہ آگیا۔“

امام نے فرمایا، شامی! تجھے پتہ نہیں کہ ہم کون ہیں اور جس رطلی کو تو کیزی میں مانگ رہا ہے یہ کون ہے؟

شامی پوچھتا ہے، "قیدی اتم ہی بتاؤ کہ تم کون ہو؟"
 امام نے فرمایا، شامی! جس بچی کو تو مانگ رہا ہے یہ فاطمہ کی پوتی ہے جس وقت امام نے فرمایا کہ یہ "فاطمہ کی پوتی ہے" تو شامی گھبرا کر نرگس سے پوچھنے لگا۔
 "کیوں نرگس! کیا واقعی فاطمہ کی پوتی ہے؟"

نرگس خاموش رہا۔ شامی دو قدم پیچھے ہٹا۔ اپنی کمرے خنجر نکال کر اپنا ہاتھ کاٹا جس ہاتھ سے اشارہ کیا تھا۔ پھر کٹا ہوا ہاتھ اپنے دوسرے ہاتھ میں لیا اور کہا۔
 "سیدہ کی پوتی! میں نے اس ہاتھ سے تیری طرف اشارہ کیا تھا لہذا میں نے اس ہاتھ کو کاٹ دیا۔"

شہزادی! آپ کو اپنے جد کی قسم مجھے معاف کر دیجئے۔ مجھے پتہ نہ تھا کہ تم کون ہو؟

نرگس نرگس کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا، "اللہ یَعْلَمُ حَيْثُ مِنْ يَشَارُ رِسَالَةَ"
 اور امام قبلہ کی طرف منکر کے سجدہ میں گر گیا۔
 "سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلَى۔ يَا لَلَّهِ! تیرا شکر ہے کہ محمد کے گھرانے کی عزت بچی۔"

شہر دمشق میں زلزلہ آیا اور شامی خود راوی ہے کہ ہم نے ایک آواز سنی کہ
 کوئی کہہ رہا تھا، "ارفع رَسْلَكَ اَنْتَ سَيِّدُ السَّاجِدِينَ"
 پس اپنا سر اٹھالے اس عالم میں سجدہ کرنے والے! تو سارے سجدوں سے بڑھ گیا۔

نجات



خداوند عز و جل جلالہ کی حمد و ثناء کے بعد حضرت محمدؐ و آل محمدؐ پر درود و سلام

حضرات محترم!

مجھ سے پہلے میرے ایک عزیز دوست لفظ نجات سے ”پردا عظم فرما رہے تھے لہذا میں بھی چاہتا ہوں کہ نجات ہی کے موضوع پر تھوڑی سی گفتگو ہو جائے۔ سامعین کو ام! ————— یہ جتنی چیزیں ہیں نا۔ نماز۔ روزہ۔ دیروہ ان چیزوں کا بدلہ خدا کی طرف سے جو تیرے جسم کی پرورش کے لئے خدا نے عطا فرمائی ہیں۔ کیونکہ تو نے اللہ کی ہزاروں من روٹی کھائی، ہزاروں من پانی پی لیا۔ بے انتہا اللہ کی ہوا تو نے استعمال کی لہذا تو نماز پڑھ۔ روزہ رکھ۔ کیونکہ نماز روزہ کا بدلہ تجھے یہیں ملتا جا رہا ہے۔ روزہ گئی نجات ہے! اس کا تعلق اس چیز سے ہے جو تیری رُوح کے ساتھ وابستہ اور رُوح کی مانند پس ایک شے وابستہ راتی ہے جسے کہتے ہیں محبت گویا نجات صرف محبت میں ہے۔ اب اگر محبت سمٹ کر ایک مرکز پر اکٹھی ہو جائے تو وہ عشق کہلاتا ہے۔ عشق ہے دنیا میں دو قسم کا اگر عشق میں کوئی مادی غرض شامل ہے تو وہ ”ہوس“ کہلاتی ہے اور اگر صرف زندگی کے تصور سے عشق ہو گیا ہے تو ایسے عشق کو دنیا میں ”ولایت“ کہتے ہیں جو مادی اغراض سے میرا ہوتا ہے اور یہی ”تو لا“ ہے جو ولایت کہلاتی ہے۔ یہی شے ہے جو عاقبت میں نجات دینے والی ہے۔

سامعین!

یاد رکھو! نجات کا جو تعلق ہے وہ نہ عشق میں ہے، نہ محبت میں ہے۔ نہ نماز روزے میں ہے۔ گویا ادائے فرض میں برات ہے۔ مگر نجات کا تعلق صرف ولایت

سے ہے اسی لئے ہم نماز میں پہلوئے نجات پیدا کرنے کے لئے "اذان" میں "ولی اللہ" بھی کہہ لیتے ہیں۔ اپنے کلمے کو ذریعہ نجات بنانے کے لئے اقرار و لایٹ بھی کر لیتے ہیں۔ بہر نوع۔ اگر کسی شے سے نجات ہے تو وہ ولایت ہے۔

صاحبانے! ————— ولایت زبان ندارد۔ لباس ندارد۔ مکان ندارد۔

پوزیشن ندارد گویا جو صاحب ولایت ہو جائے اس کے لئے کسی خاص زبان کی ضرورت نہیں۔ وہ اردو بھی اتنا ہی سمجھتا ہے جتنا پنجابی۔ اسے پنجابی میں بھی وہی لطف آتا ہے جو انگریزی میں۔ صرف ضابطے کو پورا کرنے کے لئے قانون کو نبھانے کے لئے غماز میں آپ کو سرکاری زبان عربی استعمال کرنی پڑے گی مگر قانون ولایت کو پورا کرنے کے لئے جو زبان آتی ہوگی ٹھیک ہے۔ پنجابی بولو گے تب وہی لطف ہے اردو بولو گے تب وہی سوا ہے۔ نظم میں بولو گے تب وہی لطف ہے۔ نثر میں بولو گے تب وہی لطف ہے۔ گویا دیوانگان ولایت زبان کے پابند نہیں ہوتے۔ جس انداز میں ولایت نظر آجائے بس وہ ولایت ہے۔ کیونکہ ولایت کی معرفت کو دنیا جانتی ہی نہیں۔ جہاں سرمست گان ولایت کو دیکھا اور یہ قانون کی حکمرانیوں میں گھری ہوئی دنیا اور قانون کو ناقص طور پر سمجھ کے قانون سمجھنے والی دنیا ہم دیوانگان ولایت کے خلاف فتوے بازی شروع کر رہی ہے۔ انہیں اندازہ ہی نہیں کہ ولایت کی سرمستی کیا ہے۔ انہیں پتہ ہی نہیں چلتا کہ سرمستان ولایت کے دل میں جو ولی ہے اسکے ساتھ ان تعلق کیا ہے۔

دیکھو نا! آپ کو ایک واقعہ سناتا ہوں۔ اگر یہاں سمجھ نہ آئے تو گھر جا کر نتیجہ نکال لیتا۔

کوڈ میں ایک شخص رہتا تھا جس کا "مٹیم" نام تھا۔ غریب آدمی۔ شام کو ایک ٹوکری لے کر کونے کے باغ میں جاتا اور ناقص کھجوریں سستے داموں بازار میں لاکر بیچ کر جو دو چار پیسے ملتے اس کی روٹی کھا لیتا۔ یہی گویا اس کی دنیاوی وجاہت تھی۔ اتفاق سے اس غریب آدمی کے دل میں شمع ولایت روشن ہو گئی اور اس وقت

کہاں بلندئِ تختِ حکومت اور کہاں پستیِ خرمِ مافروشی۔ مگر یہ ولایت وہ شے ہے کہ پست و بلند کے امتیاز کو مٹا دیتی ہے۔۔۔۔۔ بہرِ نوع۔ اس چھا بڑی فروش کو شہنشاہ سے ولایت ہو گئی۔

ہو سکتا ہے کہ شہنشاہ سے ولایت ہونے کے بعد شہنشاہ اس خرمافروش کو منہ بھی نہ لگائے (چاند سے پیت لگائے، پتھی بانو ریا) بھلا بتائیے اس غریب کی رسانی کیلئے مگر دنیا نے یہ منظر دیکھا کہ شہنشاہ اپنے مسندِ عدالت پر فیصلے کرنے کے بعد وہاں سے اٹھ کر چلا۔ دوپہر کا وقت ہے۔ خواماں خواماں چلا جا رہا ہے۔ لوگوں نے خیال کیا کہ اعلیٰ حضرت نہ جانے کہ ہر تشریف لے جا رہے ہیں۔ ظلِ سبحانی کی سواری کہاں جا رہی ہے۔ دیکھا کہ قدسی شمعِ امامت ہاتھ میں لئے ہوئے۔ فقرِ قدرت پہ دستخط کرتے ہوئے ساتھ ساتھ ہیں۔ فرشتگانِ قدرت با آدب با ملاحظہ ہوشیار کہہ رہے ہیں اور یہاں سے جلوسِ موقبائعِ جلالِ شہنشاہِ عالم کا روانہ ہوا۔ اور توجہ کا مرکز کیا ہے۔ وہی چھا بڑی والا وہاں پہنچے۔ فرمایا

”مثنیٰ بھائی! سلام علیکم“

دنيا جيران تھی کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ مشیم سے سلام علیکم کیسی؟
اب لوگ جیران کھڑے دیکھ رہے ہیں کہ مشیم سے سلام کرنے کے بعد اعلیٰ حضرت

فرماتے ہیں ”مثیم بھائی! میں آگیا۔ اب تم گھر جاؤ۔ چنانچہ مثیم نے اپنی کھجوریں سپرد کیں اور خود روٹی کھانے گھر چلا گیا۔

مثیم گھر چلا گیا اور شہنشاہ اعظم وہاں بیٹھا اس کی کھجوریں بیچ رہا ہے۔ تھوڑی دیر بعد مثیم واپس لوٹا۔ پوچھا ”میاں کتنی بیچیں۔ پیسوں کا حساب دو“ شہنشاہ عالم اسے کھجوروں کا حساب دے رہا ہے اور مثیم اس سے جھگڑا کر رہا ہے ”واہ تو نے آدھ پاد کھجور زیادہ کیوں دے دیں؟ اور وہ کہہ رہا ہے ”بھئی غلطی ہو گئی“ اور دنیا یہ تماشا دیکھ رہی ہے۔

حضور والا!

یہ تھا قانونِ ولایت۔ اب آج ذہنی مثیم، حضرت مثیمؑ قرار ہے۔ دنیا کے اعلیٰ محققوں کے نام مٹ گئے مگر اس چھا بڑی فروش کا نام ذہنوں سے نہیں مٹ سکتا۔ اور اسے سکھا کیا دیا شہنشاہِ ولایت نے۔ کہ

”سن مثیم! تو بھی کیا یاد کرے گا۔ سنے مجھے ایک بات بتاتا ہوں“

چنانچہ اسے علمِ بلند یاد دلایا یا سکھا دیا۔ اس علم کے معنی یہ ہیں کہ ہر شخص کو دیکھ کر وہ یہ سمجھ جاتا تھا کہ اس شخص کی موت کب۔ کہاں اور کس طرح واقع ہوگی، بناؤ! یہ کتنا بڑا علم ہے کہ ہر انسان کو دیکھ کر وہ یہ بتا دیتا تھا کہ اس شخص کی موت کب۔ کہاں اور کس طرح واقع ہوگی۔؟

سامعین!

بات سے بات نکلتی ہے۔ اب میں کس سے جانے پوچھوں کہ قرآن تو یہ کہتا ہے کہ موت کب آئے گی۔ کہاں آئے گی اور کس طرح آئے گی۔ اس کا علم صرف خدا کو ہے۔ یہ تو ہے قانون کی بات۔ اور یہ ہے ولایت کی بات کہ مثیم کو بھی ان باتوں کا علم ہے۔ جب کہ اس کا علم صرف خدا کو ہے۔

اب ہے کوئی دنیا کا ذی عقل آدمی! جہان چیزوں کو ملا کر مجھے سمجھائے کہ کیسے پوری ہوتی ہیں۔ جس چیز کو قرآن کہتا ہے کہ صرف خدا کو علم ہے اور مثیم کہتا ہے

کہ مجھے اس کا علم ہے — کیا مٹیم نے قانون توڑ دیا۔ کیا اس نے قانون ختم کر دیا۔؟ ہرگز نہیں۔

مٹیم خواب دیتا ہے، اگر میری ولایت کا خدا تک جا ملے تو جو چیز خدا کیلئے علم خاص تھا وہ مٹیم تک پہنچ سکتا ہے، گویا یہ ہے مرتبہ ولایت جو مٹیم تمہارے کو حاصل ہو گیا۔ اب اگر آج کا دعویٰ دار ولایت یہ کہے، مجھے بھی ولایت ہے، تو وہ ذرا مٹیم کے سامنے تو آکر دیکھے کہ ولایت ہے یا نہیں،

میرے محترم بھائیو!

ایک دن مٹیم تمہارے کونے کے بازار میں کھڑے تھے سامنے سے حبیب ابن مفلح آگئے۔ دونوں آمنے سامنے ہو گئے۔ مٹیم کے دل میں خیال تھا کہ یہ علم ابلا یا دالسنایا مجھے آتا ہے۔ مٹلانے مرت مجھے بتایا ہے۔ چنانچہ وہ حبیب کو دیکھ کر کہنے لگا۔

”حبیب! مجھے نظر آ رہا ہے کہ ایسا خوب رجوان جس کی داڑھی فلاں

تاریخ کو فلاں وقت اس کے خون سے رنگین ہوگی امیرزہ شہید ہوگا،

مٹیم نیکر مکرا کے کہ گویا حبیب پہ رعب ہوگا کہ مجھے یہ بات آتی ہے اور میں بتا دی۔ ادھر مٹیم کی بات سن کر حبیب نے پلٹ کے کہا۔

”مٹیم! مجھے بھی نظر آ رہا ہے کہ ایسا بوڑھا جو بحر ولایت امیر المومنین فلاں

درخت پر پھانسی دیا جائے گا،

مٹیم حیران ہو کر پوچھتا ہے، ”حبیب! تجھے کس نے بتایا؟“

حبیب مسکرا کے پوچھتا ہے، ”مٹیم! پہلے تم بتاؤ۔ تمہیں کس نے بتایا ہے؟“

مٹیم نے کہا، ”مجھے امیر المومنین نے بتایا ہے۔“

ادھر حبیب مسکرا کے کہتا ہے، ”مٹیم! تیرے پاس باپ کی دی ہوئی بات

ہے۔ میرے پاس بیٹے کی دی ہوئی بات ہے۔ تو باپ کی ولایت میں سرشار ہے۔

میں بیٹے کی ولایت میں سرشار ہوں۔ تجھے علیؑ نے بتا دیا، مجھے حبیب نے بتا دیا۔“

اب مٹیم پوچھتا ہے، ”حبیب! تو نے کب پوچھا تھا؟“

حبیبؑ پوچھتا ہے ”تو نے کب پوچھا تھا؟“

مثیمؑ نے کہا ”امیر المومنین جب کوفے میں بادشاہ تھے۔ میں نے چار سال خدمت کر کے جب سیکھا تھا۔“

حبیبؑ نے کہا ”میں جب اپنے آقاؐ کے سلام کے لئے مدینہ گیا تھا۔ ایک رات خدمت میں رہ کے جب سیکھا تھا۔“

اب مثیمؑ گھبرا کے کہتا ہے ”حبیبؑ! کیا ایک رات میں اتنا علم؟“

حبیبؑ نے جواب دیا ”ہاں۔ ہاں۔ جو میرا استاد ہے نا۔ اس کے شمشیر ہدایت پر پانچویں سے۔ اس کے ولی بنانے کے انداز اور ہیں۔ وہاں وقفہ لگتا تھا۔ یہاں وقفہ نہیں لگتا۔ انہوں نے زندگی میں ایک دو ولی بنائے۔ مگر _____ حسین جس دن ولی بنائے بیٹھ گیا تو چراغ گلی کر کے پانچ منٹ میں پہنچ ولی بنائے گا۔ اتنے ولی نہ اس سے پہلے کبھی کسی نے بنائے اور نہ اس سے بعد کوئی بنا سکے گا۔“

محترم بزرگو!

یاد رکھو! آدمؑ سے لیکر حسینؑ تک کی تاریخ پڑھو اور حسینؑ سے لیکر آج تک کی تاریخ کے اوراق پلٹ ڈالو اور تم دیکھو گے کہ آدمؑ سے حسینؑ تک اور حسینؑ سے آج تک کسی اللہ والے کو نصیب نہیں ہوئے۔ یہ سب سے بڑی تعداد تھی اللہ والوں کی جو حسینؑ کو ملی۔ تم کیوں کہتے ہو حسینؑ کو ”شاہ کم سپاہ“ کیا حسینؑ کی فوج تھوڑی تھی۔ کیا وہ بیکس تھا؟

میرے بھائیو! ایسے الفاظ نہ کہا کرو۔ اتنی فوج تو کسی کو نصیب ہی نہیں ہوئی۔ اتنے مددگار تو کسی کو نصیب ہی نہیں ہوئے۔ اتنے معاون تو کسی کو ملے ہی نہیں جتنے حسینؑ کے ساتھ تھے۔

آدمؑ کے یاس دو بیٹے تھے (ہابیل و قابیل)۔ دو میں سے ایک فیل ہو گیا نوخ کی کشتی میں سائرسؑ سے زیادہ آدمی نہ آ سکے۔

ابراہیمؑ (آدمؑ کے) کی خدمت میں سلولہ سے زیادہ آدمی نہ آ سکے۔ اور موسیٰؑ

طور پر چالیس آدمی لے گئے۔ سب فیمل ہو گئے اور علیؑ کے ساتھ بارہ حواری تھے مگر جب علیؑ کو سولی دی گئی بارہ کے بارہ منکر ہو گئے اور محمدؐ کے پاس ہزاروں آدمی تھے مگر احد و بدر میں ہم نے آزمائے دیکھ لیا۔ اور علیؑ کے پاس صفین میں ایک لاکھ فوج تھی۔ جب حاکمین کی نوبت آئی تو پھر سات آدمی رہ گئے تھے اور حسنؑ مجتبیٰ کے ساتھ صرف ایک ہارون لگی رہ گیا تھا۔ جب آپ صلح فرما رہے تھے۔ اور یہ صرف حسین کا انتقال تھا کہ اس کے ساتھ پورے بہتر انسان تھے۔ ایسے آدمی کو بیکس کہنا اس کی توہین ہے۔ بتاؤ! جس کے پاس بہتر جانثار ہوں کیا وہ بے کس ہے؟۔ ہرگز نہیں

حضور والا!

یا درکھو! "الہدایت فصل الحجاب والولایت رفع الحجاب" جب ہدایت کا زمانہ ہو پڑے پڑ جاتے ہیں (پتہ نہیں چلتا کہ اپنا کون ہے اور غیر کون ہے) اور..... جب ولایت میدان میں آجاتی ہے تو پردے اٹھ جاتے ہیں۔ (پتہ چل جاتا ہے کہ یہ کون ہے اور وہ کون ہے) مکھیا ولایت رفع حجاب ہے۔ سامعین! دنیا میں سب سے پہلی دفعہ میدان کر بلا میں ولایت بے نقاب ہو کر کھڑی ہوئی ہے۔ اس سے پہلے بھی پردوں میں رہی اس کے بعد بھی پردوں میں رہی۔ اور ولایت نے اس دنیا کو بتا دیا کہ ادھر کون ہے اور ادھر کون ہے درخدا شاہد ہے۔ پردے پڑے ہوئے تھے۔ اور پتہ نہیں چلتا تھا کہ اپنا کون ہے اور غیر کون ہے پس حسینؑ نے بہتر چن کے دکھا دیئے۔

اب بتاؤ۔ اگر بہتر آدمی کہیں اکٹھے ہو جائیں تو یہ فوج کہلاتے ہیں، ہرگز نہیں اب اگر بہتر آدمی کسی حکومت کے باغی ہو جائیں تو ان کی گرفتاری کے لئے فوج بلائی جاتی ہے؟۔ ادھر حسینؑ کا اندازہ کیا ہے کہ وہ ان بہتر کی بھی چھانٹی کرنا چاہتا ہے۔ عاشق کی شام کو حسینؑ کے کیمپ میں بہتر آدمی ہیں حسینؑ کہتے ہیں کہ یہ بہتر بھی بہت ہیں کچھ چھنٹ جائیں تو اچھا ہے کیونکہ جوں جوں جو ہر چھنٹا جائیگا توں توں ہر چھنٹ جائیگا

حضور والا۔۔۔۔۔ دنیا نے یہ منظر دیکھا کہ شب عاشور رات کے بارہ بجے کا وقت چاند دھندلایا ہوا اور حسین اکہتر جانثاروں کے ساتھ ایک خیمے میں تشریف فرما ہیں۔ اور ابو تراب کا بیٹا زمین پر سند لگا کے بیٹھ گیا۔ گویا آج دنیا کا بے مثل فیڈ مارشل اپنی فوج کو ایک انوکھی بات کہہ رہا ہے جو آج تک کسی نے کہی نہ سنی۔ امام فرماتے ہیں۔

”عباس بھائی! دیکھو سب آگئے کوئی رہ تو نہیں گیا۔“

فرزنجی ہاشم اٹھے۔ گن کے بتایا، ”مولانا پورے اکہتر آدمی ہیں،“

امام نے فرمایا، ”نہیں بہتر ہونے چاہیئے۔“

عباس نے پھر گن، ”عرض کی، ”قبلہ! اکہتر ہیں،“ امام نے فرمایا، ”بہتر ہونے چاہیئے“

اب جو امام نے یہ فرمایا تو خیمے کی پشت کا پردہ اٹھا اور اماں فصد برآمد ہوئے۔

سفید رومال میں لپیٹی ہوئی ایک شے سامنے رکھی۔ ”مولانا پوچھا۔“

”اماں فصد کیا لاتی ہو؟“ فصد نے عرض کی، ”حسین! تیرا بہتر ۲۴ سپاہی“

اب گن کے دیکھو۔ بہتر ہوئے ہیں یا نہیں؟“ امام نے فرمایا، ”ہاں۔ اب بہتر ہو گئے،“

اب حسین اپنے سپاہیوں سے فرماتے ہیں، ”میرے دوستو! میرے عزیزو!

میری جان سے پیارے رفیقو! میرے بیٹو! بھتیجو! بھائیو! پھر امام نے نام ایسے

کے بلکارا، ”بھائی حبیب! بھائی زبیر! اور جو بزرگ تھے جیسے مسلم عوٹو وغیرہ

انہیں امام نے، ”چچا“ کہہ کے خطاب کیا، ”میرے باپ اور نانا کے صحابیو! دیکھو

زمانے کا حال کیا ہے۔ یہ فوج جو مجھے گھرے ہوئے ہے اسے صرف میری ذات

سے واسطہ ہے۔ تم سے کوئی عداوت نہیں۔ اس وقت رات کا وقت ہے میں

تمہیں خوشی سے کہہ رہا ہوں کہ تم سے جو جانا چاہے جا سکتا ہے۔“

جب تین چار دفعہ مولانا نے یہ فرمایا کہ جو جانا چاہے جا سکتا ہے تو بہتر سپاہی

عالم سکتے ہیں بت بنے بیٹھے ہیں۔ آخر مولانا نے فرمایا۔

”دیکھو! شاہد تمہیں جانتے ہوئے یہ خیال آتا ہے کہ وہ ثواب جو تمہیں

”تمہیں غیرت محسوس ہوتی ہے کہ لوگ تمہیں طعنے دیں گے کہ اپنے سردار کو چھوڑ کر آگئے
لہذا اس غیرت کا علاج یہ ہے کہ میرے ساتھ تمہارے نبی کی بیٹیاں آئی ہوئی
ہیں تم انہیں ساتھ لے جاؤ اور انہیں نانا کی قبر پر بٹھا دینا۔ پھر جہاں جس کا جی چاہے
چلے جانا۔ اگر کوئی طعنہ دے تو کہہ دینا کہ ”زینب کا پردہ بچانے چلے آئے تھے۔
نبی کی بیٹیوں کو نرنے سے نکال کے لے آئے تھے۔ لوگ خاموش ہو جائیں گے“۔

لوگ پھر بھی خاموش رہے۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا۔
 ”دیکھو! میں ہنہارے سائے بیٹھا ہوں۔ آنکھ میں شرم ہے۔ اس شرم کی
 وجہ سے تم نہیں جانتے۔ اکبر بیٹا! ذرا چراغ گل کر دو۔“
 چنانچہ چراغ گل کر دیا گیا۔ پھر اٹام نے فرمایا۔
 ”اب اندھیرا ہے۔ میں تمہیں نہیں دیکھ سکتا۔ تم جاسکتے ہو۔“

سما معین !

اندھیرے میں آوازیں تو آ رہی ہیں۔ مگر پتہ نہیں چل رہا کہ کیا ہو رہا ہے۔ جب دُشٹ گزرتے آپ نے حکم دیا۔ چراغ دوبارہ روشن کیا جائے۔ اب جو چراغ دوبارہ روشن ہوا تو اہام نے دیکھا کہ اتنے میں یہ فرق آ گیا تھا کہ جواؤں نے اپنی تلواروں کے نیام کھٹنے لگا کے توڑ دیئے اور بیڑھوں نے اپنی پگڑیاں اتار کر اپنی کمر پر باندھ لیں کہ جھکی ہوئی کمر ذرا سیدھی ہو جائے۔ اور جو بچے ہیں وہ ایڑی اٹھا کے کھڑے ہو گئے کہ جوان نظر آنے لگیں۔ اور چھ مہینے والا سپاہی بدل تو سکتا نہیں تھا۔ آنکھوں آنکھوں میں کہہ رہا تھا مولا! منکر نہ کر میں بھی شیر خدا کا پوتا ہوں کل رہ جہاد کروں گا کہ دنیا بدرکھے گی۔

اب جو امام نے یہ نظر دیکھا تو سینہ فخر سے تن گیا اور بے ساختہ منہ سے نکل گیا

”خداوند! تو گواہ ہے کہ اتنے اچھے جانثار تو میرے مانا محمدؐ کو نہ ملے۔ اتنے اچھے ساتھی تو میرے باپ علیؑ کو نہ ملے۔ اتنے اچھے رفیق تو آدم سے لیکر آج تک کسی کو نصیب نہیں ہوئے۔“

اب جو مولانا فرمایا تو جانثاروں کا بیجا نہ صبر بھی بریز ہو گیا۔ سب پہلے مسلم عورتیں اٹھیں، بڑھیا آدمی، رسولؐ کو دیکھ چکے تھے، علیؑ کے ساتھ رہ چکے تھے، تلوار ٹیک کر کھڑے ہوئے۔ بدن میں تھوڑا سا لرزہ بھی تھا۔ کہنے لگے

”حسین! میں نے تیرے نانا کو دیکھا ہے میں تیرے باپ کے ساتھ رہا ہوں تیرے منہ سے یہی سبوتا ہے جو تو کہہ رہا ہے۔ تیری ہی شان ہے جو تو کہہ رہا ہے حسین! یہ سچ ہے کہ تجھے ہماری ضرورت بالکل نہیں۔ مگر میں تیری ضرورت ہے۔ تو ہمارا محتاج نہیں حسین! ہم تیرے محتاج ہیں۔ حسین! اگر تو ٹھوکریں مار مار کے بھی اس میدان سے نکال دے پھر یہیں پلٹ کے آئیں گے کیونکہ ہم تیرے بغیر نہیں رہ سکتے۔“

بڑھیا آدمی۔ جوش میں نقرے کہے۔ بدن میں لرزہ پیدا ہوا وہیں گر گیا گرتے ہی حضرت بریدؓ ہمدانی کھڑے ہو گئے۔ یہ بڑے فیض البیان انسان تھے۔ انہوں نے کھڑے ہو کے فرمایا:-

”حسین! میں جانے کو کہتے ہو۔ ہم چلے جاتے ہیں مگر اپنے گھر سے اچھا گھر بناؤ جہاں ہم چلے جائیں۔ اپنے دربار سے اچھا دربار بناؤ جہاں ہم جا کے بیٹھ جائیں۔ یہ نقرے کہہ کے وہ بھی ہوش ہو کر گر گئے۔“

اس کے بعد حسین کے بچپن کا دوست حبیبؓ اٹھا۔ حبیبؓ نے اسی طرح بات کی ہے جس طرح بچپن کا دوست بات کرتا ہے۔

”حسین! میں تیرے ساتھ بچپن میں کھیلا ہوں۔ میں تجھے چھوڑ کے چلا جاؤں مگر ایک بات بتا دے کہ قیامت کے دن اگر تیری آٹاں نے پوچھ لیا۔ ”حبیبؓ! میرے حسین کو کہاں چھوڑ آیا تو کیا جواب دوں گا۔“

یہ کہہ کے حبیبؑ بھی بیٹھ گئے۔ اسی طرح حبيب تمام اصحاب بائیں کر کے بیٹھ گئے۔ نواب عزیزوں کی باری آئی۔ عزیزوں کی نمائندگی حضورِ قمر بنی ہاشم جناب عباس غازی نے فرمائی۔

صاحبانِ ذوق! ذرا توجہ سے سننا عباس کی تقریر۔

پورا بدن لرز رہا ہے زلوار کا قبضہ ہاتھ میں ہے۔ ایک مرتبہ فرمایا: ”مولانا!“

خاموش ہو گئے۔ دوسری مرتبہ اور بلند آواز سے کہا: ”یا ابنِ رسول اللہ“

پھر خاموش ہو گئے۔ پھر تیسری مرتبہ کہا: ”میرے سردار“ پھر خاموش

ہو گئے۔ اور خاموش ہو کے ایک دم بجفت کی طرف مڑ گئے اور بجائے

حسین سے کچھ کہتے رہ کر فرمایا: ”یا علیؑ ص ۵۱! بابا۔ حسین جانے

کہہ رہے ہیں کیا جواب دوں؟“

اماں کو عباسؑ کی اس ادب پر پیار آگیا۔ اٹھ کے ایک ایک کے گلے ملے۔ ایک ایک

کی پیشانی چوٹی۔

”میں تمہارا بڑا احسان مند ہوں۔ میں تمہارا بڑا شکر گزار ہوں۔ جہاد

کلی کے مرنے کی تیاری کرو“

اور اماں نے اپنے جانثاروں کو سلام کیا وی سلام جو آج تک زیارت

گنج شہداء میں پڑھا جاتا ہے: ”اَسْلَامٌ عَلَیْکُمْ یَا اَوْلِیَاءِ اللّٰہِ“ اے اولیاء اللہ

میرا تم پر سلام ہو“ گویا دسل منٹ کے اندر حسین نے بہتر کو اولیاء اللہ بنا دیا۔

یہ ہے ولایت کی معرفت۔

سامعین!

یوم عاشور بہتر کے علاوہ شہید ہونے والوں میں کون بھی ہے اگر یہ رات

والے اولیاء اللہ بن گئے تو حُرّ تو ولی بننے سے رہ گیا ہوگا۔ لہذا حسین نے

اسے ولی بنانے کے لئے الگ دفن کروادیا کہ سب کے ساتھ دفن ہوتا تو اولیاء اللہ

پر زیارت پڑھی جائے گی تو لوگوں کو پشیدہ ہوگا کہ وہ تھے اولیاء اللہ جو رات کو تھے صبح دلا

نہیں تھا۔ لہذا حُرّ کو الگ دفن کرا کے ہمیں حکم ہوا کہ وہاں اولیاء اللہ جموعاً کہا کرواد

یہاں حُر کی قبر پر کھڑے ہو کر کہا کرو "اسلام و علیک یا ولی اللہ" اے حُر! تو بھی ولی اللہ ہے۔ یوں ولایت اس گھر سے تقسیم ہوتی ہے۔

میرے بھائیو! مصیبت و پریشانی کے اس عالم میں حبیب یقین ہر جائے کھل جنگ و افتاء ہوگی اپنی فوج سے فیلڈ مارشل کا یہ کہنا کہ تم چلے جاؤ یہ وہ بات ہے جس پر عقل حیران ہوتی ہے۔ حالانکہ ایسے عالم میں تو سربراہ فوج اپنی فوج کو قابو میں رکھتا ہے مگر حسین ہے کہ اپنے ساتھیوں سے کہہ رہا ہے کہ تم میں سے جو جانا چاہے جاسکتا ہے۔ گویا حسین نے دنیا کو یہ دیکھا دیا کہ یہ ولایت کی شان ہے کہ اگر بھوک پیاس سے تنگ آکر کوئی سپاہی مجھے چھوڑ کر چلا جائے یہ حق ہے یا کوئی دنیاوی عیش و آرام چھوڑ کر بھوک پیاس کی طرف آجائے یہ حق ہے۔ یہ ہے شان ولایت۔

بہر نوع۔ حقوڑی دیر بعد حسین نے دربار برخواست کر دیا اور بیت الشرف میں تشریف لائے۔ پردہ اٹھا کر خیمے میں قدم رکھا ہی ہے کہ دیکھا سامنے بہن کھڑی ہے۔

_____ "زینب! تم یہاں کیسے؟" زینب نے فرمایا "حسین! میں قنات کے پیچھے تیرے ساتھیوں کی گفتگو سنتی رہی میں وعدہ کرتی ہوں حسین! ہر ایک شہید کی قبر پر کھڑی ہو کر سفید بال کھول کر ان کا ماتم کروں گی۔ مگر..... اتنا بتا کہ ان میں سے کوئی چلا تو نہیں جائے گا؟"

بس بھائیو! زینب کا یہ پوچھنا تھا کہ پر رے کے بالکل پیچھے دار کے طور پر حضرت بربر ہمدانی کھڑے تھے۔ انہوں نے سن لیا۔ رات کا وقت ایکدم گھبرا کے پکارا۔ "حبیب! زبیر! عہدی آؤ۔"

اب جو انہوں نے آواز دی تو سب دوڑتے ہوئے آگئے۔ زبیر نے پوچھا۔ "زبیر! خبریت تو ہے؟"

زبیر نے کہا "زبیر! خبریت بالکل نہیں۔ ابھی زینب کو ہماری دغا کا یقین نہیں آیا۔ خیمے میں بعد میں جانا پہلے زینب کو یقین دلا کے جاؤ۔ چنانچہ سب

تلاوریں نیا سوں سے نکلیں اور خیمے کے صحن میں آکے گریں اور گڑا گڑا کر جاننا رکن
عرض کی۔

”علیٰ کی بیٹی! اپنے ہاتھ سے ان سروں کو کاٹ دے۔ ہم تیری چوٹ
سے ملنے والے نہیں“

اور اتنا اعتماد تھا زینب کو اصحاب کی دنیا پر کہ عاشور کی شام کو جب خیمے جلنے
لگے تو زینب نے حیثین کو نہیں پکارا۔ عباس کو نہیں پکارا بلکہ وہاں بھی کھڑے ہو کر
زینب نے یہی آواز دی۔

”بھائی حبیب! آؤ نا۔ دیکھو ہم پہ کیا گزری ہے“

سامعین! یوں ولایت اس گھر سے تقسیم ہوئی۔ یوں بہتر دلی بنے
ایک وقت میں اتنے اولیاء کا اجتماع ایک جگہ نہ تاریخ عالم میں اس سے
پہلے ہوا اور نہ اس کے بعد اور ان اولیاء کی ایک جگہ قبریں بن گئیں۔ انہر ایک
دلی کی قبر اجیو۔ پاکپٹن۔ اور قولنہ کو شریف بنا سکتی ہے تو جہاں بہتر اولیاء
کا جھڑمٹ اکٹھا ہو جائے اس کی شرافت کے لئے لغت عالم میں ہمیں سوائے
معلیٰ کے اور کوئی لفظ ہی نہیں ملتا۔

بزرگان ص: حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن ہر زمین شق ہو

جائے گی اور ہر قبر سے مردہ اٹھ کے آئے گا۔ مگر — کر بلا کی زمین

یو نہی رہے گی اور یہاں کی قبروں میں سونے والوں کو آدم سے اٹھایا جائیگا۔

اسکے علی دلائل علماء کرام کے پاس موجود ہیں مگر مجھ دیوانے نے یہی سمجھا ہے کہ

اللہ کو پتہ ہے کہ یہ بڑے زخمی ہیں لہذا ان زخموں کو تکلیف نہ دی جائے انہیں

اسی طرح اٹھایا جائے گا جس طرح زخمی کو ستر پھر پر لایا جاتا ہے اور یہی اولیاء

کے جمع کی برکت ہے۔ یہی بات ہے کہ دنیا کی کتابیں پڑھ ڈالو جن میں زیارات لکھی

ہوئی ہیں کہ پندرہ شبان کو کربلا معلیٰ میں ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء و کرام اور

آئمہ طاہرین بمثل ملائکہ کے تشریف لاتے ہیں۔ بجفت میں مدینہ میں، کاظمی میں سامری

میں، مشہد میں۔ کہیں یہ نہیں لکھا ہوا کہ کسی جگہ حیثین تشریف لائے گا۔ بلکہ سارے بزرگ

حسین کے پاس تشریف لاتے ہیں۔ غالباً سب ملکر فیصلہ کیا ہوگا کہ حسین کے یہاں چلے چلو کیونکہ یہ بڑا زخمی ہے لہذا اسے تکلیف نہ دو۔ چنانچہ سب کمر بلا متعلے میں تشریف لاتے ہیں اور حسین کا دربار کائنات کے شہنشاہوں کی آمد سے متوجہ جاتا ہے۔ اور سمجھنے کا انداز یہ ہوتا ہے کہ ————— بنظام قدرت سجا یا گیا جنت اعلیٰ کے بنے ہوئے مرمیس پتھر فرش کی جگہ بچھائے گئے۔ علم آدم کے زمر میں تخت بچھائے گئے۔ حلیم نوح کی آبشاریں چلا دی گئیں۔ ابراہیم کی خلعت کے پرے ٹھکا دیئے گئے۔ ہیبت موٹے کو چوبدار بنا دیا گیا۔ زہد عیسیٰ کے نقش و نگار کو دیئے گئے۔ حسن یوسف کی گلکاری ہو گئی اور پرے حرم کو سجا دیا گیا اور تخت شاہی پہ جو اسٹیج بنی اس پر شہنشاہ کمر بلا اپنے بہتر ساتھیوں کے ساتھ آکر رونق افروز ہو گئے۔ شہنشاہ کے پیچھے کرسیوں پر اٹھارہ بنی ہاشم اور ان کے پیچھے ہلالی شکل میں کرسیوں پر شہدائے کمر بلا اور باقاعدہ قرینے سے دو طرفہ کرسیاں رکھی ہوئی ہیں۔ ہر کرسی پر بیٹھنے والے بنی کا لکھا ہوا ہے اور حضور قمر بنی ہاشم عباسی غازی نبیلہ مارشل کی وردی پہنے ہوئے دروازے پر کھڑے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد کسی نے نبیلہ مارشل سے آگے کہا کہ آدم سلام کیلئے حاضر ہوتے ہیں۔ اجازت ہے؟ ————— نبیلہ مارشل نے وہیں سے آواز دی۔ ”سرکار حسین میں آدم کا سلام قبول ہو“ سرکار کی طرف سے حکم ہوگا۔ ”آئے دو“ چنانچہ آدم آئے اور اپنی کرسی پہ بیٹھ گئے۔ اس کے بعد نوح آئے اسی طرح جب سارے انبیاء آکر قرینے سے اپنی کرسیوں پر بیٹھ گئے تو قمر بنی ہاشم نے مڑھکا کے عرض کی۔ ”سرکار حسین میں حضور سرکار عالمین تشریف لارہے ہیں“ حضور سرکار عالمین کا نام سنتے ہی سید الشہداء اپنے تخت سے اترے۔ آگے بڑھ کر نانا کا استقبال کیا۔ اپنے برابر کی کرسی پہ بٹھایا۔ اور اس کرسی کے پیچھے شہزادہ علی اکبر کو کھڑا کر دیا۔ تاکہ ہم شکل محسوس ہو سکے ساتھ ہی بیٹھ جائے اس کے بعد آئمہ مطہرین تشریف لائے اور اپنی اپنی کرسیوں پر قرینے سے بیٹھ گئے۔ اس کے بعد حکم ہوا اہل دربار! اپنی آنکھیں بند کر لو۔ میری اماں آ رہی ہیں۔ حضور سیدہ طاہرہ آگے بیٹھ گئیں۔ چنانچہ حجب سب اپنے اپنے

قرینے سے بیٹھ گئے اور دربار شروع ہوا تو اچانک ایک آواز آئی۔

”بھیا! کیا میں بھی آسکتی ہوں؟“

بس اس آواز کا سننا تھا کہ قرینی ہاشم نے سر سے عمامہ اتار کے پھینک دیا۔ شہزادہ علی اکبر ننگے سر ننگے پاؤں درڑے اور حسین نے کرسی چھوڑ دی۔ محمد تعظیم کو کھڑے ہو گئے۔ سیڑھ نے چادر پھیلادی۔ آمنہ طاہرین جھک کے سلام کرنے لگے۔ انبیاء ہاتھوں پہ ہاتھ رکھ کے کھڑے ہو گئے اور زینب جھجکتی ہوئی، ڈرتی ہوئی کہے گی۔

”حسین! آج تیرے دربار میں زینب آ رہی ہے۔ حسین! اجازت

ہے، میں آ جاؤں؟“

محترم بزرگو!

حضور امام زین العابدین علیہ السلام آگے بڑھیں گے اور پھوپھی کو سلام کر کے پھوپھی کا بازو پکڑ کر فرمائیں گے۔

”پھوپھی اماں! آؤ ساتھ چلیں“

اور حسین کے دربار میں پھوپھی بھتیجے آ کے بیٹھ جائیں گے۔ گویا اس شان سے زینب کی آمد ہوگی۔

حسین پوچھیں گے۔ ”زینب! کچھ کہنا چاہتی ہو؟“

زینب فرمائیں گی۔ ”حسین! ایک بات کہہ کے مجھے واپس جانا ہے

اللہ تیرے دربار کو آباد رکھے۔ حسین! میں نے بڑی محنت سے تیرا دربار

آباد کیا۔ حسین! اطراف عالم میں دنیا کے لوگ تیرے ماتم دار ہیں۔ میں

ہر ایک کے گھر جاتی ہوں۔ حسین! آج میں تیرے دربار میں ان کی سفارش

لے کے آئی ہوں۔“

حسین فرمائیں گے۔ ”زینب! فکر نہ کرو تو فرمائے گی وہی ہوگا“

حسین! میں چاہتی ہوں کہ کربلا کے شہر میں میری سواری کا جلوس گزرا دو۔ میں

تیرے سارے شہر کو دیکھنا چاہتی ہوں۔ حسین! یہ وہی جنگل ہے نا۔ جہاں میرے

جہاں میرے سر سے چادر اُتری تھی۔ حسین یہ وہی جگہ ہے نا جہاں میں
کھڑی ہوئی دیکھ رہی تھی اور تو زنج ہو رہا تھا۔

اللہ ہمارے دلوں میں دلائے آل محمد اور مودۃ آل محمد عطا
فرمائے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ط
اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّآلِ مُحَمَّدٍ ط

اے آل محمد !

اچھے غلاموں کو اپنا کہنا تو ہر آقا
کا کلام ہے۔ مگر

تمہاری شان تو یہی ہے کہ
ہم جیسے ”گناہ گاروں“

کو
اپنا کہہ دو

(نخطیۃ آل محمد)

ختم نبوة

خداوند عز و جلال کی حمد و ثناء کے بعد حضرات
محمد و آل محمد پر درود و سلام

حضرات علمائے کرام و سامعین عظام !

آپ حضرات کے واجباً لاتباہ حکم کی تعمیل میں آج میں یہاں حاضر ہوا ہوں۔ جب میں یہاں پہنچا تو بڑی روشنی تھی جس کی وجہ سے میں نے اتنے ہی جگہ پہچان لی کہ یہ تو ہمارا پرانا اڈا ہے۔ یہاں تو ہم کئی بار آچکے ہیں۔ پھر مجھے مولانا مرحوم مدرس سے ملے۔ جو میرے لئے بہت بہتر تھا۔ کیونکہ مدرس کی ہوا لگنے سے مجھ میں اتنی طاقت آگئی کہ میں آپ سے خطاب کر سکوں۔ بہر نوع میں یہاں پہنچا اور یہاں آکر میں نے دیکھا کہ ہر مکتب منکر۔ ہر عمر۔ ہر سن کا مسلمان یہاں موجود ہے۔ گویا یہاں مکتب فقہ بھی ہیں اور مکتب منکر بھی ہیں۔ یہاں انگریزی مدرسوں کے طالب علم بھی ہیں۔ اور عربی مدرسوں کے طالب علم بھی ہیں۔ لہذا جب انہی جماعتیں مل کے بیٹھ جائیں تو ان کا مل بیٹھنا ہی بہت بڑی خوشی کی بات ہے۔ چنانچہ اس خوشی کے موقعہ کو دیکھ کر کسی کے دل سے یہ دعا نکلی کہ

خوشی کا وقت ہے گل کر دو ان چراغوں کو

خوشی کے وقت ہے کیا کام جلنے والوں کا

حضور والا! اسی اجتماع کی خوشی میں ہم نے کہہ دیا۔ خداوند! ہمیں بجلی نہیں چاہیے۔ بجلی وہاں گڑ جہاں اسے گرنا چاہیے اس لئے کہ بجلی کی روشنی انسانوں کی بنائی ہوئی روشنی سے۔ درہم تو یہاں اکٹھے ہی اس لئے ہوئے ہیں

کہ انسانوں کی بنائی ہوئی مصنوعي روشنیوں، کو بجھا دیں۔

بزرگان من!

بوجہ حالات تقریباً دو ماہ تک مجھے ہسپتال میں داخل رہنا پڑا۔ اخبار میں پڑھ سکتا نہیں تھا۔ یوں ہی بیٹے بیٹے پوچھ لیا کرتا تھا۔

• بچو! بتاؤ ملک کی کیا حالت ہے۔ سیاسی حالات کیا ہیں۔ مذہبی حالات کیا ہیں۔ ابھی ابھی ہمارے ملک میں دنیا بھر کے اسلامی سربراہوں کی کانفرنس ہو چکی ہے لہذا عالم اسلام کا کیا حال ہے۔ وہاں مسلمانوں کی کیا کیفیت ہے؟۔ چنانچہ نیچے چڑھ پڑھ کر مجھے سناتے اور میں بہت خوش ہوتا کہ مسلمانوں کا بڑا اچھا حال ہے ہمارا کاروان بڑی اچھی طرح چل رہا ہے۔ ہمارا قائد بڑی شان سے رماں دواں ہے ایک دن اسی دوران میں نے سنا کہ ہمارا کاروان جب بڑی شان سے چل رہا تھا تو کسی بد نظر نے ہماری "چلتی گاڑی" کو روکنا چاہا کیونکہ وہ چاہتا نہیں تھا کہ مسلمانوں کی گاڑی چلتی رہے۔ میرے پاس اور تو کچھ تھا نہیں۔ یوں ہی بیٹے ہوئے دُعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے۔

• خداوند! وہ لوگ جو ہماری چلتی گاڑی کو روکنا چاہیں۔ اُن سے "دُعا" واکا "نہ پڑے۔ اُن سے ہمارا کبھی واسطہ نہ ہو۔ اُن سے ہمارا کبھی تعلق نہ ہو۔ بہر نوع یہ واقعہ بھی سنا اور اس کے بعد اور خبریں بھی سنتا رہا۔

محترم سامعین!

مجھے آج اس مختصر سے وقت میں نہ کسی کی نبوت پر تنقید کرنی ہے اور نہ ہی کسی کی شخصیت پر تنقید کرنی ہے۔ اگر کوئی مجھ سے یہ کہے۔

• زیدی صاحب!

• فلاں شخص نبی بن گئے۔

میں کہتا ہوں! بن گئے تو میں کیا کروں۔ میں نے دنیا کے سارے پالکوں کو
فہرست تو نہیں بنائھی کہ جتنی غولٹھے میں اس پر تنقید کرتا رہوں۔ میں نے تو آج اپنا عقیدہ
بیان کرنا ہے۔ دین اسلام کی بات کہتی ہے :

یاد رکھو!

اللہ کا ہم پر بہت بڑا فضل و کرم ہے گناہوں نے ہمیں انسان بنایا ہے۔ اور انسان
بننا کہ ہمیں اس دنیا میں بھیج دیا۔ ہم چلے آئے۔

کیوں بھائیو!..... کوئی ہے ایسا انسان جو اپنی مرضی سے آیا ہو؟
ہرگز نہیں۔

دیکھو نا! اگر ہم اپنی خوشی سے آتے تو آتے ہی ہستے۔ مگر ہم تو آتے ہی مٹے
تھے۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ یہاں آنے کو حکم آیا ہی نہیں چاہتا تھا۔ اللہ نے ہمیں
زبردستی بھیج دیا۔ ہم آئے اور جب تک یہاں دکھے گا ہمیں رہنا پڑے گا۔ اور
جس دن بلائے گا چاہے مڑ جائیں ہیں جانا پڑے گا۔ یہ اور بات ہے کہ اپنے پیروں
سے چل کر نہیں جائیں گے تو چار بندے اٹھا کر لے جائیں گے۔ مگر جانا ضرور پڑے گا۔
کتاب ہے بس دیکھو یہ انسان کو نہ آنے میں بس ہے اور نہ جانے میں بس ہے اور
نہی یہاں رہنے میں بس ہے۔ اللہ جانے ہم یہاں آکر کیا جرم کر بیٹھے ہیں کہ اس دنیا
میں آکر چاہے ہم ایک سانس لیں چاہے ہزاروں لاکھوں سانس لیں مگر یہاں ہمارا
آنا اتنا بڑا جرم ہے کہ اس کی سزا موت ہے۔ کیا مجال جو کوئی شخص سزا
موت سے بچ جائے۔ آخر ہم ہی پوچھتے ہیں۔

پسیدہ کرنے والے!

تو ہی بتا۔ خود آئے تو کبھی نہ پوچھتے۔ چو کہ تو نے بھیجا ہے۔ اس لئے پوچھتے

ہیں کہ جس وقت کی سزا ہے تو یہاں پہلے آئے نہ کا مقرر کیا ہے؟

حضور والا!

خدا گواہ ہے۔ بھیجا بھی بڑی شان و شوکت سے۔ دماغ کے خانوں میں عقل کی
شع و روشن کر کے بھیجا۔ دماغ کے کھڑے میں زبان کو بولنے کی طاقت میں پابند کر کے
بھیجا۔ آنکھوں میں نور کے چراغ روشن کر کے بھیجا سوچنے سمجھنے کی صلاحیت دے کر
بھیجا۔ زمین پھیل جائیں تو جال بن جائیں اور چاند پر پہنچ جائیں تو کندیں بن جائیں
تو اسے ہمارے تابع۔ سورج ہمارے تابع۔ چاند ہمارے تابع۔ آسمان ہمارے
تابع۔ زمین ہمارے تابع۔ اور آج ہم زمین سے فارغ ہو کر آسمان پہ جانے کی
تیاریاں کر رہے ہیں۔ اور فرشتوں میں پہلچل چکی ہوئی ہے کہ جنت سے نکالا ہوا۔
پھر واپس آ رہا ہے۔ گویا خدا نے اس شان سے ہمیں بھیجا۔ ہماری طاقت کا کوئی اندازہ
نہیں کر سکتا۔ ہماری قوت کا کوئی اندازہ نہیں کر سکتا۔

بچو!

سینکڑوں دفعہ یہ بات تمہیں بتا چکا ہوں کہ یہ ہماری طاقت کی حد ہے کہ
ہم یہاں بیٹھ کر امریکہ، روس اور لندن کی باتیں سننے میں اور سننے کا انداز یہ ہوتا
ہے کہ سننے ایک صندوق رکھ لیا۔ ہم سننے بیٹھ گئے اور صندوق سے کہا "سنو کوئی نئی
سی بات، اور پھر غلط یہ ہے کہ اس کے سامنے ہاتھ نہیں جوڑتے بلکہ بڑے آرام سے
اس کے کان مردھتے ہیں۔ اور وہ ہمارے سامنے باتیں کرنے لگ جاتا ہے۔

اب بے بتاؤ! جب ہم یہاں بیٹھ کر پوری دنیا کی باتیں سن سکتے ہیں۔ اب اگر ہم
اس کا نام "وحی" رکھ دیں تو کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟ بس اگر نام ہی رکھنا
ہے تو آپ اسے "ریڈیو" کہیں اور میں اسے "ٹی وی" یعنی فرشتہ کہہ دوں گا۔
بیٹھے بڑی آسانی سے میں بھی بن گیا۔

مسکراہٹیں۔ اب اگر آپ سے یہ سنا تو تادین کریں تو آج میں نبوت کا

دیکھو نا! اگر تم تھوڑی دیر کے لئے میری ہاں میں ہاں ملا دو تو میں بھی باسانی
نبی بن سکتا ہوں، کیونکہ نبی کی جو شرطیں ہیں وہ تقریباً پوری ہیں۔

مثلاً آنکھوں سے نظر نہیں آتا۔ آنکھوں کے لئے بینک چاہیے۔ دانت مصنوعی ہیں۔ چھڑی کے بغیر چل نہیں سکتا۔ بغیر سہارے کے کام نہیں ہوتا۔ دوسرے کی نقل سے سوچتا ہوں۔ گویا جب اپنے حواس ختم ہو جائیں، اپنی عقل ختم ہو جائے تو اس کے بعد بنی بن جاؤ۔ جھگڑا کس بات کا ہے اور پھر لطف یہ ہے کہ ہزاروں بیماریاں لگ جائیں مگر نام ”مسیحی“ ہو گا۔

بچو! تم نے پھر مرزیت، نرود، باد کاغزو بلند کیا۔

میں کہتا ہوں "مردہ باد" نہ کہا کرو۔ اس لئے کہ "مردہ باد" 3
ہوتا ہے جو پہلے "زندہ" ہو اور جو پہلے ہی سے زندہ نہ ہو وہ
"مردہ باد" کیسے کہلائے گا۔

بہر وقت میں یہ مرض کورہا تھا کہ اللہ نے انسان کو بہت سی طاقتیں دے کر بھیجا ہے۔ آخر ہم نے مرض کی "خداوندانہ نونے" اتنی طاقتیں دے کر نہیں بھیجا ہے۔ آخر ہمارا آنے کا مقصد کیا ہے؟

اللہ جواب میں فرماتا ہے :

”دیکھو نا! ہم نے تمہیں دنیا میں کھانے پینے کے لئے نہیں بھیجا بلکہ تمہارے ”بھیکے“ میں غفل ہے تو ہمارے بھیجے کا مقصد سمجھو اور وہ ہے کہ ہم نے تمہیں ”عبادت“ کے لئے بھیجا ہے۔

صاحیان!

میز کے ترنہ بیٹھے، بُرے یہ نوجوان، نیچے مجھے گھور رہے ہیں کہ

• دیدی صاحب! کہدی نما آخر مولویوں والی بات
 میں کہتے ہوں۔ ”بچپن: آخر مولویوں والی بات سے چھٹکارا لگتا نہیں بلکہ
 سکتا۔ حقیقی بات تو یہی ہے کہ اللہ نے انسان کو عبادت کے لئے پیدا
 کیا ہے۔ خواہ تم اسے سمجھ بھو یا غلط جالو۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے
 کہ عبادت کیا ہے؟

سَامِعِین!

حضرات صلئے کلام یہاں پر تشریف فرما ہیں۔ یہ حضرات مجھ جاہل آدمی کی اس بات
 کی تصدیق کریں گے کہ ”عبادت“ کا مفہوم اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے کہ
عبادت ہر اس عمل کو کہتے ہیں جس سے اللہ خوش ہو جائے
 گویا جس کام سے اللہ خوش ہو جائے وہ عبادت ہے۔ اگر اللہ غامذ پڑھنے سے
 خوش ہے تو یقیناً غامذ عبادت ہے۔ اگر خدا روزہ رکھنے سے خوش ہے تو روزہ عبادت
 ہے۔ روزہ بذات خود عبادت نہیں ہے بلکہ اللہ خوش ہے اس لئے عبادت ہے اور
 غامذ بھی اس لئے عبادت کہ اللہ خوش ہے۔ گویا مردہ مل جس سے اللہ خوش ہو جائے
 وہ عبادت ہے۔

پڑھئے لکھے لو جو النوا

اب یہ بتاؤ کہ جب عبادت کرنی ہے میں نے اور خوش کرنا ہے اللہ کو تو اب
 مجھے کیسے پتہ چلے کہ میرے اس عمل سے اللہ خوش بھی ہے یا نہیں؟ ہو سکتا ہے میں
 یہ سمجھوں کہ اللہ بڑا خوش ہے اور وہ ناامان بیٹھا ہو۔ آخر کیسے پتہ چلے کہ اللہ خوش بھی ہے
 یا نہیں؟ نہ اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ ہم خود اللہ سے پوچھ آئیں کہ تو خوش بھی ہے
 یا نہیں؟

ابے ستار! تم میں سے کون اللہ کے گھر جانے کو تیار ہے؟

دیکھنا! کسی کچھ بد رستی بھیج دیں تو وہ واپس نہیں آتا اور جو کہتے ہیں کہ اللہ خوش ہے تو انہوں نے ابھی تک اللہ سے ملاقات ہی نہیں کی۔ آتمکس سے جاڑ بھیجیں کہ اللہ ہمارے اعمال سے خوش ہے یا نہیں؟ کیونکہ جس کی پسند کا کام کرنا ہے وہ پردہ نشین ہے اور جنہوں نے کام کرنا ہے وہ نامحرم ہیں۔ نامحرم وہاں تک جا نہیں سکتا اور پردہ نشین ہم تک آ نہیں سکتا۔ لہذا اب چکیے چلے کہ ہمارے عمل سے وہ پردہ نشین معبود خوش بھی ہے یا نہیں؟

حضور والا!

یہ کوئی فلسفے کی بات نہیں۔ کوئی الجھا ہوا مسئلہ نہیں۔ سیدھی سادھی بات ہے کہ پردہ نشین کی پسند معلوم کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ جس طرح ایک نوجوان نے شادی کی۔ نوجوان کا عالم، نئی نئی شادی اور بیگم صاحبہ گھر آئیں۔ اور آتے ہی دو لہا سے فرمائش کر دی کہ میرے لئے سونے کا ایک ہار بنوا دو۔ چنانچہ دو لہا نے اپنی بقی کے سنار کو گھر بلایا اور کہا:-

”میری بیگم کے لئے ایک ہار بنادو۔“

سنار نے کہا: ”حضور! کیسا ہار بناؤں؟“

نوجوان بولا: ”ایسا ہار بناؤ جو میری بیگم کو پسند آجائے۔“

سنار نے کہا: ”جناب میں بیگم سے اُن کی پسند پوچھ سکتا ہوں؟“

نوجوان بولا: ”خیر رہے۔ میری بیگم پردہ نشین ہے۔ نہ غم وہاں جاسکتے ہیں۔“

اور نہ ہی وہ باہر آ کر بنا سکتی ہے۔“

آخر ایک عقل مند نے سمجھا یا کہ یہ بات تو آسان ہے۔ اگر تم بیگم کی پسند کا ہار

بنانا چاہتے ہو تو اس سے کہو کہ وہ اپنی پسند کا ہار بنوانے کے لئے کوئی نمونہ دے

چنانچہ بیگم نے ایک نمونہ دے دیا۔ اور سنار اسے لیکر گھر آگیا۔ اب سنار پر یہ فرض ہے کہ

وہ اپنی عقل کو دخل دے۔ بلکہ جو نمونہ اس گھر سے آیا ہے بالکل اس کے مطابق عمل کرتے رہیں گے جو نمونہ اُدھر سے آیا ہے اسے دیکھتے نہ ہوا اور عمل کرتے نہ ہونا کہ اپنا کوئی نمونہ کھڑا لینا۔

دیکھو نا! اگر اللہ کو خوش کرنے کے لئے عبادت کرنی ہے تو صرف اسی نمونے کے مطابق کرنا جو اُدھر سے آیا ہے۔ ہو سکتا ہے تمہاری صند و فنی میں کوئی بڑا خوبصورت نمونہ ہو مگر وہ تمہارا اپنا بنایا ہوا ہے۔ جو اسے پسند نہ آئے لہذا تم اس نمونہ پر عمل کرنا جو اُدھر سے آیا ہے نہ کہ اُدھر سے آیا ہو۔

محترم سامعین!

اللہ نے جی سی انتظام فرمایا کہ ہمیں سمجھانے کے لئے اس مقدس کتاب کو لکھنے کیلئے اپنی عبادت کو دانے کے لئے ہمارے ایمان کو مستحکم کرنے کے لئے ہمیں اس میں بنانے کے لئے۔ اللہ نے ایک نمونہ بھیجا اور نمونے کے ساتھ ساتھ اس کے لئے لازماً کتب بھی بھیج دی اور کہا۔

دیکھو! یہ کتاب ہے اور یہ اس کتاب کو لیکر آیا ہے۔ کتاب کو پڑھو اور کتاب دانے کو دیکھنا۔ دونوں مل کے تمہیں بتائیں گے کہ یہ نمونہ ہے اور دیکھو! یہ وہ کتاب ہے جو لازماً **فِیہا** ہے۔ جس میں کوئی شبہ ہی نہیں ہے۔ جس کا نکتہ سہی۔ جس کا زیرو زبر صحیح۔ جس کا لفظ سہی۔ جس کا سکون سہی جسکی حرکت سہی جسکی حیثیت سہی۔ جس کا انداز سہی۔ جو سُر سے پریک صحیح ہی صحیح ہے جسے حق نے اتارا ہے۔ اس پر اتارا ہے۔ حق اس کے مضامین میں۔ حق اس کے مطالب میں۔ حق اس کی تعلیمات میں۔ حق اس کے بیانات میں۔ حق اس کا خلاصہ ہے حق اس کا پہنچانے والا ہے۔ حق اس پر عمل کرنے والا ہے۔ حق اسے لانے والا ہے۔ لہذا کسی کو حق نہیں ہے کہ اسے ناحق کہے۔

گویا یہ کتاب "لاریب فیہ" ہے جو میں تمہیں بھیج رہا ہوں اور اس "لاریب فیہ" کتاب کو لانے والا بھی "لأعین فیہ" ہے۔ کتاب میں ریب نہیں اور پہچانے والے میں عیب نہیں۔ لہذا کسی "عیب دار" کی مجال نہیں کہ وہ "لاریب فیہ" کتاب کے مالک ہونے کا دعویٰ کرے۔ اور سن لو ابھی مخرج سے کہ اس کتاب کا مصنف میں خود ہوں۔ یہ کتاب میری اپنی تصنیف کردہ ہے۔ میں نے ہی تصنیف کرنے کے بعد اس کتاب کے شائع کرنے کا بھی انتظام کیا تاکہ یہ کتاب چھپ کر دنیا کے سامنے آجائے۔

سَامِعِینَ کَرَامَ!

سب سے پہلا پریس جس میں اس کتاب کو خدائے پھپھوا چاہا اس پریس کا نام تھا آڈم پرنٹنگ پریس۔ خدائے چاہا کہ اپنی کتاب کو یہاں چھپوا دے۔ لہذا جب آڈم پریس میں کتاب چھپنے کی نوبت آئی تو کسی آتش مزاج سے جھگڑا اٹھ گیا۔ اللہ نے کہا ہم اپنی کتاب یہاں نہیں چھپوا کرے۔

چنانچہ کچھ دنوں بعد "نوح پرنٹنگ پریس" قائم ہوا۔ اللہ نے اپنی کتاب یہاں چھپنے کے لئے دی مگر ابھی کتاب کے چھپنے کا ارادہ ہی تھا کہ نوح پریس سیلاب کی زد میں آگیا۔ چنانچہ کسی اور پریس کی تلاش شروع ہو گئی۔ بالآخر براہیم پریس بنا۔ خدائے چاہا کہ اپنی کتاب یہاں چھپوا لیں۔ چنانچہ پریس کے پروپرائٹر سے پورا معاہدہ بھی ہو گیا۔ حق اشاعت بھی ملے ہو گئے۔ مصنف نے پریس والے کو اپنا "خلیل" بھی بنا لیا۔ جب سارے مرحلے طے ہو گئے مگر جب چھپنے کا وقت آیا تو اللہ جانے پریس والے کی آنکھوں پر کیا پٹی بندھ گئی کہ اعلیٰ حضرت نے اپنی کتاب رکوادی کر یہاں نہیں چھپے گی۔

اس کے بعد "موسٹی پریس" قائم ہوا۔ کتابت بھی ہو چکی تھی۔ کتاب

منقریب پہنچنے والی تھی کہ جب پتھر پہ چڑھی تو پتھر جل گیا۔ بہرِ نوح کتاب یہاں بھی نہ چھپ سکی۔

اس کے بعد جب ”عینے پریس“ میں کتاب گئی تو پریس والا پریس چھوڑ کر آسمانوں پہ چلا گیا۔ گویا اعلیٰ حضرت کی کتاب یہاں بھی نہ چھپ سکی۔
 آخر کار مصنف نے کتاب کو اپنے پاس محفوظ رکھا۔ کچھ دن بعد عرب کی خشک آب و ہوا میں ”محمدی پریس“ قائم ہوا۔ اللہ نے پریس کے پردہ پر اثر سے کہا۔

”محمد! سنتے بھی ہو۔ ہماری کتاب چھپوا دے“

محمد نے جواب دیا۔ ”ہاں۔ ضرور چھپوا دیں گے۔“

اللہ نے پوچھا ”محمد! چھپائی کی اجرت کیا ہوگی؟“

محمد نے کہا۔ ”خداوند! اجرت یہی ہے کہ میرے ساتھ وعدہ کر دو کہ اس کتاب کا حقِ ضاعت میرے پاس محفوظ رہے گا۔ تاکہ میرے بعد کوئی آکر یہ نہ کہے کہ میرے پاس بھی کتاب آئی ہے۔“

اللہ نے کہا ”محمد! میں تو کسی اور کو اس کی اجازت نہیں دوں گا۔ اگر تیرے ہی ”غلاموں“ میں سے کوئی بک دے تو میں کیا کروں۔“

بہرِ نوح! یہ کتاب محمدی پریس میں چھپی اور بچکنے کے بعد پریس کے دروازہ پر دھجی کا پیرہ بٹھا دیا گیا۔ ”وَعَايِنُطْنُ عَنْ الْوَلَدِ الْم“ تاکہ باہر کی بات آنے نہ پائے۔ اور اپنی بات باہر جانے نہ پائے۔ الغرض کتاب چھپ کر سنائے آگئی اور ہمیں حکم ہوا کہ تم اس کتاب کو پڑھو۔ لہذا ہم نے کتاب کو پڑھنا شروع کیا۔ کتاب کے شروع پر لکھا تھا۔ ”اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ“

”وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ“

ہر اس شے پر جو تجھ پہ نازل کی گئی

”وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ“

اور ہر اس شے پر جو تجھ سے قبل نازل کی گئی

گو یا د چیزوں پر ایمان لاتے ہیں۔ ایک اس چیز پر جو محمد پر نازل ہوئی اور ایک اس چیز پر جو محمد سے قبل نازل ہوئی۔

علمائے کرام!

خدا آپ کے علم میں ترقی عطا فرمائے۔ آج مجھ غریب شہر کی بات بھی سن لو چونکہ میں حافظ نہیں ہوں۔ ہو سکتا ہے میں نے آیت غلط پڑھ دی ہو۔ خدا را۔ مجھے بتائیے کہ اس سے آگے بھی کچھ ہے؟

”مولانا! آخرت کی باتیں ابھی نہ کیجئے۔ ابھی ایمان کی بات ہو رہی ہے۔ میں پوچھ رہا ہوں کہ اس آیت میں ”محمد پر اور اس سے قبل“ کے بعد کوئی اور ایمان کی بات ہے؟ ہرگز نہیں۔

کیوں مولانا! اگر خدا یہ بھی کہہ دیتا کہ ”مَنْ تَبِعِدْ“ تو کیا کتاب کا حجم بڑھ جاتا۔ اسے حفظ کرنے میں کوئی خرابی واقع ہو جاتی؟ ہرگز نہیں۔

سَامِعِينَ!

اگر محمد کے بعد کوئی چیز ایمان لانے کے قابل ہے اور اللہ نے نہیں لکھا اور ہم ایمان نہیں لائے تو اس میں ہمارا کیا قصور ہے۔ ہم تو اللہ سے ہی پوچھیں گے۔ ”خدا و ندا۔ معاف کرنا۔ اگر محمد کے بعد بھی کسی کو بھیجنا تھا تو ”مَنْ تَبِعِدْ“

کیوں نہیں بتایا۔ آج ہم صرف تیرے نہ لکھنے کی وجہ سے نہیں مان رہے۔ اگر تو من بعد ؟ لکھ دیتا تو ہمیں کیا اعتراض تھا۔

بزرگوار من!

اقول دین تین ہیں۔ توحید۔ نبوت اور قیامت

توحید و نبوت پر ہمارا ایمان ہے اور قیامت پر ہمارا یقین ہے۔

اور یقین و ایمان میں فرق ہے۔

دیکھنا! اگر بڑے زور کی بارش ہو رہی ہو تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ آج بارش کیا ہوئی، قیامت ہے۔ اسی طرح کوٹہ میں جب زلزلہ آیا تو ہم نے کہہ دیا۔ قیامت آگئی، حالانکہ قیامت نہیں آئی تھی مگر ہم نے استعارہ کے طور پر قیامت کہہ دیا۔ اگر قیامت کا لفظ ہم استعارہ کے طور پر تشبیہ کے طور پر شاعری کے طور پر استعمال کر سکتے ہیں جس طرح اگر یہاں مولانا استہشام الحق تھا الذی تقریر کرتے ہیں۔ (جیسا کہ انہوں نے یہاں پڑھنا تھا جو کسی وجہ سے نہ آسکے)۔ ہر نوع وہ اگر آجائے اور یہاں تقریر کرنے کو سامعین بہت لطف اندوز ہوتے۔ اب مولانا موصوف کی تقریر ٹھیکہ کیا ہم استعارہ کے طور پر تشبیہ کے طور پر شاعری کے طور پر یہ کہہ سکتے تھے۔ کہ مولانا موصوف کی تقریر کیا ہے بس "نبوت ہے" ہرگز نہیں۔

معلوم ہو کہ توحید و نبوت اتنی مستحکم چیز ہے کہ جس کا نام تشبیہ و استعارہ کے طور پر بھی نہیں لیا جاسکتا۔ مگر یقین وہاں ہے جہاں شاعری کے طور پر لیا جاسکتا ہے۔

ہر نوع! اللہ نے کہہ دیا کہ ایمان لاؤ محمد پر اور ان چیزوں پر جو اس پر نازل کی گئی ہیں۔ اور ان چیزوں پر جو اس سے قبل نازل کی گئی ہیں۔ وہ کیا محمد کے بعد؟ یہاں تمہاری مرضی، ہم تو کچھ نہیں کہیں گے۔ تم جاننا اور تمہاری مرضی۔

معزز سامعین!

محمدؐ کتاب لے کر آگئے۔ اور فرمایا کہ اسے پڑھو۔ اسے سمجھو۔ اور کتاب بنے بھی اعلان کر دیا کہ دنیا کا کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے جو اس کتاب میں نہ ہو اور دیکھو! اس کتاب کے پہنچانے والے نے کہہ دیا کہ دنیا کا کوئی ایسا علم نہیں ہے جو میں تمہیں سمجھا نہ سکوں اور یہ اعلان وہ انسان کر رہا ہے جو آئی ٹھھا جس نے پڑھا ہی کچھ نہیں۔

کیوں بچو!

تمہارے رسولؐ نے کسی درس میں پڑھا تھا؟ ... ہرگز نہیں دیکھو! جمہوریت کا زمانہ ہے۔ ڈرگت ہے کہ اگر مذہب کا معاملہ بھی ہو تو پھر بھی جمہور سے پوچھنا پڑتا ہے اگرچہ یہ غلط ہے۔

سامعین!

میں آج ہی لاہور سے آیا ہوں۔ تاکہ یہاں آپ کے سامنے کچھ بیان کروں۔ اب اگر میں اسٹیج پہ کھڑے ہو کر بجائے تقریر کرنے کے۔ اپنی جیب سے ایک کتاب نکال لوں اور پڑھنا شروع کر دوں۔ ادھر لوگ کہتے ہیں۔

”مولانا! تقریر شروع کریں“

میں کہتا ہوں ”ابھی ٹھہرو“

تھوڑی دیر بعد پھر آواز آئی۔ ”زیدی صاحب! شروع کرو!“

میں نے کہا ”ٹھہر دھبی“

جب دس پندرہ منٹ اسی طرح گزر گئے تو تمام مجمع اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اور

کہنے لگا۔

”زیدی صاحب! اگر یہاں آنکری پڑھنا تھا تو تکبیر کیوز فرمائی نہیں تو

ایسا مولوی چاہیے جو گھر سے پڑھ کر آیا ہو۔

صاحبان!

جب آپ ایسے مولوی کو برداشت نہیں کر سکتے جو یہاں آکر پڑھے تو ایسے نبی کو کون برداشت کرے گا جو یہاں آکر پڑھا ہو۔ لہذا ہم تو ایسے نبی کو مانتے ہیں جو یہاں آئے نہ پڑھے، اُقی، کہلوائے مگر کائنات کا کوئی علم ایسا نہ ہو جس پر اسے عبور نہ ہو۔ بہر نوع ہمارا بے پڑھا نبی آگیا۔ اور اس نے کہا۔

”دیکھو! میں پڑھا نہیں مگر سب کو پڑھاؤں گا۔ کوئی ایسا علم نہیں جو میرے علم سے باہر ہو۔ کوئی ایسا مسئلہ نہیں جسے میں نہ جانتا ہوں۔ کوئی ایسی شے نہیں جو مجھے معلوم نہ ہو۔ میں تمہارا ہادی بن کر آیا ہوں۔ تمہیں دین بھی سکھاؤں گا اور تمہیں دنیا بھی سکھاؤں گا۔ کوئی ایسی شے نہیں جو تمہیں بتانے سے رہ جائے لہذا تمہیں ہر شے سکھائی جائے گی۔“

چنانچہ محمدؐ نے ہمیں ہر شے سکھا کے، ہر شے پڑھا کے، بھیجنے والے کی زبان سے کہلوادیا، ”اَلْیَوْمَ اَکَلْتُ“ آج کمال ہو گیا۔ آج وہ نبوت جو میری نعمت تھی وہ ”تمام“ ہو گئی۔

بھائیو! ”نعمت“ کے ”تمام“ ہونے کا لفظ بتاتا ہے کہ ”نعمت“ والی نبوت جو تھی وہ تمام ہو گئی اب اگر کوئی ”بے نعمت“ والی نبوت آجائے تو میں کیا کروں۔ بھلو کیف! بے پڑھے نے ہمیں سب کچھ پڑھا دیا لہذا اسکے بعد ہمیں کسی اور نبوت کی مرکز ضرورت نہیں

بچو!

اگر تم ہنسو گے نہیں تو ایک بات سناؤں؟

دیکھو نا! جب میں نے شروع شروع میں مجالس پڑھنا شروع کیں تو ایک دن کسی نے مجھے کہا، ”قبیلہ زیدی صاحب“

میں نے کہا، ”توبہ کرو۔ میں کیسے قبلہ بن سکتا ہوں۔ قبلہ تو علماء ہوتے ہیں لہذا مجھے قبلہ مت کہو۔“

چند دن بعد کسی نے پھر کہا۔ اور میں نے پھر منع کیا۔ چنانچہ تین چار مہینے شروع شروع میں منع کرتا رہا کہ میں قبلہ نہیں ہوں۔ جب پچاس آدمی مجھے قبلہ کہنے لگے تو میں چیپ ہو گیا۔ اور جب سو دو سو آدمی کہنے لگے تو میں نے کہا۔

”ہو سکتا ہے کہ میں قبلہ ہی ہوں۔“

اب مجھے بھی یقین ہو گیا۔ کچھ دن بعد تو یہ حالت بھی ہو گئی کہ اب اگر کوئی قبلہ نہیں کہتا تو بڑا لگتا ہے۔

حضور والا!

اس طرح بن جاتا ہے بننے والا اور نہ یہ مشہور تاریخی شخصیتیں جنہیں ”فرعون“ و ”نمرود“ کہتے ہیں۔ کیا وہ پاگل تھے۔ کیا انہیں پتہ نہیں تھا کہ ہم خدا نہیں ہیں؟ حالانکہ ان سمجھوں کو پتہ تھا کہ ہم خدا نہیں ہیں مگر پاس بیٹھنے والے بیوقوف اسحق جو کہہ رہے تھے کہ تم خدا ہو۔ لہذا انہوں نے سوچا کہ کیوں نا ان احمقوں سے فائدہ اٹھائیں اور خدا بن جائیں کیونکہ مفت میں بن رہے تھے۔ لہذا فرعون و نمرود خدا بن کے بیٹھ گئے۔ اور یاد رکھو! لفظ فرعون و نمرود اس بات کی علامت ہے کہ ایسا شخص جو ایسی بات کا دعویٰ کرے۔ جو اس میں نہیں ہے تو وہ فرعون و نمرود ہوگا۔ چاہے وہ زید ہو یا بکر ہو۔

اگر اپنی فرعونیت کو مستحکم کرنے کے لئے فرعون نے بھی اپنے وزیر ”ہامان“ کو حکم دیا کہ میرے لئے ایک ”مینار“ تو بنوادو۔

گویا فرعون کی یہ پہچان ہے کہ جب کوئی فرعون بنتا ہے تو اپنے لئے ایک ”مینار“ بھی بنواتا ہے تاکہ اس کی پہچان ہو سکے۔ بہر نوع یوں بن جاتے ہیں اپنے

اب ان سے کوئی پوچھے کیوں بنتے ہو؟۔ تو وہ جواب میں کہیں گے، ”لوگ جو بنا رہے ہیں اس لئے ہمیں بننا پڑے گا۔“ ہم نے پوچھا، ”تہیں معلوم نہیں کہ اس کی سزا کیا ہے؟“

وہ جواب میں کہتے ہیں، ”ہمیں اپنا انجام معلوم ہے کہ دنیا میں تو عیش کریں گے اور آخرت میں زیادہ سے زیادہ یہی ہو گا کہ جہنم میں چلے جا بیٹھیں گے۔“

سامعین کرام!

آج ہم خدا کے فضل و کرم سے اکٹھے بیٹھے ہیں۔ ایک ہی نبی کا کلمہ پڑھتے ہیں۔ اور ہمارا کلمہ پڑھنے کا مطلب یہی ہے کہ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ جس طرح خدا کے بعد نہ کوئی اور خدا ہو سکتا ہے۔ اسی طرح ”مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ“ کے معنی یہی ہیں کہ محمدؐ کے رسول ہونے کے بعد نہ قیامت تک کوئی دوسرا رسول ہو سکتا ہی نہیں۔

یاد رکھو!..... محمدؐ کے بعد نہ تو ابوبکرؓ نبی ہو سکتا ہے اور نہ ہی علیؓ نبی ہو سکتے ہیں۔ نہ ہی حسنؓ نبی ہو سکتے ہیں اور نہ ہی حسینؓ نبی ہو سکتے ہیں۔ ان تمام حضرات کی عزت اسی بات میں ہے کہ وہ ختم نبوتؐ کی حفاظت میں مر گئے۔ ان کی شان اسی بات میں ہے کہ وہ ختم نبوتؐ کی حفاظت کرتے رہے۔

صاحبان فکر!

تاریخ عالم گواہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں جب ”مسلمہ کذاب“ کو قتل کیا گیا تھا تو اتنا اتحاد مسلمانوں میں کبھی ہوا ہی نہیں جتنا اس سحرے کے قتل کے وقت ہوا تھا۔ حالانکہ مسلمہ کذاب اہلیت کا ماننے والا تھا، اصحاب کا ماننے والا تھا۔ اور وہ کلمہ بھی یہی پڑھتا تھا لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ محمدؐ رسول اللہؐ اس کی اذان بھی یہی تھی ”أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ - أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللَّهِ“ اور ساتھ یہ بھی کہہ دیتا تھا کہ محمدؐ بھی نبی ہیں۔ مگر چھوٹا سا میں بھی

نبی ہوں :

بچو! ایک بات بتا دوں کہ منکر وہ ہوتا ہے جو کسی بات سے انکار کرے اور مشرک وہ ہوتا ہے جو کسی بات میں شریک ہو جائے۔ لہذا شرک اور چیز سے انکار کرنے والا مشرک کہلاتا ہے جس طرح مسیہ کذاب نے شریک باری تعالیٰ ہونے کے ساتھ ساتھ ختم نبوت سے انکار بھی کیا جس کا جواب اس کے قتل کی شکل میں اہلبیت رسول و اصحاب رسول نے دیا۔

سامعین!

یاد رکھو! اگر کسی کو یہ گمان بھی ہوتا کہ محمد کے بعد کوئی اور نبی آسکتا ہے تو محمد کی اتنی مخالفت نہ ہوتی جتنی ہو رہی ہے۔ محمد کی مخالفت جو ان کی اولاد تک جاری رہی اس کا اصل نکتہ یہی ہے کہ اب نبی کوئی نہیں آئے گا۔

علمائے کرام!

آج میں آپ صاحبان کے سامنے حلفیہ کہتا ہوں کہ اگر یہ نیکو یہ پتہ ہوتا کہ محمد کے بعد کوئی نبی آسکتا ہے تو وہ اتنے بڑے سانحہ عظیم کا ذمہ دار نہ بنتا۔ بلکہ خاموش ہو جاتا کہ چلو کوئی بات نہیں پانچ پچھ سال بعد نبوت کا دعویٰ کروں گا۔ مگر یہ جانتا تھا کہ یہ دعویٰ نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اس نے کہا کہ اہلبیت رسول کو قتل کر دو۔

سامعین!

یہ میرے بیان کے آخری فقرے ہیں کہ آل محمد نے اور اصحاب محمد نے ختم نبوت کی حفاظت کے لئے کہیں منکر ختم نبوت کو قتل کر کے ختم نبوت کو بچایا اور کہیں اپنے آپ کو قتل کر کے ختم نبوت کو بچایا۔ اور پھر

حسین کے یہ آخری فقرے آج بھی فضا میں گونج رہے ہیں۔ یوم عاشور

ریت کے ٹیلے پہ کھڑے ہو کر حسین مسلمانوں کے جمع سے کہہ رہا ہے ۔
 ”مسلمانو! بسُن لو۔ زمین و آسمان سُن لے۔ اللہ کے فرشتے سُن لیں
 فضا و ہوا سُن لے۔ خلا سُن لے۔ پانی کے قطرے سُن لیں۔ ہوا کے ذرے سُن لیں شجر و درجہ
 سُن لیں۔ دُنیا کی ہر شے سُن لے۔ پوری کائنات سُن لے کہ میں کہہ رہا ہوں۔
 ”ان ابن رسول اللہ“ میں بیٹا ہوں رسول کا لہذا ابذلتک بنی کا
 بیٹا پیدا نہیں ہو گا۔ کیونکہ نہ بنی ہو گا اور
 نہ ہی بنی کا بیٹا ہو گا۔

”ان ابن بنت رسول اللہ“ میں محمد رسول اللہ کی بیٹی کا بیٹا ہوں۔
 کیونکہ قیامت تک رسول کی بیٹی کا بیٹا
 نہیں آئے گا۔ نہ رسول ہو گا نہ اسکی
 بیٹی ہوگی اور نہ اس کا بیٹا ہو گا۔

یہ کہہ کر حسین نے بلند آواز سے کہا: ”هل من فاصو“

کوئی ہے جو ختم نبوت کے بچانے میں بھی مدد کرے؟
 بہر نزع یہ فقرہ آج بھی فضا میں گونج رہا ہے اور ہم حسین سے وعدہ کرتے ہیں
حسین!

ہم وعدہ کرتے ہیں کہ تیرے نانا کی ختم نبوت کو محفوظ رکھنے کے لئے ہر وہ قربانی جو
 ہم دے سکتے ہوں۔ دیں گے۔ مگر ختم نبوت پر آغوش نہیں آنے دیں گے۔ یہ کبھی ہم ہی نہیں
 سکتا کہ

ہو سیہ خانوں کی رونق اور آئینہ خانے میں

شمع گل ہونے سے پہلے کیوں نہ پرلے میں

لہذا آج ہم عہد کرتے ہیں کہ ہم پر دانے موجود ہیں اور شمع محمدی پر جلنا ہمارا

فرض ہے۔

محترم بزرگو!

آج مجھ سے پوچھا جا رہا ہے کہ ختم نبوت پر ایمان نہ رکھنے والے مسلمان ہیں یا نہیں؟ تو عرض ہے کہ ان کے مسلمان ہونے یا نہ ہونے سے پہلے مجھے یہ ڈر کھائے جا رہا ہے کہ میں اپنے لئے کیا فیصلہ کروں کہ آیا میں بھی مسلمان ہوں یا نہیں؟ اور وہ اس لئے کہ میں نے اخباروں میں پڑھا ہے اور اپنے کانوں سے سنا ہے کہ اس ملک کے بانی تائیدِ مظلّم کے جنازے پر کھڑے ہو کر یہ کہا گیا تھا کہ ”میں ایک مسلمان حکومت کا کافر ملازم ہوں یا ایک کافر حکومت کا مسلمان ملازم ہوں۔“

بہرِ نزاع جو شخص یہ کہہ رہا تھا کہ اگر تم مسلمان ہو تو میں کافر ہوں اور اگر میں مسلمان ہوں تو تم کافر ہو۔“

لہذا آج میں اس شخص کے فیصلہ کے مطابق اپنے لئے فیصلہ کرتا ہوں کہ اگر میں مسلمان ہوں تو بقول اس کے وہ خود بخود کافر ہو گیا۔ ورنہ میں کافر ہونے کا فیصلہ کروں گا۔ مجھے تو اپنے بارے میں فیصلہ کرنا ہے۔

اور یاد رکھو!

حکومتیں کوئی فیصلہ نہیں کیا کرتیں۔ یہ فیصلہ ہیں کرنا ہے۔

دیکھو نا! نبوت سے قومیں بنتی ہیں اور ان میں اشتراک پیدا ہوتا ہے اور قومیں ادھر ادھر ہوتی ہیں۔ اب آج اگر کوئی صاحبِ نئی نبوت لیکر آئے ہیں تو وہ الگ، اُمت ہو گئے اور ہم الگ اُمت ہو گئے۔ اب جب ہم الگ الگ اُمت ہو گئے تو ہمیں کون مجبور کر سکتا ہے کہ ہم ایک ہو جائیں بلکہ وہ تو علیحدہ اُمت بن کر

ہم سے علیحدہ ہو چکے ہیں۔ لہذا ہم علیحدہ ہیں اور وہ علیحدہ ہیں۔ بس اسی علیحدگی کا نام تم نے ”سائیکلاسٹ“ رکھ لیا حالانکہ ”سائیکلاسٹ“ کوئی مذہبی چیز نہیں ہے

بائیکاٹ کا تو صرف مطلب یہی ہے کہ ”تم اور ہو۔ اور ہم اور ہیں“ ہم کسی کو مارنے نہیں۔ ہم کسی کو ستاتے نہیں۔ ہم تو یہی کہتے ہیں کہ تم اور ہو۔ ہم اور ہیں۔ تم نے خود ہی نئی نبوت بنا کے اپنے کو علیحدہ کر لیا لہذا تم اور ہو۔ ہم اور ہیں۔ ہمارا تمہارا کوئی میل نہیں۔ ہمارا تمہارا کوئی رشتہ نہیں۔ ہمارا تمہارا کوئی ناظم نہیں لہذا تمہارا یہ کہنا کہ ہمارا بائیکاٹ کیوں کرتے ہو؟ اگر ہم نے کوئی نئی نبوت بنائی ہے تو تمہیں کیا اعتراض ہے۔ شیعہ سنی بھی تو آپس میں لڑتے ہیں؟

سامعین!

ہم کب کہتے ہیں کہ ہم شیعہ سنی آپس میں نہیں لڑتے۔ ہم لڑتے ہیں اور انشاء اللہ قیامت تک لڑتے رہیں گے۔ مگر

یاد رکھو!.... اگر کوئی سنی مجھے قتل بھی کر دے گا تو میرا جنازہ بھی وہی پڑھے گا۔ مجھے دفن بھی وہی کرے گا۔ رہ گئی ہماری لڑائی تو وہ صرف یہی ہے کہ شیعہ سنی دونوں ہم بھائی ہیں اور ہم دونوں بھائی اس بات پر جھگڑ رہے ہیں کہ محمد ہم دونوں کے باپ ہیں۔ شیعہ کہتا ہے کہ میں اپنے باپ کو زیادہ پیارا ہوں اور سنی کہتا ہے ”میں باپ کو زیادہ پیارا ہوں گویا شیعہ سنی کا تو اس بات پر جھگڑا ہے کہ باپ کو پیارا کون ہے؟ اور جس کی مالِ شخصِ ہی اور کر لیا ہو اس کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ ہمارے ذاتی معاملات میں دخل دے۔

حضرات!

اگر منطق کی رو سے۔ کسی فلسفے کی رو سے کسی استدلال کی رو سے آج میں یہ کہوں کہ میں نبی ہوں اور میرے نبی ہونے کی دلیل یہ ہے کہ شیعہ سنی آپس میں لڑتے ہیں تو آپ کہیں گے کہ ”اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ یہ پاگل ہو گیا ہے“ کیونکہ شیعہ سنی کا جھگڑا اور جڑ سے اور نبوت کی دلیل اور چیز ہے۔ اگر ہم شیعہ سنی لڑتے ہیں

توڑنے دو۔ ہماری لڑائی کا ذکر چھڑنے کا مقصد یہ ہے کہ ان احمقوں کے پاس اپنی نبوت کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ یونہی خواہ مخواہ کے لئے ہماری لڑائی کی بات چھیڑ دیتے ہیں۔ شیعہ سنی کی لڑائی ہمارے گھر کی بات ہے۔ ہمارا اپنا قصہ ہے۔ کسی کو ہمارے گھر میں معاملات میں دخل دینے کی ضرورت نہیں ہے۔

سامعین!

پاکستان بننے سے پہلے میں تادیان (ہندوستان) میں تقریر کر رہا تھا اور میرے سامنے ایک تختہ سیاہ لٹکا دیا گیا جس پر لکھ دیا گیا۔ ”آپ کا مذہب شیعہ ہے؟“ میں نے کہا۔ ”جی ہاں۔ فرمائیے کیا بات ہے؟“

”زیدی صاحب! یہ بتائیں کہ شیعہ صاحبان کا خلفائے ثلاثہ کے بارے میں کیا عقیدہ ہے؟“

میں نے کہا، ”آپ کو کیا تکلیف ہے۔ آپ کون ہیں پوچھنے والے؟“

”زیدی صاحب! ہم تو یونہی پوچھ رہے تھے۔“

میں نے کہا میری بات سنو! ہر شیعہ کا یہ عقیدہ ہے کہ خفصاء ثلاثہ کا گھوٹا جس جگہ پر پیشاب کرتا تھا۔ اس کے قطرے کے برابر بھی ”نبیاً نبی“ نہیں ہو سکتا۔ ہمارا تو یہ عقیدہ ہے۔ تم اپنی منکر کرو۔ تمہیں ہمارے جھگڑے سے کوئی واسطہ نہیں۔

دیکھو نا!

یہ ایسی شریڈیا ہوئی کہ آج ہم بھائی بھائی ملے بیٹھے ہیں گھر جا بیٹھے۔ آپس میں تقسیم پر لڑیں گے۔ شریک جو ہوئے۔ ہر لڑنے والے آج ہم دشمن کے سامنے اکٹھے بیٹھے ہیں۔ اور ان شاء اللہ اکٹھے مل کر دشمن کے سوال کا منہ توڑ جواب دیں گے۔

صاحبان! جب ہم ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان آئے

تھے تو راستے میں ”غیر مسلم“ ہمارے قافلوں پہ حملے کر رہے تھے تو بتاؤ!
اس وقت ہمیں قتل کرتے وقت وہ پوچھا کرتے تھے کہ تم سُنی یا شیعہ ہو؟
ہرگز نہیں۔

لہذا جب ہم قتل ہونے کے لئے ایک تھے تو زندہ رہنے کے لئے کیوں نا ایک ہی
بہر نوع یہ فضول باتیں آج نہیں چلیں گی۔ آج فیصلہ ہو کے رہے گا۔ دودھ کا دودھ
اور پانی کا پانی ہو کر رہے گا۔ یا ہم مسلم ہیں یا تم کافر ہو۔ یا میرا گریبان چاک یا اپنا
گریبان چاک۔ یہ فیصلہ ضرور ہوگا۔ دیر میں ہو۔ جب ہو میرے یہ فیصلہ ہو کے رہے گا
اور رہ گیا۔ ”امن“ تو سنو ہمیں امن کی تلقین کرنے والو!

ہم سے بہتر پُر ”امن“ نہ کوئی ہے اور نہ ہی ہوگا۔ ہم تو بالکل پُر امن ہیں۔
دیکھو نا! ہم ہیں ”مومن“ اور مومن کا لفظ ”ایمان“ سے بنا ہے اور ایمان
ہے افعال کے وزن پر اس کا مادہ ہے اَمَن۔ لہذا امن نہ ہو تو ایمان نہیں ہوتا۔
بہر نوع مومن تو ہوتا ہی پُر امن ہے۔ آج تم ہمیں امن کی تلقین کرتے ہو جہاؤ
پہلے اپنے کو پُر امن بناؤ۔

اب معترض کہتا ہے ”زیدی صاحب! ایمنوں نے دودھ پلایا تھا“ اور
ساتھ ہی مثال یہ دیتے ہیں کہ علیؑ نے بھی اپنے قاتل کو شربت پلایا تھا۔
میں کہتا ہوں ”اگر میرے دادا علیؑ نے اپنے قاتل کو شربت پلایا تھا تو اگر فروت
پڑی تو میں بھی اپنے قاتل کو شربت پلادوں گا مگر تمہارے پاس کوئی ایسی دلیل نہیں ہے
کہ علیؑ نے ”ختم نبوت“ کے منکر کو شربت پلایا ہو۔

بہر نوع بائیکاٹ کا مطلب یہ ہے کہ تم اور ہو، ہم اور ہیں، ہمارا ہمارا کوئی واسطہ
نہیں۔ ہمارا ہمارا کوئی تعلق نہیں۔ اس میں نہ کوئی جھگڑا ہے اور نہ ہی کوئی ٹرائی
بھیر کیف! ہم بڑے پُر امن ہیں اور پُر امن رہیں گے۔ انشاء اللہ۔ اور

عہد کرتے ہیں کہ ہم اپنے "ایمان" کے زور سے ہر "بے ایمان" کو منائیں گے
کہ یا تو اسے "مومن" ہونا پڑے گا یا پھر ہم سے علیحدہ رہنا پڑے گا۔

بزرگاری من!

خدا شاہد ہے۔ اس میں تو بہت فائدہ ہے کہ اگر کوئی "غیر مسلم" اقلیت ہو جائے
کیونکہ غیر مسلم اقلیت "ہونے سے وہ ہماری حفاظت میں آجائیں گے۔ وہ ہماری ذمی
بن جائے گی اور ہم اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہو جائیں گے۔ فرق صرف یہ ہے
کہ وہ ذمی ہماری حصہ دار نہیں رہے گی۔ شریک نہیں رہے گی بلکہ ہماری "رعایا"
بن کے ہماری حفاظت میں آجائے گی۔

سامعین!

میں اپنے بیان کو یہاں آ کر ختم کرتا ہوں کہ میں نے اپنی پوری تقریر میں نہ تو
کسی صاحب کا نام لیا اور نہ ہی کسی پر فردا فردا تنقید کی ہے۔ صرف حقیقت بیان
کی ہے یا اپنا عقیدہ بیان کیا ہے۔

عزیز بچو!

دکھ تو اس بات کا ہے کہ مجھے کسی کا نام آنا ہی نہیں۔ میرے ہم وطن یو۔ پی۔ ایل کو
یاد ہو گا اور مجھے بھی یاد ہے کہ جب میں بچہ تھا تو میری ماں سردیوں میں میرے لئے
کپڑے میں روٹی سی کر مجھے پہنا یا کرتی تھی جسے یو۔ پی کی زبان میں "سوزائی"
کہتے ہیں۔ اب پاکستان میں آ کر ہم نے وہ بھی پہنا چھوڑ دی اور اس کے عوض
"سوئیٹر" پہن لیا۔ لہذا مجھے کسی کا نام یاد ہی نہیں رہا۔ بہر حال ہمارا تو آخری
فیصلہ یہی ہے کہ محمد کے بنی اور اس کے اعلان کے بعد حتمی۔ نقلی۔ بردہ۔
چھوٹا بڑا۔ مذائم۔ شاعرانہ طور پر بھی کوئی اور بنی ہو سکتا ہی نہیں۔ اگر وہ
روئے زمین کے سارے مردوں کو زندہ کر دے۔ جب بھی نہیں۔ اگر اس کی

ساری پیشین گوئیاں صحیح ہو جائیں۔ جب بھی نہیں۔ وہ کچھ بھی کر دے جب بھی نہیں۔

لہذا جب ایک بات طے شدہ ہے کہ نہیں تو نہیں ہی نہیں ہے۔ گویا محمد کے بعد کوئی نبی ہو سکتا ہی نہیں۔

پیارے بچو! ایک دن مجھے کسی شخص نے کہا۔

”زیدی صاحب! آج فلاں فرقے کا جلسہ ہو رہا ہے۔ وہاں تم بھی چل کے شرکت کرو۔ کیونکہ وہاں وہ اپنی نبوت کے دلائل پیش کریں گے۔“ میں نے کہا نہیں بھئی! آج مجھے فرصت نہیں ہے۔ کل آؤں گا۔ آج میں کسی اور جلسہ میں جا رہا ہوں۔“

اُس نے پوچھا کون سا جلسہ؟

میں نے کہا ”سنا ہے۔ اللہ میاں مرگے ہیں اور آج اُس کی تعزیت میں جلسہ ہو رہا ہے۔ لہذا میں بھی اسی جلسہ میں شرکت کرنے جا رہا ہوں۔“ اُس نے کہا ”زیدی صاحب! شرم کرو۔ ہوش میں ہو۔ کہیں اللہ بھی مر سکتا ہے؟“

بس بھلا بیوی! جس طرح اللہ نہیں مر سکتا اسی طرح محمد کے بعد کوئی نبی نہیں آ سکتا۔ جی طرح وہ ناممکن ہے اسی طرح یہ بھی ناممکن ہے۔

چچو!

سنا ہے کہ بھیر کے بچے نے ماں سے کہا کہ۔

”اماں! خور کیا شے ہوتی ہے؟“

بھیر نے جواب دیا۔

”بیٹا! چڑپ رہو۔ لوگوں کا مجھ پر ہی سہیہ ہے۔“

بس بھائیو! اسی طرح کسی نے کسی پاگل سے پوچھ لیا کہ۔
 ”قبدا! نبی کسے کہتے ہیں؟“
 تو اس نے جواب دیا۔

”چپ رہو۔ لوگوں کا مجھ پر ہی شبہ ہے“

بہر نوع اس طرح بننے والا بن جاتا ہے۔ اور بعد میں پتہ چلتا ہے کہ یہ کیا ہو گیا۔
 لہذا ہمارے لیدر جو ان بچے اپنے ذہنوں میں یہ بات بٹھالیں کہ محمدؐ کے بعد اور
 کوئی نبی ہو سکتا ہی نہیں۔ وہ خاتم الانبیاء ہیں اور وہی سید الانبیاء ہیں۔ یہی
 ہمارا ایمان ہے اور یہی ہمارا اعتقاد ہے۔

خداوند عالم! تمہارے ایمان کی حفاظت فرمائے۔ تمہارے ایمان
 کو مستحکم فرمائے اور تمہیں توفیق استقامت عطا فرمائے۔ تاکہ تم کہیں ڈر گمانہ
 جاؤ۔ گھبرانہ جاؤ۔ چاروں طرف سے دشمن کی یلغار ہے اور عشق محمدؐ حبیبیؐ
 شے تمہارے پاس ہے کہیں کوئی چور یا ڈاکو تم سے یہ قیمتی ہیرا چھین نہ لے۔
 اللہ تمہاری تائید فرمائے گا۔ تم حق پر ہو اور حق کی اللہ ضرور مدد فرماتا ہے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ

عقیدہ

خداوند عالم کی حمد و ثناء کے بعد حضرات محمد و آل محمد پر
درود و سلام

حضرات گرامی قدر!

مجھ سے پہلے سرکارِ علامہ السید فدا حسین قبلہ مدظلہ العالی یہاں وعظ فرماتے تھے جس میں انہوں نے فرمایا کہ حضور سیدہ طاہرہ اسلام اللہ علیہا کی سب سے بڑی فضیلت یہ ہے کہ وہ حسن و حسین جیسے اعلیٰ مقام کی ماں ہیں۔ لہذا آج میں بھی علامہ موصوف سے معذرت چاہتے ہوئے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ آپ نے بجا فرمایا کہ حسین کی ماں ہونا بہت بڑی سعادت ہے مگر میں یہ کہتا ہوں کہ سیدہ کی سب سے بڑی فضیلت یہ ہے کہ وہ زینب کی ماں ہے۔

بہر نوع ماں کا رشتہ اتنا مقدس اور قابلِ فخر ہے

حضور والا!

ایک دن حضور رسالت مآب مسجد نبوی میں منبر پر بیٹھے وعظ فرما رہے تھے کہ اچانک جناب سیدہ طاہرہ سلام اللہ علیہا سامنے موجود علیٰ تشریف لائیں رسول نے جب دیکھا تو خطبہ چھوڑ کر تعظیم کے لئے کھڑے ہو گئے۔ پاس بیٹھے والوں میں سے کسی نے پوچھ لیا۔

”حضور! یہ کئی کون ہے جس کی اتنی تعظیم کی جاتی ہے؟“

رسول نے فرمایا: ”یہ بچی اپنے باپ کی ماں ہے۔“

سنا رہے تھے کہ رسول نے فرمایا کہ یہ بچی میری بیٹی ہے تو کیا غلط تھا؟

ہرگز نہیں۔

مگر رسولوں نے یہ کہہ کر کہہ کر بیچھی اپنے باب کی ماں ہے۔ ہمیں یہ بتا دیا کہ اگر مجھے رسالت ملی ہے تو اسی کچی کے صدقے میں۔ اگر نبوت ملی ہے تو اسی کچی کے صدقے میں۔ یہ گویا میری نبوت در رسالت کی ماں ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ ماں کسے کہتے ہیں؟

نوجوانو۔ عزیزو۔ بچو!

یاد رکھو! ماں اسے کہتے ہیں جو کسی شے کی تربیت اور دنیا میں آنے کا باعث بنے۔ جیسے بھارت، ماتا، مادر وطن وغیرہ وغیرہ۔ مادر وطن کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم وطن کے پیٹ سے پیدا ہوئے ہیں بلکہ یہ وہ سرزمین ہے جو اس دنیا میں ہمارے آنے کا باعث بنی۔

جس نے ہماری غذا اور خوراک دی۔ ہماری ضروریات کی جو تکفیل ہوئی۔ اس لئے یہ مادر وطن ہے اور جس ذریعہ سے ہم اپنے مطلب کو دوسرے تک پہنچا سکیں۔ اسے ہم مادری زبان کہتے ہیں خواہ باب بھی یہی زبان بولتا ہو۔ مگر مادری زبان کہلائے گی ناکہ پدری زبان کہلائے گی۔

بہر ذریعہ لفظ "ماں" کے اندر جو لطافتیں اور وسعتیں ہیں ان کا شمار اور بیان ناممکن ہے۔

صحابانِ ذوق!

ہو سکتا ہے۔ لفظ "ماں" "پلیٹ عرش الہی پیکر خدا سے یہ شکایت کرے کہ۔

خداوند! تو نے مجھے بڑا محبوب بنایا تھا مگر کیا کروں اس لفظ میں کچھ ایسے بھی شریک ہو چکے ہیں کہ جن کی وجہ سے مجھے "ماں"

کہلاتے ہوئے شرم آنے لگتی ہے۔ ورنہ ماں کجا اور بھگڑنا کجا۔
بہر ذریعہ رسول نے کہہ دیا ”بی بی! اپنے باپ کی ماں ہے“

یاد رکھو! اس کے معنی اسی یہی ہیں کہ یہ ہے ”معدن عصمت“ اور
”خزانہ عصمت“ اگر ”عصمت کا خزانہ دنیا میں نہ ہوتا تو کوئی نبوت نبوت
نہ بنتی اور نہ کوئی امامت۔ امامت بنتی۔ گویا نبوت و امامت اسی عصمت کے
صدقے میں باقی رہ گئی۔

حضور والا!

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ عصمت رسول کو کس شان سے ملی؟
دیکھو نا! اہل بیت رسول کی طرف سے ایک مشہور و معروف حدیث
ہے کہ جب رسول معراج میں تشریف لے گئے اور مقام جنت میں پہنچے۔
سامعین!

محمد مصطفیٰ کی جنت وہ جنت نہیں ہے جس سے آدم نکالے گئے
تھے اور جہاں آدم و ہنٹ کے سلسلے قائم ہیں۔ گویا محمد کی جو جنت
ہے وہ جنت آل محمد ہے جہاں ہمارا تصور بھی نہیں جاسکتا۔
جہاں ہمارا وہم و خیال بھی نہیں جاسکتا کیونکہ جب محمد کے غلین
تک کسی نبی کا گذر نہیں ہو سکتا تو محمد کی جنت تک کون پہنچ سکتا

بہر ذریعہ رسول دوران معراج اپنی جنت کا معائنہ فرما رہے تھے اور جب رسول
نے اعلیٰ سے اعلیٰ شجر دیکھے تو سب سے اعلیٰ شجر پر آپ کی نگاہیں رک گئیں۔ جی میں آیا
کہ اس شجر کا شجر مجھے ملے۔ اب محمد کے دل کی خواہش تھی کہ وہ شجر خدمت حضور
رسالت مآب میں پہنچا۔ اور حضور نے عالم معراج میں اسے تناول فرمایا۔
سامعین! حدیث میں بھی یہ فقرہ ملتا ہے کہ حضور نے عالم معراج

میں وہ شمر "تنا دلے" فرمایا اور۔

ادھر مولوی صاحبان یہ فرماتے ہیں کہ "روحیں تو کچھ کھاتی پیتی ہی تھیں، مگر یہاں لکھا ہے کہ "تنا دل فرمایا" اور پھر لطف یہ ہے کہ "تنا دل فرماتے" کا فقرہ ہی بتاتا ہے کہ رسول کو جسم کے ساتھ معراج ہوا تھا۔

بہر کیف رسول نے وہ شمر تنا دل فرمایا اور اس شمر کی عجیب و غریب خوشبو رسول کے دماغ میں بس گئی۔ بڑا ہی لطف آیا۔ بڑا ہی سوا آیا۔ اب جو وہ شمر کھانے کے بعد رسول اپنے میزبان سے ہکلام ہوئے اور میزبان نے ایسے لب و لہجہ میں گفتگو کی کہ سواد اور بھی زیادہ ہو گیا۔ گویا عالم معراج میں انداز کلام بھی دماغ میں بس گیا اور خوشبو شے طعام بھی دماغ میں بس گئی۔ اسی طرح رسول معراج سے واپس آئے تو بچے اور اب رسول کے پاس معراج کی دُکویا دگاریں تھیں۔ ایک میزبان نے اب و لہجہ کی لطافت اور ایک اس شمر کی خوشبو۔

صاحبانِ ذوق!

یہی وجہ تھی کہ رسول جب میزبان کے لیے کے مشتاق ہوتے تو اپنے بھائی کو دیکھ کر فرماتے۔

یا علی! ادھر آؤ۔ ہم سے کوئی بات کرو۔

چنانچہ بھائی سے باتیں شروع ہو جاتیں۔ اور لہجہ معراج کا لطف بھی آ جاتا۔ اور جب اس شمر کا سوا دلینا چاہتے جو جنتِ آلِ عسجد میں مامِ معراج میں تنا دل فرمایا تھا تو اپنی بیٹی سیدہ سے کہتے "بٹیا! ذرا میرے پاس بیٹھو، مجھ سے گفتگو کرو۔ تم سے اس شمر کی خوشبو آتی ہے"

حضور والا!

واقعہ معراج کے سال بعد خدیجہ الکبریٰ کے بطنِ طیب دطاہر سے اللہ نے رسول

کو ایک دختر عطا فرمائی۔ رسول نے بیٹی کو دہلیں اٹھائی گھبرا کے کبھی ادھر دیکھتے ادھر کبھی اُدھر دیکھتے ہیں۔ کبھی ادھر دیکھتے ہیں اور کبھی بیچے دیکھتے ہیں۔ رسول کی اس گھبراہٹ کو دیکھ کر خدیجہؓ پوچھتی ہیں ”قبلہ! کیا بات ہے؟“ رسول نے فرمایا:-

”خدیجہ! یہ تو بالکل اسی ثمر کی خوشبو ہے جو میں نے عالم معراج میں جنت میں کھایا تھا“

گویا رسول کو معراج کے کارنامے کا آج نظر ملا۔

سامعین!

آج نور رسول کو بھی نطفہ آگیا کہ اگر طعام کے شائق ہوں تو بیٹی کے پاس بیٹھ جاؤں اور اگر کلام کے شائق ہوں تو بھائی کے پاس بیٹھ جاؤں۔ گویا آدھی معراج کا لطف علی کے پاس آجائے اور آدھی معراج کا سواد سیدہ کے پاس آجائے۔ یاد رکھو! اب اگر رسول ان دونوں کے گھر تشریف لاتے تھے تو ان پر احسان تصور ہی کرتے تھے۔ بلکہ وہ تو اپنی معراج کے لئے آیا کرتے تھے۔

بنورگان من!

محمدؐ کے گھر میں پتی پیدا ہو گئی۔ اعلیٰ پرورش کے سارے سامان فراہم کئے گئے مگر معراج کی بات تو روحانی بات تھی مگر دنیاوی نقطہ نظر سے بھی جواہرات کا چھوڑا اس کے منہ میں تھا۔ سینکڑوں کنیزیں تیس تیس سوئے کی بیٹی کر رہا پاندھے اس بچی کی خدمت میں کھڑی تھیں اور جواہرات ٹکے ہوئے خالص سونے کے گہوارے میں سے لٹایا گیا تھا۔ آخر ملکہ عرب کی بیٹی تھی، عرب کی سرفراز شریف زادیاں اس بچی کے گہوارے کی ڈوریاں ہلانا باعث فخر سمجھتی تھیں۔ گویا روحانی غنیمتیں محمدؐ کی بدولت اور دنیاوی راحتیں ماں کی بدولت اس بچی کو حاصل

تھیں۔ اس طرح شہزادی کی بڑے ناز و نعم کے ساتھ پرورش کی جا رہی تھی۔

سکامعین !

زمانے کا انقلاب کہو یا وقت کی گردش کہو کہ ابھی بیچ تین سال کی تھی کہ باپ پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹ پڑے کہ وہی لوگ جو محمد کے پاس بیٹھتے تھے، انہیں پاس نہ رہا۔ جن سے خون کا رشتہ تھا وہ لہو کے پیاسے ہو گئے۔ جو گلے ملنے تھے۔ انہیں گلا پیدا ہو گیا۔ جن سے پیار تھا وہ دور ہٹنے لگے۔ جن کے دل موم کی طرح نرم تھے۔ وہ سنگدل ہو کے پتھر مارنے لگے۔ جو بھول کی طرح کھلتے تھے وہ کانٹے بچھانے لگے۔ جن کے ساتھ دوستی تھی۔ وہ دشمنی کے ساتھ پیش آنے لگے۔ جسکے منہ مسکراتے تھے وہ منہ بنانے لگے جن کی عزت بنا دی تھی وہ ذلیل کرنے کے دُپے ہو گئے۔ جو اپنے تھے۔ وہ غیر بن گئے۔ غرض تمام کائنات ایک انسان کے مقابلے میں اکٹھی ہو گئی۔ اور محمد ایک طرف اکیلے کا اکیلا نمائندہ۔ اور اتنا بے بس نمائندہ نہ سر پہ باپ کا سایہ۔ نہ استناد کا سایہ۔ نہ مزنی کا سایہ۔ نہ خاندان کا سایہ۔ نہ کسی محافظ کا سایہ اور حد یہ کہ نہ اپنا سایہ۔ اتنا بے سایہ انسان ایک طرف ہے اور پوری دُنیا اس کی مخالفت کر رہی ہے۔

اب بتاؤ! جب ایسے انسان پر جس پر اتنے زیادہ مصائب ہوں تو اس کی پوزیشن کیا ہوگی۔ اسی دوران کسی نے سیدہ سے کہا کہ خانہ کعبہ کے سامنے والے صحن میں دشمنوں نے تیرے باپ کو گھیر رکھا ہے۔ وہ سجدے میں ہیں اور انکی کمر پہ دُنیا بھر کے بوجھ لاکے رکھ دیئے گئے ہیں۔

یہ سن کر بچی درڑتی ہوئی گھر سے باہر نکلی۔ تین برس کا سن۔ جب مشرکین نے بچی کو آتے دیکھا تو چلائے۔

ہٹ جاؤ۔ خدیجہ کی بیٹی آ رہی ہے۔

گویا مشرکین کے دل میں بھی خدیجہؓ کی اتنی عظمت تھی۔ اب اُن مشرکین سے کون پوچھے کہ جب خدیجہؓ کی تین سال کی بیٹی کا تو اتنا احترام کیا جا رہا ہے مگر اس کی جوان بیٹیوں کو عداوت دے کر گھر سے کیوں نکال دیا۔ کیا اس وقت احترام خدیجہؓ یا رہ تھا؟ بہر نوع اس شان شوکت سے حضورؐ سیدہ طاہرا سلام اللہ علیہا کی پرورش ہوئی رہی۔ جب آٹھ نو سال کا سن ہوا تو حضورؐ کو مکہ سے ہجرت کرنا پڑی۔ چنانچہ حضورؐ اپنے عزیزوں کو چھوڑ کر مدینہ تشریف لائے۔

حضور والا!

آپ لوگ جذبات و عقیدت کی رُو سے ہجرت کے اتفاقات سنتے ہیں کبھی ان واقعات کو دنیا داری اور عام معاملات کی رُو سے بھی سن لیا کریں کہ اتنا بڑا خطرناک ماحول۔ دشمنوں کا اتنا بڑا غلبہ کہ محمدؐ کا رہنا بھاری ہے۔ اتنے بڑے خطرناک ماحول میں محمدؐ اپنی جان بچا کے تو چلے گئے مگر بیٹی کو اور اپنے ناموس کو دشمنوں میں ہی چھوڑ دیا۔ اب بتاؤ! اپنی بیٹی اور ناموس کو دشمنوں میں اکیلے چھوڑ کر اپنی جان بچا کر چلے آنا۔ یہ کوئی شریفوں کا شیوہ ہے؟ آخر محمدؐ نے اپنی بیٹی اور ناموس کی حفاظت کا کوئی پکا انتظام کیا ہوگا کہ رسولؐ کو اپنے ناموس چھوڑنے پر کوئی خطرہ ہی نہیں محسوس ہوا ورنہ اپنی جان بچا کر اتنے بڑے خطرناک ماحول میں چھوڑ کر چلے جانا ناممکن بات تھی۔ اللہ جانے ایک نوجوان نے رسولؐ کے گھر میں رہ کر کتنی چیزوں سے رسولؐ کو مطمئن کر دیا۔ نہ ناموس کا خطرہ باقی رہنے دیا اور نہ ہی رسولؐ کی زندگی کا خطرہ باقی رہنے دیا۔

صاحبان!

دنیاوی نقطہ نظر سے کبھی کبھی یہ بھی سوچ لیا کرو کہ وہی بچہ بڑے ہوئے عرب اور بگڑے ہوئے مشرک جو رات کو قتل رسولؐ کے لئے آئے تھے آج

رسول کے گم ہو جانے پر اُن کا غصہ ایک دم بڑھ گیا ہوگا یا نہیں؟ بہت ہی بگڑے ہوں گے۔ بڑا ہی غصہ آیا ہوگا۔ اپنے ہی ہاتھوں کو کاٹتے ہوں گے کہ ہم سے کیا غلطی ہو گئی؟ ہم نے آٹے ہوٹے شکار کو کیوں جانے دیا۔ اور سب سے زیادہ غصہ تو اس نوجوان پر آیا ہوگا کہ جس نے ان کی ساری سکیم کو بستر پر سوکے ضائع کر دیا۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہ اور ابو جہل صاحب جو تمام قبائل کے تجربہ کار بہادر تھے۔ اس بچے کی اس حرکت کو دیکھ کر بہت پریشان ہوئے اور کہنے لگے۔

”اس بچے نے تو ہمارا تمام پروگرام خاک میں ملا دیا۔ اس بچے سے تو وہ بڑھا اچھا تھا جو رور کے اشارے دیتا رہا۔ اللہ جانے اس بچے نے کیا کر دیا۔ ابی طالب کا یہ لڑکا تو بڑا ہی عجیب نکلا۔“

میں کہتا ہوں، بزرگو! تم فکر مند کیوں ہو گئے۔ اگر واقعی اس بچے نے تمہارا منصوبہ خاک میں ملا دیا ہے تو بہتر ہے کہ تم اسی سے ہی سارا بدلہ اتار لو۔ اور پھر یہ بچہ بھی بڑی نازک پوزیشن میں ہے، کیونکہ اس کے ساتھ پردہ دار خواتین بھی ہیں۔

سَامِعِین!

تاریخ عالم گواہ ہے کہ حیب یہ عرب سردار اس نوجوان کے پاس آئے اور پوچھا کہ محمد کہاں ہیں۔ تو تمام مذاہب نکر کی تاریخ پڑھ ڈالو تمہیں یہی فقرہ ملے گا۔ کہ اس نوجوان نے جواب میں صرف یہی کہا، ”کیا تم محمد کو ہمارے سپرد کر گئے تھے۔ جاؤ میرے گھر سے نکل جاؤ۔“

تاریخ عالم گواہ ہے کہ بچے کا فقرہ سن کر تمام اہل مکہ خاموش ہو گئے۔ اللہ جانے

اس نوجوان کا ان لوگوں پر کتنا رعب تھا کہ صبح کو وہی اُن سے کہہ رہا ہے کہ مجھے چار اونٹ کرائے پر چاہئیں۔ لطف یہ ہے کہ اونٹ ان ہی سے مانگ رہا ہے جو رات کو گھر گھرے کھڑے تھے اور بڑی شان و مملکت سے کہہ رہا ہے ”دیکھو! آج ہم جا رہے ہیں۔ کسی میں ہمت ہو تو روک کے دیکھ لے“

اب بناؤ! قدرت کے بہائے ہوئے سمندر کے دھارے کو کون روک سکتا ہے اور اللہ کی چمکائی ہوئی بجلی کی لہر کے سامنے کون ٹھہر سکتا ہے، بہرِ نزع علیٰ بڑے آرام سے اونٹوں پر غلیب بندھوا کے۔ پردے کا انتظام کر کے مستورات کو سوار کر کے خود پیدل چل پڑے اور اہل مکہ سے کہہ رہے ہیں۔

”مکہ والو! ہم جا رہے ہیں۔ کسی میں ہمت ہے تو روک کے دیکھ لے“

بھائیو! ایک بات بناؤ کہ اگر وہ اہل مکہ محمد کے اہل و عیال کو یہ خیال کر لیتے تو محمد واپس آنے پر مجبور ہو جاتے یا نہیں؟ مگر کسی کو ہمت ہی نہیں تھی کہ انہیں روک سکتا۔ تاریخ عالم کی ان اداؤں پہ دُنیا پر ترقی ہے کہ اس بچے میں کیا کمال تھا کہ اتنے بڑے دشمنوں کے نرغے سے ناموس رسول کو نکال کر لے آیا۔ بہرِ نزع قافلہ چل پڑا اور سب اہل مکہ اپنے گھروں کے پیچھے۔ مکانوں کی پھتوں پر۔ منڈیروں کی آڑ میں بیٹھے بیٹھے یہ کہہ رہے ہیں کہ اللہ جانے! محمد کا یہ بھائی کتنا زبردست ہے۔

سَامِعِینِ کَرَام!

یکم ربیع الاول کو محمد نے مکہ سے ہجرت کی اور حِجَب قافلہ ناموس محمد مدینے پہنچا تو اس دن آٹھویں ربیع الاول تھی اور حِجَب رسول اپنے ناموس دستورات کے ساتھ مدینہ وارد ہوئے تو نو ربیع الاول تھی۔ بہرِ کیف! ربیع الاول گذرا۔ ربیع الثانی گذرا۔ جمادی الاول گذرا۔ جمادی الثانی گذرا۔

حتیٰ کہ جب ذیقعد کا آخری ہفتہ تھا تو کچھ صنادید عرب نے بقول مسلمانوں کے جو آسمان اسلام کے شمس و قمر کہلاتے ہیں، انہوں نے آپس میں صلاح مشورے کئے اور سر جھکائے رسول کی خدمت میں آ بیٹھے۔

رسول نے پوچھا: "کیوں بھئی۔ خیریت تو ہے۔ آج بڑے اُداس دکھائی دیتے ہو۔"

چھوٹے بھائی نے بڑے بھائی سے کہا: "بڑے بھائی! تم کہونا۔" رسول نے پھر فرمایا: "کہو۔ کیا کہنا چاہتے ہو؟" چنانچہ دونوں نے جو آسمان اسلام کے شمس و قمر کہلاتے ہیں۔ بڑے لجاجت آمیز لہجے میں عرض کی۔

"سرکار! ہم حضور کے غلام ہیں۔ حضور کے نوکر ہیں حضور کے ہاتھوں پہ ہی مسلمان ہوئے۔" رسول نے فرمایا:

"ہاں ہاں ٹھیک ہے مگر تم پتا بتے کیا ہو؟" قبیلہ! عرض یہ ہے کہ ہم ————— اگر ————— حضور ہیں اپنی فرزندگی میں قبول کر لیں۔"

بس بھائیو!

تاریخ عالم گواہ ہے کہ اتنا فقرہ منہ سے نکلنا تھا کہ رحمت اللعالمین کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا اور پورے غصے میں فرمایا۔
"خبردار! اگر کسی نے میری بچی کا نام اپنی زبان پر لیا۔ نکل جاؤ یہاں سے۔"

سامعین! اب بتاؤ! کوئی ہے جو رسولوں سے یہ پوچھے کہ

”حضور! یہ تو بچا رہے آسمانِ اسلام کے شمس و قمر میں جنہیں آپ نے
 جھڑک دیا۔ مگر یہ نہ دیکھا کہ اس بچی کی بڑی بہنوں کو مشرکوں کے حوالے کر دیا یا
 تو وہ بیٹیاں ہی نہیں تھیں یا پھر یہ بچی ان سے مختلف ہے۔
 بہرِ نوع دونوں بزرگ حالتِ پریشانی میں اٹھ کر چل پڑے اور آپس
 میں کہنے لگے۔

”اگر محمدؐ نے ہمیں ٹھکرا دیا ہے تو پھر اس کا رشتہ اللہ ہی کے ہاں ہے
 آئے گا۔۔۔۔۔ رسولؐ نے بھی یہ گفتگو سن لی۔ دل میں سوچا۔
 ”میرا بھی نام محمدؐ ہے۔ میری بیٹی کا رشتہ اللہ ہی کے ہاں ہے
 آئے گا۔“

بزرگانِ من!

جس طرح ہم مولویوں کی دوڑ مسجدِ تنگ ہی ہوتی ہے اسی طرح رسولؐ
 کی دوڑ بھی اللہ تنگ ہی ہوتی ہے۔ چنانچہ محمدؐ نے وہیں مصلیٰ بچھا یا اور
 دُعا مانگی۔

”خدا ارندا۔ یہ لوگ مجھے طعنے دے رہے ہیں۔ تو نے ہی میری
 بچی کو جنتِ محمدیؐ کا ثرب بنا یا تھا۔ تو نے ہی اس کو سیدہٗ نساء
 بنایا تھا۔ تو نے ہی اس کو خزینہٗ عصمت بنایا تھا۔
 تو کہتا ہے کہ جب تنگ جوڑ برابر کا نہ ہو رشتہ نہ ہو۔ اب مجھے
 نہیں معلوم کہ اس کا رشتہ کہاں ہو گا۔ لہذا تو مجھے بتا کہ یہ رشتہ
 کہاں ہو گا۔“

رسولؐ یہ دُعا فرما رہے تھے اور قدرت کی طرف سے سکراہٹ کے
 گلدستے نذر کئے جا رہے تھے۔

”محمد! گھراؤ نہیں۔ تمہاری بیٹی کا رشتہ ہمارے گھر میں ہو گا۔“
 ”بلو! ہمارے گھر رشتہ کرنے پر راضی ہو؟“
 محمد نے سر جھکا کے اپنے محبوب سے فرمایا:-
 ”خداوند! رشتہ تو منظور ہے مگر باضابطہ طور پر منظور کی رسم
 بھی ہونی چاہیے۔ لہذا تو باقاعدہ میری طرف پیغام بھیجنا کہ میں
 بھی غور کروں۔“

اعلیٰ حضرت نے کہا:-
 ”محمد! ہم آج ہی کی رات تمہیں پیغام بھیجیں گے مگر یاد رکھنا
 ہمیں بھول نہ جانا۔“
 اے حضور والا!

اعلیٰ حضرت نے اب رشتہ کی تیاریاں شروع کر دیں کہ رشتہ ہم کریں گے
 رشتہ ہماری طرف سے ہو گا۔ چنانچہ اعلیٰ حضرت نے آج کی رات رشتہ
 یوں طے کیا۔

اپنی قدرت کی بے پناہ وسعتوں کو سمیٹ کے رشتہ کرنے کا ارادہ کیا
 اور اپنی تمام طاقتوں کو ایک مرکز پر جمع کیا۔ کائنات میں پھیلی ہوئی صفات ثبوتیہ
 اور سلبیہ کو ایک جگہ لاکے اکٹھا کیا اور جب اللہ صبح معنوں میں اللہ بن کے مسند
 عز وجل پر بیٹھ گیا تو کہا:-

”آج محمد کے گھر رشتہ ہو گا۔“

چنانچہ چاروں طرف کہکشاں کی سڑکیں بنا دیں اور نصری و شیریں کے صوفے
 بچھا دیئے۔ سبلا کے گلدستے سجادیئے اور قوس قزح کی تنائیں لگا دیں دل دہل
 کے سا بن لگا دیئے۔ اور شفق کے پردے ٹکا دیئے اور تمام مخلوق سداوی

اپنے اپنے ترینے سے آکے بیٹھ گئی سوا لاکھ انبیاء بھی اپنی کرسیوں پر آکے بیٹھ گئے۔ اور ملائکہ انتظام میں کھڑے ہو گئے۔ اور حور و دے جنت کے درتیکے کھول کر اس محفل کا منظر دیکھنا شروع کیا۔ چنانچہ حب ساری محفل ہم گئی تو اعلیٰ حضرت نے پوری جلال و جبروت کی آواز کے ساتھ خطبہ پڑھا۔

”اے آسمان کے رہنے والو!

اے فرشتو!

قلعہ معلیٰ شاہی میں پیدا ہونے والے سعادت مند فرزند کا رشتہ آج ہم رحمت اللعالمین کی حضرت نیک اختر سے کرنا چاہتے ہیں گویا آج قدرت و رحمت کا جوڑ ہو گا۔“

اعلیٰ حضرت کی یہ بات سنکر تمام مخلوق سمدی نے کہا:

”خدا وندا۔ مبارک ہو۔ اس سے بہتر کیا جوڑ ہو سکتا ہے۔ مگر ہمارا انعام

ہمیں دیا جائے۔“

اعلیٰ حضرت نے فرمایا:

”ہاں ہاں منتہارا انعام تمہیں ضرور ملے گا۔ مگر حب ملے گا حب بارات

لڑکی کے گھڑ نیچے کی۔ اور دیکھو! پہلے تم ایسا انتظام کرو کہ تم میں سے کوئی

صاحب ہمارے طرف سے لڑکی والے کے گھر جائیں اور ہماری طرف سے یہ

پیغام دیں کہ مآبہ ولست یہ رشتہ چاہتے ہیں۔

اور دیکھو! ہم آج ہی اپنے علم کی تعمیل چاہتے ہیں محفل پیارگان بھری پڑی

لہذا بتاؤ تم میں سے کون جائے گا؟

جبرئیل نے بڑھ کے عرض کی: ”خدا وندا۔ میں حاضر ہوں۔“

اعلیٰ حضرت نے فرمایا: ”جبرئیل! دیکھو۔ ہر بات میں دخل نہ دیا کرو۔“

اپنی حیثیت میں رہو۔ آج تمہارا جانا مناسب نہیں۔ لوگ یہی کہیں گے کہ جڑیل پہلے بھی آیا کرتا تھا۔ اگر آج آگیا تو کیا ہوا۔ لہذا تم بیٹھ جاؤ۔ خیر سے جب بچے ہوں گے تو انہیں بہلانے چلے جانا۔ ان کا بھولا بھلاتے چلے جانا۔

محترم سامعین !

محفل سیارگان میں سے آفتاب نے عرض کی۔

”خداوند! چونکہ میں سید بخوم ہوں لہذا اجازت ہو تو میں چلا جاؤں اور شاعروں کا سہرا پیش کر کے منگنی کی رسم پوری کر دوں؟“
قدرت نے جواب دیا۔

”آفتاب! تمہاری عمر سنی تو قابل قبول ہے مگر یہ خوشی کی تقریب ہے

اور خوشی کی تقریب میں جلنے والے اچھے معلوم نہیں ہوتے لہذا تم بیٹھ جاؤ۔

چنانچہ سورج بھی بیٹھ گیا۔ اس کے بعد اعلیٰ حضرت نے چاند سے پوچھا۔

”کیوں میرے چاند! جاؤ گے؟“

چاند نے عرض کی۔

”خداوند! جانے میں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں مگر جہاں تو مجھے بھیج رہا

ہے۔ وہ تیرے محبوب کا کوچہ ہے۔ وہاں مجھ غریب پر انگلیاں اٹھتی ہیں اور

میں کٹ جاتا ہوں لہذا مجھے وہاں جاتے ہوئے شرم آتی ہے۔“

صاحبانِ ذوق!

اعلیٰ حضرت کی نگاہ انتخاب آخر ”ستارہ زہرہ“ پر آ کے رُکی۔

”زہرہ! ہماری طرف سے رشتہ کا پیغام لیکر جاؤ گے؟“

زہرہ نے عرض کی ”خداوند! اس سے بڑھ کے اور سعادت مجھے

کیا چاہیے“ چنانچہ زہرانے گلدستہ پیغام لیکر زمین کی طرف روانگی کا ارادہ

کیا۔ اور زہرہ کو آتے جود دیکھا تو مرکز عالم و عالمیان نے کہا ”اللہ اکبر“ جب زہرہ
 ”بیت النبوی“ میں پھڑا تو کہا ”الحمد للہ“ اور جب پیغام مسرت لیکر
 واپس جاتے دیکھا تو کہا ”سبحان اللہ“

بس بھائیو!

یہ فقرے تسبیح جناب سیدہ مومنوں کو بارات کی خوشی میں انعام کے طور پر
 ملے تاکہ قیامت تک آنے والا ہر مومن اس بارات کی زیارت سے فیض یاب
 ہوتا رہے۔

اور یاد رکھو! تسبیح سیدہ تو بن گئی۔ مگر اس وقت تک مکمل نہیں ہوگی جب تک
 نماز کے بعد جن کے لئے سیدہ نے ”دُعا“ کا وعدہ کیا ہے۔ ان کے لئے
 ”دُعا کرو اور جن کے لئے ”بد دُعا“ کو کہا ہے۔ ان کے لئے بد دُعا کرو۔
 تب جا کے تسبیح سیدہ مکمل ہوتی ہے۔

سامعین کرام!

اعلیٰ حضرت کی طرف سے جب رشتہ مکمل ہو گیا تو محمدؐ نے فرمایا:

”یا علی! ہم اپنی لڑکی کا عقد تمہارے ساتھ کرنا چاہتے ہیں۔“

علیؑ نے شرم سے سر جھکا دیا۔ اور رسولؐ نے پوچھا:

”یا علی! میری بچی کا جبر کیا ہوگا؟“

علیؑ خاموش ہیں۔ سمجھ نہیں آتی کہ اتنے بڑے گھر کی بیٹی کو کیا ہر پش

کروں۔ آخر عرض کی۔

”قبیلہ! میرے پاس جو سامان ہے وہ حضورؐ کو معلوم ہے۔ میرے پاس

صرف ایک گھوڑا۔ ایک تلوار اور ایک ذرہ ہے۔“

رسولؐ سنس کے فرماتے ہیں ”یا علی! ان میں سے غیر ضروری شے تمہارے

پاس صرف ذرہ ہے لہذا اسے بیچ دو۔

بزرگو!

انصاف چاہتا ہوں۔ بناؤ! کیا ابوطالب کے بیٹے کی جان اتنی سستی تھی۔ خواہ دوسرے اصحاب چھ چھ زریں پہن کر میدان جنگ میں جاویں مگر غریب ابی طالب کے بیٹے کے پاس ایک ہی ٹوٹی پھوٹی ذرہ تھی وہ بھی بکوا دی۔

رسول جواب میں فرماتے ہیں:-

”دیکھو نا۔ دوسروں کو ذرہ کی ضرورت ہوگی مگر میرا بھائی ذرہ وغیرہ کا محتاج نہیں ہے۔ یہ تو صرف رسمی طور پر جنگی لباس پہن لیتا ہے۔ ورنہ علی کو اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“

حضرات!

آپ کو تاریخ کے پسند حملے سنا تا جاؤں جو علیؑ کی ذرہ کی تعریف میں لکھے گئے ہیں۔ تاریخ میں تو یوں ہے کہ علیؑ کی ذرہ کپڑے کی بنی ہوئی تھی اور اگلی طرف تھوڑا سا لوہا لگا ہوا تھا۔ ایک دن کسی نے پوچھ لیا۔

”یا علیؑ! کپڑے کی ذرہ کیوں پہنتے ہو؟“

حضورؐ نے فرمایا: ”تاکہ سپاہی کی باغیابطہ وردی بکھل ہو جائے؟“

پھر پوچھا گیا۔

”یا علیؑ! ذرہ کے سامنے کی طرف لوہا کیوں لگا دیا ہے؟“

فرمایا: تاکہ سامنے سے مٹنے والا آئے تو لوہا دیکھ لے۔“

”یا علیؑ! اگر کسی نے ذرہ کے پیچھے سے وار کر دیا تو؟“

علیؑ نے فرمایا: ”ابی طالب کا بیٹا اس دن زندہ ہی نہیں رہے گا جس دن دشمن کو

پشت پر آنے کا موقعہ دے۔

بہر نوح علیؑ کی یہ ذرہ تھی جس کے لئے رسولؐ نے فرمایا کہ اسے بیچ دو چنانچہ امیر المؤمنینؑ نے ایک سوسات روپیہ میں وہ ذرہ فروخت کر دی اور پیسے لاکر حضور رسالتؐ مآب کے سامنے رکھ دیئے۔ حضورؐ نے ان پیسوں میں سے کچھ تو حندی منگوائی۔ ایک جوڑا کپڑا منگوا لیا اور باقی کچھ اور سامان۔ اس کے بعد شہنشاہ ارض و سماء اپنے گھر میں جا کر اپنی بیٹی کے جہیز کا سامان تیار کرنے لگے۔ اور شام تک جہیز تیار ہو گیا۔ جب سب کچھ تیار ہو گیا تو مسجد میں بیٹھ کر رسولؐ نے نکاح پڑھا اور کچھ دیر بعد سیدہ کو رخصت کرنے کی نیاری ہونے لگی۔

ادھر علیؑ نے اپنے کمرے کے فرش کو اس طرح سجایا کہ ایک بکری کی کھال بچھائی۔ جس پر دھن کو لاکے بٹھانا تھا۔ ایک طرف ایک اور بوریا بچھا دیا تاکہ کوئی ملنے والا آئے تو یہاں بیٹھ جائے۔ اس کے بعد امیر المؤمنینؑ نے اپنا تولیہ ایک کھوٹی پر لٹکا دیا اور دوسری کھوٹی پر آٹا بچھانے والی چھانٹی لٹکا دی۔ اور جب مشکل کشا عالمین کی محل سراء تیار ہو گئی تو شہنشاہ ارض و سماء کی اکھوتی بیٹی کا جہیز نکلنے لگا۔ ادھر دنیا تماشا نشانی کھڑی ہے کہ اللہ جانے۔ سید الانبیاءؑ اپنی اکھوتی بیٹی کو جہیز میں کیا کیا دیں گے۔ مگر دنیا نے دیکھا کہ جب جہیز کا سامان برآمد ہوا تو سونے کیلے ایک بوریا تھا اوڑھنے کے لئے ایک چادر تھی۔ پانی پینے کے لئے لکڑی کا ایک گلاس تھا۔ آٹا پینے کے لئے ایک چکی تھی۔ چھ چاندی کی جوڑیاں تھیں اور دقتانہ کی دیگیں تھیں اور ایک مشیزہ تھا۔ یہ گویا اس کی بیٹی کا جہیز تھا جس نے عرب کی لاکھوں بیٹیوں کی لاکھوں روپے دے کر شادی کر وادی تھی۔

بہر نوح شہنشاہ ارض و سماء کی اکھوتی بیٹی کا جہیز سروس پر اٹھائے احباب چلے۔ ادھر حضورؐ نے ایک ناتنے کے اوپر حمل لگا کر سیدہ کو

اس میں بٹھا دیا اور تمام اہانت المومنین کو حکم دیا کہ میری بیٹی کے جلوس کے پیچھے پیچھے مدحیہ اشعار پڑھتی چلو۔ چنانچہ ہرام المومنین مدرح کے اشعار پڑھتی ہوئی چلی جا رہی تھی اور رسول زار زار رو رہے تھے۔ "ہائے۔ آج خدیجہ زندہ ہوتی۔ ہائے آج چچا ابی طالب زندہ ہوتے؟"

بہر نوع ہاشم کی تیارت میں سیدہ کی شادی کا جلوس گزرنے لگا تو اچانک حضور رسالت مآب نے تمام مسلمانوں میں سے سلمان فارسی کو آواز دی۔

”سلمان! اردھراؤ۔“

جب وہ پیچھے تہ حضور نے ناسی کی عمارت کے ہاتھ میں ٹیڑھی حضور والا!

یہ ہے اپنے اپنے اقبال کی بات۔ اتنا قدر زمان ہے بے پناہ
کہ اگر کوئی ان سے محبت کرے تو یہ اس کا جملہ غم و غصہ دے دیتے
ہیں۔

بہر کیفیت۔ شادی کا یہ جلوس رسول کے گھر سے روانہ ہو کر علی
کے گھر میں آگیا۔ اور سیدہ طاہرہ سلام اللہ علیہا کی آج شادی
ہو گئی۔

آج ہم نے اسی شادی کی یادگار کے سلسلے میں ایک تنظیم الشان
جلسہ منعقد کیا ہے۔ جہاں کیا ہے۔ آج ہمارا یوم عید ہے۔ آج ہم ان طعنہ
دینے والوں کو جواب دیتے ہیں کہ شیعوں دیتے ہیں۔ انہیں یہ دکھانا چاہتے ہیں
کہ ہم جیسا منس بھی کوئی نہیں سکتا آج آپ لوگ بڑا بن جاؤ گے اور میں
اس دربار کا بھانڈ بن جاؤں اور آج ہم تمہارے فریاد کرتے ہیں۔

افشاں شکیہ

معزز سامعین کرام!

اللہ کی طرف سے انسان کے اندر ودیعت کردہ طاقتوں اور صلاحیتوں کو موقع کے مطابق عمل میں لانے کا نام "اسلام" ہے۔ گویا اسلام انسان کی کسی طاقت کو معطل نہیں کرتا بلکہ انسانی طاقتوں اور صلاحیتوں کو صحیح طریقے سے استعمال میں لانے کا نام ہی اسلام ہے۔

دیکھو نا! علم لغت یعنی زبان کے اعتبار سے عربی زبان میں طاقت کے کمال کو "ملکہ" کہتے ہیں۔ اب اگر آپ لفظ "ملکہ" کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ سوچیں کہ جب اللہ نے انسان کو پیدا کیا تو تمام ملائکہ کو حکم دیا کہ اس کے تابع ہو جاؤ، گویا دنیا کی جتنی قوتیں اور طاقتیں تھیں، ان سب کو حکم ہوا کہ "تم ان کے تابع ہو جاؤ" لہذا تمام طاقتیں انسان کے تابع ہو گئیں۔ صرف ایک نفس انسانی کی طاقت تھی جو "شیطان" بن کے باغی ہو گئی۔ اور یاد رکھو! ان تمام طاقتوں پر غالب آنے والا "غالب" کہلاتا ہے۔ اور جو اپنے نفس کی طاقت پر غالب ہو جائے وہ "مُکَلِّم" کہلاتا ہے۔ بہر ذلک انسان تمام طاقتوں کا منبع اور مرکز ہے اور ان تمام طاقتوں کو صحیح استعمال کرنا ہی اسلام ہے

بزرگان من! اس تنبیہ کے بعد میں آپ سے آسان

لفظوں میں گفتگو کرتا ہوں۔ جہاں ہزاروں طاقتیں انسان میں ہیں وہاں انسان میں یہ بھی ایک طاقت ہے کہ وہ کسی حد پر جا کر رکنا پسند نہیں کرتا۔ آپ یہ نہ سمجھیں کہ انسان چاند پر جا کر ٹوک جائے گا۔ بلکہ چاند پر پہنچ کر بھی کہیں اور جانے کی کوشش کرے گا۔ گویا کسی حد پر نہ رکنا یہ بھی انسان کی ایک طاقت ہے جو انسان کے اندر موجود ہے۔

محترم سامعین!

مثال کے طور پر سمجھانا ہوں کہ ایک بچہ مجھے کہتا ہے۔

”زیدی صاحب! مجھے نوکر کرادو۔“

میں نے پوچھا: ”برخوردار! کتنی تنخواہ چاہیے؟“

نوجوان بولا: ”تقریباً بیس روپے مل جائیں گزارہ ہو جائے گا۔“

اتفاق سے ہم نے سو روپیہ ماہوار کی نوکری دلوا دی۔ اب جو چند دنوں بعد

ہم نے اس نوجوان سے پوچھا۔

”برخوردار! حال کیسا ہے؟ تو کتنے لگا۔“

زیدی صاحب! سو روپیہ میں گزارہ مشکل ہے۔

بہر نوع! ہم نے کسی طرح سے اس کی دو سو روپیہ ماہوار کروادی۔ گراب

پھر چند دنوں بعد پوچھا تو یہی جواب ملے گا کہ ”گزارا مشکل ہے۔“ آخر ہم نے

ہزار روپیہ کر دیا مگر پھر یہی شکایت کہ گزارا مشکل ہے۔ کیا مجال جو کسی جگہ پر انسان

رکتا ہو۔ آخر ہم نے مشورہ کر کے اسے پورا ضلع دے دیا تاکہ اس کا گزارا ہو جائے۔

لیکن چند دنوں بعد پوچھا کہ بس! وہ بولا ”نہیں“ پھر ہم نے اسے ایک کٹھنری

دے دی۔ پھر پوچھا: بس! مگر اس نے پھر اسی نفی میں سر ہلا دیا۔ آخر ہم نے

مجبوراً پورا ملک دے دیا۔ لیکن اس کی ”نہیں“ بدستور قائم رہی۔ اب

آپ چاہے اسے پوری دنیا دے دیں۔ مگر جب بھی پوچھیں گے وہ یہی کہے گا
 ”ابھی اندر۔“ کیا مجال جو اس کی ”ابھی اور“ ختم ہو جائے۔ لہذا اس ”ادھر کے
 جذبے نے انسان کو بڑھا بڑھا کے ”خدا“ بنا دیا۔ مگر ادھر انسان ہے کہ خدا
 بننے کے بعد بھی یہی سوچ رہا تھا کہ اب کیا بنوں؟ کہ اسے ”موت“ آگئی۔ گویا
 موت نہ آتی تو انسان کچھ اور بن جاتا۔

سامعین!

آپ یقین فرمائیں کہ فرعون و نمرود پاگل نہیں تھے، یہ کوئی احمق نہیں تھے انہیں
 پتہ تھا کہ ہم خدا نہیں مگر یہ ”اور“ کا جذبہ تھا جو انہیں خدا بنوا رہا تھا۔

یاد رکھو! دو چیزیں انسان کا دماغ خراب کر دیتی ہیں ایک ”جذبہ اور“
 اور دوسرا ”پاس بیٹھنے والا“۔ اس لئے کہ اگر بننے والے نے ناجائز بات بھی کہی
 تو پاس بیٹھنے والے کہہ دیتے ہیں۔

حضور! بالکل درست ہے۔ حضور! بالکل مجاہد ہے۔

اور بننے والا یہ سمجھتا ہے کہ میں واقعی ”بالکل درست ہوں“ کیونکہ اتنے
 آدمی خمیری بات کو درست اور بجا کہہ رہے ہیں

دیکھو نا! بیچارے نمرود و فرعون نے ہزاروں بار لوگوں سے کہا کہ
 ہم خدا نہیں بن سکتے۔ مگر پاس بیٹھنے والوں نے کہا ”نہیں۔ نہیں۔ بننا پڑیچہ“
 آخر وہ بن گئے کیونکہ ان میں ”اور“ کا جذبہ تو تیسرے ہی سے تھا اس لئے وہ لوگوں
 کے بننے سے فردا بن گئے۔ یہ کیفیت یہ انسانوں کی ایک عادت ہے جو کثرتِ استعمال
 سے ”فطرت“ بن جاتی ہے۔ اور انسان کے اندر ”ہوسے“ کا جو مرکز ہے
 وہ انسان کا ”دماغ“ ہے اور دماغ کی شکل ایلٹے پیالے جیسی ہے جس میں
 چاہے تم سمندر بھر دو مگر خالی ہی رہے گا۔ اس لئے انسان ”اور“ کی رٹ لگاتا

ہے۔ اور جب قبر میں جائے گا۔ کپڑے کھا جائیں گے گویا جب الٹا پیالہ سیدھا ہو جائے گا تب اگر "اور" نہ کہے درذیباں تو کہتا ہی رہے گا۔ جب تک یہ الٹا پیالہ موجود ہے۔

بزرگوار! یاد رکھو، جتنی جنگیں لڑائیاں مقدسے اور فسادات دنیا میں ہو رہے ہیں ان سب کے پس پردہ صرف اور صرف "جذبہ اور مرث" جذبہ اور مرث ہے جو انسان کو لڑائیوں بھگڑوں اور فسادات پر آمادہ کرتا ہے۔

محترم سامعین!

اللہ نے ایک طرف تو ہمیں فتنہ و فساد سے منع کیا ہے اور دوسری طرف ہم میں "اور" کا جذبہ و رذیت کر دیا ہے گویا سمندر میں پھینک کر کہہ دیا کہ "دامن ترشہ ہونے پائے" بناؤ! ہمارا سخت امتحان ہے یا نہیں؟ آخر ہم خدا ہی سے پوچھتے ہیں "خدا وندا۔ تو ہی کوئی تدبیر بتا کہ ہمارا "اور" کا جذبہ بھی پورا ہوتا ہے اور دنیا میں فساد و لڑائی بھی نہ ہو۔ اللہ جواب میں فرماتا ہے۔

"صَلُّوا! میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ لَاتُ نَشْكُرْكُمْ لَا زَيْدٌ لَّكُمْ" اگر ایک نعمت کے ملنے پر تم شکر ادا کرو گے تو میں اللہ تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اس میں اور اضافہ کر دوں گا۔ چونکہ اضافہ میرے ذمہ ہے لہذا میری عطا لا محدود ہے۔ تمہارا "اور" تھک جائے گا مگر میری "عطا" نہیں تھکے گی۔

صاحبان! اس شکر کے معنی یہ نہیں ہیں کہ شام کو پیٹ بھر کے روٹی کھائی اور لیٹ گئے پیٹ پہ ہاتھ رکھ کے اور کہا "یا اللہ! تیرا شکر ادا کرتا ہوں لہذا صبح کو گوشت عطا فرمائیے گا۔ حالانکہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ خدا کی نعمت کا سطر شکر ادا نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اگر تم واقعی خدا کی دی ہوئی نعمتوں کا شکر ادا کرنا چاہتے

ہو۔ تو یوں کرو۔ کہ خدا نے یہ دو آنکھیں تمہیں نعمت دی ہیں۔ لہذا خدا کی دی ہوئی اس نعمت کا شکر ادا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اپنی ان آنکھوں کو اللہ کی مرضی کے مطابق عمل میں لاؤ۔ یہ گویا اللہ کی نعمت کا شکر یہ ادا کرنا ہے۔ اسی طرح پیروں سے چلو گھر ادھر چلو جب ہر اللہ چلانا چاہتا ہے۔ اسی طرح ہاتھوں سے ضرور کام لو۔ انہیں معطل نہ کرو کیونکہ یہ خدا کی نعمت ہے۔ لہذا اسے "بامدھ سے رکھنا" گویا کفرانِ نعمت ہے۔ اب ان ہاتھوں سے کام لو۔ مگر یہ خیال رکھنا کہ جو کام بھی لو اسے پہلے دیکھ لو کہ کیا اسے اللہ بھی پسند کرتا ہے یا نہیں؟ اسی طرح اللہ نے انسان کو زبان جیسی شے عطا فرمائی ہے۔ لہذا اس نعمت کا شکر ادا کرنے کے لئے ایسے کلمات نکالو جن سے اللہ راضی ہو جائے۔ یہی حالت دانتوں کی بھی ہے کہ حلال کھاؤ اور حرام سے بچو۔

حضورِ والا! قرآن مجید کی یہ آیت ہے کہ شکر کرو گے تو نعمت میں

اضافہ ہوگا۔ کس پر نازل ہوئی ہے؟ رسول پر۔ اب بتاؤ! اس آیت کی تعمیل رسول نے بھی کی یا نہیں؟ یقیناً رسول نے بھی شکر ادا کیا ہوگا۔ اور اللہ نے اپنے وعدے کے مطابق اضافہ بھی کیا ہوگا۔ چنانچہ رسول نے چاروں طرف نظر ڈالی اور دیکھا جتنی نعمتیں تھیں وہ مجھے پہلے ہی مل گئی ہیں اور ان میں اب اضافے کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہی۔ لہذا رسول سوچتا ہے کہ اللہ کا شکر ادا کر کے کس شے میں اضافہ کراؤں۔

نہیں بھائیو! رسول کے پاس ایک ایسی نعمت تھی جس کا شکر ادا کر کے وہ اس میں اضافہ کر سکتے تھے اور وہ تھی "عصمت"۔ چنانچہ رسول نے اس نعمت کا شکر یہ ادا کیا مگر زبان سے نہیں بلکہ اپنے عمل سے۔ گویا رسول نے عصمت کو اس شان سے برتنا کہ ابھی اعلانِ رسالت بھی نہیں ہوا۔ مگر دشمن بھی مان گئے کہ تو صادق بھی ہے

اور امین بھی ہے کیوں کہ قول میں عصمت ہو تو صادق ہے اور فعل میں عصمت ہو تو امین ہے۔ لہذا قول و فعل کی عصمت کو صداقت و امانت کہتے ہیں۔

سَامِعِین !

چالیس سال مسلسل نعمتِ عصمت کا شکر یہ اس انداز سے ادا کیا کہ کائنات مان گئی، دشمن مان گئے کہ تو صادق بھی ہے اور امین بھی ہے۔ گویا جس نے نعمتِ عصمت کا اتنا شکر یہ ادا کیا ہو تو اللہ کو بھی حسب وعدہ چاہیے کہ اس میں اضافہ کرے۔ اللہ نے کہا۔

”محمد! سن۔ میں اپنے امانت کے وعدہ کو پورا کرتا ہوں لہذا تجھے ایک عصمت عطا کرتا ہوں جس کا نام ہے ”فاطمہ“ گویا سیدہ طاہرا رسول کو شکر یہ عصمت کے امانت میں ملی ہیں۔ لہذا سیدہ کی عصمت کی شان اور ہے اور محمد کی عصمت کی شان اور ہے۔

صاحبانے ! اب آپ کہیں گے کہ عورتوں میں مہریم بھی معصوم ہیں۔ میں کہتا ہوں۔ ”مہریم معصوم ضرور ہے۔ مگر مہریم کی عصمت کسی شکر یہ میں نہیں ملی تھی۔ وہ تو عطیہ الہی تھا اور اس میں عصمت کی اتنی ہی مقدار تھی کہ ایک پشت چل کر عیسے تک ختم ہو گئی۔ مگر محمد کے شکر یہ عصمت میں ملی ہوئی عصمت بار آں پشت چل کر آج تک باقی ہے۔ اور قیامت تک باقی رہے گی۔ کیا مجال جو کہیں ختم ہو جائے اور پھر لطف یہ ہے کہ یہ شرف اللہ نے اس شکر یہ عصمت کو عطا کیا تھا کہ اس کی قیامت تک پیدا ہونے والی نسل معصوم تو نہیں ہوگی۔ مگر بے حکومت کے ”شاہ“ کہلائے گی۔ بغیر سرداری کے سید کہلائے گی۔ دنیا ان کے پیروں کو چھونا باعثِ فخر سمجھے گی۔ اور اگر پیسے پاس ہوں گے تو امیر کہلا دیں گے اور اگر کچھ نہیں

ہوگا تو تغیر کلائیں گے اور اگر مر جائیں گے تو یہ کلائیں گے یہ گویا ثروتِ عالمی ہے شکرِ عصمت کو جو عصمت کے شکر یہ کے طور پر ملی ہے۔

سامعین!

اب رسول چاہتا ہے کہ میں اس نعمت کا شکریہ ادا کر دوں تاکہ اللہ اور اضافہ کرے۔ چنانچہ رسول نے سیدہ کی عصمت کا یوں شکریہ ادا کیا کہ ایک دن رسول مسجد نبوی میں منبر پر نشہ لیتے فرمائے خطبہ فرما رہے ہیں کہ دیکھا کہ بیٹی ملی آ رہی ہے سیدہ کو دیکھ کر رسول تعظیم کے لئے کھڑے ہو گئے گویا رسول کا اٹھنا ہی اس نعمت کا شکریہ ادا کرنا تھا اور قدرت نے رسول کی اس ادا کو دیکھ کر فرمایا۔

محمد! تم نے نعمتِ عصمت کا شکریہ ادا کیا ہے لہذا ہم اس نعمت میں اور

اضافہ کرتے ہیں۔

چنانچہ اللہ نے ایک نعمتِ حسن کی شکل میں دے دی۔ گویا فاطمہؑ دے شکر میں اضافہ ہو کر حسن والی نعمت ملی۔ اب رسول نے اس نعمت کا بھی شکریہ ادا کر دیا۔ اور وہ اس طرح کہ ایک روز رسول عید کی نماز پڑھتے جا رہے تھے اور حسن کو لاندھے پر بٹھا رکھا تھا اور اپنی زلفیں حسن کے ہاتھوں میں پکڑ رکھی تھیں اور کہہ رہے تھے۔ خداوند! دیکھ لے تیری نعمتِ حسن کا شکریہ ادا کر رہا ہوں۔

گویا شکرِ نعمتِ حسن جو رسولِ جمعِ عام میں ادا کر رہے تھے۔ اس کو جب اللہ نے دیکھا تو قدرت کو محمدؐ کی یہ اداسپند آگئی

محمد! تو نے حسن کی نعمت کا خوب شکریہ ادا کیا ہے۔ لہذا آج ہم

اس میں اضافہ کر کے تمہیں حسین دیتے ہیں

صاحبانِ ذوق!

رسول نے فاطمہؑ کی نعمت کا شکریہ محض تعظیم کر کے اللہ سے حاصل کیا اور

اور حسن کی نعمت کا شکریہ یہ تھا کہ نماز کو جاننے وقت کندھے پہ بٹھالیا، مگر جب حسینؑ
 نانی نعمت ملی تو شکریہ کا انداز ہی کچھ اور تھا۔ اور وہ یہ تھا کہ
 رسول نماز پڑھ رہے ہیں، سجدہ میں سر پہ اور پشت چسٹیں کو بٹھا
 لیا، چونکہ اس شکریہ میں عبادت اور سجدہ دونوں شامل ہیں لہذا اب
 جو اضافہ ہوگا اس میں سجدہ بھی ہوگا اور عبادت بھی ہوگی۔ گویا
 حسینؑ نعمت کے شکریہ میں جو ملا وہ ”سید الساجدین“ بھی تھا
 اور ”ذین العابدین“ بھی تھا۔

بزرگان من!

رسولؐ کو جب سید الساجدین اور زین العابدین والی دونوں نعمتیں مل گئیں۔
 تو رسولؐ نے اس نعمت کا بھی شکریہ ادا کر دیا۔
 اللہ نے کہا، ”محمد! سنتے بھی ہو، اگر چاہو تو اس شکریہ کے عوض ہم تمہیں
 محمدؐ نادمے دیں“

چنانچہ محمدؐ کے شکریہ میں محمدؐ مل گیا جس کو ہم محمدؐ باقر کہتے ہیں۔ اس کے بعد
 رسولؐ نے پھر کہہ دیا
 ”یا اللہ! تیرا شکر ہے کہ تو نے مجھے باقر جیسا فرزند عطا فرمایا ہے۔“
 اللہ نے کہا،

”محمد! ہم جانتے ہیں، تم نے یہ شکریہ لسانِ صدق سے ادا کیا ہے لہذا
 ہم تمہیں ”صادق“ دیتے ہیں۔“

چنانچہ اللہ نے حضور جعفر صادقؑ دے دیا۔ اس طرح رسولؐ کا شکریہ چلتا
 جا رہا تھا۔ اور اللہ کا اضافہ بھی چلتا جا رہا تھا۔ آخر چلتے چلتے رسولؐ جب
 گیارہویں پہنچے تو اللہ نے اپنے خزانے کا جائزہ لیا۔ دیکھا اور فرمایا:

محمد! سنتے بھی۔ گیارہویں تک تو ہم دیتے رہے مگر آج سے لقطع
سودا کر لو۔

محمدؐ نے پوچھا۔ ”خداوند! وہ کیسے؟“

اعلیٰ حضرت نے فرمایا۔

محمدؐ! آج سے یہ فیصلہ ہو جائے کہ ہمارا ”عظیہ“ ”قائم“ ہوگا
اور تنہا راشرکیہ ”ذائیم“ ہوگا۔

سامعین!

ایک شخص حضور امام علی نقی علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی
”فردنذر رسولے!..... وہ امام جو آخری امام ہوگا اور جو ”دائیم و
قائم“ ہوگا۔ ذرا اس کی صفت تو بیان فرمائیے! چنانچہ حضور امام علی نقی علیہ السلام
فرماتے ہیں۔

”اپنے امام کی شان کیا پوچھتے ہو“ صاحب الدعوة النبویہ
وصول الحیدرید ”تنہارا امام اسی طرح دین کی دعوت
دیتا ہے جس طرح اس کا جہد رسول دعوت دیتا تھا“ وصول
الحیدرید ”اس کا اقبال حیدر کرار جیسا ہے“ عصمت
الفاطمیہ ”اس کی عصمت فاطمہ جیسی ہے“ والحلم الحسینیہ
حسن جیسا اس کا علم ہے“ والشجاعت الحسینیہ ”اور حسین
جیسی اس کی شجاعت ہے۔

بہر نوع صفت بیان کرتے کرتے جب گیارہویں تک پہنچے تو کہہ۔
”والہیبة العسکریہ“ اور حسن عسکری جیسی اسکی ہیبت ہے
تو یہاں آگے آپ رک گئے اور فرمایا۔

”سنو! تم اس کی غیبت پڑھتے ہو؟.... والغیبة

اللہ جیسی اُس کی غیبت ہے۔

اب بتاؤ! اللہ کسی جزیرے یا نار میں غائب ہے یا کسی مکان میں غائب

ہے؟۔ ہرگز نہیں۔

اللہ تو ہر جگہ ہے اور غائب ہے۔ اسی طرح ہمارا امام خدا کے فضل سے

ہر جگہ ہے اور غائب ہے۔ لہذا ہم یہ مجالس صرف اپنے امام کو پُرسہ دینے کی غرض

سے کرتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ ہر جگہ موجود ہے اور ہم ان کے ادنیٰ رعایہ اُن کے

سامنے اُن کے بزرگوں کے فضائل بیان کرتے ہیں۔

سَامَعِین!

خدا گواہ ہے۔ ہماری ان مجالس کے اصل سامع آلِ محمد ہیں جن کے تصور

کی وجہ سے میں نے عمر بھر کبھی بیٹھ کے نہیں پڑھا۔ میرا ایمان ہے کہ میرا مولا موجود

ہے اس لئے کھڑے ہو کر پڑھتا ہوں یہ ادبیات ہے کہ حادثہ کی وجہ سے پہلے دونوں

پاؤں پکھڑا ہوں پڑھتا تھا۔ اب ایک پاؤں پہ کھڑے ہو کر پڑھتا ہوں۔

بہر ذلک تصور آلِ محمد اپنی مجلسوں میں ملحوظ خاطر رکھتا ہوں۔

بزرگانِ منہ!

ایک دن کربلا معلیٰ میں ایک عالم بیان فرما رہے تھے کہ جب تم مجلس منعقد کرتے

ہو تو اس میں امام العز و الزماں تشریف لاتے ہیں لہذا ہمارے خطیبوں و اذکاروں

اور ذاکروں کو چاہیے کہ وہ بڑی احتیاط کے ساتھ اصل واقعات بیان فرمائیں۔

اور جب تم امام کے سامنے مصائب پڑھو تو بیشک حسین کی شہادت پڑھ دینا

علی اکبر کی شہادت پڑھ دینا۔ علی اصغر کی شہادت پڑھ دینا۔ عباس کی شہادت

پڑھ دینا۔ عون و محمد کی شہادتیں پڑھ دینا یا امیر قاسم کی شہادت پڑھ دینا

مگر ایک بات کی احتیاط کرنا کیونکہ امام موجود ہونا ہے لہذا ان کی موجودگی میں انکی دای زینب کی قید نہ پڑھنا۔ کیونکہ بی بی کی قید سننا امام کے لئے ناقابل برداشت ہے۔ یہ وہ چیز ہے جو آپ کو بے ہوش کر دیتی ہے۔ پھر فرشتے آکر پیر ملتے ہیں۔ لہذا ہمیں بڑی احتیاط سے زینب کی قید کا تذکرہ بیان کرنا چاہیے۔

سَمَاعِین!

میں خود قید ہوا تھا۔ ۲۹ جنوری ۱۹۶۴ء دو بجے رات کا وقت تھا اور تقریباً پانچ سو پولیس کے آدمی مجھے گرفتار کرنے آ گئے۔ سارے محلے کا محاصرہ تھا۔ چھتوں پر پولیس تھی اور سارا محلہ سہما ہوا تھا کہ اللہ جانے کیا بات ہے بھرنوع مجھے گرفتار کر کے جب ایک کار میں بٹھا دیا گیا تو کسی کی آواز آئی۔! "ایس پی صاحب! ہتھکڑی لگا دوں؟"

ایس پی نے کہا۔

"خبردار! کیوں شریف آدمی کو پریشان کر رہے ہو۔"

بس بھائیو!

ایس پی کا یہ کہنا تھا کہ میں نے کہہ دیا۔

ایس پی صاحب! کاش تم کربلا میں موجود ہوتے اور بجائے یہاں کے وہاں کہہ دیتے کہ "کیوں شریف آدمی کو پریشان کر رہے ہو؟"

حضراتے!

آج سے ایک عرصہ پہلے میرا اپنا خیال تھا کہ محذرتہ عسرت و طہارت کے ہاتھ باندھنے والی روایت ہم لوگوں نے صرف رونے کے لئے بنائی ہے۔ مگر جب میں نے انام زمان کی زیارت ناحیہ پڑھی تو اس میں ہاتھ باندھنے کا ذکر تھا۔ چنانچہ میں نے کہا "ٹھیک ہے ضرور بندھے ہوں گے" پھر یہ

تشویش کوئی کہ کس طرح بندھے تھے؟ اس کے متعلق بھی امام زمانؑ زیارت
- ناحیہ میں فرماتے ہیں:-

میرا سلام ہو میری دادی زینبؑ پر جس کے دونوں ہاتھ اُس کی
گردن کے ساتھ بندھے ہوئے تھے۔۔

بزرگانِ منہ!

دُنیا میں کوئی ایسی مصیبت نہیں ہے جو زینبؑ پر نہ گذری ہو۔ اسی لئے
زینبؑ کو اُم المصائب بھی کہا جاتا ہے۔
امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کا فرمان ہے کہ میری دادی پر وہ مصائب گذر گئے
کہ جنہیں نہ کوئی سوچ سکتا ہے اور نہ ہی سمجھ سکتا ہے۔

سأعین!

زمانے کا انقلاب دیکھو کہ حیدر کار کی بیٹی یزید کے دربار میں کھڑی ہے۔
اور یزید اپنے نشہ فتنے میں اتنا مشغول ہے کہ قیدیوں سے بات نہیں کرتا۔ پھر
کھڑے ہوئے قیدیوں میں معصوم بچوں کے پاؤں میں درم آگئے تھے اور زمانے
کا امام بالکل خاموش کھڑا ہے۔ سیدانوں کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں اور علی کی
بیویں، والدہ علیؑ اصغر اور والدہ شہزادہ قاسمؑ سر جھکائے خاموش کھڑی ہیں
تھوڑی دیر بعد زینبؑ نے امام زین العابدینؑ سے کہا:-

بہیٹا! میری بھاؤ جیں کھڑی ہوئی ہیں اور ان کے میلے کے لوگ
کرسیوں پر بیٹھے ہیں۔ وہ کیا کہتے ہوں گے کہ ہماری لڑکیاں کس خاندان سے یہاں
گئیں ہیں۔ بہیٹا! مجھے شرم کھا رہی ہے۔

اس کے بعد زینبؑ کا وہ تاریخی فقرہ آج بھی فضا میں گونج رہا ہے
کہ جب سیدانوں کو دربار یزید میں کافی دیر کھڑے رہنا پڑا تو زینبؑ کے

منہ سے بے ساختہ نکلا۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اٰکْرَمَنَا۔

»خدا یا ! ہم تیرا شکر ادا کرتے ہیں
جس نے ہمیں یہ عزت عطا کی«

سَامِعِیْن !

کوئی اور ہوتا تو کہتا۔

»واہ اللہ ! ہم کس طرح تیرا شکر ادا کریں۔ کیونکہ تیرے نام پر ہم
مرگے اور تو نے ہماری خبر بھی نہ لی۔ ہمارے بچوں کو زنج ہوتے دیکھنا
رہا مگر کچھ مدد نہ کی«۔

مگر

وہاں زینب نے اللہ کا شکر ادا کر کے دُنیا کو یہ منوا دیا کہ:

»خدا ہے«

اور یہ خدا کا بڑا احسان ہے کہ آج دُنیا خدا کو مان رہی ہے۔ اب اگر
خدا کا یہ وعدہ ہے کہ:

»اگر تم شکر ادا کر دگے تو امانت کر دنگلا«

تَوْبَتَاؤ !

زینب کے اس شکر پر

قدرت کیا اَصْنَان

فرماتی ہے۔ ؟

قانونِ عدل

حضراتِ گرامی قدر!

اللہ تعالیٰ کا منشا یہی ہے، اللہ کی مشیت یہی ہے اور اللہ چاہتا ہی ہے کہ انسان ہر حالت میں قانونِ عدل پر قائم رہے اور عدل سے منحرف نہ ہونے پائے دوسرے لفظوں میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ انسان کو وہی کرنا چاہیے جو کہنا چاہیے گویا کوئی بات اللہ کی ”چاہیے“ کے خلاف نہیں ہونا چاہیے۔ یہی اللہ کا منشاء ہے اور یہی اس کی مرضی ہے۔ اگر انسان قانونِ عدل پر قائم نہ رہے تو اللہ کا کچھ بگڑنا نہیں۔ اور اگر دنیا کے تمام انسان قانونِ عدل پر قائم ہو جائیں تو اللہ کو کچھ ملنا نہیں۔ اللہ بہر نوع اللہ ہے۔ چاہے ساری دنیا اللہ اللہ کرے۔ تب اللہ ہے اور اگر ساری دنیا اللہ سے منکر ہو جائے۔ اللہ پھر بھی اللہ ہے۔

سامعین!

ابھی تک تو کوئی انسان دنیا میں ایسا پیدا ہوا ہی نہیں جو اللہ کے وجود کا منکر ہو۔ یہ اور بات ہے کہ کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ ”ہم اللہ کو نہیں مانتے“ ان کا یہ کہنا ”ہم اللہ کو نہیں مانتے“ سے مراد یہ ہے کہ کوئی اللہ ہے جس کے وجود سے وہ منکر ہیں۔ ورنہ اگر اللہ نہ ہوتا تو ”نہ ماننا“ کبھی سامنے نہ آتا۔ بہر کیف کوئی انسان اللہ کے وجود سے منکر نہیں ہے۔ بلکہ ہر انسان کسی نہ کسی طرح سے اللہ کے وجود کا اقرار کرتا ہے اور اگر کوئی نہ مانے تو اس سے اللہ کا کچھ نہیں بگڑتا بلکہ وہ

تو یہ کہتا ہے کہ:-

النسا نو! قالون عدل پر قائم رہو۔

بزرگوارن من!

سب سے پہلی عدالت، اللہ ہم سے یہ چاہتا ہے کہ:-

النسا نو! میں نے تمہیں انسان پیدا کیا ہے۔ لہذا پہلا عدل یہ ہے کہ تم انسان

بن کے رہو۔

حضراتے! اگر اللہ میں انسان کی بجائے کچھ اور بنا دیتا تو ہماری کوئی

زبردستی تھی؟۔ یہ تو اللہ کا ہم پر بڑا فضل و کرم ہے کہ اس نے میں انسان پیدا کیا ہے

بچو! اب تم پوچھو گے کہ انسان کچھ اور کیا بن سکتا ہے؟

میں کہتا ہوں۔ ”زیادہ دُور جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ دیکھو نا! انسان

کے دائیں طرف ایک فرشتہ ہے اور بائیں طرف ایک حیوان۔ اب اگر انسان چاہے

تو حیوان بن جائے اور چاہے تو فرشتہ بن جائے۔

گویا فرشتہ بننا بھی کوئی مشکل نہیں اور حیوان بننا بھی کوئی مشکل نہیں۔ بلکہ انسان کا

انسان بننا بڑا مشکل کام ہے۔

سامعین!

حیوان بننے میں کیا مشکل ہے۔ طریقہ میں بتائے دیتا ہوں۔

دیکھو نا!

انسان کو بھی بھوک لگتی ہے اور حیوان کو بھی بھوک لگتی ہے۔ انسان کو بھی خوراک

چاہیے اور حیوان کو بھی خوراک چاہیے۔ لہذا دونوں اپنی بھوک میں خوراک مانگتے

ہیں۔ مگر فرق یہ ہے کہ حیوان کو جب بھوک لگتی ہے۔ رستہ توڑ دیا اور گھر سے چلا۔

رستے میں جو شے کھانے کی نظر آئی۔ کھالی مگر یہ نہ دیکھا کہ اپنی ہے یا پرانی ہے۔

اس کا کھانا مناسب ہے یا نامناسب ہے۔ اس کا کھانا جائز ہے یا ناجائز؟
بہر نوع اپنا پیٹ بھریا۔

گویا جو پیٹ بھرنے میں ”جائز و ناجائز“ کی پرواہ نہ کرے۔ اُسے
”جیوانے“ کہتے ہیں اور جو یہ سوچ لے کہ یہ مناسب ہے یا نہیں؟ جائز ہے
یا نہیں؟ اسے کھانا چاہیے یا نہیں؟ اگر پرانی ہے تو بھوکا رہنا بہتر ہے۔ ایسے
جائز و ناجائز کی سمجھ رکھنے والے کو ”السانے“ کہتے ہیں۔

اُب بناؤ ! حیوان بننا آسان ہے یا انسان بننا مشکل ہے؟
بہر نوع آپ اگر حیوان بننا چاہیں تو بن سکتے ہیں اور اگر فرشتہ بننا چاہیں تو
اس کے لئے بھی کوئی دشواری نہیں ہے۔

دیکھو نا !۔ اگر آپ چاہیں تو ابھی فرشتہ بن سکتے ہیں کیونکہ فرشتہ وہ
ہیں جو نہ کاتے ہیں اور نہ ہی محنت کرتے ہیں۔ جو نہ مزدوری کرتے ہیں اور نہ ہی
کسی کی پرواہ کرتے ہیں۔ لہذا آپ بھی یہی کام شروع کر دیں کہ ایک لمبا سا کرتا پہنیں۔
نوہ سے کا ایک چٹا ہاتھ میں لے لیں۔ سال بھر حجامت نہ بنوائیں۔ عین سال غسل نہ
فرمائیں، ناخن بڑے ہو جائیں۔ بال بے ہو جائیں۔ کرتا میل ہو جائے۔ رات کو
سونے کی جگہ ہو۔ کمانا بالکل چھوڑ دیں۔ کھانے کی فکر نہ ہے۔ لہذا سب دیکھنے والے
یہی کہیں گے ”بندہ کیا ہے، فوشتہ ہے“

میں پوچھتا ہوں ”بھئی ! تمہیں کیسے پتہ چلا کہ یہ پاگل فرشتہ بن گیا؟“
”زیدی صاحب ! تمہیں کیا معلوم ہے، تم کبھی فرشتہ بنو تو پتہ چلے“

ادھر زیدی صاحب نے کبھی فرشتہ بنیں گے اور نہ ہی پتہ چلے گا۔ اُدھر فرشتہ
صاحب میں کہ سارا دن سڑکوں پہ مارے مارے پھرتے ہیں اور رات کو کسی دکان کے
تھڑے پر لیٹ گئے۔ سردی کا موسم۔ رات بھر غلے والوں کو جگایا اور جب کئی پوچھا

کہ کیا بد تمیزی ہے تو لوگوں نے کہا، "عبادت کو رہا ہے"۔ بہر نوع اسے فرشتہ کہتے ہیں۔ اب اگر تم میں سے کوئی بننا چاہے تو بے شک بن جائیے۔

بچو!

مجھے بھی لوگ اکثر یہی کہہ دیتے ہیں، "زیدی صاحب! سبحان اللہ! آپ تو فرشتہ ہیں"۔ ادھر زیدی صاحب بھی اڑ جاتے ہیں کہ میں فرشتہ بن گیا ہوں حالانکہ لوگوں کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ زیدی صاحب فرشتہ تو میں گلان میں انسانیت نہیں ہے۔ یاد رکھو! حیوان بننا بھی بڑا آسان ہے اور فرشتہ بننا بھی بڑا آسان ہے مگر یہ دونوں باتیں انسان کو قانونِ عدل سے ہٹا دیتی ہیں۔ لہذا قانونِ عدل کا تقاضا یہی ہے کہ تم انسان ہو اس لئے انسان بن کے رہو۔ کیا عجیب جو تمہاری انسانیت میں فرق آجائے۔ تمہارا ہر قول فعل قانونِ عدل پر قائم رہنا چاہیے۔ برادری کے معاملات میں بھی اور اللہ کے معاملات میں بھی تم قانونِ عدل پر قائم رہو۔ جس طرح اللہ کہتا ہے، "نماز پڑھو"۔ لہذا تم بھی نماز پڑھو۔ اللہ کہتا ہے، "روزہ رکھو"۔ لہذا تم بھی روزہ رکھو۔ اللہ کہتا ہے، "کسی کا مالی نہ کھاؤ"۔ لہذا تم بھی غاصب نہ بنو۔ اللہ کہتا ہے، "کسی پریشان نہ کر دیکو نہ کسی معاشرتی عدل ہے"۔ لہذا تم اس پر بھی قائم رہو۔ گویا یہی قانونِ عدل ہے کہ انسان انسان بن کے رہے۔ چاہے وہ ذاتی معاملہ ہو۔ یا معاشرتی معاملہ ہو۔ چاہے بندوں کا معاملہ ہو یا اللہ تک پہنچنے کا معاملہ ہو۔ بہر نوع تمہیں ہر حالت میں قانونِ عدل پر قائم رہنا چاہیے۔

سامعینے!

اللہ کے معاملہ میں انسان بڑا ظالم واقع ہوا ہے۔ کیونکہ اگر انسان، انسانوں پر ظلم کرے تو یہ ڈر رہتا ہے کہ انسان جواب دے گا۔ مگر اللہ کے بارے میں انسان جانتا ہے کہ یہ رحیم و کریم ہے لہذا معاف کر دے گا۔ بہر کیف اللہ کے معاملہ میں انسان بہت

ظالم راقع ہوا ہے۔ انسان کو جہاں بھی موقع ملتا رہا ظلم کرتا رہا کہیں کہدیا اللہ در
ہیں کہیں کہدیا "نہیں ہے" بہ نزع اللہ کے معاملے میں انسان بڑا ظالم راقع
ہوا ہے۔

بچو!

اگر میری بات پغین نہ آئے تو ہمسایہ ملک (ہندوستان) میں جا کے دیکھ لو۔
وہاں تقریباً ساٹھ کروڑ پوجتے دلے ہیں اور دوا رب اللہ ہیں۔ گویا ایک ایک بندے
کے حصے میں تین تین "اللہ" آتے ہیں مثلاً "پہلے... اللہ" ہے "گائے اللہ
ہے۔ گنگا اللہ ہے۔ دیگر وغیرہ۔

بچو! تم تو ابھی بچے ہو۔ اُن بزرگوں سے پوچھو جو ہندوستان سے آئے
ہیں۔ وہ بتائیں گے کہ ساٹھ کروڑ عوام گنگا کو "گنگا ماما" کہتا ہے۔ ادھر گنگا
ہے کہ پھولی نہیں سماتی "کیونکہ لاکھوں کروڑوں انسان جو "اما" کہہ
رہا ہے۔

یاد رکھو! ایسی مائیں بہت اکر تھی ہیں جو بیس جمع "مائیں" نہ ہوں۔
بہ نزع دنیا نے گنگا کو جب "اما" کہہ دیا تو گنگا کے ہواس اڑ گئے۔ آپے
میں نہ رہی۔ ادھر گنگا ہے کہ پھولی نہیں سماتی کہ بغیر بچہ جنے "اما" بن بیٹھی ہوں
اس سے بہتر اور کیا چاہیے۔ لہذا سال دو سال تو خیریت سے اپنے ہی کناروں کے لاند
موضع میں بہتی رہی اور جب تیسرے سال غصہ جو آیا تو کناروں سے باہر نکل پڑی اور
سیلاب آگیا۔ اب بچے لاکھ کہہ رہے ہیں۔

اماں! دیکھو۔ ہم تیسرے ہی بچے ہیں۔ ہمیں کیوں ڈبو رہی ہو؟
مگر اماں ہے کہ کسی کی سنتی ہی نہیں۔ اور ادھر بچے ہیں کہ کان پکڑ
رہے ہیں "اما" غصہ جانے بھی دو۔ ہم بے چاروں پہ

رحم کر دے مگر ماں کسی کی سنتی ہی نہیں کیونکہ کناروں کے اندر رہے
تو رحم کرے۔

بزرگو!

انگریز قوم بڑی ہوشیار تھی۔ انہوں نے سوچا کہ، اہمات بن کے بے کار
بھی ہے اور یہ بے کاری کا مشغلہ ہے کہ چلو اور نہیں تو کناروں سے ہی باہر نکل پڑو
لہذا اماں کو مصروف رکھنے کے لئے انہوں نے جگہ جگہ سے نہریں نکال دیں اور
چلیاں لگا دیں۔ اب جو اماں کو چلی پیستا پڑی۔ تو بگڑا ہوا دماغ ٹھیک ہو گیا۔
بہر نوع انسان نے ہزاروں اللہ بنا کے بٹھا دیئے۔ اب اگر میں آج تمام
اللہؤں کی فہرست بیان کرنا شروع کر دوں تو پورا عشرہ گزر جائے گا۔ مگر اللہ
ختم نہیں ہوں گے۔

سامعینے!

ہم نے حجادہ عقل و علم کے مطابق فیصلہ کیا کہ بالکل غلط، ہزاروں دوزخ
کو کھٹکھٹانے سے تو بہتر ہے کہ ایک ہی باب کریم پہ بیٹھ جائیں۔ یہی عین شرف
ہے اور یہی تقاضائے انسانیت ہے۔ ہم مسلمان ہیں اور ہمارے کلمہ میں پہلی چیز
یہی ہے کہ ”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ“، اللہ اکبر ہے۔

دیکھنے میں تو یہ دو لفظ ہیں ”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ“
مگر اتنے قیمتی ہیں کہ بڑے سے بڑا دشمن بھی ان میں نہ نکستہ نہیں لگا سکتا
اور پھر ان میں جو لطافتیں اور وسعتیں ہیں ان کا کوئی شمار ہی نہیں کر سکتا۔
کلمہ میں طاقیتیں اتنی ہیں کہ ابھی جتنی تھا۔ پڑھ دیا تو جنتی ہو گیا۔ نجس تھا۔ پاک ہو
گیا۔ غیر تھا۔ اپنا ہو گیا۔ دور تھا۔ قریب ہو گیا۔ گویا یہ کلمہ اتنی طاقتور شے ہے۔
بزرگو! تمہاری عمر گزر گئی یہ سنتے سنتے کہ دنیا میں اگر کوئی طاقتور شے ہے

تو وہ ”ذوالفقارِ حیدر کو مار رہے۔ اور جب تلوار اتنی طاقتور ہے تو پھر تلوار
 دالے کی طاقت کا تو کوئی اندازہ ہی نہیں لگایا جاسکتا۔ گویا علیؑ تو ہے ہی مرکز طاقت
 علیؑ کے کام میں طاقت ہے۔ علیؑ کے نام میں طاقت ہے۔ انسان ذرا سا گھبرا جائے
 اور علیؑ کا نام لے لے تو بدن میں طاقت آجائے گی۔ گویا علیؑ بہترین نسخہ ہے۔
 علیؑ بہترین کیمیا ہے۔ علیؑ بہترین اکبر ہے۔ برنوع علیؑ کے نام میں بڑی قوت
 ہے۔

دیکھو نا!

جب مغربی پاکستان میں ۱۹۶۵ء میں جنگ ہوئی تھی، ان دنوں میں لاہور
 میں تھا۔ اور لاہور مرکز جنگ تھا۔ ایک رات ۱۲ بجے کے قریب تمام شہر اور محلہ بھر سے
 دکانوں اور مکانات کی چھتوں سے ”یا علیؑ۔ یا علیؑ“ کی آوازیں آنے لگیں۔ میں حیران
 و پریشان تھا کہ آخر بات کیا ہے۔ آج ”یا علیؑ۔ یا علیؑ“ کیوں ہو رہا ہے؟۔
 چنانچہ گھر سے نکلا اور دیکھا کہ بڑے بڑے بزرگانِ دین جو دن کی روشنی میں ”یا علیؑ“
 کہنے کو بدعت کہہ رہے تھے۔ آج پوری آواز سے ”یا علیؑ“ کہہ رہے ہیں۔ میں حیران
 و پریشان کہ آج یا علیؑ کا دور دورہ کیوں ہو گیا۔ آخر کاری سوچتا ہوا گھرا یا اور سو گیا۔
 مگر نیند کس کو آئے ادھر بلیک آؤٹ اور ہوائی جہاز بم برسارہے ہیں اور ادھر ”یا علیؑ“
 ”یا علیؑ“ کہنے والوں نے پریشان کر رکھا ہے۔ بالآخر سوچا کہ دن چڑھے پوچھوں گا کہ
 کیا بات ہے۔

بچو!

میں نے ایک طوطا پال رکھا تھا جسے چھ مہینے سے محنت کر کے یکساں تھا
 ”نبی جی چوری بھیجو“۔ بس اور کچھ نہیں جانتا تھا سوائے اس کے کہ۔
 ”نبی جی چوری بھیجو“۔ ادھر میں رات کو اسی سوچ میں لیٹا ہوا تھا کہ خدا دندا!

آج ”یا علی“ یا علی، کیوں ہو رہا ہے کہ اسی اثنا میں طوطے نے بھی بولنا شروع کر دیا۔ مگر۔ ”نئی جی چوری بھیج نہیں۔ بلکہ ”ٹپیں“ ”ٹپیں“ کہنا شروع کر دیا۔ وہی اپنی اصلی بولی بولنا شروع کر دی۔ میں نے بستر پر لیٹے ہوئے پوچھا :-
 طوطے میاں! آج سکھائی ہوئی بات بھول گیا اور اصلی بات کہنا شروع کر دی۔ آخر کیوں؟

یہ کہہ کر جو میں نے دیکھا کہ بتی نے طوطے کے پنجرے پہ حملہ کیا ہوا ہے۔ اب پتہ چلا کہ امن و امان ہو تو سکھائی ہوئی باتیں کہی جاتی ہیں اور حملہ ہو جائے تو اصلی بات خود بخود منہ سے نکل جاتی ہے۔

بہر نوع ”یا علی“ کہنے میں بڑی طاقت ہے۔ علی بڑی طاقت والی شے ہے، علی بڑی قوت والی شے ہے۔ علی کے نام میں طاقت ہے۔ علی کے کام میں طاقت ہے اور پھر علی کی تلوار تو ہے ہی مرکزِ طاقت۔

کیوں سامعین!

اگر علی کی تلوار پوری طاقت سے چل پڑے تو بتاؤ! اخیر کے درے رکتی ہے؟۔ مرحب کے سر سے رکتی ہے؟۔ خیر و مرحب کو چھوڑ دو بلکہ یہ بتاؤ! جبرئیل کے پر سے رکتی ہے؟۔ ”نہیں“۔ گویا علی کی تلوار اتنی طاقت ور شے ہے۔

اب بتاؤ۔ جس تلوار کی طاقت کو کوئی شے نہیں روک سکتی تھی اس کی طاقت کو لا الہ الا اللہ روک دیتا تھا یا نہیں؟۔ ادھر سے علی کی تلوار چلی اُدھر سے منہ سے کلمہ نکلا لا الہ الا اللہ، تلوار فوراً رُک جاتی تھی۔ گویا علی کی تلوار کو جو شے روک لے وہ ہے لا الہ الا اللہ۔

یاد رکھو! چاہے بے دلی سے ہو۔ چاہے صحت زبان سے ہو۔ اگر سنا

والے نے کہدیا، "لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، تو علیؑ کی تلوار ٹک جاتی تھی۔

بہر ذریعہ علیؑ کی تلوار اتنی طاقت ور ہونے کے باوجود کلمہ کے سامنے ٹک جاتی تھی: لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ ہمارا کلمہ ہے اور یہی قانونِ عدل ہے کہ "اللَّهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ"۔

صاحبانے!

مسلمانوں کی سب سے بڑی قسم اگر کوئی شے ہے تو وہ کلمہ طیبہ ہے۔ اگر کلمہ پڑھ کے کوئی مسلمان بات کہدے تو دوسرے مسلمانوں کو ماننا پڑتی ہے۔ گویا اتنی بڑی مقدس قسم ہے "قسمِ جلال"۔

بچو! ہمارے پنجاب میں تو یہ طریقہ ہے کہ اگر کسی چور کو چوری کے جرم میں پکڑ لیا جائے اور وہ کلمہ پڑھ کے کہدے کہ میں نے چوری نہیں کی تو لوگ اسے چھوڑ دیتے ہیں کہ وہ آدمی کلمہ پڑھ کے جو کہہ رہا ہے۔ اب اگر اس کی بات نہیں مانیں گے تو ہم مسلمان نہیں رہیں گے۔ گویا کلمہ اتنی طاقتور شے ہے کہ اگر کلمہ پڑھ کے کوئی بات کہ دی جائے تو مسلمانوں کو ماننا پڑے گی اور اگر نہیں مانو گے تو تم مسلمان نہیں رہو گے۔ یہی بات ہے حضور والا!

ہمارا بچہ ہو یا بوڑھا۔ جوان ہو یا بڑھا۔ جاہل ہو یا عالم۔ امیر ہو یا غریب۔ رئیس ہو یا تاجر۔ گویا ہم میں سے ہر ایک سے گھر میں۔ بازار میں مسجد میں۔ کعبہ میں۔ جہاں چاہو کہلوالو، لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ ہم کلمہ پڑھ کے کہتے ہیں۔ مسلمان ہو تو ماننا پڑے گا۔ مومن ہو تو یقین کرنا پڑے گا کہ "علیؑ ولی اللہ"۔

سامعین!

ہم یہ تو خواہ مخواہ الزام لگایا جا رہا ہے کہ ہم نے "علیؑ ولی اللہ" کو جزو کلمہ

بنالیا ہے حالانکہ ہم تو کلمہ پڑھ کے اعلان کرتے ہیں۔ ”لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ“۔ مسلمان ہو تو ماننا پڑے گا مومن ہو تو یقین کرنا پڑے گا کہ ”علی ولی اللہ“۔ اب اگر تم نہیں مانو گے تو تمہارا اسلام خطرہ میں پڑ جائے گا۔ کیونکہ کلمہ سے بہتر اور کوئی شہادت ہو سکتی ہی نہیں۔ اس سے زیادہ اعلان کی کوئی اور شان ہو سکتی ہی نہیں اب تم اس جھگڑے میں مت پڑو۔ کہ ”علی ولی اللہ“ جزد کلمہ ہے یا نہیں؟ میں کہتا ہوں کہ جزد کلمہ تو کیا شے ہے بلکہ علی ولی اللہ نور مخرج کلمہ ہے۔ اب اگر چاہو تو روح کو کلمہ سے نکال دو۔

مگر یاد رکھو! تمہیں اس بات کا اختیار نہیں ہے۔ کیونکہ روح کے بغیر تم بھی مسلمان نہیں رہ سکتے۔ لہذا اپنی خیریت چاہتے ہو تو کلمہ اور روح دونوں کو ہمیشہ یاد رکھو۔ اس لئے کہ یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔

بزرگان من!

قانون عدل پر قائم رہنے کے لئے سب سے پہلے ہمیں خدا کے بارے میں قانون عدل پر قائم رہنا پڑے گا کہ وہ ”وحدہ لا شریک“ ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں کسی کی طاقت ہی نہیں کہ اس کا کوئی شریک ہو جائے۔ کسی کی مجال ہی نہیں کہ اس کا کوئی شریک ہو جائے۔ ایسا ہو سکتا ہی نہیں کہ اس کا کوئی شریک ہو جائے۔ اور یہ عین عدل ہے اللہ کے ساتھ کہ اللہ وحدہ لا شریک ہے۔

اور یاد رکھو! خود اللہ اس بات کا گواہ ہے کہ وہ وحدہ لا شریک ہے اور وہ صاحبان علم اللہ کے وحدہ لا شریک ہونے کے گواہ ہیں جو ”قائم بلقسط“ ”عدل پر قائم ہیں“

سَامِعِیْنِ! اللہ نے یہ نہیں کہا کہ جو عدل کرتے ہیں بلکہ فرمایا ”قائم بلقسط“ ”جو عدل پر قائم ہیں“

اور یاد رکھو! ”عدلے پر قائم“ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ ان کا کوئی قول و فعل و عمل عدل کے خلاف ہو سکتا ہی نہیں ”ہوتا نہیں“ نہیں ہے بلکہ ”ہو سکتا ہی نہیں“ گویا جس کرم اصطلاح میں ”معصوم“ کہتے ہیں اسکو قرآن ”قائم بلبقسط“ کہتا ہے۔ ہر ذریعہ ان معصومین کا کوئی قول و فعل و عمل عدل کے خلاف ہو سکتا ہی نہیں۔

بچو! یہ بتاؤ۔ معصومین کتنے ہیں؟ ”چودہ“

دیکھو! ان چودہ کے علاوہ ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء بھی معصوم ہیں۔ فرق مرنے یہ ہے کہ چودہ اور شان کے معصوم ہیں اور انبیاء اور شان کے معصوم ہیں یہ چودہ بھی جو کرتے ہیں ٹھیک ہوتا ہے اور یہ انبیاء بھی جو کرتے ہیں ٹھیک ہوتا ہے۔ باقی فرق یہ ہے کہ انبیاء معصوم دی کرتے ہیں جو ٹھیک ہوتا ہے گویا پہلے وہ دیکھ لیتے ہیں کہ ٹھیک ہے۔ پھر کرتے ہیں لیکن یہ چودہ جو کر دیں ٹھیک ہوتا ہے گویا یہ چودہ پہلے ”ٹھیک“ تلاش نہیں کرتے بلکہ جو کر دیں وہ ٹھیک ہوتا ہے ان کے منہ سے جو بات نکل جائے وہ پوری ہو جاتی ہے۔ جو ان کا عمل ہو جائے وہ پورا ہو جاتا ہے۔ گویا ”ٹھیک“ ان ”چودہ“ کے تابع ہے اور انبیاء ”ٹھیک“ کے تابع ہیں۔ ان ”چودہ“ کو ضرورت نہیں کہ پہلے ”ٹھیک“ تلاش کریں بلکہ جو کر لیا وہ ٹھیک ہے۔

کیونکہ

انہوں نے اپنی مرضی اور خواہش اس طرح خدا کے سپرد کر دی ہے کہ یہ وہی چاہتے ہیں جو خدا چاہتا ہو۔ یہ وہی کرتے ہیں جو خدا چاہتا ہو اور جب ان کا قول و فعل مشیت الہی ہے تو پھر ان کے کسی حرکت و سکون میں غلطی ہو سکتی ہی نہیں۔

کیوں علمائے کرام !

بے تاؤ۔ آل محمدؑ نے کبھی کوئی ایسا عمل کیا ہے جو خدا کی مرضی

کے خلاف ہو۔ ؟

ہرگز نہیں۔

مولانا ! اعتقاد اُنہ کہو بلکہ تاریخ کا طالب علم ہونے کی حیثیت سے

کہو۔ ہر جانب دارِ مہر کی حیثیت سے کہو کہ کیا آل محمدؑ کے بڑے سے بڑے

دشمن نے بھی یہ بتایا ہے کہ ان کا فلاں قول و فعل خدا کی مرضی کے خلاف تھا ؟

ہرگز نہیں۔

نسبے بھائیو !

اسی لئے ہم دعا کرتے ہیں ”خداوند اے۔ قیامت کے دن آل محمدؑ

سے ہمارا واسطہ ہو جائے کیونکہ دنیا میں محمدؑ و آل محمدؑ نے وہی کچھ کیا جو اللہ

نے چاہا۔ لہذا قانونِ عدل کا تقاضا یہ ہے کہ جب دنیا میں محمدؑ و آل محمدؑ نے وہی

کیا جو اللہ نے چاہا تو قیامت میں اللہ بھی وہی کرے گا جو محمدؑ و آل محمدؑ چاہیں گے۔

گویا جیسے محمدؑ و آل محمدؑ چاہیں گے۔ وہ جنت میں جائیں گے اور جسے محمدؑ و آل محمدؑ نہیں

چاہیں گے وہ جہنم میں جائیں گے۔

سامعینے !

وعدہ کرو کہ قیامت کے دن مجھے پہنچانے لگے۔ دیکھو ! ایمان کا رشتہ ایسا

رشتہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کو پہچان لیں گے۔ اور پھر قیامت کے دن تو لطف بھی

بڑا ہی آئے گا۔ تم بھی حیران ہو جاؤ گے کہ جب قیامت کے دن تمام دنیا اکٹھی ہو

جائے گی۔ وہاں مسلمان بھی ہوں گے۔ یہودی بھی ہوں گے۔ ہندو بھی ہوں گے

عیسائی بھی ہوں گے۔ غرض ہر فرقہ اپنی اپنی ٹولی میں خوش کھڑا ہو گا کہ اچانک ایک

آواز آئے گی۔

”مسلمانو! جاؤ، جنت میں“

ادھر مسلمان بھی جب خوشی میں جنت کی طرف بھاگنا شروع کریں گے تو سارے جنت کا دروازہ دکھائی دے گا۔ اب جو مسلمان وہاں پہنچیں گے تو بقول شاہ ولی اللہ دہلوی کہ جنت کے صدر دروازے پر جہاں سے تمام مسلمان جنت کے اندر جائیں گے وہاں لکھا ہوگا۔

”محمد۔ علی۔ فاطمہ۔ حسن۔ حسین“

اب جو بڑے بڑے بزرگان دین اور محافظ اسلام اپنی ریش مبارک سیٹے ہوئے ان ناموں کو دیکھیں گے تو فوراً رگ جائیں گے۔

ہم پوچھیں گے ”حضرات! بات کیا ہے۔ اندر کیوں نہیں جاتے؟“
وہ کہیں گے ”نہیے جاتے“
”آخر کیوں؟“

اب وہ بڑے ہی غصہ میں فرمائیں گے۔ ”دیکھتے نہیں ہو کہ یہ امام باڑا ہے۔“ بہر نوع ہم خوش کھڑے رہیں گے اور حضرات سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑے ہوں گے کہ یہ تو امام باڑا ہے اور جنہیں امام باڑا میں جانے کی عادت ہے انہیں فرشتے لاکھ روکتے رہیں گے مگر وہ یہی کہیں گے کہ ”ابھی ٹھہرو۔ ہم مجلس سن کے ابھی آتے ہیں“ انشاء اللہ ہم اسی شان سے جنت میں جائیں گے۔ جس طرح امام باڑوں میں آتے ہیں۔

بہر کیف محمد وآل محمد ہی قانون عدل پر قائم تھے اور تقاضائے عدل ہی یہی ہے کہ وہ جس طرح چاہیں گے۔ قدرت کی طرف سے بھی یہی ہو گا۔ جو ان کی منشا و مرضی ہوگی۔

محترم سامعین !

یوں تو انسان ہر حالت میں قانونِ عدل پر قائم رہنے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر تین مواقع ایسے ہیں جہاں انسان قانونِ عدل سے ہٹ جاتا ہے اور وہ یہ ہیں محبت طیش اور عیش۔ گویا ان تین مواقع پر انسان قانونِ عدل سے ہٹ جاتا ہے۔ ایک تو محبت کی انتہا میں۔ ایک طیش کی انتہا میں اور ایک عیش کی انتہا میں۔ کیونکہ محبت بھلا دیتی ہے اچھے و بُرے کو۔ ”طیش“ بھلا دیتا ہے نیک و بد کو اور ”عیش“ بھلا دیتا ہے اپنے و پرانے کو۔ ہر نوع انسان وہ ہے جو محبت میں بھی۔ طیش میں بھی اور عیش میں بھی قانونِ عدل پر قائم رہے۔ لہذا آج ”محبت کے بارے میں آپ گفتگو کروں گا۔“

بزرگانِ من !

اگر تم اپنے جذبات پر قابو رکھو تو معلوم ہو گا کہ جذبہ محبت قانونِ عدل سے ہٹا دیتا ہے۔ دیکھو نا !

مجھے آپ سے محبت ہے۔ ابے نیا لاکھ کہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا تو یہ قانونِ عدل کے خلاف ہے۔ بھلا ایسی بات پر توجہ دی جا سکتی ہے ؟۔ ہرگز نہیں۔ یاد رکھو ! جہاں محبت آجائے وہاں لفظ ”اپنا“ خود بخود آ جاتا ہے جس طرح اپنا گھر۔ اپنا دیس۔ اپنا علاقہ۔ اپنا ملک۔ اپنا مذہب۔ اپنا خاندان۔ اپنا قبیلہ۔ اپنا باپ۔ اپنا بیٹا یا اپنا بھائی وغیرہ وغیرہ گویا جہاں لفظ ”اپنا“ آتا گیا وہاں محبت ہوتی گئی اور جہاں محبت ہوتی گئی وہاں قانونِ عدل سے انحراف ہوتا گیا۔

بچو !

تمہیں ایک بات سناؤں کہ ہمارے پنجاب میں ضلع جھنگ کے ایک

دیہات میں دو آدمی بیٹھے ہوئے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ ایک کہہ رہا تھا کہ ”میرے دادا جو تھے اللہ انہیں مغفرت کرے وہ بڑے ہی ”چنگے“ لوگ تھے مرحوم چوری کرتے تھے مگر بڑے ہی شریف تھے۔ چنانچہ ایک دن وہ حضرت چوری کرنے گئے مگر وہ گھر والے ”بے ایمانے“ جاگ رہے تھے۔“

سامعین !

آپ نے سن لیا مگر میری زندگی کا محور ہی یہی بات ہے کہ دادا اپنا تھا۔ اور باوجود چور ہونے کے خدا اس کی مغفرت کرے۔ مگر وہ گھر والے جو جاگ رہے تھے وہ بے ایمان بن گئے۔ یوں ہوتا ہے۔ اپنے پرائے کا فرق۔ اگر گھر والے جاگ رہے ہیں کہ ہمارے گھر چوری نہ ہو تو وہ بے ایمان بن گئے اور چور چونکہ اپنا ہے اسلئے خدا اس کی مغفرت کرے۔ بہر نوع یوں قانونِ عدل سے دنیا ہٹ جاتی ہے۔ محبتِ قانونِ عدل سے ہٹا دیتی ہے اور اپنا مثبت قانونِ عدل سے دُور رکھتی ہے اب اگر آپ کو کسی سے محبت ہے تو اس میں کسی کو کیا اعراض ہو سکتا ہے۔ دیکھو نا ! ایک دفعہ کسی مولوی صاحب نے مجھوں سے کہا۔ ”مجھوں میاں ! خلافت کا جھگڑا ہے۔ کسے بنا دیں ؟“ مجھوں نے جواب دیا۔

”میری بیٹی ہی کو بنا دو۔ کیونکہ مجھے تو بیٹی سے بہتر کوئی دکھائی دیتا ہی

نہیں۔“

بہر نوع جس کو جس سے محبت ہو جائے۔ وہ محبتِ قانونِ عدل پر قائم نہیں رہنے دیتی۔ اسی لئے تو کہتا ہوں کہ ہم فقیروں سے شکوہ نہ کیا کرو کہ فلاں کو فلاں سے محبت کیوں ہو گئی ہے یہ تو اپنے ذوق و شوق کی بات ہے کہ کسی کو شہنشاہ سے محبت ہو گئی اور کسی کو ایک گڈ بیٹے سے محبت ہو گئی۔ کسی کو قید

کرنے والوں سے محبت ہو گئی اور کسی کو قید ہو نبوالوں سے محبت ہو گئی۔ الغرض
دیوانہ محبت و عشق ہمارے کسی ضابطے کا پابند نہیں ہے۔
سامعین سے یاد رکھو!

اگر انسان کے لئے سب سے پیاری شے کوئی ہے تو اس کی اپنی ذات ہے
گویا ہر انسان یہی چاہتا ہے کہ میں سب سے بڑا ہو کر رہوں۔ میری بات بلند ہے
میری عزت سب سے زیادہ ہو۔ میرا گھر سب سے اچھا ہو، میرا لباس سب سے
اچھا ہو۔ ہر نوع ہر انسان کو اپنی ذات سے سب سے زیادہ محبت ہوتی ہے اور
اپنی ذات سے بھی زیادہ اگر کوئی شے ایسی ہے جس سے انسان زیادہ محبت
چاہتا ہے تو وہ ”بلیٹا“ ہے گویا ایک انسان کی سب سے زیادہ محبت والی
شے اگر کوئی ہے تو وہ اس کی ”اولاد“ ہے۔ خود پھٹا پڑا ناکپڑا پنہن لیا مگر
بیٹے کو نیا خرید کے دیا۔ خود رات جاگ کے گزار دی۔ مگر بیٹے کو آرام سے
سلا یا۔ گویا ہر باپ یہ نہیں چاہتا کہ مجھ سے کوئی بڑھ جائے مگر بیٹے کے لئے یہی
چاہتا ہے کہ مجھ سے بڑھ جائے۔ خود میٹرک ہے مگر چاہتا یہی ہے کہ بیٹا بی اے
ہو جائے۔ خود بی۔ اے ہے تو چاہتا یہی ہے کہ بیٹا پی۔ ایچ ڈی ہو جائے
اور خود لندن سے ہو کر آیا ہے تو بیٹے کے بارے میں یہی چاہے گا کہ وہ جہنم میں
چلا جائے۔ ہر نوع ہر باپ اپنے سے زیادہ اپنے بیٹے کو دیکھنا چاہتا ہے۔
ادھر اللہ بھی جب کسی کا امتحان لینا چاہتا ہے کہ آیا یہ قانون عدل پر قائم بھی ہے
یا نہیں تو بیٹے سے امتحان لیتا ہے تاکہ دیکھ سکے کہ یہ انسان قانون عدل پر قائم ہے
کہ نہیں یا قانون عدل سے ہٹ تو نہیں گیا۔

لہذا۔ اس کی سب سے بڑی مشہور و معروف مثال حضرت ابراہیمؑ
کی مثال ہے۔ اللہ نے کہا:-

ابراہیم !

تم میرے خلیل ہو، میرے دوست ہو اور تمہارا بیٹا بھی ماشاء اللہ میرا خلیل ہے۔ لہذا میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ کہیں تم بیٹے کی محبت میں قانونِ عدل سے ہٹ تو نہیں گئے؟

ابراہیم نے جواب دیا۔

”خداوند!۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ ہم تیرے قانونِ عدل سے منحرف ہو جائیں“

اللہ نے کہا۔

”ابراہیم ! ہم تو جب جانیں گے جب تم ہماری محبت کا موازنہ اپنے بیٹے کی محبت سے کرو گے تاکہ میں پتہ چل سکے کہ تم واقعی قانونِ عدل پر قائم ہو۔“

ابراہیم نے پوچھا۔

”خداوند! وہ کیسے؟“

اللہ نے فرمایا۔

”ابراہیم ! اپنے بیٹے کو ہماری خاطر ذبح کر دو۔“

سامعین !

بتاؤ۔ قانونِ عدل پر قائم رہنے کے لئے اپنے بیٹے کو ذبح کرنا ایک بہت

بڑا امتحان ہے کہ نہیں؟

دیکھو نا، ابراہیم نے تو خواب میں دیکھا تھا کہ بیٹا ذبح کر دیا ہوں اور

پتہ ہے کہ نبی کا خواب یقیناً وحی ہوتا ہے۔ لہذا کیوں نا اسطیل کی بے خبری میں کر دیا جائے۔ مگر ابراہیم جانتا تھا کہ اگر میں نے یہ کام اسطیل کی بے خبری میں کر دیا تو اسکا

اجرا سنعیل کو نہیں ملے گا۔ لہذا سنعیل کو جگایا

• بیٹا! سنعیلے! اٹھو۔

چنانچہ جوان بیٹا اٹھ کے بیٹھ گیا اور عرض کی۔

• بابا! کیا حکم ہے؟

ابراہیم نے فرمایا: "بیٹا! خداوند عز و جل جلالہ کی طرف سے ہمیں حکم

• ہوا ہے کہ ہم تمہیں ذبح کر دیں۔ بیٹا! تمہاری کیا رائے ہے؟

ادھر • قائم ملبقسط • کے مصداق نے بغیر سوچے سمجھے جواب دے دیا۔

• بابا جانے! پھر دیر کس بات کی ہے؟ • حکم خدا کی ابھی تعمیل

کرد • انشاء اللہ آپ مجھے صابر پائیں گے • انشاء اللہ ہم باپ بیٹا

دونوں قائلین عدل پہ قائم رہیں گے؟

بہر نوع دونوں میں مشورہ ہو گیا اور ساتھ یہ صلاح ہوئی کہ سنعیل کی ماں کو

اس کا پتہ نہ چلے۔ کیوں کہ جوان بیٹے کی ماں ہے کہیں گھبرانہ جائے۔ لہذا ابراہیم نے

سنعیل کی ماں کو یہ کہا کہ اسے دوست سے ملنے سے باز رہا ہوں۔ چنانچہ ہاجرہ

نے بیٹے کو ہٹلا دھلا کے نئے کپڑے پہنائے اور دروازے تک چھوڑنے آئیں اور

جب ابراہیم بیٹے کو سیکر چل پڑے تو ایک بزرگ ہاجرہ کے پاس تشریف لائے

اور کہا۔

• ہاجرہ! سنتی بھی ہو۔ باہر آؤ اور اپنے بیٹے کو پکڑ کر واپس لاؤ کیونکہ

ابراہیم اسے ذبح کرنا چاہتے ہیں۔

ہاجرہ نے کہا۔

• تم پاگل تو نہیں ہو؟ بھلا باپ بھی بیٹے کو ذبح کرتا ہے۔

بزرگ نے کہا۔ • ہاجرہ! وہ کہتا ہے کہ مجھے • وحی • ہوئی ہے۔

ہاجرہ نے کہا:-

”مَا شَاءَ اللَّهُ - اگر وحی ہوئی ہے تو بیشک ذبح کر ڈالے“

اب وہ بزرگ بدلا:- ”ہاجرہ! میں تمہیں سمجھا رہا ہوں۔ دیکھو نا! یونہی گھر میں نہ بیٹھی رہو۔ باہر نکلو اور بیٹے کو کپڑا واپس لاؤ کوئی وحی وغیرہ نہیں آئی کیونکہ ابراہیم بڑھا ہو چکا ہے اس لئے دماغ کام نہیں کرتا ہے“

ہاجرہ یہ سنکر غصے میں کہتی ہے ”لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ“
یہ سنکر وہ بزرگ بھاگ کھڑے ہوئے اور بھاگتے ہوئے مڑ کر پوچھا:-
”هَلْ جَرَّهَ! تو نے مجھے کیسے پہچان لیا کہ میں لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ ہوں“؟

ہاجرہ نے جواب دیا:-

”نامراد۔ تو نے خود ہی تو پہچنوا دیا۔ کیونکہ تو نبی کی بیوی کو گھر سے

باہر نکلنے اور اسمعیل کو واپس لانے کی ترغیب جو دے رہا ہے اور جو نبی کی بیوی کو گھر سے باہر نکلنے کی ترغیب دے وہ شیطان ہی

تو ہے“

پھر ذبح ابراہیم اپنے بیٹے کو لیکر اس جگہ پہنچے جہاں اسے ذبح کرنا مقصود تھا۔ ابراہیم نے وہاں پہنچتے ہی زمین کو صاف کیا پھر اپنی عبا بچا کر اس پر بیٹھے کھڑا کیا۔ اور پوچھا:-

”بیٹا! بھوک تو نہیں لگ رہی۔ کوئی پیاس تو نہیں لگ رہی

کوئی کسرت تو نہیں چبھ رہی؟

اسمعیل نے جواب دیا:-

”بابا! جانے!“

”بیٹا! اب میں حکم خدا کی تہ“

”ہاں بِسْمِ اللّٰہ“

ابراہیم نے بڑھچھا ”بیٹا! کوئی قریش ہے؟“

اسماعیل نے جواب دیا۔

”ہاں بابا جان! آپ میرے ہاتھ پاؤں مضبوطی سے باندھ دیں

تاکہ میں زیادہ ترپنے نہ پاؤں۔ اور اپنے کپڑے بھی سمیٹ لیں تاکہ

میرے خون کی کوئی چھینٹ آپ کے دامن پہ نہ پڑ جائے۔ جسے

میری اماں نہ دیکھ لے۔“

چنانچہ یہ سب کچھ کرنے کے بعد ابراہیم نے اسماعیل کو لٹایا۔ ہاتھ میں چھری

پکڑی اور جب ذبح کرنے کو گلے پہ چھری سلگئی تھی کہ ابراہیم نے اپنی اور اسماعیل کی آنکھوں پر دھال

ڈال دیا تاکہ بیٹا بھی چھری نہ دیکھ سکے اور ابراہیم بھی چھری نہ دیکھ سکے اس کے بعد ابراہیم

نے ”اللہ اکبر“ کہہ کر اسماعیل کے گلے پہ چھری چلا دی۔ اور کچھ دیر بعد ابراہیم نے جو

اپنی آنکھوں سے پٹی ہٹائی تو دیکھا کہ بیٹا صبح و سالم کھڑا مسکرا رہا ہے اور ذنبہ ذبح

ہو چکا ہے۔ ابراہیم نے آسمان کی طرف منہ کر کے بلند آواز میں کہا۔

”خداوند! کیا تو مجھ سے ناراض ہو گیا؟ کیا میں قاتلِ عدل سے ہٹ

گیا؟ کیا تو نے میرے بڑے بچے باندھنے کو محسوس کر لیا؟“

قدرت کی طرف سے جواب آیا۔

”ابراہیم! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم نے کب کہا تھا کہ ذبح ہو جائے

گا؟ ہم نے تو یہ کہا تھا کہ ”ذبح کر ڈالو“ لہذا تم نے اپنی بات پوری

کر دی۔ بس تمہارا اتنا ہی امتحان تھا۔ انشاء اللہ ہم یہ قربانی تم پر عرض

رکھتے ہیں۔ کوئی سبوت بیٹا پیدا ہو گا جو تمہارے قرضے کو ادا کر دیگا

بزرگو! یاد رکھو۔ بیٹے کے مصلے میں امتحان دینا اور قاتلِ عدل پر قائم رہنا

بنی نوح آدم پر قرض ہے اور کائنات دیکھ رہی ہے کہ کون ایسا سپوت بیٹا آئے گا جو اس قرض کو ادا کرے گا۔

بس بھائیو!

اس قرض کو ادا کرنے کے لئے اپنے عزیزوں و جانثاروں کے ساتھ حسین ابن علیؑ آج کربلا میں تشریف فرما ہیں اور کائنات منتظر ہے کہ ابراہیمؑ کا یہ سپوت بیٹا دادا کے قرضے کو کس شان سے ادا کرے گا۔

حضور والا!

کربلا کا بھیانگ بن ہے اور لاکھوں خونخواروں کے درمیان بہتر کا قائل ہے۔ بیچ میں بہتر کا سردار کھڑا ہے اور صبح سے کان میں آواز آرہی ہے۔

”مولا! میرے گویا“ ”میرے آقا! میں گر گیا“

”میرے بادشاہ! مجھے اٹھا لو“

جب مولا اور آقا کی آوازیں آتی بند ہو گئیں اور باقی صرف اولاد ابی طالب رہ گئے تو حسینؑ نے کسی کا انتظار کئے بغیر حکم دیا۔

”علی اکبر! بیٹا۔ میں حکم دیتا ہوں کہ تم میدان شہادت میں جاؤ

کہیں ایسا نہ ہو کہ بہن کے بچے ذبح ہو جائیں۔ بھائی کا بیٹا قتل ہو

جائے اور دنیا یہ کہے کہ اپنے بیٹے کو روک لیا تھا“

بہر نزع اور اصرام کا حکم ہوا اور علی اکبرؑ میدان کی طرف چل پڑا۔ ابھی چپ

قدم چلا ہی تھا کہ حسینؑ نے آواز دی۔

”علی اکبر! بیٹا۔ ذرا ٹھہرو“

اکبرؑ ٹھہر گئے۔ پھر فرمایا۔

”بیٹا! گھوڑے سے اترو۔ چنانچہ علی اکبرؑ گھوڑے سے نیچے اتر آئے

اور عرض کی۔

”بابا جانے! کیا حکم ہے؟“

امام نے فرمایا۔

”بیٹا! بیت الشرف میں جاؤ اور ماں کو سلام کرو۔ پھو پھی کر سلام کرو

بہنوں سے رخصت ہو۔“

چنانچہ علی اکبر گھر میں تشریف لائے اور حسین بھی ساتھ ساتھ چلتے آئے
غیر میں اکبر نے زینب سے کہا۔

”زینب! اکبر آ رہا ہے۔ آج میں سننا چاہتا ہوں کہ پھو پھی
بھتیجے میں کیا بات ہوتی ہے۔“

چنانچہ علی اکبر غیمے میں تشریف لائے اور بیٹی کو سلام کیا۔
”امات! سلام“

ماں جواب میں کہتی ہے۔

”اکبر بیٹا! تم ابھی تک زندہ ہو۔ میرے لعل! میں صبح سے
مٹے بچھائے بیٹھی ہوں۔ تاکہ تیری میت آئے تو شکریہ کی نماز
پڑھوں۔“

علی اکبر نے کہا۔

”امات! میرے جا رہا ہوں۔“

”بیٹا! خدا حافظ۔“

علی اکبر ماں سے رخصت ہو کر پھو پھی کے پاس آئے اور آتے ہی زینب
کی گود میں سر رکھ دیا۔ اور لیٹ گئے اور عرض کی۔

”پھو پھی اماں! دیکھو۔ میں تمہارا اکبر ہوں۔ مجھے پیار کرو۔“

ادھر حسین کھڑے ہوئے دیکھ رہے ہیں کہ آج پھو بھی بھتیجے میں کیا باتیں ہونگی
نقوڑی دیر بعد اکبر نے عرض کی۔

”اماں! آپ ہی اس بات کی گواہ ہیں کہ جب سے میں نے ہوش سنبھالا
ہے۔ جو بات بھی پوچھی ہے آپ ہی سے پوچھی ہے اور جو کچھ بھی مانگا ہے
آپ ہی سے مانگا ہے۔ گویا سوائے آپ سے میں نے کسی سے واسطہ ہی نہیں
رکھا۔ اماں! آج بھی آپ سے ایک مسئلہ پوچھتا ہوں۔“
زینب نے کہا۔

”بیٹا! آج کوئی مسئلہ پوچھنے کا موقع ہے۔“
”علی اکبر نے عرض کی۔“ اماں! آج ایک مسئلہ بتا دو۔“
”اچھا میرے لعل! پوچھو، کیا پوچھتے ہو۔“
علی اکبر نے عرض کی۔

”اماں! میری دادی فاطمہ کا مرتبہ زیادہ ہے یا آپ کا؟“
زینب ایک دم گھبرا کے فرماتی ہیں۔

”بیٹا! یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ کجا فاطمہ کی شان، کجا میں
میں تو فاطمہ کی ادنیٰ کینز ہوں۔“

اب جو زینب نے کہا کہ میں تو فاطمہ کی ادنیٰ کینز ہوں تو علی اکبر یا تو
بیٹے تھے۔ یا اٹھ کے بیٹھ گئے اور فرمایا۔

”اماں! اگر تم واقعی فاطمہ کی کینز ہو تو پھر ایک کام کرو۔ کہ آج فاطمہ
کے بیٹے پر اپنے بیٹے کو قربان تو کر دو۔“

بس بھائیو!

علی اکبر کا یہ کہنا تھا کہ ادھر سے حسین نے آواز دی۔

”زینبؑ! میں تاکتا تھا کہ آج میں سُنا چاہتا ہوں کہ چھو بھی بھتیجے
میں کیا بات ہوتی ہے۔“

بہر نوح دونوں بہن بھائی نے مل کر اکبرؑ کو آخری لباس پہنا یا۔ زینبؑ نے
عبا پہنائی اور حسینؑ نے عامرہ باندھا۔ مگر اس طرح باندھا گیا کہ باندھ دیا۔
اکبرؑ روانہ ہوئے کبھی کسی بہن نے آکے عبا کا دامن پکڑ لیا۔ کبھی کسی بچی نے روک
لیا۔ کبھی چھو بھی نے ٹھہر لیا۔ جب بڑی دیر ہو گئی تو امامؑ نے فرمایا۔
”بیسیو! مسافر کا رستہ نہ روکو۔“

چنانچہ امامؑ کے کہنے سے سب خاموش ہو گئے۔ علیؑ اکبرؑ جب سب سے
رخصت ہو کر خیمے سے باہر نکلے اور ابھی دروازہ کے قریب ہی تھے کہ ایک درد
بھری آواز آئی۔ جس کو حسینؑ جیسا صابرؑ نہ سمجھ سکے آنکھوں پر ہاتھ رکھ کے بیٹھ گیا
اکبرؑ ابھی دروازہ کے قریب ہی تھے کہ پیچھے سے آواز آئی۔
”اکبرؑ! ہم سے بھی ملتے جاؤ۔“

علیؑ اکبرؑ لپٹ کے دیکھتے کیا ہیں کہ بیمار بھائی چلا آ رہا ہے۔ دونوں بھائیوں
نے گلے میں ہاتھ ڈال دیئے اور حسینؑ جیسا صابرؑ آنسو میں نہکتا ہوا باہر نکل آیا۔
اللہ جانے بھائیوں میں کیا راز و نیاز کی گفتگو ہوئی۔ بہر نوح اکبرؑ خیمے سے باہر
آئے اور حسینؑ نے رکاب پکڑ کے سوار کر دیا اور فرمایا۔

”بیٹا! جاؤ۔ خدا حافظ۔“

اکبرؑ میدان کو چلے۔ حسینؑ بھی پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ تھوڑی دور جا کر
اکبرؑ نے باگ روک لی۔ اور عرض کی۔

”بابا جانے! میں اُتر آؤں؟“

حسینؑ نے فرمایا ”نہایت بیٹا۔ جاؤ۔“

• بابا جانے! پھر آپ تکلیف کیوں کر رہے ہیں؟
حسین نے فرمایا۔

• بیٹا اکبر! تمہارا کوئی جوان بیٹا نہیں۔ تمہیں اندازہ ہی
نہیں کہ ہمارے دل پہ کیا گزر رہا ہے۔
اچھا بیٹا! ہم بیٹھ گئے۔ تم جاؤ۔

عزاد ار سید الشہدا!

یہ کہہ کر حسین ایک ٹیلے پہ بیٹھ گئے اور علی اکبر میدان میں آ گئے۔ اور جہاد
شروع ہو گیا۔ علی اکبر کی نظر فوجوں پر۔ حسین کی نظر علی اکبر پر۔ دروازہ میں کھڑی
ہوئی زینب کی نظر حسین پر اور مصطفیٰ پر بیٹھی ہوئی لیلٰی کی نظر زینب پر جمی ہوئی
ہے۔ گویا یہاں سے وہاں تک نظر کا تار مل گیا۔

بسے بھائیو! کوئی دس منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ اکبر گھوڑے سے گرا
حسین ٹیلے سے گرے۔ زینب دروازے میں گری اور لیلٰی سجدے میں گری۔
• یا اللہ! تیرا شکر ہے کہ میری نیک لکائی نیک راہ میں کام آئی۔
بزرگو!

علی اکبر نے گھوڑے سے گرتے ہی آواز دی »یا ائی اَذْرِکُنِّی«
• بابا جانے! میں گر گیا۔

حسین چلے اور جب اکبر کی لاش نو دس قدم پر پہنچی تو فرمایا۔
»اکبر بیٹا! ایک دفعہ پھر پکارو۔ بیٹا! ہمیں رستہ نظر نہیں آتا۔
ہماری مبینائی کام نہیں کر رہی۔ لہذا تم ہمیں آواز دو تاکہ ہم تمہاری آواز کے
کے سہارے آئیں۔«

چنانچہ علی اکبر نے پھر آواز دی »یا اُبْتُ اِئِی اِئِی« بابا جان!

میں یہاں ہوں۔

حسین آواز کے سہارے میت پر چپے۔ دیکھا کہ اکبر ایک پاؤں سمٹتا ہے اور ایک پاؤں پھیلاتا ہے۔ حسین میت کے پاس بیٹھ گئے۔ گود میں اکبر کا سر لیا اور فرمایا۔

بیٹا علی اکبر! ہم آگے۔

اکبر نے عرض کی، ”بابا جان! آپ نے بڑی تکلیف فرمائی ہے۔“ حسین نے فرمایا۔

بیٹا! کہو۔ کچھ کہنا چاہتے ہو؟

اکبر نے عرض کی، ”بابا جانے! آج اکبر آپ سے دو چیزیں مانگتا ہے۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ اگر ہو سکے تو دو گھونٹ پانی دے دو۔“ گویا جوان بیٹے کا زندگی میں باپ سے پہلا سوال ہی یہی تھا کہ ”دو گھونٹ پانی دے دو۔“

حسین نے فرمایا، ”اکبر بیٹا! گھبراؤ نہیں تمہارے دادا ابھی تمہیں سیراب کریں گے۔“ اکبر نے فرمایا۔

بابا جانے! دوسری فرمائش کرتا ہوں کہ ابھی میں زندہ ہوں لہذا مجھے گھرے چلو تاکہ میں پھوپھی اور اماں سے آخری بار مل سکوں۔ حسین نے کہا۔

ہاں بیٹا! تمہاری یہ فرمائش ہم ضرور پوری کریں گے۔ یہ کہہ کر حسین نے ایک ہاتھ اکبر کی گردن کے نیچے لٹکھا اور ایک ہاتھ پیروں کے نیچے رکھا اور ”یا علی مدد“ کہہ کے میت اٹھانا چاہی۔ جوان میت بڑھا

آدمی۔ ہاتھ تھرائے۔ زمین پر رکھ دی۔ تھوڑی دیر بعد پھر ارادہ کیا۔ اب کے سینے تک اٹھائی۔ مگر ہاتھ پھر بھی تھرائے میت زمین پر لٹادی۔ اور حسین نے فرمایا۔

”اگر بڑھیا! ایک کام کرو کہ ادھر سے ہم اٹھاتے ہیں اور کھتر تم دونوں ہاتھ ہمارے گلے میں ڈال دو۔ کچھ تم سہارا کرو۔ کچھ ہم سہارا کریں گے۔“
چنانچہ اکبر نے ایک ہاتھ باپ کے گلے میں ڈال دیا۔ حسین نے کہا۔
”بیٹا! دوسرا ہاتھ بھی ڈال دو۔“

اکبر نے عرض کی۔ ”بابا جان! دوسرا ہاتھ میں سینے سے اٹھانا نہیں چاہتا۔“
”کیوں بیٹا! کیا بات ہے؟“
”بابا جان! میں اپنا سینہ آپ کو دکھانا نہیں چاہتا۔“
حسین نے فرمایا۔

”بیٹا! کوئی بات نہیں۔ میں بھی دکھاؤ۔ ہم دیکھیں گے۔“
اب جو اکبر نے سینے سے ہاتھ اٹھایا تو حسین نے دیکھا کہ برہی کا پھل ٹوٹ کے اکبر کے سینے میں رہ گیا ہے اور اکبر کا دل اس میں پھنسا ہوا ہے۔ حسین نے دیکھ کے فرمایا۔

”بیٹا! یہ بات تھی۔ گھبراؤ نہیں۔“

یہ کہہ کے حسین نے بیٹے کی میت کو زمین پر لٹایا۔ خود دو زانو بیٹھے۔ ایک ہاتھ بیٹے کے سینے پر رکھا۔ ایک ہاتھ میں برہی پکڑی اور کھینچنے کا ارادہ کیا اور بلند آواز سے آسمان کی طرف منہ کر کے کہا۔

”فانا رسول اللہ! دادا ابراہیم کو سبک کر دیا میں آؤ اور دیکھو میری

آنکھوں پر رومال نہیں ہے۔ میری آنکھوں پر پٹی نہیں ہے۔ میرا

ہاتھ نہیں لرز رہا۔ میرا بدن نہیں کانپ رہا۔

خداوند!

دیکھ۔ آج میں دادا ابراہیم کا قرص چکارہ ہوں:

بزرگائے منے!

حسین نے برہی کو ہلایا۔ برہی ہلی تو اکبر کا بندھا ہوا دل ہلا۔ دل ہلا تو
سارا بدن تھریا۔ بدن کا تھرانا تھا کہ کربلا میں زلزلہ آیا۔ کربلا میں زلزلہ آیا تو حسین
کے خمیوں میں زلزلہ آیا اور خمیوں پہ زلزلہ آنا تھا کہ پردہ اٹھا اور زینب نے آواز
دی۔

حسینے! مجھے آنے دو۔ اکیلے یہ کام نہ کرتا۔ دونوں بہن بھائی

بل کے یہ کام کریں گے۔

زینب کا یہ کہنا تھا کہ حسین نے وہیں سے آواز دی۔

زینب! باہر نہ آتا۔ تیرے پردے پہ اکبر کو قربان کرتا ہوں

عزاد ار سید الشہداء!

آج سے چند سال قبل کربلا معلیٰ میں حرم سید الشہداء میں مرتب اقدس

کے پاس کھڑے ہو کر۔ نماز صبح کے بعد شیخ مہدی نامی ایک شخص ٹھوڑی دیر

سید الشہداء پڑھا کرنے تھے۔ یہی گویا صبح کا ایک وظیفہ تھا۔ ایک روز انہوں نے

علی اکبر کی شہادت پڑھ دی۔ بڑا گریہ ہوا۔ واپس گھر گئے۔ دوپہر کا کھانا کھانے کے

بعد جب سو گئے۔ تو خواب میں دیکھا کہ سیاہ برقعہ والی ایک خاتون آئی میں اور

فرماتی ہیں۔

شیخ۔ مہدی! یہ شیخ کتا ہے کہ میں خواب میں ہی اٹھ کے بیٹھ گیا اور

مرضی کی۔

”جے جے ! کیا بات ہے ؟“

بی بی نے فرمایا۔

شیخ ! مجھے پچانو۔ میں حسین کی ماں ہوں۔

شیخ کہتا ہے کہ میں تھر تھر کانپنے لگا۔ اور مرض کی۔

حضور ! کیا حکم ہے ؟

بی بی نے فرمایا۔

شیخ ! تم نے آج حرم میں علی اکبر کی شہادت پڑھی ہے آئندہ یہ شہادت

نہ پڑھنا۔

شیخ نے عرض کی۔

”کیوں جے جے ! کوئی غلط روایت پڑھ دی تھی ؟“

بی بی نے فرمایا۔

”ضمیمہ۔ بالکل درست کہا تھا۔ مگر جب سے تو نے یہ واقعہ پڑھا ہے

کہ اکبر قاسم کے لاشہ پر ہاتھ رکھ کر حسین نے کہا۔

”و غریبتا۔ یا اللہ ! میں غریب ہو گیا۔ اُس وقت سے میرا حسین

جے ہوش پڑا ہے۔ وہ اب بھی اکبر کو یاد کر رہا ہے۔ میں اب تک اُسے

بھلا رہی ہوں۔

سَامَعِین !

قانونِ عدل یہی ہے جس پر حسین نے اکبر جیسے بیٹے کی محبت کو قربان

کر دیا۔ اور یہی ہے وہ اُدھارِ ذبحِ عظیم جو میدانِ کربلا میں ادا کیا گیا

اللہ ہیں مودتِ محمد و آلِ محمد عطا فرمائے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّيِّعُ الْعَلِيمُ۔ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ

وَآلِ مُحَمَّدٍ

قانونِ عدل

خداوند عز و جل جلالہ کی حمد و ثناء کے بعد حضرات
محمد و آل محمد پر درود و سلام

حضرات گرامی قدر!

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اللہ چاہتا ہی ہے کہ انسان اپنے ہر قول و فعل و عمل سے قانونِ عدل پر قائم رہے۔ عدل سے تجاویز نہ کرے بلکہ ہر معاملہ میں قانونِ عدل پر قائم رہے۔ یہی اللہ کا منشاء ہے اور یہی وہ انسان سے چاہتا ہے۔ اب اللہ کے چاہنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اگر انسان عدل پر قائم رہے گا تو اللہ کو کوئی نائدہ پہنچے گا اور اگر عدل کو چھوڑ دے گا تو اللہ کو کوئی نقصان ہوگا۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ اللہ ہر نوع اللہ ہے۔ اللہ کا کسی حالت میں کچھ نہیں بگڑتا۔ اگر ساری دنیا مل کے اللہ کا نام لے تو سبحان اللہ اور اگر ساری دنیا اس کا نام لینا چھوڑ دے تو مآشاء اللہ۔ اللہ کا کچھ نہیں بگڑتا۔ وہ تو صاف کہتا ہے کہ۔

اگر تم مجھے یاد رکھتے ہو تو شاباش اور اگر بھول جاتے ہو تو جاؤ جہنم میں۔ لہذا اللہ جو کچھ بھی چاہتا ہے۔ اس کی جو کچھ بھی منشاء ہے وہ اس لئے ہے کہ ہمارے اندر یہ خوبی ہو۔ ہمارے اندر یہ کمال ہو اور صرف اس لئے کہ دنیا میں عدل حقیقی قائم رہے۔ لہذا اللہ نے عدل حقیقی کے ایک لاکھ چوبیس ہزار نمونے انسان کو دکھائے اور سمجھائے۔ یہاں تک کہ جب ہمیں سارے نمونے دکھا چکا تو عدل کو ہمارے دل میں راسخ کرنے کے لئے اس نے عدل حقیقی کو ”قائم“ کر دیا تاکہ کبھی طرح انسان عدل پر قائم ہو جائے۔

صاحبانِ ذوق!

اللہ نے پہلا نمونہ عدل جو ہمیں دکھایا وہ تھے ہم سب کے باوا آدم۔ اور جب آدم بن کے تیار ہوئے تو اللہ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ "اسکی طرف رُخ کر کے سجدہ کرو" یہ نہیں کہا کہ "اسے کو سجدہ کرو" بلکہ یہ فرمایا کہ سجدہ اللہ کو کرو۔ مگر آدم کو "قبلہ" بنا کے کرو۔ اور فرشتے بیچارے بھولے بھالے۔ سیدھی سادھی مخلوق۔ سوائے حکم کی تعمیل کے کچھ جانتے نہیں تھے۔ انہیں جب حکم ملا کہ "سجدہ کرو تو فوراً حکم کی تعمیل میں انھوں نے اپنے سر جھکا دیئے پھر اعلیٰ حضرت کی طرف سے حکم ملا "ابھی ٹھہرو" چنانچہ فرشتے ٹھہر گئے اور عرض کی۔

"قبلہ! آپ ہی نے تو حکم دیا ہے۔ اب روکتے کیوں ہو" اعلیٰ حضرت نے فرمایا۔

"فرشتو! بیشک اس کی طرف سجدہ کرو۔ کیونکہ یہ ہمارا بنایا ہوا ہے مگر ذرا ٹھہرو۔ کیونکہ جب اس میں "روح" آجائے گی تو پھر اسے سجدہ کرنا۔

چنانچہ فرشتوں نے آدم کو جب سجدہ کیا جب اس میں روح آگئی۔

سامعین!

یاد رکھو۔ تخلیقِ آدم کے ساتھ اللہ نے ہمیں یہ قانونِ عدل سکھا دیا کہ میں "قبلہ" ضرور بناتا ہوں مگر اس وقت تک وہ قبلہ نہیں بن سکتا جب تک اس میں میری روح نہ آجائے۔ چاہے وہ علیل بنائے یا خود اپنے ہاتھوں سے جلیل بنائے۔ وہ قبلہ جب بنے گا جب اس میں میری روح آجائے گی۔

حضور والا! یہی نکتہ تھا کہ آج سے پانچ ہزار سال قبل اللہ کے

ایک خلیل بندے نے مکہ میں اللہ کا ایک گھر بنایا۔ زمین میں تصور یہ تھا کہ اللہ جانے یہ گھر کیسا ہوگا۔ کیونکہ میں نے گورنمنٹ ہاؤس دیکھا تھا۔ اس وقت میں نے اندازہ لگایا تھا کہ جب گورنر اور لوہوں کی حویلیاں کئی میلوں تک پھیلی ہوئی ہیں تو اللہ جانے ”خدا ہاؤس“ کتنا بڑا ہوگا۔ دنیا کے سب سے بڑے شاہ کا مکان اللہ جانے کتنا وسیع ہوگا۔ اور اللہ کا گھر بناتے وقت بھی یہی تصور غالباً حضرت ابراہیم کا بھی ہوگا۔

”خداوند! تیرا گھر بنا ہے۔ ذرا اس گھر کا نقشہ تو بھیج دے تاکہ تیرا گھر بناؤں۔“ اللہ نے جواب دیا۔

”ابراہیم! سنتے بھی ہو۔ گھر تو میرا ہی ہوگا۔ مگر زیادہ ناپ توں کی ضرورت نہیں ہے۔ بس اتنا کمرہ بنا دو کہ بوقت ضرورت ایک عورت آرام سے لیٹ سکے کیونکہ میں نے نہ خود آسکے رہنا ہے اور نہ ہی کرائے پر دینا ہے۔ بلکہ یونہی خالی پڑا رہے گا چاہے اس پہ بُت قبضہ کر لیں۔ چاہے بُت پرست قبضہ کر لیں مگر گھر میرا ہے۔ میں ہی اس گھر کا مالک ہوں۔“ ہم ہنچتے ہیں۔

”خداوند! تو غارِ مطلق ہو کر، اتنی بڑی طاقت والا ہو کر اپنے گھر پر کیوں ان نامراد بتوں کا قبضہ ہونے دیا۔“ اللہ جواب میں فرماتا ہے۔
 ”دیکھو نا! تم ابھی نادان ہو۔ کسی بات کو ابھی طرح سمجھتے نہیں ہو۔ اگر بُت میرے برابر کے ہوتے تو میں ان سے لڑتا اور جن بتوں کو درجن نے بنا کے بٹھایا ہو ان سے لڑنا میری توہین ہے۔ اگر ان پہ میں نے فتح بھی پالی تو بات کیا ہوئی۔ لہذا اگر یہ نامراد بُت بیٹھے ہیں تو بیٹھنے دو۔ جب وقت آئے گا خود ہی نکل جائیں گے۔“

سامعین!

ادھر بیٹ ہیں کہ جنت کر بیٹھے کہ ہم نہیں نکلتے کیونکہ خدا کا گھر ہے اور

ہم لوگوں کے بنائے ہوئے خدا ہیں!

لہذا مجبوراً اللہ کو ایسا آدمی بھیجنا پڑا کہ جس نے آتے ہی بتوں سے یہی کہا: ”نیک جاؤ میرے گھر سے۔ تمہیں معلوم نہیں کہ یہ میرا زچہ خانہ ہے“
پھر نوح ابراہیم نے اللہ کا گھر بنایا جس کو ارباب مسلمان قبضہ سمجھ کر سجدہ کرتے ہیں۔ اور گھر بنانے کی شان یہ تھی کہ ابراہیم مہار اور اسماعیل مزدور بن گئے۔ جبریل ایلے معاون بن گئے۔ اور اعلیٰ حضرت خور انجینئر بن گئے اور اپنی موجودگی میں دیکھ لکھ کے بنوا رہے تھے۔ ادھر ابراہیم دیوار کا ایک ردالگاتے اور نہ رد ہونے والی دُعا مانگ لیا کرتے۔

”خدا وندا! اتنا گھر بن گیا۔ اب مجھے یہ مل جائے۔ اب میری اولاد کو یہ مل جائے“ اور اللہ دیتا رہا اور گھر بنتا رہا۔ اور جب پورا گھر بن گیا تو اللہ نے اس گھر کا نام ”بیت اللہ“ رکھ دیا۔

بسے بھائیو! یہاں تک تو میں نے کہہ دیا کہ اس گھر کا نام اللہ نے ”بیت اللہ“ رکھ دیا۔ اب آپ خود ہی بتائیں کہ اگر کوئی اس گھر میں رہنے لگ جائے تو وہ کیا کہلاوے گا۔؟ ”اہلی بیت“ گویا بسے اہلی بیت بن گئے۔ ہرگز نہیں۔ کیونکہ گھر میں رہنا اور بات ہے اور اہلی بیت ہونا اور بات ہے۔ پھر نوح بیت اللہ بن گیا اور ابراہیم نے عرض کی۔

”خدا وندا۔ تیرا گھر بن گیا۔ اب معاشہ کسے دیکھ لے۔

چنانچہ اعلیٰ حضرت نے معاشہ کیا اور فرمایا۔

”ابراہیم! شاباش۔ بہت اچھا گھر بنا ہے مگر تم دونوں باپ بٹا

مل کر ایک کام کرو۔

”میرے گھر کو طواف کرنے والوں کے لئے پاک کر دو۔“

سامعین!

اللہ نے صوف ابراہیم اکیلے کو حکم نہیں دیا بلکہ فرمایا کہ تم دونوں مل کے میرے گھر کو طواف کرنے والوں کے لئے پاک کر دو۔

چنانچہ دونوں باپ بیٹے مل کے گھر کو پاک کرنا شروع کیا اور پاک کرنے کا طریقہ یہ تھا کہ کعبہ کی دیوار میں لگی ہوئی اینٹوں میں سے ایک ایک اینٹ پہ ہاتھ رکھا اور کہا، ”سُبْحَانَ اللَّهِ“ دوسری پہ ہاتھ رکھا اور کہا، ”سُبْحَانَ اللَّهِ“ تیسری پہ ہاتھ رکھا اور کہا، ”سُبْحَانَ اللَّهِ“ جب ساری اینٹوں پہ ہاتھ رکھ کے سُبْحَانَ اللَّهِ کہہ دیا تو اللہ نے کہا، ”پاک ہو گیا۔“ گویا ابراہیم نے بحکم خدا کعبے کی تمام اینٹوں پہ سُبْحَانَ اللَّهِ کہہ کے تمام دیوار کعبہ کو تسبیح کے دانے بنا دیا۔ اب جب دیوار کعبہ تسبیح کے دانے بن گئی تو ”امام، کو خود ہی راستہ مل جائے گا۔“ پھر نزع خدا کا گھر پاک ہو گیا اور پاک کیا بھی ابراہیم واسحقیل دونوں نے مل کر

سامعین!

یاد رکھو! اللہ کہتا ہے کہ میرا تالونِ عدل ہی یہی ہے کہ میں جب بھی کوئی کام لیتا ہوں تو ایک سے نہیں لیتا بلکہ دو سے لیتا ہوں۔ کیونکہ دو کے بغیر میرا کام چل سکتا ہی نہیں۔ دو ہوں تو کام کرو ورنہ رہنے دو۔

دیکھو ہونا! دُور جانے کی ضرورت نہیں۔ قریب سے ہی دیکھ لو کہ ابراہیم کے ساتھ ہم نے اسحقیل کو لگا دیا۔ موسے کے ساتھ ہارون کو لگا دیا۔ اسی طرح ہر ایک کے ساتھ دوسرا لگاتے رہے اور جب بیٹے اکیلے رہ گئے کوئی دوسرا معصوم نہیں تھا۔ تو اللہ نے کہا۔

”عیشے! تم اکیلے ہو اور اکیلے سے ہم کوئی کام نہیں لیا کرتے لہذا

تم غائب ہو جاؤ۔“ چنانچہ عیشے غائب ہو گئے۔

بہر نوع ہدایت کا یہ سلسلہ چلتے چلتے جب محمد تک پہنچا تو اللہ نے محمد کے ساتھ علیؑ کو لگایا۔ علیؑ کے ساتھ حسینؑ کو لگادیا۔ یہاں تک کہ گیارہویں کے ساتھ بارہویں کو لگادیا اور جب بارہویں اکیلا رہ گیا تو خدا نے اپنے قانونِ عدل کے مطابق اُسے بھی غائب کر دیا۔ ادھر عیسیٰؑ اکیلا رہ گیا اُسے غائب کر دیا گیا۔ ادھر باہویں اکیلا رہ گیا اُسے بھی غائب کر دیا گیا۔ جب تک دونوں اکیلے نہیں گئے غائب نہیں گئے اور جب اللہ ان سے ہدایت کا کام لینا چاہے گا تو پھر انہیں ملا دے گا۔ اب یہ دونوں کہاں ایک دوسرے سے ملیں گے۔ یہ بڑا پیچیدہ مسئلہ ہے۔ کیونکہ ایک غائب زمین پر اور ایک غائب ہے آسمان پر۔ لہذا دونوں کے غائب ہونے میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ادھر عیسیٰؑ ہے کہ وہ اڑ کے کہتا ہے۔

”مسلمانو! تمہارے والا زمین پر غائب ہے اور ہمارے والا

آسمان پر غائب ہے۔“

بھائیو!

اب ان عیسائیوں کو کون سمجھائے کہ اللہ نے دونوں کو غائب کرتے وقت قانونِ عدل کی میزان میں تولی تو ایک اتنا کم وزن نکلا کہ آسمان پہ پہنچ گیا اور ایک اتنا وزن والا تھا کہ زمین پر رہ گیا۔ اور رہ گیا ان دونوں کے ملنے کا طریقہ کہ یہ کہاں ملیں گے تو یہ بات وقت بتائے گا کہ آسمان والا آئے گا یا زمین والا جائے گا۔ بہر نوع دوہوں گے تو ہدایت کا کام شروع ہو گا۔

حضور والا!

قیامت کے دن جب مسلمان اور عیسائی آپس میں جھگڑیں گے کہ امام کون ہے

تو اتفاق سے ایک پٹواری صاحب اگر آجائیں تو یہ مسئلہ بہت جلد حل ہو جائے گا۔ کیونکہ وہ آکر یہی کہے گا۔

مولوی صاحبانے! تم کیوں خواہ مخواہ کے لئے جھگڑ رہے ہو۔ مسئلہ تو ہمارے سمجھانے کا ہے کہ چونکہ بیٹے زمین بھڑک رہے دخل ہو گئے تھے اور یہ آج تک اپنی زمین پر قابض ہے۔ اور قابض و دخیل کار کے ہوتے ہوئے بے دخل کو زمین پر امانت کر دانے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔

بہر نوع زمین والا ہمیں غماز پڑھائے گا اور ہم غماز پڑھیں گے تو دکھیں گے کہ نصیری اور نصاریٰ میں لڑائی ہو رہی ہوگی۔ کیونکہ نصاریٰ کے خدا کا بیٹا پیچھے ہو گا اور نصیری کے خدا کا بیٹا آگے ہو گا۔ اس دن نصیری کہے گا کہ ہم ناکستے تھے کہ۔۔۔ ہمارے خدا کا بیٹا آگیا ہے۔

بہر کیف خدا کے قانونِ عدل کے مطابق دونوں گے تو کام ہو گا۔ اسی طرح خدا نے ابراہیم اور اسماعیل دونوں سے کعبہ کو پاک کر دانے کا کام کر دایا اور جب کعبہ میں بتوں نے گھر بنا لیا اور اسے پاک کر دیا تو اس وقت بھی تنہا محمد نہیں تھے بلکہ علیؑ بھی ساتھ ہی تھے۔ دونوں نے مل کے خدا کے گھر کو پاک کیا۔

چنانچہ اعلیٰ حضرت نے فرمایا۔

”محمد! اسے قبلہ بناؤ۔“

خدا و خدا۔ کیسے؟

اعلیٰ حضرت نے فرمایا کہ جب اسمیں میری رُوح آجائے گی تو قبلہ بن جائے گا۔“

ادھر دُنیا انتظار میں تھی کہ اعلیٰ حضرت کی رُوح کب آئے گی۔ کہا جسے آئے گی اور کس طرح قبلہ بنے گا۔ یہاں تک کہ خدا کے آخری رسول بھی آگئے۔

ان سے پوچھا گیا کہ حضور! قتل بنا؟

”حضور نے فرمایا۔ ”نہیں“

”حضور! کب بنے گا؟“

محمدؐ نے فرمایا ”گھبراؤ نہیں۔ ابھی بن جائے گا“ یہاں تک کہ ایک دن رسولؐ نے دُعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے۔

”خُداوند اے۔ تو نے مجھے آخری رسولؐ بنایا ہے۔ تو نے مجھے کائنات

کا ہادی بنایا ہے۔ لہذا میں تجھ سے فریاد کرتا ہوں کہ مجھے ”مددگار“ بھی اپنے ہی گھر سے دے۔“

اللہ نے کہا ”محمدؐ! میں اسی دُعا کا منتظر تھا۔ تو نے میرے گھر

سے مددگار مانگا لہذا ضرور ملے گا۔“

حضور والا!

اُدھر رسولؐ نے دُعا کے لئے ہاتھ اٹھائے اور ادھر اسد کی بیٹی اور اسد کی ماں الہامی طور پر خدا کے گھر کے قریب پہنچی۔ گھر کا طواف کیا۔ ایک جگہ ٹھہری اور ابھی ٹھہری ہی تھی کہ کعبہ کی دیوار شق ہو گئی۔

لَوْ جَاؤُاْ! اگر تم کہیں چلے جا رہے ہو اور تمہارے سامنے والی دیوار اچانک شق ہو جائے تو تم گھبرا نہیں جاؤ گے، مگر اسد کی بیٹی کا جگر دیکھو کہ ادھر سے دیوار شق ہوئی اور ادھر وہ بھاگتی نہیں بلکہ فرماتی ہیں۔

”بھاگیں ہمارے دشمن۔ ڈریں ہمارے دشمن۔ میں ایک نا ڈرنے والے کی ماں ہوں“

لہذا حبیب دیوار شق ہوئی تو یہ خاتون بجائے بھانسنے کے آگے بڑھی اور کعبہ میں آکر بیٹھ گئیں اور دیوار پھر بند ہو گئی۔ اس گھر میں ناطقہ بنت اسد اکیلی

ٹیجی ہیں۔ ادھر رسول کو دینی پہنچی کہ۔

”حمّد! سنتے بھی ہو۔ جسے تم نے میرے گھر سے مانگا تھا وہ آگیا ہے
لہذا اسے جا کر لے آؤ۔ چنانچہ رسول تشریف لائے۔ چچی کو سلام کیا۔

”امّات! سلام“

فاطمہ بنت اسد نے کہا ”حمّد بیٹا! وعلیک سلام“

”امّات! میرے بھائی کو میری گود میں دو“

چنانچہ رسول قریب گئے۔ آخر درجے کی رسالت ٹھکی اور اول درجے کی
است ہمگی۔ نور کا ایک ٹکڑا دوسرے نور سے منصل ہوا۔ بھائی بھائی کے سینے
سے چمٹ گیا۔ تھوڑی تھوڑی لبوں پہ مسکراہٹ آئی۔

ہم پوچھتے ہیں ”قبلہ! سنتے کیوں ہو؟
وہ فرماتے ہیں۔

”سننے کی تو بات ہے۔ یہ صاحب عالم ازل سے مجھے چھوڑ کر
آگئے تھے۔ آج ہم بچپن کے ساتھی ایک دوسرے سے پھر ملیں ہیں
لہذا ہنستا ہوں کہ ہم آگئے نا“

بچے کو محمد نے سینے سے لگایا۔ بوسہ لیا اور فرمایا۔

”امّات! مبارک ہو۔ ماشاء اللہ بڑا خوبصورت ہے
ماں نے کہا۔

حمّد! خاک مبارک ہو۔ اس میں زندہ رہنے کی کوئی آثار نہیں ہی نہیں
دیکھنا! تین دن ہو گئے اسے کعبہ میں آئے ہوئے۔ نہ اس نے آنکھ

کھولی۔ نہ اس نے دودھ پیا اور نہ ہی یہ رویا۔ ایسے بچے کا زندہ رہنا مشکل ہے
مجھ نے کہا ”امّات! اگراؤ نہیں“۔ یہ کہہ کر حضور نے بچے کو ہاتھوں

پر لٹایا۔ اور پوچھا۔

”برخوردار! ہم نے تمہاری تمام شکایتیں سن لی ہیں۔ بتاؤ۔ تم نے آنکھ کیوں نہیں کھولی؟“ بچے نے عرض کی۔

”قبلہ! اگر آنکھ کھولتا تو کعبہ میں رکھے ہوئے بتوں سے نظر لڑ جاتی اور جب نظر لڑ جاتی تو توڑتے ہوئے مردت نا آ جاتی۔ اب حضور سگئے ہیں۔ لیجئے۔“
”آنکھ کھول دی“

یہ کہہ کر بچے نے آنکھ کھولی اور پہلی نظر حیرہ رسول پر پڑی۔
”بچو! آپ چاہے ”یا علی“ کا نعرہ لگائیں یا کچھ کریں۔ بیح بات تو یہ ہے کہ آپ کے علی نے سمجھا تھا کہ مجھ سے بہادر کوئی نہیں مگر کعبہ میں جب محمد کو دیکھا تو ”آنکھ کھل گئی“۔

بہر ذریعہ بچے نے آنکھ کھول دی۔ اب محمد پوچھتے ہیں۔
”برخوردار! تم روئے نہیں؟“

فرمایا ”نہیں“

”کیوں؟“

”قبلہ! بات یہ ہے کہ میرا دل تو رونے کو بہت جاگ رہا مگر میں رونے کو ضبط کرتا رہا۔ کیونکہ کعبہ میں میری ماں اکیلی تھی اور میں اس کا ساتھ ہی تھا۔ اس لئے ساتھ ہی ہو کے رونا مجھے پسند نہ آیا“

اب محمد مسکراتے ہوئے پوچھتے ہیں۔

”برخوردار! تم نے دودھ کیوں نہیں پیا؟“

فرمایا ”حضور! بھوک لگ رہی تھی مگر معاف کرنا۔ اگر اور بچوں کی طرح پیڈ ہوتا تو ضرور اپنی ماں کا دودھ پیتا۔ مگر آپ نے رسالت کا دعویٰ کیا ہے۔ آپ کو

گواہ کی ضرورت ہے لہذا آپ نے اللہ سے دعا کی کہ اپنے گھر سے گواہ دے۔ چنانچہ میں آپ کے طلب کرنے پر بطور گواہ آیا ہوں اور جب آپ کے طلب کرنے پر بطور گواہ آیا ہوں تو اپنی ماں کا دودھ کیوں پیوں کیوں کہ گواہ کا خرچ خوراک تدبیر کے ذمہ ہوتا ہے اس لئے آپ خود میری خوراک کا انتظام فرمائیں۔

بچے کی یہ باتیں سنکر رسول نے اپنی انگشت مبارک دہن میں داخل کی۔ دودھ جاری ہوا۔ ایک دو گھنٹ پی کر بچے نے منہ پھر لیا۔ رسول سمجھ گئے کہ گواہ ذرا تر مال چاہتا ہے۔ رسول نے اب جو زبان اقدس دہن میں داخل کی تو زبان سے دودھ جاری ہوا۔ اور خوب پیٹ بھر کے پیا۔ اور جب پی چکے تو ننھے ننھے ہونٹوں سے زبان رسول مضبوط پکڑ لی۔ ادھر رسول اشائے سے فرماتے ہیں ”چھوڑو بھی“ ادھر بچہ اشائے میں خواب دیتا ہے ”ٹھہرو بھی“

چنانچہ رسول اسی طرح اپنی زبان بچے کے دہن میں ڈالے ہوئے گھرنک آئے۔ گھر کے جتنے بڈھے تھے وہ محمد کے گرد اکٹھے ہو گئے۔ ادھر بچے نے جو دیکھا کہ رسول کی زبان دہن میں ہے تو مسکرایا اور آنکھوں آنکھوں میں خاندان کے بزرگوں سے کہہ رہا تھا۔

”خاندان کے بزرگو! گواہ رہنا۔ پیدا ہوتے ہی محمد مجھے زبان دے چکے ہیں“

رسول نے بچے کو گہوارے میں لٹا دیا۔ اوپر ایک چادر اوڑھادی۔ مبارکباد دینے والے لوگ آنے لگے اور پوچھنے لگے۔

”محمد! ماشاء اللہ۔ شکل کیسی ہے؟“

رسول فرماتے ہیں۔

”کیا تادوں کہ شکل کیسی ہے۔ کیونکہ بچے امیر اسی کی شکل ہوتے ہیں جسے

گھرنیوں ہوں۔ اور یہ بچہ ایسے گھر میں پیدا ہوا ہے جسکی کوئی شکل ہی نہیں۔ لہذا میں نہیں کون سی شکل بتاؤں۔
ادھر سے اعلیٰ حضرت نے کہا۔

”محمد ! واہ۔ بڑی مشکل سے تو ہمارے گھر میں ایک بچہ پیدا ہوا اور تم اس کی شکل بتاتے ہوئے گھبراتے ہو۔ کہہ دو کہ اس بچے کی آنکھیں ”عین اللہ“ ہیں۔ چہرہ ”وَجْہُ اللہ“ ہے۔ ہاتھ ”یَدُ اللہ“ ہیں اور زبان ”لسان اللہ“ ہے۔

چنانچہ رسولؐ نے بھی کہہ دیا کہ آنکھیں عین اللہ ہیں۔ چہرہ وجہ اللہ ہے۔ ہاتھ ید اللہ ہیں اور زبان لسان اللہ ہے۔ جب رسولؐ سب کچھ کہہ چکا تو خیال آیا کہ یہ کیا ہو گیا۔ کیونکہ اللہ سے دعائیں مانگ مانگ کے میں نے تو اپنا مددگار مانگا تھا مگر اللہ نے ایک ایک کر کے پھر واپس لے لیا۔ اب میرے پاس کیا رہ گیا۔ لہذا اب تک جو اللہ نے نہیں کہا تھا وہ رسولؐ نے جلدی جلدی کہہ دیا۔

”یا علیٰ لَہْمْکَ لَہْمِی - دَمِّکَ دَہِی“

”یا علیٰ ! تیرا میرا گوشت ایک۔ تیرا میرا خون ایک۔“

سَامِعِین !

ہاتھ اور آنکھیں وغیرہ اللہ نے دے دیں اور گوشت خون رسولؐ نے دے دیا۔ اور ادھر ہم گوارے کی طرف دیکھتے ہیں تو بچہ ہنسنے جا رہا ہے۔ ہم نے عرض کی۔
”یا علیٰ ! ہنسنے کیوں ہو؟“

بچہ جواب میں کہتا ہے۔ ”آج لُطْف آگیا۔“

قبلہ ! کیا لُطْف آگیا؟

”دیکھنا ! آج ہم تقسیم ہو گئے آج ہم بٹ گئے۔ آدھے اللہ کے

حصے میں آگئے اور آدھے رسول کے حصے میں آگئے۔ ہمارے پاس تو کچھ رہا ہی نہیں۔ اب اگر کوئی مجھ سے محبت کرے گا تو آدھی اللہ سے کرے گا اور آدھی رسول سے کرے گا۔ اور اگر کوئی مجھ سے عداوت کرے گا تو آدھی اللہ سے کرے گا اور آدھی رسول سے کرے گا۔

بچو!

تمہیں ایک واقعہ سناؤں کہ جب ہمارے رسول اس بچے کو لیکر گھر پہنچے ہیں تو قحطی دیر بعد حضرت ابو جہل شریف لائے۔ ان کا ذریعہ معاش ہی یہ تھا کہ مکہ میں جو بچہ پیدا ہوتا وہ اس کی آنکھوں میں کسی بڑے بت کے پاؤں کی مٹی بطور رسمہ لگاتے اور سوار و پیہ ہدیہ لیکر گھر جاتے چنانچہ وہ آج بھی شریف لائے کہ بڑے گھر میں بچہ پیدا ہوا ہے بہت انعام ملے گا۔ ابو جہل نے آتے ہی محمد سے کہا۔

”محمد! مبارک ہو۔ خدا نے بھائی عطا کیا ہے۔ اگر اجازت ہو تو میں اپنا کام کروں؟“

رسول ہنسی روک کر فرماتے ہیں۔ ”بچے سے پوچھ لو“

ابو جہل آگے بڑھا۔ ایک ہاتھ میں سلائی پکڑی۔ ایک ہاتھ سے بچے کی آنکھ کھولی اور ابھی سلائی آنکھ کے قریب ہی تھی کہ بچے نے زوردار طمانچہ رسید کر دیا۔ گویا ابو ادھر رہ گیا اور جہل ادھر رہ گیا۔ اور وہ یہ کہتا ہوا وہاں سے بھاگ پڑا کہ ”یہ خاندان بڑا عبادت گاہ ہے“

بزرگو!

اب متعزمن یہ کہتا ہے کہ

ذی بی صاحبے انشرم کرد۔ منہ بہ منہ کر مھوڑا بولتے ہو۔

بھلا تین دن کے بچے میں اتنی طاقت آ سکتی ہے کہ وہ طمانچہ مارے
میں کہتا ہوں۔ بھائیو!

اُس شخص کے برابر کا تو کوئی بُرا ہے ہی نہیں جو منبر پر بیٹھ کے جھوٹ
بولتا ہو۔ دیکھو نا! یہ تو سیدھی سادھی بات ہے کہ اگر تین گھنٹے
کا بچہ، عینے، بات کر سکتے تو تین دن کا بچہ طمانچہ بھی مار سکتا
ہے، اس میں جھگڑے کی کیا بات ہے،
اب معترض کہتا ہے۔

زیدی صاحب! بات کرنا اور چیز ہے اور طمانچہ مارنا اور
چیز ہے۔

میں کہتا ہوں۔ مولوی صاحبان!

جھگڑے میں نہ پڑو۔ دیکھو نا! بقول تمہارے علیہی "کلمۃ اللہ تھا
لہذا اس نے بات کر لی۔ اور یہ بچہ" بید اللہ تھا لہذا اس نے طمانچہ
مار دیا۔ اور اگر اب بھی سمجھ نہ آئے تو ہمارے پنجاب کا یہ محاورہ بھی
سن لو کہ "کمزور کے باتے" چلے۔ اور "طاقتور کا جہاتھ" چلے۔

حضور والا!

آج کعبہ کی قسمت ہی پلٹ گئی۔ آج کعبہ کی شان ہی بدل گئی۔ آج کعبہ کا انداز
ہی بدل گیا۔ ادھر بچہ رسول کے سینے پہ پلتا رہا۔ زبان رسول چوس کے پرورش پاتا
رہا اور جتنا اس نے پینا تھا پی لیا اور جو علیؑ سے باقی بچا وہ علیؑ کے بچوں نے
باپ کا مال سمجھ کے پینا شروع کر دیا۔ بہر کیف علیؑ رسول کے سینے پہ پلتا رہا۔
یہاں تک کہ جوں جوں اس بچے کا سن بڑھتا رہا توں توں رسول کا دل بڑھتا رہا۔
رسول کی طاقت بڑھتی رہی۔ رسول کی شان بڑھتی رہی اور جب دستِ گیارہ سال

کا ہوا تو اللہ کو بھی جوش آگیا۔

محمد! سنتے بھی ہو۔ بس اب انتظار کی گھڑیاں ختم ہو گئیں۔ لہذا اب اعلان کر دو۔ کہ ہم رسول ہیں کیونکہ تیرے دردگار کو ماشاء اللہ اب کافی طاقت آگئی ہے۔ مگر عوام سے بات نہ کرنا بلکہ پہلے اپنے گھروالوں سے بات کر دو۔ چنانچہ رسول نے گھروالے بلا لیے۔ تقریباً چالیس بنی ہاشم کاؤتکیہ لگا کے بیٹھ گئے۔ ان میں حضرت ابولہب بھی ہیں۔ حضرت قتیبہ ہیں۔ حضرت عقیبہ ہیں۔ حضرت شعبہ ہیں۔ آخر اقرب تو ہیں نا۔ یہ اور بات ہے کہ ”ع“ سے عقرب ہیں مگر ہیں تو ”اقرب“۔ بہر نوع سب حضرات تشریف فرما ہیں اور ایک کونے میں حضرت ابی طالبؑ بھی تشریف فرما ہیں۔ اور ادھر ایک طرف دس گیارہ سالہ بچہ بیٹھا ہوا کھیل رہا ہے۔ ہر کیف جب سب اکٹھے ہو گئے تو رسول تقریر کرنے کے لئے اٹھ رہے ہوئے یہ ”لسان اللہ“ کی پہلی تقریر ہے۔ جو کبھی نہیں بولا اس کا پہلا خطبہ ہے۔
مالین کے رسول کی پہلی تقریر ہے۔

سامعین!

آپ کو معلوم ہے کہ کسی حاکم کی پہلی تقریر اس کی پوری حکومت کی پالیسی ہوتی ہے لہذا آج رسول کی پہلی تقریر اس کی ساری زندگی کا خلاصہ ہو گا۔ ادھر رسول تقریر کرنے کے لئے کھڑے ہوئے۔ ادھر ساری کائنات رسول کی تقریر سننے کیلئے مسجود ہوئی۔ درخت کا ایک ایک پتہ سننے کے لئے کان بن گیا۔ درے گوش ہوا پتہ سننے کے لئے سوار ہو گئے۔ زمین پہ بٹی ہوئی نازک سیلیں سننے کے لئے درختوں پہ چڑھ گئیں۔ زمین و آسمان کی فضا سننے کے لئے ٹھہر گئی اور چلتی ہوئی ہوا اپنی سننے کے لئے روک گئیں۔ اور رسول نے تقریر شروع کر دی۔
لوگو! میں تمہارے لئے دنیا و آخرت کی خوبی لیکر آیا ہوں۔

اگر میری بات مان لے گے تو دنیا کی خوبی بھی تمہیں ملے گی اور آخرت کی خوبی بھی تمہیں ملے گی۔ گویا قیصر دکرئی کے تاج تمہارے قدموں کے نیچے ہوں گے۔

بولو! تم میں سے کون ہے جو میری مدد کرے؟
رسول کی یہ بات سن کر تمام لوگوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ اشارے کئے خاموش ہو گئے۔ دوسری دفعہ رسول نے پھر فرمایا، ”کون ہے جو میری مدد کرے؟“ مگر جب کہیں سے جواب نہ آیا۔ تو دنیائے دیکھا کہ ایک دم زمین و آسمان میں زلزلہ پیدا ہوا۔ کائنات لرز اٹھی اور چشم فلک نے ستاروں کی عینک لگا کے اس منظر کو دیکھا۔ جبریل نے سدرہ سے سر پہ تاج چڑھا کے دیکھا۔ حوروں نے جنت کے درتچے کھول دیئے۔ کوثر کے مزے میں پانی بھرا آیا۔ سبیل نے سبیل نکال کے بات سن لی کہ گیارہ سال کا بچہ کونے سے اٹھا اور عرض کی۔
حضور! پھر فرمائیں کیا حکم ہے؟“
رسول نے فرمایا۔

”بیٹا! ہم یہ کہہ رہے تھے کہ کون ہے جو ہماری مدد کرے“
یہ سن کر بچے نے ایڑیاں اٹھالیں اور کہا، ”اَنَا نَاصِرٌ يَا رَسُولَ اللَّهِ“
یا رسول اللہ! میں تیرا ناصر و مددگار ہوں۔

سَامِعِينَ!

یا محمد! نہیں کہا بلکہ یا رسول اللہ! کہا۔ اگر ”یا محمد“ کہتے تو محمد کی زندگی تک ساتھ ہوتا مگر ”یا رسول اللہ“ کے معنی یہ ہیں کہ جب تک تیری رسالت ہے جب تک میری نصرت تیرے ساتھ ہے۔
بچے کی یہ ادا دیکھ کے رسول مسکرائے اور فرمایا، ”بیٹا! سوچ لو“

بچے نے عرض کی۔

حضور! سوتے لیا۔

”بیٹا! غور کر لو۔“

”حضور! کر لیا۔“

”بیٹا! یہ بچوں کا کھیل نہیں ہے۔“

”حضور! میں جان پر کھیل کے کہہ رہا ہوں۔“

”بیٹا! یہ بڑا مشکل مرحلہ ہے۔“

”حضور! گھبراؤ نہیں۔ میں بھی مشکل کشا ہوں۔ فکر نہ کرو تمہارے دشمنوں کی آنکھیں نکال دوں گا۔ تمہارے دشمنوں کے سپیٹ پھاڑ دوں گا۔ تم بے شک جو کہنا چاہو کہو۔ اور جو کرنا چاہو کرو۔ کیا مجال کسی کی جو تمہارے پروگرام میں رکاوٹ ڈالے جب تک تیری رسالت ہے میں ساتھ دوں گا۔“

بزرگانِ منے!

علیؑ یہ کہہ رہے تھے اور ابی طالبؓ مرٹھکانے محمدؐ کی تسبیح پڑھ رہے تھے۔ اور یاد رکھو! علیؑ نے رسولؐ سے اتنا پکا وعدہ کیا ہے کہ اس سے زیادہ پکا وعدہ کوئی ہو سکتا ہی نہیں تھا۔

دیکھو نا! دیوار کی ہر طرف حکومت بٹ رہی تھی مگر رسولؐ کا ساتھ دینے کا پکا وعدہ کرنے والا رسولؐ کی میت لئے بیٹھا رہا۔ گو یا اس سے بہتر ساتھ تو کسی نے دیا ہی نہیں۔

توہبہ ہے نا صاحبانے!

علیؑ نے رسولؐ سے کہہ دیا ”میں ساتھ دوں گا“ اور میرے بچے انشا اللہ آپؐ کا ساتھ دیں گے۔ میری پوری نسل آپؐ کا ساتھ دے گی۔ آپؐ گھبراہٹ نہیں آپؐ فکر نہ کریں انشا اللہ قیامت تک میری مدد آپؐ کے ساتھ رہے گی۔ اور محمدؐ یاد رکھو! میں اس طرح ساتھ

دوں لاکہ دین پھیلے گا اللہ کا۔ کھڑے چھا جائے گا محمدؐ کا اور کنبہ کٹ جائے گا علیؑ کا۔

میرے عزیز بچو!

اگر کنبہ کٹ جائے تک ہی بات ختم ہو جاتی تو غنیمت تھا۔ مگر کنبہ کٹ جانے تک بات ختم نہیں ہوئی بلکہ یوں کہیے کہ علیؑ نے رسولؐ سے یہ کہا کہ ”قبیلہ! دین اللہ کا پھیلے گا۔ کھڑے پڑھا جائے گا اور بہو بیٹیاں میری قید ہو جائیں گی۔“ کیونکہ نوجوانوں کا کٹ کر مرنے اور بات ہے اور بہو بیٹیوں کا قید ہونا اور بات ہے۔ اور محمدؐ دیکھو! میری بیٹیاں ہی نہیں بلکہ میری بہو بیٹیاں جو غیر خاندان سے آئی ہیں وہ بھی تیرے دین کی خاطر میری بیٹیوں سے بڑھ کر قربانی دیں گی۔ میں تجھ سے وعدہ کرتا ہوں:

نوجوانو! مجھے معاف کرنا۔ میری کہانی ہی کچھ ایسی ہے۔ میں مجبور ہوں ورنہ میرا جی نہیں چاہتا کہ تم رو پڑو۔

دیکھو نا! زینبؓ کی قربانی ہو تو وہ علیؑ کی بیٹی ہے۔ لہذا اس کی شان اور کثرت کی قربانی کا انداز اور ہے مگر جو علیؑ کے گھر میں غیر خاندان کی آئی تھیں۔ ذرا ان کی قربانی کی شان دیکھو۔

محترم سامعین!

مجھے آپ ڈھنڈے دل سے سوتے کہ بتائیں کہ اگر ایک خاتون بیوہ ہو جائے اور اس کی گود میں ایک بچہ ہو تو اس کے تمام جذبات کا مرکز و محور وہی بیٹا ہوتا ہے۔ وہ بیوہ اپنی ماں کی زندگی اس بچے کے سہانے گزاردیتی ہے کہ یہ جوان ہوگا۔ اس کی شادی کروں گی۔ اس کے مہر باندھوں گی۔ اس کا گھر لے گا اور میں دوبارہ آباد ہوں گی۔ گویا ایک بیوہ کی توجہ کا مرکز اس کا بیٹا ہوتا ہے۔

حضور والا!

رسولؐ میں حسنؓ کی شہادت ہوئی۔ بوقت شہادت حسنؓ کی بیوہ اپنے شوهر کے سامنے

کھڑی ہے۔ گو دین دُوبِسال کا بچہ ہے اور اپنے شوہر سے کہہ رہی ہے۔

”میرے سوتاج! میرے لئے کیا حکم ہے؟“

حضورِ حق نے مجتبیٰ نے ارشاد فر دیا: ”قاسم کے مات! تو اپنی ساری

زندگی اس بچے کے ساتھ گزار دے۔ یہ بچہ قیامت تک تیرے نام کو قائم

دبائی رکھے گا،

برکیتِ امامِ حسنِ مجتبیٰ کی رحلت ہو گئی اور قاسم کی ماں قاسم کو گود میں اٹھا کر بیٹے

کے پاس روزانہ آتی اور فرماتی۔

”جسے بی! میں تو غیر خاندان کی ہوں۔ اُمّتی ہوں۔ آپ سادات ہیں اور نیچے

آپ کا ہے۔ اب اتنے سال کا ہو گیا میں نے اس کے لئے یہ لباس تیار کیا ہے۔ بی بی!

دیر نہ کرنا۔ جب چودہ سال کا ہو جائے تو اس کی شادی کر دینا۔ بی بی! مجھے اپنی زندگی

لاکوئی بھروسہ نہیں۔ میں ایک دفعہ قاسم کے چہرہ پر ہر دیکھنا چاہتی ہوں“

بسے بھائیو! قاسم کو تیرھواں سال ہوا تو حسین کے ساتھ کر بلا میں آگیا۔

اور قاسم کی ماں نے قاسم کی شادی کے سارے کپڑے اپنے ساتھ اٹھائے تاکہ ہو سکتا ہے

راستے میں ضرورت پڑ جائے۔

محترم سامعین!

کر بلا میں دن گذرتے گئے۔ حتیٰ کہ عاشورہ کی شب آگئی اور امامِ خیمے سے واپس

ہو کر جب مصلے پہ جا کے بیٹھے تو قاسم ماں کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی۔

”امّات! ہزلی بی نے مولا سے اپنے بیٹے کے لئے کل کی اجازت مانگی ہے۔

لہذا میں بھی اپنے لئے اجازت مانگ لوں؟“

قاسم کی ماں نے کہا: ”ہاں بیٹا! جاؤ۔ حسین سے تم بھی اجازت مانگو“

برکیتِ قاسم دہاں تشریف لائے جہاں امام مصلے پہ بیٹھے معبودِ حقیقی کے ساتھ راز و نیاز کی

باتیں کر رہے تھے۔ قاسم نے آتے ہی سلام کیا۔ ”چچا جات! سلام“

امام نے سر اٹھاتے ہی دیکھا اور فرمایا۔

”قاسم بیٹا! تم رات کو کیوں گھر سے باہر آئے۔ جاؤ میرے لعلے!

اپنی اماں کے پاس جا کر آرام کرو“ امام نے جو یہ کہا تو دل بھر آیا۔ چنانچہ قاسم کو گود میں بٹھا کر بھائی حسن کو یاد کیا۔

”قاسم بیٹا! تجھ سے بھائی حسن کی خوشبو آ رہی ہے۔ ہائے بھائی حسن!

آج حسین اکیلا رہ گیا۔“ تھوڑی دیر بعد حسین نے آسو پونچھے ہوئے فرمایا۔

”قاسم بیٹا! جاؤ۔ گھر میں جا کر آرام کرو“

قاسم نے کہا۔ ”مولانا! ایک بات پوچھنا ہوں“

امام نے فرمایا۔ ”ہاں بیٹا! پوچھو۔ کیا بات ہے؟“

قاسم نے عرض کی۔ ”مولانا! کل کے شہید ہونے والوں میں میرا نام ہے؟“

امام نے سمجھا کہ بارہ سال کا بچہ ہے۔ اللہ جانے سن کے دل پہ کیا اثر ہے۔ چنانچہ پہلا

ہوئے یہ فرمایا۔

”قاسم بیٹا! تم تو بڑے ہو۔ تمہارے چھوٹے بھائی اصغر کا نام بھی ہے“

بسے بھائیو! اب جو مولانا اصغر کا نام لیا تو قاسم یا بیٹھا تھا یا کھڑا ہو گیا

اور انگریزوں کی جول تو عبا کے بند ٹوٹ گئے اور بھرائی آواز میں فرمایا۔

”مولانا! ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے۔ کیا یہ بے حیا فوج اصغر کے گہوڑے

تک پہنچ جائے گی؟“

قاسم کی اس ادا پہ امام کو پیار آ گیا۔ گود میں اٹھایا۔ پیار کیا۔

”قاسم بیٹا! کس کی مجال ہے کہ تمہاری زندگی میں کوئی خیموں تک آجائے“

پھر نوح قاسم اٹھے۔ ماں کے پاس آئے اور کہا۔

” احمات! میرا یہ لباس اتار دو اور فقیروں والا لباس مجھے پہنا دو۔ میں ابھی اٹ
کے اندھیرے میں اپنے دادا کی قبر پر جانا چاہتا ہوں اور وہاں بیٹھ کے کہوں گا۔
” ڈاڈا اجانتے! مجھے حسین نے مرنے کی اجازت نہیں دی۔“
قاسم کی بیوہ ماں نے جویر سناؤ لکھا۔

” بیٹا! گھراؤ نہیں۔ میں تمہیں اجازت دلاتی ہوں۔“ چنانچہ ایک ہاتھ میں ٹاٹھ
لیا اور ایک ہاتھ میں قاسم کا بازو پکڑا اور حسین کی پشت کی طرف اگر کھڑی ہو گئی اور
عرص کی ”حسینے! اگر آج حسن زندہ ہوتے تو میں نہ آتی۔ تیری بیوہ بھادو جہ آج تجھ
سے قاسم کی موت کی بھیک مانگنے آئی ہوں۔“
امام نے جواب میں فرمایا۔

” بھابی جان! آپ نے کیوں تکلیف فرمائی۔ میں خود ہی حاضر ہو جاتا۔
کہو کیا بات ہے؟“

قاسم کی ماں نے عرص کی۔

حسینے! میں تیرے یتیم بھتیجے قاسم کو لائی ہوں اسے بتا دو کہ کل کے
شہید ہونے والوں میں اس کا نام بھی ہے۔ حسینے! دیکھو میں سیدانی
نہیں ہوں۔ غیر خاندان کی ہوں۔ کل کے مرنے والوں میں اگر قاسم نہ ہوتا تو میرا دودھ
بدنام ہو گا۔ لہذا مجھے بتا دو کہ یہ بھی شہید ہو گا۔“

چنانچہ حسین نے قاسم کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ گویا اجازت مل گئی۔ اور عرص قاسم کی ماں خوش
خوش خیمے میں واپس آئی اور زینب سے کہا۔

” بی بی زینب! مجھے مبارک دو۔ کل کے مرنے والوں میں قاسم کا نام بھی ہے۔“

سما معینے!

رات کا پچھلا پہر تھا اور حسن کی بیوہ نے اپنے ساتھ آئے ہوئے صندوق کھولے۔

قاسم کی شادی کے جتنے جوڑے بنائے تھے ایک ایک کر کے پہنائے اور اسی عالم میں صبح ہو گئی۔ اور صبح کو جب میدان شہادت گرم ہو گیا اور جب قاسم کی باری آئی تو حسین اپنے چھوٹے بھائی عباس غازی سے پوچھتے ہیں ”عباس بھائی! ابھی چھوٹے یتیم بھتیجے کی باری نہیں آئی؟“

عباس نے عرض کی ”مولا! قاسم کے بدن پر کوئی ذرہ پوری نہیں آئی۔“
عباس کا یہ کہنا تھا کہ خیمے سے قاسم کی ماں نے آواز دی۔

”عباس بھائی! ذرہ وہ پہنتے ہیں جو لڑتے جاویں۔ چونکہ میں اسے مرنے بھیج رہی ہوں اس لئے اسے بغیر ذرہ ہی کے بھیج دو۔“

اس کے بعد قاسم کی ماں نے قاسم کو بلا کر سبز کرتا پہنایا اور حسین نے بھائی حسن والا سرخ امامہ باندھا اور انام نے گود میں لیکر گھوڑے پر بٹھایا اور قاسم میدان میں آگئے۔

عزادار سید الشہداء!

میں اپنی گفتگو کو یہاں آ کر ختم کرنا ہوں کہ تھوڑی دیر بعد میدان سے آواز آئی اب تک جتنے شہید گرے تھے چاہے اپنے تھے یا غیر سب نے گرتے وقت حسین کو پکارا تھا مگر قاسم اتنا کن تھا کہ اس نے گرتے وقت حسین کو نہیں پکارا بلکہ ایک دم گھبرا کے آواز دی۔

”امات! میں گر گیا۔“

گویا قاسم کی معصومیت کی بات تھی کہ اس نے گرتے وقت ماں کو پکارا۔ بہر نوع قاسم کی آواز پر حسین چلے۔ میدان میں پہنچے۔ قاسم کی میت دیکھی اور فرمایا۔

”قاسم بیٹا! مجھے معاف کرنا۔ میں ذرا دیر سے پہنچا ہوں۔“ یہ کہہ کر حسین نے اپنی عباس مبارک کندھے سے اتاری اور زمین پر پچھادی اور میت کا ایک ایک

ٹکڑاٹھا کر عباس میں رکھا۔ گویا بنی ہاشم کا نازک ترین شہزادہ اپنی زندگی ہی میں پا مال ہو گیا حسین
 قاسم کی لاش کے ٹکڑوں کی کھڑی اٹھا کے خیمے میں لے آئے۔ ادھر ماں یہ سمجھی کہ حسین لاش
 نہیں لائے۔ فرمایا۔

”حسین! قاسم کی لاش نہیں لائے۔ میں بیوہ ہوں۔ کسے بھیجوں؟“
 حسین نے فرمایا۔

”بھابی! آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ میں قاسم کی لاش لایا ہوں۔ مگر شاید
 آپ دیکھ نہ سکیں گی،
 قاسم کی ماں نے کہا۔

”حسین! مجھے دکھاؤ قاسم کی لاش۔ آخر بات کیا ہے۔“
 یہ سنا کہ ماتم نے کھڑی قاسم کی ماں کے سامنے رکھ دی۔ اب جو قاسم کی ماں
 نے بیٹے کی لاش کے ٹکڑے دیکھے تو بلند آواز سے فرمایا۔

”زینب! ادھر آؤ۔“

”کلمشوم! ادھر آؤ۔“

”بی بیو! ادھر آؤ۔“

مجھے مبارک باد دو کہ میری قربانی سب سے زیادہ قبول ہوئی ہے۔ آج
 میرے بچے کی شادی ہوئی ہے۔“

ادھر حسین نے اس خیال سے کہ کہیں ماں نہ مڑ جائے، قاسم کی لاش کو اٹھایا
 اور میدان میں لے گئے اور اکبر کے لاشے کے ساتھ رکھ دیا اور دونوں لاشوں کے
 بیچ میں بیٹھ کر ایک ہاتھ قاسم کی لاش پر اور ایک ہاتھ اکبر کی لاش پر رکھ کر آسمان
 کی طرف رُخ کر کے بلند آواز میں فرمایا۔

”وَ اُغْرِبْنَا“ ”یا اللہ! میں غریب ہو گیا۔“

محاسن

خداوند عز و جل و جل جلالہ کی حمد و ثناء کے بعد حضرات محمد و آل محمد
پر دُرود و سلام

حضرات گرامی قدر!

قرآن مجید کی ہر چھوٹی آیت میں زندگی کا کوئی نہ کوئی اہم اصول بیان کیا گیا ہے مثلاً
ایک آیت ہے ”هل جزأ الاحسان الى الاحسان“ اللہ نے اس آیت کریمہ میں
لفظ ”احسان“ کو دو بار ادا کیا ہے۔ اور اس آیت کا ترجمہ مختصر وقت میں یہی ادا ہو
سکتا ہے کہ ”احسان کا کچھ بھی بدلہ نہیں سوائے احسان کے“
اگر تمہارے ساتھ کسی نے خُسن سلوک کیا ہے یا کوئی اچھی طرح پیش آیا ہے۔ اگر کسی
تمہارے ساتھ کوئی بھلائی کی ہے یا کوئی نیکی کی ہے تو اس کا بدلہ ضرور دو مگر نیکی کا بدلہ نیکی
سے بھلائی کا بدلہ بھلائی سے شرافت کا بدلہ شرافت سے ہونا چاہیے۔ گویا یہ ایک اصول ہے
جو اللہ نے اس آیت کریمہ میں بیان کر دیا ہے۔

بزرگان من!

اگر ہم اپنی ساری زندگی میں اس اصول کو پلے باندھ لیں اور اس پر عمل کرتے رہیں
تو دنیا کے تقریباً نوے فیصدی جھگڑے ہی ختم ہو جائیں۔ تمام فسادات ہی تقریباً ختم ہو جائیں
یہ گویا ایک اصولی بات ہے۔ لہذا اس اصول کو ذہن میں رکھتے ہوئے آج آپ سے عرض
کرتا ہوں کہ۔

سامعین کرام! بتاؤ۔ تمہارا سب سے بڑا محن کون ہے جس کا تم پر سب

حاضرین مجلس!

تم جتنا چاہو، سوچ لو، آخرا سی محور پر آ جاؤ گے کہ تمہارا سب سے بڑا محسن اگر کوئی ہے جس کے تم احسان کا بدلہ ادا کر سکتے ہو تو وہ محسن یہ ہے جس نے تمہیں عدم سے وجود دیا اور ناپید سے پیدا کیا۔ بناؤ وہ محسن اعظم ہے یا نہیں؟۔ یقیناً وہ محسن اعظم ہے جس نے تمہیں پیدا کیا ہے۔ دیکھو نا! ایک وقت وہ تھا کہ ہم نہیں تھے مگر آج ہم ہیں اور ایک وقت وہ ہو گا جب ہم نہیں ہوں گے۔ گدیا ہمارے ادھر بھی ”نہیں“ ہے۔ ہمارے ادھر بھی ”نہیں“ ہے۔ اور پیچ میں ہماری ”ہے“

یاد رکھو! جب ہمارے محسن نے چاہا کہ جب ہم دنیا میں آئیں تو ہمیں آنا پڑا اور جب وہ کہے گا کہ ”والپس جاؤ“ تو چاہے ہم مر جائیں۔ ہمیں جانا پڑے گا۔ یہ اور بات کہ ہنسی خوشی اپنے پیروں سے چل کر نہیں جائیں گے تو چار بندے ہی اٹھا کر لے جائیں گے مگر جانا ضرور پڑے گا۔ اور جب تک وہ یہاں رکھے گا ہمیں رہنا پڑے گا۔ اگر خود جانے کی کوشش کریں گے تو حکومت خود کشی کے جرم میں سزا دے گی۔ یا اللہ حرام موت میں پکڑے گا۔ بہر زع اللہ ہمیں جب تک رکھے گا۔ ہمیں رہنا پڑے گا اور جب بلائے گا۔ ہمیں جانا پڑے گا۔ اور پھر لطف یہ ہے کہ ہم سے پوچھے بغیر ہی جب چاہا جہاں چاہا۔ جسے چاہا بلا لیا۔ اور جس گھر میں چاہا بھیج دیا۔ چاہے ابر کے گھر میں۔ چاہے غریب کے گھر میں چاہے کسی کافر کے گھر میں۔ چاہے کسی مسلمان کے گھر میں۔ بہر زع وہ کسی سے مشورہ نہیں لیتا وہ بندے کو بھی دیکھتا ہے اور گھر کو بھی دیکھتا ہے۔ جس کو جس گھر کے قابل سمجھتا ہے وہاں بھیج دیتا ہے۔ جسے دیکھتا ہے کہ یہ بندوں کے گھر کے قابل ہے اُسے بندے کے گھر بھیج دیا۔ اور جسے دیکھتا ہے کہ یہ اللہ کے گھر کے قابل ہے اُسے اللہ کے گھر بھیج دیا۔ بہر کیف ہمارا سب سے بڑا محسن ہمارا ”اللہ“ ہے۔ اس کے بعد دوسرا محسن وہ ہے جس نے ہمیں اللہ سے متعارف کروایا۔ ورنہ ہم کیا جانتے تھے کہ اللہ ہے

بھی یا نہیں؟۔ ہم تو اپنی نادانی سے کئی لاکھوں چیزوں کو اللہ سمجھے بیٹھے تھے۔ لہذا آج ہم اس محنِ اعظم کا شکریہ ادا کرتے ہیں جس نے ہمیں لاکھوں دروازوں سے ہٹا کر ایک بابِ کریم کے دروازے پر بٹھا دیا۔ گویا ہم میں اتنی بے غیرتی اور بے حیائی تھی کہ دروازے جاکے بھیک مانگتے تھے۔ مگر اس محنِ اعظم نے کہا، ”نہیں“۔ دروازے پر بٹھکنے سے بہتر ہے کہ ایک بابِ کریم پر بیٹھ جاؤ، لہذا آج ہم اس محنِ اعظم کا شکریہ ادا کرتے ہیں جس نے ہمارا لغاتِ اللہ سے کروادیا۔

سامعین!

بہت سے کم فہم حضرات ہماری تقاریر میں کے کہتے ہیں کہ شیعہ ”غلو“ کرتے ہیں کیونکہ یہ محمد و آلِ محمد کو اللہ سے ملا دیتے ہیں۔ میں کہتا ہوں۔ ”نادالو! ہم محمد و آلِ محمد کو اللہ سے کب ملاتے بلکہ محمد و آلِ محمد نے ہیں اللہ سے ملا دیا ہے۔ ورنہ ہم تو اللہ کے واقف ہی نہیں تھے اگر وہ درمیان میں نہ ہوتے۔“

حضور والا! ایمان سے بناؤ۔ اگر محمد و آلِ محمد یہ کہہ دیتے کہ ”ہم اللہ ہیں“ تو کوئی طاقت اس کی تردید نہیں کر سکتی تھی۔ یہ تو ان کی عالی ظرفی ہے کہ انہوں نے اللہ کو اللہ رہنے دیا۔ ورنہ ان کے اللہ بننے کی کوئی تردید نہیں کر سکتا تھا۔ اور پھر لطف یہ ہے کہ باوجود ان کے انکار کرنے کے لوگ انہیں ”اللہ“ کہتے رہتے اور حبیبِ گ اللہ انہیں اللہ کہتے تھے تو وہ خوش نہیں ہوتے تھے بلکہ انہیں قتل کرتے تھے کہ ”ہمیں اللہ مت کہو“

بزرگانِ من!

اگر کوئی بڑا مانے تو مانے مگر اصل بات منہ سے نکلی ہی پڑتی ہے کہ اے آلِ محمد! تم کتنے عالی ظرف ہو کہ تم اللہ بننا بھی اپنی توہین سمجھتے ہو؟ بہ نفع جو عالی ظرف انسان

لوگوں کے بنانے سے اللہ نہ بنتا ہو۔ وہ لوگوں کے بنانے سے حاکم یا خلیفہ کیا بنے گا۔ گویا محمد مصطفیٰ ہمارے محسن اعظم ہیں جنہوں نے ہمیں اللہ کا تعارف کر دیا۔ ان کے بعد زمانے میں ایسا انقلاب آیا کہ اللہ کا نام تو تھا یا نہیں بلکہ محمد کا نام بھی دینا سے ٹنگا اب بتاؤ ! وہ ہمارا محسن اعظم ہے کہ نہیں جس نے خود مر کے محمد کا نام نہٹنے دیا۔ جس نے خود مر کے محمد کا نام روشن کر دیا۔ وہ یقیناً ہمارا محسن اعظم ہے۔

لہذا بھائیو! تقاضائے فطرت یہی ہے۔ اور شرافت یہی ہے کہ جس نے احسان کیا ہو تو اس کے احسان کا بدلہ احسان میں اتار دے چاہے دُنیا کچھ کہے مگر اپنے محسن کے احسان کو نہ بھولنا۔ یہی شرافت ہے اور یہی انسانیت ہے کہ حسین نے کربلا میں کھڑے ہو کر اللہ کے نام کو اور محمد کے نام کو زندہ کر دیا۔ خدا کے نام کو حیات ابدی دے دی اور محمد کے نام کو حیات جاوید دے دی۔

خود دُعا ہو گیا مگر اپنے ان محسنوں کے نام کو زندہ رکھا۔

بہر نفع حسین ہمارا محسن اعظم ہے جن نے ہم سب مسلمانوں پر احسان فرمایا ہے۔ لہذا یہ بات شرافت کے خلاف ہوگی اور انسانیت کے منافی ہوگی کہ اگر حسین جیسے محسن کو بھلا دیا جائے۔ گویا حسین کو بھلا دینا انسانیت کی توہین ہے۔

عزیزو!

مذہب کی الجھنوں اور بالادستی سے بالاتر ہو کر حسین جیسے محسن کے نام کو یاد رکھنا ہی عین شرافت ہے۔ حسین کے لئے کوئی مذہب و ملت کی قید نہیں ہے۔ اگر مسلمان حسین کو "امام" کہتے ہیں تو لاکھوں ہندو بھی "ہائے حسین" کہتے ہیں۔ گویا حسین عالم انسانیت کا محسن ہے۔ لہذا اللہ کا کوئی نام نہ لیتا اگر محمد نہ ہونے اور محمد کا کوئی نام نہ لیتا اگر حسین نہ ہوتے۔ اور بات یہاں اگر ختم نہیں ہوتی بلکہ حسین کا کوئی نام نہ لیتا اگر کوفہ و شام کے بازاروں میں زینب خطبات نہ پڑھتی۔

یاد رکھو!

ایک دیرانے میں لٹ جانے والے قاضی کو کون جان سکتا تھا۔ اگر زینب نہ ہوتی اس وقت نہ تو کوئی ریڈیو دیکھتے اور نہ ہی کوئی اور ذرائع تھے مگر یہ صرت زینب کا احسان ہے کہ اس نے حسین کو متعارف کر دیا۔ حالانکہ حکومت کا ذریعہ اشاعت نہ تھا اس لئے کہ حکومت تو خود قاتل تھی۔ اب کون آکر بتاتا کہ فلاں جنگل میں شہر کے کنارے ایک بے ضرر قاتل لٹ گیا ہے اگر کوہ و شام کے بازاروں میں ادنیٰ کے منبر پر بیٹھ کر ہاتھ گردن کے ساتھ بندھوا کر ننگے سر زینب خطبات نہ پڑھتی۔ لہذا زینب کا احسان ہے جس کی وجہ سے ہم حسین سے متعارف ہو گئے۔ زینب نے حسین کو ایک ایک گھر پہنچایا ہے۔ ہر فروع حسین کا ہم نگر پہنچا زینب کا احسان ہے۔ اور دنیا میں جتنی بھی مجالس عزاد ہو رہی ہیں ان تمام مجالس کی بانی زینب ہے۔

سامعین!

ایک دن بہن بھائی کے درمیان جھگڑا ہو گئی۔ اور زینب نے کہہ دیا۔
 ”حسین! جس باپ کا تو بیٹا ہے۔ اسی باپ کی میں بیٹی ہوں جس ماں کا دودھ تو نے پیسا ہے اسی ماں کا دودھ میں نے پیسا ہے۔ جو تیرا نانا ہے وہی میرا نانا ہے اور جو تیرا دادا ہے وہی میرا دادا ہے۔
 حسین! تیرے سر پر آبا کا عامہ ہے مگر دیکھ حسین! میرے سر پر اماں کی چادر ہے۔
 لہذا حسین! آج تیرا میرا مقابلہ ہے۔ اب بتا تو چاہتا کیا ہے؟
 حسین نے فرمایا۔

”زینب! آج میں اسلام کو بچانا چاہتا ہوں۔ آج میں مرکزِ نانا کے دین کو بچانا چاہتا ہوں۔“
 زینب نے کہا۔

.. حسین ! میں تجھے روکتی نہیں۔ جو تیرا ارادہ ہے پورا کر مگر حسین !

میرا تیرا بھی مقابلہ ہے۔ بے شک تو مر جاؤ گے
یاد رکھو حسین ! میں زینبؓ تجھ سے وعدہ کرتی ہوں کہ میں بھی تیرے
نام کو قیامت تک مرنے نہیں دوں گی۔ اگر بستی بستی، محلہ محلہ، گاؤں گاؤں
جا کر حسین حسین نہ کہلوا دیا تو فاطمہؓ کی مٹی نہ کہنا۔

بس بھائیو ! زینبؓ کا احسان ہے کہ آج ہم اپنے تمام کاروبار چھوڑ کر
محمدؐ کو حسینؑ کا پرستہ دے رہے ہیں اور زینبؓ کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔

وہ جسے زینبؓ ہے !

تیرا احسان ہے کہ تو نے حسینؑ جیسی قیمتی شے سے ہمیں متعارف کروا دیا۔ حسینؑ نے
بھی کربلا میں بیٹے شہید کر دائے اور تو نے بھی اپنے بیٹے شہید کر دے دیئے۔

جی جی ! میں معلوم ہے کہ وہ بیٹے قرآن کریم کے بھی حسینؑ کی نسل قیامت تک
باقی رہے گی مگر وہاں سے زینبؓ ! تو نے حسینؑ کی حفاظت میں اپنی پوری نسل ختم
کر دادی۔

جی جی ! ہم تیرے ہر احسان کو سرائیوں پر رکھتے ہیں اور تیرا شکریہ ادا کرتے ہیں
کہ تو نے آج حسینؑ جیسی قیمتی شے ہم تک پہنچا دی۔

میرے بھائیو !

زینبؓ نے پہلی مجلس گیارہ محرم سالہ کو حسینؑ کے لاشے پر پڑھی۔ پھر کوفہ
کے بازاروں میں پڑھی۔ درباروں میں پڑھی۔ جب کوفہ کے ایک ایک محلہ میں پڑھ
کی تو راستے کے شہریوں اور قصبوں میں پڑھتی رہی۔ پھر شام کے ملک میں حسینؑ کی مجلسیں
پڑھیں۔ یزیدؓ کے دربار میں پڑھیں۔ اور جب یزیدؓ نے کہا۔

زینبؓ ! تم مدینہ جاسکتی ہو۔

تو زینبؓ نے ایک مکان خالی کر دیا کہ تین دن حسینؑ کی مجلس پڑھی۔ اور وہاں سے

جب مدینہ کے لئے روانہ ہوئی تو راستے میں پڑھتی رہی۔ اور جب مدینہ پہنچی تو پہلا کام یہ کیا کہ حسین کی مجلس پڑھی۔

سامعین!

گذشتہ سال میں بھی مدینہ کی زیارت سے فیض یاب ہوا ہوں۔ جب مکہ سے مدینہ کے لئے چلا تو خدا جانے میرے ذہن میں کیا کیا تصورات منڈلا رہے تھے۔ اور جب اٹاری گاڑی مدینہ کے قریب پہنچی تو ڈرائیور نے کہا۔
”مَدِیْنہ آگیا ہے“

میں نے دیکھا کہ دنیا خوشی منا رہی تھی اور لوگ ایک دوسرے سے بغل گیر ہو رہے تھے۔ مگر میں گاڑی سے نیچے اُترا اور مدینہ کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا اور کہا۔
”مَدِیْنہ! تو ہی وہ مدینہ ہے نا جہاں حسین رہتا تھا۔
اے مدینہ کی گلیو!

تم گواہ ہونا کہ تم میں حسین کھلا کرتا تھا۔
اے مدینہ کے درو دیوار! تمہیں یاد ہے نا کہ یہاں حسین اپنے نانا کے کدے پر بیٹھ کر چلا کرتا تھا“

بہر فرح زینب مدینہ میں حسین کی پہلی مجلس پڑھی اور جب اہل مدینہ کو پتہ چلا کہ مدینہ سے باہر حسین کی بہن آئی ہے تو شہر کے سارے زن و مرد زینب کے استقبال کے لئے آگئے اور ان لوگوں کی قیادت حضرت ام البنین فرما رہی تھیں۔

سامعین!

علامہ کفایت حسین مرحوم و مغفور اپنی مجلس میں ایک فقرہ کہا کرتے تھے کہ جب ام البنینؓ المطہیت کے قافلے کے قریب آئی ہیں تو پہلا شخص جو قافلہ زینبؓ میں سے جناب ام البنین سے ملا وہ تھے حضور امام زین العابدین علیہ السلام۔

بائیس سال کا سن تھا۔ ایک سال کی قید بھگت کے آئے تھے۔ ام البنین نے امام کو جو آئے دیکھا تو پہچانا نہیں۔ چنانچہ امام زین العابدین نے آگے بڑھ کر سلام

کیا۔ "دادی اماں! سلام"

ام البنین نے پوچھا "کون؟"

اماں نے جواب دیا۔

"اماں! مجھے پہچانو۔ میں زین العابدین ہوں۔"

حافظ صاحب کہا کرتے تھے کہ امام کی یہ بات سن کر ام البنین کے منہ سے سفاقت

نکلا۔ "بیٹا زین العابدین! جوانی کی اس عمر میں تم اتنے بوڑھے ہو گئے"

بیٹا! تمہاری داڑھی کیوں سفید ہو گئی؟

بیٹا! زینب کہاں ہے۔

زینب نے قریب سے آواز دی۔

"اماں! میں یہاں کھڑی ہوں۔"

ام البنین آگے بڑھی۔ زینب کو سینے سے لگا لیا۔ اور کہا۔

زینب بیٹا! کوئی ناراضگی ہے؟

زینب نے جواب دیا۔

مجھے ملتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے۔ کیونکہ میں تیرے بچوں کو

چھوڑ گئے آگئی ہوں۔ میں تیری اولاد کو ختم کر کے آگئی ہوں۔"

صاحبان!

ایک چھوٹے بچے نے ام البنین کے پاؤں پکڑ لیے۔

ام البنین پوچھتی ہیں۔

بیٹا! تم کون ہو؟

بچہ جواب میں کہتا ہے۔

"اماں! میں تیرے عباس کا یتیم بیٹا ہوں۔"

عزاد ار سید الشہداء!

زینب! سناؤ۔ کہ بلا میں کیا گزری؟

چنانچہ زینب فرماتی رہی۔ اُمّات! کیا سنتی ہو۔ میں دیکھتی رہی اور میرے بھائی بھتیجے۔ بیٹے اور اصحاب ذبح ہوتے رہے اور جب سنانے سنانے یہاں پہنچی کہ حسین گھوڑے سے گر گئے تو ام البنین گھبرا کے کہتی ہے۔

وہا میں۔ پھر کیا ہوا؟

زینب نے جواب دیا۔

اُمّات! پھر مجھے حسین کی کوئی اطلاع نہ مل سکی۔ میں دروازہ پر بے چین کھڑی رہی مگر کوئی بتانے والا نہیں تھا کہ میرا بھائی کہاں ہے۔
ام البنین نے پوچھا۔

زینب! پھر کس نے اطلاع دی؟

فرمایا۔

اُمّات! کوئی آدمی تو زندہ نہیں رہا تھا۔

زینب نے فرمایا۔ اُمّات! مجھ پر احسان ہے حسین کے گھوڑے کا جس

نے مجھے آکر بتایا کہ زینب! تو یہاں کھڑی ہے اور حسین گر گئے۔

سامعین! بتاؤ۔ حسین کا گھوڑا ہمارا معن ہے کہ نہیں؟

آج ہم اس معن کی شبیہ کے قدموں پر سر رکھنا باعثِ سعادت سمجھتے ہیں اسکو سلام کرنا باعثِ عزت سمجھتے ہیں کیونکہ یہ ہمارے معنِ اعظم گھوڑے کی شبیہ ہے

خداوندِ عالم بعد از محمد و آل محمد ہماری

مجلسوں کو قبول و منظور فرمائے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ
اللَّهُمَّ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ وَآلِ مُحَمَّدٍ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

ادائے حق

اِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ

اللہ کا پسندیدہ دین اسلام ہے۔

خداوند عز و جل جلالہ کی حمد و ثناء کے بعد حضرات محمد وآل محمد
پر درود و سلام

حضرات گرامی قدر!

اللہ کا یہ فرمان ہے ”اِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ“

یاد رکھو! دین اور مذہب میں فرق ہے

دین کے معنی میں ”منزل مقصود“ کو یا وہ نقطہ مرکزی جہاں ہم پہنچنا چاہتے

ہیں، دین کہلاتا ہے۔ اور نقطہ مرکزی تک پہنچنے کے راستے کو مذہب

کہتے ہیں۔ ایسا ہو سکتا ہے کہ نقطہ مرکزی ایک ہو مگر اس تک پہنچنے کے

راستے مختلف ہوں۔ لہذا مختلف رستوں سے نقطہ مرکزی تک پہنچنے والے

ایک دوسرے سے اس بات پر نہیں ٹک سکتے کہ تم اس رستہ سے کیوں آئے

ہو کیونکہ جس کو جو رستہ پسند تھا وہ اس رستہ کے ذریعہ منزل مقصود تک

پہنچ گیا مگر نقطہ مرکزی تو ایک ہی ہے۔ گویا شخص قدرتی طور پر اپنی منزل تک

پہنچنے کے لئے وہ رستہ اختیار کرتا ہے جسے وہ اپنے خیال میں قریب تر اور آسان تر

سمجھتا ہے۔ یا پھر رستے کا واقف بھی ہوتا ہے لیکن کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا ہے کہ

کا واقف بھی رستہ پوچھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ جب چلتے چلتے رستہ میں چوڑا جہ

آجاتا ہے۔ چنانچہ اسے مجبوراً وہاں ٹھہرنا پڑتا ہے اور فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ ان چٹاروں راستوں میں سے کسی ایکے کو اختیار کیا جائے۔ لہذا ایسے بھٹکنے والوں کے لئے حکومت کی طرف سے جو انتظام ہوتا ہے اسے ”ٹریفک“ کہتے ہیں۔ اور اللہ کی طرف سے جو انتظام ہوتا ہے اسے ”عقل“ کہتے ہیں۔

بزرگان من!

اب تم خود سوچو کہ منزل مقصود کی طرف کون سا راستہ جائے گا کیونکہ صرف رستہ ہی وجہ اختلاف نہیں ہونا چاہیے بلکہ دیکھنا یہ چاہیے کہ ہماری منزل مقصود کیا ہے۔ ہاں مگر ہر راہ رو کو راستہ میں کمالات کا خیال ضرور رکھنا چاہیے کہ میرا بھائی جو اسی منزل کی طرف جا رہا ہے جہاں میں جانا چاہتا ہوں ایسا تو نہیں کہ اس کا رخ اصل منزل سے بالکل اٹھ ہو۔ مثلاً میرے بھائی کو لاہور کی طرف جانا ہے مگر وہ بدقسمتی سے کراچی کی طرف پر چل پڑے اور دوڑنا شروع کر دے۔ گویا وہ اپنے راستے پہ جتنا ہی تیز دوڑے گا اتنا ہی اپنی منزل سے دُور ہوتا جائے گا۔ اپنی اس ناسمجھی سے نہ تو کسی سے کلا کر سکتے ہیں اور نہ ہی کسی سے شکوہ کر سکتے ہو۔ نری محنت یا تکلیف اٹھانے سے کام نہیں چلے گا۔ بہر نوع صرف راستہ ہی وجہ اختلاف نہیں ہونا چاہیے بلکہ دیکھنا یہ ہو گا کہ ہماری ”منزل مقصود“ کیا ہے۔

بیاد رکھو!

ہمارا مقصود ہے ”دین“ اور ہمارا دین ہے ”اسلام“ گویا ہم چاہتے ہیں کہ دنیا میں ہم دیندار بن کے رہیں۔ ایماندار بن کے رہیں کیونکہ وہ آدمی دنیا میں بڑا ذلیل ہے جو ”بے دین“ ہو۔ بہت بُرا ہے وہ انسان جو ”بے ایمان“ ہو۔ اگر کسی کافر کو کافر کہہ دو تو کوئی بُری بات نہیں نہرو کہہ دو کہہ دو تو وہ بُرا نہیں منائے گا۔ اور اگر کسی عیسائی کو عیسائی کہہ دو تو

وہ یہی کہے گا کہ اس میں شک کی کیا بات ہے۔ میں عیسائی ہی ہوں۔ حالانکہ
ہندو۔ یہودی اور عیسائی آپ کے خیال میں مومن تو نہیں ہیں
ایمان سے ان کا کوئی واسطہ تو نہیں ہے مگر ذرا کسی کو ”بے ایمان“ تو کہہ دو
فوراً بگڑ جائے گا۔ معلوم ہوا کہ ایمان کوئی ایسی پیاری شے ہے کہ اس سے کوئی
علیحدہ ہونا برداشت نہیں کر سکتا اسی طرح ”بے دین“ کہہ دو تو فوراً بگڑ جائیں
گئے۔ معلوم ہوا کہ دین بھی کوئی ایسی چیز ہے جس سے الگ ہونا کوئی بھی پسند نہیں کرتا

بچو!

اگر تم ضد میں آ کر کسی ”بے دین“ کو بے دین کہہ دو تو پتہ چلے گا کہ بے دین
تمہیں کیا جواب دیتے ہیں۔ اسی طرح کسی ”بے ایمان“ کو بے ایمان تو کہہ دو۔ پھر
پتہ چلے گا کہ وہ بے ایمان تمہارے ایمان کی کیا گت بناتا ہے معلوم ہوا کہ کوئی شخص
نہ تو دین سے جدا ہونا برداشت کرتا ہے اور نہ ہی مذہب سے جدا ہونا
برداشت کرتا ہے۔ گویا دین و ایمان دونوں اتنی پیاری چیزیں ہیں۔

بزرگان من!

جب دین و ایمان دونوں اتنی پیاری چیزیں ہیں تو ہمیں دیکھنا یہ ہے
کہ ہمارے بزرگوں نے ہمیں ان کا تعارف کیسے کروایا ہے تاکہ نہ ہم دین
کو چھوڑنے پائیں اور نہ ہی اسلام کو چھوڑنے پائیں۔ چنانچہ ہمارے ہادی
اعظمؑ نے ہمیں ہزاروں باتیں بتانے کے بعد مجمع عام میں ہمیں ”کل ایمان“
کا تعارف بھی کروادیا اور یہ بتا دیا کہ اس سے علیحدہ نہ ہونا ورنہ بے ایمان
کہلاؤ گے۔ بہر نوع ہادی اعظمؑ نے ہمیں ایمان کا تعارف کروایا اور ہم صاحب ایمان
ہو گئے۔ رفتہ رفتہ ہماری نسل ہندوستان میں نہجی۔ ہم نے ایمان کو مضبوطی
سے پکڑے رکھا مگر یہاں کے لوگ ہمیں بے دین کہنے لگے۔ آخر ہم نے گھبرا

کے پوچھا۔

”خداوند! تو ہی بتا کہ دین کیا شے ہے جو ہمارے دلوں میں نہیں ہے۔“

چنانچہ اللہ نے ہیں ایک رہبر دے دیا جنہوں نے ہمیں بتا دیا کہ اگر دین پوچھنا چاہتے ہو تو

”دین است حسین“

گویا رسول نے باپ کو ایمان بنا دیا اور خواجہ معین الدین نے بیٹے کو دین بنا دیا۔ لہذا اب اگر کوئی باپ کو چھوڑ دے گا تو بے ایمان کہلائے گا۔ اور اگر کوئی بیٹے کو چھوڑ دے گا تو بے دین کہلائے گا۔ بہر نوع یہ ایک جملہ معترضہ تھا۔ اصل گفتگو تو یہی ہے کہ وہ دین جس کا تعارف اللہ نے ہمیں ہادی اعظم کی زبان سے کروایا ہے ”اسلام“ ہے۔

إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ

”اللہ کو جو دین پسند ہے وہ اسلام ہے“

سَامِعِينَ!

اگرچہ مجھے اللہ کی پسند میں شک ہے کیونکہ پسند کا تعلق دل و دماغ سے ہے اور جس کے دل و دماغ ہی نہ ہوں وہ پسند کیا کرے گا۔ اور نہ پسند کیا کرے گا۔ یہ تو ہمیں سمجھانے کے لئے کہ دیا جاتا ہے کہ اللہ کو فلاں شے پسند ہے حالانکہ اللہ جانے۔ اللہ کے پاس کون ایسے لوگ ہیں جن کا دل و دماغ ایسی چیزیں پسند کرتا ہے۔ ورنہ اللہ تو براہ راست اپنے دل و دماغ سے کوئی کام لیتا ہی نہیں بہر کیف اللہ نے فرمایا کہ میرا پسندیدہ دین ہے ”اسلام“ ادھر ہم نے اسلام کا دامن مضبوطی سے پکڑا اور جب اسلام کے معنی تو پتہ چلا کہ اسلام کا

مطلب ہے ”سر جھکا دینا“ یا کسی بات کو ”مان لینا“ گویا مسلم اسے کہتے ہیں جو کسی بات کو مان لے۔ اب اگر کوئی شخص کسی بُت کو مان لے تو وہ بت کا مُسلم کہلائے گا۔ اور اگر کوئی سورج یا چاند وغیرہ کے آگے برتر تسلیم کرے تو وہ انکا مسلم کہلائے گا غرض جو جسے مان لے وہ اس کا مسلم کہلائے گا۔

نوجوانو!

میرے دیکھ رہا ہوں کہ تم مجھے گھور رہے ہو۔ گویا تمہارا مطلب ہے کہ۔

”زیدی صاحب! ہوش کے باتے کو۔ منبر بیٹھ کر بے ہوشی“ کی باتیں کرنا گویا منبر کے توہین ہے۔ چونکہ سامعین میرے تمام تنہا جیسے سفید ریشے بوڑھے ہی تو نہیں ہیں کچھ سب جھدار ”نوجوان“ بھی ہوتے ہیں لہذا ان جوانوں کا بھی خیال رکھا کرو۔ اور سوچ سجدہ کے باتے کیا کرو؟

میں کہتا ہوں ”نوجوانو!“ اگر میرے بے ہوشی کے باتے کروں تو اس میں میرا کیا تصور ہے۔ تم نے خود ہی ایک بڑھے کو منبر پر بٹھا دیا اور ساتھ یہ بھی توقع رکھتے ہو کہ ”ہوش“ کی باتیں کروں۔ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟

نوجوان جواب میں کہتے ہیں۔ ”زیدی صاحب! بھلا یہ

کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک انسان بحیثیت انسان کے ، بحیثیت آدم کا بیٹا ہونے کے جو شکل و صورت میں بھی انسان ہو۔ دل و دماغ میں بھی ٹھیک ہو۔ اسکے باوجود کسی پتھر کو خدا مانتا ہو۔ انسان سے اتنی حاجت کے توقع نہیں کیے جاسکتے۔

میں کہتا ہوں ”نوجوانوں! تمہیں کیا معلوم کہ انسان جہاں چشم فلک کے پلکوں کو چھونا چاہتا ہے وہاں اس میں یہ پستی بھی موجود ہے کہ وہ پتھر کے سامنے ہاتھ جوڑے بیٹھا ہے۔

دیکھنا!

اگر تمہیں میری اس بات کا یقین نہ آئے تو ہمسایہ ملک (بھارت) میں جا کر دیکھ لو جہاں پچاس کروڑ پوجنے والوں کے پاس پھتر کر ڈر خدا ہیں۔ گویا ایک بندے کے حصہ میں ڈیڑھ خدا آتا ہے اور پھر لطف یہ ہے کہ ہر انسان نے اپنا الگ خدا بنایا ہوا ہے۔ غیر کے خدا کی پوجا کرنا تو ہیں سمجھتے ہیں۔ اپنے خدا کو روزانہ آشنائے کراتے ہیں۔ اسے پہ بہینے چڑھاتے ہیں

مگر خدا صاحب ہے کہ بڑے آرام سے بُتے
بنے بیٹھے ہیں کیا مجال جو سردی گرمی کا
ان پہ کوئی اثر ہو جائے۔

بچو!

ہندوستان میں ایک "ہندو خاندان" آباد ہے
چونکہ "خاندان مغلیہ" کے تمام "نہری" نظام
کا انتظام اس خاندان کے سپرد تھا اس لئے
شاہان مغلیہ کے طرف سے اس خاندان
کو "نہرو" کا خطاب دیا گیا۔ ہندوستان کے
خاندانوں میں یہ خاندان اپنی قابلیت
کے بنا پر نہایت قابل ترین خاندان ہے
تقریباً تین سو سال سے یہ خاندان ہندوستان
پر حکومت کر رہا ہے ہندوستان کے موجودہ
حکمران (اندرل) اسی خاندان کے ایک فرد
ہیں نے لاکھ طعنے دیئے مگر زناچی وہ کھیل
کھیل رہی ہے کہ ساٹھ کروڑ عوام پر حکومت
کر رہی ہے گویا ہندوستان تاریخ میں نہرو
خاندان اکثر اوقات مسند حکومت پر رہا ہے
اس خاندان کے عورتیں بھی مردوں کے
شانہ شانہ حکومت کرتی رہی ہیں بھارت
میں تو اس خاندان کے یہ حالت ہے مگر

غیر محال کہ میں یہ حیشیتے ہے کہ جب کبھی
ریڈیو پہ تقریر کرے تو دنیا بھر کے انسان
اپنے ریڈیو گھول کر ان کے تقریر سننا شروع
کر دیتے ہیں اخبار کے رپورٹرز اسے پہ لوٹے
لکھتے ہیں۔ چاہے بے عقلی کے بات کہیں
لیکن پھر بھی دنیا ان کے تقریر محفوظ کرنے کی
فکر میں ہے اور ان کے منہ سے نکلے ہوئے
لفظ قوموں کیلئے "افعال زریعہ" بن جاتے
ہیں۔ گریاناہرو خاندان اتنا عقل مند خاندان
مانا جاتا ہے اور اسبیلیوں میں ان کے عقل
کے پرچم لہرائے جاتے ہیں۔ لیکن جب گھر میں
تشریف لاتے ہیں تو پتھر کے سامنے ہاتھ جوڑ
کر بیٹھ جاتے ہیں۔ یا تو عقل کے اتنی بلندی
کہ ان کے منہ سے نکلے ہوئے فقرے کو سنہری
لفظوں میں آویزاں کیا جا رہا ہے یا پھر عقل
کی اتنی پستی کہ انسان ہوتے ہوئے پتھر نامراد
کے سامنے ہاتھ جوڑے بیٹھ جاتے ہیں۔

آخر ہم پوچھتے ہیں "پنڈت جی! اسبیلی میں تو اتنی عقل مند
کی باتیں مگر گھر میں اتنی ناسمجھی کہ پتھر کے سامنے ہاتھ جوڑے بیٹھے
ہو اور اسے خدا سمجھتے ہو۔"

پنڈت جی کہتے ہیں نادانوں! ہماری عقل تو ٹھیک ہے مگر تمہاری سمجھ پر پڑ

پڑا ہوا ہے۔ جو خواہ مخواہ ہم پہ اعتراض کر رہے ہو
ہم نے کہا پنڈت جی!

اعتراض ہی کی تو بات ہے۔ تم اتنے قابل ہو کر پتھر نامزد
کو خدا سمجھتے ہو۔ بھلا پتھر بلی پر جنے کے قابل ہوتا

ہے۔“ ۴۔

پنڈت جی کہتے ہیں۔ تمہیں کس مسخرے نے بھکا دیا ہے کہ ہم
پتھر کو پوجتے ہیں؟

ہم نے کہا ”پنڈت جی!

اس میں بھکانے کی کیا بات ہے۔ یہ تو سامنے کی بات
ہے۔ میں خود دیکھ رہا ہوں کہ تم باہوش و حواس
پتھر کے سامنے ہاتھ جوڑے بیٹھے ہو۔ آخر کیوں؟
پنڈت جی کہتے ہیں۔ دیکھو! رات میں داخل نہ دیا کرو کون
کہتا ہے کہ ہم اس پتھر کو پوجتے ہیں۔“

ہم نے جرت زدہ ہو کر پوچھا۔

پنڈت جی! شرم کرو۔ دن دھاڑے مکر رہے ہو۔
ہاتھ جوڑے سو جھکائے پتھر کے سامنے کیا ہو رہا ہے؟

پنڈت جی کہتے ہیں۔ بر خور دار!

میں اس پتھر کو نہیں پوج رہا ہوں۔ بلکہ میں تو اپنے سرکش ایسا
(قادر المطلق) کو پوجتا ہوں۔ پراونت کشور (خالق الکل) کو پوجتا
ہوں۔ پراونت الہا (کو پوجتا ہوں۔ اوم

(وحدہ لائٹریک) کو پوجتا ہوں۔ ہم تو انہیں پوج رہے ہیں پھر

کیوں خامخواہ ہم پہ پتھر کا الزام لگایا جا رہا ہے۔
 ہم نے پوچھا ”پنڈت جی! اگر یہ پوچھا نہیں ہے تو پھر کیا ہے؟
 پنڈت جی کہتے ہیں ”جیسے ہم پڑج رہے تھے وہ ہمارا مالک سے
 چونکہ مالک کے سامنے گناہ کا ر ہوا کر جاتے ہوئے کچھ شرم سی
 محسوس ہوتی ہے۔ لہذا ہم نے اس پتھر کو اپنے اور مالک کے درمیان
 وسیلہ بنا کر رکھا ہوا ہے“

ہم نے پوچھا ”پنڈت جی!
 دنیا میں اور بہت سی ایسی چیزیں تھیں جنکو وسیلہ
 بنایا جاسکتا تھا۔ آخرا اس ”پتھر“ میں کیا خصوصیت
 ہے۔“

پنڈت جی کہتے ہیں ”برخوردار!
 تمہاری نظریں یہ پتھر سہی مگر ہمارے نزدیک یہ بے گناہ ہے
 اس لئے اسے وسیلہ بنایا ہے“

سامعین!

پنڈت جی کی یہ بات سن کر میں بھی تامل ہو گیا کہ گناہ گار کو وسیلہ
 بنانے سے تو پتھر کو ہی پوچھنا بہتر ہے۔ کم از کم اس میں کوئی
 عقل و شعور کی بات تو ہے“

بچو! ایک مثال سناتا ہوں۔ اگر پسند آئے
 تو یاد رکھنا۔

ضلع جھنگ کے ایک گاؤں کا ایک دس نمبر می
 بد معاش تنہا نے میں بلوایا گیا۔ جو اپنے ساتھ ایک

سفارشی بھی لے آیا جو اتفاق سے وہ صاحب کسی
فوجداری مقدمے میں مطلوب تھے۔ چنانچہ
جب وہ سفارشی تھانے میں تشریف لائے تو
سفارشی کرنے سے پہلے پولیس نے ان کی پٹائی
شروع کر دی۔ ساتھی نے پوچھا۔

”تھانیدار صاحب! کیوں اس بیچارے کی
پٹائی کر رہے ہو؟“
تھانیدار نے کہا۔

”تمہیں معلوم نہیں کہ یہ حضرت متواتر چالیس
برس تک ڈاکہ ڈالتے رہے ہیں۔ بھلا ایسے
سفارشی کو تم کیوں ساتھ لائے جو پہلے ہی
کئی مقدموں میں مطلوب تھا۔“

بہر نوع سفارشی کا بے عیب ہونا ضروری ہے۔ خواہ پتھری
کیوں نہ ہو۔

سَامَعِیْنِ مَکْرَامِ!

خدا کا ہم پر بہت بڑا فضل و کرم ہے کہ ہم سب مسلمان ہیں۔ دوسری باتوں کے
علاوہ ہم اپنے خوراک و لباس کا پورا پورا خیال رکھتے ہیں ہلال کھاتے ہیں اور
حرام سے بچتے ہیں۔ یوں تو مسلمانوں کی اور بہت سی خوراک ہے۔ مگر سب سے
پسندیدہ خوراک گوشت ہے۔ چاہے بکرے کا ہو۔ چاہے گائے کا
ہو۔ چاہے کسی اور بلا کا ہو۔ مگر کھانے گوشت ہی ہیں۔ چنانچہ پاکستان
کے ہر شہر میں روزانہ تقریباً ہزاروں کی تعداد میں بکرے وغیرہ ذبح کئے جاتے

ہیں۔ تاکہ ہماری خوراک کا تقاضہ پورا ہو۔ لہذا ہم روزانہ قصائی کے پاس جاتے ہیں۔ اس کی پسند کی قسم اسے دی جاتی ہے اور اپنی پسند کا گوشت حاصل کیا جاتا ہے (اگرچہ آج کل گوشت بھی قصائی ہی کی پسند کا ملتا ہے)

بہر نفع گوشت خرید جاتا ہے اور کبھی بھی قصائی سے یہ نہ پوچھا کہ جس بکرے کا گوشت تو مجھے دے رہا ہے اس کا سینک ٹھیک تھا یا نہیں۔ کان ٹھیک تھے یا نہیں۔ کہیں اندھا تو نہیں تھا۔ کہیں لنگڑا تو نہیں تھا؟ ہرگز نہیں اگر بکرہ اندھا یا لنگڑا تھا تو ہمیں کیا واسطہ۔ ہمیں تو گوشت سے سروکار ہے۔ گویا ہم

تین سو چوہنٹھ دن تک تو عیب دار بکرے کھا لیتے ہیں مگر جب تین سو پینسٹھواں (عید الفطر) آتا ہے تو بڑا خیال رکھا جاتا ہے کہ کہیں بکرہ عیب دار نہ ہو۔ سینک ٹوٹا ہوا نہ ہو۔ اندھا نہ ہو۔ لنگڑا نہ ہو گو یا بکرے میں کسی قسم کا کوئی عیب نہ ہو۔ آخر ہم اپنے محلہ کے مولوی صاحب سے پوچھتے ہیں

مولانا! کیا اس سے پہلے سال بھر آپ عیب دار بکرے کا گوشت نہیں کھاتے رہے جو آج اتنی احتیاط برقی جا رہی ہے؟

مولانا فرماتے ہیں۔

”برخوردار! تین سو چوہنٹھ دن میں زبح ہونے والے بکود کی اور بات ہے اور آج (عید الفطر) کے دن ذبح ہونیوالے بکرے کی اور شان ہے۔

ہم نے پوچھا۔ مولانا! آج کے بکرے میں کیا خصوصیت ہے؟“
مولانا فرماتے ہیں۔

برخوردار! چونکہ آج کے دن کا بکرہ ہم گناہگاروں

کا وسیلہ بن کر زنج ہو گا۔ اس لئے احتیاط اس بات
کی کی جاتی ہے کہ وسیلہ بے عیب ہو۔
صاحبانے ذوق ہے!

یہاں تو میں بھی قائل ہو گیا کہ اگر بکرے کو بھی وسیلہ بنا لیا
جائے تو بے عیب ہونا چاہیے۔ کیونکہ جب تک وسیلہ بے عیب
نہیں ہو گا۔ اس وقت تک کسی گناہ گار کی بخشش نہیں ہو سکتی۔

عزیز بچو! اس دفعہ تو میں بھی عجیب کشش میں مبتلا ہو گیا۔ بحیثیت
مولوی ہونے کے میں بھی سال میں ایک بکرا زنج کر بیٹھتا ہوں حالانکہ بقول مولوی
صاحب یہ بدعت ہے مگر کیا کروں اس کے بغیر گذار بھی نہیں ہوتا۔ گذشتہ
سال کی طرح اس سال بھی محلے والوں کی شرم کی وجہ سے مجھے بھی بکرا زنج کرنا پڑا
حالانکہ بکروں کا عالم یہ تھا کہ جس بکرے کو دیکھتا وہی منہ بنا کر کھڑا ہو جاتا۔ گویا
انہی مہنگائی تھی۔ بالآخر مجبوراً ایک عمدہ سا بکرا خریدنا پڑا جس کے سینک بہترین
کان بہترین۔ خوب موٹا تازہ پلاٹھا پہلے تو اسے پورے محلہ میں گھماتا کہ پڑوسی بھی
دیکھ لیں کہ مولوی صاحب نے بکرا خرید کیا ہے۔ رات کو گھر سے باہر باندھا۔

چارہ قریب تک نہ آنے دیا کیونکہ بھوکا رہنے سے رات بھر بولے گا تو وہ پڑوسی
جو دن کو نہ دیکھ سکے ہوں رات کو اس کی آواز سن لیں تاکہ میری قربانی کا
ان پر بھی رعب پڑ جائے۔ بہر نوع دن چڑھے قربانی کا وقت آ گیا۔

جب قصائی بکرا ذبح کرنے کے لئے اپنی آستین چڑھانے لگا تو اچانک وہ
حسرت تشریف لائے جن سے بکرا خرید گیا تھا۔ وہ آتے ہی چلانے لگے۔
”زیدی صاحب! غضب ہو گیا۔ خدا را اس بکرے کو ذبح نہ کیجئے گا۔“

میں نے پوچھا ”کیوں۔ کیا بات ہے؟“

اُس نے کہا۔ زیدی صاحب ! یہ بکرا ہے تو بہت ہی عمدہ بظاہر
اس میں کوئی عیب نہیں ہے۔ گھر کا پلا ہوا ہے۔ مگر جس دن یہ میرے گھر
میں پیدا ہوا تھا اس کی ماں مر گئی تھی لہذا میں نے اپنی کُتیا کا دودھ
پلا کر اسے پروان چڑھایا ہے۔

سامعین !

بکرے والے کی یہ بات سن کر میرے چہرے کا رنگ زرد ہو گیا اور
پورا بدن غصہ سے کانپنے لگا اور گہرا کر مسلمانوں کے ہر مکتب
فکر کے مولوی سے جا کر پوچھا مگر ہر ایک نے یہی جواب دیا کہ اس
بکرے کا ذبح کرنا حرام ہے کیونکہ یہ تو بہت ہی عیب دار ہے۔

میں نے عرض کی ”مولانا ! عیب دار ہو گا مگر اب تو بہترین
عمدہ اور اچھا تندرست ہے“

میری یہ بات سن کر مذاہب اسلام کے تمام مولوی صاحبان کا متفقہ
فیصلہ یہ ہوا کہ ہم آج کے بے عیب ہونے کو کیا کریں اسکی
تو ابتداء ہی با ست میں گزری ہے۔ لہذا جس کی ابتداء
مجا ست میں گزری ہو اسے وسیلہ نہیں بنایا جا
سکتا چاہے بکرا ہی کیوں نہ ہو۔

بزرگانِ منے !

میں عرض کر رہا تھا کہ ہر انسان اپنے معبود کا مسلم ہوتا ہے اور ہر بچنے والا
اپنی پوجا کا مسلم ہوتا ہے۔ ہر انسان کی اپنی مرضی ہے کہ وہ جس کو چاہے مان لے۔
چاہے وہ اللہ ہو یا قادر مطلق ہو۔ پیدا کرنے والا ہو یا مارنے
والا ہو۔ حتیٰ کہ سانپ ہو یا بچھو ہو گاٹے ہو یا گنگا ہو۔

غرض انسان اپنی عقل کے مطابق کسی نہ کسی شے کا مسلم ضرور ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ انسان جس کو مان رہا ہے وہ بھی اسے مانتا ہے یا نہیں بہر حال ہر انسان کسی نہ کسی کا مسلم ضرور ہوتا ہے۔

کیوں تو جوانوں! میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟

دیکھو!

تم سے اس لئے پوچھتا ہوں کہ تم میرے پاس بیٹھے ہوئے ہو اور صحابیوں کو اپنی ہر بات کا راوی رکھنا چاہیے۔

یاد رکھو!

پتھر کو پوجنے کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ انسان کو ٹوکنے والے سے نفرت ہوتی ہے اور نہ ٹوکنے والے سے محبت ہوتی ہے۔ گویا انسان فطری طور پر ٹوکنے والے کو ناپسند کرتا ہے اور نہ ٹوکنے والے کو پسند کرتا ہے۔ لہذا انسان نے سوچا کہ اگر اللہ کو مان لیا جائے تو وہ ہر قدم پر ٹوکتا ہے۔ کہ تم جھوٹ کیوں بولتے ہو۔ کسی کو ستاتے کیوں ہو۔ کسی کا مال کھاتے کیوں ہو۔ گویا اللہ رات دن ٹوک ٹوک کر انسان کا ماطقہ بند کر دیتا ہے۔ لہذا انسان نے چاہا کہ ٹوکنے والے اللہ کو چھوڑ دے اور خود ایسے اللہ بنا جو ٹوکتے نہ ہوں۔ پوچھ لو تو وہ اکہ وا کہ نہیں کہتے اور توڑ دو تو بول نہیں مانتے اور چونکہ انہیں پتہ ہے کہ ہم انسان کے بنائے ہوئے ہیں۔ لہذا اگر انسان کی مرضی کے خلاف کچھ کہیں گے تو یہ ہمیں توڑ بھی دے گا۔ اس لئے یہ بہت شریفانہ بھلے مانس بنے ہوئے بیٹھے رہتے ہیں۔ اگر انہیں گھروں میں رکھ دو تو خاموش بیٹھے رہیں گے بازار میں لے آؤ تو چپ رہیں گے۔ مسجد میں رکھ دو تو بت بنے بیٹھے رہیں گے اور اگر اللہ کے گھر میں لاکے رکھ دو تو

پتھرائی نظروں سے ایک دوسرے کو تکتے فردِ در میں گئے کہ اللہ جانے اسکے
بعد کیا حشر ہو گا مگر منہ سے کچھ نہیں کہیں گے۔ بہرِ نوع انسان نے ایسے
خاموش اور بے حس و حرکت اللہ بنائے۔

بچو!

ایک دن عالمِ تصور میں میں انسان کے بنائے ہوئے ان خداؤں
سے پوچھ رہا تھا جو اللہ کے گھر میں بیٹھے ہوئے تھے۔

”انسان کے بنائے ہوئے خداؤ، بتاؤ۔ کیا تم خدا بن
گئے ہو؟“

توں نے جواب دیا۔ مولانا!

ہم خود ہی تھوڑے آئے ہیں۔ انسان نے ہمیں بٹھا

دیا۔ ہم بیٹھ گئے اور جس دن نکال دے گا، چلے جائیں

گئے۔ ہماری ضد تھوڑی ہے۔ یہ تو بنانے والے کی

مرضی پہ منحصر ہے۔ کہ بنا دے یا توڑ دے۔

بہرِ نوع انسان نے اپنی فطری تقاضے کے تحت نہ ٹوکنے والے کو خدا

بنالیا اور ٹوکنے والے سے دُور رہنے لگا۔

نو جوانو! یاد رکھو!!

جس انسان کی دس بیس نیلیں نہ ٹوکنے والے خدا کی صحبت میں گذر

چکی ہوں تو اس کے رگ و ریشہ میں یہ بات سرائت کر جاتی ہے کہ وہ نہ

ٹوکنے والے کو پسند کرتا ہے اور ٹوکنے والے کو نا پسند کرتا ہے گویا

بُت پرستی کی عادت یہ کہلوا دیتی ہے کہ۔

”ہمیں نہ ٹوکنے والی کافی ہے“

بہر نوع انسانی فطرت ہے کہ وہ نہ ٹوکنے والی چیز کو پسند کرتا ہے اور
ٹوکنے والی شے سے نفرت کرتا ہے۔

اور یاد رکھو!

آج بھی ایسا ہی ہو رہا ہے کہ انسان ہر ٹوکنے والی شے کو نہیں چاہتا اور
نہ ٹوکنے والی شے کو چاہتا ہے۔ جس طرح ہماری اسمبلی میں چند دن پیشتر
ایک صاحب یہ کہہ رہے تھے کہ ہم جو کہتے تھے کہ ہماری حکومت عوام
پر ورہے غریبوں پہ رحم کو نبوالی ہے۔ مگر ہم نے غریبوں کو بیت
ستایا ہوا ہے کہ ٹریفک کا ایک سپاہی جو ہماری طرح کا ایک انسان
ہے۔ ہماری طرح کا گوشت پوست کا بنا ہوا ہے جسے ہماری حکومت
مرن سوڈیٹھ سو روپیہ دیتی ہے۔ وہ بے چارہ گرمی سردی
اور برسات میں چوراہے پہ کھڑا ہے۔ اشارے کر کے اس کے ہاتھ
تھک جاتے ہیں۔ کبھی دائیں گھوم رہا ہے۔ کبھی بائیں۔ گھوم رہا ہے اور
تین چار گھنٹے منواتر اسے اس عالم میں کھڑا رہنا پڑتا ہے، سپیکر
پوچھا آخر آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟

ممبر نے عرض کی۔ حضور! میرا مطلب یہ ہے کہ
اس سپاہی کو چوراہے سے ہٹا دیا جائے اور اسکی
جگہ پتھر کی ایک میز رکھ دی جائے اور اس میز پر ٹریفک
کے قوانین کی ایک کتاب رکھ دی جائے تاکہ ہر
گزرنے والا خود ہی کتاب پڑھ لیا کرے۔
میںوں خواہ مخواہ کیلئے سپاہی بے چارے کو
کھڑا کر دیا جاتا ہے گزرنے والے خود ہی اس

کتاب کو پڑھ لیا کریں گے۔ کیوں کہ صرف کتاب
 ہی تو کافی ہے،
 سامعین!

ممبر کا یہ کہنا تھا کہ "کتاب کافی ہے" کہ ساری اسمبلی اس کے
 پیچھے پڑ گئی کہ یہ حضرت جو سپاہی کو ہٹا کر کتاب لانا چاہتے ہیں، خود
 ان کی نیت کوئی جرم کرنے کی ہے۔ بھلا آج کل کی تیز رفتاری
 کے دور میں چلنے والے کو کہاں فرصت ہے کہ وہ چوراہے پہ ٹھہر کر
 پہلے ٹریفک کی کتاب پڑھ لے، پھر آگے چلے۔ اور اگر کوئی ٹھہر کر
 کتاب پڑھ بھی لے گا تو اس کے "معنی" اپنے مقصد کے مطابق ڈھال
 لے گا۔ چنانچہ جہاں پر سائیکل والا چاہتا ہے سو کہ پہلے میں چلا جاؤں۔
 تانکے والا چاہتا ہے سو کہ پہلے میں چلا جاؤں اور گاڑی والا چاہتا ہے سو کہ پہلے
 میں چلا جاؤں گو یا جہاں ہر ایک پھلا بننا چاہتا ہے وہاں کتاب
 غریب کو کون پوچھے گا۔

بھرفوخ۔ میں یہ عرض کر رہا تھا کہ ہر ایک اپنے اپنے قیاس کی بنا پر
 مسلم ہوتا ہے اور ہر ایک اپنے اپنے خیال میں اپنا اپنا راستہ اختیار کئے ہوئے
 ہے۔ اس میں کوئی جھگڑے کی بات ہے نہ ہی کوئی لڑائی کی بات ہے منزل
 مقصود تو ایک ہی ہے۔ صرف وہاں تک پہنچنے کے راستے مختلف ہیں۔
 اصطلاحی معنوں میں ان راستوں کو مذہب کہتے ہیں اور منزل مقصود
 کو "دین اسلام" کہتے ہیں

بزرگانِ من!

دین اسلام میں چند باتوں کا اظہار زبان سے کیا جاتا ہے اور

کچھ عمل سے کیا جاتا ہے۔ صرف زبان سے کہے تب بھی اسلام پورا نہیں ہوتا اور صرف بغیر زبان سے کہے، تب بھی اسلام پورا نہیں ہوتا۔ لہذا کچھ کہنا پڑتا ہے اور کچھ کرنا پڑتا ہے۔
دیکھو نا!

چاہے تم جتنی ہی لمبی بات کہو۔ مگر یہ اسلام کا اقبال ہے۔
کہ تمہاری اتنی لمبی چوڑی گفتگو، کلمہ، "ہی کہلائے گی جسے ہر شخص پڑھ کر مسلمان بنتا ہے۔ اور وہ کلمہ یہ ہے۔

لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ - مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ

یہ گویا دین اسلام کا کلمہ ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ یہ کلمہ اتنی روانی سے پڑھا جاتا ہے کہ کہیں بھی کسی قسم کی رکاوٹ نہیں ہوتی گویا "نکتہ" تک کی رکاوٹ اس کلمہ میں نہیں ہے۔

یاد رکھو!

کلمہ طیبہ کے چار اجزاء ہیں۔ لا۔ الہ۔ الا۔ اللہ

پہلا لفظ کہو "لا" جس کے معنی ہیں "کچھ بھی نہیں"

دوسرا جوڑو۔ "لا الہ" جس کے معنی ہیں "اللہ نہیں ہے" گویا

کفر ہو گیا۔

تیسرا جوڑو۔ "لا الہ الا" جس کے معنی ہیں "اللہ نہیں ہے مگر"

گویا فہم ہو گیا اور چوتھا "اللہ" جوڑو تو ایمان ہو گیا۔

بیچے اب کلمہ مکمل ہو گیا۔ بہر نوع ہمیں کہنا پڑا کہ اللہ وحدہ لا شریک

ہے اور محمد اللہ کے رسول ہیں۔ یہ کہہ کر ہم مسلمان بن گئے۔ ہم

صاحب ایمان ہو گئے۔ ہمارے دل میں شیعہ ایمانی روشن ہو گئی۔

اور ہم دائرہ اسلام میں آ گئے۔

بزرگانِ من !

چودہ سو سال سے ہم تو یہی سمجھ رہے تھے کہ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ کے کہنے سے ہمارا کلمہ مکمل ہو جاتا ہے مگر ۶۔ ستمبر ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ میں پتہ چلا کہ یہ کلمہ پڑھنے کے باوجود اگر اپنے ہاتھ سے بنائے ہوئے کو مان لیا جائے تو پھر بھی ہم غیر مسلم ہو سکتے ہیں۔ بہر نوع اسلام میں ایک کلمہ ہے جسے پڑھنے سے ہم مسلمان ہو سکتے ہیں اس کے علاوہ اسلام میں ایک عمل ہے جسے ادا ئے حق کہا جاتا ہے۔

یاد رکھو !

ادا ئے حق کے معنی صرف یہی ہیں کہ تم پر اللہ کی طرف سے جو فرائض و حقوق واجب ہیں ان کا حق ادا کرو مثلاً اگر ماں باپ ہو تو اولاد کا حق ادا کرو۔ اولاد ہو تو والدین کا حق ادا کرو۔ بھائی ہو تو بھائی کا حق ادا کرو۔ بہنوں کا حق ادا کرو۔ ماتحت ہو تو افسر کا حق ادا کرو۔ اور بندے ہو تو اللہ کا حق ادا کرو۔ گویا ادا ئے حق کو عمل کہتے ہیں اللہ کا حق یہ ہے کہ اس کی عبادت کرو۔ اور بندے کا حق یہ ہے کہ اگر کہیں لڑکھنڈے کا حق ادا کرنا پڑتا ہے تو لڑکھنڈے کو۔ اور اگر کہیں صلح سے حق ادا کرنا پڑتا ہے تو صلح سے کرو۔ گویا کہیں ادا ئے حق کے لئے لڑنا پڑتا ہے اور کہیں ادا ئے حق کے لئے صلح کرنی پڑتی ہے۔

بہر لوزخ ہر صورت میں جو تم پر فرض ہے۔ وہ حق ادا کرو۔ گویا کہیں جہاد کو کے حق ادا کیا جا رہا ہے اور کہیں تلوار روک کے حق ادا کیا جا رہا ہے۔ کہیں تلوار چلا کے حق ادا کیا جا رہا ہے۔ اور کہیں تلوار کھانے کے حق ادا کیا جا رہا ہے۔ لہذا انسان پر لازم ہے کہ جس طرح بھی حق ادا ہوتا ہو، ادا کرے۔ بس اسی ادا ئے حق کو عمل کہتے ہیں۔

سامعین!

مذہب کی بات ہے نہ عقیدت کی بات ہے بلکہ ایک غیر جانبدار تاریخی مطالعہ کی بات ہے کہ کائنات میں اسلامی حق ادا کرنے کے لئے ہمیں دو مکاتب فکر ملیں گے اور وہ ہیں علیؑ اور حسینؑ۔ لہذا علیؑ کی تعلیم کو ضرب کہتے ہیں اور حسینؑ کی تعلیم کو سجدہ کہتے ہیں۔ بس یہی دو مکتب فکر ہیں جن سے اسلام میں ادا ئے حق کی تعلیم ملتی ہے۔ گویا کہیں سربہ ضرب لگا کے حق ادا کیا جا رہا ہے اور کہیں سربہ ضرب کھا کے حق ادا کیا جا رہا ہے۔ ان کے علاوہ کسی تیسرے مکتب سے ایسی تعلیم کا ملنا ناممکن ہے۔

نوجوانو! یاد رکھو!!

یا علیؑ کہنا ہمارا ایمان ہے۔ ہمارا دین ہے۔ ہماری پہچان ہے۔ ہماری علامت ہے۔ جو ہمیں زبردستی غیروں کے ساتھ وابستہ کرنا چاہی وہ تو کہہ سکتے ہیں کہ یا علیؑ مدد کہنا ضروری نہیں ہے۔ حالانکہ یا علیؑ مدد کہنا تو ہماری دوسروں سے امتیازی نشان ہے۔ مگر یا علیؑ کہتے کہتے بھی سوتل دیا کر

کہ علیؑ نے اداۓ حق میں کیا کیا۔ کھان تلوار چلا کے حق ادا کیا اور کھان
تلوار کھا کے حق ادا کیا۔ کہیں تو علیؑ کی تلوار خنجر کی چوٹی پر
ہلا رہی ہے اور کہیں خندق کو فتح کر رہی ہے۔ کہیں
علیؑ کی تلوار اُحد و بدر میں معرکے دکھا رہی ہے اور
کہیں علیؑ کی تلوار پیام میں رکھی ہوئی ہے۔ اور اسی تلوار
کا مالک خاموشی سے سر جھکائے گردن بند ہوائے چلا آ
رہا ہے۔ گویا خنجر کے دروازے کو گرانے والا خود اپنے
دروازے کو خاموشی سے گوتا ہوا دیکھ رہا ہے۔ یہ ہے
علیؑ کی وہ ادا جس پہ کائنات مرقی ہے۔ دوسروں کے
بچوں اور عورتوں پہ رحم کرنے والا جب اپنی عورتوں
اور بچوں کو رخصی دیکھتا ہے تو خاموش کھڑا رہتا ہے۔

یا درکھو!

علیؑ کے علاوہ کسی اور سے ان اخلاقی ضابطوں کا ملنا ناممکن
ہے۔ تاریخ عالم گواہ ہے کہ علیؑ نے کتنی جدوجہد کے بعد خنجر جیسے
عظیم قلعہ کا دروازہ توڑ کر اسے فتح کیا ہے۔ حالانکہ علیؑ کو پتہ ہے
کہ خنجر کے اندر جس کا میں فاتح ہوں، کروڑوں عربوں روپے کی دولت
موجود ہے۔ مگر وہ غیور فاتح خنجر فتح کرنے کے بعد قلعہ کے اندر نہیں
جاتا بلکہ خاموش سر جھکائے خنجر کے دروازے پہ کھڑا ہے۔ چنانچہ مسلمانوں
کی فوج اندر گئی۔ لوٹ چلائی اور جی بھر کے مال غنیمت لوٹا۔ چند بزرگوں
نے پوچھ لیا۔

”یا علیؑ! تم اندر کیوں نہیں جاتے حالانکہ تم نے

ہی خیر فتح کیا ہے؟

علیٰ فرماتے ہیں۔

بھئی! اس خیال سے اندر نہیں گیا کہ قلعہ کے اندر

خیبر والوں کی عورتیں تھیں لہذا مجھے ایسے

گھر میں جاتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے جہاں

کسی کا ناموس ہو۔

بزرگانِ من!

اخلاقی تعلیم کی یہ انتہا ہے کہ خیر کا فاتح خیر کے اندر جاتے ہوئے

اچکچا رہا ہے کہ کہیں ان کا کوئی ناموس نہ ہو۔

بناؤ!

خیبر کا دروازہ کھاڑ لینے سے زیادہ یہ ادا شاد ہے یا نہیں کہ خیر کا فاتح

سر جھکائے دروازے پہ کھڑا ہے اور دوسرے مسلمان ہاں غنیمت لوٹ رہے

ہیں۔ ہم پوچھتے ہیں، ”یا علی! جانے سے ڈرتے ہو؟“

علیٰ مسکرا کر فرماتے ہیں، ”دیکھو! جان کی مجھے کوئی فکر

نہیں ہے۔ کیونکہ جان تو اللہ کی دی ہوئی ہے۔ جب چاہے

گائے لیگا۔ مگر آٹا پہ حوت نہیں آنے دینا تاکہ کوئی یہ نہ کہے

کہ محمد کا بھائی، محمد کی زبان چوس کر پلنے والا

محمد کے سینے پہ کھیلنے والا دوسرے کے زنانے

گھر میں چلا گیا۔“

حضور والا!

علیٰ کی یہ اخلاقی ضرب ہے جو اس نے خیبر میں لگائی تھی اور علیٰ

کی شجاعت کی یہ ادا اس کے بچوں کو ورثہ میں مل گئی مگر بچوں نے
بھی آن پر جان قربان کر دی۔

بتاؤ!

آن پر جان دینے کی اس سے عمدہ مثال کائنات میں کہاں مل سکتی ہے
کہ مائے نے اپنے بیٹیوں کا بازو پکڑا ہوا ہے۔ دروازے پہ کھڑی ہے
اور سامنے دشمن کی فوجوں کا ٹھاٹھیں مارتا لشکر ہے اور ماں اپنے بچوں سے
کہہ رہی ہے۔

”بچو! میدان جہاد میں جاؤ۔ شہادت مبارک
ہو مگرایا درکھو! دشمن کی فوجوں کا جھوٹ
دیکھ کر ڈگمگانہ جانا بلکہ ثابت قدم رہنا۔ تم
اپنی زبان سے کچھ نہ کہنا۔ میں تو جب دُور
بخشوں گی جب فوجیں چلا اٹھیں گے تم علی کے
نواسے ہو۔ جعفر طیار کے پوتے ہو۔“

یہ سنکر بچوں نے ماں کے قدم چوم کر قسم کھائی
”امام! ہم وعدہ کرتے ہیں کہ انشاء اللہ
ہم ثابت کر دیں گے کہ ہم نے زینب کا دُور
پیام ہے۔“

تاریخ عالم نے یہ منتظر دیکھا کہ تھوڑی دیر بعد پچاس ہزار فوج
ان دُور معصوم بچوں کو گرا کر خوشیاں منا رہی ہے۔ گویا انسانی بے حیائی
کی یہ حد ہے کہ تین دن کے بھوکے پیاسے بچوں کو گھوڑے سے
گرا کر پچاس ہزار فوج خوشیوں کے بلے بجا رہی ہے۔ باجوں

کی آواز سن کر خیموں میں کھڑی مستورات سمجھ گئیں کہ زینبؓ کے بچے گم گئے۔
بے ساختہ مستورات کے منہ سے نکلا۔

”ہائے! زینبؓ کے بچے گم گئے“

زینبؓ فرماتی ہیں ”بیسیو! ہائے نہ کہو۔ خدا را
کسی کی آنکھ سے آنسو نہ نکلنے پائے۔ دیکھتی نہیں
ہو کہ باجوں کے ساتھ میرے بچوں کی بارات
آ رہی ہے“

تھوڑی دیر بعد بچوں کے لاشے بیت الشرف میں لائے
گئے۔ زینبؓ دروازے میں کھڑی لاشوں کو تسلی رہی۔ آخر
امامؑ نے فرمایا۔

زینبؓ! دیکھو۔ تمہارے بیٹوں کے لاشے ہیں
ذرا ان کے پاس آ جاؤ۔ یہ تم سے کچھ کھنا چاہتے
ہیں“

زینبؓ آگے بڑھی۔ بچوں کے قریب آئی۔ آخر ماں تھی، دل بھر آیا۔ بڑا
بچہ تو ختم ہو چکا تھا۔ چھوٹے میں ذرا دم تھا۔ ماں نے بیٹے کے منہ کے قریب
کان لگا دیئے۔ کانپتے ہونٹوں سے ایڑیاں رگڑتے ہوئے بچہ یہ کہہ رہا تھا
”امام! اب تو مطمئن ہونا۔ ہم نے آپ کے دودھ
کی آبرور کھ لی“

زینبؓ جواب میں فرماتی ہیں۔

”بیٹو! مجھے گان نہیں تھا کہ تم اتنے باعزت ہو۔
میرے لعل! اگر جھڑکا ہوتا مجھے معاف کر دینا“

عزاء دارسید الشہداء !

یہ توفیق کی قربانی ہے جو علیؑ کی بیٹی ہے۔ جس نے فاطمہؑ کا دُور
پیہا ہے۔ مگر غیر خاندان کو دیکھو جو سیدانی نہیں ہے بلکہ اُمّتی ہے جس کا
جوان بیٹا ہے۔ اب ذرا اٹھا رہا سالہ بیٹے کی ماں کے دل سے پوچھو کہ اس کے
جذبات کیا ہوتے ہیں۔ جوان بیٹے کی لاش خیمے میں آئی ہوئی ہے۔ تمام سیلے بیاں
اکبرؑ کے لاشے پہ کھڑی رو رہی ہیں مگر بیٹا اپنے خیمے میں ہے۔
اکبرؑ تے پوچھا۔

”بابا جان ! میرا آخری وقت ہے میں اپنی

ماں سے ملنا چاہتا ہوں“

اکبرؑ کی یہ بات سنکر زینبؑ خیمے میں آئی دیکھا کہ لیلیٰؑ کبھی اپنی
فناں کے ساتھ سہارا لیتی ہے اور کبھی بائیں فٹات کے ساتھ اسی عالم
گھبراہٹ میں خیمے میں پھر رہی ہے۔ بھلا وجہ کی یہ کیفیت دیکھ کر زینبؑ
فرماتی ہیں۔

”لیلیٰ ! ادھر آؤ۔ اکبرؑ یاد کو رہا ہے“

لیلیٰؑ جواب میں فرماتی ہیں ”فاطمہؑ کی بیٹی !

میری بینائی ختم ہو چکی ہے اور مجھے خیمے کا

پردہ نظر نہیں آتا“

زینبؑ نے لیلیٰؑ کا ہاتھ پکڑا۔ اکبرؑ کے لاش پہ لائی۔ لیلیٰؑ نے اکبرؑ کے
سینے پہ ہاتھ رکھا خون میں تر ہو گیا اور لیلیٰؑ نے وہی خون آلود ہاتھ
اپنے سر کے سفید بالوں پہ مل لیا اور فرمایا۔

”اکبرؑ بیٹا ! یہ خون آلود بال تیری دادی کے

سا منے لے جاؤں گی۔ میرے لعل! یہ میرا تحفہ
 ہے جو میں فاطمہ کی خدمت میں پیش کر دگی
 سامعین کرام! یاد رکھو!

جادۂ عقل و علم کے مطابق ضابطۂ اخلاق
 کی معراج بھی ہے کہ کہیں ضرب لگا کر حق ادا
 کیا جائے اور کہیں ضرب کھا کر حق ادا کیا
 جائے۔ کہیں خاموش رہ کر حق ادا کیا جائے
 اور کہیں نیزہ پہ سوار قرآن پڑھ کر حق ادا کیا جائے
 کہیں جوان بیٹے کے پیسے ہوئے کلیجے سے نیزہ کھینچے
 ہوئے مسکرا کر حق ادا کیا جائے کہیں بڈھے ہاتوں
 پہ ششمائے کالا شہ اٹھا کر حق ادا کیا جائے۔
 غرض ہر موقع و محل کے مطابق ادائے حق کو
 ضابطۂ اخلاق کی معراج میں عمل کہتے ہیں
 جس کی تعلیم صرف علیٰ وحسین کے مکاتب
 فکر سے ہمیں مل سکتی ہے۔ چاہے وہ
 ضرب بد اللہی ہو یا سجدۂ شبیر ہی ہو
 بزرگو!

سانحہ کربلا کو گزرے آج گیارہ دن ہو چکے
 ہیں۔ اللہ جانے اہلبیت رسول آج کس عالم
 میں ہوں گے۔ آج کس بازار سے گزر رہے
 ہوں گے۔ آج کس کچھری میں کھڑے ہوں گے

خدا معلوم ! بے کس و محجور قیدیوں کی گردنوں
سے بندھے ہوئے ہاتھ بلی کسی نے کھولیں ہیں
یا نہیں۔

خدا جانے ! محمد کی بیٹیاں آج کس بازار ہیں
پھرائی جا رہی ہوں گی۔ اللہ جانے ! علی کی بیٹیوں
پہ آج کیا گذر رہی ہو گی۔

خداوند عالم بصدقہ محمد و آل محمد ہماری مجلسوں
کو قبول و منظور فرمائے اور عزاء داری سید الشہداء کی عظمت
فرمائے اور اس عزاء داری کو عزت و احترام کے ساتھ باقی رکھے۔
دنیا والو!

ہم تم سے منسنے کا حق نہیں مانگتے بلکہ ہم صرف
رونے کا حق چاہتے ہیں۔ دُنیا کی تمام خوشیاں
تمہیں نصیب ہوں، مگر ہمارا رونا ہمیں دے دو
خدا را ! ہمارے آنسوؤں پہ پابندی نہ لگاؤ
ربنا تقبل منا انک انت السميع العليم
اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّآلِ مُحَمَّدٍ



اَنَا نَاصِرُ رَسُولِ اللَّهِ

خداوند عز و جل جلالہ کی حمد و ثناء کے بعد حضرت محمد ﷺ پر درود و سلام

حضراتے گرامی قدر!

اللہ نے اپنے رسول کو جب اعلان رسالت کا حکم دیا تو فرمایا کہ عوام کو نہ نہ لگاؤ اور نہ ہی پہلک سے ابھی گفتگو کرو۔ بلکہ سب سے پہلے اپنے "اقربین" سے بات کرو۔ گویا رسول کے گرد پہلا اجتماع جو ہوا وہ اقربین تھے۔

سامعین کو ام!

علم تاریخ کے عام مفسرین، مبصرین اور محققین سے آج میں یہ پوچھنا ہوں کہ بناؤ اس آیت کی تعمیل میں رسول نے جو "اقربین" اکٹھے کئے تھے ان کی فہرست کیا ہے۔؟ چنانچہ مورخین نے ہم تک جو فہرست پہنچائی ہے ان میں صرف اولاد عبدالمطلب کے مرد اور خواتین جمع تھے۔ ان کے علاوہ نہ ہی خدیجۃ الکبریٰ ہیں اور نہ ہی ان کا کوئی عزیز یا اس دعوت میں موجود تھا۔ گویا خدیجۃ الکبریٰ کا نہ ہونا اور اولاد عبدالمطلب کا ہونا ہی یہ واضح کر گیا کہ رسول کے اقرب کون ہیں۔ خدیجۃ جتنی ہی محترم بیوی تھی مگر اقربین میں سے نہیں ہیں۔

یاد رکھو!

اب اگر ہم اقربین کی سوڈت فرض کریں گے تو بیوی کے رشتے کو

سامنے نہیں لانا ہو گا۔ گویا آج ہی سمجھ لو کہ اقربین کون ہیں۔

بہر نوع ! اقربین جمع تھے جن میں خواتین بھی تھیں اور مرد بھی تھے مڑوں میں حضرت ابولہب بھی تھے، حضرت ابو جہل بھی تھے، حضرت عتبہ بھی تھے، حضرت شعبہ بھی تھے۔ آخر اقرب تھے۔ یہ اور بات ہے کہ ”ع“ سے ”عقرب“ تھے مگر سب اقرب تھے۔ ادھر قنات کے پیچھے خواتین بھی بیٹھی تھیں جن میں حضرت صفیہ بنت عبد اللہ، فاطمہ بنت اسد۔ اُمّ ہانی بنت ابی طالب اور چھ مہینے کی بچی فاطمہ بنت محمد بھی تھیں۔

خدا گواہ ہے۔

میں نے خوب غور سے دیکھا۔ ایک ایک لفظ کو ٹوٹ ٹوٹ کر پڑھا۔ عینیں لگا لگا کے دیکھا مگر یہی دیکھا کہ اقربین کی اس دعوت میں محمدؐ کی چھ مہینے والی بیٹی تو ہے مگر اس کی بڑی بہنوں کا نام کہیں نہیں ملا۔ گویا آج نہیں ہیں تو آئندہ بھی نہیں ہیں۔ بہر نوع ان اقربین سے رسولؐ نے خطاب کیا۔

”اے میرے اقربین ! تم میں سے کون میرا ساتھ

دینا چاہتا ہے۔ دیکھو! میں غیر کا احسان نہیں

اٹھانا چاہتا اس لئے اپنوں سے گفتگو کر رہا ہوں“

صاحبانِ ذوق!

جب رسولؐ نے یہ فرمایا کہ کون ہے جو میرا ساتھ دے گا تو بڑے

بڑے بزرگ خاموش ہو گئے اور ایک کونے سے دس گیارہ سال کا بچہ

اڑھیدوں پر کھڑا ہو گیا اور بلند آواز میں کہنے لگا۔

”اَنَا نَاصِرٌ يَّارَسُوْلَ اللّٰهِ“

”اے اللہ کے رسول! میں آپ کا ساتھ دوں گا“

بیاد رکھو !

اگر بچہ اس وقت یہ کہہ دیتا " اے محمد ! میں آپ کا ساتھ دوں گا تو یہ ساتھ صرف محمد کی زندگی تک کا تھا۔ مگر بچے نے یا رسول اللہ! کہ اس بات کا عہد کر لیا کہ جب تک تیری رسالت ہے اس وقت تک میری نصرت میرے ساتھ ہے "

بہر نزع ! بچے نے ساتھ دینے کا وعدہ کیا تو رسول نے بڑھ کر سینے سے لگا لیا۔ پیار کیا اور فرمایا " بیٹا! تو نے میرا ساتھ دینے کا وعدہ کیا ہے۔ لہذا

اَنْتَ وَصِيٌّ " تو میرا وصی ہے "

اَنْتَ وَزِيْرٌ " تو میرا وزیر ہے۔ اور

اَنْتَ خَلِيْفَةٌ مِنْ بَعْدِي " میرے بعد میرے مشن کا انچارج

بھی تو ہی ہے "

رسول نے یہ وعدہ فرمایا اور بچہ مشن کے خاموش ہو گیا۔ گویا معائدہ ہو گیا اور اس معائدہ کے دو فریق ہیں۔ ایک طرف گیا "۱۰ سالہ بچہ ہے اور ایک طرف تتالیس سالہ رسول ہے۔

سامعینے !

اب بتاؤ۔ معائدہ سے پھر جانے کا احتمال کس طرف سے ہے ؟

ممکن ہے کہ بچہ اپنی بات کو بھول جائے۔ اور اگر بچہ اپنے کئے ہوئے وعدہ کو ہمیشہ نبھاتا رہے تو رسول کی طرف سے تو (معاذ اللہ) وعدہ خلافی ہو ہی نہیں سکتی اب اگر رسول اپنے وعدہ کے خلاف اسے جانشین بنائے بغیر چلا جائے تو ہم تو ادب سے کچھ نہیں کہیں گے مگر اللہ خاموش نہیں رہے گا بلکہ صاف طور پر

کہہ دے گا۔

”محمد! تم نے اس دن وعدہ کیا تھا لہذا
اگر جانشین بنائے بغیر چلے گئے تو ہم یہی سمجھیں
گے کہ تم نے رسالت کا کوئی کام ہی نہیں کیا“
صاحبانِ ذوق!

بتاؤ! آج اس بچے کو جانشین بنائے بغیر چلے جانے سے رسول
کی پوری رسالت خطرے میں ہے یا نہیں؟
بہر کیف بچے نے نصرت کا وعدہ کر لیا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ وقت آنے
پر وہ بچہ ”اپنے اس وعدہ پر کس طرح قائم رہتا ہے۔

دیکھو نا!

جب اس بچے نے نصرت کا وعدہ کیا تھا۔ اس وقت گیارہ سال کا سن
تھا۔ پیروں پر گرد پڑی ہوئی تھی۔ جیب میں خوہے کی گٹھلیاں پڑی ہوئی
تھیں۔ آنکھوں میں آشوب تھا۔ کرتے کے بن کھلے ہوئے تھے۔ گویا بالکل
بچپن کی ادا تھی۔ ادھر رسول محفلِ برخاستہ کے چلے ادھر یہ بچہ رسول
کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ جب رسول مکے کے بازار سے گزرے تو کسی بازاری
نے رسول کی طرف انگلی اٹھا کر کہا ”یہ ہے وہ رسول جو ہمارے خداؤں
کو بُرا کہتا ہے“

بسے بھائیو!

تاریخِ عالم گواہ ہے کہ ادھر اس آدمی نے یہ فقرہ کہا کہ یہی وہ رسول جو
ہمارے خداؤں کو بُرا کہتا ہے کہ ادھر سے اس بچے نے جیب سے ایک
گٹھلی نکالی اور تاک کے اسے مار دی۔ سینے پر لگی تو کڑکڑ کر باہر نکل گئی۔ اب

لوگوں نے توبہ کر لی۔ کان پکڑ لیے کہ اگر یہ بچہ محمد کے ساتھ ہوا تو ہم محمد کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔

سامعینے!

ایک دفعہ میں نے یہ بات مجلس میں کہی تو معرض کہنے لگا۔
 ”ذیدی صاحب! یہ تو حُسنِ اعتقاد ہے ورنہ
 بچے کے پھینکی ہوئی گٹھلی سے کمر ٹوٹ سکتی ہے!
 میں کہتا ہوں۔ اب تمہیں کون سمجھائے کہ اگر ابابیلے کے بچے کی پھینکی
 ہوئی مسور کے دانے کے برابر والی کنکر سے پورا ہاتھی ٹوٹ سکتا ہے
 تو بچے کے ہاتھ سے پھینکی ہوئی گٹھلی سے آدمی کا سینہ کیوں نہیں ٹوٹ
 سکتا؟“

اب معرض کہتا ہے ”ذیدی صاحب! چھوڑو۔ وہ ادر
 بات نفی“

میں نے پوچھا ”کیا بات نفی؟“
 کہنے لگا ”ذیدی صاحب! وہ تو بیت اللہ کی حفاظت
 نفی“

میں کہتا ہوں ”بھئی! اگر وہ بیت اللہ کے حفاظت نفی تو یہ رسول اللہ
 کی حفاظت تو ہاں بھی اللہ تھا۔ یہاں بھی اللہ ہے جو اُس کی
 دلیل ہے وہی اس کی دلیل ہے۔“

حضور وُالا!

بچہ رسول کے ساتھ رہا۔ ابھی موقع نہیں کہ یہ دیکھا جائے کہ یہ بچہ کئی
 تک ساتھ دے گا۔ بہر نوع اسی طرح چند سال اور گزر گئے۔ ایک دن ایسا

آیا کہ رسول کو مکہ چھوڑنا پڑا۔ گویا مکہ میں رہنا ناممکن ہو گیا۔ لہذا مکہ چھوڑ کر جانا پڑا۔ اور جانا بھی رات کے وقت ہے تاکہ کوئی دیکھنے نہ پائے چنانچہ ماہ صفر کی آخری رات ہے صبح کو رجب الاول کا چاند نکلنے والا ہے اور رسول ہجرت کی تیاری فرما رہے ہیں۔

بتاؤ! صفر کی آخری رات کتنی اندھیری ہے۔ آج اس اندھیری رات میں جانا ہے کیونکہ کوئی دیکھنے نہ پائے۔ (دھڑکنوں نے گھر گھرا ہوا ہے اور جانا بھی ضروری ہے۔)

سَامِعِینَ !

ہماری اماں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب میں دن کے وقت اپنے گھر میں، اپنی سوئی کھودیا کرتی تھی اور سورج کی روشنی میں وہ سوئی نہیں مل سکتی تھی مگر رات کو جب رسول گھر تشریف لانے تھے اور ابھی صحن میں ہی ہونے تھے تو ہجورے میں اتنی روشنی ہوتی تھی کہ دن کی کھوئی ہوئی سوئی رسول کے چہرے کے نور کی روشنی میں مجھے نظر آ جاتا کرتی تھی۔

اب بتاؤ! (معاذ اللہ) ام المومنین کی کہی ہوئی بات غلط ہو سکتی ہے؟ ہرگز نہیں۔ گویا جس رسول کا چہرہ سورج کی شعاعوں سے بھی زیادہ روشن ہو تو ایسے روشن چہرے والا آدمی جس گھر میں سوئے گا تو وہ پورا گھر رات کے وقت دن کی طرح روشن ہو گا یا نہیں؟ اور جب گھر سے باہر چلا جائے گا؟ تو گھر میں اندھیرہ ہو جائے گا۔ اور جو لوگ گھر گھیرے کھڑے تھے وہ اندھا دیکھتے ہی سمجھ جائیں گے کہ رسول گھر سے باہر چلے گئے ہیں۔

لہذا اب رسول کو اس بات کی ضرورت ہے کہ جانے سے پہلے ایسا انتظام کرے کہ اس کے بعد روشنی میں کمی نہ آنے پائے گویا گھر اسی طرح

روشن رہے جس طرح رسول کی موجودگی میں روشنی رہتا تھا۔

بہر ذع رسول نے ایسا انتظام فرما دیا کہ اس کے بعد بھی گھر روشن رہا۔ اب میں اس تفصیل میں کہاں پڑوں کہ کس طرح انتظام فرمایا۔ بہر ذع رسول نے جو مناسب سمجھا کر دیا۔ لیجئے اس روشنی کا دوسرا پہلو ملاحظہ فرمائیے

دیکھو نا !

میں اپنے گھر سے چھوٹ کر باہر جانا چاہتا ہوں تاکہ کوئی مجھے دیکھنے نہ پائے اور ہاتھ میں جلتا ہوا ایک گیس پکڑ لوں تو بتاؤ وہ گیس کی روشنی مجھے بجھنے دے گی ؟ ہرگز نہیں۔ میں چاہے جتنا ہی چھپ کر جاؤں مگر وہ روشنی بتا دے گی کہ میں جا رہا ہوں۔

حضور والا !

سمجھ نہیں آتا کہ رسول نے اپنے گھر میں روشنی کا انتظام تو کر لیا ہوگا مگر خود جس گلی سے گزرے گا تو رسول کے چہرے کی روشنی ہی بتائے گی کہ وہ جا رہا ہے۔ لہذا رسول کو ایسا انتظام بھی کرنا چاہیے کہ چہرے کے نور کی روشنی چھپی چلی جائے۔ بہر ذع رسول نے جہاں اپنے گھر میں روشنی کا انتظام فرمایا وہاں اپنے ساتھ ساتھ اندھیرے کا انتظام بھی کر لیا ہوگا۔ تاکہ نور کسی کو نظر نہ آئے اور ظلمات کے سائے میں چھپا رہے

بہر ذع رات کا وقت ہے رسول نے گھر سے جانا ہے اور دشمنوں نے گھر گھیر رکھا ہے مگر جانا بھی ضرور ہے۔

بچو ! اب تم ہنسو گے مگر میں کہہ رہا ہوں جو

میں نے کہنا ہے۔

دیکھو نا !

میں لاہور سے کوچی پہنچا اور آپ کے گھر میں
ٹھہر گیا۔ آپ نے میرے لئے بہترین کھانا پکوا یا
بہترین بستری چھوایا۔ کھانا کھا کر سونے کیلئے
رات کو بستر پہ لیٹ گیا۔ آدھی رات کے قریب
گھر کا مالک گھبرا یا ہوا میرے پاس آیا اور کہنے
لگا۔ "زیدی صاحب! غضب ہو گیا۔ دشمنوں
نے میرا گھر گھیر رکھا ہے،

میں نے پوچھا "بھئی۔ خیریت تو ہے۔ بڑے پریشا
ن ہو" وہ بولا "زیدی صاحب! خیریت بالکل نہیں
دشمنوں نے مساح ہو کر میرا گھر گھیر رکھا ہے
لہذا خطرہ ہے۔

ابے بناؤ!

جب گھر کا مالک اتنا خطرہ محسوس کر رہا ہو تو مجھ جہان پر کیا گزری
ہوگی؟ یقیناً میں اس سے زیادہ ڈر جاؤں گا۔ لہذا میں بھی اٹھ کے
بیٹھ گیا اور کہنے لگا۔

"اگر اتنا خطرہ ہے تو میں کیا کروں؟"

وہ بولا۔ "زیدی صاحب! خطرہ بہت زیادہ ہے، دشمنوں نے
گھر گھیر رکھا ہے"

میں نے پوچھا "پھر میں کیا کروں؟"

وہ بولا "میں جا رہا ہوں۔ کیونکہ خطرہ ہے"

میں نے گھبرا کے پوچھا، ”ہیں؟“
وہ بولا، ”تم یہیں رہو۔ کیونکہ خطرہ ہے“
سامعین!

بتاؤ۔ اگر میں انکار کر دوں کہ ”ہیں تو اس خطرے
میں نہیں رہنا چاہتا“ تو میرا یہ کہنا اخلاقیات کا کوئی
بڑا ہموگا؟ ہرگز نہیں۔

بس بھائیو!

اب ساری کائنات کی نظریں علی پہ لگی ہوئی ہیں کہ جواب میں کیا
کہتا ہے۔ کیونکہ گھر کے مالک، جس کا چار آدمی لحاظ کرتے ہیں، وہ تو
گھر چھوڑ کر جاتا رہا ہے کیونکہ خطرہ ہے اور دوسرے کو یہ کہتا ہے کہ تم
یہیں رہو۔ کیونکہ خطرہ ہے۔

گو کیا جو جاتا رہا ہے۔ اس کی عمر تریپن سال کی ہے اور جے گھر چھوڑ
رہا ہے اس کی عمر انیس سال کی ہے۔ جس کے جینے کے دن ہیں۔ زندہ رہنے
کا زمانہ ہے۔ اُسے کہا یہ جاتا رہا ہے۔

”برخوردار! تم یہیں رہو کیونکہ خطرہ ہے“

اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ بچہ جواب میں کہتا کیا ہے؟

مگر کائنات نے دیکھا اور چشم فلک نے ستاروں کی عینک لگا کر دیکھا
کہ وہ بچہ جو نصرت کا وعدہ کر چکا ہے۔ رسول کے کہنے پر کہ ”تم یہیں رہو
کیونکہ خطرہ ہے“ یہ شکر۔ مسکرا کر جواب دیتا ہے۔

”محمد! گھبراؤ نہیں۔ میں یہاں ہوں۔ تم جا

سکتے ہو۔“

بس صاحبانے!

بچے کا یہ کہنا تھا کہ کائنات سے ”واہ واہ“ کی آوازیں آنے لگیں
اور چشم فلک نے ستاروں کی عینک لگا کر یہ منظر دیکھا۔ دنیا بھر نے
سبحان اللہ کہا بہ نوح بچہ یہ کہہ کر لپٹنے لگا کہ رسول نے فرمایا۔

”بیٹا! ابھی ٹھہرو۔ دیکھو نا! تمہارے بستر پہ
کوئی خطرہ نہیں۔ اصل خطرہ تو ہمارے بستر پہ ہے لہذا ہمارے
بستر پہ لیٹ جاؤ۔“

چنانچہ وہ بچہ رسول کے بستر پہ لیٹ گیا اور فرمایا۔
”قبلہ! میں لیٹ گیا ہوں۔ اب آپ جاسکتے
ہیں۔“

رسول نے فرمایا ”تھیں۔ صرف لیٹنا ہی ضروری نہیں
ہے۔ کیونکہ تم ”تتم“ ہو کے لیٹے تو پھر کوئی
خطرہ نہیں لہذا تم ہمارے بستر پہ ”ہم“
بن کر لیٹو کیونکہ خطرہ ہے۔“

اور دیکھو!
تم سے اچھی طرح سے ”ہم“ نہیں بنا جاسکا
لہذا ہم خود تمہیں ”ہم“ بناتے ہیں،
یہ کہہ کر رسول نے بچے کو پیش کر اپنا عمامہ اس کے سر پر رکھ دیا
اور اپنی چادر اوپر اوڑھا دی اور غور سے دیکھا اور فرمایا۔
”کیوں بیٹا! بن گئے ہم“

بچے نے عرض کی ”قبلہ! ہاں۔ بن گئے ہم“

ادھر ہم نے عرض کی "یا رسول اللہ ! یہ کیا بنا رہے ہو؟
 رسول نے فرمایا "میں اسے ہم" بنا رہا ہوں"
 ہم نے عرض کی "قبلہ ! کیا یہ ہم بن گیا؟"
 رسول نے فرمایا "نہیں - میں نے اسے "ہم" کی شبیہ بنایا ہے"
 گویا یہ بچہ محمد نہیں بنا بلکہ محمد کی شبیہ بنا ہے"
 ہم نے عرض کی "قبلہ ! شبیہ کس طرح بنائی؟"
 رسول نے فرمایا "عمامہ رکھ کے، چادر ڈال کے شبیہ بنائی"
 گویا عمامہ رکھ کے، چادر ڈال کے شبیہ بنا ناسنت
 رسول ہے -

سَامِعِین !

یہ کہہ کر رسول چلے گئے اور سونے والا بستر رسول پر سو گیا۔ اور بستر کی
 سلوٹ گواہ ہے کہ صبح تک سونے والے نے کروٹ ہی نہ بدلی اور ادھر کبھی نہ
 سونے والے نے سونے والے کو دیکھا۔ سونا پر کھا بالکل کھرا سونا
 بڑا جواب سونا۔ چنانچہ اعلیٰ حضرت نے کہا -

"محمد ! سنتے بھی ہو۔ ایسا سونا روز بروز نہیں ملتا لہذا آج اسے ہمنا

خرید لیں"

رسول نے عرض کی "خدا وندا ! اگر تو خریدنا چاہتا

تو خرید لے"

اعلیٰ حضرت نے کہا "محمد ! سونے والے سے ہماری

بات کو وادو"

چنانچہ محمد نے وہیں سے آواز دی "سونے والے !"

سونے والے نے عرض کی ”قبلہ ! کیا حکم ہے ؟“
 رسول نے فرمایا ”سونے والے ! سونا بیچتے ہو؟“
 سونے والے نے عرض کی ”جی ہاں۔ بیچتے ہیں“
 رسول نے پوچھا ”کیا لوگے؟“

سونے والے نے پوچھا ”خریدار کون ہے؟“
 رسول نے فرمایا ”اللہ“

سونے والے نے پوچھا ”وہ کیا دے گا؟“
 رسول نے فرمایا تم کیا لوگے؟

سونے والے نے کہا ”قبلہ ! تم بتاؤ۔ وہ کیا دیگا؟“
 آخر جب بڑی دیر ہو گئی تو سونے والے نے یہ کہہ کر فیصلہ کیا کہ۔
 ”جب سونے کا اللہ خریدار ہے تو اس سے جھگڑا کیا کرنا ہے۔“
 جو اس کی ”مرضی“ ہو وہ دے دے دے“
 بہر نزع ”خدا کی مرضی“ سونے کی قیمت ہو گئی۔ سونے والے
 نے عرض کی۔

”خدا وندا ! یہیں ہماری قیمت دو“
 خدا نے فرمایا ”یوں نہیں۔ آج ہم تمہیں قیمت نہیں دے
 سکتے۔ یہ ہم پر اُدھار رہی۔ انشاء اللہ قیامت
 کے دن ادا کر دیں گے“

سونے والے نے عرض کی۔ ”خدا وندا ! سودا پکا کرنے
 کے لئے کچھ بیانہ چاہئے“
 خدا نے کہا ”ٹھیک ہے۔ قیمت تو قیامت میں ملے گی

مگر بطور بیان ہم تمہیں "جنت" دیتے ہیں۔

لہذا آج سے تم اسے اپنے قبضہ میں کو دو،

چنانچہ رات کو جنت قبضہ میں آگئی۔ اب جو صبح کو اُٹھے تو مالکِ جنت تھے۔ سال بعد جو بڑے گھر کی بیٹی سے شادی ہوئی تو اپنی دہن کو منہ دکھائی میں وہی رات والی جنت دے دی۔ گویا شوہر نے حاصل کی اور بیوی خاتونِ جنت کہلائی۔ ادھر بیوی نے یہ کیا کہ شوہر والی جنت کو بچوں کے نام منتقل کر دیا اور رسول نے انتقال کی تصدیق فرمادی۔

”الحسن والحسين سيد اهل الشباب جنة“

گویا خدا کی دی ہوئی جنت باپ نے خریدی مائِ خاتونِ جنت بنی اور بچے مالکِ جنت بنے۔ اب یہ جنت ان مالکوں کی ہے۔ لہذا ان سے تشاخص نہا۔ ان سے واقف رہنا۔ ان سے متعلق رہنا کیونکہ جنت میں جانے کے لئے ان کی واقفیت کام آئے گی۔

سَامِعِينَ !

اب ہم پوچھتے ہیں ”خداوند! جنت دے گا؟“

اللہ جواب میں فرماتا ہے ”کیوں خواصخواہ کے لئے میوا

سُکھاتے ہو۔ جاؤ۔ اس سے بات کرو جس نے

خریدی ہے۔ جنت جانے اور اس کی مرضی جانے

کیونکہ میں تو مرضی کے عوض جنت بیچ چکا ہوں۔“

حضور والا !

مکہ سے ہجرت فرما کر رسول مدینے تشریف لائے اور جہاں جہاں بھی رسول کو نصرت کی ضرورت پڑتی رہی وہاں وہاں نصرت کا وعدہ کرنے والا رسول

کی نفرت کرتا رہا۔ گویا جب رسول نے نفرت کے لئے پکارا نفرت کرنے والا
نفرت کے لئے پہنچا رہا۔

بہر نوع۔ اللہ نے نفرت کرنے والے کو حسن و حسین جیسے دو بیٹے عطا
فرمادیئے۔ ادھر علیؑ دیکھ دیکھ کے بڑے خوش ہوتے اور فرماتے۔

”یا اللہ اتنی راسخ رہے کہ تو نے مجھے حسن و حسین عطا

فرزند عطا فرمائے ہیں لہذا میں نے جو نصرت

رسول کا وعدہ کیا تھا، میرے بعد میرے بیٹے

اس وعدہ کو پورا کریں گے“

صحابائے!

ادھر علیؑ خوشی کر رہے تھے کہ رسول پر آیہ مبارکہ نازل ہوئی

”اے رسول! جب کل عیسائیوں کے مقابلے میں جاؤ۔ تو

”اَبْنَاءُ نَاوْ اَبْنَائِکُمْ“ اپنے بیٹوں کو لے کر جانا

”نِسَاءُکُمْ“ اپنی نساء کو لیکر جانا۔ اور

”اَنْفُسُکُمْ“ اپنی جان کو لیکر جانا“

حضور والا!

اب جو یہ آیت رسول پر نازل ہوئی تو تمام کائنات نے سنی کہ

رسول کل اپنے ساتھ اپنے بیٹے، نساء اور جان کو لیکر جا بیٹھ گئے

لوگوں کو رسول کی جان کی تو پہلے ہی جان پہچان تھی کہ جان بگو

کون جائے گا۔ اور نساء کے متعلق بھی اطمینان تھا کہ چشم بد دور نو

بیویاں موجود ہیں۔ بیٹی بھی موجود ہے مگر ابناء کے متعلق ہر جگہ ذکر

ہو رہے تھے۔ کیونکہ اچھے شاگرد اپنے استاد کے بیٹے ہوتے

ہیں۔ اور اچھے مزید اپنے پیار کے بیٹے ہوتے ہیں۔
لہذا لوگوں نے سوچا ”آخر ہم رسول کی اُمت ہیں۔ کل کو ہم
میں سے ہی کوئی بیٹا بنے گا“

چنانچہ ساری رات مدینے کے بازار کھلے رہے۔ دکانوں پر چائیں
بنتی رہیں۔ غسل ہوتے رہے۔ کپڑے بدلے گئے۔ عطر لگائے گئے۔
رات بھر تیاریاں ہوتی رہیں کہ کل کو رسول کا بیٹا بن کے جائیں گے۔
گویا رات بھر بستر پر کڑوٹیں بدلتے رہے اور صبح کی نماز کے وقت مسلمانوں
سے مسجد نبوی چھلک اٹھی۔ رسول نے نماز پڑھاٹی۔ نماز پڑھنے کے بعد مڑ کے
دیکھا اور یہ آیت پڑھی ”وَقُلْ نَدْعُوا ابْنَانَا وَابْنَتَنَا مَعَنَا“

رسول کی آواز سنکر ہر صف سے آواز آئی ”قبلا! میں بھی ہوں“
تھوڑی دیر بعد رسول نے فرمایا ”حسین بیٹا! ادھر آؤ“
حسن تشریف لائے۔ پھر فرمایا ”حسین بیٹا! تم بھی آؤ“
حسین بھی تشریف لائے۔ جب دونوں شہزادے آگئے تو رسول نے
ایک شہزادے کو دائیں طرف بٹھایا اور دوسرے شہزادے کو بائیں طرف بٹھایا
اور سامعین کی طرف مسکرا کر فرمایا۔

”مسلمانو! دیکھو۔ یہ میرے ”ابناء“ ہیں۔ مسلمانوں میں سے کسی نے
عرض کی ”قبلا! ہم؟“

رسول نے فرمایا ”تم۔ اب نہ آنا“
بہر نوع رسول نے کہہ دیا کہ یہ ہیں میرے ”ابناء“۔
اور یاعلیٰ! دیکھو۔ تم میری جان بن کر چلو“
سامعین! رہ گیا لساٹنا ”اس ضمن میں عرض یہ ہے کہ

عزنی کی لغت میں نساء کے تین معنی ہیں " ماں " بیوی " یا " بیٹی "۔
اب اگر " ماں " تصور کریں تو وہ اس آیت کے نزول سے پہلے ہی فوت
ہو چکی تھی۔ معلوم ہوا کہ " نساء " سے مراد یا تو بیوی ہے یا " بیٹی "۔ اگر رسول
نے سوچا کہ اگر بیوی کو لے جاؤں تو بیٹی بڑا مان جائے گی اور اگر بیٹی کو
لے جاؤں تو بیوی بڑا مان جائے گی۔ چنانچہ رسول نے فرمایا:-

" یا علی ! تم میرے ساتھ میری "جان" بن کر چلو۔
حسنین بیٹا ! تم میرے ساتھ میرے بیٹے بن کے
چلو۔ اور سیّدہ ! تم ہمارے ساتھ "نساء"
بن کے چلو۔ تاکہ ساتھ جانے والوں میں سے کسی
کی بیٹی بن جاؤ۔ کسی کی "ماں" بن جاؤ اور کسی کی

"بیوی" بن جاؤ۔ "

بہر کیف رسول اپنی "جان" بیٹوں اور نساء کو لیکر میدان
مباہلہ سے کامیاب ہو کر گھر کو جو لوٹے تو علیؑ و سیّدہ بڑے خوش تھے
حسنین بھی خوش خوش کھیلتے ہوئے گھر آ گئے۔ اب جو حسنین کو آتے دیکھا
تو علیؑ و فاطمہ دونوں تعظیم کو کھڑے ہو گئے۔

بچوں نے عرض کی " بابا جان ! یہ کیا ہو رہا ہے ؟ "

علیؑ و سیّدہ نے عرض کی " شہزادو ! اس آیت سے پہلے تم ہمارے
بیٹے تھے۔ مگر اس آیت مباہلہ کو اُتار کر اللہ نے تم دونوں کو محمدؐ کا بیٹا
بنا دیا ہے۔ لہذا اب تم فرزند رسول ہو۔ اب قیامت تک تنہا رہی زیارت
یہ کہہ کر پڑھی جائے گی۔ اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ يَا بُنَّ رَسُوْلِ اللّٰهِ " لہذا اب
ہم تمہیں اپنا بیٹا نہیں کہہ سکتے بلکہ دونوں آج سے رسول کے بیٹے ہو

اس لئے تمہاری تعظیم ہم پر فرض ہے ۔

سامعین !

دن گذر گیا ۔ رات آئی ۔ رات کو دونوں شوہر بیوی ۔ علیؑ و فاطمہؑ
دھو کر کے مٹھے بچھا کر بیٹھ گئے اور خداوند عز و جل ملائکہ کی خدمت
میں عرض کرنے لگے ۔

”خداوند اے ہم تو خوش تھے کہ تو نے ہمیں حسن و حسین جیسے فرزند
عطا کئے ہیں مگر آج آیہ مباہلہ کے بعد حسین محمدؑ کے بیٹے ہو گئے“

علیؑ نے کہا ”خداوند اے میں تجھ سے التجا کرتا ہوں کہ جب حسن و حسین
محمدؑ کے بیٹے ہیں تو ایک بیٹا مجھے بھی عطا کر دے جو دنیا میں میرا بیٹا ہو سکے
رہے ۔ چونکہ میں نے محمدؑ کی نصرت کا وعدہ کیا ہے ۔ لہذا ایسا بیٹا عطا فرما
جو میرے بعد محمدؑ کے بیٹوں کی نصرت کے وعدے کو پورا کرے“

ادھر سیدہ نے دعا کی ۔ ”خداوند اے علیؑ کو ایسا بیٹا دینا جو علیؑ
کا وارث بنے ۔ مگر مجھے بھی ایک بیٹا دے دے جو میری وارث
بن کے رہے ۔

خدا نے کہا ۔ ”علیؑ تمہاری دعا بھی قبول ہوگی اور سیدہ
تمہاری دعا بھی منظور ہوگی ۔ تم دونوں کو ایسے
بیٹے دوں گا جو قیامت تک تمہارے نام کو زندہ رکھیں
گے ۔

سامعین کو ام !

میں اپنی گفتگو کو یہاں آ کر ختم کرتا ہوں کہ ایک دن حضور امیر علیہ السلام
نے اپنے بڑے بھائی جناب عقیلؑ کو بلوایا اور حجب عقیلؑ لٹریٹ لائے

تو عرض کی۔

”عقیل بھائی! تم میرے بڑے بھائی ہو اور بڑا
بھائی دنیا میں باپ کے برابر ہوتا ہے۔ آج میں
آپ کو تکلیف دیتا ہوں کہ آپ عرب کے تمام قبیلوں
سے واقف ہیں لہذا آپ میری شادی کسی ایسے
قبیلے میں کروادیں جو عرب بھر میں شجاعت میں
مُسلم ہوتا کہ بھادر قبیلہ کی خاتون سے جو میرا
بیٹا پیدا ہو وہ میری ”بھادری کا وارث“ کہلائے
غفیل نے جواب دیا۔

”یا علی! عرب میں بہادر ترین قبیلہ ”بنی کلاب“ ہے لہذا میں
آج ہی ان کے پاس جا کر تمہاری خواستگاری پیش کرتا ہوں
سامعین!

قبیلہ بنی کلاب بڑا ہی بہادر قبیلہ تھا اور عرب کے مشہور بہادر اپنی تلواروں
پراس قبیلہ کے بہادروں کے نام کندہ کروایا کرتے تھے۔ گویا بہادر قبیلہ تھا
اتفاق سے ان دنوں مدینہ کے قریب ہی بنی کلاب ٹھہرا ہوا تھا۔ چنانچہ
صبح کو عقیل وہاں پہنچے اور ایک خلستان میں جا کے بیٹھ گئے اور سردار قبیلہ
کو اطلاع کر دی۔ شیخ قبیلہ اپنے جوانوں کے ساتھ وہاں پہنچا۔ جب اس نے
دیکھا کہ عقیل ابن ابی طالب ہیں تو فوراً پاؤں پر گر گیا اور عرض کی۔

”ابی طالب کے شہزادے! بیضۃ البدن کے بیٹے!
امام العرب کے بیٹے! سید القوم کے فرزند!
آپ ہمارے قبیلے کے پاس آئے ہیں۔ ہماری

عزت بڑھی۔ غلاموں کے خیمے موجود ہیں لہذا
 ہمارے خیموں میں فروکش ہوں۔
 چنانچہ عقیل شیخ قبیلہ کے خیمے میں تشریف لائے اور تین دن کی مہمانی
 کے بعد شیخ قبیلہ دست بستہ سامنے کھڑے ہو کر عرض کرنے لگا۔
 حضور! ہم تو گستاخی مگر پوچھ سکتا ہوں
 کہ حضور نے کیوں تکلیف فرمائی؟
 عقیل نے کہا: ”شیخ! تم علی ابن ابی طالب کو جانتے ہو؟
 شیخ نے عرض کی: ”سبحان اللہ۔ علی کو کون نہیں جانتا۔ کوئی
 بے جان ہی ہو گا جو علی کو نہ جانتا ہو۔“
 عقیل نے کہا: ”شیخ! تمہارے خاندان میں علی کی
 شادی کرنا چاہتا ہوں۔“
 شیخ قبیلہ حیران ہو کے پوچھتا ہے۔
 ”قبیلہ! علی کی شادی ہمارے خاندان میں چاہتے
 ہیں؟ ہمارے خاندان کی اتنی عزت کہ علی ہمارا
 کاحاد بنے؟ حضور! میری ایک ہی لڑکی ہے اسے
 اپنی غلامی میں قبول فرمائیے گا۔“
 یہ کہہ کر شیخ قبیلہ گھر آیا اور بیوی سے کہنے لگا۔
 ”سنتی بھی ہو۔ بیٹی کا رشتہ آیا ہے۔ مبارک ہو۔“
 بیوی نے پوچھا: ”کہاں سے آیا ہے؟“
 شیخ نے کہا: ”پہلے دو رکعت نماز شکرانہ پڑھو۔ پھر بتاؤں گا۔“
 چنانچہ جب خاتون نے دو رکعت نماز پڑھ لی تو شیخ کہتا ہے۔

علیٰ کا رشتہ آیا ہے۔

بیوی پوچھتی ہے ”کون علیٰ؟“

شیخ کہتا ہے ”علیٰ ابن ابی طالب“

یہ شکر بیوی حیران ہو کر پوچھتی ہے۔

”شیخ ! وہی علیٰ جو محمدؐ کا داماد ہے؟“ وہی

ہمارا داماد بنے گا۔ سبحان اللہ اس رشتے سے

بہتر تو کوئی رشتہ ہے ہی نہیں۔“

چنانچہ رُک سے جب پوچھا گیا تو اس نے جواب دیا۔

”میں اتنا جانتی ہوں کہ رات خواب میں ایک

خاتون میرے پاس آئی تھی۔ جس نے مجھے دُلعن

بنایا اور فرمایا تھا۔

مبارک ہو۔ تو میرے بیٹے کی ماں بنے گی۔“

بہر نوع رشتہ منظور ہو گیا۔ نکاح ہوا اور ام البنین کو بنی ہاشم

اپنے جھڑپ میں لیکر علیٰؑ کے گھر لائے۔ ڈیوڑھی کے سامنے ناتھ

بٹھایا گیا۔ ام البنین محل سے اُتریں۔ چوکھٹ کو چومنا اور چوکھٹ پہ باکے

بیٹھ گئی۔ بنی ہاشم نے کہا۔ ”بی بی ! اندر چلیے۔“

ام البنین نے فرمایا ”نہیں۔ اس گھر کی مالکہ فاطمہؑ ہے۔ میں تو فاطمہؑ

کی ادنیٰ اسی کینز ہوں۔

زینبؑ آگے بڑھی اور عرض کی۔ ”اماں آؤ نا۔“

ام البنین نے کہا۔ ”بی بی ! مجھے اماں نہ کہو۔ میں تمہاری کینز ہوں۔

تمہارے باورچی خانے میں خدمت کرنے آئی ہوں۔“

بہر کیف اُم البنین علیؑ کے گھر میں آگئیں اور ایک سال بعد خدائے بطن اُم البنین سے علیؑ کو ایک بیٹا عطا فرمایا۔ علیؑ مسجد میں تھے کہ ایک خاتون نے عرض کی۔

”یا علیؑ! مبارک ہو۔ خدائے بیٹا عطا فرمایا ہے۔“

چنانچہ علیؑ گھر میں پہنچے۔ اُم البنین کی گود میں بیٹا دیکھ کر فرمایا۔

”ماشاء اللہ۔ وہی ہے جس کی مجھے تمنا تھی“

اُم البنین نے عرض کی۔

”یا علیؑ! بچہ تو بڑا حسین مگر اس نے ابھی تک آنکھ

نہیں کھولی۔“

علیؑ نے فرمایا۔ ”آنکھ کس طرح کھولتا۔ آخر میرا بیٹا

جو ہوا۔“

یہ کہہ کر علیؑ نے فقہ سے فرمایا۔

”فَقَّهٌ! ذرا میرے حسین کو تو بلاؤ۔“

حسینؑ تشریف لائے۔ علیؑ نے فرمایا۔

”حسینؑ! بھائی مبارک ہو۔“

حسینؑ نے آگے بڑھ کر دونوں ہاتھ پھیلائے۔ اور فرمایا۔

”اُمّات! میرے بھائی کو میری گود میں دو۔“

اُم البنین نے بچے کو آگے پھیلا دیا۔ ادھر بچے نے آنکھیں کھولنے

سے پہلے اپنے دونوں ہاتھ حسینؑ کی طرف پھیلا دیئے۔ گویا بچہ یہ کہہ رہا تھا

”مولا! آنکھیں تو بعد میں کھلتی رہیں گی پہلے میرے

دونوں ہاتھوں کا نذرانہ قبول فرمائیے گا۔“

حسینؑ نے بچے کو گود میں لیا اور بچے نے آنکھیں کھول دیں۔ ادھر

علیؑ دیکھتے رہے اور آنسو پونچھتے رہے۔ اور بچہ حسینؑ سے اس طرح چھٹ گیا جیسے پُرانا واقف ہو۔

بہر کیف حسینؑ کی گود سے علیؑ نے اٹھایا۔ ایک کان میں اذان کی اور ایک کان میں اقامت کی۔ جب اذان و اقامت کہہ چکے تو بی بی زینبؑ نے عرض کی۔

”بابا جان! یہ بچہ مجھے دو“

چنانچہ بھائی کو زینبؑ نے گود میں لے لیا اور بچے کے کان میں بڑی دیر تک بات کرتی رہی۔

علیؑ نے پوچھا۔ زینبؑ انتم نے کیا بات کی؟
زینبؑ نے عرض کی۔

”بابا جان! میں نے اماں کی وصیت پوری کی ہے کہ وہ مرنے وقت کہہ گئی تھی کہ ”اُم البنین“ کے بطن سے ایک بیٹا پیدا ہوگا جس کا نام عباس ہوگا۔ جب وہ پیدا ہو تو اسے میرا سلام کہنا۔ لہذا میں نے کہا ہے۔

”عباس بھائی! اماں سلام کہتی تھی۔

عباس بھائی! تو ہی میری چادر کا نگہبان ہوگا“
بہر کیف بچہ پلتا رہا۔ جب تین چار سال کا ہوا تو ام البنین نے بچے کو سمجھایا کہ۔

”بیٹا! جب تم زینبؑ کے سلام کو جابجا کرو تو نظری

پاؤں سے اوپر نہ ہرنے پائیں۔

دیکھو! وہ شہزادی ہے اور تو کنیز زادہ ہے۔ بیٹا!

کہیں حسین کے برابر نہ بیٹھا جانا

عزاد ار سید الشہداء!

منظر العجائب باب کا منظر العجائب بیٹا، حسین سرکار کا اسی طرح محافظ تھا جس طرح رسول کے دربار کا علی محافظ تھا۔ اگر حسین کہیں خط لکھتے تو کاتب عباس ہوتے۔ اگر حسین گھر میں بیٹھتے تو گھر کا منظم عباس۔ حسین کے بچوں کا بھلا والا عباس۔ حسین کی مستورات کو تسلی دینے والا عباس۔ غرض حسین سرکار کے تمام کام اس نوجوان کے سپرد تھے۔ گویا منظر العجائب کا منظر العجائب بیٹھا تھا۔ آج ہم بھی اسے منظر العجائب مانتے ہیں۔

خدا شاہد ہے۔ جو لطف ”یا علی“ کہنے میں آتا ہے

وہی لطف ”یا عباس“ کہنے میں آتا ہے۔ گویا عباس اسی طرح مشکل کشا ہے۔ جس طرح ”علی“ مشکل کشا ہے۔

بزرگانِ منے!

جو صاحبانِ کربلا کی زیارت کر چکے ہیں وہ ذرا اپنے تصور میں کربلا کے شہر کو لائیں تو پتہ چلے گا کہ عباس غازی کربلا میں کس شان سے ہیں۔ گویا کربلا کا شہر دیکھنے سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جس طرح مشرقی بادشاہوں کے شہر ہوں۔ سارا شہر چاروں طرف ہے اور درمیان میں شہنشاہ کا محل ہے جسے بڑا محرم کہتے ہیں۔ اگر شہنشاہ کے محل میں داخل ہوں تو سامنے شہنشاہ کے پڑاؤ بیٹ سیکرٹری حبیب کا روزہ ہے اندر جاؤ تو شہنشاہ کی آرام گاہ ہے۔ اور ساتھ ہی باڈی گارڈ کا رسالہ ہے جسے گنج شہداں کہتے ہیں۔ تقریباً ایک فرلانگ کے فاصلے پر

حسینی سرکار کی زنا نہ محل سوا ہے جسے خیمہ گاہ کہتے ہیں شہر سے
 باہر کھلے میدان میں حسینی سرکار کا مہمان خانہ ہے جس میں حُر
 مہمان ٹھہرا ہوا ہے اور نہر کے کنارے حسینی سرکار کے کمانڈر انچیف
 کا بنگلہ ہے جس پر آج بھی حسینی سرکار کا پرچم لہرا رہا ہے۔

بہر نوع وہ بڑے حضور کی درگاہ ہے۔ اور یہ چھوٹے حضور
 کا حرم ہے

سامعین!

میں ایک دن سید الشہداء کے حرم میں گیا۔ فریح پکڑ کر عرض کی۔
 مولا! تو نے کتنا شاندار شہر بسایا ہے۔ دُنیا بھر کے زائرین تیرے
 سلام کو آتے ہیں۔ سامنے چھوٹے بھائی کا روزہ ہے۔ خیمہ گاہ بھی
 ہے۔ گویا ہر شے اپنی جگہ پر مناسب ہے۔ مگر

مولا! ایک کسر رہ گئی۔ اگر وہ بھی پوری ہو جاتی تو تیرے شہر جیسا
 شہر کوئی نہیں تھا۔ اور وہ یہ ہے کہ اگر دونوں ”بھائیوں“ کی قبروں کے
 بیچ میں زینب کا روزہ بھی ہوتا تو کیا شان تھی

مولا! کمال ہو جانا کہ زینب کے روزہ پہ بیٹھ کر تجھے بھی رو لیتے اور
 عباس کو بھی رو لیتے

حضور والا!

میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ فوراً خیال آیا کہ یہ بالکل غلط ہے کیونکہ
 دونوں بھائیوں نے کو بلا فتح کیا تھا۔ لہذا یہ دونوں اپنے مفتوحہ علاقے
 میں ہیں اور زینب نے چونکہ مشام فتح کیا ہے۔ اس لئے وہ اپنے مفتوحہ
 علاقے میں ہے گویا سید الشہداء اور عباس غازی اپنی بہن زینب

کی زیارت کو شام جاتے ہیں اور بی بی کر بلا میں تشریف لاتی ہیں۔

اور یاد رکھو!

عباس غازی حسینی فوج کا کمانڈر انچیف ہے اس لئے ہم نے لحاظ رکھتے ہوئے یہ فیصلہ کیا ہے کہ سید الشہداء اور دوسرے آئمہ طاہرین کی نذر میں دی ہوئی چیز کو ہم "نیاز" کہتے ہیں اور جناب عباس غازی کی نذر میں دی ہوئی چیز کو ہم "حاضری" کہتے ہیں۔ لفظ "حاضری" اصطلاحی لفظ ہے کیونکہ اگر بادشاہ کی خدمت میں جائیں تو اسے نیاز کہتے ہیں اور اگر سپہ سالار کی خدمت میں جانا ہو تو اسے حاضری کہتے ہیں۔

عزادار سید الشہداء!

بی بی زینب کو عباس غازی پر اتنا اعتماد تھا کہ شب عاشور زینب نے تمام عورتوں کو اپنے نیچے میں بلا کر کہا۔

"بی بیو! گھبراؤ نہیں۔ تمہارے پودے کی میں

زمرہ دار ہوں کیونکہ عباس جیسا میرا بھائی موجود

ہے۔"

زینب کی یہ بات سنکر تمام خواتین خاموش ہو گئیں۔ وقت گزرتا گیا صبح عاشور آگئی اور میدان شہادت گرم ہو گیا۔ جب تمام عزیز و اقارب جام شہادت پی چکے تو عباس علیہ الرحمہ سرکار کے سامنے کھڑے ہو کر عرض کرنے لگے۔

"مولا! میری تمام فوج ختم ہو گئی لہذا میں بھی

مرنا چاہتا ہوں۔ مولا! مجھے احانت دو

کیونکہ کوثر پہ میرے سپا ہی میرا انتظار کر
رہے ہیں ۔

حسین نے جواب دیا ۔

”عباس ! تم میرے علمبردار ہو“

عباس نے عرض کی ۔

”مولا ! وہ فوج اب کہاں ہے جس کا میں علمبردار ہوں
عباس کا یہ فقرہ سنکر ماتم نے سوچا کہ اگر عباس کو روک لیا تو وہ غم سے ختم ہو
جائے گا۔ چنانچہ حکم تو دے دیا کہ ”تم جا سکتے ہو“ مگر لڑائی سے روکنے
کے لئے یہ بھی کہہ دیا کہ ”عباس بھائی ! اگر ہو سکے تو بچوں کی
مشک پانی سے بھر لو“
سامعین !

میں نے آج تک مقتل کی کسی کتاب میں یہ نہیں پڑھا کہ مولا نے عباس سے
یہ کہا ہو کہ ”مشک میں پانی ملا دو“ بلکہ یہی فرمایا کہ ”مشک میں پانی بھر لو۔
کیونکہ اگر پانی سے آؤ، کا حکم ہوتا تو پانی لازماً آتا۔ مگر یہاں صرف مشک
بھرنے کا حکم تھا۔ چنانچہ عباس خیمے میں آئے اور سکینہ کا مشکیزہ اٹھا کر
نہر کی طرف چل پڑے اورھر سکینہ نے تمام بچوں سے کہہ دیا ۔
”بچو ! کھیراؤ نہیں ۔ میرا چچا ستقا بن کے جا رہا

ہے ۔ پانی ضرور ملے گا“

چنانچہ سب بچے خالی کوزے لیکر سکینہ کے گرد کھڑے ہو گئے اور
عباس نے روانگی پر بی بی زینب کو سلام کیا۔ حسین کو سلام کیا اور جب
اپنی زوجہ کے خیمہ میں پہنچے تو دیکھا کہ فضلؑ پاس بیٹھا ہے اور زوجہ

یہ کہہ کر ہی ہے۔

”سرتاج! تم نے بڑی دیر کو دی“

عباس نے کہا۔

”فضل کی ماں! میرے لہو کو ”بیوہ“ ہو جائے گی“

حضور والا!

ایک شاعر عالم ارواح میں اس منظر کو دیکھ رہا تھا کہ جب عباس نے کہا کہ فضل کی ماں! تو بیوہ ہو جائے گی“ تو بی بی جواب میں فرماتی ہیں

”کچھ غم نہ کریں آپ پہ پروان چڑھیں گے

میں قبر کو جھاڑوں کی یہ قرآن پڑھیں گے

بہر نوع عباس گھوڑے پہ سوار ہوئے۔ میدان میں پہنچے اور علم کا پنجہ

برابر خیمے کے ضلع میں نظر آ رہا ہے۔ زمینت کی نظر علم کے پنجے پر جمی ہوئی

ہے۔ یتیم بچے اپنے ہاتھوں میں خالی کوزے لئے خیموں سے باہر نکل کر عباس

کے علم پر نظریں جمائے کھڑے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد علماء رحیمی نہر کے اندر

پہنچ گیا۔

صاحبانہ ذوق!

بتاؤ۔ ایک آدمی تین دن کا پیاسہ ہوا گرمی کا موسم ہو۔

اور ہمیں ہزار آدمیوں کو کڑکھٹا کر جب نہر میں پہنچا ہوتا اس کی پیاس

اپنے پورے شباب پر ہوگی یا نہیں؟ یقیناً پانی کو دیکھ کر

پیاس کی شدت بڑھ چکی ہوگی ————— گردنیانے یہ منظر

دیکھا کہ عباس نے جھک کے مشک بھری۔ تسمہ باندھا اور اپنے

ہاتھوں کو دیکھا تو بھیگ چکے لہذا ہاتھوں کو لہجے کی زور

سے صاف کیا اور دونوں ہاتھ اٹھا کے دعا کی۔
 خداوند! میری انگلیاں حسین کے بغیر بھیک گئی
 ہیں جو وفا کے خلاف ہے۔ لہذا اب جو میرا اور
 حسین کا سامنا ہو تو یہ ہاتھ میرے ساتھ نہ ہوں
 بزرگان من!

عباس کی یاد دیکھ کر کائنات جھوم اٹھی اور چشم ملک نے سناروں کی عینک
 لگا کر اس منظر کو دیکھا۔ چاروں طرف سے ”سبحان اللہ“ ”سبحان اللہ“ کی
 صدائیں بلند ہونے لگیں کیونکہ ساری دنیا کی تاریخ ایک طرف ہے اور یہ واقعہ
 ایک طرف ہے۔ لہذا آج میں جناب امیر کی خدمت میں عرض کرتا ہوں۔
 ”یا علی! خلیفہ کا اکھاڑنا ایک طرف ہے، ”مرحب“ کا
 پچھاڑنا ایک طرف ہے، ”بسنتر رسول“ پہ سونا ایک طرف
 ہے۔ مگر

”اپنی پیاس میں دیر سے پیاسہ نکل آنا اور بات ہے“

بھائیو!

یہ مثال کہیں اور ملتی ہو تو بتاؤ؟۔ بہر نوع عباس غازی پیاسے نہر سے
 نکل آئے اور خیموں کی طرف بڑھنے لگے اور ہر تکیے پر چپا کو آتے جو دیکھا
 تو بلند آواز میں کہا۔

”بچو! وہ دیکھو میرے چچا پانی لیکر آ رہے ہیں
 چنانچہ بچے اڑھیاں ابھار اُبھار کر علم کو دیکھنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد
 زینب نے دیکھا کہ علم کبھی دُائیں جھکتا ہے۔ اور کبھی بائیں جھکتا ہے۔ اب
 جو علم کو اس طرح ڈگمگانے دیکھا تو زینب نے آواز دی۔

”حسین ! علم کو کیا ہو گیا؟“

حسین نے وہیں سے آواز دی۔

”زینب ! دیکھ تو میں بھی رہا ہوں مگر میری کمر

ٹوٹ گئی۔ مجھ میں اب اتنی طاقت نہیں ہے کہ

میں وہاں جاسکوں“

عزاء دار سید الشہداء !

تھوڑی دیر بعد حسین لاشے پہ پہنچے۔ اور خالی علم لیکر گھر واپس آ گئے
اور ہرجپوں نے جو خالی علم دیکھا تو ان کے ہاتھوں سے خالی کوزے گر پڑے
سکینہ نے کہا۔

”بچو ! مجھے معاف کرنا۔ میں نے جس بھروسہ پہ کہا تھا وہ ختم

ہو گیا۔“

اَنَا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُونَ

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ اٰلِ مُحَمَّدٍ

شجرہ طیبہ

خداوند عالم کی حمد و ثناء کے بعد حضرات محمد و آل محمد پر
دُرود و سلام

محترم سامعین!

اللہ نے انسان کے اندر بہت سی طاقتیں ودیعت کی ہیں۔ یہ تمام خلائق اور فضائی طاقتیں انسان کے تابع فرمان ہیں۔ گویا انسان اتنا طاقتور ہے کہ اور بے طاقت اتنا ہے کہ ذرا سا ٹمپیر بچر بڑھ جائے تو بے کار ہو گیا۔ اگر معمولی سا سر میں درد ہو گیا تو معطل ہو گیا۔ نڈر اتنا کہ نا ڈرنے پر آٹے تو چاند پر پہنچ جائے اور ڈر لوک اتنا کہ سانپ کے قریب سے گزرے تو چیخ نکلی جائے۔ گویا نہ ہی اس کے ڈر لوک ہونے کی کوئی حد ہے۔ ہر نوع انسان جیسی طاقتور شے نے کس طرح گوارا کر لیا کہ وہ پتھر کو پوجنا شروع کر دے۔ اور اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کے بیٹھا رہے۔

فوجوالو! زمانہ جاہلیت کی بات نہیں ہے بلکہ آج کل کے پڑھ لکھے دور میں بھی ایسا ہو رہا ہے۔ آج کے تہذیب و تعلیم اور ترقی کے زمانہ میں کہ ڈر ہا انسان ایسے ہیں جو پتھر کے سامنے ہاتھ جوڑ کے بیٹھے ہیں۔

سامعین!

اگر تم میری اس بات کی دلیل چاہتے ہو تو اپنے ہمسایہ ملک (بھارت) میں جا کے دیکھ لو کہ وہ لوگ اگر اسمبلی میں تقریر کریں تو دنیا بھر کو حیران کر دیں

سیاسی باتیں کریں تو دنیا کا مزاج چکڑا دیں اور اگر گھر جا بیٹیں تو پتھر کے سامنے ہاتھ جوڑے بیٹھے رہیں۔

ہم پوچھتے ہیں۔ پنڈت جی! کیوں اس پنڈت کو پوج رہے ہو؟

پنڈت جی پورے فلسیانہ انداز میں جواب دیتے ہیں کہ:-
مسلمانو! تم نے سمجھا ہی نہیں۔ کون کتنا ہے کہ ہم پتھر کو پوجتے ہیں
ہم نے عرض کی:-

پنڈت جی! ہم دیکھ رہے ہیں کہ تم پوج رہے ہو
اس میں کلمے کی کیا بات ہے۔ اور اگر ہم نہیں سمجھتے تو
آپ ہی سمجھا دیں۔
پنڈت جی کہتے ہیں۔

”اصل بات یہ ہے کہ میں گناہ گار ہوں اور میرا اللہ جو ہے وہ پرہیزگار ہے۔
پراکشور ہے۔ اور یہ بت میرا اللہ نہیں ہے اور چونکہ میں
ایک گناہ گار ہونے کی حیثیت سے اللہ کے حضور میں جانے سے
شرماتا ہوں اس لئے اس بے گناہ کو میں نے اپنے اور اللہ کے درمیان
”وسیلہ“ بنایا ہے۔“

ہم نے پوچھا ”پنڈت جی! اس پتھر کو کیوں وسیلہ بنایا ہے؟“
پنڈت جی نے کہا۔
”دیکھو نا۔ خواہ میں کتنا ہی بڑا گناہ گار ہوں مگر یہ پتھر بے گناہ ہے۔“
سامعین!

پنڈت کی بات سن کر میں بھی قائل ہو گیا کہ گناہ گار کو وسیلہ بنانے

سے پتھر پوجنا ہی بہتر ہے۔ کم از کم اس میں شعور کی بات تو ہے
عقل کی بات تو ہے۔

بہر نوع انسان پتھر کو پوجنے لگا جو انسان کے بے عقل ہونے کی آخری
منزل ہے۔

اب بناؤ ! یہ قانونِ عدل کی تو ہین ہے یا نہیں
کہ پتھر اللہ کی جگہ پر پہنچ گیا اور انسان پتھر کا بندہ ہو گیا۔ یہ انتہائی
ظلم ہے یا نہیں کہ حقیقی معبود کو چھوڑ کر پتھر کو خدا بنالیا۔ یہ قانونِ عدل کے
انتہائی خلاف ہے یا نہیں کہ انسان پتھر کا بندہ بن گیا؟
صاحبانے !

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسان نے پتھر کو خدا کیوں بنالیا؟
اس کا جواب یہی ہے کہ انسان فطرتاً "ٹوکنے والے" سے بھاگتا ہے
اور "نا ٹوکنے والے" سے محبت کرتا ہے۔ ادھر اللہ چونکہ ٹوکتا بہت ہے کہ
نماز کیوں نہیں پڑھی، روزہ کیوں نہیں رکھا، فلاں کا حق کیوں غضب کیا، فلاں
سے فریب کیوں کیا؟ اس لئے انسان نے سوچا کہ "ٹوکنے والے" اللہ کو
چھوڑ کر اسی "نا ٹوکنے والے" پتھر کو پوجو جو ٹوکتا ہی نہ ہو۔ تو رُود
تو بڑا نہیں کہتے۔ اور پوجو تو تو شاہنشاہ نہیں کہتے۔ جہاں بٹھاؤ وہیں بیٹھ
جائیں گے۔ کعبہ میں بیٹھاؤ بیٹھ جائیں گے اور مندر میں بیٹھاؤ بیٹھ جائیں گے
عرض نہ ہی ان خداؤں کو اپنی حیثیت کا علم ہے اور نہ ہی اپنی جگہوں کا پتہ
ہے کہ ہمیں یہاں بیٹھنا چاہیے یا نہیں۔ ہر حالت میں لوگوں کے محتاج ہیں
کہ انہوں نے جہاں چاہا انہیں بیٹھا دیا۔

سامعین ! ایک دن عالمِ تصور میں "ان ٹوکنے والے" خداؤں

سے گفتگو کر رہا تھا۔

”انسانوں کے بنائے ہوئے خداؤ! کعبہ میں کیوں بیٹھ گئے۔ یہاں تمہاری جگہ مقدس ہے؟“
بتوں نے جواب دیا:-

حضور! ہم خود تھوڑا ہی آئے ہیں۔ لوگوں نے بٹھایا۔ ہم بیٹھ گئے۔ تم یہیں کیوں خواہ مخواہ کے لئے جھڑک رہے ہو؟
ہم نے پوچھا:-

”پھر نکلتے کیوں نہیں ہو؟“
بتوں نے کہا:-

صاحب! نہ خود آئے ہیں اور نہ ہی خود جائیں گے۔ لوگوں نے بٹھایا ہے۔ بیٹھ گئے اور جب کوئی نکال دے گا اچلے جائیں گے۔
ہم نے کہا:-

”بتو! تم جو یہاں بیٹھے ہو۔ تم میں کوئی کمال بھی ہے؟“
انہوں نے جواب دیا:-

”صاحب! دیے ہم میں پتھر مگر ایک کمال ہے ہم میں کہ اگر جنگ ہو رہی ہو۔ ہم سے ہم برس رہے ہوں۔ ٹینک سے ٹینک ٹکرا رہے ہوں اور دنیا پہ تباہی آرہی ہو تو تم یہیں پتھر کے بتوں کو میدان جنگ میں لے جاؤ اور جا کے رکھ دو تو ہم چور چور ہو جائیں گے پس جائیں گے تباہ ہو جائیں گے مگر میدان چھوڑ کر واپس نہیں آئیں گے۔ ہماری اس ادا پہ دنیا مرقی ہے“

بہر نفع انسان کے بنائے ہوئے یہ خدا نہ تو کسی کو ٹوکتے ہیں اور نہ ہی

کسی نہ تسلیم کرتے ہیں۔ مگر انسان نے سب سے بڑا ظلم یہ کیا کہ خدا کی جگہ پتھر کو پوجا اور یہ اس لئے کہ خدا ٹوٹتا ہے اور پتھر ٹوٹتا نہیں۔ اور فطرۃً انسان مانوس ہوتا ہے "ناٹوکنے والے" سے اور بچتا ہے "ٹوکنے والے" سے تو یاد رکھو! انسان کی جب دس بیس پشتیں "ناٹوکنے" والے خدا کو پوجتی رہیں تو جب دو ایسی چیزیں اس کے سامنے آئیں گی۔ ایک ہو "ٹوکنے والی" اور ایک ہو "ناٹوکنے والی" تو بت پرستی کی عادت یہ کھلوا دے گی کہ ہمیں ناٹوکنے والی کافی ہے۔

محترم بزرگو!

انسان نے یہ غلطِ عدل حرکت کی کہ خدا کو چھوڑ کر بتوں کو پوجا اور یہ صرف اس لئے کہ اس کے مزاج میں یہ بات بیٹھ گئی کہ وہ ناٹوکنے والے کو پسند کرتا ہے اور "ٹوکنے والے" کو ناپسند کرتا ہے ورنہ کوئی احمق ایسا نہیں ہے جو بسلامتی ہوش و حواس، انسان ہوتے ہوئے پتھر کو کہے کہ "تو خدا ہے"

ایک چیز اور ہے جس کی انسان نے ضد کی ہے کہ یہ جو شے بنا تہے اس کی قدر بہت کرنا ہے۔ اپنے ہی ہاتھوں سے بُت تراشا اور پھر اس کی عزت انہی کی کہ دنیا سے پوجا دیا۔ گویا ہر بنانے والے کو اس کی عزت کا بڑا خیال ہوتا ہے۔ جو جس کو بنا تہے وہ چاہتا ہے اس کی عزت بنے۔ جس شے کو بندے بنائیں۔ وہ چاہتے ہیں اس کی عزت بنے۔ اور جسے اللہ بنائے وہ چاہتا ہے اس کی عزت بنے۔ ہر نوع ہر بنانے والے کو اپنے بنائے ہوئے کی عزت کا پاس ہوتا ہے ورنہ اگر انسان میں ذرا سا عقل شعور ہو تو وہ فوراً سمجھ جاتا ہے کہ فلاں چیز کہاں ہوئی جائیے۔ پتھر کہاں

ہونا چاہیے۔ حیوان کہاں ہونا چاہیے اور انسان کہاں ہونا چاہیے۔ گویا
 ”چاہیے“ اسی کا نہانا عین عدل ہے اور یہی اصل عقل ہے۔
 سامعین!

ایک حدیث سنو کہ کون سی شے کہاں ہوتی چاہیے۔
 ایک روز حضور سرور کائنات مسجد میں تشریف فرما ہیں اور
 اصحاب کبار کا مجمع سامنے ہے اور کتنی بے متبرک وہ محفل جس میں ذکر ہو
 رسول اور سامعین ہوں اصحاب رسول۔ اور کتنی نورانی ہیں وہ آنکھیں جنہوں
 نے نورِ جمال سے رسول کو دیکھا اور کتنے مقبرک ہیں وہ ہاتھ جنہوں نے
 خلوص و ایمان کے ساتھ رسول کے ہاتھ پر بیعت کی اور کتنے مبارک ہیں وہ
 پاؤں جو سلامتی ایمان کے ساتھ چل کر رسول کے پاس آئے۔ بہر نوع اصحاب
 رسول سامعین ہیں اور رسول واعظ ہیں اور اسی وعظ کے دوران رسول فرماتے ہیں
 ”اللہ نے ایک شجرہ طیبہ پیدا کیا ہے جس کی مثال
 کلمہ طیبہ جیسی ہے اور وہ شجرہ ایسا ہے کہ
 اس کی جڑ تو زمین میں گڑی ہوئی ہے اور اس کی
 شاخ آسمان میں پہنچی ہوئی ہے“

بزرگانِ منے!
 رسول کی یہ بات سنکر تمام سامعین سوچنے لگے کہ ایسا شجرہ طیبہ
 کہاں ہے جس کی جڑ تو زمین میں ہو اور شاخ آسمان میں پہنچی ہوئی ہو۔
 سب نے کہا:-

”حضور! ذرا اس درخت کی تشریع فرما دیجئے“
 رسول نے فرمایا:-

”شریع میں بتاتا ہوں مگر اپنی عقل کے مطابق
اسے یاد رکھنا تمہارا ذمہ ہے۔
دیکھو!

وہ ”شجرہ طیبہ“ جسکی جڑ زمین میں ہے۔ اور
شاخ آسمان میں ہے۔ وہ شجرہ طیبہ ہم میں
میں اس شجرہ

طیبہ کی جڑ ہوں اور علیؑ اس کی شاخ ہیں“
اصحاب نے عرض کی۔

”حضور! ہمارا بھی اس شجرہ طیبہ سے کوئی تعلق ہے؟“
رسولؐ نے فرمایا:-

”ہاں۔ میرے ماننے والے اس شجرہ طیبہ کے پتے ہیں۔

سامعین!

چشم بدور۔ آپ حضرات اس شجرہ طیبہ کے ”پتے“ میں بشرطیکہ ماننے
والے ہوں تاکہ ”پتے باز“ ہوں۔ بہر نوع آپ حضرات اس شجرہ طیبہ
کے پتے ہیں۔

اب ذرا قانونِ عدل کے مطابق سوچو کہ اس درخت کی ”جڑ“
کہاں ہونی چاہیے۔ ”شاخ“ کہاں ہونی چاہیے۔ اور ”پتے“ کہاں ہونے
چاہئیں۔

دیکھو نا!

کسی درخت کو آپ نے دیکھا ہے کہ اس کے پتے، جڑ سے چٹے ہوئے
ہوں؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ پتے ہمیشہ شاخ کا دامن پکڑے رہتے ہیں۔ حالانکہ

حالانکہ پتے زندہ ہی جڑ کی بدولت ہیں۔ انہیں خوراک ہی جڑ کی بدولت پہنچتی ہے۔ اگر پتوں کا تعلق جڑ سے منقطع ہو جائے تو ختم ہو جائیں کیونکہ پتوں کا جڑ سے تعلق اسی وقت تک قائم رہتا ہے جب تک ”شاخ“ کو مضبوطی سے پکڑے رکھیں اور شاخ کے توسط سے جڑ سے فیض پہنچے گا۔ گویا پتوں کے لئے یہ قانونِ عدل ہے کہ شاخ کا دامن نہ چھوڑنے پامیٹ۔

سامعین!

اب اگر کوئی مغرور و تکبریت ”دل میں یہ خیال کرے کہ جب جڑ موجود ہے تو جڑ کے ہوتے ہوئے شاخ کا احسان کیوں اٹھایا جائے لہذا شاخ کو چھوڑ کر جڑ کی گود میں آ بیٹھے۔ گھنٹہ دو گھنٹے تو خیر سیت سے گذر جائیں گے۔ پھر کیا ہو گا رنگ زرد ہو جائے گا، رنگیں پھول جائیں گی، حیات رخصت ہو جائے گی، زندگی و بال ہو جائے گی، موت طاری ہو جائے گی، شکل بے شکل ہو جائے گی اور ہوا کے جھونکے اور ہیرے اُدھر اُڑاتے جائیں گے۔ اور اگر ایک دو دن جھنڈ کر کے جڑ کے پاس ہی بیٹھے رہے تو کوئی ”تنور“ والا آئے گا اور ان تمام پتوں کو جو شاخ کا دامن چھوڑ کر جڑ کے پاس بیٹھے رہے، انہیں اٹھا کر لے جائے گا۔ اور آگ میں ڈال دے گا۔ گویا ہر اس پتے کو جو شاخ کا دامن چھوڑ دے گا، انجام میں آگ میں جلا پڑے گا۔ اگر شاخ کا دامن مضبوطی سے پکڑ کر رکھتا تو کیا حمال تھی کہ اس کا یہ انجام ہوتا۔ پوری آب و تاب کے ساتھ حیات بھی تیز رہتی اور ہوا کے جھونکے کے ساتھ شاخ کے ساتھ جھولتا بھی رہتا بہر نوع پتے کے لئے قانونِ عدل یہی ہے کہ وہ شاخ کے ساتھ وابستہ رہے اور پھر شجرہ طیبہ کی شاخیں! سبحان اللہ۔ اگر کسی کو ان سے

وابستگی ہو جائے تو اس سے بہتر کوئی ہے ہی نہیں۔ کتنا خوش نصیب ہوگا، وہ انسان جس کا تعلق آلِ رسول سے ہو جائے اور یہی قانونِ عدل ہے
محترم بزرگو!

تاریخِ عالم گواہ ہے کہ حضورِ سرورِ کائنات سے بہتر قانونِ عدل کو کوئی جانتا ہی نہیں تھا۔ حضورِ بہتر جانتے تھے کہ کس کے ساتھ کیسا سلوک ہونا چاہیے۔ کس کے ساتھ کیا برتاؤ ہونا چاہیے۔ لہذا رسول نے ہر اچھے آدمی کا احترام کیا، ہر اچھے آدمی کی عزت کی ہر شریف آدمی کا وقار ملحوظ رکھا مگر کسی کتاب میں، کسی تاریخ میں، کسی حدیث میں یہ نہیں ہے کہ حضورِ سیدہ طاہرا سلام اللہ علیہا کے علاوہ رسول کسی کی تعظیم کو اٹھے ہوں، بخاری شریف میں تو یہ ہے کہ ”جب سیدہ شریف لاتی تھیں تو رسول فوراً تعظیم کو بھی اٹھتے تھے اور جہاں خود بیٹھتے تھے وہاں سیدہ کو بھی بٹھاتے تھے اور خود سامنے بیٹھ جاتے تھے۔“

اب بتاؤ!

رسول نے اتنا احترام کسی اور کا کیا ہوگا، ہرگز نہیں۔
معلوم ہوا کہ قانونِ عدل کے مطابق سیدہ اس احترام کی مستحق تھیں تو رسول نے بھی اتنا احترام کیا۔ ورنہ رسول سے بہتر قانونِ عدل کو کون جانتا ہے۔

اب بتاؤ! جس خاتون کی زندگی بھر یہ عادت ہو گئی ہو کہ جس کے احترام کو رسول اٹھتا ہو تو کیا اس کی فطرت میں یہ داخل نہیں ہو گیا کہ وہ جہاں جائے اس کی تعظیم کی جائے۔ اور کیا وہ خاتون یہ برداشت کر سکتی ہے جس کی تعظیم محمد کرتے ہوں کہ آج اسے کوئی یہ کہدے کہ تم ”غلط“

کہہ رہی ہو؟

محترم سامعین!

سیدہ طاہرا سلام اللہ علیہا ہی کے صدقہ میں قیامت کے دن ہماری شفاعت و نجات ہوگی۔ ہو سکتا ہے نجات کے وقت ہماری نماز و روزہ خدا کی دی ہوئی نعمتوں کا عوض بن جائے اور بخشش کے لئے کوئی شے باقی نہ رہے۔ لہذا سوائے نظرِ کرم حضور سیدہ طاہرا ہماری شفاعت ناممکن ہے۔

حضور والا!

رسالت مآب نے فرمایا ہے کہ قیامت کے میدان میں ساری روئے زمین کا انسان موجود ہوگا۔ ان میں انبیاء، اولیاء، اصفیاء غرض ہر قسم کا انسان موجود ہوگا۔ اور ہر شخص اپنے اعمال کے اچھا یا بُرا ہونے میں مبتلا ہوگا۔ اس وقت ایک غیبی آواز آئے گی۔

”قیامت والو! جہاں جہاں کھڑے ہو آنکھیں

بند کرلو۔ سر جھکا لو“

لہذا تمام انبیاء و اولیاء سمیت ہر انسان اپنی آنکھیں بند کرے گا۔ سر جھکا لیں گے۔ اور چپکے چپکے ایک دوسرے سے پوچھیں گے۔

”بات کیا ہے۔ سر کیوں جھکا دیا گیا؟“

چنانچہ تمام انبیاء کا سردار (آدم) انہیں بتائے گا کہ آنکھیں اس لئے بند کروائی گئی ہیں اور سراسر لئے جھکائے گئے ہیں کہ محمد کی بیٹی سیدہ کی سواری گزر رہی ہے۔

اس شان سے سیدہ کی سواری آئے گی۔ قیامت میں درودِ سلام

کے نعرے بلند ہو جائیں گے۔ سب سر جھکائے ہوئے کھڑے ہو جائیں گے اور سیّدہ کی سواری اس شان سے میدانِ قیامت سے گزرے گی اور حجبِ عرض الہی تک پہنچے گی تو وہاں سیّدہ فرمائے گی۔

”خداوند! میں نے آج تک صبر کیا۔ آج قیامت کا دن

ہے۔ آج میں تیری عدالت میں اپنا دعویٰ پیش کرنے آئی ہوں۔

خداوند! اگر کسی کے گھر قتل ہو جائے تو اس قتل کی مدی

حکومت بن جاتی ہے۔ آج میں تیری حکومت سے فریاد کرنے آئی

ہوں۔ کہ میرے گھر میں ایک دن میں بہتر قتل ہو گئے جسکی فریاد

کرنے آئی ہوں“

سامعین:

جب سیّدہ اپنا مقدمہ پیش کر دے گی کہ میرے گھر میں ایک دن میں بہتر

قتل ہو گئے تو عدالت الہی سے پر جوش خطاب ہوگا۔

سیّدہ! ہمیں پتہ ہے، ہم آئینی گواہ ہیں مگر مثل کو مکمل کرنے کے لئے

تمہارے پاس کوئی آئینی گواہ موجود ہے تاکہ اسے عدالت میں بلایا جائے،

سیّدہ طاہرہ فرمائیں گی۔

”خداوند! اگر چشم دید گواہ چاہیے تو میری بیٹی زینب

موجود ہے“

بس بھائیو! قدرت کی طرف سے حورانِ جنت کو حکم ہوگا

کہ زینب کو بڑے احترام کے ساتھ عدالت الہی میں لایا جائے تاکہ وہ

اپنی ماں کے مقدمہ میں گواہی دے سکے۔ چنانچہ حورانِ جنت شام

جائیں گی اور تھوڑی دیر بعد واپس آکر عرض کریں گی۔

”خدا و ندا! زینبؓ کے حضور گئے تھے مگر انھوں نے فرمایا کہ میں اسی طرح قیامت میں آنا چاہتی ہوں جس طرح کوفہ و شام کے بازار میں گئی تھی“

بہر نوع زینبؓ کی قیامت میں آمد ہوگی۔ زین العابدینؑ مہار پڑے ہوئے زینبؓ ننگے سراونٹ پہ سوار۔ اور قدرت کی طرف سے ارشاد ہوگا۔

”زینبؓ: بناؤ۔ کربلا میں کیا گذری کیونکہ تم چشم دید گواہ ہو“

زینبؓ ماں سے کہے گی:-

”اماں! تو نے مرتے دم مجھ سے وصیت کی تھی کہ بھائیوں کا خیال رکھنا۔“

اماں! میں نے تیری اولاد پر اس وقت تک حرف نہیں آنے دیا جب تک اپنی نسل ختم نہیں کروادی۔“

اماں! تیرا حسینؑ بھی کربلا میں تھا۔ میں بھی کربلا میں

تھی۔ لہذا میں نے سارے کام حسینؑ کے ساتھ بانٹ

رکھے تھے۔ آدھا کام حسینؑ کرتے تھے اور آدھا کام میں

کرتی تھی مگر فرق یہ تھا، وہ مرد تھے۔ میں خاتون تھی۔

مردوں کے کام حسینؑ کے سپرد تھے اور خواتین کے

کام میرے سپرد تھے۔ اماں! میں نے حسینؑ سے

تقسیم کر رکھی تھی کہ:-

حسین! گھر سے باہر کے کام تیرے سپرد اور
گھر سے اندر کے کام میرے سپرد، باہر سے لاشہ
لانا تیری سپرد اور اس لاش پہ بیٹھ کے رونا
میرے حصہ میں۔

شہیدوں کی سرداری حسین! تم کرنا اور اسیروں کی
گریزاری میں کروں گی۔

حسین! کفن نہ ملنا تمہارا حصہ اور چادر نہ
ملنا میرا حصہ۔

حسین! قبر نہ ملنا تمہارا حصہ اور در بدر پھرنا
میرا حصہ۔

حسین! تم مرد ہو، میں خالقن ہوں۔ جتنے کربلا میں لڑے
ہیں وہ تمہاری سپرد اور جتنی لڑکیاں ہیں وہ میری سپرد۔
حسین! علیٰ اصغر لڑکا ہے وہ تیری سپرد اور سکینہ لڑکی
ہے وہ میری سپرد۔

حسین! اصغر کے گلے سے خون بہے گا تو تیری گود میں اور
سکینہ کے کان زخمی ہوں گے تو میری گود میں
حسین! تو ایک بھائی قربان کرے عباس جیسا، مگر
دیکھ حسین! میں دو بھائی قربان کروں گی ایک حسین جیسا
اور ایک عباس جیسا۔

حسین! تو ایک بھتیجا قربان کرے گا قاسم جیسا اور میں تین
بھتیجے قربان کروں گی ایک اکبر جیسا، ایک اصغر جیسا اور ایک قاسم جیسا۔

حسین! تو دو بیٹے قربان کرے گا۔ ایک اکبر جیسا اور ایک
اصغر جیسا۔ مگر

دیکھ حسین! میں بھی دو بیٹے قربان کروں گی مگر میرے
بیٹوں اور تیرے بیٹوں میں بڑا فرق ہے۔ کیونکہ میرے بیٹے
کنیز زادے ہیں اور تیرے بیٹے شہزادے ہیں۔

مگوسن حسین! تیرے دو بیٹے قربان ہونے کے بعد بھی تیری
نسل قیامت تک باقی رہے گی اور میں اپنے دو بیٹے عوٰن
و محمد قربان کر کے اپنی پوری نسل قربان کر دوں گی۔
اب تیرا ہی کوئی بیٹا مجھے اماں کہہ دے تو کہہ دے ورنہ میرا
کوئی بیٹا نہیں رہے گا۔

سامعین!

یہ کہہ کر زینب ماں سے لپٹ گئی اور درد بھری آوازیں
فرمانے لگی۔

”اماں! میں نے تیری اولاد پہ اپنی پوری نسل
ختم کر دی۔ اماں! خدا گواہ ہے۔ اکبر کی میت
پہ بال سفید ہو گئے مگر عوٰن و محمد کے لاشوں
پہ نہیں روئی۔“

اماں! حسین سے پوچھ لو، میں نے عوٰن و محمد
تیرے بیٹے پہ صدقہ کر دیئے تھے۔

اللہ ہماری مجلسوں کو قبول و منظور فرمائے
رَبَّنَا قَبِّلْ مِنَّا اِنَّكَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ط اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ اٰلِ مُحَمَّدٍ

تصویر آل محمد

خداوند عالم کی حمد و ثناء کے بعد حضرات محمد و آل محمد پر درود و سلام
معزز سامعین !

آج میں اپنے ایک عزیز کے عقد کے سلسلہ میں حاضر ہوا ہوں۔ لہذا آج کی یہ مجلس بغرض حصول برکت و سعادت منعقد کی جا رہی ہے۔ کیونکہ یہ نکاح سادات کے دو خاندانوں کے درمیان میں ہے اور دنیا کی یہ رسم ہے کہ وہ اپنی تقریب کو زیادہ سے زیادہ باعزت اور با احترام بنانے کے لیے بڑے سے بڑے آدمیوں کو بلاتے ہیں جنہیں وہ بلا سکتے ہوں تاکہ یہ یادگار رہے کہ فلاں تقریب میں فلاں بزرگ تشریف لائے تھے۔ بہر نوع ہر آدمی کا یہ جی چاہتا ہے کہ کوئی بڑی ہستی تقریب میں شریک ہو۔

لہذا سادات کا دل بھی چاہتا ہے کہ ہم بھی اپنی تقریب میں بڑی سے بڑی ہستیوں کو بلا میں چنانچہ یہ سیدہ زادے تمام کائنات پر نظر ڈالتے ہیں کہ بڑی سے بڑی ہستی کون ہے جسے ہم بلا میں۔ جب چاروں طرف نظریں اٹھتی ہیں تو سادات کو اپنے سے بڑی ہستی نظر ہی نہیں آتی۔ لہذا اب ہم سوچتے ہیں کہ اپنے ہی بزرگوں میں سے کسی کو بلا میں نہ کہ ہماری یہ تقریب بابرکت ہو جائے مگر اتفاق سے ادھر ان کو بزرگ ایسے مل گئے کہ یہ تو ان کی اولاد ہوئے۔ مگر وہ تو خدا کے گھر بھی بن بلائے نہیں جانے بلکہ بلانے سے جانا تو اور بات ہے قرآن میں تو یہ ہے کہ ”سُبْحَانَ الَّذِي أَسْرَى بِعَبْدِهِ“ ”پاک ہے وہ ذات

جو اپنے بندے کو آکر لے گئی۔

گویا اتنے نازک مزاج اور اعلیٰ قدر بزرگ ہیں جو خدا کے پاس بھی بن بلائے نہیں جاتے بلکہ خدا کی ذات خود آکر انہیں لے جاتی ہے۔

بہر نوع سید زادے یہ سوچ رہے ہیں کہ ہم انہیں کیسے تکلیف دیں تاکہ وہ ہماری محفل میں شریک ہوں۔ آخر ہم مولوی صاحبان کے پاس پہنچے اور عرض کی "مولانا! ہم اپنے بزرگوں کو خوشی کی تقریب میں بلانا چاہتے ہیں۔ بتائیے! کس طرح بلائیں۔"

مولوی صاحبان فرماتے ہیں :-

نہما را خیال غلط ہے۔ اگر دس بیس جگہ شادی ہوئی اور سب سیدوں نے بلایا تو وہ بیچارے کہاں کہاں جائیں گے۔ کیوں خواہ مخواہ کے لئے بزرگوں کو تکلیف دیتے ہو لہذا یہ ارادہ ہی مت کرو۔ میں کہتا ہوں۔

"مولانا! دس بیس جگہ کی بات کیا ہے۔ اگر دس کوڑ جگہ بھی بیک وقت انہیں بلایا جائے تو وہ ہر جگہ جائیں گے۔ کیونکہ جگہ اور مکان ان کے لئے کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتی۔ مکانوں کی قید میں وہ جہم رستے میں جو ہمیشہ مکان تک ہی محدود رہے ہوں۔ اور جو انسان لامکان کی سیر کر آئے ہوں، انہیں مکان کی قید نہیں رہتی لہذا وہ ہر جگہ بیک وقت تشریف لاتے ہیں۔

سامعین!

بات سے بات نکلتی ہے۔ دیکھو نا! ہم یہاں امام باڑہ میں بیٹھے ہوئے

ہیں۔ سورج سر پر آگیا۔ دھوپ لگنے لگے۔ ہم یہاں سے اٹھ کر کسی دوسرے امام بارگاہ میں پہنچے مگر وہاں بھی یہی کہہ رہے ہیں کہ سورج سر پر آگیا۔ اس کے بعد کسی اور جگہ پہنچے تو وہاں بھی یہی کہا جا رہا ہے کہ سورج سر پر آگیا۔ ایک ہی سورج ہے اور کروڑ ہا انسان بیک وقت کہہ رہے ہیں کہ ہمارے سر پر آگیا حالانکہ سورج وہیں ہے جہاں ہے۔

گو باجب معمولی سی نور کی کرنوں کو پہنچانے والا نور بیک وقت کروڑ ہا جگہ ہونے کے باوجود اپنی جگہ رہتا ہے تو اس نور کو نور عطا کرنے والے "نوروں" کے لئے کوئی بے نور آنکھ ایسی ہوگی جو کہہ دے گی کہ یہاں کیسے اور وہاں کیسے؟

بہر نوع وہ مجسمہ نور بیک وقت ہزاروں لاکھوں اور کروڑوں جگہ تشریف لاسکتے ہیں۔ اگر انہیں تصور کرو تو وہ دل میں خیال بن کے آجاتے ہیں۔ اور اگر ان کے مصائب سنو تو قلب میں حلال بن کے آجاتے اور اگر ان کی حالت غضب دیکھو تو انسان کے چہرے پر حلال بن کے آجاتے ہیں اور کہیں محمد کو پکارو تو وہ اس کے ساتھ اس کی آلے بن کے آجاتے ہیں۔ غرض وہ ہر وقت آنے کے لئے تیار ہیں مگر ذرا کوئی انہیں بلا کے تو دیکھیے۔ وہ ضرور تشریف لاتے ہیں۔ مگر ان کے بلانے کا طریقہ یہ ہے کہ ایک دن ایک عقیدت مند حضور امام زین العابدین کی خدمت میں حاضر ہو کر اور عرض کی۔

۱۔ فوزند رسول! حضور کے غلام زادے کی شادی

ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ حضور بھی اس میں تشریف

لائیں۔ تاکہ میری یہ تقریب با برکت ہو جائے ۲

امامؑ نے فرمایا۔

”جہائی! انکار کرتے ہوئے شرم آتی ہے کیونکہ تو بڑی محبت سے آیا ہے مگر میں کیا بتاؤں کہ میں نے سانحہ کربلا کے بعد خوشی کی تقریبوں میں شرکت بند کر دی ہے“

یہ سنکر وہ عقیدت مند بولا۔

”حضور! مجھے معاف کر دیں۔ میں نے حضور کو

دعوت دے کر اذیت پہنچائی ہے“

امامؑ نے فرمایا:

”کوئی بات نہیں۔ خدا تیرے بچے کو پروان چڑھائے

اللہ تیری نسل کو بڑھائے

وہ شخص خاموش ہو گیا۔ اور جب جانے لگا تو امامؑ نے فرمایا۔

”جہائی خوب! ٹھہر جا۔ دل تھوڑا نہ کر۔ میں تیری تقریب

میں ضرور آؤں گا۔ مگر ایسا کر کہ تھوڑی دیر کے لئے میرے بابا

کی مجلس بھی کرے۔ میں مجلس میں آ جاؤں گا اور تیرے ہاں شرکت

بھی ہو جائے گی۔“

بزرگانِ من!

امامؑ زین العابدین کے اس فرمان کی روشنی میں ہر سیدہ زادہ اپنی

خوشی کی تقریب میں اس لئے مجلس عزا منعقد کرتا ہے تاکہ محمدؐ و آلِ محمدؐ

ان موقعوں پر تشریف لائیں اور یہ تقریب بابرکت ہو جائے۔ لہذا

آج ہم پورے فخر سے اعلان کرتے ہیں کہ آج ہماری اس تقریب میں

وہ آئے ہیں جن کے گھر قرآن آیا ہے۔ جن کے گھر نبوت آئی ہے جنکے

گھرامانت آئی ہے۔ جن کے گھر شہادت آئی ہے۔ جن کے گھر عصمت
آئی ہے۔ جن کے گھر صداقت آئی ہے۔ جن کے گھر امانت آئی ہے
جن کے گھر ہدایت آئی ہے۔ جن کے گھر فرشتے خادم بن کے آئے ہیں
گویا آج ہم اعلان کرتے ہیں کہ

”جبرائیل بہ ملائک درباں شد است“

آج ہمارا دروازہ معمولی نہیں ہے بلکہ جبرائیل
تمام فرشتوں کے ساتھ آج ہمارے گھر کی درباری
کورہے ہیں۔

برکیت آج ہماری اس تقریب میں حضرات محمد و آل محمد تشریف
فرمائیں۔ وہ یہاں اگر ہمارے عشق کا امتحان لیتے ہیں کہ تم نے تو ہمیں بُلا
لیا۔ اور ہم اللہ جانے کہاں سے چل کر آئے ہیں۔ (یہ غلط بات ہے کہ
محمد و آل محمد جنت سے آئے ہیں)۔

دیکھو نا!

ایک دفعہ میں نے منبر پر دو باتیں کہہ دیں تھیں جس کی مجھے جواب دی
کرئی پڑی۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ کسی نے پوچھا۔

”زیدی صاحب! حسین نماز پڑھتے تھے؟“
میں نے کہا۔

”جھوٹ کہتے ہو۔ حسین کو نماز پڑھنے کی کیا ضرورت تھی۔
چونکہ حسین کے صدقے میں نماز باقی رہ گئی۔ لہذا حسین
نماز نہیں پڑھتے تھے۔ بلکہ نماز حسین کو پڑھنی تھی۔“

دوسری بات یہ تھی کہ کیا ”آل محمد جنت میں رہیں گے؟“

میں نے کہا۔

”توبہ کرو۔“ آلِ محمدؐ کیوں جنت میں جائیں کیونکہ جنت تو ان کے ادنیٰ غلاموں کے لئے بنی ہے۔ لہذا گورنمنٹ ہاؤس گُجا اور سرونٹ کو ارٹوز گُجا۔ یہ تو سرونٹ کو ارٹوز ہیں جن کا نام جنت ہے۔ خدا نہ کرے کہ آلِ محمدؐ جنت میں جائیں کیونکہ جنت تو آلِ محمدؐ کے غلاموں کے رہنے کی جگہ ہے اور آلِ محمدؐ کے رہنے کی جگہ وہاں ہے جس جگہ کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔

دیکھو نا!

جب ہمارا یہ ایمان ہے کہ آلِ محمدؐ دُنیا کی مرثیے سے پہلے پیدا ہوئے تھے۔ تو وہ جنت سے پہلے بھی پیدا ہوئے تھے۔ لہذا جب جنت نہیں تھی تو وہ کہاں رہتے تھے۔؟ بس جہاں رہتے تھے وہیں رہتے تھے۔ خدا نہ کرے کہ آلِ محمدؐ جنت میں رہیں۔ جنت تو ہمارے لئے بنی ہے۔ جنت تو آلِ محمدؐ کے غلاموں کے (SERVANT QUARTERS) ہیں۔ جو ان کے محل کے قریب ہیں۔ انشاء اللہ ہم ان کو ارٹوز میں جائیں گے۔ اور ہمارے کو ارٹوز کی صفائی اور درستی کے لئے اللہ نے حواریں مقرر کی ہوئی ہیں جن کا کام صرف اتنا ہے کہ ہمارے جانے سے پہلے وہ ہمارے مکانوں کو صاف ستھرا رکھیں اور جب ہم چلے جائیں گے تو ہم انہیں جُھٹی دے دیں گے۔

گویا وہ حواریں ہمارے بھی (SERVANT QUARTERS) میں رہیں گی۔

بہر نوع آلِ محمد جنت سے کہیں دُور سے تشریف لائے
ہیں۔ اور یہاں آکر وہ ہمارا امتحان لیتے ہیں۔ کہ

”ہمیں بلانے والے! تیری ”شادی“ مبارک
ہو۔ تیرا ”سہرا“ مبارک ہو، تیرے گھر والے خوش
رہیں، تیرے مائے باپ کے کیچے ٹھنڈے رہیں تیرے
بہن بھائی خوش رہیں، تیرے دوست احباب
خوش رہیں۔ تو نے ہمیں بلایا ہے، تیرے دل میں ہماری
محبت ہے۔“

اپنی خوشی میں تو ہمیں بھول تو نہیں گیا،
ہم عرض کرتے ہیں۔

”اے آلِ محمد! ہم نہیں بھولے جب
ہمارے ہاں ”بیٹا“ ہوتا ہے تو ہم
اس کے کان میں اذان دینے سے پہلے
تیرے ”اصغر“ کو یاد کرتے ہیں۔ اور جب
اپنے ”جوان“ کی شادی کرتے ہیں تو ہم
تجھے بھولتے نہیں بلکہ اپنے جوانوں کو
سینے سے لگا کر تیرے اکبر و قاسم کے سرے
کو یاد کرتے ہیں۔“

اے آلِ محمد!

ہم تمہاری خوشی اور غمی کو ہر وقت
یاد رکھتے ہیں ہم کسی لمحہ کے لئے بھی

تمہاری یاد سے غافل نہیں ہوتے۔ ہمارا
 رونا بھی تمہارے لئے ہے اور ہمارا
 ہنسنا بھی تمہارے لئے ہے۔

اے رب العزت !

ہم بڑے کمزور اور نالائق گناہ گار ہیں اور دین محمد کی انت
 ہمارے پاس ہے۔ اس کی تو حفاظت فرما۔ ہمارے وارث کے
 ظہور میں تحلیل فرما کیونکہ دنیا نے ہمیں یتیم اور لا وارث سمجھ لیا
 ہے۔ لہذا ہم دنیا کو دکھا سکیں کہ ہم تنہا نہیں ہیں بلکہ ہمارا وارث
 بھی موجود ہے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ
 اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّآلِ مُحَمَّدٍ



اسیر بغداد

عزاد ارسید الشہدا!

حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام عرصہ چودہ سال سے بنی عباسیہ کے حبیب تاجدار ہارون رشید کے دور ملوکیت میں تنگ و تاریک قید خانہ میں بند ہیں۔ اگر مؤلا کھڑے ہوتے ہیں تو قید خانہ کی چھت نیچی ہے اور اگر لیٹتے ہیں تو پاؤں نہیں پھیلتے۔ گویا اسی تنگ و تاریک کوٹھری میں فرزند رسول قید ہیں۔ ادھر ہارون رشید چاہتا ہے کہ امام شہید کر دیئے جائیں اور میرے ذمہ خون بھی بظاہر نہ ہو لہذا اس نے بہت سی تدبیر اختیار کیں۔ یہاں تک کہ افریقہ کے جنگلوں سے کچھ جنگلی آدمی جو یہ جانتے ہی نہ تھے کہ انسانیت کیا شے ہے، جانوروں کی طرح انہیں وہاں سے گرفتار کر کے بغداد منگوا لیا گیا۔ انہیں شراب پلائی گئی اور جب وہ بالکل وحشی بن جاتے تو انہیں ایک ایک تلوار دے دی جاتی اور کہا جاتا کہ سامنے والی چار پائی پر پڑی ہوئی چادر کے نیچے والی لکڑی پر زور زور سے تلواریں مارو۔ گویا وہ اس طرح مشق کرتے رہے۔

جب چالیس دن گزر گئے تو ان کا محرک جو مشق کروا رہا تھا انہیں لیکر قید خانے میں پہنچ گیا۔ ادھر امام چادر اوڑھے ہوئے لیٹے ہوئے تھے ان وحشیوں کو شراب پلا کر تلواریں دی گئی تھیں۔ کیونکہ لکڑی پر تلواریں

مارنے کی انھیں عادت تو پہلے ہی سے تھی لہذا امام کی طرف اشارہ کر کے کہا گیا کہ ان کے جسم پر تلواریں مارو۔ چنانچہ انہوں نے اپنی عادت کے مطابق تلواریں کھینچی اور ادھر امام نے اپنے منہ سے کپڑا اٹھایا۔ اب جو وحشیوں نے چہرہ امام دیکھا تو تلواریں پھینک کے امام کے قدموں پہ گر گئے۔ اب جو رنگ ماسٹر نے یہ منظر دیکھا تو فوراً ہارون کے پاس پہنچا اور کہنے لگا۔

”ہارون! غضب ہو گیا۔ وہ وحشی بجائے قتل کرنے کے امام کے قدموں پہ گر گئے ہیں“ چنانچہ ہارون نے انہیں بلوایا اور جب پوچھا تو انہوں نے جواب دیا کہ

”ہم نے اُسے پہچان لیا ہے“

ہارون پوچھتا ہے ”وہ کون ہے؟“

انہوں نے کہا ”جب ہمارے جنگلوں میں بارش نہیں ہوتی تھی تو یہ انسان وہاں پہنچ کر بارش برساتا تھا۔“

سامعین!

یہ ہے شانِ امامت۔ اگر دُنیا اس کو گھٹانا چاہے تو اللہ کی دی ہوئی نعمت ہے جو کسی کے گھٹانے سے نہیں کھٹائی جاتی۔ یہ اور بات ہے کہ دُنیا والے آل محمد کو قید خانوں میں مقید کر سکتے ہیں مگر آل محمد وہی کریں گے جو اللہ چاہتا ہو۔ خدا کی مرضی و مشیت کے بغیر ان کا کوئی قول و فعل ان سے سرزد نہیں ہو سکتا۔

بہر نوع امام موسیٰ کاظمؑ اس قید خانہ میں قید ہیں اور اس قید خانے

کا دروغہ ابن شاذلوک جو شتر سے بھی بدتر تھا۔ اس کے ذریعہ سے
 موٹا کو ۲۳ رجب کو زہر دیا گیا۔ جب موٹا کی حالت بہت خراب
 ہو گئی تو ہارون نے اس ڈر سے کہ کہیں لوگوں کو زہر کا پتہ نہ چل جائے :
 ایک عیسائی طبیب کو بلوا بھیجا کہ موٹا کا معائنہ کرے اور یہ کہے کہ موت
 طبعی ہوگی۔ بہر کیف وہ طبیب آیا اب ابن شاذلوک موٹا سے کہتا ہے
 ”دیکھو! طبیب آرہا ہے۔ خبردار جو تم نے اس
 سے کھا کہ جھلے زہر دیا گیا ہے“

یہ کہہ کر وہ لعین وہیں بیٹھ گیا۔ طبیب پہنچا۔ موٹا کا معائنہ کیا۔ موٹا نے
 زبان سے کچھ نہ کہا البتہ اپنی تھیلیاں طبیب کے سامنے کر دیں۔ اب جو
 طبیب نے دیکھا تو بیخ ماری ”بھائے۔ اس قیدی کو تو زہر دیا گیا ہے“
 رادھر محافظ نے یہ سمجھا کہ امام نے خود بتا دیا ہے۔ چنانچہ قیدی امام سے
 ایسا سلوک کیا کہ دنیا کا یہ پہلا قیدی تھکڑی میں بندھے ہوئے ہاتھوں
 اور پاؤں میں پڑی ہوئی بیڑیوں کے ساتھ قید حیات سے آزاد ہو گیا۔
 جب امام کی موت کی خبر ہارون کو پہنچی تو وہ ظالم کہتا ہے کہ چار مزدور
 لے جاؤ اور امام کی لاش کو دفن نہ کرو بلکہ دجلہ کے پل پر رکھ دو۔ تاکہ رات
 کے وقت خنجر گدھے اور گھوڑوں کے گزرنے سے لاش پامال ہو جائے گا
 تاکہ صبح ہم کہہ سکیں کہ قید سے فرار ہو گیا تھا اور راستے میں مارا گیا۔ چنانچہ ایسا
 ہی کیا گیا۔ تقریباً آدھی رات گزرنے کے بعد ہو پارلیوں کا ایک قافلہ گزرا
 تو ان کے جتنے ہی جانور تھے جب پل کے قریب پہنچے تو روک گئے۔ لوگ بڑے
 حیران تھے کہ یہ جانور آگے کیوں نہیں چلتے۔ آخر انھوں نے دیکھا کہ پل پر
 ایک قیدی کی لاش پڑی ہوئی ہے۔

حضور والا !

بغداد میں ایک لوہار رہتا تھا۔ رات کو جب وہ سویا تو کسی نے اس کے دروازے کی "کنڈی کھڑکائی" لوہار اپنے بستر سے اٹھا دروازہ کھولا اور دیکھا کہ ایک برقعہ پوش خاتون سامنے کھڑی ہے جو اس سے یہ کہہ رہی ہے "تو نے گزشتہ سال ایک منت مانی تھی کہ اگر خدا نے بیٹا عطا فرمایا تو میں فاطمہ کے کسی بیٹے کی خدمت کروں گا۔"

لوہار نے عرض کی۔

"ہاں بی بی ! مجھے یاد ہے مگر تجھے کیسے پتہ چلا؟ برقعہ پوش خاتون نے فرمایا۔

"میں ہی وہاں بد نصیب فاطمہ ہوں۔"

بہر نوع لوہار سر جھکائے ہوئے خاتون علیا کے ساتھ ساتھ چل پڑا اور جب پل پر پہنچا تو بی بی نے عرض کی۔

"یہ ہے میرا بیٹا۔ اس کی ہتکڑی اور بیڑی اتار دو"

لوہار نے بسم اللہ پڑھ کے امام مظلوم کی ہتکڑی اور بیڑی اتار دیں۔ اور بعد میں ایک تانے نے غریبوں کے قبرستان میں امام مظلوم کو دفن کر دیا۔

بزرگان من !

دنیا کی ستم ظریفی دیکھو کہ اگر یہاں کوئی پرہیزی مرجائے تو چندہ کر کے لوگ اس کا کفن خریدیں گے اور نہایت شان سے اسے دفن کریں گے مگر آل محمد کی بد نصیبی دیکھو کہ آج بغیر کفن کے غریبوں اور لا داروں

کے قبرستان میں فرزند رسول دفن کر دیا گیا۔

یاد رکھو !

اسے کہتے ہیں تصرف امامت۔ ہارون و مامون کی قبر تک کے نشانات کہیں نہیں ملتے اور نہ ہی کوئی نشان بتانے والا ہے کہ کہاں دفن کئے گئے ہیں اس لئے کہ زمین ہے "البوترا ب" کی مالکیت خدا جانے کہاں ہیں مگر ذرا وہاں جا کر دیکھو جہاں دُنیا کے بڑے بڑے شہنشاہ اپنے تاج ہاتھوں میں لئے، سر جھکائے ہوئے کھڑے ہیں۔ جہاں طوبی کا سایہ ہے جہاں حوریں دست بستہ کھڑی ہیں۔ جہاں کوثر کا کنارہ ہے۔ جہاں جنت کی بہاریں ہیں۔ جہاں ایمان ملتا ہے اور جہاں اسلام کا تعارف ہوتا ہے۔ آج ہم اس مظلوم امام کی شہادت کا دن منا رہے ہیں اور دُنیا بیٹھی رو رہی ہے۔

”بیٹی! تو لوہار کو بلانے گئی تھی اس سے یہیں اندازہ ہوتا ہے کہ تمہیں اس بیٹے کا بڑا درد تھا لہذا آج ہم نے تیری سنت کو پورا کرنے کے لئے تیرے غلاموں کو بلایا ہے جو بغداد کے غریب کا ماتم کریں گے اور اسے روئیں گے

عزاء دار سید الشہداء !

میرا ایمان ہے کہ جب سیدہ طاہرہ سلام اللہ علیہا اپنے اس مظلوم بیٹے کی صف ماتم بچھا لیتی ہیں تو جناب زینب تشریف لاتی ہیں اور فرماتی ہیں۔

”اماں! تم آرام کرو۔ میں آگئی ہوں۔ میں اپنے

چاند کی صف ماتم بچھاتی ہوں“

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ

وَفَاتِ سَيِّدَةٍ

حضراتِ محترم!

اللہ کا یہ فرمان ہے "ایمان والو! حیب تم پر کوئی مصیبت پڑے تو اپنے اللہ کو یاد کرو ان لفظوں۔

"إِنَّا إِلَهُهُ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ"

سَمَاعِیْٹے!

کائنات کی سب سے بڑی ہستی حضور سیدہ طاہرہ آج اس دُنیا سے رخصت فرما چکی ہیں۔ اور آپ کی صاحبِ توفیقِ اولاد مومنین کی زیارت کیلئے آج جنازے کی شبیہ برآمد کرنے لگی تاکہ مومنین اپنے توکل کو پیدا کر کے حضور رسالت مآب، حیدرِ رکش اور سیدہ طاہرہ کے بچوں کو سیدہ کا پرستہ دیں سکیں۔

بزرگانِ محترم!

۲۸ صفر کو رسالت مآب کی رحلت ہوئی اور آج ۳ جمادی الثانی کو تقریباً پچانوے دن بعد جناب سیدہ طاہرہ کی رحلت ہوئی۔ گویا تین مہینے سیدہ نے اس دُنیا میں اس طرح گزارے ہیں کہ باپ کے زمانے کی زندگی بھی ان کے سامنے تھی اور باپ کی رحلت کے بعد کی زندگی بھی سامنے تھی۔ باپ کے سامنے کی زندگی کا یہ عالم تھا کہ مولانا روم نے اپنی مثنوی میں لکھا ہے کہ۔

جب آبیہ جہنم مازل ہوئی تو اپنی اُمت کے درد سے رسالت مآب نے رونا شروع کیا۔ اتنا روئے کہ کسی طرح حضور کارونا رکتا نہیں تھا۔ جب اصحاب نے یہ منظر دیکھا تو عرض کی۔

”یا رسول اللہ! ہم اپنے سارے نیک اعمال اگر

اُمت کو دے دیں تو کیا گناہ گار بیچ جائیں گے“

حضور نے فرمایا ”نہیں“

بہر لزج جب کسی طرح رونا بند نہ ہوا تو سلمان فارسی جناب سیدہ کے پاس پہنچے۔ دروازے کی گنڈی ہلائی۔ بی بی نے پوچھا۔

”کون؟“

سلمانؓ نے عرض کی۔

”شہزادی عالم! میں سلمان ہوں“

”سلمان! خیریت ہے؟“

سلمانؓ نے عرض کی۔

”شہزادی! آج خیریت نہیں“ صبح سے تمہارے والد بزرگوار

رو رہے ہیں۔ حضور کارونا کسی طرح رکتا نہیں۔

سیدہؓ نے فوراً برقعہ پہنا۔ پیروں میں موزے پہنیں۔ اور مسجد میں

تشریف لائیں۔ سیدہ کو آتے دیکھ کر رسول اپنے آنسو پونچھتے ہوئے

تعظیم کو کھڑے ہو گئے۔ چند قدم بڑھ کر استقبال کیا اور پوچھا۔

”بیبی! تو نے کیوں زحمت فرمائی ہے؟“

سیدہؓ نے فرمایا۔ ”بابا جان! میں نے سنا ہے آپ صبح سے

رو رہے ہیں۔

ہاں بیٹا۔ آج ایسی بات تھی۔ رسول نے سیدہ کو اپنی جگہ بٹھایا اور خود سیدہ کے سامنے بیٹھ گئے اور پوچھا۔

”ہاں بیٹا۔ اب بتاؤ۔“

”بابا جان! آپ رو کیوں رہے ہیں؟“

رسول نے جواب دیا۔

”بیٹی! بات یہ ہے کہ آج آبیہ جہنم نازل ہوئی ہے

جس میں بتایا گیا ہے کہ میری اُمت کے گناہ گار انسان جہنم میں جا بیٹھ گئے ہیں۔ اس وجہ سے رو رہے ہوئے لگا ہوں۔“

سیدہ نے فرمایا۔

”بابا جان! آپ بالکل نہ گھبراہٹ میں وعدہ کرتی ہوں کہ تیری سچی

اُمت کے جو گناہ گار ہوں گے انہیں میں بخشاؤں گی۔“

”بیٹا! تو کیسے بخشائے گی؟“

رسول نے جب یہ پوچھا تو سیدہ قبلہ روح ہو گئیں اور دُعا کے لئے

ہاتھ اٹھالئے۔

”خداوند! میرے باپ بڑے پریشان ہیں ان کی

اُمت کو بخش دے۔“

یہاں مولانا روم لکھتے ہیں۔

پس نگاہِ آمد ز حاجتِ رسول

من دُعاے فاطمہ کرم قبول

اللہ نے اُسی وقت وحی کی ”محمد! فاطمہ کی دُعا

ہم نے قبول کر لی ہے۔
 اور باپ کی رحلت کے بعد کے حالات کچھ اس طرح تھے۔ کہ
 باپ کے انتقال کو تین دن گزرے ہیں سیّدہ
 کو رونے سے ہوش بھی نہیں آیا ہے۔ ابھی
 پُرسہ دینے والی عورتیں چاروں طرف بیٹھی
 ہیں۔ محمد کی یتیم بچی ابھی زمین پر ہی بیٹھی
 ہے کہ آپ کو معلوم ہوا کہ میرے باپ نے ہمارے
 گزارے کیلئے جو زمین دی تھی وہ حکومت نے ضبط
 کر لی ہے۔

یہ سن کر سیّدہ نے یہ سوچا کہ شاید حکومت کو کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے۔
 لہذا میں خود جا کر حاکم وقت سے کہتی ہوں تاکہ حکومت وقت کی غلط فہمی دور
 ہو جائے۔

چنانچہ سیّدہ مسجد نبوی کے دروازے پہ تشریف
 لائیں۔ سامنے چادر پکڑے عورتیں کھڑی ہو گئیں
 اور چادر کے پیچھے سے سیّدہ بڑے آرام سے فرماتی
 ہیں۔

”میرے باپ کی مسجد میں بیٹھنے والو! تمہیں
 میرے باپ کی عزت و عظمت یاد ہو گی۔
 میں فاطمہ! تم سے اپنے باپ کے لہجے
 میں کھ رہی ہوں کہ میرا گزارا بھلے واپس
 کر دو۔“

سَامَعِین !

جب سیدہ نے یہ فرمایا کہ :-

”میرا گذارا مجھے واپس کو دو“ ————— تو
ساکم وقت نے ایسا جواب دیا ہے کہ :-

”فاطمہ اپنے دونوں ہاتھوں سے دلے پکڑ کے

گھر واپس آ گئی۔“

زینب نے پوچھا :-

”امات ! کیا جواب ملا ؟“

سیدہ نے فرمایا :-

”بیٹی زینب ! اُمّت کے آج میں نے طور طریقے

ایسے دیکھے ہیں جن سے معلوم یہ ہوتا ہے کہ

تیرے چادر کے خیریت نہیں۔“

اس کے بعد بی بی کو اتنا صدمہ ہوا کہ آپ دوبارہ اُٹھ نہ سکیں ہر وقت
رونے میں گذرتا۔ امیر المومنین تسلی دیتے۔ گھر میں خوانین تسلی دیتیں۔

سَامَعِین !

آہستہ آہستہ وقت گذرنا گیا۔ جب ۲ جمادی الثانی آئی تو جناب
سیدہ کی طبیعت اتنی زیادہ خراب ہو گئی کہ جناب امیر المومنین کو لیفین ہو گیا
کہ بیماری حد تک پہنچ گئی ہے۔

بہر نوع رات گزری۔ ۳ جمادی الثانی کا دن چڑھا۔ امیر المومنین نے
دیکھا کہ سیدہ اٹھیں غسل فرمایا۔ لباس بدلا۔ بچوں کے کپڑے دھوئے پھر
بیٹی کا سر دھویا حسنین کو نہلایا۔ بچوں کے کپڑے بدے۔ گھر میں صفائی کی

دو تین دن کا کھانا پکا کے رکھا۔ امیر المومنین نے سیدہ کو جب اس طرح گھر کا کام کرتے دیکھا تو مسکرا کے فرمایا: "مَا شَاءَ اللَّهُ" رسول کی بیٹی! آج طبیعت ٹھیک معلوم ہوتی ہے۔

بی بی نے فرمایا:-

"یا علی! فکر نہ کرو۔ آج عصر تک طبیعت بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔"

علی نے پوچھا "کیا بات ہے؟"

سیدہ نے فرمایا:-

میں نے رات اپنے باپ کو خواب میں دیکھا ہے۔ وہ مجھے فرماتے تھے "ما طمئنه! نہیں تیرے استقبال کو آیا ہوں"

لہذا آج میں اپنے باپ کی خدمت میں جا رہی ہوں۔ میں نے اسلئے بیٹوں کو نہلا دیا ہے تاکہ میرے صدمے میں پریشان ہو کر کہیں بچے رول نہ جائیں اور اُن کیے پہرے پر یہ نہ بن پائے کہ یہ بن ماں کے ہو گئے ہیں۔ میں نے زمینب کے بال اس لئے ٹھلا دیئے ہیں کہ معصوم بچی اپنے بال دھرنہ سکے گی۔ میں نے حسین کو لباس اس لئے پہنا دیا ہے تاکہ میں انہیں بھی شکستہ نہ دیکھوں اور میں نے دو دن کا کھانا بھی پکا کے رکھ دیا ہے کہ میں اپنے بچے فاقہ سے نہ دیکھ سکوں۔"

سیدہ کے یہ الفاظ شکر علی کا دل ٹوٹ گیا۔ مسجد میں تشریف لائے و غامیں پڑھنا شروع کیں۔

سماعین!

جب آج کا دن ڈھلا تو سیدہ طاہرہ نے عاصمہ اور فطمہ کو بلایا اور

فرمایا:-

”تم دونوں خواتین میرے بچوں کو ذرا باہر بلاؤ۔ میں اپنے حجرے میں جا رہی ہوں“ تم بچوں کو اندر نہ آنے دینا۔

چنانچہ یہ دونوں خواتین شہزادوں کو باہر لے کر بیٹھ گئیں۔ سیدہ حجرے میں چلی گئیں۔ تھوڑی دیر بعد چھوٹے شہزادے نے کہا۔

”امام! فضلہ! میں اپنی ماں کے پاس جانا چاہتا ہوں“

اب فضلہ کی کیا مجال کہ شہزادے کو روکے۔ اُدھر سیدہ کہہ رہی ہیں کہ ”بچو کو آنے نہ دینا“ اُدھر حسین کی یہ ضد کہ ”میں جانا چاہتا ہوں“۔

ہر نوع حسین حجرے کا دروازہ کھول کر اندر تشریف لائے۔ دیکھا کہ سیدہ کا سر سجدے میں ہے اور بڑی خفیف آواز میں کہہ رہی ہیں۔

”سبحان ربی لا علی“

ایک منٹ تو حسین نے دیکھا۔ پھر آگے بڑھ کے ماں کا سر گود میں لے لیا اور کہا۔

”امام! میں حسین ہوں۔ مجھ سے بات کرو“

ماں نے آنکھیں کھول کے بیٹے کو دیکھا اور فرمایا ”حسین بیٹا! صبر کرو“ بس یہ آخری فقرہ تھا جو ماں بیٹے سے کہہ چکی۔ حسین نے ماں کا سر سجدے میں رکھ دیا۔

سَمَاعِینَ!

پچاس سال بعد تاریخ نے اپنے آپ کو دہرایا۔ آج حسین نے فاطمہ کا سر سجدے سے اٹھا کے اپنے گود میں لیا اور فاطمہ نے کہا ”حسین بیٹا! صبر کرو“ اور پچاس سال

بعد کر بلاجسٹینے کا سر سجدے سے اٹھا کے فاطمہؑ نے گود میں لیا اور

حسینؑ نے کہا۔ "امات! صبر کرو"

بہر نزع حسینؑ باہر تشریف لائے۔ تھوڑی دیر بعد فضہؑ اندر گئیں اور
سیّدہ کو دیکھ کر باہر نکلی اور سیدھی مسجد میں گئی۔

"یا علیؑ! قالوا انّا لله وانا الیہ راجعون"

"یا علیؑ! ہمارے کائنات لٹے گئے"

"یا علیؑ! دُنیا ہمارے لئے تاریک ہو گئی"

"یا علیؑ! آج ایمان یتیم ہو گیا"

"یا علیؑ! آج قرآن بے قاری ہو گیا"

"یا علیؑ! آج محمدؐ کا دین ویران ہو گیا"

"یا علیؑ! آج سیّدہ اپنے باپ کے پاس چلی گئی"

علیؑ بغیر نعلین کے بغیر عامہ کے مسجد سے اُٹھے اور گھر میں آئے اور
دیکھا کہ سیّدہ کی رحلت ہو چکی ہے۔ اس وقت علیؑ نے ایک مرثیہ پڑھا ہے
جس کا مطلب یہ تھا۔

"اے رسولؐ کے بیٹے! اسے بھری دنیا میں تم مجھے

تنہا چھوڑ گئیں۔ اب میں بالکل تنہا رہ گیا۔ اب تیرے

بچوں کے نگہبان کون کرے گا۔ اور مجھے تسلی کون دے گا؟

اس کے بعد امیر المؤمنینؑ نے فرمایا "اُمّ فضہؑ عاصمہؑ غسل کفن کا

تمام کرو"

ساعتیں!

اتنے میں رات ہو گئی۔ جب کفن پہنا چکے اور جنازہ تیار ہو گیا تو

امیر المؤمنین نے فرمایا۔

”فاطمہ کے بچوں کو بلاؤ“

چنانچہ بچے تشریف لائے۔ علیؑ نے سب سے پہلے حضور حسنؑ مجتبیٰ سے فرمایا۔

”حسن بیٹا! تمہاری ماں کے وصینے تھی کہ جنازہ رات کو اٹھایا جائے“

لہذا آج رات تھوڑی دیر بعد جنازہ اٹھایا جائے گا۔ تو اپنے ماں کا آخری دیدار کر لے“

چنانچہ حسنؑ آگے بڑھے۔ ماں کا منہ دیکھا۔ بدن میں لرز پیدا ہوا۔ اور بے ہوش ہو کر گر پڑے اس کے بعد امیر المؤمنین نے فرمایا

”حسین بیٹا! آؤ۔ تم بھی ماں کا منہ دیکھ لو“

حسینؑ جواب میں فرماتے ہیں:-

”بابا جانے! کیا میری ماں کے عزتے مرثیہ سے کم ہے؟“

علیؑ نے فرمایا۔

”نہیں بیٹا۔ بلکہ زیا“

”بابا جانے! اگر مرثیہ نے جنازے میں عیسیٰؑ سے بات کی

تھی تو کیا میری ماں مجھ سے بات نہیں کر سکتی۔ میں اس

شرط سے ماں کے پاس جاؤں گا کہ وہ خود مجھے پکارتے

حسینؑ نے یہ کہہ کے سیدہ سے خطاب کیا:-

”امات! مجھے آواز دے“

بی بی نے کوئی آواز نہ دی۔ پھر حسینؑ بولا ”امات! مجھے پکارو“

پھر بھی جواب نہ ملا۔ آخر حسین نے پورے جوش سے کہا:-
 "انا اب! تجھے میری ہی قسم، مجھے آواز دو۔"
 اب جو حسین نے یہ کہا تو سیدہ کا جنازہ تڑپ اٹھا اور
 "سیدہ نے" ہائے "کہہ کے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے اور
 حسینے مات کی میت کے سینے پہ جا کے لیٹے گئے اور سیدہ
 نے دونوں ہاتھ حسینے کے کمر پر رکھ دیئے۔ تمام شہر مدینہ
 میں زلزلہ آنے لگا۔ علیؑ نے بڑھ کر حسینے کو گود میں اٹھا لیا
 "حسینے بیٹا! اگر تم تھوڑی دیر اور مات سے لپٹے رہے
 تو قیامت آجائے گی۔"

امیر المومنین پوچھتے ہیں:-

"بیٹا! مات سے کیا باتیں ہو رہی تھیں؟"

حسین جواب میں فرماتے ہیں:-

"با با جانے! میں امان سے وعدہ لے رہا تھا کہ

امام اسے وقتے تو تم جارہے ہو مگر جب میرا آخری وقتے

ہو گا تو آٹے کی نا۔"

بہر ذہ جب جناب امیر المومنین نے حکم دیا کہ سیدہ کا جنازہ اٹھاؤ۔

رفض نے عرض کی:-

"سؤلا! اگر آپ اجازت دیں تو میں بنی ہاشم کی عورتوں کو

بلاؤں۔"

آپؐ نے فرمایا "کسی کو نہ بلاؤ۔ ہمارے جنازے اس طرح نہیں اٹھیں گے

سما معینے! رسول کا جنازہ تنہا علیؑ نے دفن کیا۔ علیؑ کا جنازہ

حسین نے دفن کیا۔ حسن کے جنازے پہ تیر برس گئے
اور حسین کے جنازے پہ جو گزری وہ دنیا کو معلوم ہے۔ اور
آج سیدہ کا جنازہ اس طرح اٹھا کر ایک طرف تو خود اٹھا ہوا تھا اور دوسری
طرف سے علیؑ نے اٹھایا ہوا تھا اور دو بچے جنازے کے ساتھ ساتھ چل رہے
تھے۔ حسین نے پوچھا۔

”بابا جانے! آپ نے آنکھیں کیوں بند کی ہوئی ہیں؟“
امیر المؤمنین نے جواب دیا۔

”شہزادو! تمہارے نانا نے جنازہ اٹھایا ہوا ہے اور میری شرم سے آنکھیں
بند ہیں کہ کہیں رسولِ محمدؐ سے یہ نہ پوچھ بیٹھیں۔“

”علیؑ! میرے بعد تو نے میری بیٹی کی کیا حفاظت کی؟“ تو میں کیا
جواب دوں گا۔ اس لئے میں نے آنکھیں بند کی ہوئی ہیں۔“
اب جو علیؑ نے یہ کہا تو حسین فرماتے ہیں۔

بابا جانے! کیا ہم اتنے غریب ہو گئے ہیں کہ ہمارا جنازہ بھی چار
آدمی نہیں اٹھا سکتے۔“

علیؑ نے فرمایا حسین بیٹا! منکر نہ کرو۔ آج تم پر غربت ہے کہ
تمہاری ماں کے جنازے میں کوئی شریک بھی نہیں ہوا۔ مگر تمہاری سناٹا
تک تمہاری ماں کا جنازہ اٹھاتی رہے گی اور اتنا ماتم ہو گا کہ دنیا کے کسی جنازہ پر
نہ ہوا ہو گا۔“

سما عینے!

علیؑ کے اس فرمان کے مطابق آج فاطمہؑ کے بیٹے سیدہ زادے اور
سیدان سیدہ کا جنازہ اٹھائے کہہ رہے ہیں۔

”مؤلا! اگر اس وقت ہم موجود ہوتے تو فاطمہؑ کا جنازہ ہم اسی شان، عظمت اور وقار سے اٹھاتے جس طرح ہم آج اٹھا رہے ہیں۔“

جنازے کے ساتھ سید بھی ہیں۔ سیدانیاں بھی ہیں اور میں سیدانیوں سے استعجا کرتا ہوں کہ جب جنازہ زنان خانے میں جائے گا تو ننگے سراس جنازہ کو اٹھائیں اور زینب کو سیدہ کا پُرسہ دیں
 ”بی بی زینب! تیرے اماں کا جنازہ تیرے کنیزوں نے اٹھایا ہوا ہے سیدہ کے بیٹو!“

یہ اُس غریب کا جنازہ ہے جس کا جنازہ اٹھانے والا کوئی نہیں ہے۔ آج ہمارے لئے قیامت کی رات ہے۔ آج رسولِ قبر سے باہر تشریف لائے ہیں۔ آج علیؑ کے سر پہ عامہ نہیں ہے۔ آج زینبؑ کے سر پہ چادر نہیں ہے۔ آج حسنینؑ یتیم ہو چکے ہیں۔ آج زینبؑ کے بال کھلے ہوئے ہیں حوریں ماتم کر رہی ہیں اور علیؑ آواز دے رہے ہیں۔

”کہاے ہو میرے پیارے سید زادو!
 آؤ اپنے دادی کے جنازے کو کندھا دو۔“

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ



پَروردِ آغوشِ رسالت

خداوند عالم کی حمد و ثناء کے بعد حضرات محمد و آل محمد پر درود و سلام
سامعین سے کوا مر!

خداوند عالم نے اپنے خاص فضل و کرم سے دُنیلے انسانیت کو انسان کے اپنے
قائم کردہ اصول و ضوابط سے نجات دلا کر ایک ایسا ہمہ گیر اور عالم گیر نظامِ حیات
عطا فرمایا ہے کہ جس پر عمل کرنے سے ایک انسان دوسرے انسان کی غلامی سے
ہمیشہ کے لئے آزاد ہو جائے اور کوئی انسان اپنی مادی طاقت کے بل بوتے
پر کسی دوسرے انسان پر حکومت نہ کر سکے۔ گویا اس عدل اور مساوات انسانی
پر قائم نظام کا نام اسلام ہے۔

اسلام ہی وہ دین ہے، اسلام ہی وہ طریقہ حیات ہے جس نے تمام
انسانوں کو اخوت و برادری کے مضبوط رشتہ میں منسلک کر دیا ہے اور بتا
دیا ہے کہ انسان دوسرے انسانوں پر فوقیت صرف اس صورت میں رکھتا ہے
کہ وہ جتنا زیادہ متقی ہوگا۔ اچھے اخلاق سے آراستہ ہوگا، اپنے خدا سے قریب
ہوگا۔ اتنا ہی زیادہ باعزت ہوگا۔

حضور والا!

یہی وہ نظام تھا جس کو قبول کرنے کے لئے وہ طبعیں آسانی سے
تیار نہ تھیں جنکی نسلیں محض مادی برتری کی بنا پر لوگوں پر حکومت کرنے

گذریں یا جنھوں نے دوسروں کی کائی پر عیش کئے اور جو صرف مادی طاقت کے بھروسے پر دوسرے لوگوں پر بلا وجہ تسلط رہے نتیجہ یہ نکلا کہ بانی اسلام کی رحلت کے کچھ ہی دن بعد وہ جاہلی نظام، وہی انسان پر انسان کی حکومت وہی توقف و برتری کا جذبہ، وہی انسانی ذہنی غلامی، گویا یہ سب چیزیں فریاد و ملکیت کی شکل میں دنیا کے سامنے آ گئیں۔ اس کا سب سے بڑا افسوسناک پہلو یہ تھا کہ ایک طرف بنو نضیر و ملکیت کی بہترین شکل کی نمائندگی کرتے ہوئے اپنے کو خلیفۃ المسلمین، رسول کا نمائندہ اور اللہ کا نائب بھی قرار دیتا تھا اور دوسری طرف مسائل شرعیہ اور فرمان خدا اور رسول خدا کا مذاق اڑایا جاتا تھا۔ گویا بنو نضیر کی اس ظالمانہ اور جاہلانہ حکومت کو تسلیم کے معنی یہ تھے کہ یہ مان لیا گیا ہے کہ خدائی نظام یہی ہے اور اسلام کی تعلیم یہی ہے۔

سامعینے!

بنو نضیر کی اس ظالمانہ روش کو چاہے ساری دنیا تسلیم کرے یا نہ کرے مگر پروردہ آغوش رسالت فاطمہ کے دودھ سے پلا ہوا انسان جس کے رگ و ریشہ میں صحیح اسلامی رُوح سراٹھائی ہوئے تھے جو اسلام کی حقیقی جاگتی، ایک تصویر تھا جس نے بانی اسلام کے سینے اور گانڈھوں پر پھیل کر پرورش پائی تھی۔ جس نے پیدا ہوتے ہی زبان رسالت چوس کر پہلی غذا حاصل کی تھی جس کو رسول نے جو انانِ جنت کا سردار کہا تھا۔ باغیرت باپ کا باغیرت بیٹا اور دنیا کے سب سے عظیم انسان کا عظیم نواسہ! کبھی یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ ایک جاہر و ظالم حکمران اپنی حکمرانی کے غرور میں اسلامی اصول کو پاؤں مار کر دنیا کے سامنے یہ ثابت کرے کہ انسان کی ذہنی غلامی ہی اسلام کی تعلیم تھی۔ لہذا وہ محمدؐ نظم اس اصول کو ختم کرنے کے لئے اور اس اصول کی اطاعت نہ کرنے

کے لئے اور ہر قسم کی مصیبتوں اور آفتوں کا مقابلہ کرنے کے لئے میدانِ عمل میں
اُتر آیا۔

یا در کھو!

حسین علیہ السلام ہی ان تمام خوبیوں کا منظر ہیں جن کے نام کے اندر تمام
اخلاقِ حسد منفر ہے۔ آج دنیائے انسانیت کا عظیم ترین ہیرو اور مسلمانوں کا مایہ ناز انسان
اور دنیائے اسلام پر حکومت کرنے والا شہید یعنی حسین ابن علیؑ محض اس لئے اپنے
خوبصورت بچوں اور اہل و عیال، دل کے ٹکڑوں اور اپنے جگر گوشوں کو لیکر میدانِ
عمل میں اُتر آیا کہ میرے نانائے اور ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء نے جس ماد لاندہ
نظام کی بنیاد رکھی تھی وہ ایک شخص کے ہاتھوں مسٹ رہا ہے جسے میں مٹا ہوا
نہیں دیکھ سکتا۔ لہذا میں اس کے خلاف جہاد کروں گا، گو یا حسین کی یہ جنگ
نہ تھی بلکہ اصول کی خاطر ایک جہاد تھا۔

عزادار سید الشہداء

خدا نے اس عظیم جہاد کے لئے یومِ عاشوراءؑ کی تاریخ مقرر فرمائی
تھی۔ کربلا کا چٹیل میدان، ریگزار اور بیابان جنگلی جس میں انسان گزرتے ہوئے
ڈرنے لگے تھے۔ مگر قدرت اپنی حکمت سے اس جنگل کو اس خیر و شر کے معرکہ کے بعد
عرشِ معلیٰ کا ہمسربا بنا چاہتی تھی۔ لہذا آج حسینؑ اپنے عزیز ترین متاع کو لئے
ہوئے اس بیابان میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ ایک طرف دشمن کی مادی طاقت کی
پوری یلغار حکومت کی منظم فوجوں کی یورش، خزانوں کے منہ کھلے ہوئے بے شمار
تلواریں کی جھنکار بے انتہائیزوں کی جھلک اور ہزاروں کانوں کا کھینچنا اور دوسری
طرف بہتر بھوکے پیاسے جن میں بوڑھے بچے اور کمزور عورتیں ہیں کوسٹے ہوئے
دنیا کا سب سے بڑا اخلاقی طاقت کا منظر انسان، انسانی مساوات کا سب سے

بڑا علمبردار اور رسول اسلام کے کندھوں پر کھیل کر جو ان ہونے والا انسان اپنی
بظاہر کمزور فوج کو یکسر دنیا کی سب سے بڑی طاقت سے نبرد آزما ہونے کے لئے
کر بلا میں موجود ہے۔

بزرگانِ منہ!

چشمِ فلک نے ستاروں کی عینک لگا کر دیکھا کہ شامِ عاشور فوجِ یزید اپنی ظاہری
فتح کا جشن منا رہی تھی۔ "ہاٹے ہو" اور شور و شر سے کر بلا کا میدان گونج رہا تھا
اور ایک طرف خمیوں کی جلی ہوئی راکھ اور گرم ریت پر شریف ترین انسانوں کے
بے گور و کفن لاشے ہیں اور کچھ بے کس و بے سہارا عورتیں عالمِ قید میں ریت کے
ٹیلوں کی اوٹ میں خاموش بیٹھی ہیں۔ دنیا تو یہ سمجھی تھی کہ حق کو شکست ہو گئی ہے
اور باطل نے اپنی فتح کے شادیاں بجالائیں، مگر آج کا بے داغ مؤرخ اس وقت بھی
لکھ رہا تھا اور آج بھی لکھ رہا ہے کہ حق شکست کے لئے پیدا نہیں ہوا۔ حق
کبھی نہیں ہارتا۔ آج دنیا نے دیکھ لیا کہ حسین کو فتح ہوئی ہے اور یزید کو ہری
طرح شکست ہوئی ہے۔ گویا دنیا کے سب سے بڑے آمر (DECTATOR) کا
نام آج گالی بن گیا ہے۔ لہذا کوئی شخص یزید یا اولادِ یزید بننا اپنے لئے گوارہ نہیں
کرتا۔ مگر دیکھو! انسانِ حسین کی غلامی پر آج بھی فخر محسوس کرتے ہیں۔ گویا حسین
قیود مذہب و ملت اور جغرافیائی حدود سے آزاد ہو کر دنیائے عالم کے تمام
انسانوں کے دلوں پر حکومت کر رہا ہے اور آج کرہ ارض پر کروڑ ہا انسان حسین
کی اس عظیم قربانی کی یاد منا رہے ہیں اور تمام زمین و فضا آج "ہائے حسین"
اور "واہ حسین" کے نعروں سے گونج رہی ہے۔ "آج حسینیت ہے!
زندہ باد" کی ابدی صدا ہر انسان کے کان میں آ رہی ہے۔ گویا یہ وہ فتح
عظیم ہے جو حسین کی شہادتِ عظمیٰ نے حاصل کی۔

زوجوا الذوات!

خوب یاد رکھو! حسین نے ہمیں بتا دیا ہے کہ انسانی غلامی ایک آرزو
ایک ذلت ہے اور اس ذلت کی زندگی سے مرعہ جانا ہی بہتر ہے اور اللہ کے "وعدہ"
لا شریک کے دروازے پر سر جھکانے والا انسان کبھی غلام غوثی طاقت کے
سامنے سر نہیں جھکا سکتا۔ اس کا سر کٹ تو سکتا ہے مگر جھک نہیں سکتا۔ اس کا سر
لوہ نیزے پر بلند تو ہو سکتا ہے مگر یزیدیت کی اطاعت قبول نہیں کر سکتا۔
اس کی ہینس اور بیٹیاں قید تو ہو سکتی ہیں مگر غلام و سرکش کے دربار میں اعلان
حق کی طاقت سے ملوکیت کے درباروں کی جہ نہیں ملا سکتی ہیں۔

شام عینے!

حسین نے اپنے جوانوں، بیٹیوں اور بچوں کا خون دیکر اسلام کو اتنا قوی بنا
دیا ہے کہ قیامت تک اسلام کی جڑوں کو کوئی غلام غوثی طاقت کھو کھلا نہیں بنا سکتی
بے شک ظلم و استبداد کہیں کہیں آج بھی زندہ ہے مگر
یاد رکھو!

اس ظلم کے غلام آج بھی حسین کی آواز بلند ہو رہی ہے اور قیامت تک
وہی رہے گی۔ لہذا آج ہم حسین کا شکر یہ ادا کرتے ہیں۔

حسینے! تو نے دنیا میں ایک ایسا باغ لگا دیا ہے جس کے
پھل انسانیت کو ہمیشہ ملنے رہیں گے اور جس کے درختوں کے
ذیر سایہ ستائی ہوئی انسانیت ہمیشہ پناہ لیتی رہے گی۔
حسینے! تیرا نام انسان سے کو پناہ دینے کا ضامن ہے۔

حسینے! تیرا ذکر انسانیت کی سر بلندی کا ذریعہ ہے۔

حسینے! تیرے ماتم کی صدا دنیا میں انسانیت کو سکون بخشی ہے
حسینے! تیری یاد انسان کو کھو یا ہوا انتقام دلا سکتی ہے۔

حسینے! تیری محبت ہم کو کافروں کا دلیر شفاعت ہے۔

معروف کتب پر مبنی کمپیوٹر ڈی وی ڈی



بشیر سٹید وصی حنینہ رضائی



کتابوں کی لسٹ ڈی وی ڈی کور کی پشت پر ملاحظہ فرمائیں۔
خصوصی تعاون: حجت الاسلام سید نور بہار رضا نقوی (فاضل مشہد ایران)

سگ در بتول: سید علی قنبر زیدی . سید علی حیدر زیدی

التماس سورہ فاتحہ برائے ایصال ثواب سید وصی حیدر رضا زیدی ابن سید حسین احمد زیدی (مرحوم)